بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علٰی رسولہ الکریم

وعلٰی عبدہ المسیح الموعود

ملفوظات

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

۱۸۹۱ء

حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ فرماتے ہیں:

بعثت کی غرض

"مجھے خوب یاد ہے اور مَیں نے اپنی نوٹ بک میں اس کو لکھ رکھا ہے کہ جالندھر کے مقام پر ایک شخص نے حضرتِ اقدس امام صادق حضرت میرزا صاحبؑ کی خدمت میں سوال کیا کہ آپ کی غرض دُنیا میں آنے سے کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا کہ "مَیں اِس لیے آیا ہوں تا لوگ قوتِ یقین میں ترقی کریں۔"

ایمان کی اقسام

ایک اور بات بھی ہے۔ جو میری نوٹ بک میں درج ہے اور وہ واقعہ بھی اسی جالندھر کا ہے۔ ہماری جماعت کے ایک آدمی ہمارے بھائی منشی محمد اروڑا صاحبؓ نے سوال کیا کہ حضرت ایمان کتنی طرح کا ہوتا ہے؟ آپؑ نے جو جواب اُس کا فرمایا، بہت ہی لطیف اور سلیس ہے۔

فرمایا: "ایمان دو قسم کا ہوتا ہے۔ موٹا اور باریک۔ موٹا ایمان تو یہی ہے کہ دِینُ العجائز پر عمل کرے اور باریک ایمان یہ ہے کہ میرے پیچھے ہو لے۔"[1]

---

[1] از تقریر حضرت مولانا عبدالکریم صاحبؓ فرمودہ ۲۹ردسمبر ۱۸۹۷ء۔ مندرجہ رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء۔ صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷

۱۸۹۵ء جناب مفتی محمد صادق صاحبؓ لکھتے ہیں :

"۱۸۹۵ء میں جب میں حضرتِ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا تو اس وقت بھی مجھے شوق تھا کہ آپؑ کے کلماتِ طیبات ایک کاغذ پر نقل کر کے ہمیشہ لاہور لے جاتا اور وہاں کے احمدی احباب کو ہفتہ وار کمیٹی میں سُنایا کرتا ......
...... اس وقت کی یادداشت میں سے کچھ نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اُن ایام میں چونکہ تاریخ کا انتظام نہیں رکھا تھا، اس لیے بلا تاریخ ہر ایک بات درج کی جاتی ہے۔

بیعت اور توبہ

بیعت میں جاننا چاہیے کہ کیا فائدہ ہے اور کیوں اس کی ضرورت ہے؟ جب تک کسی شئے کا فائدہ اور قیمت معلوم نہ ہو، تو اس کی قدر آنکھوں کے اندر نہیں سماتی۔ جیسے گھر میں انسان کے کئی قسم کا مال و اسباب ہوتا ہے۔ مثلاً روپیہ، پیسہ، کوڑی، لکڑی وغیرہ۔ تو جس قسم کی جو شے ہے اسی درجہ کی اس کی حفاظت کی جاوے گی۔ ایک کوڑی کی حفاظت کے لیے وُہ سامان نہ کرے گا جو پیسہ اور روپیہ کے لیے اُسے کرنا پڑے گا اور لکڑی وغیرہ کو تو یُونہی ایک کونہ میں ڈال دے گا۔ علیٰ ہٰذالقیاس جس کے تلف ہونے سے اس کا زیادہ نُقصان ہے۔ اس کی زیادہ حفاظت کرے گا۔ اسی طرح بیعت میں عظیم الشان بات توبہ ہے جس کے معنی رجوع کے ہیں۔ توبہ اس حالت کا نام ہے کہ انسان اپنے معاصی سے جن سے اس کے تعلقات بڑھے ہوئے ہیں اور اس نے اپنا وطن انہیں مقرر کر لیا ہوا ہے گویا کہ گناہ میں اُس نے بُود و باش مقرر کر لی ہوتی ہے۔ اُس وطن کو چھوڑنا اور رجوع کے معنے پاکیزگی کو اختیار کرنا۔ اب وطن کو چھوڑنا بڑا گراں گزرتا ہے اور ہزاروں تکلیفیں ہوتی ہیں۔ ایک گھر جب انسان چھوڑتا ہے تو کس قدر اُسے تکلیف ہوتی ہے اور وطن کو چھوڑنے میں تو اُس کو سب یار دوستوں سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے اور سب چیزوں کو مثل چارپائی، فرش و ہمسائے، وہ گلیاں کُوچے، بازار سب چھوڑ چھاڑ کر ایک نئے مُلک میں جانا پڑتا ہے یعنی اُس (سابقہ) وطن میں کبھی نہیں آتا۔ اس کا نام توبہ ہے۔ معصیت کے دوست اور ہوتے ہیں اور تقویٰ کے دوست اور۔ اس تبدیلی کو صُوفیاء نے موت کہا ہے۔ جو توبہ کرتا ہے اُسے بڑا حرج اُٹھانا پڑتا ہے اور سچی توبہ کے وقت بڑے بڑے حرج اُس کے سامنے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے۔ وہ جب تک اُس کُل کا نعم البدل عطا نہ فرماوے، نہیں مارتا۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (البقرہ ۲۲۳) میں یہی اشارہ ہے کہ وہ توبہ کر کے غریب، بیکس ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس سے محبت اور پیار کرتا ہے اور اُسے نیکوں کی جماعت میں داخل کرتا ہے دوسری قومیں خدا کو رحیم و کریم خیال نہیں کرتیں۔ عیسائیوں نے خدا کو تو ظالم جانا اور بیٹے کو رحیم کہ باپ تو گناہ نہ بخشے اور بیٹا جان دیکر بخشوائے۔ بڑی بے وقوفی ہے کہ باپ بیٹے میں اتنا فرق ہو۔ والد مولُود میں مناسبت اخلاق، عادات کی ہوا کرتی ہے۔ (مگر یہاں تو بالکل ندارد) اگر اللہ رحیم نہ ہوتا تو انسان کا ایک دم گذارہ نہ ہوتا۔ جس نے انسان کے عمل سے پیشتر ہزاروں اشیاء اُس کے لیے مفید بنائیں، تو کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ توبہ اور عمل کو قبول نہ کرے۔

٭ ٭ ٭

گناہ اور توبہ کی حقیقت

گناہ کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ گناہ کو پیدا کرے اور پھر ہزاروں برس کے بعد گناہ کی معافی سوجھے۔ جیسے مکھی کے دو پر ہیں۔ ایک میں شفا اور دوسرے میں زہر۔ اسی طرح انسان کے دو پر ہیں۔ ایک معاصی کا دوسرا خجالت، توبہ، پریشانی کا۔ یہ ایک قاعدہ کی بات ہے۔ جیسے ایک شخص جب غلام کو سخت مارتا ہے تو پھر اُس کے بعد پچھتاتا ہے۔ گویا کہ دونوں پر اکٹھے حرکت کرتے ہیں۔ زہر کے ساتھ تریاق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زہر کیوں بنایا گیا؟ تو جواب یہ ہے کہ گو یہ زہر ہے، مگر کُشتہ کرنے سے حکم اکسیر کا رکھتا ہے۔ اگر گناہ نہ ہوتا تو رعونت کا زہر انسان میں بڑھ جاتا اور وہ ہلاک ہو جاتا ـــ توبہ اس کی تلافی کرتی ہے۔ کبر اور عُجب کی آفت سے گناہ انسان کو بچائے رکھتا ہے۔ جب نبی معصومؑ ستر بار استغفار کرے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ گناہ سے توبہ وہی نہیں کرتا جو اس پر راضی ہو جاوے اور جو گناہ کو گناہ جانتا ہے، وہ آخر اُسے چھوڑے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب انسان بار بار رو رو کر اللہ سے بخشش چاہتا ہے تو آخر کار خدا کہہ دیتا ہے کہ ہم نے تجھ کو بخش دیا۔ اب تیرا جو جی چاہے سو کر۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دل کو بدل دیا اور اب گناہ اُسے بالطبع بُرا معلوم ہوگا۔ جیسے بھیڑ کو مَیلا کھاتے دیکھ کر کوئی دوسرا حرص نہیں کرتا کہ وہ بھی کھاوے، اسی طرح وہ انسان بھی گناہ نہ کرے گا جسے خدا نے بخش دیا ہے۔ مسلمانوں کو خنزیر کے گوشت سے بالطبع کراہت ہے، حالانکہ اور دوسرے ہزاروں کام کرتے ہیں جو حرام اور منع ہیں۔ تو اس میں حکمت یہی ہے کہ ایک نمونہ کراہت کا رکھ دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ اسی طرح انسان کو گناہ سے نفرت ہو جاوے۔

دُعا تریاق ہے

گناہ کرنے والا اپنے گناہوں کی کثرت وغیرہ کا خیال کر کے دُعا سے ہرگز باز نہ رہے۔ دُعا تریاق ہے۔ آخر دُعاؤں سے دیکھ لے گا کہ گناہ اُسے کیسا بُرا لگنے لگا۔ جو لوگ معاصی میں ڈوب کر دُعا کی قبولیت سے مایوس رہتے ہیں اور توبہ کی طرف رجوع نہیں کرتے، آخر وہ انبیاء اور اُن کی تاثیرات کے منکر ہو جاتے ہیں۔

توبہ جُزوِ بیعت ہے

یہ توبہ کی حقیقت ہے (جو اُوپر بیان ہوئی) اور یہ بیعت کی جُز کیوں ہے؟ تو بات یہ ہے کہ انسان غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ جب وہ بیعت کرتا ہے اور ایسے کے ہاتھ پر جسے اللہ تعالیٰ نے وہ تبدیلی بخشی ہو، تو جیسے درخت میں پیوند لگانے سے خاصیت بدل جاتی ہے۔ اِسی طرح سے اس پیوند سے بھی اس میں وہ فیوض اور انوار آنے لگتے ہیں (جو اُس تبدیلی یافتہ انسان میں ہوتے ہیں) بشرطیکہ اُس کے ساتھ سچا تعلق ہو۔ خشک شاخ کی طرح نہ ہو۔ اُس کی شاخ ہو کر پیوند ہو جاوے۔ جس قدر یہ نسبت ہوگی اسی قدر فائدہ ہوگا۔

رسمی بیعت فائدہ نہیں دیتی

بیعت رسمی فائدہ نہیں دیتی۔ ایسی بیعت سے حصہ دار ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اسی وقت حصہ دار ہوگا جب اپنے وجود کو ترک کر کے بالکل محبت اور اخلاص کے ساتھ اس کے ساتھ ہو جاوے۔ منافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچا تعلق نہ ہونے کی وجہ سے آخر بے ایمان رہے۔

اُن کو سچی محبت اور اخلاص پیدا نہ ہوا، اس لیے ظاہری لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ان کے کام نہ آیا۔ تو ان تعلقات کو بڑھانا بڑا ضروری امر ہے۔ اگر ان تعلقات کو وُہ (طالب) نہیں بڑھاتا اور کوشش نہیں کرتا، تو اس کا شکوہ اور افسوس بے فائدہ ہے۔ محبت واخلاص کا تعلق بڑھانا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو اُس انسان (مُرشد) کے ہمرنگ ہو۔ طریقوں میں اور اعتقاد میں۔ نفس لمبی عُمر کے وعدے دیتا ہے۔ یہ دھوکا ہے۔ عُمر کا اعتبار نہیں ہے۔ جلدی راستبازی اور عبادت کی طرف جُھکنا چاہیے اور صُبح سے لے کر شام تک حساب کرنا چاہیے۔

تہجد کی تاکید

"اس زندگی کے کُل اَنفاس اگر دُنیاوی کاموں میں گذر گئے، تو آخرت کے لیے کیا ذخیرہ کیا ــــــ؟

تہجد میں خاص کر اُٹھو اور ذوق اور شوق سے ادا کرو۔ درمیانی نمازوں میں بہ باعث ملازمت کے ابتلا آ جاتا ہے۔ رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ نماز اپنے وقت پر ادا کرنی چاہیے۔ ظہر اور عصر کبھی کبھی جمع ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ضعیف لوگ ہوں گے، اس لیے یہ گنجائش رکھ دی، مگر یہ گنجائش تین کے جمع کرنے میں نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ کی خاطر تکلیف اُٹھانا

جبکہ ملازمت میں اور دُوسرے کئی امور میں لوگ سزا پاتے ہیں (اور موردِ عتابِ حکام ہوتے ہیں) تو اگر اللہ تعالیٰ کے لیے تکلیف اُٹھاویں تو کیا خوب ہے۔ جو لوگ راستبازی کے لیے تکلیف اور نقصان اُٹھاتے ہیں وہ لوگوں کی نظروں میں بھی مرغوب ہوتے ہیں۔ اور یہ کام نبیوں اور صدّیقوں کا ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے دُنیاوی نقصان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے ذمّہ نہیں رکھتا، پورا اجر دیتا ہے۔

انسان منافقانہ طرز نہ رکھے

(انسان کو لازم ہے) منافقانہ طرز نہ رکھے۔ مثلاً اگر ایک ہندو (خواہ حاکم یا عہدیدار ہو) کہے کہ رامؔ اور رحیمؔ ایک ہے، تو ایسے موقعہ پر ہاں میں ہاں نہ ملائے۔ اللہ تعالیٰ تہذیب سے منع نہیں کرتا۔ مہذبانہ جواب دیوے۔ حکمت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ایسی گفتگو کی جاوے جس سے خواہ نخواہ جوش پیدا ہو اور بیہودہ جنگ ہو کبھی اخفائے حق نہ کرے۔ ہاں میں ہاں ملانے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

ع یارِ غالب شو کہ تا غالب شوی

اللہ تعالیٰ کا لحاظ اور پاس رکھنا چاہیے۔ ہمارے دین میں کوئی بات تہذیب کے خلاف نہیں۔

☆ ☆ ☆

ا؎ (مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ تقریر حضرتؑ نے اس وقت فرمائی۔ جب محمد نواب خاں صاحب تحصیلدار نے حضورؑ سے بیعت کی تھی۔ ایڈیٹر)

(البدر جلد ۱ نمبر ۵، ۶ پرچہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء)

اِسلام مظلوم ہے

اِسلام ¹ اِسلام ہمیشہ مظلوم چلا آیا ہے۔ جیسے کبھی دو بھائیوں میں فساد ہو تو بڑا بھائی بہ سبب اپنی عظمت اور پہلے پیدا ہونے کے اپنے چھوٹے بھائی پر خواہ نخواہ ظلم کرتا ہے اس لیے کہ وہ پیدائش میں اوّل ہونے سے اپنا حق زیادہ خیال کرتا ہے، حالانکہ حق دونوں کا برابر ہے۔ اسی طرح کا ظلم اِسلام پر ہو رہا ہے۔ اسلام سب مذاہب کے بعد آیا۔ اسلام نے سب مذاہب کی غلطی اُن کو بتلائی، تو جیسے قاعدہ ہے کہ جاہل، خیرخواہ کا دشمن ہو جاتا ہے اسی طرح وہ سب مذاہب اس سے ناراض ہوئے، کیونکہ اُن کے دلوں میں اپنی اپنی عظمت بیٹھی ہوئی تھی۔ انسان کثرتِ قوم، قدامت اور کثرتِ مال کے باعث متکبّر ہو جاتا ہے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ایک غریب، قلیل اور نئے گروہ والے تھے۔ اِس لیے (ابتدا میں) اُنھوں (مخالفین) نے نہ مانا۔ حق ہمیشہ مظلوم ہوتا ہے۔

اسلام دُوسری اقوام کا محسن ہے

اِسلام ایسا مطہر مذہب ہے کہ کسی مذہب کے بانی کو بُرا کہنے نہیں دیتا۔ دیگر مذاہب والے جھٹ گالی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ دیکھو یہ عیسائی قوم آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کس قدر گالیاں دیتی ہے۔ اگر آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اس وقت زندہ ہوتے، تو آپ کی دُنیاوی عظمت کے خیال سے بھی یہ لوگ کوئی کلمہ زبان پر نہ لا سکتے، بلکہ ہزار ہا درجہ تعظیم سے پیش آتے۔ امیرِ کابل اور سلطانِ رُوم ایک ادنیٰ اُمتی آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہیں۔ اُن کو گالی نہیں دے سکتے۔ بے ادبی سے پیش نہیں آ سکتے۔ مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا نام لیا جاتے، تو ہزاروں گالیاں سُناتے ہیں۔ اسلام دوسری اقوام کا محسن ہے کہ ہر ایک نبی اور کتاب کو بَری کیا۔ اور خود اِسلام مظلوم ہے۔ اسلام کا مضمون لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتے۔"

۱۸۹۶ء

فرمایا: حضرت مسیح کی آمد کے واسطے جو لفظ آیا ہے وہ نزُول ہے اور رجُوع نہیں ہے۔ اوّل تو واپس آنے والے کی نسبت جو لفظ آتا ہے وہ رجُوع ہے اور رجُوع کا لفظ حضرت عیسٰیؑ کی نسبت کہیں نہیں بولا گیا۔ دوّم نزول کے معنے آسمان سے آنے کے نہیں ہیں۔ نزیل مُسافر کو کہتے ہیں۔

مخالفین کیلئے دُعا سے کام لینا چاہیے

فرمایا: ہم نے جو مخالفین پر بعض جگہ سختی کی ہے۔ وہ اُن کے تکبّر کو دُور کرنے کے واسطے ہے۔ وہ سخت باتوں کا جواب نہیں، بلکہ علاج کے طور پر کڑوی دوائی ہے اَلْحَقُّ مُرٌّ۔ لیکن ہر شخص کے واسطے جائز نہیں کہ وہ ایسی تحریر کو استعمال کرے۔ جماعت کو احتیاط چاہیے۔ ہر ایک شخص اپنے دل کو پہلے ٹٹول کر دیکھ لے کہ صرف ضدّ اور دشمنی کے طور پر ایسے لفظ لکھ رہا ہے یا کسی نیک نیت پر یہ کام مبنی ہے۔

---

¹ "البدر" جلد ۱، پرچہ ۹، ۱۹؍ دسمبر ۱۹۰۲ء

فرمایا: مخالفین کے ساتھ دشمنی سے پیش نہیں آنا چاہیے، بلکہ زیادہ تر دُعا سے کام لینا چاہیے اور دیگر وسائل سے کوشش کرنی چاہیے۔[1]

۱۸۹۷ء

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"مَیں ہرگز اپنے آپ کو مولوی نہیں کہتا اور نہ مَیں راضی ہوں کہ کبھی کوئی مجھے مولوی کہے، بلکہ مجھے تو اس لفظ سے ایسا رنج ہوتا ہے، جیسا کہ کسی نے گالی دے دی۔

فرمایا: لوگ تمھیں دُکھ دیں گے اور ہر طرح سے تکلیف پہنچائیں گے، مگر ہماری جماعت کے لوگ جوش نہ دکھائیں۔ جوشِ نفس سے دل دُکھانے والے الفاظ استعمال نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ پسند نہیں ہوتے۔ ہماری جماعت کو اللہ تعالیٰ ایک نمونہ بنانا چاہتا ہے۔"[2]

فرمایا: یہ آسمانی کام ہے اور آسمانی کام رُک نہیں سکتا۔ اس معاملہ میں ہمارا قدم ایک ذرہ بھی درمیان میں نہیں۔

فرمایا: لوگوں کی گالیوں سے ہمارا نفس جوش میں نہیں آتا۔

فرمایا: دولت مندوں میں نخوت ہے، مگر آج کل کے علماء میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اُن کا تکبّر ایک دیوار کی طرح اُنکی راہ میں رُکاوٹ ہے۔ مَیں اِس دیوار کو توڑنا چاہتا ہوں۔ جب یہ دیوار ٹوٹ جائے گی تو وہ انکسار کے ساتھ آویں گے۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ متّقی کو پیار کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عظمت کو یاد کر کے سب ترساں رہو اور یاد رکھو کہ سب اللہ کے بندے ہیں۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ نہ تیزی کرو۔ نہ کسی کو حقارت سے دیکھو۔ جماعت میں اگر ایک آدمی گندہ ہے، تو وہ سب کو گندہ کر دیتا ہے۔ اگر حرارت کی طرف تمہاری طبیعت کا میلان ہو تو پھر اپنے دل کو ٹٹولو کہ یہ حرارت کس چشمہ سے نکلی ہے۔ یہ مقام بہت نازک ہے۔"[3]

دسمبر ۱۸۹۷ء

دارالامان قادیان سے بذریعہ پوسٹ کارڈ اطلاع ملی ہے کہ ہماری جماعت ہر نماز کی آخری رکعت میں بعد رکوع مندرجہ ذیل دُعا بکثرت پڑھے:[4]

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (بقرہ: ۲۰۲)

---

[1] بدر جلد ۱۱ صفحہ ۶ پرچہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۱ء

[2] بدر جلد ۱۱ صفحہ ۳ پرچہ ۱۶ نومبر ۱۹۱۱ء

[3] بدر جلد ۱۱ صفحہ ۹ پرچہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۱ء

[4] الحکم جلد ۱ صفحہ ۶ پرچہ ۹ دسمبر ۱۸۹۷ء

۲۵؍دسمبر ۱۸۹۷ء

حضرتِ اقدسؑ کی پہلی تقریر جلسہ سالانہ

حضورؑ نے فرمایا:۔

تقویٰ کی بابت نصیحت

اپنی جماعت کی خیر خواہی کے لیے زیادہ ضروری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تقویٰ کی بابت نصیحت کی جاوے، کیونکہ یہ بات عقلمند کے نزدیک ظاہر ہے کہ بجز تقویٰ کے اور کسی بات سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (النحل ۱۲۹)

ہماری جماعت کے لیے خاص کر تقویٰ کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس خیال سے بھی کہ وہ ایک ایسے شخص سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے سلسلۂ بیعت میں ہیں جس کا دعویٰ ماموریت کا ہے تا وہ لوگ جو خواہ کسی قسم کے بغضوں، کینوں یا شرکوں میں مُبتلا تھے یا کیسے ہی رُو بہ دُنیا تھے، اُن تمام آفات سے نجات پاویں۔

آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی بیمار ہو جاوے خواہ اس کی بیماری چھوٹی ہو یا بڑی اگر اُس بیماری کے لیے دوا نہ کی جاوے اور علاج کے لیے دُکھ نہ اُٹھایا جاوے۔ بیمار اچھا نہیں ہو سکتا۔ ایک سیاہ داغ مُنہ پر نکل کر ایک بڑا فکر پیدا کر دیتا ہے کہ کہیں یہ داغ بڑھتا بڑھتا کُل مُنہ کو کالا نہ کر دے۔ اسی طرح معصیت کا بھی ایک سیاہ داغ دل پر ہوتا ہے۔ صغائر سہل انگاری سے کبائر ہو جاتے ہیں۔ صغائر وہی داغ چھوٹا ہے جو بڑھ کر آخر کار کُل مُنہ کو سیاہ کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے ویسا ہی قہار اور مُنتقِم بھی ہے۔ ایک جماعت کو دیکھتا ہے کہ اُن کا دعویٰ اور لاف و گزاف تو بہت کچھ ہے اور اُن کی عملی حالت ایسی نہیں، تو اس کا غیظ و غضب بڑھ جاتا ہے۔ پھر ایسی جماعت کی سزادہی کے لیے وُہ کفّار کو ہی تجویز کرتا ہے۔ جو لوگ تاریخ سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کئی دفعہ مُسلمان کافروں سے تہ تیغ کیے گئے۔ جیسے چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے مُسلمانوں کو تباہ کیا؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں سے حمایت اور نصرت کا وعدہ کیا ہے، لیکن پھر بھی۔ مُسلمان مغلوب ہوئے۔ اس قسم کے واقعات بسا اوقات پیش آئے۔ اس کا باعث یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو پکارتی ہے لیکن اس کا دِل اور طرف ہے اور اپنے افعال سے وُہ بالکل رُو بہ دُنیا ہے تو پھر اُس کا قہر اپنا رنگ دکھاتا ہے۔

* * *

قول و فعل میں مطابقت

اللہ کا خوف اسی میں ہے کہ انسان دیکھے کہ اُس کا قول و فعل کہاں تک ایک دُوسرے سے مطابقت رکھتا ہے۔ پھر جب دیکھے کہ اس کا قول و فعل برابر نہیں تو سمجھ لے کہ موردِ غضبِ الٰہی ہوگا۔ جو دل ناپاک ہے خواہ قول کتنا ہی پاک ہو وہ دل خدا کی نگاہ میں قیمت نہیں پاتا۔ بلکہ خدا کا غضب مشتعل ہوگا۔ پس میری جماعت سمجھ لے کہ وہ میرے پاس آئے ہیں، اسی لیے کہ تخم ریزی کی جاوے جس سے وہ پھلدار درخت ہو جاتے۔ پس ہر ایک اپنے اندر غور کرے کہ اس کا اندرُونہ کیسا ہے؟ اور اس کی باطنی حالت کیسی ہے؟ اگر ہماری جماعت بھی خدانخواستہ ایسی ہے کہ اُس کی زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ ہے تو پھر خاتمہ بالخیر نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جب دیکھتا ہے کہ ایک جماعت جو دل سے خالی ہے۔ اور زبانی دعوے کرتی ہے۔ وہ غنی ہے۔ وہ پروا نہیں کرتا۔ بدر کی فتح کی پیشگوئی ہو چکی تھی، ہر طرح فتح کی اُمید تھی، لیکن پھر بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رو رو کر دُعا مانگتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ جب ہر طرح فتح کا وعدہ ہے، تو پھر ضرورتِ الحاح کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ وہ ذات غنی ہے یعنی ممکن ہے کہ وعدۂ الٰہی میں کوئی مخفی شرائط ہوں۔

برکاتِ تقویٰ

پس ہمیشہ دیکھنا چاہیے کہ ہم نے تقویٰ و طہارت میں کہاں تک ترقی کی ہے۔ اس کا معیار قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متقی کے نشانوں میں ایک یہ بھی نشان رکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ متقی کو مکروہاتِ دُنیا سے آزاد کر کے اُس کے کاموں کا خود کفیل ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (الطلاق ۳،۴) جو شخص خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ ہر ایک مصیبت میں اس کے لیے راستہ مخلصی کا نکال دیتا ہے اور اس کے لیے ایسے روزی کے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے علم و گمان میں نہ ہوں، یعنی یہ بھی ایک علامت متقی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی کو نابکار ضرورتوں کا محتاج نہیں کرتا۔ مثلاً ایک دوکاندار یہ خیال کرتا ہے کہ دروغگوئی کے سوا اس کا کام ہی نہیں چل سکتا، اس لیے وہ دروغگوئی سے باز نہیں آتا اور جھوٹ بولنے کے لیے وہ مجبوری ظاہر کرتا ہے، لیکن یہ امر ہرگز سچ نہیں۔ خدا تعالیٰ متقی کا خود محافظ ہو جاتا ہے اور اُسے ایسے مواقع سے بچا لیتا ہے جو خلافِ حق پر مجبور کرنے والے ہوں۔ یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ کو کسی نے چھوڑا، تو خدا نے اُسے چھوڑ دیا۔ جب رحمان نے چھوڑ دیا، تو ضرور شیطان اپنا رشتہ جوڑے گا۔

یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کمزور ہے۔ وہ بڑی طاقت والا ہے۔ جب اس پر کسی امر میں بھروسہ کرو گے وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق ۴) لیکن جو لوگ اِن آیات کے پہلے مخاطب تھے، وہ اہلِ دین تھے۔ اُن کی ساری فکریں محض دینی اُمور کے لیے تھیں اور دُنیوی اُمور حوالہ بخدا تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو تسلّی دی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ غرض برکاتِ تقویٰ میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ متقی کو اِن مصائب سے مخلصی بخشتا ہے جو دینی اُمور میں حارج ہوں۔

متقی کیلئے روحانی رزق

ایسا ہی اللہ تعالیٰ متقی کو خاص طور پر رزق دیتا ہے۔ یہاں میں معارف کے رزق کا ذکر کروں گا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود اُمّی ہونے کے تمام جہان کا مقابلہ کرنا تھا، جس میں اہلِ کتاب، فلاسفر، اعلیٰ درجہ کے علمی مذاق والے لوگ اور عالم فاضل شامل تھے، لیکن آپ کو رُوحانی رزق اس قدر ملا کہ آپ سب پر غالب آئے اور اُن سب کی غلطیاں نکالیں۔

یہ رُوحانی رزق تھا جس کی نظیر نہیں۔ متقی کی شان میں دُوسری جگہ یہ بھی آیا ہے۔ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (الانفال: ۳۵) اللہ تعالیٰ کے ولی وہ ہیں جو متقی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے دوست۔ پس یہ کیسی نعمت ہے کہ تھوڑی سی تکلیف سے خدا کا مقرب کہلائے۔ آج کل زمانہ کس قدر پست ہمت ہے۔ اگر کوئی حاکم یا افسر کسی کو یہ کہدے کہ تُو میرا دوست ہے یا اُس کو کُرسی دے اور اُس کی عزت کرے، تو وہ شیخی کرتا ہے۔ فخر کرتا پھرتا ہے، لیکن اُس انسان کا کس قدر افضل رُتبہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ اپنا ولی یا دوست کہہ کر پکارے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ وعدہ فرمایا ہے۔ جیسے کہ ایک حدیث بخاری میں وارد ہے: لَا يَزَالُ يَتَقَرَّبُ عَبْدِيْ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَ بَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا وَلَئِنْ سَاَلَنِيْ لَاُعْطِيَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَ نِيْ لَاُعِيْذَنَّهٗ۔ (صحیح بخاری جزو رابع۔ باب التواضع) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا ولی ایسا قرب میرے ساتھ بذریعہ نوافل پیدا کر لیتا ہے۔

فرائض اور نوافل

انسان جس قدر نیکیاں کرتا ہے، اس کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک فرائض، دُوسرے نوافل۔ فرائض یعنی جو انسان پر فرض کیا گیا ہو۔ جیسے قرضہ کا اُتارنا۔ یا نیکی کے مقابل نیکی۔ ان فرائض کے علاوہ ہر ایک نیکی کے ساتھ نوافل ہوتے ہیں، یعنی ایسی نیکی جو اس کے حق سے فاضل ہو۔ جیسے احسان کے مقابل احسان کے علاوہ اور احسان کرنا۔ یہ نوافل ہیں۔ یہ بطور مُکمّلات اور مُتمّمات فرائض کے ہیں۔ اس حدیث میں بیان ہے کہ اولیاء اللہ کے دینی فرائض کی تکمیل نوافل سے ہو رہتی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے علاوہ وہ اور صدقات دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسوں کا ولی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس کی دوستی یہانتک ہوتی ہے کہ میں اُس کے ہاتھ، پاؤں حتیٰ کہ اس کی زبان ہو جاتا ہُوں جس سے وہ بولتا ہے۔

ہر ایک فعل خدا کی منشاء کے مطابق ہو

بات یہ ہے کہ جب انسان جذباتِ نفس سے پاک ہوتا اور نفسانیت چھوڑ کر خدا کے ارادوں کے اندر چلتا ہے، اس کا کوئی فعل ناجائز نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک فعل خدا کی منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔ جہاں لوگ ابتلاء میں پڑتے ہیں وہاں یہ امر ہمیشہ ہوتا ہے کہ وہ فعل خدا کے ارادہ سے مطابق نہیں ہوتا۔ خدا کی رضا اس کے برخلاف ہوتی ہے۔ ایسا شخص اپنے جذبات کے نیچے چلتا ہے۔ مثلاً غصّہ میں آکر کوئی ایسا فعل اس سے سرزد ہو جاتا ہے جس سے مقدّمات بن جایا کرتے ہیں۔ فوجداریاں ہو جاتی ہیں، مگر

اگر کسی کا یہ ارادہ ہو کہ بلا استصواب کتابُ اللہ اس کا حرکت و سکون نہ ہوگا اور اپنی ہر ایک بات پر کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے گا، تو یقینی امر ہے کہ کتاب اللہ مشورہ دے گی۔ جیسے فرمایا: وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام: ۶۰) سو اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ ہم مشورہ کتاب اللہ سے لیں گے، تو ہم کو ضرور مشورہ ملے گا، لیکن جو اپنے جذبات کا تابع ہے۔ وہ ضرور نقصان ہی میں پڑے گا۔ بسا اوقات وہ اس جگہ مواخذہ میں پڑیگا۔ سو اس کے مقابل اللہ نے فرمایا کہ ولی جو میرے ساتھ بولتے چلتے کام کرتے ہیں۔ وہ گویا اس میں محو ہیں۔ سو جس قدر کوئی محویت میں کم ہے۔ وہ اُتنا ہی خدا سے دُور ہے، لیکن اگر اُس کی محویت ویسی ہی ہے جیسے خدا نے فرمایا تو اس کے ایمان کا اندازہ نہیں۔ اُن کی حمایت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ عَادَ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ (الحدیث) جو شخص میرے ولی کا مقابلہ کرتا ہے وہ میرے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ اب دیکھ لو کہ مُتقی کی شان کس قدر بلند ہے اور اس کا پایہ کس قدر عالی ہے۔ جس کا قُرب خُدا کی جناب میں ایسا ہے کہ اس کا ستایا جانا خدا کا ستایا جانا ہے تو خدا اس کا کس قدر معاون و مددگار ہوگا۔

متقی کے پاس جو آجاتا ہے وہ بھی بچایا جاتا ہے

لوگ بہت سے مصائب میں گرفتار ہوتے ہیں، لیکن متقی بچائے جاتے ہیں، بلکہ اُن کے پاس جو آجاتا ہے وہ بھی بچایا جاتا ہے۔ مصائب کی کوئی حد نہیں۔ انسان کا اپنا اندر اس قدر مصائب سے بھرا ہوا ہے کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ امراض کو ہی دیکھ لیا جاوے کہ ہزار ہا مصائب کے پیدا کرنے کو کافی ہیں، لیکن جو تقویٰ کے قلعہ میں ہوتا ہے وہ اُن سے محفوظ ہے اور جو اس سے باہر ہے وہ ایک جنگل میں ہے جو درندہ جانوروں سے بھرا ہوا ہے۔

متقی کو اسی دنیا میں بشارتیں ملتی ہیں

متقی کے لیے ایک اور بھی وعدہ ہے۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (یونس: ۶۵) یعنی جو متقی ہوتے ہیں، اُن کو اسی دُنیا میں بشارتیں سچے خوابوں کے ذریعہ ملتی ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ صاحبِ مکاشفات ہو جاتے ہیں۔ مکالمۃُ اللہ کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ وہ بشریت کے لباس میں ہی ملائکہ کو دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے کہ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (حٰمٓ السجدہ: ۳۱) یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور استقامت دکھاتے ہیں، یعنی ابتلا کے وقت ایسا شخص دکھلا دیتا ہے کہ جو مَیں نے مُنہ سے وعدہ کیا تھا، وہ عملی طور سے پورا کرتا ہوں۔

ابتلا ضروری ہے

ابتلا ضروری ہے۔ جیسے یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت: ۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور استقامت کی، اُن پر فرشتے اُترتے ہیں۔ مفسّروں کی غلطی ہے کہ فرشتوں کا اُترنا نزع میں ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کو صاف کرتے ہیں اور نجاست اور گندگی سے، جو اللہ سے دُور رکھتی ہے، اپنے نفس کو دُور رکھتے ہیں۔ اُن میں سلسلۂ الہام کے لیے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ سلسلۂ الہام شروع ہو جاتا ہے۔ پھر متقی کی شان میں ایک اور

جگہ فرمایا: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (یونس: ۶۳) یعنی جو اللہ کے ولی ہیں اُن کو کوئی غم نہیں جس کا خدا متکفل ہو اسس کو کوئی تکلیف نہیں۔ کوئی مقابلہ کرنے والا ضرر نہیں دے سکتا اگر خدا ولی ہو جاتے۔ پھر فرمایا: وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (حٰم سجدہ ۳۱) یعنی تم اس جنت کے لیے خوش ہو جس کا تم کو وعدہ ہے۔

قرآن کی تعلیم سے پایا جاتا ہے کہ انسان کے لیے دو جنت ہیں۔ جو شخص خدا سے پیار کرتا ہے کیا وُہ ایک جلنے والی زندگی میں رہ سکتا ہے؟ جب اس جگہ ایک حاکم کا دوست دُنیوی تعلقات میں ایک قسم کی بہشتی زندگی میں ہوتا ہے، تو کیوں نہ ان کے لیے دروازہ جنت کا کھلے جو اللہ کے دوست ہیں؛ اگرچہ دُنیا پُر از تکلیف و مصائب ہے، لیکن کسی کو کیا خبر وہ کیسی لذت اُٹھاتے ہیں؟ اگر اُن کو رنج ہو تو آدھ گھنٹہ تکلیف اُٹھانا بھی مشکل ہے، حالانکہ وہ تو تمام عمر تکلیف میں رہتے ہیں۔ ایک زمانہ کی سلطنت اُن کو دے کر اُن کو اپنے کام سے روکا جائے تو کب کسی کی سُنتے ہیں؟ اس طرح خواہ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں، وہ اپنے ارادہ کو نہیں چھوڑتے۔

کامل نمونۂ اخلاق

ہمارے ہادیٔ کامل کو یہ دونوں باتیں دیکھنی پڑیں۔ ایک وقت تو طائف میں پتھر برسائے گئے۔ ایک کثیر جماعت نے سخت سے سخت جسمانی تکلیف دی، لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ جب قوم نے دیکھا کہ مصائب و شدائد سے ان پر کوئی اثر نہ پڑا، تو اُنھوں نے جمع ہو کر بادشاہت کا وعدہ دیا۔ اپنا امیر بنانا چاہا۔ ہر ایک قسم کے سامانِ آسائش مہیا کر دینے کا وعدہ کیا۔ حتیٰ کہ عمدہ سے عمدہ بی بی بھی۔ بدیں شرط کہ حضرتؐ بتوں کی مذمت چھوڑ دیں۔ لیکن جیسے کہ طائف کی مصیبت کے وقت ویسی ہی اِسس وعدۂ بادشاہت کے وقت حضرتؐ نے کچھ پروا نہ کی اور پتھر کھانے کو ترجیح دی۔ سو جب تک خاص لذت نہ ہو، تو کیا ضرورت تھی کہ آرام چھوڑ کر دُکھوں میں پڑتے۔

یہ موقع سوا ہمارے رسُول علیہ الصّلوٰۃ والتحیات کے کسی اور نبی کو نہ ملا کہ اُن کو نبوّت کا کام چھوڑنے کے لیے کوئی وعدہ دیا گیا ہو۔ مسیحؑ کو بھی یہ امر نصیب نہ ہوا۔ دُنیا کی تاریخ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی یہ معاملہ ہوا کہ آپؐ کو سلطنت کا وعدہ دیا گیا اگر آپ اپنا کام چھوڑ دیں۔ سو یہ عزّت ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اسی طرح ہمارے ہادیٔ کامل کو دونوں زمانے تکلیف اور فتح مندی کے نصیب ہوتے، تاکہ وہ دونوں اوقات میں کامل نمونہ اخلاق کا دکھا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لیے چاہا ہے کہ ہر دو لذتیں اٹھائیں۔ بعض وقت دُنیوی لذات، آرام اور طیبات کے رنگ میں۔ بعض وقت عُسرت اور مصائب میں۔ تاکہ اُن کے دونوں اخلاق کامل نمونہ دکھا سکیں۔ بعض اخلاق طاقت میں اور بعض مصائب میں کُھلتے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دونوں باتیں میسّر آئیں۔ سو جس قدر ہم آپؐ کے اخلاق پیش کر سکیں گے۔ کوئی اور قوم اپنے کسی نبی کے اخلاق پیش نہ کر سکے گی۔ جیسے مسیحؑ کا صرف صبر ظاہر ہو سکتا ہے کہ وہ مار

کھاتا رہا، لیکن یہ کہاں سے نکلے گا کہ اُن کو طاقت نصیب ہوئی۔ وہ نبی بیشک سچے ہیں لیکن اُن کے ہر قسم کے اخلاق ثابت نہیں، چونکہ اُن کا ذکر قرآن میں آگیا، اس لیے ہم اُن کو نبی مانتے ہیں۔ واِلّا انجیل میں تو اُن کا کوئی ایسا خُلق ثابت نہیں۔ جیسے اُولوالعزم انبیاء کی شان ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہمارے ہادئ کامل بھی اگر ابتدائی تیرہ برس کی مصائب میں مرجاتے، تو اُن کے اور بہت سے اخلاقِ فاضلہ مسیح کی طرح ثابت نہ ہوتے، لیکن دُوسرا زمانہ جب فتح کا آیا اور مجرم آپؐ کے سامنے پیش کیے گئے تو اس سے آپؐ کی صفتِ رحم اور عفو کا کامل ثبوت ملا اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ آپؐ کے کام کوئی جبر پر نہ تھے۔ نہ زبردستی تھی، بلکہ ہر ایک امر اپنے طبعی رنگ میں ہوا۔ اسی طرح آپؐ کے اور بہت سے اخلاق بھی ثابت ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (حٰمٓ السجدۃ) کہ ہم اس دُنیا میں بھی اور آئندہ بھی متقی کے ولی ہیں۔ سو یہ آیت بھی تکذیب میں اُن نادانوں کے ہے۔ جنھوں نے اس زندگی میں نزولِ ملائکہ سے انکار کیا۔ اگر نزع میں نزولِ ملائکہ تھا، تو حیٰوۃ الدُّنیا میں خدا تعالیٰ کیسے ولی ہوا۔

متقی کو آئندہ کی زندگی یہیں دکھلائی جاتی ہے

سو یہ ایک نعمت ہے کہ ولیوں کو خدا کے فرشتے نظر آتے ہیں۔ آئندہ کی زندگی محض ایمانی ہے لیکن ایک متقی کو آئندہ کی زندگی یہیں دکھلائی جاتی ہے۔ اُنہیں اسی زندگی میں خدا ملتا ہے، نظر آتا ہے اور اُن سے باتیں کرتا ہے۔ سو اگر ایسی صورت کسی کو نصیب نہیں، تو اُس کا مرنا اور یہاں سے چلے جانا نہایت خراب ہے۔ ایک ولی کا قول ہے کہ جس کو ایک سچا خواب عمر میں نصیب نہیں ہوا۔ اس کا خاتمہ خطرناک ہے جیسے کہ قرآن مومن کے یہ نشان ٹھہراتا ہے۔ سنو! جس میں یہ نشان نہیں اُس میں تقویٰ نہیں۔ سو ہم سب کی یہ دُعا چاہیے کہ یہ شرط ہم میں پُوری ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام، خواب، مکاشفات کا فیضان ہو، کیونکہ مومن کا یہ خاصہ ہے۔ سو یہ ہونا چاہیے۔

بہت سی اور بھی برکات ہیں جو متقی کو ملتی ہیں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ میں جو قرآن کے شروع میں ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ دُعا مانگیں: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ (الفاتحہ ۶-۸) یعنی ہمیں وہ راہ سیدھی بتلا ان لوگوں کی جن پر تیرا انعام وفضل ہے۔ یہ اس لیے سکھلائی گئی کہ انسان عالی ہمّت ہو کر اس سے خالق کا منشاء سمجھے اور وُہ یہ ہے کہ یہ اُمّت بہائم کی طرح زندگی بسر نہ کرے، بلکہ اس کے تمام پردے کھُل جاویں۔ جیسے کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ولایت بارہ اماموں کے بعد ختم ہوگئی۔ برخلاف اس کے اس دُعا سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے سے ارادہ کر رکھا ہے کہ جو متقی ہو اور خدا کی منشاء کے مطابق ہو، تو وہ اُن مراتب کو حاصل کرسکے جو انبیاء اور اصفیاء کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انسان کو بہت سے قویٰ ملے ہیں جنھوں نے نشوونما پانا ہے اور بہت ترقی کرنا ہے۔ ہاں ایک بکرا چونکہ انسان نہیں، اس کے قویٰ ترقی نہیں کرسکتے۔ عالی ہمّت انسان جب رسُولوں اور انبیاء کے حالات سُنتا ہے کہ وُہ انعامات جو اس پاک جماعت کو حاصل ہوتے اس پر نہ صرف

ایمان ہی ہو بلکہ اُسے بتدریج ان نعماء کا علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہو جاوے۔

علم کے تین مدارج

علم کے تین مدارج ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ مثلاً ایک جگہ سے دھُواں نکلتا دیکھ کر آگ کا یقین کر لینا علم الیقین ہے۔ لیکن خود آنکھ سے آگ کا دیکھنا عین الیقین ہے۔ ان سے بڑھ کر درجہ حق الیقین کا ہے یعنی آگ میں ہاتھ ڈال کر جلن اور حرقت سے یقین کر لینا کہ آگ موجود ہے۔ پس کیسا وہ شخص بدقسمت ہے جس کو تینوں میں سے کوئی درجہ حاصل نہیں۔ اس آیت کے مطابق جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں وہ کورانہ تقلید میں پھنسا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت) جو ہماری راہ میں مجاہدہ کرے گا ہم اس کو اپنی راہیں دکھلادیں گے۔ یہ تو وعدہ ہے اور ادھر یہ دُعا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ (الفاتحہ: ۶) سو انسان کو چاہیے کہ اس کو مدِّنظر رکھ کر نماز میں دُعا بالحاح کرے اور تمنّا رکھے کہ وہ بھی ان لوگوں میں سے ہو جائے جو ترقی اور بصیرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اُٹھایا جاوے؛ فرمایا: مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (بنی اسرائیل: ۷۳) کہ جو اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہے۔ جس کی منشاء یہ ہے کہ اُس جہان کے مشاہدہ کے لیے اسی جہان سے ہم کو آنکھیں لے جانی ہیں۔ آئندہ جہان کو محسوس کرنے کے لیے حواس کی طیاری اسی جہان میں ہوگی۔ پس کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کرے اور پورا نہ کرے۔

اندھا کون ہے؟

اندھے سے مراد وہ ہے جو رُوحانی معارف اور رُوحانی لذّات سے خالی ہے۔ ایک شخص کورانہ تقلید سے کہ مُسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گیا مُسلمان کہلاتا ہے۔ دُوسری طرف اسی طرح ایک عیسائی عیسائیوں کے ہاں پیدا ہو کر عیسائی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شخص کو خدا، رسول اور قرآن کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس کی دین سے محبت بھی قابلِ اعتراض ہے۔ خدا اور رسُول کی ہتک کرنے والوں میں اس کا گذر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایسے شخص کی رُوحانی آنکھ نہیں۔ اس میں محبتِ دین نہیں۔ ورنہ محبت والا اپنے محبوب کے برخلاف کیا کچھ پسند کرتا ہے؟ غرض اللہ تعالیٰ نے سکھلایا ہے کہ میں تو دینے کو تیار ہوں اگر تو لینے کو تیار ہے۔ پس یہ دُعا کرنا ہی اس ہدایت کو لینے کی تیاری ہے۔

مُتّقی

اس دُعا کے بعد سُورہ بقرہ کے شروع میں ہی جو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ: ۳) کہا گیا، تو گویا خدا تعالےٰ نے دینے کی تیاری کی۔ یعنی یہ کتاب متقی کو کمال تک پہنچانے کا وعدہ کرتی ہے۔ سو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ان کے لیے نافع ہے جو پرہیز کرنے اور نصیحت کے سُننے کو تیار ہوں۔ اس درجہ کا متقی وہ ہے جو تخلّی بالطبع ہو کر حق کی بات سُننے کو تیار ہو۔ جیسے جب کوئی مسلمان ہوتا ہے تو وہ متقی بنتا ہے۔ جب کسی غیر مذہب کے اچھے دن آئے، تو اس میں اتّقاء پیدا ہوا۔ عُجب، غرور، پندار دُور ہوا۔ یہ تمام روکیں تھیں جو دُور ہو گئیں۔ ان کے دُور ہونے سے تاریک گھر کی

کھڑکی کھل گئی اور شعاعیں اندر داخل ہوگئیں۔

یہ جو فرمایا کہ یہ کتاب متقین کی ہدایت ہے، یعنی ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ تو اِتّقَاجو اِفْتِعَال کے باب سے ہے اور یہ باب تکلف کے لیے آتا ہے، یعنی اس میں اشارہ ہے کہ جس قدر یہاں ہم تقویٰ چاہتے ہیں وہ تکلف سے خالی نہیں، جس کی حفاظت کے لیے اس کتاب میں ہدایات ہیں۔ گویا متقی کو نیکی کرنے میں تکلیف سے کام لینا پڑتا ہے۔

عبدِ صالح

جب یہ گذر جاتا ہے تو سالک عبدِ صالح ہو جاتا ہے۔ گویا تکلیف کا رنگ دُور ہوا۔ اور صالح نے طبعاً وفطرتاً نیکی شروع کی۔ وہ ایک قسم کے دارالامان میں ہے، جس کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب کُل جنگ اپنے نفسانی جذبات کے برخلاف ختم ہو چکے ہیں اور وُہ امن میں آگیا اور ہر ایک قسم کے خطرات سے پاک ہوگیا۔ اسی امر کی طرف ہمارے ہادیٔ کامل ؐ نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا کہ ہر ایک کے ساتھ شیطان ہوتا ہے، لیکن میرا شیطان مُسلم ہو گیا ہے۔ سو متقی کو ہمیشہ شیطان کے مقابل جنگ ہے، لیکن جب وُہ صالح ہو جاتا ہے، تو کُل جنگیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک ریا ہی ہے، جس سے اُسے آٹھوں پہر جنگ ہے۔ متقی ایک ایسے میدان میں ہے، جہاں ہر وقت لڑائی ہے۔ اللہ کے فضل کا ہاتھ اُس کے ساتھ ہو، تو اُسے فتح ہو۔ جیسے ریا، جس کی چال ایک چیونٹی کی طرح ہے، بعض وقت انسان بے سمجھے لیکن موقعہ پر ریا کو دل میں پیدا ہونے کا موقعہ دے دیتا ہے۔ مثلاً ایک کا چاقو گم ہو جاوے اور وُہ دُوسرے سے دریافت کرے تو اس موقعہ پر ایک متقی کا جنگ شیطان سے شروع ہو جاتا ہے، جو اُسے سکھاتا ہے کہ اس طرح دریافت کرنا ایک قسم کی بے عزتی ہے، جس سے اس کے افروختہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ آپس میں لڑائی بھی ہو جاوے۔ اس موقعہ پر ایک متقی کو اپنے نفس کی بدخواہش سے جنگ ہے۔ اگر اس شخص میں محض للہ دیانت موجود ہو تو غصہ کرنے کی اس کو ضرورت ہی کیا ہے، کیونکہ دیانت جس قدر مخفی رکھی جائے۔ اسی قدر بہتر ہے۔ مثلاً ایک جوہری کو راستہ میں چند چور مل جاویں اور چور آپس میں اس کے متعلق مشورہ کریں۔ بعض اُسے دولت مند بتلاویں اور بعض کہیں وہ کنگال ہے۔ اب مقابلتاً یہ جوہری انہیں کو پسند کریگا جو اُسے کنگال ظاہر کریں گے۔

اعمال میں اخفا اچھا ہے

اسی طرح یہ دُنیا کیا ہے۔ ایک قسم کی دارالابتلا ہے۔ وہی اچھا ہے، جو ہر ایک امر خفیہ رکھے اور ریا سے بچے۔ وہ لوگ جن کے اعمال للّٰہی ہوتے ہیں وہ کسی پر اپنے اعمال ظاہر ہونے نہیں دیتے یہی لوگ متقی ہیں۔

مَیں نے تذکرۃ الاولیا میں دیکھا ہے کہ ایک مجمع میں ایک بزرگ نے سوال کیا کہ اس کو کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کوئی اس کی مدد کرے۔ ایک نے صالح سمجھ کر اُس کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ اُنھوں نے روپیہ لے کر اس کی سخاوت اور فیاضی کی تعریف کی۔ اس بات پر وُہ رنجیدہ ہوا کہ جب یہاں ہی تعریف ہوگئی تو شاید ثوابِ آخرت سے محرومیت ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وُہ آیا اور کہا کہ وہ روپیہ اس کی والدہ کا تھا جو دینا نہیں چاہتی، چنانچہ وہ روپیہ واپس دیا گیا۔ جس پر ہر ایک

لعنت کی اور کہا کہ جھوٹا ہے۔ اصل میں روپیہ دینا نہیں چاہتا۔ جب شام کے وقت وہ بزرگ گھر گیا۔ تو وُہ شخص ہزار روپیہ اس کے پاس لایا اور کہا کہ آپ نے سرِعام میری تعریف کر کے مجھے محرومِ ثواب آخرت کیا، اس لیے مَیں نے یہ بہانہ کیا۔ اب یہ روپیہ آپ کا ہے لیکن آپ کسی کے آگے نام نہ لیں۔ بزرگ رو پڑا اور کہا کہ اب تُو قیامت تک موردِ لعن طعن ہوا، کیونکہ کل کا واقعہ سب کو معلوم ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ تُو نے مجھے روپیہ واپس دیدیا ہے۔

ایک متقی تو اپنے نفسِ اَمّارہ کے برخلاف جنگ کر کے اپنے خیال کو چھپاتا ہے اور خفیہ رکھتا ہے، لیکن اللہ تعالےٰ اس خفیہ خیال کو ہمیشہ ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ایک بدمعاش کسی بدچلنی کا مرتکب ہو کر خفیہ رہنا چاہتا ہے، اسی طرح ایک متقی چھپ کر نماز پڑھتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کوئی اُس کو دیکھ لے۔ سچا متقی ایک قسم کا سَتر چاہتا ہے۔ تقویٰ کے مراتب بہت ہیں، لیکن بہرحال تقویٰ کے لیے تکلف ہے اور متقی حالتِ جنگ میں ہے اور صالح اس جنگ سے باہر ہے۔ جیسے کہ مَیں نے مثال کے طور پر اُوپر ریا کا ذکر کیا ہے، جس سے متقی کو آٹھوں پہر جنگ ہے۔

ریا، اور حِلم کا جنگ

بسا اوقات ریا، اور حِلم کا جنگ ہو جاتا ہے۔ کبھی انسان کا غصہ کتاب اللہ کے برخلاف ہوتا ہے۔ گالی سُن کر اُس کا نفس جوش مارتا ہے۔ تقویٰ اُس کو سکھلاتا ہے کہ وہ غصہ کرنے سے باز رہے۔ جیسے قرآن کہتا ہے : وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (الفرقان ۷۳) ایسا ہی بے صبری کے ساتھ اُسے اکثر جنگ کرنا پڑتا ہے۔ بے صبری سے مُراد یہ ہے کہ اُس کو راہِ تقویٰ میں اس قدر دِقتوں کا مقابلہ ہے کہ مشکل سے وُہ منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے، اس لیے بے صبر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک کنواں پچاس ہاتھ تک کھودنا ہے۔ اگر دو چار ہاتھ کے بعد کھودنا چھوڑ دیا جائے، تو محض یہ ایک بدظنی ہے۔ اب تقویٰ کی شرط یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے احکام دیئے، اُن کو اخیر تک پہنچائے اور بے صبر نہ ہو جائے۔

راہِ سلوک میں مُبارک قدم دوگروہ ہیں

راہِ سلوک میں مُبارک قدم دوگروہ ہیں۔ ایک دین العجائز والے جو موٹی موٹی باتوں پر قدم مارتے ہیں۔ مثلاً احکامِ شریعت کے پابند ہو گئے اور نجات پاگئے۔ دُوسرے وُہ جنھوں نے آگے قدم مارا۔ ہرگز نہ تھکے اور چلتے گئے، حتیٰ کہ منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ لیکن نامُراد وُہ فرقہ ہے کہ دین العجائز سے تو قدم آگے رکھا، لیکن منزلِ سلوک کو طے نہ کیا۔ وہ ضرور دہریہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو نمازیں بھی پڑھتے رہے۔ چلہ کشیاں بھی کیں لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا۔ جیسے ایک شخص منصور مسیح نے بیان کیا کہ اُس کی عیسائیت کا باعث یہی تھا کہ وہ مُرشدوں کے پاس گیا، چلہ کشی کرتا رہا، لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا، تو بدظن ہو کر عیسائی ہو گیا۔

صدق و صبر

سو جو لوگ بے صبری کرتے ہیں، وُہ شیطان کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔ سو متقی کو بے صبری کے ساتھ بھی جنگ ہے۔ بوستان میں ایک عابد کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب کبھی وہ عبادت کرتا

تو ہاتف یہی آواز دیتا کہ تو مردود و مخذول ہے۔ ایک دفعہ ایک مُرید نے یہ آواز سُن لی اور کہا کہ اب تو فیصلہ ہوگیا۔ اب ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ بہت رویا اور کہا کہ مَیں اُس جناب کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ اگر ملعون ہوں، تو ملعون ہی سہی۔ غنیمت ہے کہ مجھ کو ملعون تو کہا جاتا ہے۔ ابھی یہ باتیں مرید سے ہو ہی رہی تھیں کہ آواز آئی کہ تو مقبول ہے۔ سو یہ سب صدق و صبر کا نتیجہ تھا جو متقی میں ہونا شرط ہے۔

اِستقامت

یہ جو فرمایا ہے کہ ؛ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۷۰) یعنی ہمارے راہ کے مجاہد راستہ پاویں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس راہ میں پیمبر کے ساتھ مِل کر جدّ و جہد کرنا ہوگا۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد بھاگ جانا مجاہد کا کام نہیں۔ بلکہ جان دینے کے لیے تیار رہنا اس کا کام ہے۔ سو متقی کی نشانی اِستقامت ہے۔ جیسے کہ فرمایا ؛ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حٰمٓ السجدہ ۳۱) یعنی جنھوں نے کہا کہ ربّ ہمارا اللہ ہے اور استقامت دکھائی اور ہر طرف سے مُنہ پھیر کر اللہ کو ڈھونڈا۔ مطلب یہ کہ کامیابی اِستقامت پر موقوف ہے اور وہ اللہ کو پہچاننا اور کسی ابتلا اور زلازل اور امتحان سے نہ ڈرنا ہے۔ ضرور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مَوردِ مخاطبہ و مکالمہ الٰہی انبیاء کی طرح ہوگا۔

ولی بننے کیلئے ابتلا ضروری ہیں

بہت سے لوگ یہاں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پھونک مار کر عرش پر پہنچ جائیں اور واصلین سے ہو جاویں۔ ایسے لوگ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ وہ انبیاء کے حالات کو دیکھیں۔ یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ کسی ولی کے پاس جا کر صدہا ولی فی الفور بن گئے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے ؛ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (العنکبوت ۳) جبتک انسان آزمایا نہ جاوے فتن میں نہ ڈالا جاوے، وہ کب ولی بن سکتا ہے۔

ایک مجلس میں بایزیدؒ وعظ فرما رہے تھے۔ وہاں ایک مشائخ زادہ بھی تھا، جو ایک لمبا سِلسلہ رکھتا تھا۔ اس کو آپؒ سے اندرونی بغض تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خاصہ ہے کہ پُرانے خاندانوں کو چھوڑ کر کسی اور کو لے لیتا ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسمٰعیل کو لے لیا۔ کیونکہ وہ لوگ عیش و عشرت میں پڑ کر خدا کو بھول گئے ہوتے ہیں۔ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ (آل عمران ۱۴۱) سو اس شیخ زادے کو خیال آیا کہ یہ ایک معمولی خاندان کا آدمی ہے۔ کہاں سے ایسا صاحبِ خوارق آ گیا کہ لوگ اس کی طرف جھکتے ہیں اور ہماری طرف نہیں آتے۔ یہ باتیں خدا تعالیٰ نے حضرت بایزیدؒ پر ظاہر کیں، تو اُنھوںؒ نے قصّہ کے رنگ میں یہ بیان شروع کیا کہ ایک جگہ مجلس میں رات کے وقت ایک لیمپ میں پانی سے ملا ہوا تیل جل رہا تھا۔ تیل اور پانی میں بحث ہوئی۔ پانی نے تیل کو کہا کہ تو کثیف اور گندہ ہے اور باوجود کثافت کے میرے اُوپر آتا ہے۔ مَیں ایک مصفّا چیز ہوں اور طہارت کے لیے استعمال کیا جاتا ہوں لیکن نیچے ہوں۔ اس کا باعث کیا ہے؟ تیل نے کہا کہ جس قدر صعوبتیں مَیں نے کھینچی ہیں، تو نے وہ کہاں جھیلی ہیں۔ جس کے باعث یہ

بلندی مجھے نصیب ہوئی۔ ایک زمانہ تھا، جب مَیں بویا گیا، زمین میں مخفی رہا، خاکسار ہوا۔ پھر خدا کے ارادہ سے بڑھا بڑھنے نہ پایا کہ کاٹا گیا۔ پھر طرح طرح کی مشقتوں کے بعد صاف کیا گیا۔ کولہو میں پیسا گیا۔ پھر تیل بنا اور آگ لگائی گئی۔ کیا ان مصائب کے بعد بھی بلندی حاصل نہ کرتا؟

یہ ایک مثال ہے کہ اہلِ اللہ مصائب و شدائد کے بعد درجات پاتے ہیں۔ لوگوں کا یہ خیال خام ہے کہ فلاں شخص فلاں کے پاس جاکر بلا مجاہدہ و تزکیہ ایک دم میں صدیقین میں داخل ہوگیا۔ قرآن شریف کو دیکھو کہ خدا کس طرح تم پر ظاہر ہوا، جبتک نبیوں کی طرح تم پر مصائب و زلازل نہ آویں، جنھوں نے بعض وقت تنگ آکر یہ بھی کہہ دیا۔ حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ (البقرہ: ۲۱۵) اللہ کے بندے ہمیشہ بلاؤں میں ڈالے گئے۔ پھر خدا نے ان کو قبول کیا۔

ترقیات کی دو راہیں

سلوک صوفیوں نے ترقیات کی دو راہیں لکھی ہیں۔ ایک سلوک دوسرا جذب۔ سلوک وہ ہے جو لوگ آپ عقلمندی سے سوچ کر اللہ و رسول کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسے فرمایا، قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ (آلِ عمران: ۳۲) یعنی اگر تم اللہ کے پیارے بننا چاہتے ہو، تو رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرو۔ وہ ہادیٔ کامل وہی رسول ہیں جنھوں نے وہ مصائب اُٹھائیں کہ دنیا اپنے اندر نظیر نہیں رکھتی۔ ایک دن بھی آرام نہ پایا۔ اب پیروی کرنیوالے بھی حقیقی طور سے وہی ہوں گے۔ جو اپنے متبوع کے ہر قول و فعل کی پیروی پوری جدّ و جُہد سے کریں۔ متبع وہی ہے جو سب طرح پیروی کرے گا۔ سہل انگار اور سست گذار کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے غضب میں آوے گا۔ یہاں جو اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تو سالک کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اوّل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل تاریخ دیکھے اور پھر پیروی کرے۔ اسی کا نام سلوک ہے۔ اس راہ میں بہت مصائب و شدائد ہوتے ہیں ان سب کو اُٹھانے کے بعد ہی انسان سالک ہوتا ہے۔

جذب اہلِ جذب کا درجہ سالکوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلوک کے درجہ پر ہی نہیں رکھتا، بلکہ خود اُن کو مصائب میں ڈالتا اور جاذبۂ ازلی سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کُل انبیاء مجذوب ہی تھے۔

جس وقت انسانی روح کو مصائب کا مقابلہ ہوتا ہے اُن سے فرسودہ کار اور تجربہ کار ہوکر روح چمک اُٹھتی ہے۔ جیسے کہ لوہا یا شیشہ اگرچہ چمک کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن صیقلوں کے بعد ہی مجلّٰی ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس میں منہ دیکھنے والے کا منہ نظر آجاتا ہے۔ مجاہدات بھی صیقل کا ہی کام کرتے ہیں۔ دل کا صیقل یہاں تک ہونا چاہیئے کہ اُس میں سے بھی منہ نظر آجاوے۔ منہ کا نظر آنا کیا ہے؟ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کا مصداق ہونا۔ سالک کا دل آئینہ ہے جس کو مصائب شدائد

اس قدر صیقل کر دیتے ہیں کہ اخلاق الٰہی اُس میں منعکس ہو جاتے ہیں اور یہ اُس وقت ہوتا ہے۔ جب بہت مجاہدات اور تزکیوں کے بعد اس کے اندر کسی قسم کی کدورت یا کثافت نہ رہے تب یہ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ ہر ایک مومن کو ایک حد تک ایسی صفائی کی ضرورت ہے۔ کوئی مومن بلا آئینہ ہونے کے نجات نہ پائیگا۔ سلوک والا خود یہ صیقل کرتا ہے، اپنے کام سے مصائب اُٹھاتا ہے۔ لیکن جذب والا مصائب میں ڈالا جاتا ہے۔ خدا خود اُس کا مُصقل ہوتا ہے اور طرح طرح کے مصائب وشدائد سے صیقل کر کے اس کو آئینہ کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔ دراصل سالک ومجذوب دونوں کا ایک ہی نتیجہ ہے سو متقی کے دو حصے ہیں سلوک وجذب ؂

ایمان بالغیب تقویٰ جیسا کہ میں بیان کر آیا ہوں، کسی قدر تکلف کو چاہتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ: ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (البقرۃ ۳،۴) اس میں ایک تکلف ہے۔ مشاہدہ کے مقابل ایمان بالغیب لانا ایک قسم کے تکلف کو چاہتا ہے۔ سو متقی کے لیے ایک حد تک تکلف ہے، کیونکہ جب وہ صالح کا درجہ حاصل کرتا ہے تو پھر غیب اُس کے لیے غیب نہیں رہتا، کیونکہ صالح کے اندر سے ایک نہر کھلتی ہے، جو اس میں سے نکل کر خدا تک پہنچتی ہے۔ وہ خدا اور اُس کی محبت کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے کہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی۔ (بنی اسرائیل ۷۳:) اسی سے ظاہر ہے کہ جبتک انسان پوری روشنی اِسی جہان میں نہ حاصل کرے۔ وہ کبھی خدا کا مُنہ نہ دیکھے گا۔ سو متقی کا یہی کام ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے سُرمے تیار کرتا رہے، جس سے اس کا رُوحانی نزول الماء دُور ہو جائے۔ اب اس سے ظاہر ہے کہ متقی شروع میں اندھا ہوتا ہے۔ مختلف کوششوں اور تزکیوں سے وہ نُور حاصل کرتا ہے پس جب سوجاکھا ہوگیا اور صالح بن گیا۔ پھر ایمان بالغیب نہ رہا اور تکلف بھی ختم ہو گیا۔ جیسے کہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برأی العین اسی عالم میں بہشت و دوزخ وغیرہ سب کچھ مشاہدہ کرایا گیا۔ جو متقی کو ایک ایمان بالغیب کے رنگ میں ماننا پڑتا ہے، وہ تمام آپؐ کے مشاہدہ میں آگیا۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ متقی اگرچہ اندھا ہے اور تکلف کی تکلیف میں ہے، لیکن صالح ایک دارالامان میں آگیا ہے اور اُس کا نفس نفسِ مطمئنہ ہو گیا ہے۔ متقی اپنے اندر ایمان بالغیب کی کیفیت رکھتا ہے۔ وہ اندھا دُھند طریق سے چلتا ہے۔ اُس کو کچھ خبر نہیں۔ ہر ایک بات پر اُس کا ایمان بالغیب ہے۔ یہی اُس کا صدق ہے اور اس صدق کے مقابل خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وُہ فلاح پائیگا۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (البقرۃ ۶:)

اقامتِ صلوٰۃ اس کے بعد متقی کی شان میں آیا ہے۔ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ۔ (البقرۃ ۴:) یعنی وُہ نماز کو کھڑی کرتا ہے۔ یہاں لفظ کھڑی کرنے کا آیا ہے۔ یہ بھی اس تکلف کی طرف اشارہ کرتا ہے جو متقی کا کا خاصہ ہے۔ یعنی جب وہ نماز شروع کرتا ہے تو طرح طرح کے وساوس کا اُسے مقابلہ ہوتا ہے جن کے باعث اسکی نماز گویا بار بار گری پڑتی ہے، جس کو اُس نے کھڑا کرتا ہے۔ جب اس نے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا تو ایک ہجوم وساوس ہے جو

اُس کے حضورِ قلب میں تفرق ڈال رہا ہے۔ وُہ اُن سے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے پریشان ہوتا ہے۔ ہرچند حضور و ذوق کے لیے لڑتا مرتا ہے، لیکن نماز جو گری پڑتی ہے۔ بڑی جان کنی سے اُسے کھڑا کرنے کی فکر میں ہے۔ بار بار اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہہ کر نماز کے قائم کرنے کے لیے دُعا مانگتا ہے اور ایسے الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی ہدایت چاہتا ہے جس سے اُس کی نماز کھڑی ہو جائے۔ ان وساوس کے مقابل میں متقی ایک بچہ کی طرح ہے، جو خدا کے آگے گڑگڑاتا ہے۔ روتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (الاعراف: ۱۷۷) ہو رہا ہوں۔ سو یہی وُہ جنگ ہے جو متقی کو نماز میں نفس کے ساتھ کرنی ہوتی ہے اور اسی پر ثواب مترتب ہوگا۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نماز میں وساوس کو فی الفور دُور کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کی منشاء کچھ اور ہے۔ کیا خدا نہیں جانتا؟ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا قول ہے کہ ثواب اُسوقت تک ہے جبتک مجاہدات ہیں اور جب مجاہدات ختم ہوئے، تو ثواب ساقط ہو جاتا ہے۔ گویا صوم وصلوٰۃ اُس وقت تک اعمال ہیں جبتک ایک جدوجہد سے وساوس کا مقابلہ ہے لیکن جب اُن میں ایک اعلیٰ درجہ پیدا ہو گیا اور صاحب صوم و صلوٰۃ تقویٰ کے تکلف سے بچکر صلاحیت سے رنگین ہو گیا، تو اب صوم وصلوٰۃ اعمال نہیں رہے۔ اس موقعہ پر اُنھوں نے سوال کیا کہ کیا اب نماز معاف ہو جاتی ہے؟ کیونکہ ثواب تو اس وقت تھا جس وقت تک تکلف کرنا پڑتا تھا۔ سو بات یہ ہے کہ نماز اب عمل نہیں بلکہ ایک انعام ہے۔ یہ نماز اُس کی ایک غذا ہے، جو اس کے لیے قُرَّةُ الْعَيْن ہے۔ یہ گویا نقد بہشت ہے۔

مقابل میں وہ لوگ جو مجاہدات میں ہیں۔ وہ کُشتی کر رہے ہیں۔ اور یہ نجات پا چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا سلوک جب ختم ہوا، تو اُس کے مصائب بھی ختم ہو گئے۔ مثلاً ایک مُخنّث اگر یہ کہے کہ وہ کبھی کسی عورت کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا، تو وُہ کونسی نعمت یا ثواب کا مستحق ہے۔ اُس میں تو صفتِ بدنظری ہے ہی نہیں، لیکن اگر ایک مرد صاحب رجولیت ایسا کرے تو ثواب پائیگا۔ اسی طرح انسان کو ہزاروں مقامات طے کرنے پڑتے ہیں۔ بعض بعض اُمور میں اُس کی مشاقی اُس کو قادر کر دیتی ہے۔ نفس کے ساتھ اس کی مصالحت ہو گئی۔ اب وہ ایک بہشت میں ہے، لیکن وہ پہلا سا ثواب نہیں رہے گا۔ وہ ایک تجارت کر چکا ہے۔ جس کا وُہ نفع اُٹھا رہا ہے، لیکن پہلا رنگ نہ رہے گا۔ انسان میں ایک فعل تکلف سے کرتے کرتے طبیعت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک شخص جو طبعی طور سے لذت پاتا ہے، وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اُس کام سے ہٹایا جاوے۔ وُہ طبعًا یہاں سے ہٹ نہیں سکتا۔ سو اتقا اور تقویٰ کی حد تک پُورا انکشاف نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک قسم کا دعویٰ ہے۔

انفاق من رزق اللہ

اس کے بعد متقی کی شان میں وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرۃ: ۴) آیا ہے۔ یہاں متقی کے لیے مِمَّا کا لفظ استعمال کیا، کیونکہ اُس وقت وہ ایک اعمیٰ کی حالت

میں ہے، اس لیے جو کچھ خدا نے اُس کو دیا، اس میں سے کچھ خدا کے نام کا دیا۔ حق یہ ہے کہ اگر وہ آنکھ رکھتا، تو دیکھ لیتا کہ اس کا کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ خدا تعالیٰ کا ہی ہے۔ یہ ایک حجاب تھا جو اِتقا میں لازمی ہے۔ اِس حالتِ اِتقا کے تقاضے نے متقی سے خدا کے دیئے میں سے کچھ دلوایا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایامِ وفات میں دریافت فرمایا کہ گھر میں کچھ ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک دینار تھا۔ فرمایا کہ یہ سیرتِ یگانگت سے بعید ہے کہ ایک چیز بھی اپنے پاس رکھی جاوے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اِتقا کے درجہ سے گزر کر صلاحیت تک پہنچ چکے تھے، اس لیے مِمَّا ان کی شان میں نہ آیا۔ کیونکہ وہ شخص اندھا ہے جس نے کچھ اپنے پاس رکھا اور کچھ خدا کو دیا، لیکن یہ لازمہ متقی تھا، کیونکہ خدا کی راہ میں دینے سے بھی اُسے نفس کے ساتھ جنگ تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ دیا اور کچھ رکھا۔ ہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ خدا کی راہ میں دیدیا اور اپنے لیے کچھ نہ رکھا۔

جیسے دھرم مہوتسو کے مضمون میں انسان کی تین حالتیں ذکر کی گئی ہیں، جو انسان پر ابتداء سے انتہا تک وارد ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی قرآنِ کریم نے جو انسان کو تمام مراحل ترقی کے طے کرانے آیا۔ اِتقا سے شروع کیا۔ یہ ایک تکلف کا راستہ ہے۔ یہ ایک خطرناک میدان ہے۔ اُس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور مقابل بھی تلوار ہے۔ اگر بچ گیا تو نجات پا گیا۔ ورنہ اَسْفَلِ السَّافِلِین میں پڑ گیا؛ چنانچہ یہاں متقی کی صفات میں یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ ہم دیتے ہیں، اسے سب کا سب خرچ کر دیتا ہے۔ متقی میں اس قدر ایمانی طاقت نہیں ہوتی جو نبی کی شان ہوتی ہے کہ وہ ہمارے ہادیٔ کامل کی طرح کُل کا کُل خدا کا دیا ہوا خدا کو دیدے۔ اسی لیے پہلے مختصر سا ٹیکس لگایا گیا، تاکہ چاشنی چکھ کر زیادہ ایثار کے لیے تیار ہو جاوے۔

رزق سے مُراد

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ (البقرہ ۴:) رزق سے مراد صرف مال نہیں، بلکہ جو کچھ ان کو عطا ہوا۔ علم، حکمت، طبابت۔ یہ سب رزق میں ہی شامل ہے۔ اس کو اسی میں سے خدا کی راہ میں بھی خرچ کرنا ہے۔

تدریج کے ساتھ تعلیم کی تکمیل

انسان نے اس راہ میں بتدریج اور زینہ بہ زینہ ترقی کرنی ہے۔ اگر انجیل کی طرح یہ تعلیم ہوتی کہ گال پر طمانچہ کھا کر دُوسرے طمانچہ کے لیے گال آگے رکھ دی جاوے۔ یا سب کچھ دیدیا جاوے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح تعلیم کے ناممکن التعمیل ہونے کے باعث ثواب سے محروم رہتے۔ لیکن قرآن شریف تو حسبِ فطرتِ انسانی آہستہ آہستہ ترقی کراتا ہے۔ انجیل کی مثال تو اُس لڑکے کی ہے جو مکتب میں داخل ہوتے ہی بڑی مشکل کتاب پڑھنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ الحکیم ہے۔ اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہونا چاہیے تھا کہ تدریج کے ساتھ تعلیم کی تکمیل ہو۔

اس کے بعد متقی کے لیے فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرہ ۵:) یعنی وہ متقی ہوتے ہیں جو پہلی نازل شدہ کُتب پر اور تجھ پر جو کتاب نازل ہوئی، اس پر ایمان لاتے اور آخرت

پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ امر بھی تکلف سے خالی نہیں۔ ابھی تک ایمان ایک محجوبیت کے رنگ میں ہے متقی کی آنکھیں معرفت اور بصیرت کی نہیں۔ اس نے تقویٰ سے شیطان کا مقابلہ کر کے ابھی تک ایک بات کو مان لیا ہے۔ یہی حال اس وقت ہماری جماعت کا ہے۔ اُنھوں نے بھی تقویٰ سے مانا تو ہے۔ پر ابھی تک وُہ نہیں جانتے کہ یہ جماعت کہاں تک نشوونما الٰہی ہاتھوں سے پانے والی ہے۔ سو یہ ایک ایمان ہے جو بالآخر فائدہ رساں ہوگا۔

یقین کا لفظ جب عام طور پر استعمال ہو، تو اس سے مُراد اس کا اَدنیٰ درجہ ہوتا ہے یعنی علم کے تین مدارج میں سے اَدنیٰ درجہ کا علم یعنی علم الیقین۔ اس درجہ پر اتقاد لاہوتا ہے مگر بعد اس کے عین الیقین اور حق الیقین کا مرتبہ بھی تقویٰ کے مراحل طے کرنے کے بعد حاصل کر لیتا ہے۔

تقویٰ کوئی چھوٹی چیز نہیں۔ اس کے ذریعہ سے اُن تمام شیطانوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے جو انسان کی ہر ایک اندرونی طاقت و قوت پر غلبہ پاتے ہوتے ہیں۔ یہ تمام قوتیں نفسِ امارہ کی حالت میں انسان کے اندر شیطان ہیں۔ اگر اصلاح نہ پائیں گی، تو انسان کو غلام کر لیں گی۔ علم و عقل ہی بُرے طور پر استعمال ہو کر شیطان ہو جاتے ہیں۔ متقی کا کام اُن کی اور ایسا ہی اور دیگر کُل قویٰ کی تعدیل کرنا ہے۔

سچا مذہب انسانی قویٰ کا مُربّی ہوتا ہے

ایسا ہی جو لوگ انتقام، غضب یا نکاح کو ہر حال میں بُرا مانتے ہیں، وُہ بھی صحیفۂ قدرت کے مخالف ہیں اور قویٰ انسانی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ سچا مذہب وُہی ہے جو انسانی قویٰ کا مُربّی ہو، نہ کہ اُن کا استیصال کرے۔ رجولیت یا غضب جو خدا تعالیٰ کی طرف سے فطرتِ انسانی میں رکھے گئے ہیں۔ ان کو چھوڑنا خدا کا مقابلہ کرنا ہے۔ جیسے تارک الدُّنیا ہونا یا راہب بن جانا۔ یہ تمام اُمور حق العباد کو تلف کرنے والے ہیں۔ اگر یہ امر ایسا ہی ہوتا، تو گویا اُس خدا پر اعتراض ہے جس نے یہ قویٰ ہم میں پیدا کیے — پس ایسی تعلیمات جو انجیل میں ہیں اور جن سے قویٰ کا استیصال لازم آتا ہے، ضلالت تک پہنچاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اُس کی تعدیل کا حکم دیتا ہے ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ جیسے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ۔ الخ (النحل: ۹۱) عدل ایک ایسی چیز ہے جس سے سب کو فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ حضرت مسیح کا یہ تعلیم دینا کہ اگر تو بُری آنکھ سے دیکھے، تو آنکھ نکال ڈال۔ اس میں بھی قویٰ کا استیصال ہے، کیونکہ ایسی تعلیم نہ دی کہ تو غیر محرم عورت کو ہرگز نہ دیکھ، مگر بر خلاف اس کے اجازت دی کہ دیکھ تو ضرور، لیکن زنا کی آنکھ سے نہ دیکھ۔ دیکھنے سے تو ممانعت ہے ہی نہیں۔ دیکھے گا تو ضرور، بعد دیکھنے کے دیکھنا چاہیے کہ اس کے قویٰ پر کیا اثر ہوگا۔ کیوں نہ قرآن شریف کی طرح آنکھ کو ٹھوکر والی چیز ہی کے دیکھنے سے روکا۔ اور آنکھ جیسی مُفید اور قیمتی چیز کو ضائع کر دینے کا افسوس لگایا۔

اسلامی پردہ

آج کل پردہ پر حملے کیے جاتے ہیں، لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ اسلامی پردہ سے مُراد زندان نہیں، بلکہ ایک قسم کی روک ہے کہ غیر مرد اور عورت ایک دُوسرے کو نہ دیکھ سکے جب

پردہ ہوگا، ٹھوکر سے بچیں گے۔ ایک مُنصف مزاج کہہ سکتا ہے کہ ایسے لوگوں میں جہاں غیر مرد و عورت اکٹھے بلا تامّل اور بے محابا مل سکیں، سیریں کریں۔ کیونکر جذباتِ نفس سے اضطراراً ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ بسا اوقات سُننے اور دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی قومیں غیر مرد اور عورت کے ایک مکان میں تنہا رہنے کو حالانکہ دروازہ بھی بند ہو، کوئی عیب نہیں سمجھتیں۔ یہ گویا تہذیب ہے۔ انہی بد نتائج کو روکنے کے لیے شارعِ اسلام نے وُہ باتیں کرنے کی اجازت ہی نہ دی، جو کسی کی ٹھوکر کا باعث ہوں۔ ایسے موقعہ پر یہ کہدیا کہ جہاں اس طرح غیر محرم مرد و عورت ہر دو جمع ہوں، تیسرا اُن میں شیطان ہوتا ہے۔ اُن ناپاک نتائج پر غور کرو۔ جو یورپ اس خلیعُ الرّسن تعلیم سے بُھگت رہا ہے۔ بعض جگہ بالکل قابلِ شرم طوائفانہ زندگی بسر کی جا رہی ہے۔ یہ انہیں تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی چیز کو خیانت سے بچانا چاہتے ہو تو حفاظت کرو۔ لیکن اگر حفاظت نہ کرو۔ اور یہ سمجھ رکھو کہ بھلے مانس لوگ ہیں، تو یاد رکھو کہ ضرور وہ چیز تباہ ہوگی۔ اِسلامی تعلیم کیسی پاکیزہ تعلیم ہے کہ جس نے مرد و عورت کو الگ رکھ کر ٹھوکر سے بچایا اور انسان کی زندگی حرام اور تلخ نہیں کی جس کے باعث یورپ نے آئے دن کی خانہ جنگیاں اور خودکُشیاں دیکھیں۔ بعض شریف عورتوں کا طوائفانہ زندگی بسر کرنا ایک عملی نتیجہ اس اجازت کا ہے جو غیر عورت کو دیکھنے کے لیے دی گئی۔

انسانی قویٰ کی تعدیل اور جائز استعمال

اللہ تعالیٰ نے جس قدر قویٰ عطا فرمائے، وہ ضائع کرنے کے لیے نہیں دیئے گئے اُن کی تعدیل اور جائز استعمال کرنا ہی اُن کی نشوونما ہے۔ اسی لیے اسلام نے قوائے رجولیت یا آنکھ کے نکالنے کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ ان کا جائز استعمال اور تزکیۂ نفس کرایا۔ جیسے فرمایا: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (المؤمنون ۲:) اور ایسے ہی یہاں بھی فرمایا۔ متقی کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر آخر میں بطور نتیجہ یہ کہا۔ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (البقرہ ۶:) یعنی وُہ لوگ جو تقویٰ پر قدم مارتے ہیں۔ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ نماز ڈگمگاتی ہے۔ پھر اُسے کھڑا کرتے ہیں۔ خُدا کے دیئے ہوئے سے دیتے ہیں۔ باوجود خطراتِ نفس بلا سوچے، گذشتہ اور موجودہ کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور آخر کار وہ یقین تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت کے سر پر ہیں۔ وہ ایک ایسی سڑک پر ہیں جو برابر آگے کو جا رہی ہے اور جس سے آدمی فلاح تک پہنچتا ہے۔ پس یہی لوگ فلاح یاب ہیں جو منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے اور راہ کے خطرات سے نجات پا چکے ہیں، اس لیے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں تقویٰ کی تعلیم دے کر ایک ایسی کتاب ہم کو عطا کی جس میں تقویٰ کے وصایا بھی دیئے۔

سو ہماری جماعت یہ غم کُل دینوی غموں سے بڑھ کر اپنی جان پر لگائے کہ اُن میں تقویٰ ہے یا نہیں۔

اپنی زندگی غربت اور مسکینی میں بسر کرو

اہلِ تقویٰ کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اپنی زندگی غربت اور مسکینی میں بسر کریں۔ یہ تقویٰ کی ایک شاخ ہے، جس کے ذریعہ سے ہمیں ناجائز غضب کا مقابلہ کرنا ہے۔ بڑے بڑے عارف اور صدیقوں کے لیے آخری اور کڑی منزل غضب سے بچنا

ہی ہے۔ عُجب و پندار غضب سے پیدا ہوتا ہے اور ایسا ہی کبھی خود غضب عُجب و پندار کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ غضب اس وقت ہوگا۔ جب انسان اپنے نفس کو دُوسرے پر ترجیح دیتا ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ میری جماعت والے آپس میں ایک دُوسرے کو چھوٹا یا بڑا سمجھیں، یا ایک دُوسرے پر غرور کریں یا نظرِ استخفاف سے دیکھیں۔ خدا جانتا ہے کہ بڑا کون ہے یا چھوٹا کون ہے۔ یہ ایک قسم کی تحقیر ہے۔ جس کے اندر حقارت ہے۔ ڈر ہے کہ یہ حقارت بیج کی طرح بڑھے اور اس کی ہلاکت کا باعث ہو جائے۔ بعض آدمی بڑوں کو مل کر بڑے ادب سے پیش آتے ہیں، لیکن بڑا وہ ہے جو مسکین کی بات کو مسکینی سے سُنے۔ اس کی دلجوئی کرے۔ اس کی بات کی عزت کرے۔ کوئی چِڑ کی بات مُنہ پر نہ لاوے کہ جس سے دُکھ پہنچے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ۔ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (الحجرات: ۱۲) تم ایک دُوسرے کا چِڑ کے نام نہ لو۔ یہ فعل فسّاق و فجّار کا ہے۔ جو شخص کسی کو چِڑاتا ہے، وُہ نہ مرے گا جبتک وہ خود اسی طرح مبتلا نہ ہوگا۔ اپنے بھائیوں کو حقیر نہ سمجھو۔ جب ایک ہی چشمہ سے کُل پانی پیتے ہو، تو کون جانتا ہے کہ کس کی قسمت میں زیادہ پانی پینا ہے۔ مکرّم و معظّم کوئی دُنیاوی اُصولوں سے نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا وُہ ہے جو متّقی ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔ (الحجرات: ۱۴)

ذاتوں کا امتیاز

یہ جو مختلف ذاتیں ہیں۔ یہ کوئی وجہِ شرافت نہیں۔ خدا تعالیٰ نے محض عرف کے لیے یہ ذاتیں بنائیں اور آج کل تو صرف بعد چار پُشتوں کے حقیقی پتہ لگانا ہی مشکل ہے۔ متّقی کی شان نہیں کہ ذاتوں کے جھگڑے میں پڑے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ میرے نزدیک ذات کی کوئی سَنَد نہیں۔ حقیقی مکرمت اور عظمت کا باعث فقط تقویٰ ہے۔

متّقی کون ہیں؟

خُدا کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ متّقی وہ ہوتے ہیں جو حلیمی اور مسکینی سے چلتے ہیں۔ وہ مغرورانہ گفتگو نہیں کرتے۔ ان کی گفتگو ایسی ہوتی ہے جیسے چھوٹا بڑے سے گفتگو کرے۔ ہم کو ہر حال میں وہ کرنا چاہیے جس سے ہماری فلاح ہو۔ اللہ تعالیٰ کسی کا اجارہ دار نہیں۔ وُہ خاص تقویٰ کو چاہتا ہے۔ جو تقویٰ کریگا وہ مقامِ اعلیٰ کو پہنچے گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابراہیم علیہ السلام میں سے کسی نے وراثت سے تو عزت نہیں پائی۔ گو ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد عبداللہ مُشرک نہ تھے، لیکن اس نے نبوت تو نہیں دی۔ یہ تو فضلِ الٰہی تھا۔ اُن صِدقوں کے باعث جو اُن کی فطرت میں تھے یہی فضل کے محرّک تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ابوالانبیا تھے، انھوں نے اپنے صِدق و تقویٰ سے ہی بیٹے کو قربان کرنے میں دریغ نہ کیا۔ خود آگ میں ڈالے گئے۔ ہمارے سیّد و مولیٰ حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی صدق و وفا دیکھئے۔ آپؐ نے ہر ایک قسم کی بدتحریک کا مقابلہ کیا۔ طرح طرح کے مصائب و تکالیف اُٹھائے، لیکن پرواہ نہ کی۔ یہی صِدق و وفا تھا جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (الاحزاب: ۵۷)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اور اُس کے تمام فرشتے رسُول پر درُود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم درُود و سلام بھیجو نبی پر۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسُولِ اکرمؐ کے اعمال ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف یا اوصاف کی تحدید کرنے کے لیے کوئی لفظ خاص نہ فرمایا۔ لفظ تو مِل سکتے تھے، لیکن خود استعمال نہ کیے یعنی آپؐ کے اعمالِ صالحہ کی تعریف تحدید سے بیروں تھی۔ اس قسم کی آیت کسی اور نبی کی شان میں استعمال نہ کی۔ آپؐ کی رُوح میں وہ صدق و وفا تھا اور آپؐ کے اعمال خدا کی نگاہ میں اس قدر پسندیدہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے یہ حکم دیا کہ آئندہ لوگ شکرگزاری کے طور پر درُود بھیجیں۔

آپؐ کی ہمت و صدق وُہ تھا کہ اگر ہم اوپر یا نیچے نگاہ کریں، تو اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ خود حضرت مسیحؑ کے وقت کو دیکھ لیا جائے کہ اُن کی ہمت یا رُوحانی صدق و وفا کا کہاں تک اثر ان کے پیروؤں پر ہوا۔ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ایک بد روش کو دُرست کرنا کس قدر مشکل ہے۔ عاداتِ راسخہ کا گنوانا کیسا محالات سے ہے۔ لیکن ہمارے مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہزاروں انسانوں کو دُرست کیا، جو حیوانوں سے بدتر تھے۔ بعض ماؤں اور بہنوں میں حیوانوں کی طرح فرق نہ کرتے تھے۔ یتیموں کا مال کھاتے۔ مردوں کا مال کھاتے۔ بعض ستارہ پرست، بعض دہریہ، بعض عناصر پرست تھے۔ جزیرہ عرب کیا تھا، ایک مجموعۂ مذاہب اپنے اندر رکھتا تھا۔

قرآنِ مجید کامل ہدایت ہے

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قرآن کریم ہر ایک قسم کی تعلیم اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہر ایک غلط عقیدہ یا بُری تعلیم جو دُنیا میں ممکن ہے، اس کے استیصال کے لیے کافی تعلیم اس میں موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عمیق حکمت و تصرف ہے۔

چونکہ کامل کتاب نے آکر کامل اصلاح کرنی تھی۔ ضرور تھا کہ اُس کے نزول کے وقت اُس کے جائے نزول میں بیماری بھی کامل طور پر ہو، تاکہ ہر بیماری کا کامل علاج مہیا کیا جاوے۔ سو اس جزیرہ میں کامل طور سے بیمار (لوگ موجود) تھے اور جن میں وہ تمام رُوحانی بیماریاں موجود تھیں، جو اُس وقت یا اس کے بعد آئندہ نسلوں کو لاحق ہونے والی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ قرآنِ شریف نے کُل شریعت کی تکمیل کی۔ دُوسری کتابوں کے نزول کے وقت نہ یہ ضرورت تھی، نہ اُن میں ایسی کامل تعلیم ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ

ہمارے نبی اکملؐ کی برکات جس قدر ظہور میں آئیں۔ اگر تمام خوارق کو الگ کر دیا جائے تو صرف آپؐ کی اصلاح ہی ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔

اگر کوئی اُس حالت پر غور کرے، جب آپؐ آئے۔ پھر اُس حالت کو دیکھے، جو آپؐ چھوڑ گئے۔ تو اس کو ماننا پڑے گا کہ یہ اثر بذاتِ خود ایک اعجاز تھا، اگرچہ کُل انبیاء عزت کے قابل ہیں لیکن ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الجمعہ: ۵)

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لاتے، تو نبوت تو درکنار، خدائی کا ثبوت بھی اس طرح نہ ملتا۔ آپؐ ہی کی تعلیم سے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص) کا پتہ

لگا۔ اگر توریت میں کوئی ایسی تعلیم ہوتی اور قرآن شریف اس کی تصریح ہی کرتا۔ تو نصاریٰ کا وجود ہی کیوں ہوتا۔

قرآن پاک میں سب سچائیاں ہیں

غرض قرآن شریف نے جس قدر تقویٰ کی راہیں بتلائیں اور ہر طرح کے انسانوں اور مختلف عقل والوں کی پرورش کرنے کے طریق سکھلاتے ایک جاہل، عالم اور فلسفی کی پرورش کے واسطے ہر طبقہ کے سوالات کے جواب۔ غرضیکہ کوئی فرقہ نہ چھوڑا، جس کی اصلاح کے طریق نہ بتلائے۔ یہ ایک صحیفۂ قدرت تھا۔ جیسےکہ فرمایا۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ : ۴) یہ وہ صحیفے ہیں، جن میں کُل سچائیاں ہیں۔ یہ کیسی مُبارک کتاب ہے کہ اس میں سب سامان اعلیٰ درجہ تک پہنچنے کے موجود ہیں۔

مسیح و مہدی

لیکن افسوس ہے کہ جیسے حدیث میں آیا ہے کہ ایک درمیانی زمانہ آوے گا جو فیج اعوج ہے یعنی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک میرا زمانہ برکت والا ہے۔ ایک آنے والے مسیح و مہدی کا۔ مسیح و مہدی کوئی دو الگ اشخاص نہیں ان سے مُراد ایک ہی ہے۔ مہدی ہدایت یافتہ سے مراد ہے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسیح مہدی نہیں۔ مہدی مسیح ہو یا نہ ہو، لیکن مسیح کے مہدی ہونے سے انکار کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ اصل میں اللہ تعالیٰ نے یہ دو الفاظ سبّ و شتم کے مقابل بطور ذبّ کے رکھے ہیں کہ وہ کافر، ضالّ، مُضِلّ نہیں۔ بلکہ مہدی ہے۔ چونکہ اُس کے علم میں تھا کہ آنیوالے مسیح و مہدی کو دجّال و گمراہ کہا جائے گا، اس لیے اُسے مسیح و مہدی کہا گیا۔ دجّال کا تعلق أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (الاعراف : ۱۷۷) سے تھا اور مسیحؑ کا رفع آسمانی ہونا تھا۔ سو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے چاہا تھا اس کی تکمیل دو ہی زمانوں میں ہونی تھی۔ ایک آپؐ کا زمانہ اور ایک آخری مسیح و مہدی کا زمانہ یعنی ایک زمانے میں تو قرآن اور سچی تعلیم نازل ہوئی، لیکن اس تعلیم پر فیج اعوج کے زمانہ نے پردہ ڈال دیا۔ جس پردہ کا اُٹھایا جانا مسیحؑ کے زمانہ میں مقدر تھا۔ جیسے کہ فرمایا کہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو موجودہ جماعت یعنی جماعتِ صحابہ کرامؓ کا تزکیہ کیا اور ایک آنیوالی جماعت کا جسکی شان میں لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ (الجمعۃ:۴) آیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے بشارت دی کہ ضلالت کیوقت اللہ تعالیٰ اس دین کو ضائع نہ کرے گا۔ بلکہ آنیوالے زمانہ میں خدا تعالیٰ حقائقِ قرآنیہ کو کھول دے گا۔ آثار میں ہے۔ کہ آنے والے مسیح کی ایک یہ فضیلت ہوگی۔ کہ وہ قرآنی فہم اور معارف کا صاحب ہوگا اور صرف قرآن سے استنباط کر کے لوگوں کو اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرے گا۔ جو حقائقِ قرآن کی ناواقفیت سے لوگوں میں پیدا ہوگئی ہوں گی۔

سِلسلہ مُوسویہ و محمّدیہ میں مماثلت

قرآن شریف میں رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰؑ قرار دے کر فرمایا: إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا (المزمّل : ۱۶) یعنی ہم نے ایک رسُول بھیجا۔ جیسے موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا تھا۔ ہمارا رسُول مثیلِ موسیٰؑ ہے ایک اور جگہ فرمایا: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۵۶) کہ اس مثیلِ موسیٰؑ کے خلفاء بھی اُسی سلسلہ سے ہوں گے۔ جیسے کہ موسیٰؑ کے خلفاء سلسلہ وار آئے۔

اُس سلسلہ کی میعاد چودہ سو برس تک رہی۔ برابر خلفاء آتے رہے۔ یہ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی تھی کہ جس طرح سے پہلے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ ویسے ہی اس سلسلہ کا آغاز ہوگا یعنی جس طرح موسیٰؑ نے ابتدا میں جلالی نشان دکھاتے اور قوم کو فرعون سے چھڑایا۔ اسی طرح آنیوالا نبی بھی موسیٰ کی طرح ہوگا۔ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا۔ اِلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا (المزمل ۱۸، ۱۹) یعنی جس طرح ہم نے موسیٰؑ کو بھیجا تھا۔ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کفارِ عرب بھی فرعونیت سے بھرے ہوئے تھے، وہ بھی فرعون کی طرح باز نہ آئے۔ جبتک انھوں نے جلالی نشان نہ دیکھ لیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کام موسیٰؑ کے کاموں کے سے تھے۔ اس موسیٰؑ کے کام قابلِ پذیرائی نہ تھے، لیکن قرآن شریف نے منوایا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں گو فرعون کے ہاتھ سے بنی اسرائیل کو نجات ملی، لیکن گناہوں سے نجات نہ ملی۔ وہ لڑتے اور کج دل ہوتے اور موسیٰؑ پر حملہ آور ہوتے، لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری پوری نجات قوم کو دی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر طاقت، شوکت، سلطنتِ اسلام کو نہ دیتے، تو مسلمان مظلوم رہتے اور کفار کے ہاتھ سے نجات نہ پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ نجات دی کہ مستقل اسلامی سلطنت قائم ہوگئی۔ دُوسرے یہ کہ گناہوں سے ان کو کامل نجات ملی۔ خدا تعالےٰ نے ہر دو نقشے کھینچے ہیں کہ عرب پہلے کیا تھے اور پھر کیا ہوگئے۔ اگر ہر دو نقشے اکٹھے کیے جائیں، تو ان کی پہلی حالت کا اندازہ لگ جائے گا۔ سو اللہ تعالیٰ نے اُن کو دونوں نجاتیں دیں۔ شیطان سے بھی نجات دی اور طاغوت سے بھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کا مقام

جو صدق و صفا آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے دکھایا اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ جان دینے تک سے دریغ نہ کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا اور نہ ہی کوئی منکرِ الہام تھا۔ برادری کے چند لوگوں کو سمجھانا کونسا بڑا کام ہے۔ یہودی توریت تو پڑھے ہی ہوتے تھے، اس پر ایمان رکھتے تھے۔ خدا کو وحدہٗ لاشریک جانتے ہی تھے بعض وقت یہ خیال آجاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کیا کرنے آئے تھے۔ یہودیوں میں تو توریت کے لیے اب بھی غیرت پائی جاتی ہے۔ نہایت کار یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید اخلاقی نقص یہود میں تھے، لیکن تعلیم تو توریت میں موجود ہی تھی۔ باوجود اس سہولت کے کہ قوم اس کتاب کو مانتی تھی، حضرت مسیحؑ نے وہ کتاب سبقاً سبقاً ایک اُستاد سے پڑھی تھی۔ اس کے مقابل ہمارے سیّد مولیٰ ہادیٔ کامل اُمّی تھے۔ آپؐ کا کوئی اُستاد بھی نہ تھا اور یہ ایک واقعہ ہے کہ مخالف بھی اس امر سے انکار نہ کرسکے پس حضرت عیسیٰؑ کے لیے دو آسانیاں تھیں۔ ایک تو برادری کے لوگ تھے اور جو بھاری بات اُن سے منوانی تھی، وہ پہلے ہی مان چکے تھے۔ ہاں کچھ اخلاقی نقص تھے، لیکن باوجود اتنی سہولت کے حواری بھی دُرست نہ ہوتے۔ لالچی رہے حضرت عیسیٰؑ اپنے پاس روپیہ رکھتے تھے بعض حواری چوریاں بھی کرتے تھے، چنانچہ وہ (حضرت مسیحؑ) کہتے ہیں۔ کہ مجھے سر رکھنے کی جگہ نہیں، لیکن ہم حیران ہیں کہ ایسا کہنے کے کیا معنے ہیں۔ جب گھر بھی ہو۔ مکان بھی ہو اور مال میں گنجائش اس قدر کہ

چوری کی جاوے۔ تو پتہ بھی نہ لگے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ دکھانا یہ منظور ہے کہ باوجود ان تمام سہولتوں کے کوئی اصلاح نہ ہو سکی۔ پطرس کو بہشت کی کنجیاں تو مل جاویں، لیکن وہ اپنے اُستاد کو لعنت دینے سے نہ رُک سکے۔

اب اس کے مقابلہ میں انصافاً دیکھا جاوے کہ ہمارے ہادیٔ اکمل ؐ کے صحابہؓ نے اپنے خُدا اور رسُول کے لیے کیا کیا جان نثاریاں کیں، جلا وطن ہوئے۔ ظُلم اُٹھائے، طرح طرح کے مصائب برداشت کیے، جانیں دیں لیکن صدق و وفا کے ساتھ قدم مارتے ہی گئے۔ پس وہ کیا بات تھی کہ جس نے اُنہیں ایسا جاں نثار بنا دیا۔ وہ سچی الٰہی محبت کا جوش تھا، جس کی شعاع اُن کے دل میں پڑ چکی تھی، اس لیے خواہ کسی نبی کے ساتھ مقابلہ کر لیا جاوے۔ آپؐ کی تعلیم، تزکیہ نفس، اپنے پَیروؤں کو دُنیا سے متنفر کرا دینا، شجاعت کے ساتھ صداقت کے لیے خُون بہا دینا۔ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے گی۔ یہ مقام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا ہے اور اُن میں جو باہمی اُلفت و محبت تھی۔ اس کا نقشہ دو فقروں میں بیان فرمایا ہے؛ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (الانفال : ۶۴) یعنی جو تالیف اُن میں ہے وہ ہرگز پیدا نہ ہوتی، خواہ سونے کا پہاڑ بھی دیا جاتا۔ اب ایک اور جماعت مسیح موعودؑ کی ہے جس نے اپنے اندر صحابہؓ کا رنگ پیدا کرنا ہے۔ صحابہؓ کی تو وُہ پاک جماعت تھی جس کی تعریف میں قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ کیا آپ لوگ ایسے ہیں؟ جب خدا کہتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ساتھ وہ لوگ ہوں گے، جو صحابہؓ کے دوش بدوش ہوں گے۔ صحابہؓ تو وُہ تھے جنھوں نے اپنا مال، اپنا وطن راہِ حق میں دیدیا اور سب کچھ چھوڑ دیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا معاملہ اکثر سُنا ہو گا۔ ایک دفعہ جب راہِ خدا میں مال دینے کا حُکم ہوا، تو گھر کا کُل اثاثہ لے آئے۔ جب رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ گھر میں کیا چھوڑ آئے۔ تو فرمایا کہ خُدا اور رسُول کو گھر چھوڑ آیا ہوں۔ رئیسِ مکّہ ہو اور کمبل پوش، غربا کا لباس پہنے۔ یہ سمجھ لو کہ وہ لوگ تو خدا کی راہ میں شہید ہو گئے۔ ان کے لیے تو یہی لکھا ہے کہ سَیفوں (تلواروں) کے نیچے بہشت ہے، لیکن ہمارے لیے تو اتنی سختی نہیں، کیونکہ یَضَعُ الْحَرْبُ ہمارے لیے آیا ہے یعنی مہدی کے وقت لڑائی نہیں ہو گی۔

جہاد کی حقیقت

اللہ تعالیٰ بعض مصالح کے رُو سے ایک فعل کرتا ہے اور آئندہ جب وہ فعل معرضِ اعتراض ٹھہرتا ہے، تو پھر وہ فعل نہیں کرتا۔ اوّلاً ہمارے رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تلوار نہ اُٹھائی مگر اُن کو سخت سے سخت تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ تیرہؔ سال کا عرصہ ایک بچے کو بالغ کرنے کے لیے کافی ہے اور حضرت مسیحؑ کی میعاد تو اگر اس میعاد میں سے دسؔ نکال دیں تو پھر بھی کافی ہوتی ہے۔ غرض اس لمبے عرصہ میں کوئی یا کسی رنگ کی تکلیف نہ تھی جو اُٹھانی نہ پڑی ہو۔ آخر کار وطن سے نکلے تو تعاقب ہوا۔ دُوسری جگہ پناہ لی، تو دشمن نے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ جب یہ حالت ہوئی تو مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لیے حکم ہوا۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج ۴۰-۴۱) کہ جن لوگوں کے ساتھ لڑائیاں خواہ مخواہ کی گئیں اور گھروں سے ناحق نکالے گئے، صرف اس لیے کہ اُنھوں نے کہا کہ ہمارا

ربّ اللہ ہے۔ سو یہ ضرورت تھی کہ تلوار اُٹھائی گئی۔ ورنہ آنحضرت کبھی تلوار نہ اُٹھاتے۔ ہاں ہمارے زمانہ میں ہمارے برخلاف قلم اُٹھائی گئی ہے۔ قلم سے ہم کو اذیت دی گئی اور سخت ستایا گیا، اس لیے اس کے مقابل پر قلم ہی ہمارا حربہ ہے۔

جماعت کے لیے نصیحت

مَیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ جس قدر کوئی شخص قُرب حاصل کرتا ہے اسی قدر مواخذہ کے قابل ہے۔ اہلبیت زیادہ مواخذہ کے لائق تھے۔ وہ لوگ جو دُور ہیں، وہ قابلِ مواخذہ نہیں لیکن تم ضرور ہو۔ اگر تم میں اُن پر کوئی ایمانی زیادتی نہیں، تو تم میں اور اُن میں کیا فرق ہوا۔ تم ہزاروں کے زیرِ نظر ہو۔ وہ لوگ گورنمنٹ کے جاسوسوں کی طرح تمہاری حرکات وسکنات کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ سچتے ہیں جب مسیحؑ کے ساتھی صحابہؓ کے ہمدوش ہونے لگے ہیں، تو کیا آپ ویسے ہیں ؟ جب آپ لوگ ویسے نہیں، تو قابلِ گرفت ہیں۔ گو یہ ابتدائی حالت ہے لیکن موت کا کیا اعتبار ہے۔ موت ایک ایسا ناگزیر امر ہے جو ہر شخص کو پیش آتا ہے۔ جب یہ حالت ہے، تو پھر آپ کیوں غافل ہیں۔ جب کوئی شخص مجھ سے تعلق نہیں رکھتا، تو یہ امر دُوسرا ہے، لیکن جب آپ میرے پاس آتے۔ میرا دعویٰ قبول کیا اور مجھے مسیح مانا، تو گویا من وجہٖ آپ نے صحابہ کرامؓ کے ہمدوش ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ تو کیا صحابہؓ نے کبھی صدق ووفا پر قدم مارنے سے دریغ کیا۔ اُن میں کوئی کسل تھا۔ کیا وہ دل آزار تھے؟ کیا اُن کو اپنے جذبات پر قابو نہ تھا؟ کیا وہ منکسرالمزاج نہ تھے۔ بلکہ ان میں پرلے درجہ کا انکسار تھا۔ سو دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم کو بھی ویسی ہی توفیق عطا کرے، کیونکہ تذلّل اور انکساری کی زندگی کوئی شخص اختیار نہیں کر سکتا جبتک کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہ کرے۔ اپنے آپ کو ٹٹولو اور اگر بچّہ کی طرح اپنے آپ کو کمزور پاؤ، تو گھبراؤ نہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعا صحابہ کی طرح جاری رکھو۔ راتوں کو اُٹھو اور دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی راہ دکھلائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے بھی تدریجاً تربیت پائی۔ وہ پہلے کیا تھے۔ ایک کسان کی تخمریزی کی طرح تھے۔ پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آبپاشی کی۔ آپ نے اُن کے لیے دُعائیں کیں۔ بیج صحیح تھا اور زمین عمدہ تو اس آبپاشی سے پھل عمدہ نکلا جسطرح حضور علیہ السلام چلتے اسی طرح وہ چلتے۔ وہ دن کا یا رات کا انتظار نہ کرتے تھے۔ تم لوگ سچے دل سے توبہ کرو، تہجد میں اُٹھو، دُعا کرو، دل کو دُرست کرو۔ کمزوریوں کو چھوڑ دو اور خدا تعالیٰ کی رضا کے مطابق اپنے قول وفعل کو بناؤ۔ یقین رکھو کہ جو اس نصیحت کو وِرد بنائے گا اور عملی طور سے دُعا کرے گا اور عملی طور پر التجا خدا کے سامنے لائیگا۔ اللہ تعالیٰ اس پر فضل کرے گا اور اس کے دل میں تبدیلی ہوگی۔ خدا تعالیٰ سے ناامید مت ہو۔ ؎

بر کریماں کارہا دشوار نیست

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو کیا کوئی ولی بننا ہے؟ افسوس اُنھوں نے کچھ قدر نہ کی بیشک انسان نے (خدا کا) ولی بننا ہے۔ اگر وہ صراطِ مستقیم پر چلے گا، تو خدا بھی اس کی طرف چلے گا اور پھر ایک جگہ پر اس کی ملاقات ہوگی۔ اس کی اس طرف حرکت خواہ آہستہ ہوگی، لیکن اس کے مقابل خدا تعالیٰ کی حرکت بہت جلد ہوگی، چنانچہ یہ آیت اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ الخ (العنکبوت: ۷۰) سو جو جو باتیں میں نے آج وصیت کی ہیں، ان کو

یاد رکھو کہ اِن ہی پر مدارِ نجات ہے۔ تمہارے معاملات خدا اور خلق کے ساتھ ایسے ہونے چاہئیں جن میں رضا الٰہی مطلق ہی ہو پس اس سے تم نے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ الخ (الجمعہ : ۴) کے مصداق بننا ہے۔

اسرائیلی اور اسمٰعیلی سلسلوں میں مسیح کی بعثت

ہاں جیسا کہ آگے بیان ہو چکا ہے۔ خدا کی حکمتِ بالغہ نے یہی پسند کیا کہ اسرائیلی اور اسمٰعیلی دو سلسلے دُنیا میں قائم کرے پہلا سلسلہ حضرت موسیٰؑ سے شروع ہو کر حضرت مسیحؑ تک ختم ہوا اور یہ چودہ۱۴ سو برس تک رہا۔ اسی طرح حضرت رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج چودہ۱۴ سو برس پر ایک مسیحؑ کے آنے کا اشارہ ہے۔ عدد چودہ۱۴ کو خاص نسبت ایک یہ بھی ہے کہ انسان چودہ۱۴ برس پر بلوغ پا لیتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو خبر ملی تھی کہ مسیحؑ اس وقت آئے گا۔ جب یہودیوں میں بہت فرقے ہونگے۔ اُن کے عقائد میں سخت اختلاف ہوگا۔ بعض کو فرشتوں کے وجود سے انکار۔ بعض کو قیامت و حشرِ اجساد سے انکار۔ غرض جب طرح طرح کی عملی بد اعتقادی پھیل جائے گی۔ تب بطور حَکَم کے مسیحؑ اُن میں آوے گا۔ اسی طرح ہمارے ہادیٔ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اطلاع دی کہ جب تم میں بھی یہودیوں کی طرح کثرت سے فرقے ہو جاویں گے اور اُن کی طرح مختلف قسم کی بد اعتقادیاں اور بد عملیاں شروع ہوں گی۔ علماء یہود کی طرح بعض بعض کے مُکفّر ہوں گے۔ اُس وقت اِس اُمّتِ مرحُومہ کا مسیح بھی بطور حَکَم کے آئے گا، جو قرآن شریف سے ہر امر کا فیصلہ کرے گا۔ وہ مسیحؑ کی طرح قوم کے ہاتھ سے ستایا جائے گا اور کافر قرار دیا جائے گا۔ اگر ان لوگوں نے کم بھی سے اس شخص کو دجّال اور کافر کہا، تو ضرور تھا کہ ایسا ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں آ چکا تھا کہ آنے والا مسیح کافر و دجّال ٹھہرایا جائیگا۔ لیکن جو عقیدہ آپ کو سکھلایا جاتا ہے وہ بالکل صاف اور اُجلا ہے اور صحاحِ دلائل بھی نہیں۔ برہانِ قاطع اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

وفاتِ مسیح

پہلا جھگڑا وفاتِ مسیحؑ کا ہی ہے۔ کھُلی کھُلی آیات اس کی حمایت میں ہیں۔ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (آل عمران : ۵۶) پھر فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ (المائدہ : ۱۱۸) یہ عذر بالکل جھوٹا ہے کہ تَوَفِّیْ کے معنی کچھ اور ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور خود ہادیٔ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے معنی اماتت کے کر دیئے ہیں۔ یہ لوگ بھی جہاں کہیں لفظ تَوَفِّیْ استعمال کرتے ہیں۔ تو معنی اماتت اور قبضِ رُوح کے مُراد لیتے ہیں۔ قرآن شریف نے بھی ہر ایک جگہ اس لفظ کے یہی معنے بیان کیے ہیں۔ اس لیے اس پر تو ہاتھ کہیں نہ پڑا اور جب مسیح ناصری کی وفات ثابت ہے تو ضرور ہے کہ آنیوالا اسی اُمّت میں سے کوئی ہو۔ جیسے کہ اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ (الحدیث) اس کی تصریح کرتا ہے۔ وہ لوگ جو نیچری ہیں۔ اُن کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اس ابتلا سے بچ گئے، کیونکہ وَفاتِ مَسِیحؑ کے تو وُہ قائل ہی ہیں۔ اور مسیح موعود کا ذکر اس قدر تواتر رکھتا ہے کہ جس تواتر سے اِنکار محال ہے۔ علاوہ ازیں قرآنی اشارات بھی آنے والے کے شاہد ہیں، اس لیے ایک عقلمند اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسیح آئے گا۔

مسیح کو اس زمانہ سے کیا خصوصیت ہے؟

ہاں بعض کا حق ہے کہ یہ اعتراض کریں کہ مسیح کو اس زمانہ سے کیا خصوصیت ہے؟ اس کا یہ جواب ہے کہ قرآن شریف نے اسرائیلی اور اسماعیلی دو سلسلوں میں خلافت کی مماثلت کا کھلا کھلا اشارہ کیا ہے۔ جیسے اس آیت سے ظاہر ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور : ۵۶) اسرائیلی سلسلہ کا آخری خلیفہ جو چودھویں صدی پر بعد حضرت موسیٰ آیا، وہ مسیح ناصری تھا۔ مقابل میں ضرور تھا کہ اس اُمت کا مسیح بھی چودھویں صدی کے سر پر آوے۔ علاوہ ازیں اہلِ کشف نے اسی صدی کو بعثتِ مسیح کا زمانہ قرار دیا جیسے شاہ ولی اللہ صاحبؒ وغیرہ اہلحدیث کا اتفاق ہو چکا ہے کہ علاماتِ صُغریٰ کل اور علاماتِ کبریٰ ایک حد تک پوری ہو چکی ہیں، لیکن اس میں کسی قدر ان کی غلطی ہے...... علامات کُل پوری ہو چکی ہیں۔ بڑی علامت یا نشان جو آنے والے کا ہے وہ بخاری شریف میں یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَیَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ[1] الخ لکھا ہے۔ یعنی نزولِ مسیح کا وقت غلبہ نصاریٰ اور صلیبی پرستش کا زور ہے۔ سو کیا یہ وُہ وقت نہیں؟ کیا جو کچھ پادریوں سے نقصان اسلام کو پہنچ چکا ہے، اس کی نظیر آدمؑ سے لے کر آج تک کہیں ہے؟ ہر مُلک میں تفرقہ پڑ گیا۔ کوئی ایسا خاندانِ اسلامی نہیں کہ جس میں سے ایک آدھ آدمی اُن کے ہاتھ میں نہ چلا گیا ہو۔ سو آنے والے کا وقت صلیب پرستی کا غلبہ ہے۔ اب اس سے زیادہ کیا غلبہ ہوگا کہ کس طرح درندوں کی طرح اسلام پر کینہ وری سے حملے کیے گئے۔ کیا کوئی گروہ مخالفین کا ہے کہ جس نے حضرت رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت وحشیانہ الفاظ اور گالیوں سے یاد نہیں کیا؟ اب اگر آنیوالے کا یہ وقت نہیں تو بہت جلدی وہ آیا بھی تو سو سال تک آئے گا، کیونکہ وہ وقت مجدّد کا ہے۔ جس کی بعثت کا زمانہ صدی کا سر ہوتا ہے۔ تو کیا اسلام میں موجودہ وقت میں اس قدر اور طاقت ہے کہ ایک صدی تک پادریوں کے روز افزوں غلبہ کا مقابلہ کر سکے غلبہ حد تک پہنچ گیا اور آنیوالا آ گیا۔ ہاں اب وہ دجال کو اتمامِ حجت سے ہلاک کرے گا، کیونکہ حدیثوں میں آ چکا ہے کہ اُس کے ہاتھ پر ملتوں کی ہلاکت مقدر ہے نہ لوگوں کی یا اہلِ ملل کی، تو ویسا ہی پورا ہوا۔

مسیح موعود کی تائید میں آفاقی نشانات

آنے والے کا ایک یہ نشان بھی ہے کہ اس زمانہ میں ماہِ رمضان میں کسُوف و خسوف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے نشان سے ٹھٹھا کرنے والے خدا سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔ کسوف و خسوف کا اس کے دعویٰ کے بعد ہونا یہ ایک ایسا امر تھا۔ جو افترا اور بناوٹ سے بعید تر ہے۔ اس سے پہلے کوئی کسوف و خسوف ایسا نہیں ہوا۔ یہ ایک ایسا نشان تھا کہ جس سے اللہ تعالیٰ کو کُل دُنیا میں آنے والے کی مُنادی کرنی تھی، چنانچہ اہلِ عرب نے بھی اس نشان کو دیکھ کر اپنے مذاق کے مطابق دُرست کہا۔ ہمارے اشتہارات بطور منادی جہاں جہاں نہ پہنچ سکتے تھے۔ وہاں وہاں اس کسوف و خسوف نے آنے والے کے وقت کی منادی کر دی۔ یہ خدا کا نشان تھا جو انسانی منصوبوں سے بالکل پاک تھا۔ خواہ کوئی کیسا ہی فلسفی ہو وہ غور کرے اور

[1] بخاری جلد ۱۔ باب نزولِ عیسیٰؑ

سوچے کہ جب مقرر کردہ نشان پُورا ہوگیا، تو ضرور ہے کہ اس کا مصداق بھی کہیں ہو۔ یہ امر ایسا نہ تھا کہ جو کسی حساب کے ماتحت ہو۔ جیسے کہ فرمایا تھا کہ یہ اس وقت ہوگا۔ جب کوئی مدّعیِ مہدویّت ہو چکے گا۔ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بھی فرمایا کہ آدمؑ سے لے کر اُس مہدی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ اگر کوئی شخص تاریخ سے ایسا ثابت کرے، تو ہم مان لیں گے۔

ایک اور نشان یہ بھی تھا کہ اُس وقت ستارہ ذوالسنین طلوع کرے گا۔ یعنی اُن برسوں کا ستارہ جو پہلے گزر چکے ہیں۔ یعنی وہ ستارہ جو مسیح ناصری کے ایّام (برسوں) میں طلوع ہوا تھا۔ اب وہ ستارہ بھی طلوع ہوگیا جس نے یہودیوں کے مسیح کی اطلاع آسمانی طور سے دی تھی۔ اسی طرح قرآن شریف کے دیکھنے سے بھی پتہ لگتا ہے۔ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ۔ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ۔ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (التکویر: ۵ تا ۱۱) یعنی اس زمانہ میں اُونٹنیاں بیکار ہو جاویں گی۔ اعلیٰ درجہ کی سواری اور باربرداری جن سے ایّامِ سابقہ میں ہوا کرتی تھی۔ یعنی اُس زمانہ میں سواری کا انتظام کچھ ایسا عمدہ ہوگا کہ یہ سواریاں بیکار ہو جائیں گی۔ اس سے ریل کا زمانہ مُراد تھا۔ وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ ان آیات کا تعلق قیامت سے ہے، وہ نہیں سوچتے کہ قیامت میں اُونٹنیاں حمل دار کیسے رہ سکتی ہیں، کیونکہ عشار سے مراد حمل دار اُونٹنیاں ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ اس زمانہ میں چاروں طرف نہریں نکالی جائیں گی اور کتابیں کثرت سے اشاعت پائیں گی۔ غرضیکہ یہ سب نشان اسی زمانہ کے متعلق تھے۔

مسیح موعود کی جائے ظہور

اب رہا مکان کے متعلق۔ سو یاد رہے کہ دجّال کا خروج مشرق میں بتایا گیا ہے۔ جس سے ہمارا ملک مُراد ہے؛ چنانچہ صاحب حجج الکرامہ نے لکھا ہے کہ فتنِ دجّال کا ظہور ہندوستان میں ہو رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ظہورِ مسیح اُسی جگہ ہو، جہاں دجّال ہو۔ پھر اس گاؤں کا نام قدعہ قرار دیا ہے۔ جو قادیان کا مخفف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یمن کے علاقہ میں بھی اس نام کا کوئی گاؤں ہو۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یمن حجاز سے مشرق میں نہیں بلکہ جنوب میں ہے۔ آخر اسی پنجاب میں ایک اور قادیاں بھی تو لُدھیانہ کے قریب ہے۔

اس کے علاوہ خود قضاء و قدر نے اس عاجز کا نام جو رکھوایا ہے تو وُہ بھی ایک لطیف اشارہ اِس طرف رکھتا ہے کیونکہ غلام احمد قادیانی کے عدد بحساب جُمّل پُورے تیرہ سَو (۱۳۰۰) نکلتے ہیں۔ یعنی اِس نام کا امام چودھویں صدی کے آغاز پر ہوگا۔ غرض آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اشارہ اسی طرف تھا۔

حوادثِ ارضی و سماوی

حوادث بھی ایک علامت تھی۔ حوادثِ سماوی نے قحط، طاعون اور ہیضہ کی صورت پکڑلی۔ طاعون وہ خطرناک عذاب ہے کہ اُس نے گورنمنٹ تک کو زلزلہ میں ڈال دیا۔ اور اگر اس کا قدم بڑھ گیا، تو مُلک صاف ہو جائے گا۔ ارضی حوادث لڑائیاں، زلازل تھے جنھوں نے ملک کو تباہ کیا۔ مامور من اللہ کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ وہ اپنے ثبوت میں آسمانی نشان دکھاوے۔ ایک لیکھرام کا نشان کیا کچھ

کم نشان تھا۔ ایک کُشتی کے طور پر کئی سال تک ایک شرط بدھی رہی پانچ سال تک برابر جنگ ہوتا رہا۔ طرفین نے اشتہار دیئے۔ عام شہرت ہوگئی۔ ایسی شہرت کہ جس کی مثال بھی محال ہے۔ پھر ایسا ہی واقعہ ہوا جیسے کہ کہا گیا تھا۔ کیا اس واقعہ کی کوئی اور نظیر ہے؟ دھرم مہوتسو کے متعلق بھی کئی دن پہلے اعلان کیا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ ہمارا مضمون سب پر غالب رہے گا۔ جن لوگوں نے اس عظیم آلشان اور پُر رُعب جلسہ کو دیکھا ہے۔ وہ خود غور کر سکتے ہیں کہ ایسے جلسہ میں غلبہ پانے کی خبر پیش از وقت دینی کوئی اٹکل یا قیاس نہ تھا۔ پھر آخر وہی ہوا جیسے کہا گیا[1]۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

---

[1] رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۶ء۔ مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی ص ۹۱-۱۳۳

۲۸؍دسمبر ۱۸۹۷ء بعد نمازِ ظہر

حضرتِ اقدسؑ کی دُوسری تقریر

حضورؑ نے فرمایا

ہر ایک شخص سفرِ آخرت کی تیاری رکھے

اس وقت میری غرض بیان کرنے سے یہ ہے کہ چونکہ انسانی زندگی کا کچھ بھی اعتبار نہیں، اس لیے جس قدر احباب اس وقت میرے پاس جمع ہیں۔ مَیں خیال کرتا ہوں، شاید آئندہ سال جمع نہ ہو سکیں اور انہیں دنوں میں مَیں نے ایک کشف میں دیکھا ہے کہ اگلے سال بعض احباب دُنیا میں نہ ہوں گے۔ گو مَیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کشف کے مصداق کون کون احباب ہوں گے۔

اور مَیں جانتا ہوں کہ یہ اس لیے ہے تا ہر ایک شخص بجائے خود سفرِ آخرت کی تیاری رکھے۔ جیسا کہ مَیں نے ابھی کہا ہے کہ مجھے کسی کا نام نہیں بتلایا گیا۔ لیکن مَیں یہ اللہ تعالیٰ کے اعلام سے خوب جانتا ہوں کہ قضاء و قدر کا ایک وقت ہے اور ضرور ایک وقت اس فانی دُنیا کو چھوڑنا ہے، اس لیے میں کہتا نہایت ضروری ہے کہ ہر شخص اور ہر دوست جو اس وقت موجود ہے، وہ میری باتوں کو قصّہ گو کی داستان کی طرح نہ سمجھے، بلکہ یہ ایک واعظ من جانب اللہ اور مامور من اللہ ہے۔ جو نہایت خیرخواہی اور سچی بھلائی اور پوری دِلسوزی سے باتیں کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان

پس مَیں اپنے دوستوں کو اطلاع دیتا ہوں کہ خوب یاد رکھو اور دل سے سُنو اور دل میں جگہ دو کہ اللہ تعالیٰ جیسا کہ اس نے اپنی کتاب قرآن کریم میں اپنے وجود اور توحید کو پُر زور اور آسان دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ایک برتر ہستی اور نُور ہے۔ وہ لوگ جو اس زبردست ہستی کی قدرتوں اور عجائبات کو دیکھتے ہوئے بھی اس کے وجود میں شکوک ظاہر کرتے اور شُبہ کرتے ہیں۔ سچ جانو۔ بڑے ہی بدقسمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی زبردست ہستی اور مقتدر وجُود کے اثبات کے متعلق ہی فرمایا ہے۔ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (ابراہیم: ۱۱) کیا اللہ کے وجود میں بھی شک ہو سکتا ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے ؟ دیکھو یہ تو بڑی سیدھی اور صاف بات ہے کہ ایک مصنوع کو دیکھ کر صانع کو ماننا پڑتا ہے۔ ایک عمدہ جوتے یا صندوق کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کی ضرورت کا معاً اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ پھر تعجب پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی میں کیونکر انکار کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ایسے صانع کے وجود کا کیونکر انکار ہو سکتا ہے، جس کے ہزارہا عجائبات سے

زمین و آسمان پُر ہیں۔ پس یقیناً سمجھو کہ قدرت کے اِن عجائبات اور صنعتوں کو دیکھ کر بھی جن میں انسانی ہاتھ، انسانی عقل و دماغ کا کام نہیں۔ اگر کوئی بیوقوف خدا کی ہستی اور وجود میں شک لائے۔ تو وہ بدقسمت انسان شیطان کے پنجہ میں گرفتار ہے اور اس کو استغفار کرنا چاہیے۔ خدا کی ہستی کا انکار دلیل اور رؤیت کی بنا پر نہیں، بلکہ اللہ جلّ شانہٗ کی ہستی کا انکار کرنا باوجود مشاہدہ کرنے اس کی قدرتوں اور عجائبات مخلوقات اور مصنوعات کے جو زمین و آسمان میں بھرے پڑے ہیں۔ بڑی ہی نابینائی ہے۔

نابینائی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آنکھوں کی نابینائی ہے اور دُوسری دل کی، آنکھوں کی نابینائی کا اثر ایمان پر کچھ نہیں ہوتا، مگر دل کی نابینائی کا اثر ایمان پر پڑتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے اور بہت ضروری ہے کہ ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ سے پُورے تذلّل اور انکسار کے ساتھ ہر وقت دُعا مانگتا رہے کہ وُہ اُسے سچّی معرفت اور حقیقی بصیرت اور بینائی عطا کرے اور شیطان کے وساوس سے محفوظ رکھے

آخرت پر ایمان

شیطان کے وساوس بہت ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک وسوسہ اور شبہ جو انسانی دل میں پیدا ہو کر اُسے خَسِرَ الدُّنیا والآخرۃ کر دیتا ہے۔ آخرت کے متعلق ہے، کیونکہ تمام نیکیوں اور راستبازیوں کا بڑا بھاری ذریعہ منجملہ دیگر اسباب اور وسائل کے آخرت پر ایمان بھی ہے اور جب انسان آخرت اور اس کی باتوں کو قصّہ اور داستان سمجھے تو سمجھو کہ وُہ ردّ ہو گیا اور دونوں جہانوں سے گیا گزرا ہوا۔ اس لیے کہ آخرت کا ڈر بھی تو انسان کو خائف اور ترساں بنا کر معرفت کے سچّے چشمہ کی طرف کشاں کشاں لے آتا ہے اور سچّی معرفت بغیر حقیقی خشیت اور خداترسی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس یاد رکھو کہ آخرت کے متعلق وساوس کا پیدا ہونا ایمان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے اور خاتمہ بالخیر میں فتور پڑ جاتا ہے۔

ابرار کا طریقِ زندگی

جس قدر اَبرار، اَخیار اور راستباز انسان دُنیا میں ہو گزرے ہیں، جو رات کو اُٹھ کر قیام اور سجدہ میں ہی صبح کر دیتے تھے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ وہ جسمانی قوتیں بہت رکھتے تھے۔ اور بڑے بڑے قوی ہیکل جوان اور تنومند پہلوان تھے؟ نہیں۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ جسمانی قوت اور توانائی سے وہ کام ہرگز نہیں ہو سکتے، جو رُوحانی قوت اور طاقت کر سکتی ہے۔ بہت سے انسان آپ نے دیکھے ہوں گے جو تین تین پاؤ بھر روٹی کھاتے ہیں اور خوب لذیذ اور مقوی اغذیہ پلاؤ وغیرہ کھاتے ہیں، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ صبح تک سوئے رہتے ہیں اور نیند اُن پر غالب رہتی ہے۔ یہاں تک کہ نیند اور سُستی سے بالکل مغلوب ہو جاتے ہیں کہ اُن کو عشاء کی نماز بھی دوبھر اور مشکلِ عظیم معلوم دیتی ہے، چہ جائیکہ وہ تہجد گزار ہوں۔

دیکھو! آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کیا تنعّم پسند اور خورد و نوش کے دلدادہ تھے۔ جو کفّار پر غالب تھے؟ نہیں یہ بات تو نہیں۔ پہلی کتابوں میں بھی ان کی نسبت آیا ہے کہ وہ قائم اللیل اور صائم الدہر

ہوں گے۔ اُن کی راتیں ذکر اور فکر میں گزرتی تھیں اور اُن کی زندگی کیسے بسر ہوتی تھی؟ قرآن کریم کی ذیل کی آیۂ شریفہ اُن کے طریقِ زندگی کا پُورا نقشہ کھینچ کر دکھاتی ہے۔ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال: ۶۱)۔ اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ (آلِ عمران: ۲۰۱) اور سرحد پر اپنے گھوڑے باندھے رکھو کہ خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن اس تمہاری تیاری اور استعداد سے ڈرتے رہیں۔ اے مومنو! صبر اور مصابرت اور مرابطت کرو۔

رِبَاط کے معنی

رِبَاط اُن گھوڑوں کو کہتے ہیں جو دشمن کی سرحد پر باندھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحابہؓ کو اعداء کے مقابلہ کے لیے مستعد رہنے کا حکم دیتا ہے اور اس رِبَاط کے لفظ سے انہیں پوری اور سچی تیاری کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اُن کے سپرد دو کام تھے۔ ایک ظاہری دشمنوں کا مقابلہ اور دُوسرا روحانی مقابلہ اور رِبَاط لغت میں نفس اور انسانی دل کو بھی کہتے ہیں اور یہ ایک لطیف بات ہے کہ گھوڑے وہی کام کرتے ہیں، جو سدھائے ہوتے اور تعلیمیافتہ ہوں۔ آجکل گھوڑوں کی تعلیم و تربیت کا اسی انداز پر لحاظ رکھا جاتا ہے اور اسی طرح اُن کو سدھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ جس طرح بچّوں کو سکولوں میں خاص احتیاط اور اہتمام سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر اُن کو تعلیم نہ دی جائے اور وہ سدھائے نہ جائیں، تو وہ بالکل نکمّے ہوں اور بجائے مفید ہونے کے خوفناک اور مُضر ثابت ہوں۔

یہ اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ انسانوں کے نفوس یعنی رِبَاط بھی تعلیمیافتہ ہونے چاہئیں اور اُن کے قویٰ اور طاقتیں ایسی ہونی چاہئیں جو اللہ تعالیٰ کی حدود کے نیچے نیچے چلیں، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو۔ تو وہ اس حرب اور جدال کا کام نہ دے سکیں گے جو انسان اور اس کے خوفناک دشمن یعنی شیطان کے درمیان اندرونی طور پر ہر لحظہ اور ہر آن جاری ہے۔ جیسا کہ لڑائی اور میدانِ جنگ میں علاوہ قوائے بدنی کے تعلیمیافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اس اندرونی حرب اور جہاد کے لیے نفوسِ انسانی کی تربیت اور مناسب تعلیم مطلوب ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان اس پر غالب آجائے گا اور وہ بہت بُری طرح ذلیل اور رُسوا ہوگا۔ مثلاً اگر ایک شخص توپ و تفنگ، اسلحۂ حرب بندوق وغیرہ تو رکھتا ہو، لیکن اس کے استعمال اور چلانے سے ناواقفِ محض ہو۔ تو وہ دشمن کے مقابلہ میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اور تیر و تفنگ اور سامانِ حرب بھی ایک شخص رکھتا ہو اور اُن کا استعمال کرنا بھی جانتا ہو۔ لیکن اس کے بازو میں طاقت نہ ہو تو بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف طریق اور طرزِ استعمال کا سیکھ لینا بھی کارآمد اور مفید نہیں ہو سکتا۔ جبتک کہ ورزش اور مشق کر کے بازو میں توانائی اور قوت پیدا نہ کی جائے۔ اب اگر ایک شخص جو تلوار چلانا تو جانتا ہے لیکن ورزش اور مشق نہیں رکھتا، تو میدانِ حرب میں جا کر جونہی تین چار دفعہ تلوار کو حرکت دے گا اور دو ایک ہاتھ مارے گا۔ اُس کے بازو نکمّے ہو جائیں گے اور وُہ تھک کر بالکل بے کار ہو جائے گا اور خود ہی آخر دشمن کا شکار ہو جائے گا۔

مجاہدہ اور ریاضت

پس سمجھ لو اور خوب سمجھ لو کہ نِرا علم و فن اور خشک تعلیم بھی کچھ کام نہیں دے سکتی۔ جبتک کہ عمل اور مجاہدہ اور ریاضت نہ ہو۔ دیکھو سرکار بھی فوجوں کو اسی خیال سے بیکار نہیں رہنے دیتی یعنی امن و آرام کے دنوں میں بھی مصنوعی جنگ برپا کر کے فوجوں کو بیکار نہیں بیٹھنے دیتی اور معمولی طور پر چاند ماری اور پریڈ وغیرہ تو ہر روز ہوتی ہی رہتی ہے۔

جیسا ابھی مَیں نے بیان کیا کہ میدانِ کارزار میں کامیاب ہونے کے لیے جہاں ایک طرف طریق استعمالِ اسلحہ وغیرہ کی تعلیم اور واقفیت کی ضرورت ہے وہاں دُوسری طرف ورزش اور محلِ استعمال کی بھی بڑی بھاری ضرورت ہے اور نیز حرب و ضرب کیلئے تعلیمیافتہ گھوڑے چاہئیں۔ یعنی ایسے گھوڑے جو توپوں اور بندوقوں کی آواز سے نہ ڈریں اور گرد و غبار سے پراگندہ ہوکر پیچھے نہ ہٹیں، بلکہ آگے ہی بڑھیں۔ اسی طرح نفوسِ انسانی کامل ورزش اور پُوری ریاضت اور حقیقی تعلیم کے بغیر اعداءُ اللہ کے مقابل میدانِ کارزار میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

عربی زبان کی خُوبی

لغتِ عرب بھی عجیب چیز ہے۔ رِبَاط کا لفظ جو آیہ مذکورہ میں آیا ہے جہاں دُنیاوی جنگ و جدل اور فنونِ جنگ کی فلاسفی پر مشتمل ہے۔ وہاں رُوحانی طور پر اندرونی جنگ اور مجاہدۂ نفس کی حقیقت اور خوبی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے۔ اسی لیے عربی زبان اُمّ الْاَلسِنَہ ہے۔ اس سے وُہ کام نکلتے ہیں، جو دُوسری زبان سے ممکن نہیں اور انشاءاللہ یہ معارف نہایت وضاحت اور لطافت سے کتاب منن الرحمٰن کے ذریعہ سے ظاہر ہوں گے، جو مَیں نے آجکل عربی زبان کی فضیلت اور اُس کو اُمّ الالسنہ ثابت کرنے کے بارہ میں شروع کی ہے۔ معلوم ہو جائے گا کہ یورپین لوگوں کی تحقیقاتیں بالکل نکمی اور ادھوری ہیں۔ اور اُن کو بھی پتہ لگ جائے گا۔ کہ زبانوں کی گم گشتہ ماں بھی اس زمانہ ہی میں جہاں اور گشتہ دینی صداقتیں مِل گئی ہیں۔ مِل گئی ہے اور وُہ عربی ہی ہے۔ الغرض عربی زبان کی لغت جسمانی سِلسلہ میں رُوحانی سلسلہ بھی دکھلاتی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جسمانی امور اور جسمانی باتیں خارجی طور پر ہمارے مشاہدہ میں آتی ہیں اور ہم ان کی ماہیت نہایت سہولت اور آسانی سے سمجھ سکتے ہیں پس اُن پر قیاس کر کے رُوحانی سلسلہ اور رُوحانی اُمور کی فلاسفی سمجھ میں آنی مشکل نہیں ہوتی اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور برکت ہے جو اُس نے اس تاریکی اور ضلالت کے زمانہ میں معرفت کا نُور آسمان سے اُتارا۔ تاکہ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھلائے اور ایسا طریق اور پیرایہ ظاہر کیا جو اب تک راز کے طور پر تھا۔ وہ کیا؟ یہی لغتِ عرب کی فلاسفی اور ماہیت سے استدلال۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے فضل کی قدر کرتے اور اس کے لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

اسلام کو جنگ کی دو قوتیں دی گئی تھیں

اب دیکھو کہ یہی رِبَاط کا لفظ جو اُن گھوڑوں پر بولا جاتا ہے جو سرحد پر دشمنوں سے حفاظت کے لیے باندھے جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ لفظ اُن نفسوں پر بھی بولا جاتا ہے جو اس جنگ کی تیاری کے لیے تعلیمیافتہ ہوں۔ جو انسان کے اندر ہی شیطان

سے ہروقت جاری ہے۔ یہ بالکل ٹھیک بات ہے کہ اسلام کو دو قوتیں جنگ کی دی گئی تھیں۔ ایک قوت وہ تھی جس کا استعمال صدرِ اول میں بطور مدافعت اور انتقام کے ہوا۔ یعنی مشرکین عرب نے جب ستایا اور تکلیفیں دیں، تو ایک ہزار نے ایک لاکھ کفار کا مقابلہ کرکے شجاعت کا جوہر دکھایا اور ہر امتحان میں اس پاک قوت و شوکت کا ثبوت دیا۔ وہ زمانہ گزر گیا اور دِیباچہ کے لفظ میں جو فلاسفی ظاہری قوتِ جنگ اور فنونِ جنگ کی مخفی تھی۔ وہ ظاہر ہوگئی۔

اس زمانہ میں جنگِ باطنی کے نمونے دکھانے مطلوب ہیں

اب اس زمانہ میں جس میں ہم ہیں، ظاہری جنگ کی مطلق ضرورت اور حاجت نہیں۔ بلکہ آخری دنوں میں جنگِ باطنی کے نمونے دکھانے مطلوب تھے اور رُوحانی مقابلہ زیرِ نظر تھا۔ کیونکہ اس وقت باطنی ارتداد اور الحاد کی اشاعت کے لیے بڑے بڑے سامان اور اسلحہ بنائے گئے، اس لیے اُن کا مقابلہ بھی اسی قسم کے اسلحہ سے ضروری ہے۔ کیونکہ آجکل امن و امان کا زمانہ ہے اور ہم کو ہر طرح کی آسائش اور امن حاصل ہے۔ آزادی سے ہر آدمی اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ اور احکام کی بجا آوری کرسکتا ہے۔ پھر اسلام جو امن کا سچا حامی ہے، بلکہ حقیقتاً امن اور سلامتی اور آشتی کا اشاعت کنندہ ہی اسلام ہے کیونکر اس زمانہ امن و آزادی میں اُس پہلے نمونہ کو دکھانا پسند کرسکتا تھا؟ پس آجکل وہی دُوسرا نمونہ یعنی رُوحانی مجاہدہ مطلوب ہے۔ کیونکہ ع کہ حلوا چو یکبار خوردند و بس

موجودہ زمانہ میں جہاد

ایک اور بات بھی ہے کہ اُس پہلے نمونہ کے دکھانے میں ایک اور امر بھی ملحوظ تھا۔ یعنی اُس وقت اظہارِ شجاعت بھی مقصود تھا۔ جو اُس وقت کی دُنیا میں سب سے زیادہ محمود اور محبوب وصف بھی جاتی تھی اور اس وقت تو حرب ایک فن ہوگیا ہے کہ دُور بیٹھے ہوئے بھی ایک آدمی توپ اور بندوق چلاسکتا ہے۔ مگر اُن دنوں میں سچا بہادر وہ تھا جو تلواروں کے سامنے سینہ سپر ہوتا۔ مگر آجکل کا فنِ حرب تو بزدلوں کا پردہ پوش ہے۔ اب شجاعت کا کام نہیں، بلکہ جو شخص آلاتِ حربِ جدید اور نئی توپیں وغیرہ رکھتا ہے اور چلا سکتا ہے وہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ اُس حرب کا مدعا اور مقصد مومنوں کے مخفی مادۂ شجاعت کا اظہار تھا اور خدا تعالیٰ نے جیسا چاہا، خوب طرح اُسے دُنیا پر ظاہر کیا۔ اب اس کی حاجت نہیں رہی، اس لیے کہ اب جنگ نے فن اور مکیدت اور خدیعت کی صورت اختیار کرلی ہے اور نئے نئے آلاتِ حرب اور پیچدار فنون نے اس قیمتی اور قابلِ فخر جوہر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں دفاعی لڑائیوں اور جسمانی جنگوں کی اس لیے بھی ضرورت پڑتی تھی کہ دعوتِ اسلام کرنے والے کا جواب اُن دنوں دلائل و براہین سے نہیں بلکہ تلوار سے دیا جاتا تھا، اس لیے لاچار جواب الجواب میں تلوار سے کام لینا پڑا، لیکن اب تلوار سے جواب نہیں دیا جاتا، بلکہ قلم اور دلائل سے اسلام پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے چاہا ہے کہ سَیف (تلوار) کا کام قلم سے لیا جائے اور تحریر سے مقابلہ کرکے مخالفوں کو پست کیا جائے، اس لیے اب کسی کو شایاں نہیں کہ قلم کا جواب تلوار سے دینے کی کوشش کرے۔ ع گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی ۰

اِس وقت قلم کی ضرورت ہے

اس وقت جو ضرورت ہے۔ وہ یقیناً سمجھ لو۔ سیف کی نہیں بلکہ قلم کی ہے ہمارے مخالفین نے اسلام پر جو شبہات وارد کیے ہیں اور مختلف سائنسوں اور مکائد کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے سچے مذہب پر حملہ کرنا چاہا ہے۔ اُس نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ میں قلمی اسلحہ پہن کر اس سائنس اور علمی ترقی کے میدانِ کارزار میں اُتروں اور اسلام کی رُوحانی شجاعت اور باطنی قوت کا کرشمہ بھی دکھلاؤں میں کب اس میدان کے قابل ہو سکتا تھا۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کی بے حد عنایت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میرے جیسے عاجز انسان کے ہاتھ سے اُس کے دین کی عزت ظاہر ہو۔ میں نے ایک وقت اُن اعتراضات اور حملات کو شمار کیا تھا جو اسلام پر ہمارے مخالفین نے کیے ہیں، تو اُن کی تعداد میرے خیال اور اندازہ میں تین ہزار ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تو تعداد اور بھی بڑھ گئی ہوگی۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اسلام کی بنا ایسی کمزور باتوں پر ہے کہ اس پر تین ہزار اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ اعتراضات تو کوتاہ اندیشوں اور نادانوں کی نظر میں اعتراض ہیں مگر میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے جہاں ان اعتراضات کو شمار کیا، وہاں یہ بھی غور کیا ہے کہ ان اعتراضات کی تہہ میں دراصل بہت ہی نادر صداقتیں موجود ہیں۔ جو عدم بصیرت کی وجہ سے معترضین کو دکھائی نہیں دیں اور درحقیقت یہ خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جہاں نابینا معترض اٹکا ہے، وہیں حقائق و معارف کا مخفی خزانہ رکھا ہے۔

مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کی غرض

اور خدا تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا کہ میں ان خزائنِ مدفونہ کو دُنیا پر ظاہر کروں اور ناپاک اعتراضات کا کیچڑ جو اُن درخشاں جواہرات پر تھوپا گیا ہے۔ اس سے اُن کو پاک صاف کروں۔ خدا تعالیٰ کی غیرت اس وقت بڑی جوش میں ہے کہ قرآنِ شریف کی عزت کو ہر ایک خبیث دشمن کے داغِ اعتراض سے مُنزّہ و مقدس کرے۔

الغرض ایسی صورت میں کہ مخالفین قلم سے ہم پر وار کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں۔ کس قدر بیوقوفی ہوگی کہ ہم اُن سے ماتم لڑنے کو تیار ہو جائیں۔ میں تمہیں کھول کر بتاتا ہوں کہ ایسی صورت میں اگر کوئی اسلام کا نام لیکر جنگ و جدال کا طریق جواب میں اختیار کرے۔ تو وہ اسلام کا بدنام کرنے والا ہوگا۔ اور اسلام کا کبھی ایسا منشاء نہ تھا کہ بے مطلب اور بلا ضرورت تلوار اُٹھائی جائے۔ اب لڑائیوں کی اغراض جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ فن کی شکل میں آکر دینی نہیں رہیں۔ بلکہ دنیوی اغراض ان کا موضوع ہو گیا ہے۔ پس کس قدر ظلم ہوگا کہ اعتراض کرنے والوں کو جواب دینے کی بجائے تلوار دکھائی جائے۔ اب زمانہ کے ساتھ حرب کا پہلو بدل گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اپنے دل اور دماغ سے کام لیں اور نفوس کا تزکیہ کریں۔ راستبازی اور تقویٰ سے خدا تعالیٰ سے امداد اور فتح چاہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا ایک اٹل قانون اور مستحکم اُصول ہے اور اگر مسلمان صرف قیل و قال اور باتوں سے مقابلہ میں کامیابی اور فتح پانا چاہیں، تو یہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ لاف و گزاف اور لفظوں کو نہیں چاہتا۔ وہ تو حقیقی تقویٰ کو چاہتا اور سچی طہارت کو پسند

فرماتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (النحل: ۱۲۹)

عقل سے بھی کام لینا چاہیے

ہم کو عقل سے بھی کام لینا چاہیے، کیونکہ انسان عقل کی وجہ سے مکلف ہے۔ کوئی آدمی بھی خلافِ عقل باتوں کے ماننے پر مجبور نہیں ہو سکتا۔ قویٰ کی برداشت اور حوصلہ سے بڑھ کر کسی قسم کی شرعی تکلیف نہیں اٹھوائی گئی۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ: ۲۸۷) اس آیت سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ایسے نہیں جن کی بجاآوری کوئی کر ہی نہ سکے اور نہ شرائع و احکام خدا تعالیٰ نے دنیا میں اس لیے نازل کیے کہ اپنی بڑی فصاحت و بلاغت اور ایجادی قانونی طاقت اور چیستان طرازی کا فخر انسان پر ظاہر کرے اور یُوں پہلے ہی سے اپنی جگہ ٹھان رکھا تھا کہ کہاں بیہودہ ضعیف انسان اور کہاں کا ان حکموں پر عمل درآمد؟ خدا تعالیٰ اس سے برتر و پاک ہے کہ ایسا لغو فعل کرے۔ ہاں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ دُنیا میں کوئی آدمی شریعت کی تابعداری اور خدا کے حکموں کی بجاآوری کر ہی نہیں سکتا۔ نادان اتنا نہیں جانتے کہ پھر خدا کو شریعت کے بھیجنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ اُن کے خیال اور اعتقاد میں گویا اللہ تعالیٰ نے (نعوذ باللہ) پہلے نبیوں پر شریعت نازل کر کے ایک عبث اور بیہودہ کام کیا۔ اصل میں خدا کی ذاتِ پاک پر اس قسم کی عیب تراشی کی ضرورت عیسائیوں کو اُسی کفارہ کے مسئلہ کی گھڑت کے لیے پیش آئی۔ مجھے حیرت اور تعجب ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ایک اختراعی مسئلہ کی بنیاد قائم کرنے کے لیے اس بات کی بھی پرواہ نہیں کی کہ خدا کی ذات پر کس قسم کا گندہ حرف آتا ہے۔

قرآنی تعلیم کا ہر ایک حکم معلّل باغراض و مصالح ہے

ہاں! یہ خوبی قرآنی تعلیم میں ہے کہ اس کا ہر حکم معلّل باغراض و مصالح ہے اور اس لیے جابجا قرآن کریم میں تاکید ہے کہ عقل، فہم، تدبّر، فقاہت اور ایمان سے کام لیا جاتے اور قرآنِ مجید اور دُوسری کتابوں میں یہی مابہ الامتیاز ہے۔ اور کسی کتاب نے اپنی تعلیم کو عقل اور تدبّر کی دقیق اور آزاد نکتہ چینی کے آگے ڈالنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ بلکہ انجیلِ خاموش کے چالاک اور عیار حامیوں نے اس خیال سے کہ انجیل کی تعلیم عقلی زور کے مقابل بے جان محض ہے۔ نہایت ہوشیاری سے اپنے عقائد میں اس امر کو داخل کر لیا کہ تثلیث اور کفارہ ایسے راز ہیں کہ انسانی عقل اُن کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ برخلاف اس کے فرقانِ حمید کی یہ تعلیم ہے۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ (آلِ عمران: ۱۹۱، ۱۹۲) یعنے آسمانوں کی بناوٹ اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کا آگے پیچھے آنا دانشمندوں کو اُس اللہ کا صاف پتہ دیتے ہیں جس کی طرف مذہبِ اسلام دعوت دیتا ہے۔ اس آیت میں کس قدر صاف حکم ہے کہ دانشمند اپنی دانشوں اور مغزوں سے بھی کام لیں۔

اسلام کا خدا

جان لیں کہ اسلام کا خدا ایسا گورکھ دھندا نہیں کہ اُسے عقل پر پتھر مار کر بہ جبر منوایا جائے۔ اور صحیفۂ فطرت میں کوئی بھی ثبوت اس کے لیے نہ ہو، بلکہ فطرت کے وسیع اوراق میں اُسکے اس قدر نشانات ہیں، جو صاف بتلاتے ہیں کہ وُہ ہے۔ ایک ایک چیز اس کائنات میں اُس نشان اور تختہ کی طرح ہے جو ہر سڑک اور گلی کے سرے پر اس سڑک یا محلہ یا شہر کا نام معلوم کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ خدا کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور اس موجودہ ہستی کا پتہ ہی نہیں بلکہ مطمئن کر دینے والا ثبوت دیتی ہے۔ زمین و آسمان کی شہادتیں کسی مصنوعی اور بناوٹی خدا کی ہستی کا ثبوت نہیں دیتیں۔ بلکہ اس خدائے اَحَد اَلصَّمَد لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کی ہستی کو دکھاتی ہیں جو زندہ اور قائم خدا ہے اور جسے اسلام پیش کرتا ہے، چنانچہ پادری فنڈر جس نے پہلے پہل ہندوستان میں آکر مذہبی مناظروں میں قدم رکھا اور اسلام پر نکتہ چینیاں کیں، اپنی کتاب میزان الحق میں خود ہی سوال کے طور پر لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسا جزیرہ ہو جہاں تثلیث کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ تو کیا وہاں کے رہنے والوں پر آخرت میں مواخذہ تثلیث کے عقیدہ کی بِنا پر ہوگا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اُن سے توحید کا مواخذہ ہوگا۔ اس سے سمجھ لو کہ اگر توحید کا نقش ہر ایک شے میں نہ پایا جاتا اور تثلیث ایک بناوٹی اور مصنوعی تصویر نہ ہوتی، تو عقیدۂ توحید کی بنا پر مواخذہ کیوں ہوتا؟

توحید کا نقش قدرت کی ہر چیز میں رکھا ہوا ہے

بات اصل میں یہ ہے کہ انسان کی فطرت ہی میں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی (الاعراف: ۱۷۲) نقش کیا گیا ہے اور تثلیث سے کوئی مناسبت جبلّتِ انسانی اور تمام اشیائے عالم کو نہیں۔ ایک قطرہ پانی کا دیکھو، تو وہ گول نظر آتا ہے۔ مثلث کی شکل میں نظر نہیں آتا۔ اِس سے بھی صاف طور پر یہی پایا جاتا ہے کہ توحید کا نقش قدرت کی ہر ایک چیز میں رکھا ہوا ہے۔ خُوب غور سے دیکھو کہ پانی کا قطرہ گول ہوتا ہے اور کُروی شکل میں توحید ہی ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ جہت کو نہیں چاہتی اور مثلث شکل جہت کو چاہتی ہے، چنانچہ آگ کو دیکھو۔ شکل بھی مخروطی ہے اور وہ بھی کُرویت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس سے بھی توحید کا نُور چمکتا ہے۔ زمین کو لو۔ اور انگریزوں ہی سے پُوچھو کہ اس کی شکل کیسی ہے؟ کہیں گے گول۔ الغرض طبعی تحقیقاتیں جہاں تک ہوتی چلی جائیں گی وہاں توحید ہی توحید نکلتی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران: ۱۹۱) میں بتلاتا ہے کہ جس خُدا کو قرآن مجید پیش کرتا ہے۔ اس کے لیے زمین و آسمان دلائل سے بھرے پڑے ہیں۔

مجھے ایک حکیم کا مقولہ بہت ہی پسند آتا ہے۔ کہ اگر کُل کتابیں دریا بُرد کر دی جاویں، تو پھر بھی اسلام کا خدا باقی رہ جائے گا۔ اس لیے کہ وہ مثلث اور کہانی نہیں۔ اصل میں پُختہ بات وہی ہے، جس کی صداقت کسی خاص چیز پر منحصر نہ ہو کہ اگر وُہ نہ ہو تو اس کا پتہ ہی ندارد۔ قصّہ کہانی کا نقش نہ دل پر ہوتا، نہ صحیفۂ فطرت میں جب تک کسی پنڈت یا ملّے یا پادری نے یاد رکھا۔ ان کا کوئی وجود مسلّم رہا۔ ازاں بعد حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔

تعلیمِ قرآن کی شہادت قانونِ قدرت کی زبان سے ادا ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ: ۷۸ تا ۸۰) بلکہ یہ سارا صحیفہ قدرت کے مضبوط صندوق میں محفوظ ہے۔ کیا مطلب کہ یہ قرآن کریم ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے۔ اس کا وجود کاغذوں تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے جس کو صحیفۂ فطرت کہتے ہیں۔ یعنی قرآن کی ساری تعلیم کی شہادت قانونِ قدرت کے ذرّہ ذرّہ کی زبان سے ادا ہوتی ہے۔ اُس کی تعلیم اور اس کی برکات کتھا کہانی نہیں جو مٹ جائیں۔

ضرورتِ الہام ہر ایک آدمی چونکہ عقل سے مدارجِ یقین پر نہیں پہنچ سکتا، اس لیے الہام کی ضرورت پڑتی ہے، جو تاریکی میں عقل کے لیے ایک روشن چراغ ہو کر مدد دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے فلاسفر بھی محض عقل پر بھروسہ کر کے حقیقی خدا کو نہ پا سکے؛ چنانچہ افلاطون جیسا فلاسفر بھی مرتے وقت کہنے لگا کہ میں ڈرتا ہوں۔ ایک بت پر میرے لیے ایک مُرغا ذبح کرو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی۔ افلاطون کی فلاسفی، اس کی دانائی اور دانشمندی اُس کو وُہ سچی سکینت اور اطمینان نہیں دے سکے جو مومنوں کو حاصل ہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ الہام کی ضرورت قلبی اطمینان اور دلی استقامت کے لیے اشد ضروری ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے عقل سے کام لو اور یہ یاد رکھو کہ جو عقل سے کام لے گا۔ اسلام کا خدا اُسے ضرور ہی نظر آ جائے گا۔ کیونکہ درختوں کے پتے پتے پر اور آسمان کے اجرام پر اس کا نام بڑے جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے، لیکن بالکل عقل ہی کے تابع نہ بن جاؤ، تا کہ الہامِ الٰہی کی وقعت کو نہ کھو بیٹھو۔ جس کے بغیر نہ حقیقی تسلی اور نہ اخلاقِ فاضلہ نصیب ہو سکتے ہیں۔ برہمو لوگ بھی شانتی اور سچا نُور نجات کا حاصل نہیں کر سکتے، اِس لیے کہ وُہ الہام کی ضرورت کے قائل نہیں۔ ایسے لوگ جو عقل کے بندے ہو کر الہام کو فضول قرار دیتے ہیں۔ مَیں بالکل ٹھیک کہتا ہوں کہ عقل سے بھی کام نہیں لیتے۔ قرآن کریم میں اُن لوگوں کو جو عقل سے کام لیتے ہیں اُولُوا الْاَلْبَاب فرمایا ہے۔ پھر اس کے آگے فرمایا ہے: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آلِ عمران: ۱۹۲) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دُوسرا پہلو بیان کیا ہے کہ اُولُوا الالباب اور عقلِ سلیم بھی وہی رکھتے ہیں جو اللہ جلشانہٗ کا ذکر اُٹھتے بیٹھتے کرتے ہیں۔ یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ عقل و دانش ایسی چیزیں ہیں جو یونہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ نہیں۔

سچی فراست بلکہ سچی فراست اور سچی دانش اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے تو کہا گیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وُہ نُورِ الٰہی سے دیکھتا ہے۔ صحیح فراست اور حقیقی دانش جیسا مَیں نے ابھی کہا۔ کبھی نصیب نہیں ہو سکتی جب تک تقویٰ میسّر نہ ہو۔

اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو۔ تو عقل سے کام لو فکر کرو۔ سوچو۔ تدبّر اور فکر کے لیے قرآن کریم میں بار بار تاکیدیں موجود ہیں۔

کتابِ مکنون القرآن کریم میں فکر کرو اور پارسا طبع ہو جاؤ۔ جب تمھارے دل پاک ہو جائیں گے اور ادھر عقلِ سلیم سے کام لوگے اور تقویٰ کی راہوں پر قدم مارو گے۔ پھر ان دونوں کے جوڑ سے وہ حالت پیدا ہو جائے گی کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران : ۱۹۲) تمہارے دل سے نکلے گا۔ اُس وقت سمجھ میں آجائے گا کہ یہ مخلوق عبث نہیں بلکہ صانعِ حقیقی کی حقانیت اور اثبات پر دلالت کرتی ہے تاکہ طرح طرح کے علوم و فنون جو دین کو مدد دیتے ہیں۔ ظاہر ہوں۔

الہام کی روشنی

خدا تعالیٰ نے مُسلمانوں کو صرف عقل ہی کے عطیہ سے مشرف نہیں فرمایا بلکہ الہام کی روشنی اور نور بھی اس کے ساتھ مرحمت فرمایا ہے۔ اُن کو ان راہوں پر نہیں چلنا چاہیے جن پر خشک منطقی اور فلاسفر چلانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر لسانی قوت غالب ہوتی ہے اور رُوحانی قویٰ بہت ضعیف ہوتے ہیں۔ دیکھو قرآنِ شریف میں خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی تعریف میں اُولِی الْاَيْدِیْ وَالْاَبْصَارِ (صٓ : ۴۶) فرمایا ہے کہیں اُولی الالسنہ نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کو وہی لوگ پسند ہیں۔ جو بصر اور بصیرت سے خدا کے کام اور کلام کو دیکھتے ہیں اور پھر اُس پر عمل کرتے ہیں اور یہ ساری باتیں بجز تزکیہ نفس اور تطہیرِ قوائے باطنیہ کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتیں۔

فلاحِ دارین کے حصول کا طریق

اگر تم چاہتے ہو کہ تمھیں فلاحِ دارین حاصل ہو اور لوگوں کے دلوں پر فتح پاؤ، تو پاکیزگی اختیار کرو۔ عقل سے کام لو اور کلامِ الٰہی کی ہدایات پر چلو۔ خود اپنے تئیں سنوارو اور دُوسروں کو اپنے اخلاقِ فاضلہ کا نمونہ دکھاؤ۔ تب البتہ کامیاب ہو جاؤ گے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

سخن کز دل بروں آید نشیند لاجرم بر دل

پس پہلے دل پیدا کرو۔ اگر دلوں پر اثر اندازی چاہتے ہو تو عملی طاقت پیدا کرو۔ کیونکہ عمل کے بغیر قولی طاقت اور لسانی قوت کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ زبان سے قیل وقال کرنے والے تو لاکھوں ہیں۔ بہت سے مولوی اور علماء کہلا کر منبروں پر چڑھ کر اپنے تئیں نائب الرسول اور وارث الانبیاء قرار دے کر وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تکبر، غرور اور بدکاریوں سے بچو، مگر جو اُن کے اپنے اعمال ہیں اور جو کرتوتیں وہ خود کرتے ہیں۔ ان کا اندازہ اس سے کر لو کہ اُن باتوں کا اثر تمہارے دل پر کہاں تک ہوتا ہے۔

قول و فعل میں مطابقت

اگر اس قسم کے لوگ عملی طاقت بھی رکھتے اور کہنے سے پہلے خود کرتے تو قرآن شریف میں لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصّف : ۳) کہنے کی کیا ضرورت پڑتی؟ یہ آیت ہی بتلاتی ہے کہ دُنیا میں کہہ کر خود نہ کرنے والے بھی موجود تھے اور ہیں اور ہوں گے۔

تم میری بات سُن رکھو اور خوب یاد کر لو کہ اگر انسان کی گفتگو سچے دل سے نہ ہو اور عملی طاقت اُس میں نہ ہو تو وہ اثر انداز

نہیں ہوتی۔ اسی سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صداقت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جو کامیابی اور تاثیر فی القلوب آپؐ کے حصّہ میں آئی اس کی کوئی نظیر بنی آدم کی تاریخ میں نہیں ملتی اور یہ سب اس لیے ہوا کہ آپؐ کے قول اور فعل میں پوری مطابقت تھی۔

میری اِن باتوں پر عمل کرو

میری یہ باتیں اس لیے ہیں کہ تاتم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو اور اس تعلق کی وجہ سے میرے اعضاء ہو گئے ہو۔ اِن باتوں پر عمل کرو۔ اور عقل اور کلامِ الٰہی سے کام لو تاکہ سچی معرفت اور یقین کی روشنی تمہارے اندر پیدا ہو اور تم دوسرے لوگوں کو ظلمت سے نُور کی طرف لانے کا وسیلہ بنو۔ اس لیے کہ آجکل اعتراضوں کی بنیاد طبعی اور طبابت اور ہیئت کے مسائل کی بناء پر ہے۔ اس لیے لازم ہوا کہ ان علوم کی ماہیت اور کیفیت سے آگاہی حاصل کریں، تاکہ جواب دینے سے پہلے اعتراض کی حقیقت تو ہم پر کھل جائے۔

علومِ جدیدہ کی تحصیل

میں اُن مولویوں کو غلطی پر جانتا ہوں جو علومِ جدیدہ کی تعلیم کے مخالف ہیں۔ وہ دراصل اپنی غلطی اور کمزوری کو چھپانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ علومِ جدیدہ کی تحقیقات اسلام سے بدظن اور گمراہ کر دیتی ہے اور وہ یہ قرار دیتے بیٹھے ہیں کہ گویا عقل اور سائنس اسلام سے بالکل متضاد چیزیں ہیں چونکہ خود فلسفہ کی کمزوریوں کو ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے یہ بات تراشتے ہیں کہ علومِ جدیدہ کو پڑھنا ہی جائز نہیں۔ اُن کی رُوح فلسفہ سے کانپتی ہے اور نئی تحقیقات کے سامنے سجدہ کرتی ہے۔

سچا فلسفہ قرآن میں ہے

مگر وُہ سچا فلسفہ اُن کو نہیں ملا جو الہامِ الٰہی سے پیدا ہوتا ہے جو قرآن کریم میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ اُن کو اور صرف انہیں کو دیا جاتا ہے جو نہایت تذلّل اور نیستی سے اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کے دروازے پر پھینک دیتے ہیں۔ جن کے دل اور دماغ سے متکبرانہ خیالات کا تعفّن نکل جاتا ہے اور جو اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے گڑ گڑا کر سچی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں۔

علومِ جدیدہ کو اسلام کے تابع کرنا چاہیے

پس ضرورت ہے کہ آجکل دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے علومِ جدیدہ حاصل کرو اور بڑے جدّ و جہد سے حاصل کرو لیکن مجھے یہ بھی تجربہ ہے جو بطور انتباہ میں بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ان علوم ہی میں یکطرفہ پڑ گئے اور ایسے محو اور منہمک ہوئے کہ کسی اہلِ دل اور اہلِ ذکر کے پاس بیٹھنے کا اُن کو موقعہ نہ ملا اور خود اپنے اندر الٰہی نُور نہ رکھتے تھے، وہ عموماً ٹھوکر کھا گئے اور اسلام سے دُور جا پڑے اور بجائے اس کے کہ اُن علوم کو اسلام کے تابع کرتے، اُلٹا اسلام کو علوم کے ماتحت کرنے کی بے سُود کوشش کر کے اپنے زعم میں دینی اور قومی خدمات کے متکفّل بن گئے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ کام وُہی کر سکتا ہے یعنی دینی خدمت وہی بجا لا سکتا ہے جو آسمانی روشنی اپنے اندر رکھتا ہو۔

بات یہ ہے کہ ان علوم کی تعلیمیں پادریت اور فلسفیت کے رنگ میں رنگی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان تعلیمات کا دلدادہ چند روز تو حسنِ ظن کی وجہ سے جو اس کو فطرتاً حاصل ہوتا ہے۔ رسومِ اسلام کا پابند رہتا ہے، لیکن جُوں جُوں اِدھر قدم بڑھاتا چلا جاتا ہے، اسلام کو دُور چھوڑتا جاتا ہے اور آخر ان رُسوم کی پابندی سے بالکل ہی رہ جاتا ہے اور حقیقت سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور ہوا ہے یکطرفہ علوم کی تحقیقات اور تعلیم میں منہمک ہونے کا۔ بہت سے لوگ قومی لیڈر کہلا کر بھی اس رمز کو نہیں سمجھ سکے کہ علومِ جدیدہ کی تحصیل جب ہی مفید ہو سکتی ہے، جب محض دینی خدمت کی نیت سے ہو اور کسی اہلِ دل آسمانی عقل اپنے اندر رکھنے والے مردِ خدا کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

میرا ایمان یہی کہتا ہے کہ اس دہریت نما نیچریت کے پھیلنے کی یہی وجہ ہے کہ جو شیطانی حملے الحاد کے زہر سے بھرے ہوئے علومِ طبعی، فلسفی یا ہیئت دانوں کی طرف سے اسلام پر ہوتے ہیں اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے یا اُن کا جواب دینے کے لیے اسلام اور آسمانی نور کو عاجز سمجھ کر عقلی ڈھکوسلوں اور فرضی اور قیاسی دلائل کو کام میں لایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے مجیب قرآن کریم کے مطالب اور مقاصد سے کہیں دُور جا پڑتے ہیں اور اِلحاد کا ایک چھپا ہوا پردہ اپنے دل پر ڈال لیتے ہیں، جو ایک وقت آکر اگر اللہ تعالیٰ اپنا فضل نہ کرے، تو دہریت کا جامہ پہن لیتا ہے اور وہی رنگ دل کو دیتا ہے جس سے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

آجکل کے تعلیمیافتہ لوگوں پر ایک اتنی بڑی آفت جو آکر پڑتی ہے وُہ یہ ہے کہ اُن کو دینی علوم سے مُطلق مَس نہیں ہوتا۔ پھر جب وہ کسی ہیئت دان یا فلسفہ دان کے اعتراض پڑھتے ہیں، تو اسلام کی نسبت شکوک اور وساوس ان کو پیدا ہو جاتے ہیں۔ تب وہ عیسائی یا دہریہ بن جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اُن کے والدین بھی ان پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔ کہ دینی علوم کی تحصیل کے لیے ذرا سا وقت بھی اُن کو نہیں دیتے اور ابتدا ہی سے ایسے دھندوں اور بکھیڑوں میں ڈال دیتے ہیں جو انہیں پاک دین سے محروم کر دیتے ہیں۔

دینی تعلیم و تربیت کا صحیح وقت

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ دینی علوم کی تحصیل کے لیے طفولیت کا زمانہ بہت ہی مناسب اور موزون ہے۔ جب ڈاڑھی نکل آئی، تب ضَرَبَ یَضْرِبُ یاد کرنے بیٹھے تو کیا خاک ہوگا۔ طفولیت کا حافظہ تیز ہوتا ہے۔ انسانی عمر کے کسی دُوسرے حصّہ میں ایسا حافظہ کبھی بھی نہیں ہوتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ طفولیت کی بعض باتیں تو اب تک یاد ہیں، لیکن پندرہ برس پہلے کی اکثر باتیں یاد نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی عمر میں علم کے نقوش ایسے طور پر اپنی جگہ کر لیتے ہیں اور قویٰ کے نشوونما کی عمر ہونے کے باعث ایسے دلنشیں ہو جاتے ہیں کہ پھر ضائع نہیں ہو سکتے۔ غرض یہ ایک طویل امر ہے۔ مختصر یہ کہ تعلیمی طریق میں اس اَمر کا لحاظ اور خاص توجہ چاہیے کہ دینی تعلیم ابتدا سے ہی ہو۔ اور میری ابتدا سے یہی خواہش رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرے۔ دیکھو تمہاری ہمسایہ قوموں یعنی آریوں نے کس قدر حیثیت تعلیم کے لیے بنائی کئی لاکھ

سے زیادہ روپیہ جمع کرلیا۔ کالج کی عالیشان عمارت اور سامان بھی پیدا کیا۔ اگر مسلمان پورے طور پر اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کریں گے، تو میری بات سن رکھیں کہ ایک وقت اُن کے ہاتھ سے بچے بھی جاتے رہیں گے۔

صحبت کا اثر

مثل مشہور ہے "تخم تاثیر صحبت را اثر" اس کے اول جزو (حصّہ) پر کلام ہو تو ہو، لیکن دُوسرا حصّہ "صحبت را اثر" ایسا ثابت شدہ مسئلہ ہے کہ اس پر زیادہ بحث کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ ہر ایک شریف قوم کے بچوں کا عیسائیوں کے پھندے میں پھنس جانا اور مسلمانوں حتیٰ کہ غوث وقطب کہلانے والوں کی اولاد اور سادات کے فرزندوں کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنا دیکھ چکے ہو۔ اُن صحیح النسب سیدوں کی جو اولاد اپنا سلسلہ حضرت امام حسینؓ تک پہنچاتے ہیں۔ ہم نے کرسچن (عیسائی) دیکھی ہے۔ اور بانیٔ اسلام کی نسبت قسم قسم کے الزام (نعوذ باللہ) لگاتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی اگر کوئی مسلمان اپنے دین اور اپنے نبیؐ کے لیے غیرت نہیں رکھتا، تو اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا؟

اگر تم اپنے بچوں کو عیسائیوں، آریوں اور دُوسروں کی صحبت سے نہیں بچاتے یا کم از کم نہیں بچانا چاہتے، تو یاد رکھو کہ نہ صرف اپنے اُوپر بلکہ قوم پر اور اسلام پر ظلم کرتے اور بہت بڑا بھاری ظلم کرتے ہو۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ گویا تمہیں اسلام کے لیے کچھ غیرت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت تمہارے دل میں نہیں۔

راستباز اور متقی بنو تاکہ عقل میں جودت اور ذہانت پیدا ہو

ذرا سوچو اور سمجھو۔ خدا کے واسطے عقل سے کام لو اور اس لیے کہ عقل میں جودت اور ذہانت پیدا ہو۔ راستباز اور متقی بنو۔ پاک عقل آسمان سے آتی ہے اور اپنے ہمراہ ایک نُور لاتی ہے، لیکن وُہ جوہر قابل کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس پاک سلسلہ کا قانون وہی قانون ہے جو ہم جسمانی قانون میں دیکھتے ہیں۔ بارش آسمان سے پڑتی ہے، لیکن کوئی جگہ اُس بارش سے گلزار ہوتی ہے اور کہیں کانٹے اور جھاڑیاں ہی اُگتی ہیں اور کہیں وہی قطرہ بارش سمندر کی تہہ میں جا کر ایک گوہرِ شاہوار بنتا ہے۔ بقول کسے ؎

در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اگر زمین قابل نہیں ہوتی، تو بارش کا کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ اُلٹا ضرر اور نقصان ہوتا ہے۔ اسی لیے آسمانی نُور اترا ہے اور وہ دلوں کو روشن کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے قبول کرنے اور اُس سے فائدہ اٹھانے کو تیار ہو جاؤ تا کہ ایسا نہ ہو کہ بارش کی طرح کہ جو زمین جوہر قابل نہیں رکھتی، وُہ اُس کو ضائع کر دیتی ہے۔ تم بھی باوجود نُور کی موجودگی کے تاریکی میں چلو اور ٹھوکر کھا کر اندھے کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ مادرِ مہربان سے بھی بڑھ کر مہربان ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اُس کی مخلوق ضائع ہو۔ وُہ ہدایت اور روشنی کی راہیں تم پر کھولتا ہے، مگر تم اُن پر قدم مارنے کے لیے عقل اور تزکیۂ نفوس سے کام لو۔ جیسے زمین کہ جبتک ہل چلا کر تیار نہیں کی جاتی، تخم ریزی اُس میں نہیں ہوتی۔ اسی طرح جبتک مجاہدہ

اور ریاضت سے تزکیہ نفوس نہیں ہوتا، پاک عقل آسمان سے اُتر نہیں سکتی۔

اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے بڑا فضل کیا اور اپنے دین اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں غیرت کھا کر ایک انسان کو جو تم میں بول رہا ہے بھیجا تاکہ وہ اس روشنی کی طرف لوگوں کو بلاتے۔ اگر زمانہ میں ایسا فساد اور فتنہ نہ ہوتا اور دین کو محو کرنے کے لیے جس قسم کی کوششیں ہو رہی ہیں نہ ہوتیں، تو چنداں حرج نہ تھا۔ لیکن اب تم دیکھتے ہو کہ ہر طرف یمین ویسار اسلام ہی کو معدوم کرنے کی فکر میں جملہ اقوام لگی ہوئی ہیں۔ مجھے یاد ہے اور براھین احمدیہ میں بھی میں نے ذکر کیا ہے کہ اسلام کے خلاف چھ کروڑ کتابیں تصنیف اور تالیف ہو کر شائع کی گئی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد بھی چھ کروڑ اور اسلام کے خلاف کتابوں کا شمار بھی اسی قدر ہے۔ اگر اس زیادتی تعداد کو جو ابتک ان تصنیفات میں ہوئی ہے چھوڑ بھی دیا جائے، تو بھی ہمارے مخالف ایک ایک کتاب ہر ایک مسلمان کے ہاتھ میں دے چکے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا جوش غیرت میں نہ ہوتا۔ اور اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر : ۱۰) اس کا وعدہ صادق نہ ہوتا تو یقیناً سمجھو کہ اسلام آج دنیا سے اُٹھ جاتا اور اُس کا نام ونشان تک مِٹ جاتا، مگر نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ خدا تعالیٰ کا پوشیدہ ہاتھ اُس کی حفاظت کر رہا ہے۔ مجھے افسوس اور رنج اس امر کا ہوتا ہے کہ لوگ مسلمان کہلا کر ناطے بیاہ کے برابر بھی تو اسلام کا فکر نہیں کرتے اور مجھے اکثر بار پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ عیسائی عورتوں تک مرتے وقت لکھو کھا روپیہ عیسائی دین کی ترویج اور اشاعت کے لیے وصیت کر جاتی ہیں اور اُن کا اپنی زندگیوں کو عیسائیت کی اشاعت میں صَرف کرنا تو ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔ ہزار ہا لیڈیز مشنری، گھروں اور کوچوں میں پھرتی ہیں اور جس طرح بن پڑے نقد ایمان چھینتی پھرتی ہیں۔ مسلمانوں میں سے کسی ایک کو نہیں دیکھا کہ وہ پچاس روپیہ بھی اشاعتِ اسلام کے لیے وصیت کر کے مرا ہو۔ ہاں، شادیوں اور دنیاوی رسوم پر تو بے حد اسراف ہوتے ہیں اور قرض لے کر بھی دل کھول کر فضول خرچیاں کی جاتی ہیں، اگر خرچ کرنے کے نہیں، تو صرف اسلام کے لیے نہیں۔ افسوس! افسوس!! اس سے بڑھ کر اور مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم کیا ہوگی؟

ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا ہوتی ہے

اصل بات یہ ہے کہ بد اعمالی کا نتیجہ بد اعمالی ہوتا ہے۔ اسلام کے لیے خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت ہے کہ ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد آیا تذکرۃ الاولیاء میں میں نے پڑھا تھا کہ ایک آتش پرست بڈھا نوّے برس کی عُمر کا تھا۔ اتفاقاً بارش کی جھڑی جو لگ گئی، تو وہ اُس جھڑی میں کوٹھے پر چڑیوں کے لیے دانے ڈال رہا تھا۔ کسی بزرگ نے پاس سے کہا کہ ارے بڈھے تُو کیا کرتا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ بھائی چھ سات روز متواتر بارش ہوتی رہی ہے۔ چڑیوں کو دانہ ڈالتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ تو عبث یہ حرکت کرتا ہے۔ تُو کافر ہے۔ تجھے اجر کہاں۔ بُڑھے نے جواب دیا مجھے اس کا اجر ضرور ملے گا۔ بزرگ صاحب فرماتے ہیں کہ میں حج کو گیا، تو دُور سے کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بڈھا طواف

کر رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا اور جب میں آگے بڑھا تو پہلے وہی بولا۔ کیا میرے دانے ڈالنا ضائع گیا، یا اُن کا عوض ملا؟

نیکی کا اجر ضائع نہیں ہوتا

اب خیال کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کافر کی نیکی کا اجر بھی ضائع نہیں کیا، تو کیا مسلمان کی نیکی کا اجر ضائع کر دے گا؟ مجھے ایک صحابی کا ذکر یاد آیا۔ کہ اُس نے کہا یا رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)، میں نے اپنے کفر کے زمانہ میں بہت سے صدقات کئے ہیں۔ کیا اُن کا اجر مجھے ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ وہی صدقات تو تیرے اسلام کا موجب ہو گئے ہیں۔

نیکی کیا چیز ہے؟

نیکی ایک زینہ ہے اسلام اور خدا کی طرف چڑھنے کا۔ لیکن یاد رکھو کہ نیکی کیا چیز ہے۔ شیطان ہر ایک راہ میں لوگوں کی راہ زنی کرتا ہے اور اُن کو راہِ حق سے بہکاتا ہے۔ مثلاً رات کو روٹی زیادہ پک گئی اور صبح باسی بچ رہی۔ عین کھانے کے وقت کہ اس کے سامنے اچھے اچھے کھانے رکھے ہیں۔ ابھی ایک لقمہ نہیں لیا کہ دروازہ پر آکر فقیر نے صدا کی اور روٹی مانگی۔ کہا کہ باسی روٹی سائل کو دے دو۔ کیا یہ نیکی ہوگی؟ باسی روٹی تو پڑی ہی رہتی تھی تنعم پسند اُسے کیوں کھانے لگے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدہر: ۹) یہ بھی معلوم ہے کہ طعام کہتے ہی پسندیدہ طعام کو ہیں۔ سڑا ہوا باسی طعام نہیں کہلاتا۔ الغرض اس رکابی میں سے جس میں ابھی تازہ کھانا لذیذ اور پسندیدہ رکھا ہوا ہے۔ کھانا شروع نہیں کیا۔ فقیر کی صدا پر نکال دے، تو یہ تو نیکی ہے۔

بیکار اور نکمی چیزوں کے خرچ کرنے سے کوئی آدمی نیکی کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ نیکی کا دروازہ تنگ ہے۔ پس یہ امر ذہن نشین کر لو کہ نکمی چیزوں کے خرچ کرنے سے کوئی اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نصِ صریح ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (آل عمران: ۹۳) جبتک عزیز سے عزیز اور پیاری سے پیاری چیزوں کو خرچ نہ کرو گے اُس وقت تک محبوب اور عزیز ہونے کا درجہ نہیں مل سکتا۔ اگر تکلیف اُٹھانا نہیں چاہتے اور حقیقی نیکی کو اختیار کرنا نہیں چاہتے تو کیونکر کامیاب اور بامُراد ہو سکتے ہو۔ کیا صحابہ کرامؓ مفت میں اس درجہ تک پہنچ گئے جو اُن کو حاصل ہوا۔ دُنیاوی خطابوں کے حاصل کرنے کے لیے کس قدر اخراجات اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، تب کہیں جا کر ایک معمولی خطاب جس سے دلی اطمینان اور سکینت حاصل نہیں ہو سکتی، ملتا ہے۔ پھر خیال کرو کہ رضی اللہ عنہم کا خطاب جو دل کو تسلّی اور قلب کو اطمینان اور مولیٰ کریم کی رضامندی کا نشان ہے، کیا یُونہی آسانی سے مل گیا؟

بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضامندی جو حقیقی خوشی کا موجب ہے، حاصل نہیں ہو سکتی۔ جبتک عارضی تکلیفیں برداشت نہ کی جاویں، خُدا ٹھگا نہیں جا سکتا۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جو رضائے الٰہی کے حصُول کے لیے تکلیف کی پروا نہ کریں کیونکہ اَبدی خوشی اور دائمی آرام کی رَوشنی اس عارضی تکلیف کے بعد مومن کو ملتی ہے۔

٭ ٭ ٭

سچا مُسلمان کون ہے؟

مَیں کھول کر کہتا ہوں کہ جبتک ہر بات پر اللہ تعالیٰ مقدم نہ ہو جاوے اور دل پر نظر ڈال کر وہ نہ دیکھ سکے کہ یہ میرا ہی ہے، اس وقت تک کوئی سچا مومن نہیں کہلا سکتا۔ ایسا آدمی تو ال (عُرفِ عام) کے طور پر مومن یا مُسلمان ہے۔ جیسے چوہڑے کو بھی مصلّی یا مومن کہہ دیتے ہیں۔ مُسلمان وہی ہے جو اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کا مصداق ہوگیا ہو۔ وجہ مُونہہ کو کہتے ہیں مگر اس کا اطلاق ذات اور وجُود پر بھی ہوتا ہے پس جس نے ساری طاقتیں اللہ کے حضُور رکھ دی ہوں۔ وہی سچا مُسلمان کہلانے کا مستحق ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مُسلمان نے کسی یہُودی کو دعوتِ اسلام کی کہ تُو مُسلمان ہوجا۔ مُسلمان خود فسق و فجور میں مبتلا تھا۔ یہودی نے اس فاسق مُسلمان کو کہا کہ تُو پہلے اپنے آپ کو دیکھ اور تُو اس بات پر مغرور نہ ہو کہ تُو مُسلمان کہلاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اسلام کا مفہوم چاہتا ہے نہ نام اور لفظ۔ یہودی نے اپنا قصّہ بیان کیا کہ مَیں نے اپنے لڑکے کا نام خالد رکھا تھا، مگر دُوسرے دن مجھے اُسے قبر میں گاڑنا پڑا۔ اگر صرف نام ہی میں برکت ہوتی تو وہ کیوں مرتا۔ اگر کوئی مُسلمان سے پوچھتا ہے کہ کیا تُو مُسلمان ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

پس یاد رکھو کہ صرف لفاظی اور لسانی کام نہیں آسکتی، جبتک کہ عمل نہ ہو۔ محض باتیں عنداللہ کچھ بھی وقعت نہیں رکھتیں چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف: ۴)

اِسلام کی خدمت کا شرف حاصل کرنے کا طریق

اَب مَیں پھر اپنے پہلے مقصد کی طرف رجُوع کرتا ہوں۔ یعنی صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (آل عمران: ۲۰۱) جس طرح دشمن کے مقابلہ پر سرحد پر گھوڑا ہونا ضروری ہے تاکہ دشمن حد سے نہ نکلنے پاوے۔ اسی طرح تم بھی تیار رہو۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن سرحد سے گذر کر اسلام کو صدمہ پہنچائے۔ مَیں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ اگر تم اسلام کی حمایت اور خدمت کرنا چاہتے ہو، تو پہلے خود تقویٰ اور طہارت اختیار کرو جس سے خود تم خدا تعالیٰ کی پناہ کے حصنِ حصین میں آسکو۔ اور پھر تم کو اس خدمت کا شرف اور استحقاق حاصل ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ مُسلمانوں کی بیرونی طاقت کیسی کمزور ہوگئی ہے۔ قومیں انکو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اگر تمہاری اندرونی اور قلبی طاقت بھی کمزور اور پست ہوگئی، تو بس پھر تو خاتمہ ہی سمجھو۔ تم اپنے نفسوں کو ایسے پاک کرو کہ قُدسی قوّت ان میں سرایت کرے اور وہ سرحد کے گھوڑوں کی طرح مضبوط اور محافظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہمیشہ متقیوں اور راستبازوں ہی کے شاملِ حال ہوا کرتا ہے۔ اپنے اخلاق اور اطوار ایسے نہ بناؤ جن سے اسلام کو داغ لگ جاوے۔ بدکاروں اور اسلام کی تعلیم پر عمل نہ کرنے والے مُسلمانوں سے اسلام کو داغ لگتا ہے۔ کوئی مُسلمان شراب پی لیتا ہے تو کہیں قے کرتا پھرتا ہے۔ پگڑی گلے میں ہوتی ہے۔ موریوں اور گندی نالیوں میں گرتا پھرتا ہے۔ پولیس کے جُوتے پڑتے ہیں۔ ہندو اور عیسائی اس پر ہنستے ہیں۔ اس کا ایسا خلافِ شرع فعل اس کی ہی تضحیک کا موجب نہیں ہوتا بلکہ درپردہ اس کا اثر نفسِ اسلام تک پہنچتا ہے۔ مجھے ایسی خبریں یا جیل خانوں کی رپورٹیں پڑھ کر سخت رنج ہوتا ہے۔ جب

میں دیکھتا ہوں کہ اس قدر مسلمان بدعملیوں کی وجہ سے موردِ عتاب ہوتے۔ دل بیقرار ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ جو صراطِ مستقیم رکھتے ہیں۔ اپنی بداعتدالیوں سے صرف اپنے آپ کو نقصان نہیں پہنچاتے، بلکہ اسلام پر ہنسی کراتے ہیں یہی وجہ تھی کہ کسی گذشتہ مردم شماری کے وقت مسٹر ابیٹسن صاحب نے اپنی رپورٹ میں بہت کچھ لکھا تھا، میری غرض اس سے یہ ہے کہ مسلمان لوگ مسلمان کہلا کر ان ممنوعات اور منہیات میں مبتلا ہوتے ہیں جو نہ صرف ان کو بلکہ اسلام کو مشکوک کر دیتے ہیں پس اپنے چال چلن اور اطوار ایسے بناؤ کہ کفار کو بھی تم پر (جو در اصل اسلام پر ہوتی ہے) نکتہ چینی کرنے کا موقعہ نہ ملے۔

اصل شکر تقویٰ اور طہارت ہے

تمہارا اصل شکر تقویٰ اور طہارت ہی ہے۔ مسلمان کا پوچھنے پر الحمد للہ کہہ دینا سچا سپاس اور شکر نہیں ہے۔ اگر تم نے حقیقی سپاس گذاری یعنی طہارت اور تقویٰ کی راہیں اختیار کریں۔ تو میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ تم سرحد پر کھڑے ہو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ہندو سررشتہ دار نے جس کا نام جگن ناتھ تھا اور جو ایک متعصب ہندو تھا بتلایا کہ امرتسر یا کسی جگہ میں وہ سررشتہ دار تھا جہاں ایک ہندو اہلکار در پردہ نماز پڑھا کرتا تھا، مگر بظاہر ہندو تھا۔ میں اور دیگر سارے ہندو اُسے بہت بُرا جانتے تھے اور ہم سب اہلکاروں نے مل کر ارادہ کر لیا کہ اس کو ضرور موقوف کرائیں۔ سب سے زیادہ شرارت میرے دل میں تھی۔ میں نے کئی بار شکایت کی کہ اس نے یہ غلطی کی ہے اور یہ خلاف ورزی کی ہے، مگر اس پر کوئی التفات نہ ہوتی تھی۔ لیکن ہم نے ارادہ کر لیا ہوا تھا کہ اُسے ضرور موقوف کرا دیں گے۔ اور اپنے اس ارادہ میں کامیاب ہونے کے لیے بہت سی نکتہ چینیاں بھی جمع کر لی تھیں اور میں وقتاً فوقتاً ان نکتہ چینیوں کو صاحب بہادر کے رُوبرو پیش کر دیا کرتا تھا۔ صاحب اگر بہت ہی غصہ ہو کر اُس کو بُلا بھی لیتا تھا۔ تو جونہی وہ سامنے آجاتا، تو گویا آگ پر پانی پڑ جاتا۔ معمولی طور پر نہایت نرمی سے فہمائش کر دیتا۔ گویا اس سے کوئی قصور سرزد ہی نہیں ہوا۔

تقویٰ کا رُعب دوسروں پر بھی پڑتا ہے

اصل بات یہ ہے کہ تقویٰ کا رُعب دُوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ متقیوں کو ضائع نہیں کرتا۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ حضرت سید عبدالقادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے اکابر میں سے ہوئے ہیں۔ ان کا نفس بڑا مطہر تھا۔ ایک بار اُنھوں نے اپنی والدہ سے کہا کہ میرا دل دُنیا سے برداشتہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی پیشوا تلاش کروں جو مجھے سکینت اور اطمینان کی راہیں دکھلائے۔ والدہ نے جب دیکھا کہ یہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا، تو اُن کی بات کو مان لیا اور کہا کہ اچھا میں تجھے رخصت کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر اندر گئی اور اَسّی مُہریں جو اس نے جمع کی ہوئی تھیں، اُٹھا لائی اور کہا کہ ان مہروں سے حصہ شرعی کے موافق چالیس مہریں تیری ہیں اور چالیس تیرے بڑے بھائی کی۔ اس لیے چالیس مُہریں تجھے بحصہ رسدی دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چالیس مُہریں اُن کی بغل کے نیچے پیراہن میں سی دیں اور کہا کہ امن کی جگہ پہنچ کر نکال لینا اور عندالضرورت اپنے صرف میں لانا۔ سید عبدالقادر صاحبؒ نے اپنی والدہ سے عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرما دیں۔

اُنھوں نے کہا کہ بیٹا جھوٹ کبھی نہ بولنا۔ اس سے بڑی برکت ہوگی۔ اتنا سُن کر آپؒ رخصت ہوتے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس جنگل میں سے ہو کر آپؒ گذرے، اُس میں چند راہزن قزاق رہتے تھے۔ جو مسافروں کو لُوٹ لیا کرتے تھے۔ دُور سے سیّد عبدالقادر صاحبؒ پر بھی اُن کی نظر پڑی۔ قریب آئے، تو اُنھوں نے کمبل پوش فقیر سا دیکھا۔ ایک نے ہنسی سے دریافت کیا کہ تیرے پاس کچھ ہے؟ آپؒ ابھی اپنی والدہ سے تازہ نصیحت سُن کر آتے تھے کہ جھوٹ نہ بولنا۔ فی الفور جواب دیا کہ ہاں چالیس مُہریں میری بغل کے نیچے ہیں۔ جو میری والدہ صاحبہ نے کیسہ کی طرح سی دی ہیں۔ اُس قزاق نے سمجھا کہ یہ ٹھٹھا کرتا ہے۔ دُوسرے قزاق نے جب پُوچھا تو اُس کو بھی یہی جواب دیا۔ الغرض ہر ایک چور کو یہی جواب دیا۔ وہ ان کو اپنے امیرِ قزاقان کے پاس لے گئے کہ بار بار یہی کہتا ہے۔ امیر نے کہا۔ اچھا۔ اس کا کپڑا دیکھو تو سہی۔ جب تلاشی لی گئی، تو واقعی چالیس مُہریں برآمد ہوئیں۔ وہ حیران ہوئے کہ یہ عجیب آدمی ہے۔ ہم نے ایسا آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ امیر نے آپؒ سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ تُو نے اِس طرح پر اپنے مال کا پتہ بتا دیا؟ آپؒ نے فرمایا کہ مَیں خدا کے دین کی تلاش میں جاتا ہوں۔ روانگی پر والدہ صاحبہ نے نصیحت فرمائی تھی کہ جھوٹ کبھی نہ بولنا۔ یہ پہلا امتحان تھا۔ مَیں جھوٹ کیوں بولتا۔ یہ سُنکر امیر قزاقان رو پڑا اور کہا کہ آہ! مَیں نے ایک بار بھی خدا تعالیٰ کا حکم نہ مانا۔ چوروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کلمہ اور اس شخص کی استقامت نے میرا تو کام تمام کر دیا ہے۔ اب مَیں تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتا اور توبہ کرتا ہوں۔ اس کے کہنے کے ساتھ ہی باقی چوروں نے بھی توبہ کر لی۔ ..... مَیں "چوروں قطب بنایا ای" اسی واقعہ کو سمجھتا ہوں۔ الغرض سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلے بیعت کرنے والے چور ہی تھے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا (آل عمران: ۲۰۱) صبر ایک نقطہ کی طرح پیدا ہوتا ہے اور پھر دائرہ کی شکل اختیار کر کے سب پر محیط ہو جاتا ہے۔ آخر بدمعاشوں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دے اور تقویٰ کی راہوں پر مضبوطی سے قدم مارے۔ کیونکہ مُتقی کا اثر ضرور پڑتا ہے اور اُس کا رُعب مخالفوں کے دل میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

تقویٰ کے اجزاء تقویٰ کے بہت سے اجزاء ہیں۔ عُجب، خود پسندی، مالِ حرام سے پرہیز اور بد اخلاقی سے بچنا بھی تقویٰ ہے۔ جو شخص اچھے اخلاق ظاہر کرتا ہے۔ اِس کے دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (المومنون: ۹۷)

اَب خیال کرو کہ یہ ہدایت کیا تعلیم دیتی ہے؟ اس ہدایت میں اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ اگر مخالف گالی بھی دے، تو اس کا جواب گالی سے نہ دیا جائے بلکہ اُس پر صبر کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مخالف تمہاری فضیلت کا قائل ہو کر خود ہی نادم اور شرمندہ ہوگا اور یہ سزا اُس سزا سے بہت بڑھ کر ہوگی جو انتقامی طور پر تم اُس کو دے سکتے ہو۔ یُوں تو ایک ذرا سا آدمی اقدامِ قتل تک نوبت پہنچا سکتا ہے لیکن انسانیت کا تقاضا اور تقویٰ کا منشاء یہ نہیں ہے۔ خوش اخلاقی

ایک ایسا جوہر ہے کہ مُوذی سے مُوذی انسان پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔ کہ ع

لُطف کُن لُطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

فاسق آدمی جو انبیاء کے مقابلہ پر تھے۔ خصوصًا وہ لوگ جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر تھے۔ اُنکا ایمان لانا معجزات پر منحصر نہ تھا اور نہ معجزات اور خوارق اُن کی تسلّی کا باعث تھے، بلکہ وہ لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ کو ہی دیکھ کر آپؐ کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے۔ اخلاقی معجزات وہ کام کر سکتے ہیں جو اقتداری معجزات نہیں کر سکتے اَلْاِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْکَرَامَةِ کا یہی مفہوم ہے اور تجربہ کر کے دیکھ لو کہ استقامت کیسے کرشمے دکھاتی ہے۔ کرامت کی طرف تو چنداں التفات ہی نہیں ہوتا، خصوصًا آجکل کے زمانہ میں، لیکن اگر پتہ لگ جائے کہ فلاں شخص بااخلاق آدمی ہے، تو اس کی طرف جس قدر رجُوع ہوتا ہے۔ وہ کوئی مخفی امر نہیں۔ اخلاقِ حمیدہ کی زد اُن لوگوں پر بھی پڑتی ہے جو کئی قسم کے نشانات کو دیکھ کر بھی اطمینان اور تسلّی نہیں پا سکتے۔ بات یہ ہے کہ بعض آدمی ظاہری معجزات اور خوارق کو دیکھ کر ایمان لاتے ہیں اور بعض حقائق اور معارف کو دیکھ کر۔ مگر اکثر لوگ وُہ ہوتے ہیں جن کی ہدایت اور تسلّی کا موجب اخلاقِ فاضلہ اور التفات ہوتے ہیں۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر ایک قسم کے خوارق اور معجزات حاصل تھے۔ ہم آپؐ کی شان کیا بیان کریں۔ جس طرف دیکھو، بے شمار معجزات ملیں گے۔ ہر سہ اقسام بالا کے مُعجزات ملیں گے۔ ہر سہ اقسام بالا کے معجزات کا آپؐ مجموعہ تھے۔ ظاہری خوارق مثل شق القمر وغیرہ، دیگر معجزات جن کی تعداد تین ہزار سے بھی زائد ہے۔ معارف اور حقائق کے معجزات سے تو سارا قرآن شریف لبریز ہے جو ہر وقت تازہ اور رسنئے ہیں اور بلحاظ اخلاقی معجزات کے خود آپؐ کا وجود مقدس اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۵) کا مصداق ہے۔ قرآن کریم اپنے اعجاز کے ثبوت میں اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرہ: ۲۴) کہتا ہے۔ یہ معجزات رُوحانی ہیں جس طرح وحدانیت کے دلائل دیئے ہیں۔ اسی طرح پر اس کی حکمت، فصاحت، بلاغت کی مثل لانے پر بھی انسان قادر نہیں۔ دُوسرے مقام پر فرمایا: لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (بنی اسرائیل: ۸۹)

قرآنِ مجید کی فصاحت و بلاغت

غرض روحانی معجزات کے بارہ میں کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ مُسلمانوں کا وہم اور خیالِ باطل ہے۔ آجکل کے نیچری نہیں بلکہ (وہ لوگ جو) خلافِ نیچر (ہیں) یہ نہیں مانتے کہ فصاحت و بلاغت قرآن شریف کا معجزہ ہے۔ سیّد احمد نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اور وہ اس کی فصاحت و بلاغت کو معجزہ نہیں مانتے۔ جب ہم یاد کرتے ہیں، تو ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ سیّد احمد نے معجزات سے انکار کیا ہے۔ سیّد صاحب کسی طور سے معجزہ نہیں مان سکتے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ایک معمولی درجہ کا آدمی یا اعلیٰ درجہ کا آدمی بھی نظیر بنا سکتا ہے، مگر افسوس تو یہ ہے کہ وُہ اتنا نہیں جانتے کہ قرآن مجید لانے والا وہ شان رکھتا ہے کہ يَتْلُوْا صُحُفًا

مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البينة : ۳، ۴) ایسی کتاب جس میں ساری کتابیں اور ساری صداقتیں موجود ہیں۔ کتاب سے مراد اور عام مفہوم وہ عمدہ باتیں ہیں جو بالطبع انسان قابل تقلید سمجھتا ہے۔

قرآن مجید کی جامعیت

قرآن شریف حکمتوں اور معارف کا جامع ہے اور وہ رطب و یابس فضولیات کا کوئی ذخیرہ اپنے اندر نہیں رکھتا۔ ہر ایک امر کی تفسیر وہ خود کرتا ہے اور ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان اس کے اندر موجود ہے۔ وہ ہر ایک پہلو سے نشان اور آیت ہے۔ اگر کوئی اس امر کا انکار کرے تو ہم ہر پہلو سے اس کا اعجاز ثابت کرنے اور دکھلانے کو تیار ہیں آجکل توحید اور ہستی الٰہی پر بہت زور آور حملے ہو رہے ہیں۔ عیسائیوں نے بھی بہت کچھ زور مارا اور لکھا ہے لیکن جو کچھ کہا اور لکھا وہ اسلام کے خدا کی بابت ہی لکھا ہے۔ نہ کہ ایک مردہ، مصلوب اور عاجز خدا کی بابت۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر قلم اُٹھائے گا۔ اس کو آخر کار اسی خدا کی طرف آنا پڑے گا۔ جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ صحیفۂ فطرت کے ایک ایک پتے میں اس کا پتہ ملتا ہے اور بالطبع انسان اُسی خدا کا نقش اپنے اندر رکھتا ہے۔ غرض ایسے آدمیوں کا قدم جب اُٹھے گا۔ وُہ اسلام ہی کے میدان کی طرف اُٹھے گا۔ یہ بھی تو ایک عظیم الشان اعجاز ہے۔

قرآن مجید کا چیلنج

اگر کوئی شخص قرآن کریم کے اس معجزہ کا انکار کرے تو ایک ہی پہلو سے ہم آزما لیتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص قرآن کریم کو خدا تعالیٰ کا کلام نہیں مانتا، تو اس روشنی اور سائنس کے زمانہ میں ایسا مدعی خدا تعالیٰ کی ہستی پر دلائل لکھے بالمقابل ہم وہ تمام دلائل قرآن کریم ہی سے نکال کر دکھلا دینگے اور اگر وہ شخص توحید الٰہی کی نسبت دلائل قلمبند کرے تو وُہ سب دلائل بھی ہم قرآن کریم ہی سے نکال کر دکھا دیں گے۔ پھر وہ ایسے دلائل کا دعویٰ کر کے لکھے جو قرآنِ کریم میں نہیں پائے جاتے یا اُن صداقتوں اور پاک تعلیموں پر دلائل لکھے جن کی نسبت اس کا خیال ہو کہ وُہ قرآن کریم میں نہیں ہیں۔ تو ہم ایسے شخص کو واضح طور پر دکھلا دیں گے کہ قرآن شریف کا دعویٰ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البينة : ۴) کیسا سچا اور صاف ہے اور یا اصل و فطرتی مذہب کی بابت دلائل لکھنا چاہے تو ہم ہر پہلو سے قرآنِ کریم کا اعجاز ثابت کر کے دکھلا دیں گے اور بتلا دیں گے کہ تمام صداقتیں اور پاک تعلیمیں قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔

الغرض قرآنِ کریم ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر ایک قسم کے معارف اور اسرار موجود ہیں لیکن اُن کے حاصل کرنے کے لیے میں پھر کہتا ہوں کہ اسی قوتِ قدسیہ کی ضرورت ہے، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعة : ۸۰)

ایسا ہی فصاحت بلاغت میں (اس کا مقابلہ ناممکن ہے) مثلاً سورۃ فاتحہ کی موجودہ ترتیب چھوڑ کر کوئی اور ترتیب استعمال کرو، تو وہ مطالبِ عالیہ اور مقاصدِ عظمیٰ جو اس ترتیب میں موجود ہیں۔ ممکن نہیں کہ کسی دُوسری ترتیب میں بیان ہو سکیں۔ کوئی سی سُورۃ لے لو۔ خواہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ہی کیوں نہ ہو۔ جس قدر نرمی اور ملاطفت کی رعایت کو ملحوظ

رکھ کر اس میں معارف اور حقائق ہیں، وہ کوئی دُوسرا بیان نہ کر سکے گا۔ یہ بھی فقط اعجازِ قرآن ہی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب بعض نادان مقاماتِ حریری یا سبع معلقہ کو بے نظیر اور بے مثل کہتے ہیں اور اس طرح پر قرآن کریم کی نامثلیت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اوّل تو حریری کے مصنف نے کہیں اس کے بے نظیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور دوم یہ کہ مصنفِ حریری خود قرآن کریم کی اعجازی فصاحت کا قائل تھا۔ علاوہ ازیں معترضین راستی اور صداقت کو ذہن میں نہیں رکھتے بلکہ اُن کو چھوڑ کر محض الفاظ کی طرف جاتے ہیں مندرجہ بالا کتابیں حق اور حکمت سے خالی ہیں۔

اعجاز کی خوبی

اعجاز کی خوبی اور وجہ تو یہی ہے کہ ہر ایک قسم کی رعایت کو زیرِ نظر رکھے۔ فصاحت اور بلاغت بھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ صداقت اور حکمت کو بھی نہ چھوڑے۔ یہ معجزہ صرف قرآن شریف ہی کا ہے۔ جو آفتاب کی طرح روشن ہے اور ہر پہلو سے اپنے اندر اعجازی طاقت رکھتا ہے۔ انجیل کی طرح محض زبانی ہی جمع خرچ نہیں کہ "ایک گال پر طمانچہ مارے تو دُوسری بھی پھیر دو"۔ یہ لحاظ اور خیال نہیں کہ ایسی تعلیم حکیمانہ فعل سے کہاں تک تعلق رکھتی ہے اور انسان کی فطرت کا لحاظ اس میں کہاں تک ہے؟

اس کے مقابل میں قرآن کریم کی تعلیم پڑھیں گے، تو پتہ لگ جائے گا کہ انسان کے خیالات اس طرح ہر پہلو پر قادر نہیں ہو سکتے اور ایسی مکمل اور بے نقص تعلیم جیسی کہ قرآن شریف کی ہے۔ زمینی دماغ اور ذہن کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے رُو برو ایک ہزار مسکین آدمی ہوں اور ان میں سے ہم چند ایک کو کچھ دے دیں اور باقی کا خیال تک بھی نہ کریں۔ ایسا ہی انجیل ایک ہی پہلو پر پڑی ہے۔ باقی پہلوؤں کا اُسے خیال تک بھی نہیں رہا۔ ہم یہ الزام انجیل پر نہیں دیتے کیونکہ یہ یہودیوں کی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے۔ جیسی اُن کی استعدادیں تھیں، انہیں کے موافق انجیل آئی "جیسی رُوح ویسے فرشتے"۔ اس میں کسی کا کیا قصور؟

انجیل کی تعلیم مُختص الزّمان تھی

اس کے علاوہ انجیل ایک قانون ہے مختص المقام والزّمان اور مختص القوم۔ جیسا کہ انگریز بھی قوانین مختص المقام اور مختص الوقت نافذ کر دیا کرتے ہیں جن کا بعد از وقت کوئی اثر نہیں رہتا۔ اسی طرح انجیل بھی ایک مختص قانون ہے۔ عام نہیں۔ مگر اس کے خلاف تعلیمِ قرآنی کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ قیامت تک ایک ہی لاتبدیل قانون ہے اور ہر قوم اور ہر وقت کے لیے ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲) یعنی ہم اپنے خزانوں میں سے بقدرِ معلوم نازل کرتے ہیں۔ انجیل کی ضرورت (صرف) اسی قدر تھی، اس لیے انجیل کا خلاصہ صرف ایک صفحہ میں آ سکتا ہے۔

قرآن سب زمانوں کے لیے ہے

لیکن قرآن کریم کی ضرورتیں تھیں سارے زمانہ کی اصلاح۔ قرآن کا مقصد تھا وحشیانہ حالت سے انسان بنانا۔ انسانی آداب سے مہذب انسان بنانا۔ تا شرعی حدود اور احکام کے ساتھ مرحلہ طے ہو۔ اور پھر باخدا انسان بنانا۔ گو یہ لفظ مختصر ہیں، مگر ان کے ہزار ہا شعبے ہیں۔

چونکہ یہودیوں، طبیعیوں، آتش پرستوں اور مختلف اقوام میں بدروشی کی رُوح کام کر رہی تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باعلامِ الٰہی سب کو مخاطب کر کے فرمایا: یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (الاعراف ۱۵۹) اس لیے ضروری تھا کہ قرآن شریف اُن تعلیمات کا جامع ہوتا جو وقتاً فوقتاً جاری رہ چکی تھیں اور ان تمام صداقتوں کو اپنے اندر رکھتا جو آسمان سے مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ذریعے سے زمین کے باشندوں کو پہنچائی گئی تھیں۔ قرآن کریم کے مدّنظر تمام نوعِ انسان تھا نہ کوئی خاص قوم اور مُلک اور زمانہ۔ اور انجیل کے مدّنظر (صرف) ایک خاص قوم تھی، اسی لیے مسیح علیہ السلام نے باربار کہا کہ "مَیں اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں"

تورات کے بعد قرآن شریف کی ضرورت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کیا لایا؟ اس میں وُہی کچھ تو ہے جو توراۃ میں درج ہے اور اسی کوتاہ نظری نے بعض عیسائیوں کو عدمِ ضرورتِ قرآن جیسے رسائل لکھنے پر دلیر کر دیا۔ کاش وہ سچّی دانائی اور حقیقی فراست سے حصّہ رکھتے، تا وہ بھٹک نہ جاتے۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ توراۃ میں لکھا ہے کہ تُو زنا نہ کر۔ ایسا ہی قرآن میں لکھا ہے کہ زنا نہ کر۔ قرآن توحید سکھاتا ہے اور توراۃ بھی خدائے واحد کی پرستش سکھلاتی ہے۔ پھر فرق کیا ہوا؟ بظاہر یہ سوال بڑا پیچدار ہے۔ اگر کسی ناواقف آدمی کے سامنے پیش کیا جاوے، تو وہ گھبرا جاوے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے باریک اور پیچدار سوالات کا حل بھی اللہ تعالیٰ کے خاص فضل کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی تو قرآنی معارف ہیں۔ جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن شریف اور توراۃ میں تطابق ضرور ہے۔ اس سے ہم کو انکار نہیں، لیکن توراۃ نے صرف متن کو لیا ہے۔ جس کے ساتھ دلائل، براہین اور شرح نہیں ہے لیکن قرآن کریم نے معقولی رنگ کو لیا ہے۔ اس لیے کہ توریت کے وقت انسانوں کی استعدادیں وحشیانہ رنگ میں تھیں (مگر قرآن شریف کے نزول کے وقت استعدادیں معقولیت کا رنگ پکڑ گئی تھیں) اس لیے قرآن شریف نے وُہ طریق اختیار کیا جو اخلاق کے منافع کو ظاہر کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اخلاق کے مفاد یہ ہیں اور نہ صرف مفاد اور منافع کو بیان ہی کرتا ہے بلکہ معقولی طور پر دلائل اور براہین کے ساتھ اُن کو پیش کرتا ہے۔ تاکہ عقلِ سلیم سے کام لینے والوں کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ جیسا کہ مَیں نے ابھی بیان کیا ہے کہ قرآن شریف کے وقت استعدادیں معقولیت کا رنگ پکڑ گئی تھیں اور توریت کے وقت وحشیانہ حالت تھی۔ حضرت آدمؑ سے لے کر زمانہ ترقی کرتا چلا گیا ہے۔ یہانتک کہ قرآن شریف کے وقت وہ دائرہ کی طرح پُورا ہوگیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ زمانہ مستدیر ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب ۴۱)

ضرورتیں نبوت کا انجن ہیں۔ ظلماتی راتیں اس نُور کو کھینچتی ہیں، جو دُنیا کو تاریکی سے نجات دے۔ اس ضرورت کے موافق نبوت کا سلسلہ شروع ہوا اور جب قرآن کریم کے زمانہ تک پہنچا، تو مکمل ہوگیا۔ اب گویا سب ضرورتیں پُوری ہوگئیں۔ اِس سے لازم آیا کہ آپ یعنی آنحضرت صلی اللہ خاتم الانبیا تھے۔ اب بڑا اور واضح فرق (توراۃ و قرآن کریم

کی تعلیم میں ایک تو یہی ہے کہ قرآن شریف نے دلائل پیش کیے ہیں جنکو توریت نے مس تک نہیں کیا۔

قرآن شریف اور توریت کی تعلیم میں دُوسرا فرق

اور دُوسرا فرق یہ ہے کہ توراۃ نے صرف بنی اسرائیل کو مخاطب کیا ہے اور دُوسری قوموں سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رکھا۔

اور یہی وجہ ہے کہ اس نے دلائل و براہین پر زور نہیں دیا، کیونکہ توریت کے زیرِ نظر کوئی دُوسرا فرقہ (یا مذہب) مثل دہریہ، فلاسفیہ اور براہمہ وغیرہ کا نہ تھا۔ بخلاف اس کے قرآن شریف کے مخاطب چونکہ کُل مِلل اور فرقے تھے اور اس پر پہنچ کر تمام فرقیں ختم ہو گئی تھیں، اس لیے قرآن کریم نے عقائد کو بھی اور احکامِ عملی کو بھی مدلّل (طور پر بیان) کیا۔

چنانچہ قرآنِ مجید فرماتا ہے: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (النور: ۳۱) یعنی مومنوں کو کہدے کہ کسی کے ستر کو آنکھ پھاڑ کر نہ دیکھیں اور باقی تمام فُروج کی بھی حفاظت کریں۔ یعنی انسان پر لازم ہے کہ چشم خوابیدہ ہو تاکہ کسی غیر محرم عورت کو دیکھ کر فتنہ میں نہ پڑے۔ کان بھی فُروج میں داخل ہیں جو قصص اور فحش باتیں سُن کر فتنہ میں پڑجاتے ہیں، اس لیے عام طور پر فرمایا کہ تمام موریوں (سوراخوں) کو محفوظ رکھو اور فضولیات سے بالکل بند رکھو ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (النور: ۳۱) یہ مومنوں کے لیے بہت ہی بہتر ہے اور یہ طریقِ تعلیم ایسی اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی اپنے اندر رکھتا ہے کہ جس کے ہوتے ہوتے بدکاروں میں نہ ہوگے۔

قرآن شریف دلائل و براہین بھی خود ہی بیان کرتا ہے

دیکھو! قرآن نے اسی ایک امر کو جو توریت میں بھی اپنے لفظوں اور اپنے مفہوم پر بیان ہوا۔ کیسا شرح و بسط کے ساتھ اور دلائل اور براہین کے ساتھ مؤکد کر کے بیان فرمایا۔ یہی تو قرآنی اعجاز ہے کہ وہ اپنے پیرو کو کسی دُوسرے کا محتاج نہیں ہونے دیتا۔ دلائل اور براہین بھی خود ہی بیان کر کے اُسے مستغنی کر دیتا ہے۔ قرآن شریف نے دلائل کے ساتھ احکام کو لکھا ہے اور ہر حکم کے جُداگانہ دلائل دیئے ہیں۔ غرض یہ دو بڑے فرق ہیں، جو توریت اور قرآن میں ہیں۔ اوّل الذکر میں طریقِ استدلال نہیں۔ دعویٰ کی دلیل خود تلاش کرنی پڑتی ہے۔ آخر الذکر اپنے دعویٰ کو ہر قسم کی دلیل سے مدلّل کرتا ہے اور پھر پیش کرتا ہے اور خدا کے احکام کو زبردستی نہیں منواتا، بلکہ انسان کے مُنہ سے سرِ تسلیم خم کرنے کی صدا نکلواتا ہے۔ نہ کسی جبر و اکراہ سے بلکہ اپنے لطیف طریقِ استدلال سے اور فطری سیادت سے۔ توریت کا مخاطب خاص گروہ ہے اور قرآن کے مخاطب کُل لوگ جو قیامت تک پیدا ہوں گے۔ پھر بتلاؤ کہ توریت اور قرآن کیونکر ایک ہو جائیں اور توریت کے ہونے سے کیونکر ضرورتِ قرآن نہ پڑے۔ قرآن جب کہتا ہے کہ تُو زنا نہ کر، تو کُل بنی نوعِ انسان اُس کا مفہوم ہوتا ہے لیکن جب یہی لفظ توریت بولتی ہے، تو اُس کا مخاطب اور مشارٌ الیہ وہی قوم بنی اسرائیل ہوتی ہے۔ اس سے بھی قرآن کی فضیلت کا پتہ لگ سکتا ہے، مگر دُور اندیش اور خدا ترس دل ہو تو۔

جسمانی اور رُوحانی خوارق

(علاوہازیں، توریت اور قرآن میں یہ بھی ایک فرق عظیم ہے کہ قرآن جسمانی اور رُوحانی خوارق ہر قسم کے اپنے اندر رکھتا ہے۔ مثلاً شق القمر کا معجزہ جسمانی معجزات کی قسم سے ہے۔

قانونِ قدرت کی تحدید نہیں ہوسکتی

بعض نادان شق القمر کے معجزہ پر قانونِ قدرت کی آڑ میں چھپ کر اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کو اتنا معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور قوانین کا احاطہ اور اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک وقت تو وُہ مُنہ سے خدا بولتے ہیں، لیکن دُوسرے وقت بجز جائیکہ اُن کے دل، اُن کی رُوح خدائے تعالیٰ کی عظیم الشان اور وَرَاءُ الوَرا قدرتوں کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑے۔ اُسے مطلق بھُول جاتے ہیں۔ اگر خدا کی ہستی اور بساط یہی ہے کہ اس کی قدرتیں اور طاقتیں ہمارے ہی خیالات اور اندازہ تک محدود ہیں، تو پھر دُعا کی کیا ضرورت رہی؟ لیکن نہیں۔ مَیں تمہیں بتلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور ارادوں کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ ایسا انسان جو یہ دعویٰ کرے، وُہ خدا کا مُنکر ہے۔ لیکن کس قدر واویلا ہے اُس نادان پر جو اللہ تعالیٰ کو لامحدود قدرتوں کا مالک سمجھ کر بھی یہ کہے کہ شق القمر کا معجزہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ سمجھ لو کہ ایسا آدمی فکرِ سلیم اور دُور اندیش دل سے بہرہ مند نہیں۔ خوب یاد رکھو کہ کبھی قانونِ قدرت پر بھروسہ نہ کرلو۔ یعنی کہیں قانونِ قُدرت کی حد نہ ٹھہرا لو کہ بس خدا کی خدائی کا سارا راز یہی ہے۔ پھر تو سارا تار و پود کھُل گیا۔ نہیں۔ اس قسم کی دلیری اور جسارت نہ کرنی چاہیے۔ جو انسان کو عبُودیت کے درجہ سے گرا دے۔ جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ ایسی بیوقوفی اور حماقت کہ خدا کی قدرتوں کو محصُور اور محدود کرنا کسی مومن سے نہیں ہوسکتی۔ امام فخرالدین رازی کا یہ قول بہت دُرست ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کو عقل کے پیمانہ سے اندازہ کرنے کا ارادہ کرے گا، وُہ بیوقوف ہے۔ دیکھو نُطفہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ یہ لفظ کہہ دینے آسان اور بالکل آسان ہیں اور یہ بالکل معمولی سی بات نظر آتی ہے، مگر یہ ایک سِرّ اور راز ہے کہ ایک قطرۂ آب سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور اس میں اس قسم کے قویٰ رکھ دیتا ہے۔ کیا کسی عقل کی طاقت ہے کہ وہ اس کی کیفیت اور کُنہ تک پہنچے۔ طبیبوں اور فلاسفروں نے بہتیرا زور مارا، لیکن وہ اس کی ماہیت پر اطلاع نہ پاسکے۔ اسی طرح ایک ایک ذرہ خدا تعالیٰ کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ یہ ظاہری نظام بھی اُسی طرح رہے اور ایک خارقِ عادت امر بھی ظاہر ہو جاوے۔ عارف لوگ ان کیفیتوں کو خوب دیکھتے اور اُن سے حظ اُٹھاتے ہیں۔ بعض لوگ ایک ادنیٰ ادنیٰ اور معمولی باتوں پر اعتراض کر دیتے ہیں اور شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا۔ یہ امر بھی ایسا ہے جیسا شق القمر کے متعلق۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کس حد تک آگ جلاتی ہے اور ان اسباب کے پیدا ہونے سے فرو ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا مصالحہ ظاہر ہو جاوے یا بتلا دیا جاوے، تو فی الفور مان لیں گے۔ لیکن ایسی صُورت میں ایمان بالغیب اور حُسنِ ظن کا لُطف اور خوبی کیا ظاہر ہوگی۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ خدا خلقِ اسباب نہیں کرتا، مگر بعض اسباب ایسے ہوتے ہیں کہ نظر آتے ہیں اور بعض اسباب نظر

نہیں آتے۔ غرض یہ ہے کہ خدا کے افعال گوناگوں ہیں۔ خدا تعالیٰ کی قدرت کبھی درماندہ نہیں ہوتی اور وہ نہیں تھکتا وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (یٰسٓ: ۸۰) اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (قٓ: ۱۶) اس کی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں اور افعال کا، کیسا ہی صاحبِ عقل اور علم کیوں نہ ہو، اندازہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ اُس کو اظہارِ عجز کرنا پڑتا ہے۔

مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ ڈاکٹر خوب جانتے ہیں۔ عبدالکریم نام ایک شخص میرے پاس آیا۔ اس کے پیٹ کے اندر ایک رسولی تھی، جو پاخانہ کی طرف بڑھتی جاتی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے کہا کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کو بندوق مار کر مار دینا چاہیے۔ الغرض بہت سے امراض اس قسم کے ہیں جن کی ماہیت ڈاکٹروں کو بخوبی معلوم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً طاعون یا ہیضہ ایسے امراض ہیں کہ ڈاکٹر کو اگر پلیگ ڈیوٹی پر مقرر کیا جاوے، تو اُسے خود ہی دست لگ جاتے ہیں۔ انسان جہاں تک ممکن ہو علم پڑھے اور فلسفہ کی تحقیقات میں محو ہو جاوے، لیکن بالآخر اُس کو معلوم ہوگا کہ اُس نے کچھ ہی نہیں کیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جیسے سمندر کے کنارے ایک چڑیا پانی کی چونچ بھرتی ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے کلام اور فعل کے معارف اور اسرار سے حصہ ملتا ہے۔ پھر کیا عاجز انسان، ہاں، نادان فلسفی اسی حیثیت اور شیخی پر خدا تعالیٰ کے ایک فعل شق القمر پر اعتراض کرتا اور اُسے قانونِ قدرت کے خلاف ٹھہراتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اعتراض نہ کرو۔ نہیں کرو اور ضرور کرو۔ شوق سے اور دل کھول کر کرو، لیکن دو باتیں زیرِ نظر رکھ لو۔ اوّل خدا کا خوف (اور اُس کی لامحدود طاقت) دوسرے (انسان کی نیستی اور محدود علم) بڑے بڑے فلاسفر بھی آخر یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہم جاہل ہیں۔ انتہائے عقل ہمیشہ انتہائے جہل پر ہوتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹروں سے پوچھو کہ عصبہ مجوفہ کو سب وہ جانتے اور سمجھتے ہیں، مگر نور کی ماہیت اور اُس کا کُنہ تو بتلاؤ کہ کیا ہے؟ آواز کی ماہیت پوچھو تو یہ تو کہدیں گے کہ کان کے پردہ پر یُوں ہوتا ہے اور یُوں ہوتا ہے، لیکن ماہیتِ آواز خاک بھی نہ بتلا سکیں گے۔ آگ کی گرمی اور پانی کی ٹھنڈک پر کیوں کا جواب نہ دے سکیں گے۔ کنہِ اشیاء تک پہنچا کسی حکیم یا فلاسفر کا کام نہیں ہے۔ دیکھئے ہماری شکل آئینہ میں منعکس ہوتی ہے، لیکن ہمارا سر ٹوٹ کر شیشہ کے اندر نہیں چلا جاتا۔ ہم بھی سلامت ہیں اور ہمارا چہرہ بھی آئینہ کے اندر نظر آتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ چاند شق ہو اور شق ہو کر بھی انتظامِ دنیا میں خلل نہ آوے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اشیاء کے خواص ہیں۔ کون دم مار سکتا ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ کے خوارق اور معجزات کا انکار کرنا اور انکار کے لیے جلدی کرنا شتاب کاروں اور نادانوں کا کام ہے۔

خدا کی قدرتوں اور عجائبات کو محدود سمجھنا دانشمندی نہیں

خدا کی قدرتوں اور عجائبات کو محدود سمجھنا، دانش مندی نہیں۔ وہ اپنی ماہیت نہیں جانتا اور سمجھتا اور آسمانی باتوں پر رائے زنی کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے ؎

تو کارِ زمیں رانکو ساختی　　کہ با آسماں نیز پرداختی

انسان کو لازم ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ کر قدم نہ مارے۔ اکثر امراض اور عوارض کے اسباب اور علامات ڈاکٹروں کو معلوم نہیں تو کیا ایسی کمزوری پر اسے مناسب ہے کہ وُہ بساط سے بڑھ کر چلے ؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ طریقِ عبودیت یہی ہے کہ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ (البقرہ ۳۳) کہنے والوں کے ساتھ ہو۔ دیکھو ستارے جو اتنے بڑے بڑے گولے ہیں آسمان میں بغیر ستون کے لٹکتے ہیں اور خود آسمان بغیر کسی سہارے کے ہزار ہا سال سے اسی طرح چلے آتے ہیں چاند ہر روز دُھلا دھلایا نکلتا ہے۔ آفتاب ہر روز طلوع ہوتا ہے اور ٹھیک رفتار اور رَوش پر چلتا ہے۔ ہمارے کاموں میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے کام دیکھو کہ یہی چاند سورج اپنے ایک ہی طریق پر چلتے ہیں۔ اگر ہر روز ان باتوں کو سوچو کہ سُورج ہر روز مقررہ طریق پر نکلتا ہے۔ جہات کو بتلاتا ہے تو دیوانہ ہو جاؤ۔ دیکھو ہم پر اپنی حالتیں آتی ہیں اور سُورج پر کوئی حالت نہیں آتی۔ ایک گھڑی جو دو ہزار روپیہ کی ہو۔ اگر وہ بارہ کی بجائے دس اور دس کی بجائے بارہ بجائے، تو نکمی سمجھی جائے گی۔ لیکن خدا تعالیٰ کی قائم کردہ گھڑی ایسی ہے کہ اس میں ذرّہ برابر فرق نہیں اور نہ اس کو کسی چابی کی ضرورت۔ نہ صاف کرنے کی حاجت۔ کیا ایسے صانع کی طاقتوں کا شمار کر سکتے ہیں۔ انسان حیران ہو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہماری اشیاء کپڑے برتن وغیرہ جو استعمال میں آتے ہیں گِھستے رہتے ہیں۔ بچّے جوان اور بوڑھے ہو کر مرتے ہیں، لیکن جو سُورج کل طلوع ہوا تھا آج بھی وہی سُورج ہے اور ایک لاتعداد زمانہ سے اسی طرح چلا آیا ہے اور چلا جائیگا، مگر اس پر کوئی حالت تحلیل وغیرہ کی یا اثر زمانہ کا نہیں ہوتا۔ کِسقدر گستاخی ہے کہ ایک کیڑے ہو کر اس رافع ذاتِ الٰہی پر حملہ کریں اور جلدی سے حکم کر دیں کہ خدا میں طاقت نہیں۔

انبیاء علیہم السّلام کے معجزات کا مقصد

اسلام کا خدا بڑا طاقتور خدا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا ہے کہ اس کی طاقتوں پر اعتراض کرے۔ انبیاء علیہم السّلام کو جو معجزات دیئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی تجارب شناخت نہیں کر سکتے اور جب انسان اُن خارقِ عادت اُمور کو دیکھتا ہے، تو ایک بار تو یہ کہنے پر مجبُور ہو جاتا ہے کہ وُہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن اگر اپنی عقل کا ادّعا کرے اور تفہیمِ الٰہی کے کُوچے میں قدم نہ رکھے تو دونوں طرف سے راہ بند ہو جاتی ہے۔ ایک طرف معجزات کا انکار، دُوسری طرف عقلِ خام کا ادّعا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دقیق در دقیق کُنہ کے دریافت کرنے کی فکر میں وہ نادان انسان لگ جاتا ہے۔ جو معجزات کی تہہ میں ہے اور جس کی فلاسفی زمینی عقل اور سطحی خیالات پر نہیں کُھل سکتی۔ اس سے وُہ انکار کی طرف رجوع کرتے کرتے نبوّت کے نفس کا ہی مُنکر ہو جاتا ہے اور شکوک اور وساوس کا ایک بہت سا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے جو اس کی شقاوت کا موجب ہو کر رہتا ہے۔ کبھی یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ بھی ہمارے جیسا ایک آدمی ہے جو کھاتا پیتا اور حوائج انسانی رکھتا ہے۔ اس کی طاقتیں ہم سے کیونکر بڑھ سکتی ہیں ؟ اس کی طاقتوں میں رُوحانیت کی قوّت، اور دُعاؤں میں استجابت کا اثر کیونکر خاص طور پر آجائے گا ؟ افسوس ! اس قسم کی باتیں بناتے اور اعتراض کرتے ہیں۔ جس کے سبب جیسا میں نے ابھی کہا نفسِ نبوّت

کا انکار کر دیتے ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ معمولی طور پر تو مانتے نہیں اور غیر معمولی طور پر اعتراض کرتے ہیں۔ اب یہ عمداً اور صریحاً انبیاء علیہم السلام کے وجود کا انکار نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا انہی عقلوں اور دانشوں پر ناز ہے کہ فلاسفر کہلا کر دہریہ یا بُت پرست ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی مخفی طاقتیں کبھی الہام اور وحی کے سوا اپنا کرشمہ نہیں دکھلا سکتیں۔ وہ وحی اور الہام ہی کے رنگ میں نظر آتی ہیں۔

عقلمند وہ ہے جو نبی کو شناخت کرتا ہے

یہ خدائے تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ اُس نے دُنیا میں اپنے نبی بھیجے۔ عقلمند وہ ہے جو نبی کو شناخت کرتا ہے، کیونکہ وہ خدا کو شناخت کرتا ہے اور بیوقوف وُہ ہے جو نبی کا انکار کرتا ہے کیونکہ نبوت کا انکار اُلوہیت کے انکار کو مُستلزم ہے۔ اور جو ولی کو شناخت کرتا ہے وُہ نبی کو شناخت کرتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہہ سکتے ہیں کہ نبی اُلوہیت کے لیے بطور ایک میخ آہنی کے ہے اور ولی نبی کے لیے۔ اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تیرہ سو سال پہلے اس سلسلہ کو دُنیا میں ظاہر کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ظاہر کیا، لیکن آج تیرہ سو سال بعد اور اس وقت کہ چودھویں صدی کے بھی پندرہ سال گذر گئے۔ اس کو آریوں، برہموؤں، طبیعوں اور دہریوں یا عیسائیوں کے سامنے بیان کرو، تو وہ ہنس دیتے ہیں اور تمسخر میں اُڑا دیتے ہیں۔ ایسی مصیبت کے وقت میں کہ ایک طرف علوم جدیدہ کی روشنی، دُوسری طرف طبیعیوں میں ایک خاص انقلاب پیدا ہو جانے کے بعد مختلف فرقوں اور مذہبوں کی کثرت ہے ان اُمور کا پیش کرنا اور لوگوں سے منوانا بہت ہی پیچیدہ بات ہو گئی تھی اور اسلام اور اس کی باتیں ایک قصہ کہانی سمجھی جانے لگی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر: ۱۰) کا وعدہ دے کر قرآن اور اسلام کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہے مسلمانوں کو اس مصیبت سے بچالیا اور فتنہ میں پڑنے نہ دیا۔ پس مُبارک ہیں وُہ لوگ جو اس سلسلہ کی قدر کرتے اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر ثبوت نہ ملے تو یہ بالکل ٹھیک ہے کہ جیسا انسانی طبائع کا خاصہ ہے کہ وُہ بدظنی کی طرف جھٹ رجُوع کر لیتی ہیں۔ تو اندرونی طور پر ہی لوگ ایک قصہ کہانی سمجھ کر قرآن اور اسلام سے دستبردار ہو جاتے۔ مثلاً دیکھو۔ اگر اندر کھڑکا ہو، تو باہر والا خواہ مخواہ خیال کرے گا کہ اندر کوئی آدمی ضرور ہے، مگر وُہ جب دو چار دن تک دیکھتا ہے کہ اندر سے کوئی نہیں نکلا، تو پھر اُس کا خیال مبدل ہونا شروع ہوتا ہے۔ تو پھر بدُوں اندر جانے کے ہی وُہ سمجھ لیتا ہے کہ اگر انسان ہوتا، تو اُس کو کھانے پینے کی ضرورت پڑتی اور وُہ ضرور باہر آتا۔ اگر نبوت کے انوار و برکات جو وحیِ ولایت کے رنگ میں آتے ہیں۔ اس فلاسفی اور روشنی کے زمانہ میں ظاہر نہ ہوتے، تو مسلمانوں کے بچے مُسلمانوں کے گھر میں رہ کر اسلام اور قرآن کو ایک قصہ کہانی اور داستان سمجھ لیتے۔ اور اسلام سے اُن کو کوئی واسطہ اور تعلق نہ رہتا۔ اِس طرح پر گویا اسلام کو مُعدوم کرنے کا سلسلہ بندھ جاتا، مگر نہیں! اللہ تعالیٰ کی غیرت، اُس کا ایفائے وعدہ کا جوش کب ایسا ہونے دیتا تھا۔ جیسا کہ ابھی مَیں نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے

وعدہ فرمایا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ (الحجر : ۱۰)

قرآن کا نام ذکر رکھنے کی وجہ

اب دیکھو۔ قرآنِ کریم کا نام ذِکر رکھا گیا ہے، اس لیے کہ وہ انسان کی اندرُونی شریعت یاد دلاتا ہے۔ جب اِسمِ فاعل کو مصدر کی صورت میں لاتے ہیں، تو وہ مبالغہ کا کام دیتا ہے۔ جیسا زَیۡدٌ عَدۡلٌ۔ کیا معنے؟ زید بہت عادل ہے۔ قرآن کوئی نئی تعلیم نہیں لایا، بلکہ اُس اندرونی شریعت کو یاد دلاتا ہے، جو انسان کے اندر مختلف طاقتوں کی صُورت میں رکھی ہے۔ حِلم ہے، ایثار ہے، شجاعت ہے، جبر ہے، غضب ہے، قناعت ہے وغیرہ۔ غرض جو فطرت باطن میں رکھی تھی، قرآن نے اُسے یاد دلایا۔ جیسے فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ (الواقعہ : ۷۹) یعنی صحیفۂ فطرت میں کہ جو چھُپی ہوئی کتاب تھی اور جس کو ہر ایک شخص نہ دیکھ سکتا تھا۔ اسی طرح اِس کتاب کا نام ذِکر بیان کیا۔ تاکہ وہ پڑھی جاوے تو وہ اندرونی اور رُوحانی قوتوں اور اس نورِ قلب کو جو آسمانی ودیعت انسان کے اندر ہے، یاد دلاوے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھیج کر بجائے خود ایک رُوحانی معجزہ دکھایا۔ تاکہ انسان اُن معارف اور حقائق اور رُوحانی خوارق کو معلوم کرے، جن کا اُسے پتہ نہ تھا، مگر افسوس کہ قرآن کی اس علّتِ غائی کو چھوڑ کر جو ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (البقرہ : ۳) ہے۔ اس کو صرف چند قصص کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے اور نہایت بے پروائی اور خود غرضی سے مُشرکینِ عرب کی طرح اَساطِیرُ الاَوّلین کہہ کر ٹالا جاتا ہے۔ وہ زمانہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اور قرآن کے نزُول کا۔ جب وُہ دُنیا سے گمشدہ صداقتوں کو یاد دلانے کے لیے آیا تھا۔ اب وُہ زمانہ آ گیا جس کی نسبت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کی تھی کہ لوگ قرآن پڑھیں گے، لیکن اُن کے حلق سے نیچے قرآن نہ اُترے گا۔ سو اب تم اِن آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ لوگ قرآن کیسی خوش الحانی اور عمدہ قراءت سے پڑھتے ہیں، لیکن وُہ اُن کے حلق سے نیچے نہیں گزرتا۔ اِس لیے جیسے قرآنِ کریم جس کا دُوسرا نام ذِکۡر ہے، اُس ابتدائی زمانہ میں انسان کے اندر چھپی ہوئی اور فراموش شدہ صداقتوں اور ودیعتوں کو یاد دلانے کے لیے آیا تھا۔

اِس زمانہ میں بھی آسمان سے ایک مُعلّم آیا

اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ واثقہ کی رُو سے کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر : ۱۰) اِس زمانہ میں بھی آسمان سے ایک مُعلّم آیا جو اٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ (الجمعۃ : ۴) کا مِصداق اور موعُود ہے۔ وُہ وہی ہے جو تمہارے درمیان بول رہا ہے۔ مَیں پھر رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کی طرف عَود کر کے کہتا ہوں کہ آپ نے اس زمانہ کی ہی بابت خبر دی تھی کہ لوگ قرآن کو پڑھیں گے، لیکن وُہ اُن کے حلق سے نیچے نہ اُترے گا۔ اب ہمارے مخالف۔ نہیں نہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی قدر نہ کرنے والے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر دھیان نہ دینے والے خوب گلے مروڑ مروڑ کر یَا عِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (آل عمران : ۵۶) اور فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ (المائدہ : ۱۱۸) قرآن میں عجیب لہجہ سے پڑھتے ہیں، لیکن سمجھتے نہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ اگر کوئی ناصح مشفق بن کر سمجھانا چاہے تو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

نہ کریں۔ اتنا تو کریں کہ اس کی بات ہی ذرا سُن لیں۔ مگر کیوں سُنیں؟ وہ گوشِ شنوا بھی رکھیں۔ صبر اور حُسنِ ظن سے بھی کام لیں۔ اگر خدا تعالیٰ فضل کے ساتھ زمین کی طرف توجہ نہ کرتا تو اسلام بھی اس زمانہ میں مثل دُوسرے مذہبوں کے مُردہ اور ایک قصّہ کہانی سمجھا جاتا۔ کوئی مُردہ مذہب کسی دُوسرے کو زندگی نہیں دے سکتا۔ لیکن اسلام اس وقت زندگی دینے کو تیار ہے۔ لیکن چونکہ یہ سُنّت اللہ ہے کہ کوئی کام خدا تعالیٰ بغیر اسباب کے نہیں کرتا۔ ہاں یہ امر جُدا ہے کہ وُہ اسباب ہم کو دکھائی دیں یا نہ۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسباب ضرور ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے انوار اُترتے ہیں، جو زمین پر پہنچ کر اسباب کی صُورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو تاریکی اور گمراہی میں مبتلا پایا اور ہر طرف سے ضلالت اور ظلمت کی گھنگھور گھٹا دُنیا پر چھا گئی۔ اُس وقت اس تاریکی کو دُور کرنے اور ضلالت کو ہدایت اور سعادت سے تبدیل کرنے کے لیے ایک سراجِ منیر فاران کی چوٹیوں پر چمکا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

موجودہ زمانہ کی حالت اور ضرورتِ مصلح

اور ایسا ہی اس زمانہ میں کہ جس میں ہم رہتے ہیں ایمانی طاقتیں مُردہ ہو کر فسق و فجور نے اُن کی جگہ لے لی ہے۔ لوگوں کے معاملات ایک طرف۔ عبادات دُوسری طرف۔ غرض ہر بات میں فتور ہو گیا ہے۔ صرف یہ آفت ہی اگر ہوتی تو کچھ مُضائقہ اور چنداں خطرہ نہ تھا، لیکن ان ساری باتوں کے علاوہ سب سے بڑی آفت جس کا مجھے کئی بار ذکر کرنا پڑا ہے اور جس کو ہر بہی خواہِ اسلام کا دل محسوس کر چکا ہے یا کر سکتا ہے وُہ، وہ زہریلا اثر ہے جو آجکل کی طبعی، طبابت اور ہیئت اور جھوٹے فلسفہ کے باعث اسلام اور اہلِ اسلام پر پڑ رہا ہے۔ علماء تو اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ اُن کو خانہ جنگیوں اور اندرونی جھگڑوں اور ایک دُوسرے کی تکفیر بازی سے فرصت ملے تو اِدھر توجہ کریں۔ زاہد اپنی گوشہ نشینی میں بیٹھ کر اگر دعاؤں سے کام لیتے تو بھی کچھ آثار پیدا ہوتے، مگر وہ پیر پرستی اور جوازِ سماع وغیرہ کی بحثوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ حقیقی صُوفی ازم کی جگہ اب چند رسُومات نے لے لی جن کا قرآن اور سُنّت سے پتہ نہیں چلتا۔ الغرض ہر طرف سے اسلام عُرضۂ تیغِ جہلاء و سفہا ہو رہا ہے۔ اس وقت میں کہ وہ ضرورتیں جو کسی مُصلح اور ریفارمر کی آمد کے لیے لازم ہیں، پورے انتہائی نقطہ تک پہنچ چکی ہیں۔ ہر ایک شخص بجائے خود ایک نیا مذہب رکھتا ہے۔ ان تمام اُمور اور حالات پر قیاس کر کے اسلام کی عُمر خاتمہ کے قریب نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر اور طبیب جب کسی ہیضہ کے مریض کا بدن برف سا سرد یا اُسے سرسام میں مبتلا دیکھتے ہیں، تو اُسے لاعلاج بتلا کر کھسک آتے ہیں۔ اور حالتِ ردّیہ دیکھ کر ڈاکٹر حاذق بھی یاس اور نومیدی ظاہر کر دیتا ہے۔ اب اس وقت اسلام کی حالت پر کچھ شک نہیں کہ اُس کی انتہا یاس تک پہنچ گئی تھی، لیکن اگر وُہ بھی انسان کے اپنے خیالات کا نتیجہ یا اپنی کوششوں کا ثمرہ ہوتا، تو اِن مصائب اور شدائد کے دوران میں کہ ہر طرف سے اُس پر زد پڑتی ہو اور اس کی اپنی اندرونی حالت بوجہ نفاقِ باہمی کمزور ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں کم از کم اِسلام کا قائم رہنا، جس کے

معدوم کرنے کے لیے مخالفوں نے ناخنوں تک زور لگایا اور لگا رہے ہیں۔ بہت مشکل ہو جاتا۔ کوئی سال نہیں جاتا جبکہ کوئی نئی صورت اسلام پر حملہ کرنے کی نہیں تراشی جاتی۔ اگر کوئی ایجاد یا کل بنائی جاتی ہے۔ اس کے اصول کو زیرِ نظر رکھ کر اسلام پر حملہ کر دیا جاتا ہے۔

آجکل کی ترقی بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے

الغرض ایسے فتنے کے وقت میں قریب تھا کہ دشمن اکٹھے ہو کر ایک دفعہ ہی مسلمانوں کو برگشتہ کر دیتے، لیکن اللہ تعالےٰ کے زبردست ہاتھ نے اسلام کو سنبھالے رکھا۔ یہ بھی ایک دلیل ہے اسلام کی صداقت کی۔ آجکل کی ترقی بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے۔ پس دیکھو کہ مخالفوں نے اپنی ساری طاقتیں اور قوتیں حتّٰی کہ جان اور مال تک بھی اسلام کے نابود کرنے میں صرف کر دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے موافق اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر: ۱۰) یعنی خدا آپ ہی اُن نقوشِ فطرت کو یاد دلانے والا ہے اور وہی خطرہ کے وقت اس کو بچائے گا۔ اسلام کی کشتی خطرہ میں جا پڑی تھی۔ پادریوں کا حملہ جنھوں نے کروڑہا روپیہ خرچ کر کے اور طرح طرح کے منافع اور وعدے۔ یہانتک کہ شرمناک نفسانی حظوظ تک دکھا کر بھی لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف اسلامی عقائد کو بدنام کرتے ہیں۔ دیکھو! امساکِ بارش کی وجہ سے استسقاء کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اگر کل سے بارش برسانے میں کامیابی ہو جاوے، جیسا کہ آجکل بعض لوگ امریکہ وغیرہ میں کوششیں کرتے ہیں، تو اس طرح پر ایک رُکن ٹوٹ جائے گا۔ غرض میں کہاں تک بیان کروں۔ ہر طرف سے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور اُس کو بدنام کرنے کی کوشش، ہاں انتھک کوشش کی جاتی ہے۔ مگر ان لوگوں کے منصوبے اور ہتھکنڈے کیا کر سکتے ہیں۔ خدا اس کو خود اُن حربوں سے بچانا چاہتا ہے اور اس زمانِ ترقی میں اسلام کو بغیر امداد کے نہیں چھوڑا، بلکہ اس نے اسلام کی حفاظت کی اور اپنے سچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وعدوں کو سچا ثابت کیا اور اس کی مبارک پیشگوئیوں کی حقیقت کھول دی اور اس صدی میں ایک شخص پیدا کر دیا۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ وہ وُہی ہے جو تمھارے درمیان بول رہا ہے۔ وہ صداقت کی رُوح اسلام میں پھونک دیگا۔ وہ وہی ہے جو گمشدہ صداقتوں کو آسمانوں سے لاتا ہے اور لوگوں تک پہنچاتا ہے، وہ بدظنیوں اور ایمانی کمزوریوں کو دُور کرنا چاہتا ہے۔

بدظنی

بدظنی ایک ایسا مرض ہے اور ایسی بُری بلا ہے جو انسان کو اندھا کر کے ہلاکت کے ایک تاریک کنویں میں گرا دیتی ہے۔ بدظنی ہی ہے جس نے ایک مُردہ انسان کی پرستش کرائی۔ بدظنی ہی تو ہے جو لوگوں کو خدا تعالیٰ کی صفاتِ خلق، رحم، رازقیت وغیرہ سے معطّل کر کے نعوذ باللہ ایک فردِ معطّل اور شئے بیکار بنا دیتی ہے۔ الغرض اسی بدظنی کے باعث جہنّم کا بہت بڑا حصہ، اگر کہوں کہ سارا حصہ بھر جائیگا، تو مبالغہ نہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ماموروں سے بدظنی کرتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے فضل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غرض اگر کوئی ہمارے اس سلسلہ کا جو خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا۔ انکار کرے تو ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ ہائے! ایک رُوح ہلاکت

کے دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹاتی ہے اور یہ سلسلہ ایسا روشن ہے کہ اگر کوئی شخص مستعد دل لے کر دو گھنٹہ بھی ہماری باتوں کو سُنے، تو وہ حق کو پا لے گا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی معجزات

اب میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں اور کہہ کر اس تقریر کو ختم کر دوں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے معجزات کے سلسلہ کی طرف پھر عود کر کے کہتا ہوں کہ ایک خوارق تو شق القمر وغیرہ کے علمی رنگ کے ہیں اور دوسرے حقائق و معارف کے۔ تیسرا طبقہ معجزات کا اخلاقی معجزات ہیں۔ اخلاقی کرامت میں بہت اثر ہوتا ہے۔ فلاسفر لوگ معارف اور حقائق سے تسلی نہیں پا سکتے، مگر اخلاقِ عظیمہ اُن پر بہت بڑا اور گہرا اثر کرتے ہیں۔ حضور سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی معجزات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ آپؐ ایک درخت کے نیچے سوئے پڑے تھے کہ ناگاہ ایک شور و پکار سے بیدار ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جنگلی اعرابی تلوار کھینچ کر خود حضور پر آ پڑا ہے۔ اُس نے کہا۔ اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) بتا، اس وقت میرے ہاتھ سے تجھے کون بچا سکتا ہے؟ آپؐ نے پورے اطمینان اور سچی سکینت سے جو حاصل تھی فرمایا کہ اَللّٰہ۔ آپؐ کا یہ فرمانا عام انسانوں کی طرح نہ تھا۔ اَللّٰہ جو خدا تعالیٰ کا ایک ذاتی اِسم ہے اور جو تمام جمیع صفاتِ کاملہ کا مُستجمع ہے۔ ایسے طور پر آپؐ کے مُنہ سے نکلا اور دل پر ہی جا کر ٹھہرا۔ کہتے ہیں کہ اِسمِ اعظم یہی ہے اور اس میں بڑی بڑی برکات ہیں، لیکن جس کو وہ اللہ یاد ہی نہ ہو، وہ اِس سے کیا فائدہ اُٹھائے گا۔ الغرض ایسے طور پر اللہ کا لفظ آپؐ کے مُنہ سے نکلا کہ اس پر رُعب طاری ہو گیا اور ہاتھ کانپ گیا۔ تلوار گر پڑی۔ حضرتؐ نے وُہی تلوار اُٹھا کر کہا کہ اب بتلا۔ میرے ہاتھ سے تجھے کون بچا سکتا ہے؟ وہ ضعیف القلب جنگلی کس کا نام لے سکتا تھا۔ آخر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاقِ فاضلہ کا نمونہ دکھایا اور کہا۔ جا تجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ مروّت اور شجاعت مجھ سے سیکھ۔ اِس اخلاقی معجزہ نے اُس پر ایسا اثر کیا کہ وہ مُسلمان ہو گیا۔

رسیر میں لکھا ہے کہ ابوالحسن خرقانی کے پاس ایک شخص آیا۔ راستہ میں شیر ملا۔ اور کہا کہ اللہ کے واسطے پیچھا چھوڑ دے، شیر نے حملہ کیا اور جب کہا۔ اُبوالحسن کے واسطے چھوڑ دے، تو اُس نے چھوڑ دیا۔ شخصِ مذکور کے ایمان میں اس حالت نے سیاہی سی پیدا کر دی اور اس نے سفر ترک کر دیا۔ واپس آ کر یہ عُقدہ پیش کیا۔ اس کو ابُوالحسن نے جواب دیا کہ یہ بات مشکل نہیں۔ اللہ کے نام سے تُو واقف نہ تھا۔ اللہ کی سچی ہیبت اور جلال تیرے دل میں نہ تھا اور مجھ سے تُو واقف تھا۔ اس لیے میری قدر تیرے دل میں تھی۔ پس اللہ کے لفظ میں بڑی بڑی برکات اور خوبیاں ہیں بشرطیکہ کوئی اس کو اپنے دل میں جگہ دے اور اس کی ماہیت پر کان دھرے۔

اسی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی معجزات میں ایک اور معجزہ بھی ہے کہ آپؐ کے پاس ایک وقت بہت سی بھیڑیں تھیں۔ ایک شخص نے کہا۔ اِس قدر مال اس سے پیشتر کسی کے پاس نہیں دیکھا۔ حضورؐ نے وہ سب بھیڑیں اس کو دے دیں۔ اُس نے فی الفور کہا کہ لاریب آپؐ سچے نبی ہیں۔ سچے نبی کے بغیر اس قسم کی سخاوت دُوسرے سے

عمل میں آنی شکل ہے۔ الغرض آنحضرتؐ کے اخلاقِ فاضلہ ایسے تھے کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم : ۵) قرآن میں وارد ہوا۔

ہماری جماعت کو مناسب ہے کہ وہ اخلاقی ترقی کریں

پس ہماری جماعت کو مناسب ہے کہ وہ اخلاقی ترقی کریں، کیونکہ اَلْاِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ مشہور ہے۔ وہ یاد رکھیں کہ اگر کوئی ان پر سختی کرے۔ تو حتی الواسع اُس کا جواب نرمی اور ملاطفت سے دیں۔ تشدد اور جبر کی ضرورت انتقامی طور پر بھی نہ پڑنے دیں۔

انسان میں نفس بھی ہے اور اُس کی تین قسم ہیں۔ اَمّارہ، لوّامہ، مُطمئنہ۔ امّارہ کی حالت میں انسان جذبات اور بے جا جوش کو سنبھال نہیں سکتا اور اندازہ سے نکل جاتا اور اخلاقی حالت سے گر جاتا ہے۔ مگر حالتِ لوّامہ میں سنبھال لیتا ہے۔ مجھے ایک حکایت یاد آئی جو سعدیؒ نے بوستان میں لکھی ہے۔ کہ ایک بزرگ کو کُتّے نے کاٹا۔ گھر آیا، تو گھر والوں نے دیکھا کہ اُسے کتّے نے کاٹ کھایا ہے۔ ایک بھولی بھالی چھوٹی لڑکی بھی تھی۔ وہ بولی۔ آپ نے کیوں نہ کاٹ کھایا؟ اُس نے جواب دیا۔ بیٹی! انسان سے کُتّپن نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے انسان کو چاہیے کہ جب کوئی شریر گالی دے تو مومن کو لازم ہے کہ اِعراض کرے۔ نہیں تو وہی کُتّپن کی مثال صادق آئے گی۔ خدا کے مقرّبوں کو بڑی بڑی گالیاں دی گئیں۔ بہت بُری طرح ستایا گیا، مگر اُن کو اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف : ۲۰۰) کا ہی خطاب ہوا۔ خود اُس انسانِ کامل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بُری طرح تکلیفیں دی گئیں اور گالیاں، بدزبانی اور شوخیاں کی گئیں، مگر اس خُلقِ مجسّم ذات نے اس کے مقابلہ میں کیا کیا۔ اُن کے لیے دُعا کی اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر لیا تھا کہ جاہلوں سے اعراض کرے گا، تو تیری عزت اور جان کو ہم صحیح وسلامت رکھیں گے اور یہ بازاری آدمی اُس پر حملہ نہ کر سکیں گے؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضورؐ کے مخالف آپؐ کی عزّت پر حرف نہ لا سکے اور خود ہی ذلیل وخوار ہو کر آپ کے قدموں پر گرے۔ یا سامنے تباہ ہوئے۔ غرض یہ صفت لوّامہ کی ہے۔ جو انسان کشمکش میں بھی اصلاح کر لیتا ہے۔ روزمرّہ کی بات ہے۔ اگر کوئی جاہل یا اوباش گالی دے یا کوئی شرارت کرے۔ جس قدر اس سے اعراض کرو گے، اسی قدر اُس سے عزّت بچا لو گے۔ اور جس قدر اس سے مُنہ بھیڑ اور مقابلہ کرو گے تباہ ہو جاؤ گے اور ذلت خرید لو گے۔ نفسِ مُطمئنہ کی حالت میں انسان کا ملکہ حسنات اور خیرات ہو جاتا ہے۔ وہ دُنیا اور ما سوی اللہ سے بکلی انقطاع کر لیتا ہے۔ وہ دُنیا میں چلتا پھرتا اور دُنیا والوں سے مِلتا جلتا ہے، لیکن حقیقت میں وُہ یہاں نہیں ہوتا۔ جہاں وُہ ہوتا ہے۔ وُہ دُنیا اور ہی ہوتی ہے۔ وہاں کا آسمان اور زمین اور ہوتی ہے۔

جماعتِ احمدیہ کے لیے بشارتِ عظیم

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (آلِ عمران: ۵۶) یہ

تسلّی بخش وعدہ ناصرہ میں پیدا ہونے والے ابنِ مریم سے ہوا تھا، مگر میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ یسُوع مسیح کے نام سے آنیوالے ابنِ مریم کو بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں الفاظ میں مخاطب کرکے بشارت دی ہے۔ اب آپ سوچ لیں کہ جو میرے ساتھ تعلق رکھ کر اس وعدۂ عظیم اور بشارتِ عظیم میں شامل ہونا چاہتے ہیں کیا وُہ وُہ لوگ ہو سکتے ہیں جو امّارہ کے درجہ میں پڑے ہوئے فسق و فجور کی راہوں پر کاربند ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی سچّی قدر کرتے ہیں اور میری باتوں کو قصّہ کہانی نہیں جانتے، تو یاد رکھو اور دل سے سُن لو۔ مَیں ایک بار پھر اُن لوگوں کو مخاطب کرکے کہتا ہوں جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور وہ تعلق کوئی عام تعلق نہیں، بلکہ بہت زبردست تعلق ہے اور ایسا تعلق ہے کہ جس کا اثر (نہ صرف میری ذات تک) بلکہ اس ہستی تک پہنچتا ہے، جس نے مجھے بھی اس برگزیدہ انسانِ کامل کی ذات تک پہنچایا ہے جو دُنیا میں صداقت اور راستی کی رُوح لے کر آیا۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ان باتوں کا اثر میری ذات تک پہنچتا، تو مجھے کچھ بھی اندیشہ اور فکر نہ تھا اور نہ ان کی پرواہ تھی، مگر اس پر بس نہیں ہوتی۔ اس کا اثر ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خود خدائے تعالیٰ کی برگزیدہ ذات تک پہنچ جاتا ہے۔ پس ایسی صُورت اور حالت میں تم خوب دھیان دے کر سُن رکھو کہ اگر اس بشارت سے حصّہ لینا چاہتے ہو اور اس کے مصداق ہونے کی آرزو رکھتے ہو اور اتنی بڑی کامیابی (کہ قیامت تک مکفّرین پر غالب رہوگے) کی سچّی پیاس تمہارے اندر ہے، تو پھر اتنا ہی مَیں کہتا ہوں کہ یہ کامیابی اُس وقت تک حاصل نہ ہوگی جب تک لوّامہ کے درجہ سے گزر کر مطمئنہ کے مینار تک نہ پہنچ جاؤ۔

اس سے زیادہ اور مَیں کچھ نہیں کہتا کہ تم لوگ ایک ایسے شخص کے ساتھ پیوند رکھتے ہو جو مامور من اللہ ہے۔ پس اُس کی باتوں کو دل کے کانوں سے سُنو اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہو جاؤ۔ تاکہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اقرار کے بعد انکار کی نجاست میں گِر کر ابدی عذاب خرید لیتے ہیں[1] ٭ فقط

---

[1] (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۲-۱۰۰)

حضرتِ اقدس امام الزمان کی تیسری تقریر

(۳۰ دسمبر ۱۸۹۷ء)

دوستوں کے لیے ہمدردی اور غمخواری

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے دوستوں کا تعلق ہمارے ساتھ اعضاء کی طرح سے ہے اور یہ بات ہمارے روزمرہ کے تجربہ میں آتی ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے عضو مثلاً اُنگلی ہی میں درد ہو، تو سارا بدن بے چین اور بے قرار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ٹھیک اسی طرح ہر وقت اور ہر آن میں ہمیشہ اسی خیال اور فکر میں رہتا ہوں کہ میرے دوست ہر قسم کے آرام و آسائش سے رہیں۔ یہ ہمدردی اور یہ غمخواری کسی تکلف اور بناوٹ کی رُو سے نہیں، بلکہ جس طرح والدہ اپنے بچوں میں سے ہر واحد کے آرام و آسائش کے فکر میں مستغرق رہتی ہے خواہ وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح میں للّٰہی دلسوزی اور غمخواری اپنے دل میں دوستوں کے لیے پاتا ہوں اور یہ ہمدردی کچھ ایسی اضطراری حالت پر واقع ہوئی ہے کہ جب ہمارے دوستوں میں سے کسی کا خط کسی قسم کی تکلیف یا بیماری کے حالات پر مشتمل پہنچتا ہے، تو طبیعت میں ایک بے کلی اور گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور ایک غم شاملِ حال ہو جاتا ہے اور جُوں جُوں احباب کی کثرت ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر یہ غم بڑھتا جاتا ہے اور کوئی وقت ایسا خالی نہیں رہتا جبکہ کسی قسم کا فکر اور غم شاملِ حال نہ ہو، کیونکہ اس قدر کثیر التعداد احباب میں سے کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی غم اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی اطلاع پر ادھر دل میں قلق اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے میں نہیں بتلا سکتا کہ کس قدر اوقات غموں میں گذرتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو ایسے ہموم اور افکار سے نجات دیوے۔ اس لیے میں ہمیشہ دُعاؤں میں لگا رہتا ہوں اور سب سے مقدم دُعا یہی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں کو ہموم اور غموم سے محفوظ رکھے، کیونکہ مجھے تو اُن کے ہی افکار اور رنج غم میں ڈالتے ہیں۔ اور پھر یہ دُعا مجموعی ہیئت سے کی جاتی ہے کہ اگر کسی کو کوئی رنج اور تکلیف پہنچی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُس سے اُس کو نجات دے۔ ساری سرگرمی اور پورا جوش یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کروں۔ دُعا کی قبولیت میں بڑی بڑی اُمیدیں ہیں۔

قبولیتِ دُعا کے اصُول

بلکہ میرے ساتھ میرے مولیٰ کریم کا صاف وعدہ ہے کہ اُجِیْبُ کُلَّ دُعَائِکَ۔ مگر میں خوب سمجھتا ہوں کہ کُل سے مُراد یہ ہے کہ جن کے نہ سُننے سے ضرر پہنچ جاتا

لیکن اگر اللہ تعالیٰ تربیت اور اصلاح چاہتا ہے تو رَدّ کرنا ہی اجابتِ دُعا ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان کسی دُعا میں ناکام رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے دُعا رَدّ کر دی، حالانکہ خدا تعالیٰ اُس کی دُعا کو سُن لیتا ہے اور وہ اجابت بصورت رَدّ ہی ہوتی ہے، کیونکہ اُس کے لیے در پردہ اور حقیقت میں بہتری اور بھلائی اُس کے رَدّ ہی میں ہوتی ہے۔ انسان چونکہ کوتاہ بین ہے اور دُور اندیش نہیں، بلکہ ظاہر پرست ہے، اس لیے اس کو مناسب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے کوئی دُعا کرے اور وہ بظاہر اس کے مُفیدِ مطلب نتیجہ خیز نہ ہو، تو خدا پر بدظنی نہ ہو کہ اُس نے میری دُعا نہیں سنی۔ وہ تو ہر ایک کی دُعا سُنتا ہے۔ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن: ۶۱) فرماتا ہے۔ راز اور بھید یہی ہوتا ہے کہ داعی کے لیے خیر اور بھلائی رَدِّ دُعا ہی میں ہوتی ہے۔

دُعا کا اصول یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبولِ دُعا میں ہمارے اندیشہ اور خواہش کے تابع نہیں ہوتا ہے دیکھو بچے کس قدر اپنی ماؤں کو پیارے ہوتے ہیں اور وہ چاہتی ہے کہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے، لیکن اگر بچے بیہودہ طور پر اصرار کریں اور رو کر تیز چاقو یا آگ کا روشن اور چمکتا ہوا انگارا مانگیں، تو کیا ماں باوجود سچی محبت اور حقیقی دلسوزی کے کبھی گوارا کرے گی کہ اس کا بچہ آگ کا انگارہ لے کر ہاتھ جلالے یا چاقو کی تیز دھار پر ہاتھ مار کر ہاتھ کاٹ لے؟ ہرگز نہیں۔ اسی اصول سے اجابتِ دُعا کا اصول سمجھ سکتے ہیں۔ مَیں خود اس امر میں ایک تجربہ رکھتا ہوں کہ جب دُعا میں کوئی جزو مُضر ہوتا ہے تو وہ دُعا ہرگز قبول نہیں ہوتی ہے۔ یہ بات خوب سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہمارا علم یقینی اور صحیح نہیں ہوتا۔ بہت سے کام نہایت خوشی سے مُبارک سمجھ کر کرتے ہیں اور اپنے خیال میں اُن کا نتیجہ بہت ہی مُبارک خیال کرتے ہیں، مگر انجام کار وہ ایک غم اور مصیبت ہو کر چمٹ جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ خواہشاتِ انسانی سب پر صاد نہیں کر سکتے کہ سب صحیح ہیں۔ چونکہ انسان سہو اور نسیان سے مرکب ہے، اس لیے ہونا چاہیے اور ہوتا ہے کہ بعض خواہش مضر ہوتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اُس کو منظور کرے تو یہ امر منصبِ رحمت کے صریح خلاف ہے۔ یہ ایک سچا اور یقینی امر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دُعاؤں کو سُنتا ہے اور ان کو قبولیت کا شرف بخشتا ہے، مگر ہر رطب و یابس کو نہیں، کیونکہ جوشِ نفس کی وجہ سے انسان انجام اور مآل کو نہیں دیکھتا اور دُعا کرتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ جو حقیقی بہی خواہ اور مآل بین ہے ان مضرتوں اور بدنتائج کو ملحوظ رکھ کر جو اس دُعا کے تحت میں بصورتِ قبول داعی کو پہنچ سکتے ہیں، اُسے رَدّ کر دیتا ہے اور یہ رَدِّ دُعا ہی اس کے لیے قبولِ دُعا ہوتا ہے۔ پس ایسی دُعائیں جن میں انسان حوادث اور صدمات سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے، مگر مُضر دعاؤں کو بصورتِ رَدّ قبول فرما لیتا ہے۔ مجھے یہ الہام بار ہا ہو چکا ہے۔ اُجِيْبُ كُلَّ دُعَائِكَ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہو کہ ہر ایک ایسی دُعا جو نفس الامر میں نافع اور مُفید ہے، قبول کی جائے گی۔ مَیں جب اِس خیال کو اپنے دل میں پاتا ہوں، تو میری رُوح لذّت اور سرُور سے بھر جاتی ہے۔ جب مجھے یہ اوّل ہی اوّل الہام ہوا قریباً پچیس یا تیس برس کا عرصہ ہوتا ہے، تو مجھے بہت ہی خوشی ہوتی کہ اللہ تعالیٰ میری دُعائیں جو میرے یا

میرے احباب کے متعلق ہوں گی ، ضرور قبول کریگا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ اس معاملہ میں بُخل نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ ایک انعامِ الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے مُتقین کی صفت میں فرمایا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ : ۴) پس میں نے اپنے دوستوں کیلئے یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ خواہ وہ یاد دلائیں یا نہ یاد دلائیں، کوئی امرِ خطیر پیش کریں یا نہ کریں۔ اُن کی دینی اور دُنیوی بھلائی کے لیے دُعا کی جاتی ہے۔

قبولیتِ دُعا کی شرائط

مگر یہ بات بھی بحضورِ دل سُن لینی چاہیے کہ قبولِ دُعا کے لیے چند شرائط ہوتی ہیں۔ اُن میں سے بعض تو دُعا کرنے والے کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض دُعا کرانے والے کے متعلق۔ دُعا کرانے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کو مدِ نظر رکھے اور اس کے غِنائے ذاتی سے ہر وقت ڈرتا رہے اور صُلحکاری اور خدا پرستی اپنا شعار بنا لے۔ تقویٰ اور راستبازی سے خدا تعالیٰ کو خوش کرے، تو ایسی صُورت میں دُعا کے لیے بابِ استجابت کھولا جاتا ہے۔ اگر وُہ خدا تعالیٰ کو ناراض کرتا ہے اور اُس سے بگاڑ اور جنگ قائم کرتا ہے، تو اس کی شرارتیں اور غلط کاریاں دُعا کی راہ میں ایک سدّ اور چٹان ہو جاتی ہیں اور استجابت کا دروازہ اِس کے لیے بند ہو جاتا ہے۔

ہماری دعاؤں کو ضائع ہونے سے بچائیں

پس ہمارے دوستوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ہماری دُعاؤں کو ضائع ہونے سے بچاویں اور اُن کی راہ میں کوئی روک نہ ڈال دیں جو اُن کی ناشائستہ حرکات سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اُن کو چاہیے کہ وُہ تقویٰ کی راہ اختیار کریں کیونکہ تقویٰ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو شریعت کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں اور اگر شریعت کو مختصر طور پر بیان کرنا چاہیں تو مغزِ شریعت تقویٰ ہی ہو سکتا ہے۔ تقویٰ کے مدارج اور مراتب بہت سے ہیں، لیکن اگر طالبِ صادق ہو کر ابتدائی مراتب اور مراحل استقلال اور خلوص سے طے کرے، تو وہ اُس راستی اور طلبِ صدق کی وجہ سے اعلیٰ مدارج کو پا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (المائدہ : ۲۸) گویا اللہ تعالیٰ مُتقیوں کی دُعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ یہ گویا اُس کا وعدہ ہے اور اُس کے وعدوں میں تخلف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (الرعد : ۳۲) پس جس حال میں تقویٰ کی شرط قبولیتِ دُعا کے لیے ایک غیر منفک شرط ہے، تو ایک انسان غافل اور بے راہ ہو کر اگر قبولیتِ دُعا چاہے، تو کیا وہ احمق اور نادان نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری جماعت کو لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ ہر ایک اُن میں سے تقویٰ کی راہوں پر قدم مارے، تا کہ قبولیتِ دُعا کا سُرور اور حظّ حاصل کرے اور زیادتیِ ایمان کا حصّہ لے۔

نفسِ انسانی کی تین حالتیں

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی کی تین حالتیں ہیں۔ ایک اَمّارہ، دُوسری لوّامہ، تیسری مُطمئنّہ۔ نفسِ امّارہ کی حالت میں انسان شیطان

کے پنجہ میں گویا گرفتار ہوتا ہے اور اس کی طرف بہت جُھکتا ہے، لیکن نفسِ لوّامہ کی حالت میں وہ اپنی خطاکاریوں پر نادم ہوتا اور شرمسار ہوکر خدا کی طرف جُھکتا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی ایک جنگ رہتی ہے کبھی شیطان کی طرف جھکتا ہے اور کبھی رحمان کی طرف۔ مگر نفسِ مطمئنہ کی حالت میں وہ عِبادُ الرحمٰن کے زُمرہ میں داخل ہوجاتا ہے اور یہ گویا ارتفاعی نقطہ ہے، جس کے بالمقابل نیچے کی طرف امّارہ ہے۔ اس میزان کے بیچ میں لوّامہ ہے جو ترازو کی زبان کی طرح ہے۔ انخفاضی نقطہ کی طرف اگر زیادہ جھکتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر اور اَرذل ہوجاتا ہے اور ارتفاعی نقطہ کی طرف جس قدر رجُوع کرتا ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے قریب ہوجاتا ہے اور سِفلی اور ارضی حالتوں سے نکل کر علوی اور سماوی فیضان سے حصّہ لیتا ہے۔

دُنیا میں کوئی چیز منفعت سے خالی نہیں

یہ بات بھی خوب یاد رکھنی چاہیے کہ ہر بات میں منافعہ ہوتا ہے۔ دُنیا میں دیکھ لو۔ اعلیٰ درجہ کی نباتات سے لیکر کیڑوں اور چوہوں تک بھی کوئی چیز ایسی نہیں، جو انسان کے لیے منفعت اور فائدے سے خالی ہو۔ یہ تمام اشیاء خواہ وہ ارضی ہیں یا سماوی اللہ تعالیٰ کی صفات کے اظلال اور آثار ہیں اور جب صفات میں نفع ہی نفع ہے، تو بتلاؤ کہ ذات میں کس قدر نفع اور سُود ہوگا۔ اس مقام پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جیسے اِن اشیاء سے کسی وقت نقصان اُٹھاتے ہیں، تو اپنی غلطی اور نافہمی کی وجہ سے۔ اِس لیے نہیں کہ نفس الامر میں ان اشیاء میں مضرّت ہی ہے۔ نہیں، بلکہ اپنی غلطی اور خطاکاری سے۔ اسی طرح پر ہم اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا عِلم نہ رکھنے کی وجہ سے تکلیف اور مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں؛ ورنہ خدا تعالیٰ تو ہمہ رحم اور کرم ہے۔ دُنیا میں تکلیف اُٹھانے اور رنج پانے کا یہی راز ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں اپنی سُوءِ فہم اور قصُورِ علم کی وجہ سے مبتلائے مصائب ہوتے ہیں۔ پس اس صفائی آنکھ کے ہی روزن سے ہم اللہ تعالیٰ کو رحیم اور کریم اور حد سے زیادہ قیاس سے باہر نافع ہستی پاتے ہیں اور ان منافع سے زیادہ بہرہ وَر وہی ہوتا ہے جو اس کے زیادہ قریب اور نزدیک تر آتا جاتا ہے اور یہ درجہ اُن لوگوں کو ہی ملتا ہے جو مُتّقی کہلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قُرب میں جگہ پاتے ہیں۔ جُوں جُوں مُتّقی خدا تعالیٰ کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ ایک نورِ ہدایت اُسے ملتا ہے، جو اُس کی معلومات اور عقل میں ایک خاص قسم کی روشنی پیدا کرتا ہے اور جُوں جُوں دُور ہوتا جاتا ہے ایک تباہ کرنے والی تاریکی اس کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ (البقرہ: ۱۹) کا مصداق ہوکر ذلت اور تباہی کا موردبن جاتا ہے، مگر اُس کے بالمقابل نور اور روشنی سے بہرہ ور انسان اعلیٰ درجہ کی راحت اور عزّت پاتا ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً (الفجر: ۲۸، ۲۹) یعنی اے وہ نفس جو اطمینان یافتہ ہے اور پھر یہ اطمینان خدا کے ساتھ پایا ہے۔ بعض لوگ حکومت سے بظاہر اطمینان اور سیری حاصل کرتے ہیں۔ بعض کی تسکین اور سیری کا موجب اُن کا مال اور عزّت ہوجاتی ہے۔ اور بعض اپنی خوبصورت اور ہوشیار اولاد و احفاد کو دیکھ دیکھ کر بظاہر مطمئن کہلاتے ہیں، مگر یہ لذت انواع و اقسام

کی لذّاتِ دُنیا انسان کو سچّا اطمینان اور سچی تسلّی نہیں دے سکتیں۔ بلکہ ایک قسم کی ناپاک حرص کو پیدا کرکے طلب اور پیاس کو پیدا کرتی ہیں۔ استسقاء کے مریض کی طرح اُن کی پیاس نہیں بُجھتی۔ یہاں تک کہ اُن کو ہلاک کر دیتی ہے۔ مگر یہاں خدا تعالیٰ فرماتا ہے وُہ نفس جس نے اپنا اطمینان خدا تعالیٰ میں حاصل کیا ہے۔ یہ درجہ بندے کے لیے ممکن ہے۔ اس وقت اس کی خوشحالی باوجود مال و منال کے دُنیوی حشمت اور جاہ و جلال کے ہوتے ہوئے بھی خدا ہی میں ہوتی ہے۔ یہ زر و جواہر، یہ دُنیا اور اس کے دھندے، اُس کی سچی راحت کا موجب نہیں ہوتے۔ پس جب تک انسان خدا تعالیٰ ہی میں راحت اور اطمینان نہیں پاتا، وُہ نجات نہیں پا سکتا، کیونکہ نجات اطمینان ہی کا ایک مترادف لفظ ہے۔

نفسِ مطمئنہ کے بغیر انسان نجات نہیں پا سکتا

مَیں نے بعض آدمیوں کو دیکھا اور اکثروں کے حالات پڑھے ہیں جو دُنیا میں مال و دولت اور دُنیا کی جھوٹی لذتیں اور ہر ایک قسم کی نعمتیں اَولاد احفاد رکھتے تھے۔ جب مرنے لگے اور اُن کو اس دُنیا کے چھوڑ جانے اور ساتھ ہی ان اشیاء سے الگ ہونے اور دُوسرے عالَم میں جانے کا علم ہوا تو اُن پر حسرتوں اور بے جا آرزوؤں کی آگ بھڑکی اور سرد آہیں مارنے لگے۔ پس یہ بھی ایک قسم کا جہنّم ہے۔ جو انسان کے دل کو راحت اور قرار نہیں دے سکتا، بلکہ اس کو گھبراہٹ اور بے قراری کے عالَم میں ڈال دیتا ہے۔ اس لیے یہ امر بھی میرے دوستوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیے کہ اکثر اوقات انسان اہل و عیال اور اموال کی محبت ہاں ناجائز اور بیجا محبت میں ایسا محو ہو جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات اسی محبت کے جوش اور نشہ میں ایسے ناجائز کام کر گزرتا ہے، جو اُس میں اور خدا تعالیٰ میں ایک حجاب پیدا کر دیتے ہیں اور اُس کے لیے ایک دوزخ تیار کر دیتے ہیں۔ اس کو اس بات کا علم نہیں ہوتا جب وہ اُن سب سے یکایک علیٰحدہ کیا جاتا ہے اس گھڑی کی اُسے خبر نہیں ہوتی۔ تب وہ ایک سخت بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی چیز سے جب محبت ہو، تو اس سے جدائی اور علیٰحدگی پر ایک رنج اور دردناک غم پیدا ہو جاتا ہے۔ اب یہ مسئلہ منقولی ہی نہیں بلکہ معقولی رنگ رکھتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (الھمزۃ: ۷-۸) پس یہ وُہی غیر اللہ کی محبت کی آگ ہے جو انسانی دل کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور ایک حیرت ناک عذاب اور دَرد میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ بالکل سچی اور یقینی بات ہے کہ نفسِ مطمئنہ کے بدُوں انسان نجات نہیں پا سکتا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ نفسِ اَمّارہ کی حالت میں انسان شیطان کا غلام ہوتا ہے اور لوّامہ میں اُسے شیطان سے ایک مجاہدہ اور جنگ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی وُہ غالب آجاتا ہے اور کبھی شیطان، مگر مطمئنہ کی حالت ایک امن اور آرام کی حالت ہوتی ہے کہ وہ آرام سے بیٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اس آیت میں کہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (الفجر: ۲۸) یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری حالت میں کس قدر استراحت ہوتی ہے، چنانچہ اس کا ترجمہ

یہ ہے۔ کہ اے نفسِ مطمئنّہ اللہ کی طرف چلا آ۔ ظاہر کے لحاظ سے تو یہ مطلب ہے کہ جان کندنی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آتی ہے کہ اے مطمئن نفس۔ اپنے ربّ کی طرف چلا آ۔ وُہ تجھ سے خوش اور تُو اس سے راضی۔ چونکہ قرآن کے لیے ظاہر اور بطن دونوں ہیں۔ اس لیے بطن کے لحاظ سے یہ مطلب ہے کہ اے اطمینان پر پہنچے ہوئے نفس اپنے ربّ کی طرف چلا آ۔ یعنی تیری طبعًا یہ حالت ہو چکی ہے کہ تُو اطمینان اور سکینت کے مرتبہ پر پہنچ گیا ہے اور تجھ میں اور اللہ تعالیٰ میں کوئی بُعد نہیں ہے۔ لوّامہ کی حالت میں تو تکلیف ہوتی ہے، مگر مطمئنّہ کی حالت میں ایسا ہوتا ہے کہ جیسے پانی اُوپر سے گرتا ہے۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ کی محبت انسان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ خدا ہی کی محبت سے جیتا ہے۔ غیر اللہ کی محبت جو اس کے لیے ایک جلانے اور جہنّم کے پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ جل جاتی ہے اور اُس کی جگہ ایک روشنی اور نور بھر دیا جاتا ہے۔ اس کی رضاء اللہ تعالیٰ کی رضا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس کا منشاء ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی محبت ایسی حالت میں اس کے لیے بطور جان ہوتی ہے۔ جس طرح زندگی کے لیے لوازمِ زندگی ضروری ہیں۔ اس کی زندگی کے لیے خدا اور صرف خُدا ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے کہ خُدا تعالیٰ ہی اس کی سچی خوشی اور پُوری راحت ہوتا ہے۔

انسانی ہستی کا مُدّعا

نفسِ مطمئنّہ کی یہ نشانی ہے کہ کسی خارجی تحریک کے بدُوں ہی وُہ ایسی صورت پکڑ جاتا ہے کہ خدا کے بدُوں رہ نہیں سکتا اور یہی انسانی ہستی کا مدّعا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ فارغ انسان شکار، شطرنج، گنجفہ وغیرہ اشغال اپنے لیے پیدا کر لیتے ہیں، مگر جب مطمئنّہ ناجائز اور عارضی اور بسا اوقات رنج اور کرب پیدا کرنے والے اشغال سے الگ ہو گیا۔ اب الگ ہو کر منقطع عالم اُسے کیوں یاد آوے۔ اس لیے خدا ہی سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ امر بھی دل سے محو نہیں ہونا چاہیے کہ محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ذاتی محبت ہوتی ہے اور ایک محبت اغراض سے وابستہ ہوتی ہے۔ یا یُوں کہو کہ اُس کا باعث صرف چند عارضی باتیں ہوتی ہیں۔ جن کے دُور ہوتے ہی وہ محبت سرد ہو کر رنج اور غم کا باعث ہو جاتی ہے، مگر ذاتی محبت سچی راحت پیدا کرتی ہے۔ چونکہ انسان فطرتًا خدا ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت: ۵۷) اس لیے خدا تعالیٰ نے اُس کی فطرت ہی میں اپنے لیے کچھ نہ کچھ رکھا ہوا ہے اور اپنے پوشیدہ اور مخفی در مخفی اسباب سے اُسے اپنے لیے بنایا ہوا ہے پس جب انسان جھوٹی اور نمائشی۔ ہاں عارضی اور رنج پر ختم ہونے والی محبتوں سے الگ ہو جاتا ہے پھر وہ خدا ہی کے لیے ہو جاتا ہے اور طبعًا کوئی بُعد نہیں رہتا اور خدا کی طرف دوڑا چلا آتا ہے۔ پس اس آیت یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ خدا تعالیٰ کا آواز دینا یہی ہے کہ درمیانی حجاب اُٹھ گیا اور بُعد نہیں رہا۔ یہ متّقی کا انتہائی درجہ ہوتا ہے۔ جب وہ اطمینان اور راحت پاتا ہے۔ دُوسرے مقام پر قرآن شریف نے اس اطمینان کا نام فلاح اور استقامت بھی رکھا ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں اسی

اِستقامت یا اطمینان یا فلاح کی طرف لطیف اشارہ ہے اور خود مستقیم کا لفظ بتلا رہا ہے۔

معجزات سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ غیر معمولی طور پر کوئی کام نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ خلقِ اسباب کرتا ہے خواہ ہم کو ان اسباب پر اطلاع ہو یا نہ ہو، الغرض اسباب مزدور ہوتے ہیں۔ اِس لیئے شق القمر" یا "ینَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا (الانبیاء : ۰۰) کے مُعجزات بھی خارج از اسباب نہیں، بلکہ وُہ بھی بعض مخفی در مخفی اسباب کے نتائج ہیں اور سچے اور حقیقی سائنس پر مبنی ہیں۔ کوتاہ اندیش اور تاریک فلسفہ کے دلدادہ اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے تو یہ حیرت آتی ہے کہ جس حال میں یہ ایک امر مسلّم ہے کہ عدمِ علم سے عدمِ شئے لازم نہیں آتا، تو نادان فلاسفر کیوں ان اسباب کی بے علمی پر جو اُن مُعجزات کا موجب ہیں اصل مُعجزات کی نفی کی جرأت کرتا ہے۔ ہاں ہمارا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے، تو اپنے کسی بندے کو اُن اسبابِ مخفیہ پر مطلع کر دے، لیکن یہ کوئی لازم بات نہیں۔ دیکھو انسان اپنے لیے جب گھر بناتا ہے، تو جہاں اور سب آسائش کے سامانوں کا خیال رکھتا ہے، سب سے پہلے اس امر کو بھی ملحوظ رکھ لیتا ہے کہ اندر جانے اور باہر نکلنے کے لیے بھی کوئی دروازہ بنا لے۔ اور اگر زیادہ ساز و سامان ہاتھی، گھوڑے، گاڑیاں بھی پاس ہیں تو علیٰ قدرِ مراتب ہر ایک چیز اور سامان کے نکلنے اور جانے کے واسطے دروازہ بناتا ہے نہ یہ کہ سانپ کی بانبی کی طرح ایک چھوٹا سا سوراخ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فعل یعنی قانونِ قدرت پر ایک وسیع اور پُر غور نظر کرنے سے ہم پتہ لگا سکتے ہیں کہ اس نے اپنی مخلوق کو پیدا کر کے یہ کبھی نہیں چاہا کہ وُہ عبودیت سے سرکش ہو کر رُبوبیت سے متعلق نہ ہو۔ رُبوبیت نے عبُودیت کو دُور کرنے کا ارادہ کبھی نہیں کیا۔ سچا فلسفہ یہی ہے۔ جو لوگ عبُودیت کو کوئی مستقل اختیار والی شئے سمجھتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں۔ خُدا نے اُس کو ایسا نہیں بنایا۔ ہماری معلُومات، خیالات اور عقلوں کا باہم مساوی نہ ہونا اور ہر امر پر پوری اور کماحقہ روشنی ڈالنے کے ناقابل ہونا صریح اس امر کی دلیل ہے کہ عبُودیت بدُوں فیضانِ ربوبیت کے نہیں رہ سکتی۔ ہمارے جسم کا ذرّہ ذرّہ ملائک کا حکم رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو پھر دوا اور اس سے بڑھ کر دُعا کا اُصول ہی بے فائدہ اور بے جان ہوتا۔

زمین، آسمان اور مافی الارض والسّمٰوات پر نظر کرو اور سوچو کہ کیا یہ کُل مخلوقات بذاتہٖ و بنفسہٖ اپنے قیام اور ہستی میں مستقل اختیار رکھتے ہیں یا کسی کے محتاج ہیں؟

تمام مخلوقات اجرامِ فلکی سے لے کر ارضی تک اپنی بناوٹ ہی میں عبُودیت کا رنگ رکھتی ہیں۔ ہر پتّے سے یہ پتہ ملتا ہے اور ہر شاخ اور آواز سے یہ صدا نکلتی ہے کہ الُوہیت اپنا کام کر رہی ہے اسکے عمیق در عمیق تصرّفات جن کو ہم خیال اور قوّت سے بیان نہیں کر سکتے، بلکہ کامِل طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اپنا کام کر رہے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (البقرہ: ۲۵۶) یعنی اللہ تعالیٰ ہی ایک ایسی ذات ہے جو جامع صفاتِ کاملہ اور ہر ایک نقص سے منزّہ ہے۔ وہی مستحقِ عبادات ہے۔ اسی کا وجود بدیہی الثبوت ہے۔ کیونکہ وُہ حَیّ بالذّات اور قائم بالذّات

ہے اور بجز اس کے اور کسی چیز میں حق بالذات اور قائم بالذات ہونے کی صفت نہیں پائی جاتی۔ کیا مطلب۔ کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں اور کسی میں یہ صفت نظر نہیں آتی کہ بغیر کسی علتِ موجبہ کے آپ ہی موجود اور قائم ہو یا یہ کہ اس عالم کی جو کمال حکمت اور ترتیب محکم و موزوں سے بنایا گیا ہے۔ علتِ موجبہ ہو سکے۔ غرض اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو ان مخلوقاتِ عالم میں تغیر و تبدل کر سکتی ہو یا ہر ایک شے کی حیات کا موجب اور قیام کا باعث ہو۔

صوفیاء کے دو مکتبہ ہائے فکر وجودی و شہودی

اس آیت پر نظر کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وجودی مذہب حق سے دور چلا گیا ہے اور اس نے صفاتِ الٰہیہ کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ معلوم نہیں کر سکا کہ اس نے عبودیت اور الوہیت کے ہی رشتہ پر ٹھوکر کھائی ہے۔ اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے جو لوگ اہلِ کشف ہوتے ہیں اور ان میں سے اہلِ مجاہدہ نے دریافت کرنا چاہا، تو عبودیت اور ربوبیت کے رشتہ میں امتیاز نہ کر سکے اور خلق الاشیاء کے قائل ہو گئے۔

قرآن شریف قلب ہی پر وارد ہو کر زبان پر آتا ہے اور قلب کا کس قدر تعلق تھا کہ کلامِ الٰہی کا مورد ہو گیا۔ اس باریک بحث سے وہ دھوکہ کھا سکتے تھے، مگر بات یہ ہے کہ انسان جب غلط فہمی سے قدم اٹھاتا ہے تو پھر مشکلات کے بھنور میں پھنس جاتا ہے، جیسا میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کے تصرفات انسان کے ساتھ ایسے عمیق در عمیق ہیں کہ کوئی طاقت انکو بیان نہیں کر سکتی اور اگر ایسا ہوتا، تو اس کی ربوبیت اور صفاتِ کاملہ مندرجہ قرآن نہ پائی جاتیں۔ ہمارا عدم ہی اس کی ہستی کا ثبوت ہے اور یہ ایک سچی بات ہے کہ جب انسان ہر طرح سے بے اختیار ہوتا ہے، تو اس کا عدم ہی ہوتا ہے۔ اس باریک بھید کو بعض لوگ نہ سمجھ کر خلق الاشیاء ھو عین کہہ اٹھتے ہیں۔ وجودی اور شہودی ہیں سے اول الذکر تو وہی ہیں، جو خلق الاشیاء ھو عین کہتے اور مانتے ہیں اور ثانی الذکر وہ ہیں جو فنا نظری کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت میں انسان اس قدر استغراق کر سکتا ہے کہ وہ فنا فی اللہ ہو سکتا ہے اور پھر اس کے لیے یہ کہنا سزاوار ہوتا ہے ؂

من تن شدم، تو جاں شدی، من تو شدم تو من شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

بایں ہمہ تصرفاتِ الٰہیہ کا قائل ان کو بھی ہونا پڑتا ہے۔ خواہ وجودی ہوں یا شہودی ہوں۔ ان کے بعض بزرگ اور اہلِ کمال بایزید بسطامیؒ سے لے کر شبلیؒ۔ ذوالنونؒ اور محی الدین ابن عربیؒ تک کے کلمات علی العموم ایسے ہیں کہ بعض ظاہر طور پر اور بعض مخفی طور پر اسی طرف گئے ہیں۔ میں یہ بات کھول کر کہنی چاہتا ہوں کہ ہمارا یہ حق نہیں کہ ہم ان کو استہزا کی نظر سے دیکھیں۔ نہیں نہیں۔ وہ اہلِ عقل تھے۔ بات یوں ہے کہ معرفت کا یہ ایک باریک اور عمیق راز تھا۔ اس کا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا ــــ یہی بات تھی اور کچھ نہیں۔ خدا تعالیٰ کے اعلیٰ تصرفات پر انسان ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ہالک الذات۔ انھوں نے انسان کو ایسا دیکھا اور ان کے منہ سے ایسی باتیں نکلیں اور ذہن ادھر منتقل ہو گیا۔ پس

یہ امر بحضورِ دل یاد رکھو کہ باوصفیکہ انسان صفائی باطن سے ایسے درجہ پر پہنچتا ہے (جیسا کہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اس مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچے) کہ جہاں اُسے اقتداری طاقت ملتی ہے لیکن خالق اور مخلوق میں ایک فرق ہے اور نمایاں فرق ہے۔ اس کو کبھی دل سے دُور کرنا نہ چاہیے۔

انسان ہستی کے عوارض سے آزاد نہیں۔ نہ یہاں نہ وہاں۔ کھاتا پیتا ہے۔ معاصی ہوتے ہیں۔ کبائر بھی اور صغائر بھی۔ اور اسی طرح پر اگلے جہان میں بھی بعض جہنم میں ہوں گے اور بعض جنت الخلد میں۔ غرض یہ ہے کہ انسان کبھی بھی جامۂ عبودیت سے باہر نہیں ہو سکتا، تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کونسا حجاب ہے کہ جب وُہ اُتار کر ربُوبیت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ بڑے بڑے زاہدوں اور مجاہدوں کے شاملِ حال عبُودیت ہی رہی۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عبودیت

قرآنِ کریم کو پڑھ کر دیکھ لو۔ اور تو اور ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر دُنیا میں کسی کامل انسان کا نمونہ موجود نہیں اور نہ آئندہ قیامت تک ہو سکتا ہے۔ پھر دیکھو کہ اقتداری معجزات کے ملنے پر بھی حضور کے شاملِ حال ہمیشہ عبودیت ہی رہی اور بار بار اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف : ۱۱۱) ہی فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ کلمۂ توحید میں اپنی عبُودیت کے اقرار کا ایک جزو لازم قرار دیا۔ جس کے بدُوں مُسلمان مُسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ سوچو! اور پھر سوچو!! پس جس حال میں ہادیٔ اکمل کی طرزِ زندگی ہم کو یہ سبق دے رہی ہے کہ اعلیٰ ترین مقامِ قرب پر بھی پہنچ کر عبُودیت کے اعتراف کو ہاتھ سے نہیں دیا، تو اور کسی کا تو ایسا خیال کرنا اور ایسی باتوں کا دل میں لانا ہی فضول اور عبث ہے۔

تصرفات کی دو قسمیں

ہاں! یہ سچی بات ہے۔ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات بیحد و بے شمار ہیں۔ ان کی تعداد اور گنتی ناممکن ہے۔ انسان جس قدر زُہد اور مجاہدہ کرتا ہے اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا جاتا ہے اور اس نسبت سے ان تصرفات کا ایک رنگ اُس پر آتا جاتا ہے اور تصرفاتِ اللہ کی واقفیت کا دروازہ اس پر کھلتا ہے۔ اِس امر کا بیان کر دینا بھی مناسب موقع معلوم ہوتا ہے کہ تصرفات بھی دُو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک باعتبار مخلوق کے اور دُوسرے باعتبار قُرب کے۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایک تصرف تو اسی مخلوق کی نوعیت اور اعتبار سے ہوتا ہے جو یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان : ۸) وغیرہ کے رنگ میں ہوتا ہے۔ صحت، بیماری وغیرہ اُس کے ہی اختیار میں ہوتا ہے اور ایک جدید تصرف قُرب کے مراتب میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے طور پر اُن کے قریب ہوتا ہے کہ اُن سے مخاطبات اور مکالمات شروع ہو جاتے ہیں اور اُن کی دُعاؤں کا جواب ملتا ہے، مگر بعض لوگ نہیں سمجھ سکتے اور یہاں تک ہی نہیں، بلکہ نرے مکالمہ اور مخاطبہ سے بڑھ کر ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ اُلوہیت کی چادر اُن پر پڑی ہوئی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اپنی ہستی کے طرح طرح کے نمونے ان کو دکھاتا ہے اور یہ ایک ٹھیک مثال اس قُرب اور تعلق کی ہے۔ کہ جیسے لوہے کو کسی آگ میں رکھ دیں، تو وُہ اثر پذیر ہو کر سُرخ آگ

کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا ہے۔ اُس وقت اُس میں آگ کی سی روشنی بھی ہوتی ہے اور احراق جو ایک صفت آگ کی ہے وُہ بھی اُس میں آجاتی ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ ایک بیّن بات ہے کہ وہ لوہا آگ یا آگ کا ٹکڑا نہیں ہوتا۔

ایک مقام پر اہل اللہ سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر اُلوہیت کے خواص رکھتے ہیں

اسی طرح ہمارے تجربہ میں آیا ہے کہ اہل اللہ قربِ الٰہی میں ایسے مقام تک جا پہنچتے ہیں جبکہ ربانی رنگ بشریت کے رنگ و بُو کو تمام و کمال اپنے رنگ کے نیچے متواری کر لیتا ہے اور جس طرح آگ لوہے کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا اور ظلّی طور پر وہ صفاتِ الٰہیہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔
اُس وقت اس سے بدُوں دُعا و التماس ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر اُلوہیت کے خواص رکھتے ہیں اور وہ ایسی باتیں مُنہ سے نکالتے ہیں جو جس طرح کہتے ہیں۔ اُسی طرح ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور زبان سے ایسے امُور کے صُدور کی بصراحت بحث ہے۔ جیسا کہ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال : ۱۸) اور ایسا ہی معجزہ شق القمر اور اسی طرح پر اکثر مریضوں اور سقیم الحال لوگوں کا اچھا کر دینا ثابت ہے قرآن شریف میں جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ ارشاد ہوا کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم : ۴) یہ اُس شدید اور اعلیٰ ترین قُرب ہی کی طرف اشارہ ہے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال تزکیہ نفس اور قربِ الٰہی کی ایک دلیل ہے۔
حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عبدِ مومن کے ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں وغیرہ وغیرہ ہو جاتا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ تمام اعضاء للّٰہی طاعت کے رنگ سے ایسے رنگین ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ ایک الٰہی آلہ ہیں، جن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً افعالِ الٰہیہ ظہُور پذیر ہوتے ہیں۔ یا ایک مُصفّا آئینہ ہیں، جس میں تمام مرضیاتِ الٰہیہ بصفاءِ تام عکسی طور پر ظہور کرتی رہتی ہیں۔ یا یہ کہو کہ اس حالت میں وہ اپنی انسانیت سے بکلّی دستبردار ہو جاتے ہیں۔ جیسے جب انسان بولتا ہے، تو اُس کے دل میں خیال ہوتا ہے کہ لوگ اُس کی فصاحت اور خوش بیانی اور قادرُ الکلامی کی تعریف کریں۔ مگر وہ لوگ جو خُدا کے بُلائے بولتے ہیں اور اُن کی رُوح جب جوش مارتی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ایک موج اُس پر اثر انداز ہو کر توجّہ پیدا کر دیتی ہے اور اپنی آواز اور تکلم سے وُہ نہیں بولتے۔ بلکہ الٰہی حال اور قال اور جوش سے۔ اور ایسا ہی جب وہ دیکھتے ہیں تو جیسا کہ قاعدہ ہے کہ دیکھنے میں فکر شامل ہے۔ اُن کی رویت اپنے دخل سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے نُور سے اور وہ اُنکو ایک ایسی چیز دکھا دیتا ہے جو دُوسری پُر غور نظر بھی نہیں دیکھ سکتی۔

مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیے

جیسے آیا ہے کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ۔ یعنی مومن کی فراست سے بچو، کیونکہ تمھاری آورد ہے اور اس کی آمد۔ تمہارا قال ہے اُس کا حال۔

جیسے ایک گھڑی چلتی ہے۔ اس کے پُرزے تو اُسے چلاتے رہیں گے۔ اگر ہم تین بجے کی جگہ سات بجے کا وقت کہہ سکتے ہو، مگر گھڑی جو اسی مطلب کے لیے بنائی گئی ہے، وُہ تو ٹھیک وقت بتلائے گی اور خطا نہ کرے گی پس اگر اس سے جھگڑو گے تو بجز خفت کے کیا لو گے؟ اسی طرح سے یاد رکھو کہ متقی کا یہ کام نہیں کہ وہ اُن لوگوں سے جھگڑے اور مقابلہ کرے جو قُربِ الٰہی کا درجہ رکھتے ہیں اور دُنیا میں مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں پس مومن کے مقابلہ کے وقت ڈرو۔ اِتَّقُوْا کے مصداق بنو۔ ایسا نہ ہو کہ تم جھُوٹے نکلو اور پھر اس غلط کاری کے بدترین نتائج بھگتو۔ کیونکہ مومن تو اللہ تعالیٰ کے نُور سے دیکھتا ہے اور وُہ نُور تم کو نہیں ملا، اس لیے تم ٹیڑھے چل سکتے ہو، مگر مومن ہمیشہ سیدھا ہی چلتا ہے۔ تم خود ہی بتلاؤ کہ کیا وہ شخص جو ایک تاریکی میں چل رہا ہے، اس آدمی کا مقابلہ کر سکتا ہے جو چراغ کی روشنی میں جا رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ فرمایا ہے: هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (الانعام: ۵۱) کیا اندھا اور بینا مساوی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پس جب ہم اسباب کو دیکھتے ہیں، تو پھر کس قدر غلطی ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

غرض یہ کہ مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیے اور مقابلۂ مومن کے لیے تیار ہو جانا دانشمند انسان کا کام نہیں ہے اور مومن کی شناخت انہیں آثار و نشانات سے ہو سکتی ہے جو ہم نے ابھی بیان کیے ہیں۔ اِسی فراستِ الٰہیہ کا رُعب تھا جو صحابہ کرامؓ پر تھا اور ایسا ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ رُعب بطور نشانِ الٰہی آتا ہے۔ وُہ پُوچھ لیتے تھے کہ اگر یہ وحیِ الٰہی ہے تو ہم مخالفت نہیں کرتے اور وہ ایک ہیبت میں آ جاتے تھے۔

متکلم کے قدر کے موافق اس کے کلام میں ایک عظمت اور ہیبت ہوتی ہے۔ دیکھو دُنیاوی حکام کے سامنے جاتے وقت بھی ایک تکلیف اور رُعب ہوتا اور خیال ہوتا ہے کہ اُن کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اِسی طرح پر جو لوگ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ مومن کے ساتھ خدا ہے، وُہ اس کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو تنہا بیٹھ کر اُس پر غور کرتے ہیں اور مقابلہ کر کے سوچتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری ہوتا ہے کہ واقفِ راہ اور روشنی والے کے لیے دُوسرے تابع ہو جاویں۔ اور یہی حدیث اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ کا منشاء اور مفہوم ہے۔ یعنی جب مومن کچھ بیان کرے، تو خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، کیونکہ وہ جو کچھ بولتا ہے، وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بولتا ہے۔ مُدعا یہ ہے کہ مومن جب خدا سے محبت کرتا ہے تو الٰہی نُور کا اُس پر احاطہ ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ نُور اس کو اپنے اندر چُھپا لیتا ہے اور اس کی بشریت کو ایک حد تک بھسم کر جاتا ہے۔ جیسے آگ میں پڑا ہوا لوہا ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی وہ عبُودیت اور بشریت معدوم نہیں ہو جاتی۔ یہی وُہ راز ہے جو قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف: ۱۱۱) کی تہ میں مرکوز ہے۔ بشریت تو ہوتی ہے، مگر وہ اُلوہیت کے رنگ کے نیچے متواری ہو جاتی ہے اور اس کے تمام قویٰ اور اعضاء لِلّٰہی راہوں میں خدا تعالیٰ کے ارادوں سے پُر ہو کر اس کی خواہشوں کی تصویر ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وُہ امتیاز ہے جو اُس کو کروڑہا مخلوق کی رُوحانی تربیت کا کفیل

بنا دیتا ہے اور رُبوبیتِ تامّہ کا ایک مظہر قرار دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کبھی بھی ایک نبی اس قدر مخلوقات کے لیے ہادی اور رہبر نہ ہو سکے۔

رسُولِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کا بے نظیر مقام

چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کُل دُنیا کے انسانوں کی رُوحانی تربیت کے لیے آئے تھے۔ اس لیے یہ رنگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بدرجہ کمال موجود تھا اور یہی وُہ مرتبہ ہے جس پر قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر حضور کی نسبت شہادت دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابل اور اُسی رنگ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۱۰۸) اور ایسا ہی فرمایا يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف: ۱۵۹) قرآنِ شریف کے دُوسرے مقامات پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اُمّی فرمایا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے آپؐ کا کوئی اُستاد نہ تھا۔ مگر بایں ہمہ کہ آپؐ اُمّی تھے۔ حضور کے دین میں اُمِّيُّوْنَ اوسط درجہ کے آدمیوں کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے فلاسفروں اور عالموں کو بھی کردیا قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا کے معنے نہایت ہی لطیف طور پر سمجھ میں آسکتے ہیں۔ جَمِيْعًا کے دو معنے ہیں۔ اوّل تمام بنی نوعِ انسان یا تمام مخلوق۔ دوم تمام طبقے کے آدمیوں کے لیے یعنی متوسط، ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے فلاسفروں اور ہر ایک قسم کی عقل رکھنے والوں کے لیے۔ غرض ہر عقل اور ہر مزاج کا آدمی مجھ سے تعلق کر سکتا ہے۔

قرآنِ کریم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُسی اُمّی نے کتاب اور حکمت ہی نہیں بتلائی، بلکہ تزکیہ نفس کی راہوں سے واقف کیا اور یہاں تک کہ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ: ۲۳) تک پہنچا دیا۔ دیکھو اور پُر غور نظر سے دیکھو کہ قرآن شریف ہر راز کے طالب کو اپنے مطلوب تک پہنچاتا اور ہر راستی اور صداقت کے پیاسے کو سیراب کرتا ہے۔ لیکن خیال تو کرو کہ یہ حکمت اور معرفت کا دریا، صداقت اور نُور کا چشمہ کس پر نازل ہوا؟ اسی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ایک طرف تو اُمّی کہلاتا ہے اور دُوسری طرف وُہ کمالات اور حقائق اُس کے مُنہ سے نکل رہے ہیں کہ دُنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر پائی نہیں جاتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال فضل ہے کہ تا لوگ محسوس کریں کہ اللہ تعالیٰ کے تعلقات انسان کے ساتھ کہاں تک ہو سکتے ہیں؟ ہماری غرض اس بیان سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلقات بہت نازک درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مُقربین سے اُلوہیت کا ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ مخلوق پرست انسان اُن کو خدا سمجھ لیتے ہیں یہ بالکل دُرست اور صحیح ہے کہ ؎

مردانِ خدا، خدا نباشند لیکن ز خدا جُدا نباشند

خدا تعالیٰ اُن کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ بغیر دُعاؤں کے بھی اُن کی امداد کرتا ہے۔ مُدعا یہ ہے کہ انسان کا اعلیٰ درجہ وہی نفسِ مطمئنہ ہے جس پر مَیں نے گفتگو شروع کی ہے۔ اسی حالت میں اور تمام حالتوں سے ایسے لوازم ہو جاتے ہیں کہ

عام تعلقِ الٰہی سے بڑھ کر خاص تعلق ہو جاتا ہے، جو زمینی اور سفلی نہیں ہوتا۔ بلکہ علوی اور سماوی تعلق ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اطمینان جس کو فلاح اور استقامت بھی کہتے ہیں اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ: ۶) میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے اور اسی راہ کی دُعا تعلیم کی گئی ہے اور یہ استقامت کی راہ ان لوگوں کی راہ ہے جو منعم علیہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے افضال و اکرام کے مورد ہیں۔ مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ کی راہ کو خاص طور پر بیان کرنے سے یہ مطلب تھا کہ استقامت کی راہیں مختلف ہیں۔ مگر وہ استقامت جو کامیابی اور فلاح کی راہوں کا نام ہے۔ وُہ انبیاء علیہم السّلام کی راہیں ہیں۔ اِس میں ایک اور اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں وُہ دُعا انسان کی زبان، قلب اور فعل سے ہوتی ہے اور جب انسان خُدا سے نیک ہونے کی دُعا کرے تو اُسے شرم آتی ہے، مگر یہی ایک دُعا ہے جو اِن مشکلات کو دُور کر دیتی ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (الفاتحہ: ۵) تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی اِمداد چاہتے ہیں۔

دُعا کرنے سے پہلے تمام قویٰ کا خرچ کرنا ضروری ہے

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو تقدم اس لیے ہے کہ انسان دُعا کے وقت تمام قویٰ سے کام لے کر خدا تعالیٰ کی طرف آتا ہے۔ یہ ایک بے اَدبی اور گستاخی ہے کہ قویٰ سے کام نہ لے کر اور قانونِ قدرت کے قواعد سے کام نہ لے کر آوے۔ مثلاً کسان اگر تخم ریزی کرنے سے پہلے ہی یہ دُعا کرے کہ الٰہی! اِس کھیت کو ہرا بھرا کر اور پھل پھول لا، تو یہ شوخی اور ٹھٹھا ہے۔ اسی کو خدا کا امتحان اور آزمائش کہتے ہیں، جس سے منع کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خدا کو مت آزماؤ۔ جیسا کہ مسیح علیہ السّلام کے مائدہ مانگنے کے قصّہ میں اس امر کو بوضاحت بیان کیا گیا ہے۔ اس پر غور کرو اور سوچو۔

یہ سچی بات ہے کہ جو شخص اعمال سے کام نہیں لیتا، وہ دُعا نہیں کرتا، بلکہ خدا تعالیٰ کی آزمائش کرتا ہے اس لیے دُعا کرنے سے پہلے اپنی تمام طاقتوں کو خرچ کرنا ضروری ہے اور یہی معنی اس دُعا کے ہیں۔ پہلے لازم ہے کہ انسان اپنے اعتقاد، اعمال میں نظر کرے، کیونکہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اصلاح اسباب کے پیرایہ میں ہوتی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا کر دیتا ہے کہ جو اصلاح کا موجب ہو جاتا ہے۔ وُہ لوگ اس مقام پر ذرا خاص غور کریں جو کہتے ہیں کہ جب دُعا ہوئی، تو اسباب کی کیا ضرورت ہے۔ وہ نادان سوچیں کہ دُعا بجائے خود ایک مخفی سبب ہے جو دُوسرے اسباب کو پیدا کر دیتا ہے اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا تقدم اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر جو کلمۂ دُعائیہ ہے اس امر کی خاص تشریح کر رہا ہے۔ غرض عادۃ اللہ ہم یُونہی دیکھ رہے ہیں کہ وہ خلقِ اسباب کر دیتا ہے۔ دیکھو پیاس کے بجھانے کے لیے پانی اور بھوک مٹانے کے لیے کھانا مہیا کرتا ہے، مگر اسباب کے ذریعہ پس یہ سلسلۂ اسباب یُونہی چلتا ہے اور خلقِ اسباب ضرور ہوتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کے یہ دو نام ہی ہیں۔ جیسا کہ مولوی محمد احسن صاحب نے ذکر کیا تھا کہ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (النساء: ۱۵۹) عزیز تو یہ

ہے کہ ہرایک کام کر دینا اور حکیم یہ کہ ہرایک کام کسی حکمت سے موقع اور محل کے مناسب اور موزون کر دینا۔ دیکھو نباتات، جمادات میں قسم قسم کے خواص رکھے ہیں۔ تربد ہی کو دیکھو کہ وہ ایک دو تولہ تک دست لے آتی ہے، ایسا ہی سقمونیا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ یونہی دست آجاتے یا پیاس بدوں پانی ہی کے بجھ جاتے۔ مگر چونکہ عجائباتِ قدرت کا علم کرانا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ جس قدر واقفیت اور علم عجائباتِ قدرت کا وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اُسی قدر انسان اللہ تعالیٰ کی صفات پر اطلاع پاکر قرب حاصل کرنے کے قابل ہوتا جاتا ہے۔ طبابت، ہیئت سے ہزارہا خواص معلوم ہوتے ہیں۔

خواص الاشیاء کا ہی نام علم ہے

علوم ہیں ہی کیا؟ صرف خواص الاشیاء ہی کا تو نام ہے۔ سیارہ، ستارہ، نباتات کی تاثیریں اگر نہ رکھتا تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ عَلِیْم پر ایمان لانا انسان کے لیے مشکل ہو جاتا۔

یہ ایک یقینی امر ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد خواص الاشیاء ہے۔ اس سے یہ غرض ہے کہ ہم حکمت سیکھیں۔ علوم کا نام حکمت بھی رکھا ہے، چنانچہ فرمایا: وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ (البقرۃ: ۲۷۰)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا مقصد

پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا مقصد یہی ہے کہ اس دعا کے وقت اُن لوگوں کے اعمال، اخلاق، عقائد کی نقل کرنی چاہیے جو مُنْعَمْ عَلَیْہِ ہیں۔ جہاں تک انسان سے ممکن ہو عقائد، اخلاق اور اعمال سے کام لے۔ اس امر کو تم مشاہدہ میں دیکھ سکتے ہو کہ جب تک انسان اپنے قویٰ سے کام نہیں لیتا، وہ ترقی نہیں کر سکتا یا اُن کو اصل غرض اور مقصود سے ہٹا کر کوئی اور کام اُن سے لیتا ہے، جس کے لیے وہ خلق نہیں ہوئے۔ تو بھی وہ ترقی کی راہ میں نہ بڑھیں گے۔

اگر آنکھ کو چالیس روز بند رکھا جاوے گا، تو اس کے دیکھنے کی طاقت سلب ہو جاوے گی۔ پس یہ ضروری امر ہے کہ پہلے قویٰ کو اُن کے فطرتی کاموں پر لگاؤ، تو اور بھی ملے گا۔ ہمارا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ جہاں تک عملی طاقتوں سے کام لیا جاوے، اللہ تعالیٰ اُس پر برکت نازل کرتا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ اوّل عقائد، اخلاق، اعمال کو درست کرو۔ پھر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا مانگو، تو اُس کا اثر کامل طور پر ظاہر ہوگا۔

اُمّتِ مرحومہ کہنے کی وجہ

خاص طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُمّتِ مرحومہ ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی ہے جس کے لیے آفات پیدا ہونے لگی ہیں۔ انسان کی حرکت گناہوں اور معاصی کی طرف ایسی ہے، جیسے کہ ایک پتھر نیچے کو چلا جاتا ہے۔ اُمّتِ مرحومہ اس لیے کہلاتی ہے کہ معاصی کا زور ہو گیا۔ جیسے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم: ۴۲) اور دوسری جگہ فرمایا: یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا (الروم: ۲۰) ان سب آیات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دو نقشے دکھائے ہیں۔ اوّل الذکر میں تو اس زمانہ کا جبکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے اس وقت

بھی چونکہ دُنیا کی حالت بہت ہی قابلِ رحم ہوگئی تھی۔ اخلاق، اعمال، عقائد سب کا نام و نشان اُٹھ گیا تھا۔ اس لیے اس اُمت کو مرحومہ کہا گیا، کیونکہ اس وقت بڑے ہی رحم کی ضرورت تھی اور اسی لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ:
مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸)۔

قابلِ رحم اس شخص کو کہتے ہیں جسے سانپوں کی زمین پر چلنے کا حکم ہو یعنی خطراتِ عظیمہ اور آفاتِ شدیدہ در پیش ہوں۔ پس اُمتِ مرحومہ اس لیے کہا کہ یہ قابلِ رحم ہے۔ جب انسان کو مشکل کام دیا جاتا ہے، تو وہ مشکل قابلِ رحم ہوتی ہے شرارتوں میں تجربہ کار، بداندیش خطاکاروں سے مقابلہ ٹھہرا اور پھر اُمّی۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ ہم اُمّی ہیں اور حساب نہیں جانتے۔ پس اُمّیوں کو شریر قوموں کا مقابلہ کرنا پڑا، جو مکائد اور شرارتوں میں تجربہ کار تھے، اس لیے اس کا نام اُمتِ مرحومہ رکھا۔ مُسلمانوں کو کس قدر خوش ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قابلِ رحم سمجھا۔ پہلے واعظ انبیاء ایسے وقتوں میں آتے تھے کہ لوگ مکائد سے واقف نہ ہوتے اور بعض اپنی ہی قوم میں آتے تھے، لیکن اب لوگ مکائد اور دُنیا کے علوم وفنون اور فلسفہ وسائنس میں پکے ماہر ہیں اور راستبازوں کو اس جہان کے ظاہری علوم اور مادی عقلوں سے اور اُن کے پیچ در پیچ منصوبوں اور داؤں سے بہت کم مناسبت ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اے عیسیٰؑ! میں تیرے بعد ایک اُمت کو پیدا کرنے والا ہوں جو نہ عقل رکھے گی اور نہ علم۔ یعنی اُمّی ہوگی۔ آپؑ نے عرض کی۔ یَا رَبِّ كَيْفَ يَعْرِفُوْنَكَ! اے اللہ! جبکہ وُہ علم اور عقل سے بہرہ ور نہ ہوں گے، تو تجھے کیونکر پہچانیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَیں اپنا علم اور عقل دُوں گا۔

اہلِ اسلام کو سماوی علُوم سے مناسبت ہے

اِس سے بڑی بشارت ملتی ہے۔ جیسے ہمارے مخالفوں کو ارضی علُوم سے مناسبت ہے، ایسے ہی اہلِ اسلام کو سماوی عُلوم سے۔ ایک گنوار مُسلمان کی سچی رؤیا اور خوابیں بڑے بڑے فلاسفروں، بشپوں اور پنڈتوں کے خوابوں سے طاقت میں بڑھ کر ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الجمعۃ: ۵) پس مُسلمانوں کو واجب ہے کہ اپنے اس محسنِ حقیقی کا شکر کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔ (ابراہیم: ۸) یعنی اگر تم میرا شکر کروگے، تو میں اپنی دی ہوئی نعمت کو زیادہ کروں گا اور بصُورتِ کفر عذاب میرا سخت ہے۔ یاد رکھو کہ جب اُمت کو مرحومہ قرار دیا ہے اور علُومِ لدنّیہ سے اُسے سرفرازی بخشی ہے، تو عملی طور پر شکر واجب ہے۔ الغرض اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں تمام مُسلمانوں کو لازم ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا لحاظ رکھیں، کیونکہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پر مقدم رکھا ہے۔ پس پہلے عملی طور پر شکریہ کرنا چاہیے اور یہی مطلب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں رکھا ہے۔ یعنی دُعا سے پہلے اسبابِ ظاہری کی رعایت اور نگہداشت ضروری طور پر کی جاوے۔ اور پھر دُعا کی طرف رجُوع ہو۔ اوّلاً عقائد، اخلاق اور عادات کی اصلاح ہو۔ پھر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔

اخلاق انسان کے صالح ہونے کی نشانی ہیں

اب مَیں ایک اور ضروری اور اشد ضروری بات بیان کرنی چاہتا ہوں۔ ہماری جماعت کو چاہیے کہ لاپرواہی اور عدم توجہی سے نہ سُنے۔ یاد رکھو کہ اخلاق انسان کے صالح ہونے کی نشانی ہیں۔ عام طور پر حدیث شریف میں مُسلمانوں کی یہی تعریف آئی ہے کہ "مُسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مُسلمان سلامت ہیں"

{یہاں تک حضورؑ نے تقریر فرمائی تھی کہ نمازِ عصر کا وقت ہوگیا؛ چنانچہ آپؑ نے اور کُل حاضرین نے نہایت خلوص اور سچے جوش سے نمازِ عصر ادا کی اور پھر سب کے سب ہمہ تن گوش ہو کر "مردِ خدا" کی باتیں سننے لگے اور آپؑ نے تقریر پھر شروع کیا۔ (ایڈیٹر}

مَیں نے اس ذکر کو چھوڑا تھا کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعا تعلیم کرنے میں اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے۔ کہ انسان تین پہلو مدِ نظر رکھے۔ اوّل، اخلاقی حالت۔ دوم، حالتِ عقائد۔ سوم، اعمال کی حالت۔ مجموعی طور پر یُوں کہو کہ انسان خداداد قوتوں کے ذریعے سے اپنے حال کی اصلاح کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ یہ مطلب نہیں کہ اِصلاح کی صورت میں دُعا نہ کرے۔ نہیں اُس وقت بھی مانگتا رہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں فاصلہ نہیں ہے؛ البتہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں تقدّمِ زمانی ہے، کیونکہ جس حال میں اپنی رحمانیت سے بغیر ہماری دُعا اور درخواست کے ہمیں انسان بنایا اور انواع و اقسام کی قوتیں اور نعمتیں عطا فرمائیں۔ اس وقت ہماری دُعا نہ تھی اُس وقت خدا کا فضل تھا اور یہی تقدّم ہے۔

رحمانیت اور رحیمیت

یہ یاد رہے کہ رحم دُو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک رحمانیت اور دُوسرا رحیمیت کے نام سے مُوسوم ہے۔ رحمانیت تو ایسا فیضان ہے کہ جو ہمارے وجُود اور ہستی سے بھی پہلے شروع ہوا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے پہلے پہل اپنے علمِ قدیم سے دیکھ کر اس قسم کا زمین و آسمان اور ارضی اور سماوی اشیاء ایسی پیدا کی ہیں، جو سب ہمارے کام آنے والی ہیں اور کام آتی ہیں اور ان سب اشیاء سے انسان ہی عام طور پر فائدہ اُٹھاتا ہے۔ بھیڑ بکری اور دیگر حیوانات جبکہ بجائے خود انسان کے لیے مفید شے ہیں۔ تو وُہ کیا فائدہ اٹھاتے ہیں؟ دیکھو جسمانی اُمور میں انسان کیسی کیسی لطیف اور اعلیٰ درجہ کی غذائیں کھاتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا گوشت انسان کے لیے ہے۔ ٹکڑے اور ہڈیاں کُتّوں کے واسطے۔ جسمانی طور پر جو حظوظ اور لذّات انسان کو حاصل ہیں گو حیوان بھی اس میں شریک ہیں، مگر انسان کو وہ بدرجۂ اعلیٰ حاصل ہیں اور رُوحانی لذّات میں جانور شریک بھی نہیں ہیں۔ پس یہ دو قسم کی رحمتیں ہیں۔ ایک وُہ جو ہمارے وجُود سے پہلے پیش از وقت کے طور پر تقدمہ کی صُورت میں عناصر وغیرہ اشیاء پیدا کیں جو ہمارے کام میں لگی ہوئی ہیں اور یہ ہمارے وجود، خواہش اور دُعا سے پہلے ہیں، جو رحمانیت کے تقاضے سے پیدا ہوتے۔

اور دُوسری رحمت رحیمیت کی ہے یعنی جب ہم دُعا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ غور کیا جاوے تو معلوم ہو

گا کہ قانونِ قدرت کا تعلق ہمیشہ سے دُعا کا تعلق ہے۔ بعض لوگ آجکل اس کو بدعت سمجھتے ہیں۔ ہماری دُعا کا جو تعلق خدا تعالیٰ سے ہے، مَیں چاہتا ہوں کہ اُسے بھی بیان کر دوں۔

ایک بچہ جب بھوک سے بیتاب ہو کر دُودھ کے لیے چلاّتا اور چیختا ہے، تو ماں کے پستان میں دُودھ جوش مار کر آجاتا ہے۔ بچہ دُعا کا نام بھی نہیں جانتا، لیکن اُس کی چیخیں دُودھ کو کیونکر کھینچ کر لاتی ہیں؟ اس کا ہر ایک کو تجربہ ہے بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ مائیں دُودھ کو محسوس بھی نہیں کرتیں، مگر بچہ کی چلاّہٹ ہے کہ دُودھ کو کھینچے لاتی ہے۔ تو کیا ہماری چیخیں جب اللہ تعالیٰ کے حضور ہوں، تو وہ کچھ بھی نہیں کھینچ کر لا سکتیں؟ آتا ہے اور سب کچھ آتا ہے۔ مگر آنکھوں کے اندھے جو فاضل اور فلاسفر بنے بیٹھے ہیں وہ دیکھ نہیں سکتے۔ بچہ کو جو مناسبت ماں سے ہے اس تعلق اور رشتہ کو انسان اپنے ذہن میں رکھ کر دُعا کی فلاسفی پر غور کرے، تو وہ بہت آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے۔ دُوسری قسم کا رحم یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک رحم مانگنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ مانگتے جاؤ گے، ملتا جائے گا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) کوئی لفاظی نہیں بلکہ یہ انسانی سرشت کا ایک لازمہ ہے۔

مانگنا انسان کا خاصہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا

مانگنا انسان کا خاصہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا۔ جو نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا، وہ جھوٹا ہے۔ بچہ کی مثال جو مَیں نے بیان کی ہے وہ دُعا کی فلاسفی خوب حل کر کے دکھاتی ہے۔ رحمانیت اور رحیمیت دو نہیں ہیں پس جو ایک کو چھوڑ کر دُوسری کو چاہتا ہے، اُسے مل نہیں سکتا۔ رحمانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ ہم میں رحیمیت سے فیض اُٹھانے کی سکت پیدا کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا، وہ کافرِ نعمت ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے معنی ہیں کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ ان ظاہری سامانوں اور اسباب کی رعایت سے جو تُو نے عطا کیے ہیں۔ دیکھو۔ یہ زبان جو عروق اور اعصاب سے خلق کی ہے اگر ایسی نہ ہوتی تو ہم بول نہ سکتے۔ ایسی زبان دُعا کے واسطے عطا کی جو قلب کے خیالات تک کو ظاہر کر سکے۔ اگر ہم دُعا کا کام زبان سے کبھی نہ لیں، تو یہ ہماری شوربختی ہے۔ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر وہ زبان کو لگ جاویں تو یکدفعہ ہی زبان اپنا کام چھوڑ بیٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان گونگا ہو جاتا ہے۔ پس یہ کیسی رحیمیت ہے کہ ہم کو زبان دے رکھی ہے۔ ایسا ہی کانوں کی بناوٹ میں فرق آجاوے، تو خاک بھی سنائی نہ دے۔ ایسا ہی قلب کا حال ہے وہ جو خشوع و خضوع کی حالت رکھی ہے اور سوچنے اور تفکر کی قوتیں رکھی ہیں۔ اگر بیماری آجاوے تو وہ سب قریباً بیکار ہو جاتی ہیں۔ مجنونوں کو دیکھو کہ اُن کے قویٰ کیسے بیکار ہو جاتے ہیں۔ تو کیا یہ ہم کو لازم نہیں کہ ان خداداد نعمتوں کی قدر کریں؟ اگر اُن قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال فضل سے ہم کو عطا کیے ہیں۔ بیکار چھوڑ دیں، تو لاریب ہم کافرِ نعمت ہیں۔ پس یاد رکھو کہ اگر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو معطّل چھوڑ کر دُعا کرتے ہیں۔ تو دُعا کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ جب ہم نے پہلے عطیّہ سے کچھ کام نہیں لیا، تو دوسرے کو کب اپنے لیے مفید اور کارآمد بنا سکیں گے۔

سچی بصیرت مانگنے کی ہدایت

پس اِیَّاکَ نَعۡبُدُ یہ بتلا رہا ہے کہ اے رب العالمین! تیرے پہلے عطیہ کو بھی ہم نے بیکار اور برباد نہیں کیا۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ انسان خدا تعالیٰ سے سچی بصیرت مانگے کیونکہ اگر اُس کا فضل اور کرم دستگیری نہ کرے، تو عاجز انسان (اسی) تاریکی اور اندھکار میں پھنسا ہوا ہے کہ وُہ دُعا ہی نہیں کر سکتا۔ پس جب تک انسان خدا کے اُس فضل کو جو رحمانیت کے فیضان سے اُسے پہنچا ہے کام میں لا کر دُعا نہ مانگے۔ کوئی نتیجہ بہتر نہیں نکال سکتا۔

مَیں نے عرصہ ہوا انگریزی قانون میں یہ دیکھا تھا کہ تعادی کے لیے پہلے کچھ سامان دکھانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح قانونِ قدرت کی طرف دیکھو کہ جو کچھ ہم کو پہلے ملا ہے۔ اس سے کیا بنایا؟ اگر عقل و ہوش، آنکھ کان رکھتے ہوئے نہیں بہکے ہو اور حُمق اور دیوانگی کی طرف نہیں گئے، تو دُعا کرو اور بھی فیضِ الٰہی ملے گا؛ ورنہ محرومی اور بدقسمتی کے لچھن ہیں۔

حکمت کے معنی

بسا اوقات ہمارے دوستوں کو عیسائیوں سے واسطہ پڑیگا۔ وہ دیکھیں گے کہ کوئی بھی بات نادانوں میں ایسی نہیں جو حکیم خدا کی طرف منسوب ہو سکے۔ حکمت کے معنی کیا ہیں؟ وَضۡعُ الشَّیۡءِ فِیۡ مَحَلِّہٖ۔ مگر اُن میں دیکھو گے کہ کوئی فعل اور حکم بھی اس کا مصداق نظر نہیں آتا۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ پر جب ہم پُرغور نظر کرتے ہیں تو اشارۃ النص کے طور پر پتہ لگتا ہے کہ بظاہر تو اس سے دُعا کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے کہ الصراط المستقیم کی ہدایت مانگنے کی تعلیم ہے، لیکن اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ اس کے سر پر بتلا رہا ہے کہ اس سے فائدہ اُٹھائیں یعنی راہِ راست کے منازل کے لیے قوائے سلیم سے کام لے کر استعانتِ الٰہی کو مانگنا چاہیے۔

اخلاق سے کیا مراد ہے

اب سوچنا چاہیے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جو مانگنی چاہئیں۔ اوّل اخلاق، جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اخلاق سے کوئی صرف نرمی کرنا ہی مراد نہ لے لے۔ خَلق اور خُلق دو لفظ ہیں، جو بالمقابل معنوں پر دلالت کرتے ہیں۔ خَلق ظاہری پیدائش کا نام ہے۔ جیسے کان، ناک یہانتک کہ بال وغیرہ بھی سب خَلق میں شامل ہیں اور خُلق باطنی پیدائش کا نام ہے۔ ایسا ہی باطنی قویٰ جو انسان اور غیر انسان میں مابہ الامتیاز ہیں، وُہ سب خُلق میں داخل ہیں۔ یہانتک کہ عقل فکر وغیرہ تمام قوتیں خُلق ہی میں داخل ہیں۔

خُلق سے اِنسان اپنی انسانیت کو دُرست کرتا ہے۔ اگر انسانوں کے فرائض نہ ہوں، تو فرض کرنا پڑے گا کہ آدمی ہے؟ گدھا ہے؟ یا کیا ہے؟ جب خُلق میں فرق آجاوے، تو صُورت ہی رہتی ہے۔ مثلاً عقل ماری جاوے تو مجنون کہلاتا ہے صرف ظاہری صورت سے ہی انسان کہلاتا ہے۔ پس اخلاق سے مراد خدا تعالیٰ کی رضا جوئی (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں مجسّم نظر آتا ہے) کا حصول ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرزِ زندگی کے موافق اپنی زندگی بنانے کی کوشش کرے۔ یہ اخلاق بطور بنیاد کے ہیں۔ اگر وہ متزلزل رہے تو اس پر عمارت نہیں بنا سکتے۔ اخلاق ایک اینٹ پر دوسری اینٹ کا رکھنا ہے۔ اگر ایک اینٹ ٹیڑھی ہو، تو ساری دیوار ٹیڑھی رہتی ہے۔

کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریا مے رَود دیوار کج

ان باتوں کو نہایت توجہ سے سُننا چاہیے۔ اکثر آدمیوں کو مَیں نے دیکھا اور غور سے مُطالعہ کیا ہے کہ بعض سخاوت تو کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی غصّہ وَر اور زود رنج ہیں۔ بعض حلیم تو ہیں، لیکن بخیل ہیں۔ بعض غضب اور طیش کی حالت میں ڈنڈے مار مار کر گھائل کر دیتے ہیں، مگر تواضع اور انکسار نام کو نہیں۔ بعض کو دیکھا ہے کہ تواضع اور انکسار تو اُن میں پرلے درجہ کا ہے، مگر شجاعت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ طاعون اور ہیضہ کا نام بھی سُن لیں، تو دست لگ جاتے ہیں۔ مَیں یہ خیال نہیں کرتا کہ جو ایسے طور پر شجاعت نہیں کرتا، اس کا ایمان نہیں۔ صحابہ کرامؓ میں بھی بعض ایسے تھے کہ اُن کو لڑائی کی قوت اور جرأت نہ تھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کو معذور رکھتے تھے۔ یہ اخلاق بہت ہیں۔ مَیں نے جلسہ مذاہب کی تقریر میں اِن سب کو واضح طور پر اور مفصّل بیان کیا ہے۔ ہر انسان جامع صفات بھی نہیں اور بالکل محروم بھی نہیں ہے۔

رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاقِ عالیہ

سب سے اکمل نمونہ اور نظیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں جو جمیع اخلاق میں کامل تھے۔ اسی لیے آپؐ کی شان میں فرمایا: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۵)۔

ایک وقت ہے کہ آپؐ فصاحت بیانی سے ایک گروہ کو تصویر کی صُورت حیران کر رہے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ تیر و تلوار کے میدان میں بڑھ کر شجاعت دکھاتے ہیں۔ سخاوت پر آتے ہیں، تو سونے کے پہاڑ بخشتے ہیں۔ حلم میں اپنی شان دکھاتے ہیں، تو واجب القتل کو چھوڑ دیتے ہیں۔ الغرض رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بے نظیر اور کامل نمونہ ہے۔ جو خدا تعالیٰ نے دکھا دیا ہے۔ اس کی مثال ایک بڑے عظیم الشان درخت کی ہے۔ جس کے سایہ میں بیٹھ کر انسان اس کے ہر جزو سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرے۔ اس کا پھل، اس کا پھول اور اس کی چھال، اس کے پتے۔ غرضیکہ ہر چیز مفید ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اس عظیم الشان درخت کی مثال ہیں جس کا سایہ ایسا ہے کہ کروڑ ہا مخلوق اس میں مُرغی کے پَروں کی طرح آرام اور پناہ لیتی ہے۔ لڑائی میں سب سے بہادر وُہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ہوتا تھا، کیونکہ آپؐ بڑے خطرناک مقام میں ہوتے تھے۔ سُبحان اللہ! کیا شان ہے۔ اُحد میں دیکھو کہ تلواروں پر تلواریں پڑتی ہیں۔ ایسی گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے کہ صحابہؓ برداشت نہیں کر سکتے، مگر یہ مردِ میدان سینہ سپر ہو کر لڑ رہا ہے۔ اس میں صحابہؓ کا قصور نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بخش دیا، بلکہ اس میں بھید یہ تھا کہ تا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شجاعت کا نمونہ دکھایا جاوے۔ ایک موقع پر تلوار پر تلوار پڑتی تھی اور آپؐ نبوت کا دعویٰ کرتے تھے کہ محمدؐ رسُول اللہ مَیں ہوں۔ کہتے ہیں حضرتؐ کی پیشانی پر ستر زخم لگے۔ مگر زخم خفیف تھے، یہ خُلقِ عظیم تھا۔

ایک وقت آتا ہے کہ آپؐ کے پاس اس قدر بھیڑ بکریاں تھیں کہ قیصر و کسریٰ کے پاس بھی نہ ہوں۔ آپؐ نے وُہ

سب ایک سائل کو بخش دیں۔ اب اگر پاس نہ ہوتا، تو کیا بخشتے۔ اگر حکومت کا رنگ نہ ہوتا، تو یہ کیونکر ثابت ہوتا کہ آپؐ واجبُ القتل کفارِ مکہ کو باوجود مقدرتِ انتقام کے بخش سکتے ہیں۔ جنھوں نے صحابہ کرامؓ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مسلمان عورتوں کو سخت سے سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی تھیں۔ جب وُہ سامنے آئے تو آپؐ نے فرمایا۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ (یوسف: ۹۲) میں نے آج تم کو بخش دیا۔ اگر ایسا موقع نہ ملتا تو ایسے اخلاقِ فاضلہ حضورؐ کے کیونکر ظاہر ہوتے۔ یہ شان آپؐ کی اور صرف آپؐ کی ہی تھی۔ کوئی ایسا خُلق بتلاؤ جو آپؐ میں نہ ہو اور پھر بدرجۂ غایت کامل طور پر نہ ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ان کے اخلاق بالکل مخفی ہی رہے۔ شریر یہود جن کو گورمنٹ کے ہاں کرسیاں ملتی تھیں اور رُومی گورمنٹ ان کے گروہ کی وجہ سے عزت کرتی تھی مسیحؑ کو تنگ کرتے رہے، مگر کوئی اقتدار کا وقت حضرت مسیحؑ کی زندگی میں ایسا نہ آیا، جس سے معلوم ہوجاتا کہ وہ کہاں تک باوجود مقدرتِ انتقام کے عفو سے کام لیتے ہیں، مگر برخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ایسے ہیں کہ وُہ مشاہدہ اور تجربہ کی محک پر کامل المعیار ثابت ہوئے۔ یہ صرف باتیں ہی نہیں، بلکہ اُن کی صداقت کا ثبوت ہمارے ہاتھ میں ایسا ہی ہے، جیسے ہندسہ اور حساب کے اُصول صحیح اور یقینی ہیں اور ہم دو اور دو چار کی طرح اُن کو ثابت کرسکتے ہیں، لیکن کسی اور نبی کا متبع ایسا نہیں کرسکتا۔ اسی لیے آپؐ کی مثال ایک ایسے درخت سے دی، جس کی جڑ، چھال، پھل، پھول، پتے غرضیکہ ہر ایک چیز مفید اور بغایت درجہ مُفید۔ راحت رساں اور سُرور بخش ہے۔ چونکہ جناب سرورِ کائنات علیہ التحیات کے بعد اُمت میں ایک تفرقہ پیدا ہوگیا، اس لیے وُہ جامعیتِ اخلاق بھی نہ رہی، بلکہ جُدا جُدا اور متفرق طور پر وُہ مجموعۂ اخلاق پھیل گیا۔ اس لیے بعض آدمی بعض اخلاق کو آسانی سے صادر کرسکتے ہیں۔

تزکیۂ نفس اور فلاح

ہدایتِ الٰہی تو یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس: ۱۰، ۱۱) نجات پائے گا وُہ شخص جس نے تزکیۂ نفس کیا اور ہلاک ہوگیا وہ آدمی جس نے نفس کو بگاڑا۔ فلح چیرنے کو کہتے ہیں۔ فلاحت زراعت کو کہتے ہیں۔ تزکیۂ نفس میں بھی فلاحت ہے۔ مجاہدہ انسانی نفس کو اُس کی خرابیوں اور سختیوں سے صاف کرکے اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس میں ایمانِ صحیح کی تخم ریزی کی جاوے۔ پھر وُہ شجرِ ایمان بارآور ہونے کے لائق بن جاتا ہے۔ چونکہ ابتدائی مراحل اور منازل میں متقی کو بڑی بڑی مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے فلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دُوسری جگہ فرمایا ہے: قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (الذاریات: ۱۱، ۱۲) اللہ تعالیٰ کفار کا حال بیان کرتا ہے کہ ستیاناس ہوگیا اٹکل بازیاں کرنے والوں کا۔ جن کے نفوس غمرہ میں پڑے ہوتے ہیں۔ غمرہ دبانے والی چیز کو کہتے ہیں، جو سر اٹھانے نہ دے۔ کھیت پر بھی غمرہ پڑتا ہے، جسے کرنڈ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اٹکل بازیاں کرنے والوں کا ستیاناس ہوگیا۔ ہنوز اُن کے نفوس غمرہ میں پڑے ہوتے ہیں۔ مومنوں کو اس آیت میں ایک نظیر دے کر متنبہ کیا جاتا ہے کہ جب تک

فرو گذر نہ ہو تب تک علیٰ وجہ البصیرت کام نہیں ہو سکتا اور وُہ اُولوالابصار نہیں کہلا سکتے۔ قُتِلَ اس لیے فرمایا کہ وُہ رحم کی جگہ ہے۔ گویا وُہ فاعل بھی خود ہی ہیں۔ اپنے آپ کو خود ہلاک کیا۔ بعض آدمیوں میں خرّاص ہونے کا مادہ ہوتا ہے۔ وُہ بصیرت اور دُور اندیشی سے کام نہیں لیتے، بلکہ ظنونِ فاسدہ اور اٹکلوں سے کام لیتے ہیں اور وُہ اسی میں اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ میری غرض یہ تھی کہ حصّۂ اخلاق میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل نمونہ پیش کروں۔ جو ایک فردِ اکمل تھے۔ زاں بعد متفرق طور پر آپؐ کے اخلاق سے حِصّہ لیا گیا۔ کسی نے ایک لیا اور دُوسرے نے کوئی اور۔ اور ایک کو دُوسرے میں غُمّرہ ہوگیا۔ جس طرح کسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس غُمّرہ کو دُور کرے؛ ورنہ اس کا نتیجہ دُوسرے پودوں پر اچھا نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہر ایک انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندرونی غُمّرہ کو دُور کرے؛ ورنہ اندیشہ ہے کہ دُوسری صفاتِ حسنہ کو بھی نہ کھو بیٹھے۔

لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ کا وسیع مفہوم

یہ بات ٹھیک نہیں کہ بعض اخلاق کے تبدیل پر انسان قادر ہے۔ اور بعض پر نہیں۔ نہیں نہیں! ہر ایک مرض کا علاج موجود ہے۔ لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ۔ افسوس! لوگ آپؐ کے اس مبارک قول کی قدر نہیں کرتے اور اس کو صرف ظاہری امراض تک ہی محدود سمجھتے ہیں۔ یہ کس قدر نادانی اور غلطی ہے۔ جس حال میں ایک فانی جسم کے لیے اس کی اصلاح اور بھلائی کے کُل سامان موجود ہیں، تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ انسان کی رُوحانی امراض کا مداوا اللہ تعالیٰ کے حضور کچھ بھی نہ ہو؟ ہے! اور ضرور ہے!!

یہ ایک واقعی اور یقینی بات ہے کہ خدا تعالیٰ اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں، لیکن جو کسل اور سُستی سے کام کرتے ہیں، وُہ آخر کار ہلاک ہو جاتے ہیں۔

پیرانہ سالی کی دو قسمیں

انسان پر جیسے ایک طرف نقص فی الخلق کا زمانہ آتا ہے، جسے بڑھاپا کہتے ہیں۔ اُس وقت آنکھیں اپنا کام چھوڑ دیتی ہیں اور کان شنوا نہیں ہو سکتے۔ غرض کہ ہر ایک عضوِ بدن اپنے کام سے عاری اور معطّل کے قریب قریب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے یاد رکھو کہ پیرانہ سالی دو قسم کی ہوتی ہے۔ طبعی اور غیر طبعی۔ طبعی تو وہ ہے جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا۔ غیر طبعی وُہ ہے کہ کوئی اپنی امراضِ لاحقہ کا فکر نہ کرے، تو وہ انسان کو کمزور کر کے قبل از وقت پیرانہ سال بنا دیں۔ جیسے نظامِ جسمانی میں یہ طریق ہے ایسا ہی اندرُونی اور رُوحانی نظام میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی اپنے اخلاقِ فاسدہ کو اخلاقِ فاضلہ اور خصائلِ حَسَنہ سے تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرتا، تو اس کی اخلاقی حالت بالکل گِر جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور قرآن کریم کی تعلیم سے یہ امر بداہت ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ایک مرض کی دوا ہے، لیکن اگر کسل اور سُستی انسان پر غالب آجاوے، تو بجز ہلاکت کے اور کیا چارہ ہے۔ اگر ایسی بے نیازی سے زندگی بسر کرے جیسی کہ ایک بوڑھا کرتا ہے، تو کیونکر بچاؤ ہو سکتا ہے۔

تبدیلِ اخلاق مجاہدہ اور دُعا سے ممکن ہے

جب تک انسان مجاہدہ نہ کرے گا، دُعا سے کام نہ لے گا وہ غمرہ جو دل پر پڑ جاتا ہے، دُور نہیں ہوسکتا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد: ۱۲) یعنی خدا تعالیٰ ہر ایک قسم کی آفت اور بَلا کو جو قوم پر آتی ہے دُور نہیں کرتا ہے، جبتک خود قوم اس کو دُور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہمت نہ کرے، شجاعت سے کام نہ لے تو کیونکر تبدیلی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک لاتبدیل سُنّت ہے۔ جیسے فرمایا: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (الاحزاب: ۶۳) پس ہماری جماعت ہو یا کوئی ہو، وہ تبدیلِ اخلاق اُسی صورت میں کر سکتے ہیں جبکہ مجاہدہ اور دُعا سے کام لیں، ورنہ ممکن نہیں ہے۔

تبدیلِ اخلاق کے متعلق دو مذہب

حکماء کے تبدیلِ اخلاق پر دو مذہب ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ انسان تبدیلِ اخلاق پر قادر ہے اور دُوسرے وہ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ وہ قادر نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسل اور سستی نہ ہو اور ہاتھ پَیر ہلاوے، تو تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس مقام پر ایک حکایت یاد آئی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یُونانیوں کے مشہور فلاسفر افلاطُون کے پاس ایک آدمی آیا اور دروازہ پر کھڑے ہوکر اندر اطلاع کرائی۔ افلاطُون کا قاعدہ تھا کہ جبتک آنے والے کا حُلیہ اور نقوشِ چہرہ کو معلوم نہ کر لیتا تھا، اندر نہیں آنے دیتا تھا۔ اور وہ قیافہ سے استنباط کر لیتا تھا کہ شخصِ مذکور کیسا ہے، کس قسم کا ہے۔ نوکر نے آکر اس شخص کا حُلیہ حسبِ معمول بتلایا۔ افلاطُون نے جواب دیا کہ اُس شخص کو کہہ دو کہ چونکہ تم میں اخلاقِ رذیلہ بہت ہیں، مَیں ملنا نہیں چاہتا۔ اُس آدمی نے جب افلاطُون کا یہ جواب سُنا، تو نوکر سے کہا کہ تم جاکر کہہ دو کہ جو کچھ آپ نے فرمایا، وہ ٹھیک ہے، مگر مَیں نے اپنی عادتِ رذیلہ کا قلع قمع کر کے اصلاح کر لی ہے۔ اس پر افلاطُون نے کہا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے؛ چنانچہ اُس کو اندر بلایا اور نہایت عزت واحترام کے ساتھ اُس سے ملاقات کی۔ جن حکماء کا یہ خیال ہے کہ تبدیلِ اخلاق ممکن نہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ملازمت پیشہ لوگ جو رشوت لیتے ہیں جب وہ سچی توبہ کر لیتے ہیں، پھر اگر ان کو کوئی سونے کا پہاڑ بھی دے، تو اس پر نگاہ نہیں کرتے۔

توبہ کے تین شرائط

توبہ دراصل حصُولِ اخلاق کے لیے بڑی محرک اور مؤید چیز ہے اور انسان کو کامل بنا دیتی ہے یعنی جو شخص اپنے اخلاقِ سیئہ کی تبدیلی چاہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ سچے دل اور پکے ارادے کے ساتھ توبہ کرے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ توبہ کے تین شرائط ہیں۔ بِدُوں اُن کی تکمیل کے سچی توبہ جسے توبۃ النصوح کہتے ہیں، حاصل نہیں ہوتی۔

اِن ہر سہ شرائط میں سے پہلی شرط جسے عربی زبان میں اقلاع کہتے ہیں یعنی اُن خیالاتِ فاسدہ کو دُور کر دیا جاوے جو ان خصائلِ ردّیہ کے محرّک ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تصوّرات کا بڑا بھاری اثر پڑتا ہے، کیونکہ حیطۂ عمل میں

آنے سے پیشتر ہر ایک فعل ایک تصوری صورت رکھتا ہے۔ پس توبہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اُن خیالاتِ فاسدہ و تصوّراتِ بد کو چھوڑ دے۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی عورت سے کوئی ناجائز تعلق رکھتا ہے، تو اُسے توبہ کرنے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ اس کی شکل کو بدصورت قرار دے اور اس کی تمام خصائلِ رذیلہ کو اپنے دل میں مستحضر کرے، کیونکہ جیسا میں نے ابھی کہا ہے۔ تصوّرات کا اثر بہت زبردست اثر ہے اور میں نے صُوفیوں کے تذکروں میں پڑھا ہے کہ انھوں نے تصوّر کو یہاں تک پہنچایا کہ انسان کو بندر یا خنزیر کی صورت میں دیکھا۔ غرض یہ ہے کہ جیسا کوئی تصوّر کرتا ہے، ویسا ہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ پس جو خیالاتِ بدلذّات کا موجب سمجھے جاتے تھے ان کا قلع قمع کرے۔ یہ پہلی شرط ہے۔

دُوسری شرط ندم ہے یعنی پشیمانی اور ندامت ظاہر کرنا۔ ہر ایک انسان کا کانشنس اپنے اندر یہ قوّت رکھتا ہے کہ وُہ اس کو ہر بُرائی پر متنبّہ کرتا ہے، مگر بدبخت انسان اس کو معطّل چھوڑ دیتا ہے۔ پس گناہ اور بدی کے ارتکاب پر پشیمانی ظاہر کرے اور یہ خیال کرے کہ یہ لذّات عارضی اور چند روزہ ہیں اور پھر یہ بھی سوچے کہ ہر مرتبہ اس لذّت اور حظ میں کمی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بڑھاپے میں آکر جبکہ قویٰ بیکار اور کمزور ہو جائیں گے۔ آخر ان سب لذّاتِ دُنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ پس جبکہ خود زندگی ہی میں یہ سب لذّات چھوٹ جانے والی ہیں، تو پھر اُن کے اِرتکاب سے کیا حاصل؟ بڑا ہی خوش قسمت ہے وُہ انسان جو توبہ کی طرف رجُوع کرے اور جس میں اوّل اقلاع کا خیال پیدا ہو یعنی خیالاتِ فاسدہ و تصوّراتِ بیہودہ کا قلع قمع کرے۔ جب یہ نجاست اور ناپاکی نکل جاوے تو پھر نادم ہو اور اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

تیسری شرط عزم ہے یعنی آئندہ کے لیے مصمّم ارادہ کرلے کہ پھر اُن برائیوں کی طرف رجُوع نہ کرے گا اور جب وُہ مُداومت کرے گا، تو خدا تعالیٰ اسے سچّی توبہ کی توفیق عطا کرے گا۔ یہاں تک کہ وہ سیّئات اس سے قطعاً زایل ہو کر اخلاقِ حسنہ اور افعالِ حمیدہ اُس کی جگہ لے لیں گے اور یہ فتح ہے اخلاق پر۔ اس پر قوّت اور طاقت بخشنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، کیونکہ تمام طاقتوں اور قوّتوں کا مالک وہی ہے۔ جیسے فرمایا: اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (البقرۃ: ۱۶۶) ساری قوّتیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں اور انسان ضعیف البُنیان تو کمزور ہستی ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء: ۲۹) اُس کی حقیقت ہے۔ پس خدا تعالیٰ سے قوّت پانے کے لیے مندرجہ بالا ہر سہ شرائط کو کامل کرکے انسان کسل اور سُستی کو چھوڑ دے اور ہمہ تن مُستعد ہو کر خدا تعالیٰ سے دُعا مانگے۔ اللہ تعالیٰ تبدیلِ اخلاق کر دے گا۔

اصلی شہ زور کون ہے؟

ہماری جماعت میں شہ زور اور پہلوانوں کی طاقت رکھنے والے مطلوب نہیں، بلکہ ایسی قوّت رکھنے والے مطلوب ہیں جو تبدیلِ اخلاق کے لیے کوشش کرنے والے ہوں۔ یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ وہ شہ زور اور طاقت والا نہیں جو پہاڑ کو جگہ سے ہٹا سکے۔ نہیں نہیں۔ اصلی بہادر وہی ہے جو تبدیلِ اخلاق پر مقدرت پاوے۔ پس یاد رکھو کہ ساری ہمّت اور قوّت تبدیلِ اخلاق میں صرف

کرو، کیونکہ یہی حقیقی قوت اور دلیری ہے۔

خُلقِ عظیم بڑی بھاری کرامت ہے

مَیں نے کل یا پرسوں بیان کیا تھا کہ خُلقِ عظیم بڑی بھاری کرامت ہے جو خوارق عادت اُمور کو بھی مشتبہ کرسکتا ہے۔ مثلاً اگر آج شق القمر کا معجزہ ہو، تو یہ ہیئت وطبعی کے ماہر اور سائنس کے دلدادہ فی الفور اس کو کسوف خسوف کے اقسام میں داخل کرکے اس کی عظمت کو کم کرنا چاہیں گے اور جو پرانا معجزہ اب پیش کرتے ہیں، تو اُسے قصّہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً یہی کسوف وخسوف دیکھو جو رمضان میں ہوا اور جو آیاتِ مہدی میں سے ایک سماوی نشان تھا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو علمِ ہیئت کی رُو سے ثابت تھا کہ رمضان میں ایسا ہو۔ یہ کہہ کر گویا وہ اُس حدیث کی جو امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف سے ہے، وقعت کم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ احمق اتنا نہیں سوچتے کہ نبوّت ہر ایک شخص نہیں کرسکتا۔ نبوّت پیشگوئی کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی ہر کس وناکس کا یہ کام نہیں کہ وہ پیشگوئیاں کرتا پھرے۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدعی مہدویت ومسیحیت کے زمانہ میں یہ کسوف خسوف رمضان میں ہوگا اور ابتدائے آفرینش سے آج تک کبھی نہیں ہوا۔ پس اگر عقلی طور پر کسی قسم کا اشتباہ ہو، تو ایسے مخالفوں کو چاہیے کہ وہ تاریخی طور پر اس پیشگوئی کی عظمت کو کم کر دکھائیں یعنی کسی ایسے وقت کا پتہ دیں جبکہ رمضان میں کسوف خسوف اس طور پر ہوا ہو کہ پہلے کسی مدعی نے دعویٰ بھی کیا ہو اور جس امر کا دعویٰ کیا ہو اس امر کے ثبوت میں رمضان کے کسوف وخسوف کی پہلے کسی نبی کے زمانہ میں پیشگوئی بھی کی گئی ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ کوئی دکھلا سکے۔

میری غرض اِس واقعہ کے بیان سے صرف یہ تھی کہ خوارق پر تو کسی نہ کسی رنگ میں لوگ عذرات پیش کردیتے ہیں اور اُس کو ٹالنا چاہتے ہیں، لیکن اخلاقی حالت ایک ایسی کرامت ہے، جس پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا اور قوی اعجاز اخلاق ہی کا دیا گیا۔ جیسے فرمایا وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (القلم: ۵) یوں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک قسم کے خوارق قوتِ ثبوت میں جملہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے بجائے خود بڑھے ہوتے ہیں، مگر آپؐ کے اخلاقی اعجاز کا نمبر اُن سب سے اوّل ہے جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ نہیں بتلاسکتی اور نہ پیش کرسکے گی۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک شخص جو اپنے اخلاقِ سیئہ کو چھوڑ کر عاداتِ ذمیمہ کو ترک کرکے خصائلِ حسنہ کو لیتا ہے اسکے لیے وُہی کرامت ہے۔ مثلاً اگر بہت ہی سخت تُند مزاج اور غصہ ور اِن عاداتِ بد کو چھوڑتا ہے اور حلم اور عفو کو اختیار کرتا ہے یا امساک کو چھوڑ کر سخاوت، اور حسد کی بجائے ہمدردی حاصل کرتا ہے، تو بیشک یہ کرامت ہے۔ اور ایسا ہی خودستائی اور خود پسندی کو چھوڑ کر جب انکساری اور فروتنی اختیار کرتا ہے، تو یہ فروتنی ہی کرامت ہے۔ پس تُم میں سے کون ہے جو نہیں چاہتا کہ کراماتی بن جاوے۔ مَیں جانتا ہوں ہر ایک یہی چاہتا ہے، تو بس یہ ایک

دامی اور زندہ کرامت ہے۔ انسان اخلاقی حالت کو دُرست کرے کیونکہ یہ ایسی کرامت ہے جس کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا بلکہ نفع دُور تک پہنچتا ہے۔ مومن کو چاہیے کہ خلق اور خالق کے نزدیک اہلِ کرامت ہو جاوے۔ بہت سے رِند اور عیاش ایسے دیکھے گئے ہیں جو کسی خارقِ عادت نشان کے قائل نہیں ہوتے، لیکن اخلاقی حالت کو دیکھ کر اُنھوں نے بھی سر جھکا لیا ہے اور بجز اقرار اور قائل ہونے کے دُوسری راہ نہیں ملی۔ بہت سے لوگوں کے سوانح میں اس امر کو پاؤ گے کہ اُنہوں نے اخلاقی کرامات ہی کو دیکھ کر دینِ حق کو قبول کر لیا۔[1]

میری باتوں کو ضائع نہ کریں

بس مَیں پھر پکار کر کہتا ہوں اور میرے دوست سُن رکھیں کہ وُہ میری باتوں کو ضائع نہ کریں اور اُن کو صرف ایک قصہ گو یا داستان گو کی کہانیوں ہی کا رنگ نہ دیں، بلکہ مَیں نے یہ ساری باتیں نہایت دلسوزی اور سچّی ہمدردی سے جو فطرتاً میری رُوح میں ہے، کی ہیں۔ انکو گوشِ دل سے سُنو اور اُن پر عمل کرو۔

ہاں خوب یاد رکھو اور اس کو سچ سمجھو کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور جانا ہے۔ پس اگر ہم عُمدہ حالت میں یہاں سے کوچ کرتے ہیں تو ہمارے لیے مُبارکی اور خوشی ہے؛ ورنہ خطرناک حالت ہے۔ یاد رکھو کہ جب انسان بُری حالت میں جاتا ہے، تو مکانِ بعید اُس کے لیے یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی نزع کی حالت ہی سے اُس میں تغیّر شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (طٰہٰ: ۷۵) یعنی جو شخص مُجرم بن کر آوے گا۔ اس کے لیے ایک جہنّم ہے، جس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ یہ کیسی صاف بات ہے۔ اصل لذت زندگی کی راحت اور خوشی ہی میں ہے، بلکہ اسی حالت میں وہ زندہ متصور ہوتا ہے جبکہ ہر طرح کے اَمن و آرام میں ہو۔ اگر وہ کسی دَرد مثلاً قولنج یا درد دانت ہی میں مبتلا ہو جاوے تو وہ مُردوں سے بدتر ہوتا ہے اور حالت ایسی ہوتی ہے کہ نہ تو مُردہ ہی ہوتا ہے اور نہ زندہ ہی کہلا سکتا ہے۔ پس اسی پر قیاس کر لو کہ جہنّم کے دردناک عذاب میں کیسی بُری حالت ہوگی۔

مُجرم وہ ہے جو اپنی زندگی میں خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق قطع کرلے

مُجرم وُہ ہے جو اپنی زندگی میں خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق کاٹ لیوے۔ اُس کو

---

[1] حضرت اقدسؑ یہ تقریر نہایت جوش اور مؤثر طریق سے فرما رہے تھے کہ چند سکھ فقیرانہ لباس میں آئے نشہ میں مدہوش تھے۔ انہوں نے اگرچہ ایسی بجواس کی کہ ممکن تھا، اس بہشتی مجلس میں بھنگ پڑے، مگر ہمارے صادق امام علیہ السلام نے اپنے عملی نمونہ سے یہ اخلاقی کرامت جس کی ہدایت فرما رہے تھے، دکھائی۔ جس کا اثر سامعین پر ایسا پڑا کہ اکثر اُن میں سے چلا چلا کر فرطِ جوش سے رو پڑے وہ شریر آخر پولیس کے ہاتھ جا کر پٹے اور ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ (ایڈیٹر) ۱۲

تو حکم تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے لیے ہو جاتا اور صادقوں کے ساتھ ہو جاتا، مگر وہ ہَوا و ہَوس کا بندہ بن کر رہا اور شریروں اور دشمنانِ خدا و رسول سے موافقت کرتا رہا۔ گویا اس نے اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا کہ خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ یہ ایک عادۃ اللہ ہے کہ انسان جدھر قدم اٹھاتا ہے، اُس کی مخالف جانب سے وُہ دُور ہوتا جاتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الگ ہو کر ہَوا و ہوسِ نفسانی کا بندہ ہوتا ہے، تو خُدا اُس سے دُور ہوتا جاتا ہے اور جُوں جُوں اِدھر تعلقات بڑھتے ہیں اُدھر کم ہوتے ہیں۔ یہ مشہور بات ہے کہ دل را بدل رہیست۔ پس اگر خدا تعالیٰ سے عملی طور پر بیزاری ظاہر کرتا ہے، تو سمجھ لے کہ خدا تعالیٰ بھی اُس سے بیزار ہے اور اگر خدا تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور پانی کی طرح اس کی طرف جھکتا ہے، تو سمجھ لے کہ وہ مہربان ہے۔ محبت کرنے والے سے زیادہ اللہ تعالیٰ اُس سے محبت کرتا ہے۔ وُہ وُہ خدا ہے کہ اپنے مُحبّوں پر برکات نازل کرتا ہے اور اُن کو محسوس کرا دیتا ہے کہ خدا اُن کے ساتھ ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے کلام میں، اُن کے لبوں میں برکت رکھ دیتا ہے اور لوگ اُن کے کپڑوں اور اُن کی ہر بات سے برکت پاتے ہیں۔ اُمّتِ محمدیہ میں اِس کا بیّن ثبوت اس وقت تک موجُود ہے کہ جو خدا کے لیے ہوتا ہے، خدا اس کا ہو جاتا ہے۔

خدا کی طرف سعی کرنے والا کبھی بھی ناکام نہیں رہتا

خدا تعالیٰ اپنی طرف آنے والے کی سعی اور کوشش کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ ممکن ہے کہ زمیندار اپنا کھیت ضائع کرے۔ نوکر موقوف ہو کر نقصان پہنچا دے۔ امتحان دینے والا کامیاب نہ ہو، مگر خدا کی طرف سعی کرنے والا کبھی بھی ناکام نہیں رہتا۔ اس کا سچا وعدہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۷۰) خدا تعالیٰ کی راہوں کی تلاش میں جو جویا ہوا، وُہ آخر منزلِ مقصود پر پہنچا۔ دُنیوی امتحانوں کے لیے تیاریاں کرنے والے راتوں کو دن بنا دینے والے طالب علموں کی محنت اور حالت کو ہم دیکھ کر رحم کھا سکتے ہیں، تو کیا اللہ تعالیٰ جس کا رحم اور فضل بیحد اور بے انت ہے۔ اپنی طرف آنے والے کو ضائع کر دیگا؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (التوبہ: ۱۲۰) اور پھر فرماتا ہے مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال: ۸) ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال ہزارہا طالب علم سالہا سال کی محنتوں اور مشقتوں پر پانی پھرتا ہوا دیکھ کر روتے رہ جاتے ہیں اور خُود کشیاں کر لیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضلِ عمیم ایسا ہے کہ وُہ ذرا سے عمل کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ پھر کِس قدر افسوس کا مقام ہے کہ انسان دُنیا میں ظنّی اور وہمی باتوں کی طرف تو اس قدر گرویدہ ہو کر محنت کرتا ہے کہ آرام اپنے اوپر گویا حرام کر لیتا ہے اور صرف خشک اُمید پر کہ شاید کامیاب ہو جاویں، ہزارہا رنج اور دُکھ اُٹھاتا ہے۔ تاجر نفع کی اُمید پر لاکھوں روپے لگا دیتا ہے، مگر یقین اُسے بھی نہیں ہوتا کہ ضرور نفع ہی ہوگا، مگر خدا تعالیٰ کی طرف جانیوالے کی (جس کے وعدے یقینی اور حتمی ہیں کہ جس کی طرف قدم اٹھانے والے کی ذرا بھی محنت رائیگاں نہیں جاتی) مَیں اس قدر دوڑ دھوپ اور سرگرمی نہیں پاتا ہوں۔ یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟ وہ کیوں نہیں ڈرتے کہ آخر ایک دن مرنا ہے۔

کیا وہ ان ناکامیوں کو دیکھ کر بھی اس تجارت کے فکر میں نہیں لگ سکتے۔ جہاں خسارہ کا نام و نشان ہی نہیں اور نفع یقینی ہے۔ زمیندار کس قدر محنت سے کاشتکاری کرتا ہے، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ نتیجہ ضرور راحت ہی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کیسا رحیم ہے اور یہ کیسا خزانہ ہے کہ کوڑی بھی جمع ہو سکتی ہے۔ روپیہ اشرفی بھی۔ نہ چور چکار کا اندیشہ نہ یہ خطرہ کہ دیوالہ نکل جاوے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی ایک کانٹا راستہ سے ہٹا دے، تو اس کا بھی ثواب اس کو دیا جاتا ہے اور پانی نکالتا ہوا اگر ایک ڈول اپنے بھائی کے گھڑے میں ڈال دے، تو خدا تعالیٰ اس کا بھی اجر ضائع نہیں کرتا۔ پس یاد رکھو کہ وُہ راہ جہاں انسان کبھی ناکام نہیں ہوسکتا وُہ خدا کی راہ ہے۔ دُنیا کی شاہراہ ایسی ہے جہاں قدم قدم پر ٹھوکریں اور ناکامیوں کی چٹانیں ہیں۔ وُہ لوگ جنھوں نے سلطنتوں تک کو چھوڑ دیا، آخر بیوقوف تو نہ تھے۔ جیسے ابراہیم اَدہم، شاہ شجاع، شاہ عبدالعزیز جو مجدد بھی کہلاتے ہیں حکومت، سلطنت اور شوکتِ دُنیا کو چھوڑ بیٹھے۔ اُس کی یہی وجہ تو تھی کہ ہر قدم پر ایک ٹھوکر موجود ہے۔ خدا ایک موتی ہے اس کی معرفت کے بعد انسان دُنیاوی اشیاء کو ایسی حقارت اور ذلت سے دیکھتا ہے کہ ان کے دیکھنے کے لیے بھی اُسے طبیعت پر ایک جبر اور اکراہ کرنا پڑتا ہے پس خدا تعالیٰ کی معرفت چاہو اور اُس کی طرف ہی قدم اٹھاؤ کہ کامیابی اسی میں ہے۔

اخلاقی کرامت

اللہ تعالیٰ سے اصلاح چاہنا اور اپنی قوت خرچ کرنا یہی ایمان کا طریق ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو یقین سے اپنا ہاتھ دُعا کے لیے اٹھاتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کی دُعا رد نہیں کرتا ہے پس خدا سے مانگو اور یقین اور صدقِ نیت سے مانگو۔ میری نصیحت پھر یہی ہے کہ اچھے اخلاق ظاہر کرنا اپنی کرامت ظاہر کرنا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں کراماتی بننا نہیں چاہتا، تو یہ یاد رکھے کہ شیطان اُسے دھوکہ میں ڈالتا ہے۔ کرامت سے عُجب اور پندار مُراد نہیں ہے۔ کرامت سے لوگوں کو اسلام کی سچائی اور حقیقت معلوم ہوتی ہے اور ہدایت ہوتی ہے۔ مَیں تمھیں پھر کہتا ہوں کہ عُجب اور پندار تو کرامتِ اخلاقی میں داخل ہی نہیں۔ پس یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ دیکھو یہ کروڑ ہا مُسلمان جو رُوئے زمین کے مختلف حصص میں نظر آتے ہیں۔ کیا یہ تلوار کے زور سے، جبر و اکراہ سے ہوئے ہیں؟ نہیں! یہ بالکل غلط ہے۔ یہ اسلام کی کراماتی تاثیر ہے جو اُن کو کھینچ لائی ہے۔ کرامتیں انواع و اقسام کی ہوتی ہیں منجملہ اُن کے ایک اخلاقی کرامت بھی ہے جو ہر میدان میں کامیاب ہے۔ اُنہوں نے جو مُسلمان ہوتے، صرف راستبازوں کی کرامت ہی دیکھی اور اُس کا اثر پڑا۔ اُنہوں نے اسلام کو عظمت کی نگاہ سے دیکھا۔ نہ تلوار کو دیکھا بڑے بڑے محقق انگریزوں کو یہ بات ماننی پڑی ہے کہ اسلام کی سچائی کی رُوح ہی ایسی قوی ہے، جو غیر قوموں کو اسلام میں آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

سلسلہ کی عظمت اور عزت کا خیال رکھیں

جو شخص اپنے ہمسایہ کو اپنے اخلاق میں تبدیلی دکھاتا ہے کہ پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔ وُہ گویا ایک کرامت دکھاتا ہے۔ اُس کا

اثر ہمسایہ پر بہت اعلیٰ درجہ کا پڑتا ہے۔ ہماری جماعت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ کیا ترقی ہوگئی ہے اور تہمت لگاتے ہیں کہ افترا۔ غیظ وغضب میں مُبتلا ہیں۔ کیا یہ اُن کے لیے باعثِ ندامت نہیں ہے کہ انسان عُمدہ سمجھ کر اس سلسلہ میں آیا تھا جیسا کہ ایک رشید فرزند اپنے باپ کی نیک نامی ظاہر کرتا ہے، کیونکہ بیعت کرنے والا فرزند کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور اسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو اُمّہات المومنین کہا ہے۔ گویا کہ حضوؐر عامۃ المومنین کے باپ ہیں۔ جسمانی باپ زمین پر لانے کا موجب ہوتا ہے اور حیاتِ ظاہری کا باعث، مگر رُوحانی باپ آسمان پر لے جاتا ہے اور اس مرکزِ اصلی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کو بدنام کرے؟ طوائف کے ہاں جاوے اور قمار بازی کرتا پھرے۔ شراب پیوے یا اور ایسے افعالِ قبیحہ کا مرتکب ہو جو باپ کی بدنامی کا موجب ہوں۔ میں جانتا ہوں کوئی آدمی ایسا نہیں ہو سکتا، جو اس فعل کو پسند کرے، لیکن جب وہ ناخلف بیٹا ایسا کرتا ہے، تو پھر زبانِ خلق بند نہیں ہو سکتی۔ لوگ اُس کے باپ کی طرف نسبت کر کے کہیں گے کہ یہ فلاں شخص کا بیٹا فلاں بُرا کام کرتا ہے پس وُہ ناخلف بیٹا خود ہی باپ کی بدنامی کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص ایک سلسلہ میں شامل ہوتا ہے اور اُس سلسلہ کی عظمت اور عزت کا خیال نہیں رکھتا اور اسکے خلاف کرتا ہے تو وہ عنداللہ ماخوذ ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہیں ڈالتا بلکہ دُوسروں کے لیے ایک بُرا نمونہ ہو کر انکو سعادت اور ہدایت کی راہ سے محروم رکھتا ہے۔ پس جہاں تک آپ لوگوں کی طاقت ہے خدا تعالیٰ سے مدد مانگو اور اپنی پوری طاقت اور ہمت سے اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کرو۔ جہاں عاجز آجاؤ، وہاں صِدق اور یقین سے ہاتھ اُٹھاؤ، کیونکہ خشوُع اور خضوُع سے اُٹھائے ہوئے ہاتھ جو صِدق اور یقین کی تحریک سے اُٹھتے ہیں، خالی واپس نہیں ہوتے۔ ہم تجربہ سے کہتے ہیں کہ ہماری ہزار ہا دُعائیں قبول ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

یہ ایک یقینی بات ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اندر اپنے اَبنائے جنس کے لیے ہمدردی کا جوش نہیں پاتا، وُہ بخیل ہے۔ اگر میں ایک راہ دیکھوں جس میں بھلائی اور خیر ہے، تو میرا فرض ہے کہ میں پُکار پُکار کر لوگوں کو بتلاؤں۔ اس اَمر کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔ کہ کوئی اُس پر عمل کرتا ہے یا نہیں ؎

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم

اگر ایک شخص بھی زندہ طبیعت کا نکل آوے، تو کافی ہے میں یہ بات کھول کر بیان کرتا ہوں کہ میرے مناسبِ حال یہ بات نہیں ہے کہ جو کچھ میں آپ لوگوں کو کہتا ہوں میں، ثواب کی نیت سے کہتا ہوں۔ نہیں! میں اپنے نفس میں انتہا درجہ کا جوش اور دَرد پاتا ہوں گو وُہ وجُوہ نامعلوم ہیں کہ کیوں یہ جوش ہے۔ مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ جوش ایسا ہے کہ میں رُک نہیں سکتا۔ اس لیے آپ لوگ اِن باتوں کو ایسے آدمی کی وصایا سمجھ کر کہ پھر شاید ملنا نصیب نہ ہو۔ اُن پر ایسے کاربند ہوں کہ ایک نمونہ ہو اور ان آدمیوں کو جو ہم سے دُور ہیں، اپنے فعل اور قول سے سمجھا دو۔ اگر یہ بات نہیں

ہے اور عمل کی ضرورت نہیں ہے، تو پھر مجھے بتلاؤ کہ یہاں آنے سے کیا مطلب ہے۔ مَیں مخفی تبدیلی نہیں چاہتا۔ نمایاں تبدیلی مطلوب ہے، تاکہ مخالف شرمندہ ہوں اور لوگوں کے دلوں پر یک طرفہ روشنی پڑے اور وہ ناامید ہو جاویں کہ یہ مخالفت ضلالت میں پڑے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بڑے بڑے شریر آ کر تائب ہوتے وُہ کیوں؟ اِس عظیم الشان تبدیلی نے جو صحابہؓ میں ہوئی اور ان کے واجب التقلید نمونوں نے اُن کو شرمندہ کیا۔

عکرمہ کا پاک نمونہ

عکرمہ کا حال تم نے سُنا ہوگا۔ اُحد کی مصیبت کا بانی مبانی یہی تھا اور اس کا باپ ابوجہل تھا، لیکن آخر اُسے صحابہ کرامؓ کے نمونوں نے شرمندہ کر دیا۔ میرا مذہب یہ ہے کہ خوارق نے ایسا اثر نہیں کیا جیسا صحابہ کرامؓ کے پاک نمونوں اور تبدیلیوں نے لوگوں کو حیران کیا۔ لوگ حیران ہو گئے کہ ہمارا چچازاد کہاں سے کہاں پہنچا۔ آخر اُنہوں نے اپنے آپکو دھوکہ خوردہ سمجھا۔ عکرمہ نے ایک وقت ذاتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا اور دُوسرے وقت لشکرِ کفار کو دَرہم برہم کیا۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہؓ نے جو پاک نمونے دکھاتے ہیں۔ ہم آج فخر کے ساتھ اُنکو دلائل اور آیات کے رنگ میں بیان کر سکتے ہیں ا چنانچہ عکرمہ ہی کا نمونہ دیکھو کہ کفر کے دنوں کفر۔ عُجب وغیرہ خصائلِ بَد اپنے اندر رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ بس چلے تو اسلام کو دُنیا سے نابُود کر دے، مگر جب خدائے تعالیٰ کے فضل نے اس کی دستگیری کی اور وہ مشرف با اسلام ہوا، تو ایسے اخلاق پیدا ہوتے کہ وُہ عُجب اور پندار نام تک کو باقی نہ رہا اور فروتنی اور انکسار پیدا ہوا کہ وہ انکسار حجۃ الاسلام ہو گیا اور صداقتِ اسلام کے لیے ایک دلیل ٹھہرا۔ ایک موقع پر کفار سے مقابلہ ہوا۔ عکرمہ لشکرِ اسلام کا سپہ سالار تھا۔ کفار نے بہت سخت مقابلہ کیا۔ یہانتک کہ لشکرِ اسلام کی حالت قریب شکست کھانے کے ہوگئی۔ عکرمہ نے جب دیکھا، تو گھوڑے سے اُترا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کیوں اُترتے ہیں۔ شاید اِدھر اُدھر ہونے کا وقت ہو، تو گھوڑا مدد دے۔ تو اُس نے کہا۔ اِس وقت مجھے وہ زمانہ یاد آگیا ہے جب مَیں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرتا تھا۔ مَیں چاہتا ہوں کہ جان دے کر گناہوں کا کفارہ کروں۔ اب دیکھئے کہ کہاں سے کہاں تک حالت پہنچی کہ بار بار محامد سے یاد کیا گیا۔ یہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کی رضا ان لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ جو اس کی رضا اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جابجا اُن لوگوں کو رضی اللہ عنہم کہا ہے۔ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر شخص ان اخلاق کی پابندی کرے۔

عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ

علاوہ ازیں دو حصّے اور بھی ہیں، جن کو مدِّ نظر رکھنا صادق اخلاص مند کا کام ہونا چاہیے۔ اُن میں سے ایک عقائدِ صحیحہ کا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال فضل ہے کہ اُس نے کامل اور مکمل عقائدِ صحیحہ کی راہ ہم کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بدوں مشقت و محنت کے دکھائی ہے۔ وُہ راہ جو آپ لوگوں کو اِس زمانہ میں دکھائی گئی ہے۔ بہت سے عالم ابھی تک اُس سے محروم ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کے اِس فضل اور نعمت کا شکر کرو اور وُہ شُکر یہی ہے کہ سچے دل سے اُن اعمالِ صالحہ کو بجالاؤ جو عقائدِ صحیحہ کے بعد دُوسرے

حصہ میں آتے ہیں اور اپنی عملی حالت سے مدد دے کر دُعا مانگو کہ وہ ان عقائدِ صحیحہ پر ثابت قدم رکھے اور اعمالِ صالحہ کی توفیق بخشے۔ حصہ عبادات میں صوم، صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ اُمور شامل ہیں۔ اب خیال کرو کہ مثلاً نماز ہی ہے۔ یہ دُنیا میں آئی ہے، لیکن دُنیا سے نہیں آئی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ

نماز کے اوقات رُوحانی حالتوں کی ایک عکسی تصویر ہے

اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ جو پانچ وقت نماز کے لیے مقرر ہیں یہ کوئی تحکم اور جبر کے طور پر نہیں، بلکہ اگر غور کرو تو یہ دراصل رُوحانی حالتوں کی ایک عکسی تصویر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل: ۷۹) یعنی قائم کرو نماز کو دلوک الشمس سے۔ اب دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں قیامِ صلوٰۃ کو دُلوکِ شمس سے لیا ہے۔ دُلوک کے معنوں میں گو اختلاف ہے، لیکن دوپہر کے ڈھلنے کے وقت کا نام دُلوک ہے۔ اب دُلوک سے لے کر پانچ نمازیں رکھ دیں۔ اس میں حکمت اور سِرّ کیا ہے؟ قانونِ قدرت دکھاتا ہے کہ رُوحانی تذلّل اور انکسار کے مراتب بھی دُلوک ہی سے شروع ہوتے ہیں اور پانچ ہی حالتیں آتی ہیں پس یہ طبعی نماز بھی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب حُزن اور ہمّ و غم کے آثار شروع ہوتے ہیں۔ اُس وقت جبکہ انسان پر کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے، تو کس قدر تذلّل اور انکساری کرتا ہے۔ اب اس وقت اگر زلزلہ آوے، تو تم سمجھ سکتے ہو کہ طبیعت میں کیسی رقت اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پر سوچو کہ اگر مثلاً کسی شخص پر نالش ہو تو سمن یا وارنٹ آنے پر اس کو معلوم ہو گا کہ فلاں دفعہ فوجداری یا دیوانی میں نالش ہوئی ہے، اب بعد مطالعۂ وارنٹ اس کی حالت میں گویا نصف النہار کے بعد زوال شروع ہوا کیونکہ وارنٹ یا سمن تک تو اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اب خیال پیدا ہوا کہ خدا جانے ادھر وکیل ہو یا کیا ہو؟ اس قسم کے تردّدات اور تفکرات سے جو زوال پیدا ہوتا ہے یہ وُہی حالتِ دُلوک ہے اور یہ پہلی حالت ہے جو نمازِ ظہر کے قائم مقام ہے اور اُس کی عکسی حالت نمازِ ظہر ہے۔ اب دُوسری حالت اُس پر وُہ آتی ہے جبکہ وُہ کمرۂ عدالت میں کھڑا ہے۔ فریقِ مخالف اور عدالت کی طرف سے سوالاتِ جرح ہو رہے ہیں اور وُہ ایک عجیب حالت ہوتی ہے۔ یہ وُہ حالت اور وقت ہے جو نمازِ عصر کا نمونہ ہے، کیونکہ عصر گھوٹنے اور نچوڑنے کو کہتے ہیں۔ جب حالت اور بھی نازک ہو جاتی ہے اور فردِ قرارِ دادِ جُرم لگ جاتی ہے، تو یاس اور نااُمیدی بڑھتی ہے۔ کیونکہ اب خیال ہوتا ہے کہ سزا مل جاوے گی۔ یہ وہ وقت ہے جو مغرب کی نماز کا عکس ہے۔ پھر جب حکم سُنا یا گیا اور کنسٹیبل یا کورٹ انسپکٹر کے حوالہ کیا گیا، تو وُہ رُوحانی طور پر نمازِ عشا کی عکسی تصویر ہے۔ یہاں تک کہ نماز کی صُبحِ صادق ظاہر ہوئی۔ اور اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (الانشراح: ۷) کی حالت کا وقت آگیا۔ تو روحانی نمازِ فجر کا وقت آگیا اور فجر کی نماز اس کی عکسی تصویر ہے۔

القصّہ مَیں پھر تم کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ تم جو میرے ساتھ ایک سچا تعلق پیدا کرتے ہو۔ اس سے یہی غرض ہے کہ تم اپنے اخلاق میں، عادات میں ایک نمایاں تبدیلی کرو، جو دُوسروں کے لیے ہدایت اور سعادت کا موجب ہو۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی صفحہ ۱۳۰-۱۴۷)

۱۴ر جنوری ۱۸۹۸ء

آخرت پر نظر رکھیں

فرمایا۔ لوگوں کو لازم ہے کہ آخرت پر نظر رکھیں۔ عذاب سے پہلے ڈرنا چاہیے ؎

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

دیکھو لوطؑ وغیرہ قوموں کا انجام کیا ہوا۔ ہر ایک کو لازم ہے کہ دل اگر سخت بھی ہو، تو اس کو ملامت کرکے خشوع وخضوع کا سبق دے۔ ہماری جماعت کے لیے بہت ضروری ہے، کیونکہ اُن کو تازہ معرفت ملتی ہے۔ اگر کوئی دعویٰ تو معرفت کا کرے، مگر اس پر چلے نہیں، تو یہ لاف وگزاف ہی ہے۔ اس لیے ہماری جماعت دُوسروں کی غفلت سے خود غافل نہ رہے اور اُن کی محبت کو سرد دیکھ کر اپنی محبت کو ٹھنڈا نہ کرے۔ انسان بہت تمنّائیں رکھتا ہے۔ غیب کی قضا وقدر کی کس کو خبر ہے۔ آرزوؤں کے موافق زندگی کبھی نہیں چلتی ہے۔ آرزوؤں کا سلسلہ اور ہے اور قضاء وقدر کا سلسلہ اور ہے اور یہی سلسلہ سچا ہے۔ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے پاس انسان کے سوانح سچے ہیں۔ اُسے کیا معلوم ہے کہ اس میں کیا کیا لکھا ہے، اس لیے دل کو جگا جگا کر متوجہ کرنا چاہیے۔

فرمایا: افسوس کی بات ہے کہ عام طور پر مصائب کے آنے کی وجہ سے لوگوں کا عُجب ونخوت دُور نہیں ہوا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ دُور نہ ہوں گی، جبتک لوگوں کی ضد اور اکڑ دُور نہ ہوگی۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ خدا تعالیٰ سے پُوری مصالحت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قحط کے دَوران میں لوگوں نے محسوس نہیں کیا۔ ابتدا میں مکّہ ومدینہ کا فتویٰ بھی ڈرایا کرتا تھا۔ جب کوئی کہتا کہ مکّہ معظّمہ سے فتویٰ آیا ہے، تو لوگ ڈر جاتے تھے، لیکن اب مصائب کو دیکھ کر بھی نہیں ڈرتے۔ میری رائے ہے کہ جب تک لوگ کامل طور پر رجُوع نہ کریں، تقدیر نہ بدلے گی۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرّعد: ۱۲) [۱]

۱۵ر جنوری ۱۸۹۸ء

شیعہ مذہب کے عقائد

فرمایا: شیعہ مذہب اسلام کا سخت مخالف ہے۔ اوّل۔ شیعہ کا اعتقاد ہے کہ جبرائیل وحی لانے میں غلطی کھا گیا ہے۔ دوم۔ صحابہؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کے بعد حاصل ہوتے تھے، اُن کے نزدیک معاذ اللہ مسلمان نہ تھے۔ سوم۔ قرآن شریف جو اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب ہے اور جس کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ کر چکا ہے۔ شیعہ کے اعتقاد کے موافق قرآن شریف اصلی نہیں ہے۔ امام مہدی

---

[۱] (الحکم جلد نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

اصل قرآن غار میں لے جاکر چُھپ رہے ہے۔ چہارم۔ بارہ اماموں تک ولایت ختم ہو چکی، باقی قیامت تک آدمی وحشیوں کی طرح رہے اور خدا تعالیٰ کو اُن سے محبت نہیں۔ پنجم۔ خدا تعالیٰ کے حبیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو گالیاں دینا دُرود شریف کے پڑھنے سے بھی زیادہ ثواب سمجھتے ہیں۔ ششم۔ کسی اکابر اور اہل اللہ کو نیک نہیں سمجھتے۔ مَیں نے اپنے اُستاد سے حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی نسبت سُنا ہے کہ وہ گالیاں دیتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ بدنام یزید ہے۔ اگر اُس کی شراکت سے امام حسینؓ کی شہادت ہوئی، تو بُرا کیا، لیکن آج کل کے شیعہ تو کوئی بھی وہ دینی کام نہیں کر سکتے جو اُس نے کیا۔

طعامِ اہلِ کتاب

اہلِ کتاب کے کھانا کھانے پر بابو محمد افضل صاحب کے سوال پر حضرت اقدسؑ نے جواب دیا کہ "تمدن کے طور پر ہندوؤں کی چیز بھی کھا لیتے ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں کا کھانا بھی دُرست ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ خیال ضروری ہے کہ برتن پاک ہوں، کوئی ناپاک چیز نہ ہو۔"[1]

۱۵؍ جنوری ۱۸۹۸ء

کو خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے کے ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان میں کامیاب ہونے کی خبر آئی۔ فجر کی نماز کے بعد حضرت اقدس امام ہمام علیہ السلام بیٹھ گئے اور مندرجہ ذیل مختصر سی تقریر فرمائی :

دُنیوی کامیابیاں اور خوشیاں دائمی نہیں

انسان کو ہر قسم کی کامیابی کے موقع پر ایک خوشی ہوتی ہے۔ قرآن شریف سے تین قسم کی خوشیاں لَہو، لعب، تفاخر معلوم ہوتی ہیں۔ لَہو میں اشیاء خوردنی شامل ہیں اور لعب میں شادی وغیرہ کی خوشیاں اور تفاخر میں مال وغیرہ کی خوشیاں۔ یہ تینوں قسم کی خوشیاں ہیں۔ ان سے باہر کوئی خوشی نہیں ہے۔ مگر یاد رکھو کہ کامیابیاں اور یہ خوشیاں دائمی نہیں ہوتی ہیں بلکہ اُن کے ساتھ دِل لگاؤ گے، تو سخت حرج ہوگا اور رفتہ رفتہ ایک وقت آجاتا ہے کہ ان خوشیوں کا زمانہ تلخیوں سے بدلنے لگتا ہے۔

دُنیا کی کامیابیاں ابتلاء سے خالی نہیں ہوتی ہیں۔ قرآن شریف میں آیا ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ (الملک : ۳) یعنی موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ ہم تمہیں آزمائیں۔ کامیابی اور ناکامی بھی زندگی اور موت کا سوال ہوتا ہے۔ کامیابی ایک قسم کی زندگی ہوتی ہے۔ جب کسی کو اپنے کامیاب ہونے کی خبر پہنچتی ہے، تو اس میں جان پڑ جاتی ہے اور گویا نئی زندگی ملتی ہے اور اگر ناکامی کی خبر آ جاتے، تو زندہ ہی مر جاتا ہے اور بسا اوقات بہت سے کمزور دِل

---

[1] (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ پرچہ ۱۷؍ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

آدمی ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عام زندگی اور موت تو ایک آسان امر ہے، لیکن جنتی زندگی اور موت دُشوار ترین چیز ہے۔ سعید آدمی ناکامی کے بعد کامیاب ہو کر اور بھی سعید ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ پر ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اُس کو ایک مزہ آتا ہے۔ جب وہ غور کرتا ہے کہ میرا خدا کیسا ہے اور دُنیا کی کامیابی خداشناسی کا ایک بہانہ ہو جاتا ہے۔ ایسے آدمیوں کے لیے یہ دُنیوی کامیابیاں حقیقی کامیابی کا (جس کو اسلام کی اصطلاح میں فلاح کہتے ہیں) ایک ذریعہ ہو جاتی ہیں۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ سچی راحت دُنیا اور دُنیا کی چیزوں میں ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ دُنیا کے تمام شعبے دیکھ کر بھی انسان سچا اور دائمی سُرور حاصل نہیں کر سکتا۔ تم دیکھتے ہو کہ دولتمند زیادہ مال و دولت رکھنے والے ہر وقت خنداں رہتے ہیں، مگر اُن کی حالت جرب یعنی خارش کے مریض کی سی ہوتی ہے جس کو کھجلانے سے راحت ملتی ہے، لیکن اس خارش کا آخری نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ خون نکل آتا ہے۔ پس اِن دُنیوی اور عارضی کامیابیوں پر اس قدر خوش مت ہو کہ حقیقی کامیابی سے دُور چلے جاؤ، بلکہ ان کامیابیوں کو خداشناسی کا ایک ذریعہ قرار دو۔ اپنی ہمت اور کوشش پر نازمت کرو اور مت سمجھو کہ یہ کامیابی ہماری کسی قابلیت اور محنت کا نتیجہ ہے، بلکہ یہ سوچو کہ اس رحیم خدا نے جو کبھی کسی کی سچی محنت کو ضائع نہیں کرتا ہے۔ ہماری محنت کو بارور کیا، ورنہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ صدہا طالب علم آئے دن امتحانوں میں فیل ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب کے سب محنت نہ کرنے والے اور بالکل غبی اور بلید ہی ہوتے ہیں؟ نہیں بلکہ بعض ایسے ذکی اور ہوشیار ہوتے ہیں کہ پاس ہونے والوں میں سے اکثر کے مقابلہ میں ہوشیار ہوتے ہیں۔ اس لیے واجب اور ضروری ہے کہ ہر کامیابی پر مومن خدا تعالیٰ کے حضور سجداتِ شکر بجا لائے کہ اُس نے محنت کو اکارت تو نہیں جانے دیا۔ اس شکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھے گی اور ایمان میں ترقی ہوگی اور نہ صرف یہی بلکہ اور بھی کامیابیاں ملیں گی، کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم میری نعمتوں کا شکر کرو گے، تو البتہ میں نعمتوں کو زیادہ کروں گا۔ اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے، تو یاد رکھو عذابِ سخت میں گرفتار ہو گے۔

مومن اور کافر کی کامیابی میں فرق

اس اصول کو ہمیشہ مدِ نظر رکھو۔ مومن کا کام یہ ہے کہ وہ کسی کامیابی پر جو اُسے دی جاتی ہے۔ شرمندہ ہوتا ہے اور خدا کی حمد کرتا ہے کہ اُس نے اپنا فضل کیا اور اس طرح پر وہ قدم آگے رکھتا ہے اور ہر ابتلا میں ثابت قدم رہ کر ایمان پاتا ہے۔ بظاہر ایک ہندو اور مومن کی کامیابی ایک رنگ میں مشابہ ہوتی ہے، لیکن یاد رکھو کہ کافر کی کامیابی ضلالت کی راہ ہے اور مومن کی کامیابی سے اُس کے لیے نعمتوں کا دروازہ کھلتا ہے۔ کافر کی کامیابی اس لیے ضلالت کی طرف لے جاتی ہے کہ وہ خدا کی طرف رُجوع نہیں کرتا، بلکہ اپنی محنت، دانش اور قابلیت کو خدا بنا لیتا ہے، مگر مومن خدا کی طرف رجوع کر کے خدا سے ایک نیا تعارف پیدا کرتا ہے اور اس طرح پر ہر ایک کامیابی کے بعد اُس کا خدا

سے ایک نیا معاملہ شروع ہوجاتا ہے اور اس میں تبدیلی ہونے لگتی ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (النحل: ۱۲۹) خدا اُن کے ساتھ ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف میں تقویٰ کا لفظ بہت مرتبہ آیا ہے۔ اس کے معنے پہلے لفظ سے کیے جاتے ہیں۔ یہاں مَعَ کا لفظ آیا ہے یعنی جو خدا کو مقدّم سمجھتا ہے، خدا اس کو مقدّم رکھتا ہے اور دُنیا میں ہر قسم کی ذلّتوں سے بچا لیتا ہے۔ میرا ایمان یہی ہے کہ اگر انسان دُنیا میں ہر قسم کی ذلّت اور سختی سے بچنا چاہے تو اُس کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ متقی بن جاوے۔ پھر اُس کو کسی چیز کی کمی نہیں۔ پس مومن کی کامیابیاں اُس کو آگے لے جاتی ہیں اور وہ وہیں پر نہیں ٹھہر جاتا۔

مبارک وہ ہے جو کامیابی اور خوشی کے وقت تقویٰ سے کام لے

اکثر لوگوں کے حالات کتابوں میں لکھے ہیں کہ اوائل میں دُنیا سے تعلق رکھتے تھے اور شدید تعلق رکھتے تھے، لیکن انہوں نے کوئی دُعا کی اور وُہ قبول ہوگئی۔ اس کے بعد ان کی حالت ہی بدل گئی، اِس لیے اپنی دُعاؤں کی قبولیت اور کامیابیوں پر نازاں نہ ہو، بلکہ خدا کے فضل اور عنایت کی قدر کرو۔ قاعدہ ہے کہ کامیابی پر ہمت اور حوصلہ میں ایک نئی زندگی آجاتی ہے، اس زندگی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی کرنی چاہیے، کیونکہ سب سے اعلیٰ درجہ کی بات جو کام آنے والی ہے وہ یہی معرفتِ الٰہی ہے اور یہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم پر غور کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کو کوئی روک نہیں سکتا۔

بہت تنگدستی بھی انسان کو مصیبت میں ڈال دیتی ہے۔ اس لیے حدیث میں آیا ہے اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ۔ ایسے لوگ مَیں نے خود دیکھے ہیں، جو اپنی تنگدستیوں کی وجہ سے دہریہ ہوگئے ہیں۔ مگر مومن کسی تنگی پر بھی خُدا سے بدگمان نہیں ہوتا اور اس کو اپنی غلطیوں کا نتیجہ قرار دے کر اُس سے رحم اور فضل کی درخواست کرتا ہے اور جب وُہ زمانہ گذر جاتا ہے اور اُس کی دعائیں بارور ہوتی ہیں، تو وہ اُس عاجزی کے زمانہ کو بھولتا نہیں، بلکہ اُسے یاد رکھتا ہے۔ غرض اگر اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کام پڑتا ہے، تو تقویٰ کا طریق اختیار کرو۔ مُبارک وُہ ہے جو کامیابی اور خوشی کے وقت تقویٰ اختیار کرے اور بدقسمت وُہ ہے جو ٹھوکر کھا کر اُس کی طرف نہ جُھکے۔[1]

❖ ❖ ❖

۱؎ (الحکم۔ جلد ۵ نمبر ۲۳۔ صفحہ ۱، ۲۔ پرچہ ۲۴ جون ۱۹۰۱ء)

تقریر حضرت اقدس علیہ السلام

۱۸؍ جنوری ۱۸۹۸ء

تقدیر تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کا نام معلّق ہے اور دوسری کو مُبرم کہتے ہیں۔ اگر کوئی تقدیر معلق ہو تو دعا اور صدقات اُس کو ٹلا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُس تقدیر کو بدل دیتا ہے۔ مُبرم ہونے کی صورت میں وہ صدقات اور دُعا اس تقدیر کے متعلق کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں وہ عبث اور فضول بھی نہیں رہتے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اس دُعا اور صدقات کا اثر اور نتیجہ کسی دوسرے پیرائے میں اُس کو پہنچا دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی تقدیر میں ایک وقت تک توقّف اور تاخیر ڈال دیتا ہے۔

قضائے معلق اور مُبرم کا ماخذ اور پتہ قرآن کریم سے ملتا ہے۔ یہ الفاظ گو نہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) دُعا مانگو۔ میں قبول کروں گا۔ اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دُعا قبول ہو سکتی ہے اور دُعا سے عذاب ٹل جاتا ہے اور ہزارہا کیا کُل کام دُعا سے نکلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کُل چیزوں پر قادرانہ تصرّف ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ اس کے پوشیدہ تصرفات کی لوگوں کو خواہ خبر ہو یا نہ ہو، مگر صدہا تجربہ کاروں کے وسیع تجربے اور ہزارہا دردمندوں کی دُعا کے صریح نتیجے بتلا رہے ہیں کہ اس کا ایک پوشیدہ اور مخفی تصرّف ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، محو کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اثبات کرتا ہے۔ ہمارے لیے یہ امر ضروری نہیں کہ ہم اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی کُنہ اور کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایک شئے ہونے والی ہے۔ اس لیے ہم کو جھگڑے اور مباحثے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کی قضا و قدر کو مشروط کر رکھا ہے جو توبہ، خشوع، خضوع سے ٹل سکتی ہے۔ جب کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت انسان کو پہنچتی ہے، تو وہ فطرتاً اور طبعاً اعمالِ حسنہ کی طرف رُجوع کرتا ہے۔ اپنے اندر ایک قلق اور کرب محسوس کرتا ہے جو اسے بیدار کرتا ہے اور نیکیوں کی طرف کھینچے لیے جاتا ہے اور گناہ سے ہٹاتا ہے۔ جس طرح پر ہم ادویات کے اثر کو تجربے کے ذریعہ سے پا لیتے ہیں، اسی طرح پر ایک مضطرب الحال انسان جب خدا تعالیٰ کے آستانہ پر نہایت تذلّل اور نیستی کے ساتھ گرتا

ہے اور ذوقی ذوقی کہہ کر اس کو پکارتا ہے اور دُعائیں مانگتا ہے، تو وہ رویائے صالحہ یا الہامِ صالحہ کے ذریعے سے ایک بشارت اور تسلی پا لیتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب صبر اور صدق سے دُعا انتہا کو پہنچے، تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ دُعا، صدقہ اور خیرات سے عذاب کا ٹلنا ایسی ثابت شدہ صداقت ہے، جس پر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی کا اتفاق ہے اور کروڑ ہا صلحا اور اتقیا اور اولیاء اللہ کے ذاتی تجربے اس امر پر گواہ ہیں۔

عبادات میں لذّت اور سرور رکھا گیا ہے

نماز کیا ہے؟ یہ ایک خاص دُعا ہے، مگر لوگ اس کو بادشاہوں کا ٹیکس سمجھتے ہیں۔ نادان اتنا نہیں جانتے کہ بھلا خدا تعالےٰ کو ان باتوں کی کیا حاجت ہے؟ اس کے غنا۔ ذاتی کو اس بات کی کیا حاجت ہے کہ انسان دُعا، تسبیح اور تہلیل میں مصروف ہے، بلکہ اس میں انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے کہ وہ اس طریق پر اپنے مطلب کو پہنچ جاتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ آجکل عبادات اور تقویٰ اور دینداری سے محبت نہیں ہے۔ اِس کی وجہ ایک عام زہریلا اثر رسم کا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت سرد ہو رہی ہے اور عبادت میں جس قسم کا مزا آنا چاہیے، وُہ مزا نہیں آتا۔ دُنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس میں لذّت اور ایک خاص حظّ اللہ تعالیٰ نے نہ رکھا ہو۔ جس طرح پر ایک مریض ایک عمدہ سے عمدہ خوش ذائقہ چیز کا مزہ نہیں اُٹھا سکتا اور وہ اُسے تلخ یا پھیکا سمجھتا ہے، اسی طرح وُہ لوگ جو عباداتِ الٰہی میں حظّ اور لذّت نہیں پاتے اُن کو اپنی بیماری کا فکر کرنا چاہیے، کیونکہ جیسا مَیں نے ابھی کہا ہے دُنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس میں خدا تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی لذّت نہ رکھی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عبادت کے لیے پیدا کیا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس عبادت میں اُس کے لیے لذّت اور سُرور نہ ہو۔ لذّت اور سرور تو ہے، مگر اُس سے حظ اٹھانے والا بھی تو ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّاریات: ۵۷) اب انسان جبکہ عبادت ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ ضروری ہے کہ عبادت میں لذّت اور سُرور بھی درجۂ غایت کا رکھا ہو۔ اس بات کو ہم اپنے روزمرّہ کے مشاہدہ اور تجربے سے خوب سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً دیکھو اناج اور تمام خوردنی اور نوشیدنی اشیاء انسان کے لیے پیدا ہوئی ہیں، تو کیا اُن سے وُہ ایک لذّت اور حظّ نہیں پاتا ہے؟ کیا اس ذائقہ، مزے اور احساس کے لیے اُس کے مُنہ میں زبان موجود نہیں۔ کیا وہ خوبصورت اشیاء دیکھ کر نباتات ہوں یا جمادات۔ حیوانات ہوں یا انسان حظّ نہیں پاتا؟ کیا دل خوش کُن اور سُریلی آوازوں سے اس کے کان محظوظ نہیں ہوتے؟ پھر کیا کوئی دلیل اور بھی اس امر کے اثبات کے لیے مطلوب ہے کہ عبادت میں لذّت نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے عورت اور مرد کو جوڑا پیدا کیا اور مرد کو رغبت دی ہے۔ اب اس میں زبردستی نہیں کی، بلکہ ایک لذّت بھی دکھلائی ہے۔ اگر محض توالد و تناسل ہی مقصود بالذات ہوتا تو مطلب پُورا نہ ہو سکتا۔ عورت اور مرد کی برہنگی کی حالت میں ان کی غیرت قبول نہ کرتی کہ وہ ایک دُوسرے کے ساتھ تعلق پیدا کریں۔

مگر اس میں اُن کے لیے ایک حظ ہے اور ایک لذت ہے۔ یہ حظ اور لذت اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ بعض کوتاہ اندیش انسان اولاد کی بھی پروا اور خیال نہیں کرتے، بلکہ ان کو صرف حظ ہی سے کام اور غرض ہے۔ خدا تعالیٰ کی علتِ غائی بندوں کا پیدا کرنا تھا اور اس سبب کے لیے ایک تعلق عورت مرد میں قائم کیا اور ضمناً اس میں ایک حظ رکھ دیا جو اکثر نادانوں کے لیے مقصود بالذات ہو گیا ہے۔ اسی طرح سے خوب سمجھ لو کہ عبادت بھی کوئی بوجھ اور ٹیکس نہیں اس میں بھی ایک لذت اور سرور ہے اور یہ لذت اور سرور دُنیا کی تمام لذتوں اور تمام حظوظِ نفس سے بالاتر اور بلند ہے جیسے عورت اور مرد کے باہمی تعلقات میں ایک لذت ہے اور اس سے وہی بہرہ مند ہو سکتا ہے جو مرد اپنے قویٰ صحیحہ رکھتا ہے۔ ایک نامرد اور مخنث وہ حظ نہیں پا سکتا اور جیسے ایک مریض کسی عمدہ سے عمدہ خوش ذائقہ غذا کی لذت سے محروم ہے اسی طرح پر ہاں ٹھیک ایسا ہی وہ کمبخت انسان ہے جو عبادتِ الٰہی سے لذت نہیں پا سکتا۔

عبودیت اور ربوبیت کے رشتہ کی حقیقت

عورت اور مرد کا جوڑا تو باطل اور عارضی جوڑا ہے۔ میں کہتا ہوں حقیقی ابدی اور لذتِ مجسم جو جوڑ ہے وہ انسان اور خدا تعالیٰ کا ہے۔ مجھے سخت اضطراب ہوتا اور کبھی کبھی یہ رنج میری جان کو کھانے لگتا ہے کہ ایک دن اگر کسی کو روٹی یا کھانے کا مزا نہ آئے، تو طبیب کے پاس جاتا اور کیسی کیسی منتیں اور خوشامدیں کرتا ہے۔ روپیہ خرچ کرتا۔ دُکھ اُٹھاتا ہے کہ وُہ مزا حاصل ہو۔ وہ نامرد جو اپنی بیوی سے لذت حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات گھبرا گھبرا کر خودکشی کے ارادے تک پہنچ جاتا اور اکثر موتیں اس قسم کی ہو جاتی ہیں۔ مگر آہ! وہ مریضِ دل۔ وُہ نامراد کیوں کوشش نہیں کرتا جس کو عبادت میں لذت نہیں آتی؟ اس کی جان کیوں غم سے نڈھال نہیں ہو جاتی؟ دُنیا اور اس کی خوشیوں کیلئے کیا کچھ کرتا ہے۔ مگر ابدی اور حقیقی راحتوں کی وُہ پیاس اور تڑپ نہیں پاتا۔ کس قدر بے نصیب ہے! کیسا ہی محروم ہے! عارضی اور فانی لذتوں کے علاج تلاش کرتا ہے اور پا لیتا ہے۔ کیا ہو سکتا ہے کہ مستقل اور ابدی لذت کے علاج نہ ہوں؟ ہیں اور ضرور ہیں۔ مگر تلاشِ حق میں مستقل اور پویہ قدم درکار ہیں۔ قرآن کریم میں ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے صالحین کی مثال عورتوں سے دی ہے۔ اس میں بھی سرّ اور بھید ہے۔ ایمان لانے والوں کو مریم اور آسیہ سے مثال دی ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ مشرکین میں سے مومنوں کو پیدا کرتا ہے۔ بہرحال عورتوں سے مثال دینے میں دراصل ایک لطیف راز کا اظہار ہے یعنی جس طرح عورت اور مرد کا باہم تعلق ہوتا ہے اسی طرح پر عبودیت اور ربوبیت کا رشتہ ہے۔ اگر عورت اور مرد کی باہم موافقت ہو اور ایک دُوسرے پر فریفتہ ہو تو وہ جوڑا ایک مبارک اور مفید جوڑا ہوتا ہے، ورنہ نظامِ خانگی بگڑ جاتا ہے اور مقصود بالذات حاصل نہیں ہوتا ہے۔ مرد اور جگہ خراب ہوتا ہے صدہا قسم کی بیماریاں لے آتا ہے آتشک سے مجذوم ہو کر دُنیا میں ہی محروم ہو جاتا ہے۔ اور اگر اولاد ہو بھی جاوے تو کئی پشت تک یہ سلسلہ برابر چلا جاتا ہے اور ادھر عورت بے حیائی کرتی پھرتی ہے اور عزت و آبرو کو ڈبو کر بھی سچی راحت حاصل نہیں کر سکتی۔ غرض اس جوڑے سے الگ ہو کر کس قدر

بد نتائج اور فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان رُوحانی جوڑے سے الگ ہو کر مجذوم اور مخذول ہو جاتا ہے۔ دُنیاوی جوڑے سے زیادہ رنج و مصائب کا نشانہ بنتا ہے۔ جیسا کہ عورت اور مرد کے جوڑے سے ایک قسم کی بقا کے لیے حظّ ہے۔ اسی طرح پر عبودیت اور ربوبیت کے جوڑے میں ایک ابدی بقاء کے لیے حظّ موجود ہے۔ صوفی کہتے ہیں جس کو یہ حظ نصیب ہو جاوے وہ دُنیا و مافیہا کے تمام حظوظ سے بڑھ کر ترجیح رکھتا ہے۔ اگر ساری عُمر میں ایکبار بھی اُس کو معلوم ہو جائے، تو اُس میں ہی فنا ہو جاوے، لیکن مشکل تو یہ ہے کہ دُنیا میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے اس راز کو نہیں سمجھا اور اُن کی نمازیں صرف ٹکریں ہیں اور اوپرے دل کے ساتھ ایک قسم کی قبض اور تنگی سے صرف نشست و برخاست کے طور پر ہوتی ہیں۔ مجھے اور بھی افسوس ہوتا ہے، جب مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ صرف اس لیے نمازیں پڑھتے ہیں کہ وہ دُنیا میں معتبر اور قابلِ عزّت سمجھے جاویں اور پھر اس نماز سے یہ بات ان کو حاصل ہو جاتی ہے، یعنی وہ نمازی اور پرہیزگار کہلاتے ہیں۔ پھر اُن کو کیوں یہ کھا جانے والا غم نہیں لگتا کہ جب جھوٹ موٹ اور بیدل کی نماز کو یہ مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے تو کیوں ایک سچے عابد بننے سے ان کو عزّت نہ ملے گی اور کیسی عزّت ملے گی۔

نماز میں لذّت نہ آنے کی وجہ اور اُس کا علاج

غرض میں دیکھتا ہوں کہ لوگ نمازوں میں غافل اور سُست اس لیے ہوتے ہیں کہ اُن کو اس لذّت اور سُرور سے اطلاع نہیں جو اللہ تعالیٰ نے نماز کے اندر رکھا ہے اور بڑی بھاری وجہ اس کی یہی ہے۔ پھر شہر وں اور گاؤں میں تو اور بھی سُستی اور غفلت ہوتی ہے۔ سوچاسواں حصّہ بھی تو پوری مُستعدی اور سچّی محبت سے اپنے مولا حقیقی کے حضور سر نہیں جُھکاتا۔ پھر سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ اُن کو اس لذّت کی اطلاع نہیں اور نہ کبھی اُنہوں نے اس مزہ کو چکھا اور مذاہب میں ایسے احکام نہیں ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے کاموں میں مبتلا ہوتے ہیں اور مؤذّن اذان دے دیتا ہے۔ پھر وہ سُننا بھی نہیں چاہتے، گویا اُن کے دل دُکھتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ہی قابلِ رحم ہیں۔ بعض لوگ یہاں بھی ایسے ہیں کہ اُن کی دُکانیں دیکھو تو مسجدوں کے نیچے ہیں۔ مگر کبھی جا کر کھڑے بھی تو نہیں ہوتے۔ پس میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ سے نہایت سوز اور ایک جوش کے ساتھ یہ دُعا مانگنی چاہیے کہ جس طرح پھلوں اور اشیاء کی طرح طرح کی لذّتیں عطا کی ہیں۔ نماز اور عبادت کا بھی ایکبار مزہ چکھا دے۔ کھایا ہوا یاد رہتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی شخص کسی خوبصورت کو ایک سُرور کے ساتھ دیکھتا ہے، تو وہ اُسے خوب یاد رہتا ہے اور پھر اگر کسی بدشکل اور مکروہ ہیئت کو دیکھتا ہے، تو اس کی ساری حالت بہ اعتبار اس کے مجسّم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ہاں۔ اگر کوئی تعلق نہ ہو تو، کچھ یاد نہیں رہتا۔ اسی طرح بے نمازوں کے نزدیک نماز ایک تاوان ہے کہ ناحق صبح اُٹھ کر سردی میں وضو کر کے خوابِ راحت چھوڑ کر کئی قسم کی آسائشوں

کو کھو کر پڑھنی پڑتی ہے اصل بات یہ ہے کہ اسے بیزاری ہے، وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لذت اور راحت سے جو نماز میں ہے اس کو اطلاع نہیں ہے پھر نماز میں لذت کیونکر حاصل ہو۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ایک شرابی اور نشہ باز انسان کو جب سُرور نہیں آتا، تو وہ پئے در پئے پیالے پیتا جاتا ہے، یہانتک کہ اُس کو ایک قسم کا نشہ آجاتا ہے۔ دانشمند اور بزرگ انسان اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور وہ یہ کہ نماز پر دوام کرے اور پڑھتا جاوے۔ یہانتک کہ اُس کو سرور آجاوے اور جیسے شرابی کے ذہن میں ایک لذت ہوتی ہے، جس کا حاصل کرنا اس کا مقصود بالذات ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ذہن میں اور ساری طاقتوں کا رُجحان نماز میں اُسی سُرور کا حاصل کرنا ہو اور پھر ایک خلوص اور جوش کے ساتھ کم از کم اس نشہ باز کے اضطراب اور قلق وکرب کی مانند ہی ایک دُعا پیدا ہو کہ وُہ لذت حاصل ہو تو مَیں کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ یقیناً یقیناً وہ لذت حاصل ہو جاوے گی۔ پھر نماز پڑھتے وقت اُن مفاد کا حاصل کرنا بھی ملحوظ ہو جو اس سے ہوتے ہیں اور احسان پیشِ نظر رہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (ھود : ۱۱۵) نیکیاں بدیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ پس ان حسنات کو اور لذات کو دل میں رکھ کر دُعا کرے کہ وُہ نماز جو کہ صدیقوں اور محسنوں کی ہے، وہ نصیب کرے۔ یہ جو فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (ھود : ۱۱۵) یعنی نیکیاں یا نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے یا دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ نماز فواحش اور برائیوں سے بچاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ باوجود نماز پڑھنے کے پھر بدیاں کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں، مگر نہ روح اور راستی کے ساتھ۔ وُہ صرف رسم اور عادت کے طور پر ٹکریں مارتے ہیں۔ اُن کی رُوح مُردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام حسنات نہیں رکھا اور یہاں جو حسنات کا لفظ رکھا الصلوٰۃ کا لفظ نہیں رکھا۔ باوجودیکہ معنے وہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تا نماز کی خوبی اور حسن وجمال کی طرف اشارہ کرے کہ وہ نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے جو اپنے اندر ایک سچائی کی رُوح رکھتی ہے اور فیض کی تاثیر اُس میں موجود ہے۔ وہ نماز یقیناً یقیناً برائیوں کو دُور کرتی ہے۔ نماز نشست و برخاست کا نام نہیں ہے۔ نماز کا مغز اور رُوح وہ دُعا ہے جو ایک لذت اور سُرور اپنے اندر رکھتی ہے۔

ارکانِ نماز کی حقیقت

ارکانِ نماز دراصل روحانی نشست و برخاست ہیں۔ انسان کو خدا تعالےٰ کے رُوبرو کھڑا ہونا پڑتا ہے اور قیام بھی آدابِ خدمتگاران میں سے ہے۔ رکوع جو دوسرا حصّہ ہے بتلاتا ہے کہ گویا تیاری ہے کہ وہ تعمیلِ حکم کو کس قدر گردن جھکاتا ہے اور سجدہ کمالِ آداب اور کمالِ تذلّل اور نیستی کو جو عبادت کا مقصود ہے ظاہر کرتا ہے۔ یہ آداب اور طُرق ہیں جو خدا تعالیٰ نے بطور یادداشت کے مقرر کر دیئے ہیں اور جسم کو باطنی طریق سے حصہ دینے کی خاطر ان کو مقرر کیا ہے۔ علاوہ ازیں باطنی طریق کے اثبات کی خاطر ایک ظاہری طریق بھی رکھ دیا ہے۔ اب اگر ظاہری طریق میں (جو اندرونی اور

باطنی طریق کا ایک عکس ہے) صرف نقال کی طرح نقلیں اُتاری جاویں اور اسے ایک بارگراں سمجھ کر اُتار پھینکنے کی کوشش کی جاوے، تو تم ہی بتاؤ۔ اس میں کیا لذت اور حظ آسکتا ہے؟ اور جبتک لذت اور سُرور نہ آئے۔ اُس کی حقیقت کیونکر متحقق ہوگی اور یہ اُس وقت ہوگا جبکہ رُوح بھی ہمہ نیستی اور تذلل تام ہو کر آستانۂ الوُہیت پر گرے اور جو زبان بولتی ہے، رُوح بھی بولے۔ اُس وقت ایک سُرور اور نُور اور تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ مَیں اِس کو اور کھول کر لکھنا چاہتا ہوں کہ انسان جس قدر مراتب طے کر کے انسان ہوتا ہے۔ یعنی کہاں نُطفہ۔ بلکہ اس سے بھی پہلے نُطفہ کے اجزاء یعنی مختلف قسم کی اغذیہ اور اُن کی ساخت اور بناوٹ۔ پھر نُطفہ کے بعد مختلف مدارج کے بعد بچہ۔ پھر جوان، بُوڑھا۔ غرض ان تمام عالموں میں جو اُس پر مختلف اوقات میں گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا معترف ہو اور وہ نقشہ ہر آن اس کے ذہن میں کھنچا رہے۔ تو بھی وُہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ ربوبیت کے مدِمقابل میں اپنی عبودیت کو ڈال دے۔ غرض مدعا یہ ہے کہ نماز میں لذت اور سُرور بھی عبوُدیت اور ربوبیت کے ایک تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ جبتک اپنے آپ کو عدمِ محض یا مشابہ بالعدم قرار دے کر جو ربوبیت کا ذاتی تقاضہ ہے نہ ڈال دے۔ اُس کا فیضان اور پرَتو اس پر نہیں پڑتا۔ اور اگر ایسا ہو تو پھر اعلیٰ درجہ کی لذت حاصل ہوتی ہے جس سے بڑھ کر کوئی حظ نہیں ہے۔

سچی نماز اس مقام پر انسان کی رُوح جب ہمہ نیستی ہو جاتی ہے تو وہ خدا کی طرف ایک چشمہ کی طرح بہتی ہے اور ماسویٰ اللہ سے اُسے انقطاعِ تام ہو جاتا ہے۔ اُس وقت خدا تعالیٰ کی محبت اُس پر گرتی ہے۔ اس اتصال کے وقت ان دو جوشوں سے، جو اُوپر کی طرف سے رُبوبیت کا جوش اور نیچے کی طرف عبُودیت کا جوش ہوتا ہے، ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نام صلوٰۃ ہے۔ پس یہی وہ صلوٰۃ ہے جو سَیّئات کو بھسم کر جاتی ہے اور اپنی جگہ ایک نُور اور چمک چھوڑ دیتی ہے۔ جو سالک کو راستہ کے خطرات اور مشکلات کے وقت ایک منوّر شمع کا کام دیتی ہے اور ہر قسم کے خس و خاشاک اور ٹھوکر کے پتھروں اور خار و خس سے جو اس کی راہ میں ہوتی ہیں، آگاہ کر کے بچاتی ہے اور یہی وُہ حالت ہے جبکہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ - (العنکبوت: ۴۶) کا اطلاق اس پر ہوتا ہے۔ کیونکر اُس کے ہاتھ میں نہیں اُس کے دل میں ایک روشن چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے اور یہ درجہ کامل تذلل، کامل نیستی اور فروتنی اور پُوری اطاعت سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر گناہ کا خیال اُسے کیونکر آسکتا ہے اور انکار اس میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ فحشاء کی طرف اس کی نظر اُٹھ ہی نہیں سکتی۔ غرض ایک ایسی لذت، ایسا سُرور حاصل ہوتا ہے کہ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اُسے کیونکر بیان کروں۔

غیراللہ کی طرف رجوع

پھر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ نماز جو اپنے اصلی معنوں میں نماز ہے، دُعا سے حاصل ہوتی ہے۔ غیراللہ سے سوال کرنا مومنانہ غیرت کے صریح اور سخت مخالف ہے، کیونکہ یہ مرتبہ دُعا کا اللہ ہی کے لیے ہے۔ جبتک انسان پُورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے اور اُسی سے نہ مانگے۔ سچ سمجھو کہ وہ حقیقی طور پر سچا مُسلمان اور سچا مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی، سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں۔ جس طرح پر ایک بڑا انجن بہت سی کلوں کو چلاتا ہے۔ پس اسی طور پر جب تک انسان اپنے ہر کام اور ہر حرکت و سکون کو اُسی انجن کی طاقت عظمیٰ کے ماتحت نہ کر لیوے وُہ کیونکر اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کا قائل ہو سکتا ہے اور اپنے آپ کو اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (الانعام: ۸۰) کہتے وقت واقعی حنیف کہہ سکتا ہے؟ جیسے مُنہ سے کہتا ہے، ویسے ہی ادھر کی طرف متوجہ ہو تو لاَرَیْب وہ مُسلم ہے۔ وہ مومن اور حنیف ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا غیراللہ سے سوال کرتا ہے اور ادھر بھی جُھکتا ہے، وہ یاد رکھے کہ بڑا ہی بدقسمت اور محروم ہے کہ اُس پر وُہ وقت آجانے والا ہے کہ وہ زبانی اور نمائشی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف نہ جُھک سکے۔

ترکِ نماز کی عادت اور کسل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کیونکہ جب انسان غیراللہ کی طرف جُھکتا ہے، تو رُوح اور دل کی طاقتیں اس درخت کی طرح (جس کی شاخیں ابتداءً ایک طرف کر دی جاویں اور اُس طرف جُھک کر پرورش پالیں) ادھر ہی جُھکتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک سختی اور تشدد اس کے دل میں پیدا ہو کر اُسے منجمد اور پتھر بنا دیتا ہے۔ جیسے وُہ شاخیں۔ پھر دُوسری طرف مڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح پر وہ دل اور رُوح دن بدن خدا تعالیٰ سے دُور ہوتی جاتی ہے۔ پس یہ بڑی خطرناک اور دل کو کپکپا دینے والی بات ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دُوسرے سے سوال کرے۔ اسی لیے نماز کا التزام اور پابندی بڑی ضروری چیز ہے تاکہ اوّلاً وہ ایک عادتِ راسخہ کی طرح قائم ہو اور رجوع الی اللہ کا خیال ہو۔ پھر رفتہ رفتہ وہ وقت خود آجاتا ہے جبکہ انقطاعِ کلّی کی حالت میں انسان ایک نُور اور ایک لذت کا وارث ہو جاتا ہے۔ مَیں اس امر کو پھر تاکید سے کہتا ہوں افسوس ہے کہ مجھے وُہ لفظ نہیں ملے، جس میں غیراللہ کی طرف رجُوع کرنے کی برائیاں بیان کر سکوں۔ لوگوں کے پاس جا کر منت خوشامد کرتے ہیں۔ یہ بات خدا تعالیٰ کی غیرت کو جوش میں لاتی ہے۔ کیونکہ یہ تو لوگوں کی نماز ہے پس وہ اس سے ہٹتا اور اُسے دُور پھینک دیتا ہے۔ میں موٹے الفاظ میں اس کو بیان کرتا ہوں گو یہ امر اس طرح پر نہیں ہے مگر سمجھ میں خوب آسکتا ہے کہ جیسے ایک مردِ غیور کی غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ وُہ اپنی بیوی کو کسی غیر کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہوئے دیکھ سکے اور جس طرح پر وُہ مرد ایسی حالت میں اس نابکار عورت کو واجب القتل سمجھتا

بلکہ بسا اوقات ایسی واردات ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی جوش اور غیرت اُلوہیت کا ہے۔ عبودیت اور دُعا خاص اسی ذات کے بمقابل ہیں۔ وہ پسند نہیں کر سکتا کہ کسی اور کو معبود قرار دیا جاوے یا پکارا جاوے۔ پس خوب یاد رکھو! اور پھر یاد رکھو! کہ غیر اللہ کی طرف جھکنا خدا سے کاٹنا ہے۔ نماز اور توحید کچھ ہی کہو، کیونکہ توحید کے عملی اقرار کا نام ہی نماز ہے۔ اس وقت بے برکت اور بیسود ہوتی ہے جب اُس میں نیستی اور تذلل کی رُوح اور حنیف دل نہ ہو۔

رعایتِ اسباب دُعا کا شعبہ ہے

سُنو! وہ دُعا جس کے لیے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن: ۶۱) فرمایا ہے۔ اس کے لیے یہی سچی رُوح مطلوب ہے۔ اگر اس تضرع اور خشوع میں حقیقت کی رُوح نہیں، تو وہ ٹیں ٹیں سے کم نہیں ہے۔ پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسباب کی رعایت ضروری نہیں ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ شریعت نے اسباب کو منع نہیں کیا ہے اور سچ پوچھو تو کیا دُعا اسباب نہیں؟ یا اسباب دُعا نہیں؟ تلاشِ اسباب بجائے خود ایک دُعا ہے۔ اور دُعا بجائے خود عظیم الشان اسباب کا چشمہ ہے۔ انسان کی ظاہری بناوٹ، اس کے دو ہاتھ دو پاؤں کی ساخت ایک دُوسرے کی امداد کا ایک قدرتی راہنما ہے جب یہ نظارہ خود انسان میں موجود ہے۔ پھر کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ وہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدۃ: ۳) کے معنے سمجھنے میں مشکلات کو دیکھے۔

ہاں! مَیں کہتا ہوں کہ تلاشِ اسباب بھی بذریعہ دُعا کرو۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ جب میں تمہیں تمہارے جسم کے اندر اللہ تعالیٰ کا ایک قائم کردہ سلسلۂ امدادِ باہمی اور کامل رہنما سلسلہ دکھاتا ہوں۔ تم اس سے انکار کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسباب کو اور بھی صاف کرنے اور وضاحت سے دُنیا پر کھول دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کا ایک سلسلہ دُنیا میں قائم کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا اور قادر ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی قسم کی امداد کی ضرورت ان رسولوں کو باقی نہ رہنے دے۔ مگر پھر بھی ایک وقت اُن پر آتا ہے کہ وہ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (الصّٰفّٰت: ۱۵) کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیا وہ ایک ٹکڑ گدا فقیر کی طرح صدا دیتے ہیں؟ نہیں مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کہنے کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ وہ دُنیا کو رعایتِ اسباب سکھانا چاہتے ہیں۔ جو دُعا کا ایک شعبہ ہے؛ ورنہ اللہ تعالیٰ پر اُن کو کامل ایمان اور اس کے وعدوں پر پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (المومن: ۵۲) ایک یقینی اور حتمی وعدہ ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ بھلا اگر خدا کسی کے دل میں مدد کا خیال نہ ڈالے، تو کوئی کیونکر مدد کر سکتا ہے۔

مامور من اللہ کی طلبِ امداد کا سِرّ

اصل بات یہی ہے کہ حقیقی مُعاون و ناصر وہی پاک ذات ہے، جس کی شان نعم المولیٰ و نعم النصیر و نعم الوکیل ہے۔ دُنیا اور دُنیا کی مددیں اُن لوگوں کے سامنے کالمیّت ہوتی ہیں اور وہ مردہ کیڑے کے برابر بھی حقیقت

نہیں رکھتے ہیں، لیکن دُنیا کو دُعا کا ایک موٹا طریق بتلانے کے لیے وہ یہ راہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اپنے کاروبار کا متولّی خدا تعالیٰ ہی کو جانتے ہیں اور یہ بات بالکل سچ ہے۔ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (اعراف: ۱۹۷) اللہ تعالیٰ ان کو مامور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کاروبار کو دُوسروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔ ہمارے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مقامات پر مدد کا وعظ کرتے تھے، اس لیے کہ وقت نصرتِ الٰہی کا تھا، اُس کو تلاش کرتے تھے کہ وُہ کس کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ یہ ایک بڑی غور طلب بات ہے۔ دراصل مامور من اللہ لوگوں سے مدد نہیں مانگتا، بلکہ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (الصّف: ۱۵) کہہ کر وُہ اُس نصرت کا استقبال کرنا چاہتا ہے اور ایک فرطِ شوق سے بیقرار دل کی طرح اس کی تلاش میں رہتا ہے۔ نادان اور کوتہ اندیش لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وُہ لوگوں سے مدد مانگتا ہے، بلکہ اسی طرح پر اس شان میں وُہ کسی دل کے لیے جو اس نصرت کا مُوجب ہوتا ہے ایک برکت اور رحمت کا موجب ہوتا ہے۔ پس مامُور من اللہ کی طلبِ امداد کا اصل سِرّ اور راز یہی ہے جو قیامت تک اسی طرح پر رہے گا۔ اشاعتِ دین میں مامُور من اللہ دُوسروں سے مدد چاہتے ہیں۔ مگر کیوں؟ اپنے ادائے فرض کے لیے تاکہ دلوں میں خدا تعالیٰ کی عظمت پیدا کریں؛ ورنہ یہ ایک ایسی بات ہے کہ قریب بہ کفر پہنچ جاتی ہے۔ اگر غیراللہ کو متولّی قرار دیں اور ان نفوسِ قدسیہ سے ایسا امکان محالِ مطلق ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ توحید تب ہی پُوری ہوتی ہے کہ کُل مُرادوں کا مُعطی اور تمام امراض کا چارہ اور مدار وہی ذاتِ واحد ہو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنی یہی ہیں۔ صُوفیوں نے اس میں اِلٰہ کے لفظ سے محبُوب، مقصُود، معبُود مُراد لی ہے۔

بے شک اصل اور سچ یونہی ہے۔ جبتک انسان کامل توحید پر کاربند نہیں ہوتا، اس میں اسلام کی محبت اور عظمت قائم نہیں ہوتی اور پھر میں اصل ذکر کی طرف رجُوع کر کے کہتا ہوں کہ نماز کی لذّت اور سُرور اسے حاصل نہیں ہو سکتا مدار اسی بات پر ہے کہ جبتک بُرے ارادے، ناپاک اور گندے منصوبے بھسم نہ ہوں۔ انانیت اور شیخی دُور ہو کر نیستی اور فروتنی نہ آئے، خدا کا سچا بندہ نہیں کہلا سکتا اور عبُودیتِ کاملہ کے سکھانے کے لیے بہترین معلّم اور افضل ترین ذریعہ نماز ہی ہے۔

مَیں پھر تمہیں بتلاتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ سے سچا تعلق، حقیقی ارتباط قائم کرنا چاہتے ہو، تو نماز پر کاربند ہو جاؤ اور ایسے کاربند بنو کہ تمہارا جسم نہ تمہاری زبان بلکہ تمہاری رُوح کے ارادے اور جذبے سب کے سب ہمہ تن نماز ہو جائیں۔[1]

❁ ❁ ❁

---

[1] (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ صفحہ ۷ پرچہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء)

۱۹؍جنوری ۱۸۹۸ء

چودھویں صدی کے مجدّد کا کام

بعد نماز مغرب فرمایا: "عیسائیوں کا فتنہ اُمّ الفتن ہے، اس لیے چودھویں صدی کے مجدّد کا کام کسرِ صلیب ہے۔ پھر چونکہ یہ علامت اُس پر صادق آئی، اس لیے چودھویں صدی کا مجدّد مسیح موعود قرار پایا۔ کیونکہ احادیث سے مسیح موعود کا کام کسرِ صلیب ثابت ہوتا ہے۔ اب جبکہ ہمارے مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ چودھویں صدی کے مجدّد کا کام کسرِ صلیب ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اس کے سامنے یہی مصیبت ہے۔ پھر انکار کے لیے کون سی گنجائش ہے کہ مسیح موعود چودھویں صدی کا مجدّد ہی ہوگا۔ ہماری توجہ ان لوگوں کی طرف ہے جن کو حق کی پیاس ہے، لیکن جو حق کی تلاش نہیں چاہتے، جن کی طبیعتیں معکوس ہیں وہ ہم سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟ یاد رکھو ہدایت تو اُن کو ہوتی ہے جو تعصّب سے کام نہیں لیتے۔ وہ لوگ فائدہ نہیں اُٹھاتے جو تدبّر نہیں کرتے۔ پس طالبِ ہدایت سمجھ لے کہ موجودہ حالتوں میں چودھویں صدی کے مجدّد کا یہ کام ہے کہ کسرِ صلیب کرے۔ کیونکہ صلیبی فتنہ خطرناک پھیلا ہوا ہے۔ [اسلام] ایسا دین تھا کہ اگر ایک بھی اس سے مرتد ہو جاتا، تو قیامت برپا ہو جاتی تھی، لیکن اب کس قدر افسوس ہے کہ مرتد ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے اور وہ لوگ جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتے تھے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل انسان کی نسبت جس کی پاک باطنی کی کوئی نظیر دنیا میں موجود نہیں، قسم قسم کے دل آزار بہتان لگا رہے ہیں کہ کروڑوں کتابیں اس سیّد المعصومین کی تکذیب میں اُس گروہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں بہت سے مستقل ہفتہ وار اور ماہوار اخبار اور رسالے اس غرض کے لیے جاری کر رکھے ہیں۔

پھر کیا ایسی حالت میں خدا تعالیٰ کوئی مجدّد نہ بھیجتا؟ اور پھر اگر کوئی مجدّد آتا، تو تم ہی خدا کے واسطے سوچ کر بتاؤ کہ کیا اس کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ رفع یدین کے جھگڑے کرے یا آمین بالجہر پر مرتا پھرے۔

غور تو کرو جو مرض وبا کی طرح پھیل رہا ہے طبیب اس کا علاج کرے گا، نہ کسی اور مرض کا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی حد ہو چکی ہے۔ لکھا ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اپنی ماں سے سُن کر اس کو مار دیا تھا۔ یہ غیرت اور حمیّت تھی مسلمانوں کی، مگر آج یہ حال ہو گیا ہے کہ توہین کی کتابیں پڑھتے اور سُنتے ہیں۔ غیرت نہیں آتی اور اتنا نہیں ہو سکتا کہ اُن سے نفرت ہی کریں، بلکہ اُلٹا جس شخص کو خدا نے خاص اِس فتنہ کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور جلال کے لیے خاص قسم کی غیرت لے کر آیا ہے۔ اُس کی مخالفت کرتے ہیں اور اُس پر ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہی ان لوگوں کو

بصیرت کی آنکھ دے۔ آمین ۔"

آنحضرتؐ کی تائید و نصرت کے متعلق ایک عظیم الشان پیشگوئی

فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک سورۃ بھیج کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علو اور مرتبہ ظاہر کیا ہے اور وہ سورۃ ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (الفیل: ۲)
یہ سورۃ اُس حالت کی ہے کہ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مصائب اور دُکھ اُٹھا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس حالت میں آپؐ کو تسلی دیتا ہے کہ میں تیرا مؤید و ناصر ہوں۔ اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے کہ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحاب الفیل کے ساتھ کیا کیا یعنی اُن کا مکر اُلٹا کر اُن پر ہی مارا اور چھوٹے چھوٹے جانور اُن کے مارنے کے لیے بھیج دیئے۔ ان جانوروں کے ہاتھوں میں کوئی بندوقیں نہ تھیں، بلکہ مٹی تھی۔ سِجِّیل بھیگی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں۔ اس سورۃ شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ قرار دیا ہے اور اصحاب الفیل کے واقعہ کو پیش کر کے آپؐ کی کامیابی اور تائید اور نصرت کی پیشگوئی کی ہے۔

یعنی آپؐ کی ساری کارروائی کو برباد کرنے کے لیے جو سامان کرتے ہیں اور تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔ ان کے تباہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اُن کی ہی تدبیروں کو اور کوششوں کو اُلٹا کر دیتا ہے کسی بڑے سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے ہاتھی والوں کو چڑیوں نے تباہ کر دیا۔ ایسا ہی یہ پیشگوئی قیامت تک جاتی ہے۔ جب کبھی کوئی اصحاب الفیل پیدا ہو۔ تب ہی اللہ تعالیٰ اُن کے تباہ کرنے کے لیے ان کی کوششوں کو خاک میں ملا دینے کے سامان کر دیتا ہے۔

پادریوں کا اُصول یہی ہے۔ اُن کی چھاتی پر اسلام ہی پتھر ہے؛ ورنہ باقی تمام مذاہب اُن کے نزدیک نامرد ہیں۔ ہندو بھی عیسائی ہو کر اسلام کے ہی رد میں کتابیں لکھتے ہیں۔ رامچند اور ٹھاکر داس نے اسلام کی تردید میں اپنا سارا زور لگا کر کتابیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اُن کا کانشنس کہتا ہے کہ اُن کی ہلاکت اسلام ہی سے ہے۔ طبعی طور پر خوف اُنہی کا پڑتا ہے جن کے ذریعہ ہلاکت ہوتی ہے۔ ایک مُرغی کا بچہ بلی کو دیکھتے ہی چلانے لگتا ہے۔ اسی طرح مختلف مذاہب کے پیرو عموماً اور پادری خصوصاً جو اسلام کی تردید میں زور لگا رہے ہیں، یہ اسی لیے ہے کہ اُن کو یقین ہے، بلکہ اندر ہی اندر اُن کا دل اُن کو بتاتا ہے کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے، جو مِلَلِ باطلہ کو پیس ڈالے گا۔

احمدیت کے ذریعہ اسلام کا دفاع

اس وقت اصحاب الفیل کی شکل میں اسلام پر حملہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں بہت کمزوریاں ہیں۔ اسلام غریب ہے اور اصحابِ فیل زور میں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ وہی نمونہ پھر دکھانا چاہتا ہے۔ چڑیوں سے وہی کام لے گا۔ ہماری جماعت اُن کے

مقابلہ میں کیا ہے۔ اُن کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اُن کے اتفاق اور طاقت اور دولت کے سامنے نام بھی نہیں رکھتے، لیکن ہم اصحاب الفیل کا واقعہ سامنے دیکھتے ہیں کہ کیسی تسلّی کی آیات نازل فرمائی ہیں۔ مجھے یہی الہام ہوا ہے جس سے صاف صاف پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نصرت اور تائید اپنا کام کر کے رہے گی۔ ہاں اُس پر وُہی یقین رکھتے ہیں، جن کو قرآن سے محبت ہے۔ جسے قرآن سے محبت نہیں، اسلام سے اُلفت نہیں وہ ان باتوں کی کب پروا کر سکتا ہے۔ اسلام اور ایمان یہی ہے کہ خدا کی رائے سے رائے ملائے۔ جو اسلام کی عزّت اور اس کے لیے غیرت نہیں رکھتا، خواہ وہ کوئی ہو، خدا کو اُس کی عزّت اور اُس کی غیرت کی پروا نہیں ہوتی اور وُہ دیندار مُسلمان نہیں۔ خدا کی باتوں کو حقیر مت سمجھو اور ان لوگوں کو قابلِ رحم سمجھو جنھوں نے تعصّب کی وجہ سے حق کا انکار کر دیا اور کہدیا کہ اس زمانہ میں کسی کے آنے کی کیا ضرورت ہے۔ افسوس اُن پر۔ وہ نہیں دیکھتے کہ اسلام کس طرح دشمنوں کے نرغہ میں پھنسا ہوا ہے۔ چاروں طرف سے اُس پر حملہ پر حملہ ہو رہا ہے۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی جاتی ہے پھر بھی کہتے ہیں کہ کسی کی ضرورت نہیں۔

قانون سڈیشن سے اسلام ہی فائدہ اُٹھا سکتا ہے

قانون سڈیشن ہمارے لیے بہت مفید ہے۔ صرف ہم ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ دُوسرے مذہبوں کو ہلاک کرنے کے لیے یہ بھی ایک ذریعہ ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس تو حقائق اور معارف کے خزانے ہیں۔ ہم ان کا ایک ایسا سلسلہ جاری رکھیں گے جو کبھی ختم نہ ہوگا، مگر آریہ یا پادری کون سے معارف پیش کرینگے۔ پادریوں نے گذشتہ پچاس سال کے اندر کیا دکھایا ہے۔ کیا گالیوں کے سوا وہ اور کچھ پیش کر سکتے ہیں، جو آئندہ کریں گے؟ ہندوؤں کے ہاتھوں میں بھی اعتراضوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر کسی آریہ یا پادری کو اپنے مذہب کے کمالات اور خوبیاں بیان کرنے کو بلایا جائے، تو وہ ہمارے مقابلہ میں ایک سلطنت بھی نہ ٹھہر سکے[1]۔

۱۹؍جنوری ۱۸۹۸ء

کفّارہ

مذہب کی اوّل اینٹ خدا شناسی ہے۔ جبتک وُہ دُرست نہ ہو، دُوسرے اعمال کیونکر پاک ہو سکتے ہیں؟ عیسائی دوسروں کی پاک باطنی پر بڑے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ اور کفّارہ کا اخلاق سوز مسئلہ مان کر اعتراض کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب کفّارہ کا عقیدہ ہو

---

[1] الحکم جلد ۲۶ پرچہ ۱۷؍جولائی ۱۹۰۱ء

تو اللہ تعالیٰ کے مواخذہ کا خوف رہ کیونکر سکتا ہے؟ کیا سچ نہیں ہے کہ ہمارے گناہوں کے بدلے مسیح پر سب کچھ وارد ہوگیا۔ یہانتک کہ اُسے ملعون قرار دیا اور تین دن ھاویہ میں رکھا۔ ایسی حالت میں اگر گناہوں کے بدلے سزا ہو تو پھر کفارہ کا کیا فائدہ ہوا؟ اصولِ کفارہ ہی چاہتا ہے کہ گناہ کیا جائے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ اصول کا اثر بہت پڑتا ہے۔ دیکھو! ہندوؤں کے نزدیک گائے بہت پوتر اور قابلِ تعظیم ہے اور اُس کا اثر ان میں اس حد تک ہے کہ اُس کا پیشاب اور گوبر بھی پوتر کرنے والا اُن میں قرار دیا گیا ہے اور گائے کے متعلق اس قدر جوش ان میں ہے، جس کی کچھ بھی حد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ امر اُن میں بطور اصول داخل کیا گیا ہے۔ یاد رکھو۔ اصول بطور ماں کے ہوتے ہیں اور اعمال بطور اولاد کے۔ جب مسیح کفارہ ہوگیا ہے اور اُس نے تمام گناہ ایمان لانے والوں کے اُٹھا لیے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ گناہ نہ کیے جاویں؟ تعجب کی بات ہے کہ عیسائی جب کفارہ کا اصول بیان کرتے ہیں، تو اپنی تقریر کو خدا تعالیٰ کے رحم اور عدل سے شروع کیا کرتے ہیں، مگر میں پوچھتا ہوں کہ جب زید کے بدلے پھانسی بکر کو ملی تو یہ کونسا انصاف اور رحم ہے۔ جب یہ اصول قرار دیدیا کہ سب گناہ اُس نے اُٹھا لیے، پھر گناہ نہ کرنے کے لیے کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ہدایت ہوتی کہ اُس وقت کے گناہ گار عیسائیوں کے لیے کفارہ ہوتے ہیں، تو یہ اور بات تھی، مگر جب یہ مان لیا گیا ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والوں کے گناہوں کی گٹھڑی یسوع اٹھا کر لے گیا اور اس نے سزا بھی اُٹھا لی۔ پھر گنہگار کو پکڑنا کس قدر ظلم ہے۔ اوّل تو بیگناہ کو گنہگار کے بدلے سزا دینا ہی ظلم ہے اور پھر دوسرا ظلم یہ ہے کہ اوّل گنہگاروں کے گناہوں کی گٹھڑی یسوع کے سر پر رکھ دی اور گنہگاروں کو مژدہ سُنا دیا کہ تمہارے گناہ اُس نے اُٹھا لیے اور پھر وہ گناہ کریں، تو پکڑے جاویں۔ یہ عجیب دھوکا ہے جس کا جواب عیسائی کبھی نہیں دے سکیں گے۔

کفارہ پر ایمان لانے سے انسان گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ کفارہ پر ایمان لانے سے انسان گناہ کی زندگی سے نجات پا سکتا ہے اور گناہ کی قوت اس میں نہیں رہتی، تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اصول ہی اپنی جڑھ میں گناہ رکھتا ہے۔ گناہ سے بچنے کی قوت پیدا ہوتی ہے مواخذۂ الٰہی کے خوف سے لیکن وہ مواخذہ کا خوف کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ یہ مان لیا جاوے کہ ہمارے گناہ یسوع نے اُٹھا لیے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسے اصول کا انسان کبھی متقی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ ہر ایک کام کو جس کی بنا تقویٰ کے اصولوں پر ہو، ضروری نہ سمجھے گا۔ یہ خوب یاد رکھو کہ پاک باطنی ہمیشہ اصولوں ہی سے شروع ہوتی ہے، ورنہ

خبثِ نفس نہ گردد بسالہا معلوم

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کفارہ کا مسئلہ ماننے والوں نے پاک باطنی کی عملی نظیریں کیا قائم کی ہیں؟ یورپ کی

بداعمالیاں سب کو معلوم ہیں۔ شراب جو اُمّ الخبائث ہے۔ اس کی یورپ میں اس قدر کثرت ہے کہ اُس کی نظیر کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی۔ مَیں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ اگر لندن کی شراب کی دوکانوں کو ایک لائن میں رکھا جائے، تو پچھتر میل تک چلی جاویں۔ جس حالت میں اُن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر ایک گناہ کی معافی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے اور جس قدر گناہ کوئی کرے معاف ہیں تو اب سوچ کر عیسائی ہم کو جواب دیں کہ اس کا اثر کیا پڑے گا۔

اگر نعوذ باللہ ہمارا یہ اصول ہوتا، تو ہم پر اس کا کتنا بڑا اثر پڑتا۔ نفسِ امّارہ تو بہانہ ہی تلاش کرتا ہے جیسے شیعوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کا سہارا لے لیا اور تقیہ کی آڑ میں جو کچھ کرلیں، سو تھوڑا ہے۔ مَیں اسی تقیہ اور امام حسینؓ کے فدیہ کے اصول کی بنا پر دلیری سے کہتا ہوں کہ شیعوں میں متقی کم نکلیں گے۔ خلیفہ محمد حسین صاحب نے لکھا ہے کہ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (الصّٰفّٰت:۱۰۸) سے جو قرآن میں آیا ہے۔ امام حسینؓ کا شہید ہونا نکلتا ہے اور اس نکتہ پر بہت خوش ہوتے ہیں کہ گویا قرآن شریف کے مغز کو پہنچ گئے ہیں۔

اُن کی اس نکتہ دانی پر مجھے ایک پوستی کی حکایت یاد آئی۔ وُہ یہ ہے کہ ایک پوستی کے پاس ایک لوٹا تھا اور اُس میں ایک سُوراخ تھا۔ جب رفعِ حاجت کو جاتا۔ اس سے پیشتر کہ وہ فارغ ہو کر طہارت کرے۔ سارا پانی لوٹے سے نکل جاتا تھا۔ آخر کئی دن کی سوچ اور فکر کے بعد اس نے یہ تجویز نکالی کہ پہلے طہارت ہی کر لیا کریں اور اپنی اس تجویز پر بہت ہی خوش ہوا۔ اسی قسم کا نکتہ اور نسخہ ان کو ملا ہے۔ جو فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (الصّٰفّٰت:۱۰۸) سے امام حسینؓ کی شہادت نکالتے ہیں۔ شیعہ لوگوں کی مسجدیں تک تو صاف نہیں رہ سکتی ہیں۔ ہم ایک شیعہ اُستاد سے پڑھا کرتے تھے اور وہاں کتے پیشاب و پاخانہ پھر جاتے تھے اور مجھے یاد نہیں کہ کسی نے کبھی وہاں نماز پڑھی ہو۔ شیعہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارے لیے امام حسینؓ اور اہلِ بیت شہید ہو چکے ہیں۔ اُن کے غم میں رو لینا اور ماتم کر لینا بس یہی کافی ہے۔ جنت کے لیے اور کسی عمل کی بجز اس کے ضرورت نہیں اور ایسا ہی عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح کا خون ہمارے لیے مُنجی ہوا۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارے گناہوں پر بھی باز پُرس ہوتی ہے اور تمہیں ان کی سزا بھگتنی ہے، تو پھر یہ نجات کیسی ہے؟

اس اُصول کا اثر درحقیقت بہت بُرا پڑا۔ اگر یہ اصول نہ ہوتا، تو یورپ کے ملکوں میں اس کثرت سے فسق و فجور نہ ہوتا اور اس طرح پر بدکاری کا سیلاب نہ آتا جیسے اب آیا ہوا ہے۔ لندن اور پیرس کے ہوٹلوں اور پارکوں میں جاکر دیکھو کیا ہو رہا ہے اور ان لوگوں سے پوچھو جو وہاں سے آتے ہیں آئے دن اخبارات میں ان بچوں کی فہرستیں جن کی ولادت ناجائز ولادت ہوتی ہے، شائع ہوتی ہیں۔

کفّارہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے

اب ہم تو اصُول ہی کو دیکھیں گے۔ ہمارے اصول میں تو یہ لکھا ہے کہ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال:۸)

اب اس کا اثر تم خود سوچ لو گے، کیا پڑے گا۔ یہی کہ انسان اعمال کی ضرورت محسوس کریگا اور نیک عمل کرنے کی سعی کرے گا۔ برخلاف اِس کے جب یہ کہا جاوے گا کہ انسان اعمال سے نجات نہیں پا سکتا، تو یہ اصُول انسان کی ہمت اور سعی کو پست کر دیگا اور اس کو بالکل مایوس اور بے دست و پا بنا دے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کا اصُول انسانی قویٰ کی بھی بےحرمتی کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی قویٰ میں ایک ترقی کا مادہ رکھا ہے لیکن کفارہ اس کو ترقی سے روکتا ہے۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ کفارہ کا اعتقاد رکھنے والوں کے حالاتِ آزادی اور بے قیدی کو جو دیکھتے ہیں تو یہ اسی اصول کی وجہ سے ہے کہ کتّے اور کتیوں کی طرح بدکاریاں ہوتی ہیں۔ لنڈن کے ہائیڈ پارک میں علانیہ بدکاریاں ہوتی ہیں اور حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں پس ہم کو صرف قیل و قال تک ہی محدود نہ رکھنا چاہیے بلکہ اعمال ساتھ ہونے چاہیں۔ جو اعمال کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ سخت ناعاقبت اندیش اور نادان ہے۔ قانونِ قدرت میں اعمال اور ان کے نتائج کی نظیریں تو موجود ہیں۔ کفارہ کی نظیر کوئی موجود نہیں۔ مثلاً بھوک لگتی ہے، تو کھانا کھا لینے کے بعد وہ فرو ہو جاتی ہے یا پیاس لگتی ہے، پانی سے جاتی رہتی ہے تو معلوم ہوا کہ کھانا کھانے یا پانی پینے کا نتیجہ بھوک کا جاتے رہنا یا پیاس کا بجھ جانا ہوا۔ مگر یہ تو نہیں ہوتا کہ بھوک لگے زید کو اور بکر روٹی کھائے اور زید کی بھوک جاتی رہے۔ اگر قانونِ قدرت میں اس کی کوئی نظیر موجود ہوتی، تو شاید کفارہ کا مسئلہ مان لینے کی گنجائش نکل آتی، لیکن جب قانونِ قدرت میں اس کی کوئی نظیر ہی نہیں ہے تو انسان جو نظیر دیکھ کر ماننے کا عادی ہے۔ اسے کیونکر تسلیم کر سکتا ہے۔ عام قانونِ انسانی میں بھی تو اس کی نظیر نہیں ملتی ہے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ زید نے خون کیا ہو اور خالد کو پھانسی ملی ہو۔ غرض یہ ایک ایسا اصُول ہے، جس کی کوئی نظیر ہرگز موجود نہیں۔

اعمالِ صالحہ اور تقویٰ

مَیں اپنی جماعت کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ ضرورت ہے اعمالِ صالحہ کی۔ خدا تعالیٰ کے حضور اگر کوئی چیز جا سکتی ہے، تو وہ یہی اعمالِ صالحہ ہیں۔ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (سورۃ فاطر: ۱۱) خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اس وقت ہمارے قلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلواروں کے برابر ہیں، لیکن فتح اور نصرت اسی کو ملتی ہے جو متقی ہو خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ فرما دیا ہے۔ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الروم: ۴۸) مومنوں کی نصرت ہمارے ذمہ ہے۔ اور لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا (النساء: ۱۴۲) اللہ مومنوں پر کافروں کو راہ نہیں دیتا، اس لیے یاد رکھو کہ تمہاری فتح تقویٰ سے ہے، ورنہ عرب تو بڑے لیکچرار اور خطیب اور شاعر ہی تھے۔ اُنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فرشتے ان کی امداد کے لیے نازل کیے۔ تاریخ کو اگر انسان پڑھے تو اُسے نظر آجائے گا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس قدر فتوحات کیں وہ انسانی طاقت اور سعی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک بیس سال کے اندر ہی اندر اسلامی سلطنت عالمگیر ہو گئی۔ اب ہم کو کوئی بتا دے کہ انسان ایسا کر سکتا

ہے؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ـ (النحل: ۱۲۹)

مُتقی اور مُحسن

مُتقی کے معنی ہیں ڈرنے والا۔ ایک ترکِ شر ہوتا ہے اور ایک اِفاضۂ خیر مُتقی ترکِ شر کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے اور محسن اِفاضۂ خیر کو چاہتا ہے۔ مَیں نے اس کے متعلق ایک حکایت پڑھی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی کی دعوت کی اور اپنی طرف سے مہمان نوازی کا پورا اہتمام کیا اور حق ادا کیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے، تو بزرگ نے بڑے اِنکسار سے کہا کہ مَیں آپ کے لائق خدمت نہیں کر سکا۔ مہمان نے کہا کہ آپ نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ مَیں نے احسان کیا ہے، کیونکہ جس وقت تم مصروف تھے، مَیں تمھاری املاک کو آگ لگا دیتا تو کیا ہوتا۔ غرض متقی کا کام یہ ہے کہ برائیوں سے باز آوے۔ اس سے آگے دُوسرا درجہ افاضۂ خیر کا ہے، جس کو یہاں مُحسنون کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے کہ نیکیاں بھی کرے۔ پُورا راستباز انسان تب ہوتا ہے جب بدیوں سے پرہیز کر کے یہ مطالعہ کرے کہ نیکی کون سی کی ہے؟

کہتے ہیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوکر چاء کی پیالی لایا۔ جب قریب آیا تو غفلت سے وہ پیالی آپؓ کے سر پر گر پڑی۔ آپؓ نے تکلیف محسوس کر کے ذرا تیز نظر سے غلام کی طرف دیکھا۔ غلام نے آہستہ سے پڑھا۔ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (آل عمران: ۱۳۵) یہ سُن کر امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کَظَمْتُ غلام نے پھر کہا وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ۔ کظم میں انسان غصہ دبا لیتا ہے اور اظہار نہیں کرتا ہے، مگر اندر سے پوری رضامندی نہیں ہوتی، اس لیے عفو کی شرط لگا دی ہے۔ آپؓ نے کہا کہ مَیں نے عفو کیا۔ پھر پڑھا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ محبوبِ الٰہی وُہی ہوتے ہیں جو کظم اور عفو کے بعد نیکی بھی کرتے ہیں۔ آپؓ نے فرمایا: جا آزاد بھی کیا۔ راستبازوں کے نمونے ایسے ہیں کہ چائے کی پیالی گرا کر آزاد ہوا۔ اب بتاؤ کہ یہ نمونہ اصول کی عمدگی ہی سے پیدا ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی قوّتِ قُدسی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ (ھود: ۱۱۳) یعنی سیدھا ہو جا۔ کسی قسم کی بداعمالی کی کجی نہ رہے۔ پھر راضی ہوں گا۔ آپ بھی سیدھا ہو جا اور دُوسروں کو بھی سیدھا کر۔ عرب کے لیے سیدھا کرنا کس قدر مشکل تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کے پُوچھنے پر فرمایا کہ مجھے سُورۃ ھُود نے بوڑھا کر دیا۔ کیونکہ اس کے حکم کی رُو سے بڑی بھاری ذمہ داری میرے سپُرد ہوئی ہے۔ اپنے آپ کو سیدھا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پُوری فرمانبرداری کرنا، جہاں تک انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہے، ممکن ہے کہ وُہ اس کو پورا کرے، لیکن دُوسروں کو ویسا ہی بنانا آسان نہیں ہے۔ اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بلند شان اور قوّتِ قُدسی کا پتہ لگتا ہے؛ چنانچہ آپؐ نے اس حکم کی کیسی تعمیل کی۔ صحابہ کرامؓ کی وہ پاک جماعت تیار کی کہ اُن کو کُنْتُمْ

خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ (آل عمران : ۱۱۱) کہا گیا اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ (البیّنۃ : ۹) کی آواز اُن کو آگئی۔ آپؐ کی زندگی میں کوئی بھی منافق مدینہ طیبہ میں نہ رہا۔ غرض ایسی کامیابی آپؐ کو ہوئی کہ اس کی نظیر کسی دوسرے نبی کے واقعاتِ زندگی میں نہیں ملتی۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ تھی کہ قیل وقال ہی تک بات نہ رکھنی چاہیے، کیونکہ اگر نِرے قیل وقال اور رِیاکاری تک ہی بات ہو تو دُوسرے لوگوں اور ہم میں پھر امتیاز کیا ہوگا اور دُوسروں پر کیا شرف! تم صرف اپنا عملی نمونہ دکھاؤ اور اس میں ایک ایسی چمک ہو کہ دُوسرے اس کو قبول کرلیں، کیونکہ جبتک اس میں چمک نہ ہو کوئی اس کو قبول نہیں کرتا۔ کیا کوئی انسان میلی چیز پسند کرسکتا ہے؟ جبتک کپڑے میں ایک داغ بھی ہو، وہ اچھا نہیں لگتا۔ اسی طرح جبتک تمہاری اندرونی حالت میں صفائی اور چمک نہ ہوگی، کوئی خریدار نہیں ہوسکتا۔ ہر شخص عمدہ چیز کو پسند کرتا ہے اسی طرح جب تک تمہارے اخلاق اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں، کسی مقام تک نہیں پہنچ سکو گے۔

انسانی پیدائش کی اصل غرض

سورۃ عصر میں اللہ تعالیٰ نے کفار اور مومنوں کی زندگی کے نمونے بتائے ہیں۔ کفار کی زندگی بالکل چوپاؤں کی سی زندگی ہوتی ہے جکو کھانے اور پینے اور شہوانی جذبات کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ (محمّد: ۱۳) مگر دیکھو اگر ایک بیل چارہ تو کھالے، لیکن ہَل چلانے کے وقت بیٹھ جائے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ زمیندار اسے بوچڑخانے میں جاکر بیچ دیگا۔ اسی طرح ان لوگوں کی نسبت (جو خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی یا پرواہ نہیں کرتے اور اپنی زندگی فسق و فجور میں گذارتے ہیں) فرماتا ہے۔ قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا دُعَآؤُکُمۡ۔ (الفرقان : ۷۸) یعنی میرا رب تمہاری کیا پرواکرتا ہے اگر تم اُس کی عبادت نہ کرو۔ یہ امر بحضورِ دل یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کے لیے محبت کی ضرورت ہے اور محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک محبت تو ذاتی ہوتی ہے اور ایک اغراض سے وابستہ ہوتی ہے۔ یعنی اس کا باعث صرف چند عارضی باتیں ہوتی ہیں۔ جن کے دُور ہوتے ہی وہ محبت سرد ہوکر رنج وغم کا باعث ہوجاتی ہے، مگر ذاتی محبت سچی راحت پیدا کرتی ہے، چونکہ انسان فطرتاً خدا ہی کے لیے پیدا ہوا۔ جیسا کہ فرمایا: مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ۔ (الذّٰریٰت: ۵۷) اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کی فطرت ہی میں اپنے لیے کچھ نہ کچھ رکھا ہوا ہے اور مخفی در مخفی اسباب سے اُسے اپنے لیے بنایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہاری پیدائش کی اصل غرض یہ رکھی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، مگر جو لوگ اپنی اس اصلی اور فطری غرض کو چھوڑ کر حیوانوں کی طرح زندگی کی غرض صرف کھانا پینا اور سو رہنا سمجھتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے دُور جا پڑتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی ذمہ داری اُن کے لیے نہیں رہتی۔ وُہ زندگی جو ذمہ داری کی ہے۔ یہی ہے کہ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ۔ پر ایمان لاکر زندگی کا

پہلو بدل لے۔ موت کا اعتبار نہیں ہے۔ سعدیؒ کا شعر سچا ہے ۔

مکُن تکیہ بر عمرِ ناپائیدار مباش ایمن از بازیٔ روزگار

عمرِ ناپائیدار پر بھروسہ کرنا دانشمند کا کام نہیں ہے۔ موت یونہی آ کر لتاڑ جاتی ہے اور انسان کو پتہ بھی نہیں لگتا جبکہ انسان اس طرح پر موت کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ پھر اُس کی زندگی کا خدا تعالیٰ کے سوا کون ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

خدا کے لیے زندگی

اگر زندگی خدا کے لیے ہو تو اس کی حفاظت کریگا۔ بخاری میں ایک حدیث ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کا رابطہ پیدا کر لیتا ہے، خدا تعالیٰ اُس کے اعضاء ہو جاتا ہے۔ ایک دُوسری روایت میں ہے کہ اُس کی دوستی یہانتک ہوتی ہے کہ میں اُس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ حتیٰ کہ اُس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب انسان جذباتِ نفس سے پاک ہو جاتا ہے اور نفسانیت چھوڑ کر خدا کے ارادوں کے اندر چلتا ہے۔ اس کا کوئی فعل ناجائز نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک فعل خدا کے منشاء کے موافق ہوتا ہے۔ اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خدا تعالیٰ اُسے اپنا فعل ہی قرار دیتا ہے۔ یہ ایک مقام ہے قربِ الٰہی کا، جہاں پہنچ کر سلوک کی منزلوں کو پورے طور پر طے نہ کرنے والوں نے یا تو ٹھوکر کھائی ہے یا الٰہیات سے ناواقف اور قربِ الٰہی کے مفہوم کو نہ سمجھنے والوں نے غلط فہمی سے کام لیا ہے اور وحدت وجود کا مسئلہ گھڑ لیا ہے۔ اس بات کو بھی ہرگز بھولنا نہ چاہیے کہ جہاں انسان ابتلا میں پڑتا ہے وہ فعل خدا کے ارادہ سے موافق نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ کی رضاء اُس کے خلاف ہوتی ہے۔ ایسا شخص اپنے جذبات کے نیچے ہوتا ہے نہ کہ منشاءِ الٰہی کے ماتحت، لیکن وُہ انسان جو اللہ تعالیٰ کا ولی کہلاتا ہے اور خدا جسکی زندگی کا ذمّہ دار ہوتا ہے ۔ وہ ہوتا ہے جس کی کوئی حرکت و سکون بلا استصواب کتابِ الٰہی نہیں ہوتی۔ وُہ اپنی ہر بات اور ارادہ پر کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُس سے مشورہ لیتا ہے۔

پھر آگے کہا ہے کہ اُس کی جان نکالنے میں اللہ تعالیٰ کو بڑا تردد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تردد سے پاک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مصلحت کے لیے اُس کو موت دی جاتی ہے اور ایک عظیم مصلحت کے لیے اس کو دُوسرے جہان میں لے جایا جاتا ہے۔ نہیں تو اُس کی بقا خدا کو بڑی پیاری لگتی ہے۔ پس اگر انسان کی ایسی زندگی نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اُس کی جان لینے میں تردد ہو تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔ ایک بکری سے بہت سے آدمی گزارہ کر سکتے ہیں اور اس کا چمڑہ بھی کام آسکتا ہے۔ اور انسان کسی حالت میں کیا مر کر بھی کام نہیں آتا، مگر صالح آدمی کا اثر اس کی ذرّیت پر بھی پڑتا ہے اور وہ بھی اس سے فائدہ اُٹھاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ درحقیقت وہ مرتا ہی نہیں۔ مرنے پر بھی اس کو ایک نئی زندگی دی جاتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا ہے کہ مَیں بچہ تھا، بوڑھا ہوا۔ مَیں نے کسی خدا پرست کو ذلیل حالت میں نہیں دیکھا اور نہ اُس کے لڑکوں کو دیکھا کہ

وہ ٹکڑے مانگتے ہوں، گویا متقی کی اولاد کا بھی خدا تعالیٰ ذمہ دار ہوتا ہے، لیکن حدیث میں آیا ہے ظالم اپنے اہل و عیال پر بھی ظلم کرتا ہے، کیونکہ ان پر اس کا بد اثر پڑتا ہے۔

انسانی پیدائش کی غرض عبادت ہے

پس کس قدر ضرورت ہے کہ تم اس بات کو سمجھ لو کہ تمہارے پیدا کرنے سے خدا تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ تم اُس کی عبادت کرو اور اس کے لیے بن جاؤ۔ دُنیا تمہاری مقصود بالذّات نہ ہو۔ مَیں اس لیے بار بار اس ایک امر کو بیان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک یہی ایک بات ہے جس کے لیے انسان آیا ہے اور یہی بات ہے جس سے وہ دُور پڑا ہوا ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ تم دُنیا کے کاروبار چھوڑ دو۔ بیوی بچوں سے الگ ہو کر کسی جنگل یا پہاڑ میں جا بیٹھو۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا اور رہبانیت اسلام کا منشاء نہیں۔ اسلام تو انسان کو چست اور ہوشیار اور مستعد بنانا چاہتا ہے، اس لیے مَیں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے کاروبار کو جدّوجہد سے کرو۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ جس کے پاس زمین ہو اور وُہ اس کا تردّد نہ کرے، تو اس سے مواخذہ ہوگا۔ پس اگر کوئی اس سے یہ مُراد لے کہ دُنیا کے کاروبار سے الگ ہو جائے وُہ غلطی کرتا ہے۔ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کاروبار جو تم کرتے ہو۔ اس میں دیکھ لو کہ خدا تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور اُس کے ارادہ سے باہر نکل کر اپنی اغراض و جذبات کو مقدم نہ کرو۔

پس اگر انسان کی زندگی کا یہ مدّعا ہو جائے کہ وہ صرف تنعّم کی زندگی بسر کرے اور اس کی ساری کامیابیوں کی انتہا خورد و نوش اور لباس و خواب ہی ہو اور خدا تعالیٰ کے لیے کوئی خانہ اُس کے دل میں باقی نہ رہے، تو یاد رکھو کہ ایسا شخص فطرۃ اللہ کا مُقلِب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے قویٰ کو بیکار کرے گا۔ یہ صاف بات ہے کہ جس مطلب کے لیے کوئی چیز ہم لیتے ہیں اگر وہ وہی کام نہ دے، تو اُسے بیکار قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک لکڑی کُرسی یا میز بنانے کے واسطے لیں اور اس کام کے ناقابل ثابت ہو تو ہم اُسے ایندھن ہی بنا لیں گے۔ اسی طرح پر انسان کی پیدائش کی اصل غرض تو عبادتِ الٰہی ہے، لیکن اگر وُہ اپنی فطرت کو خارجی اسباب اور بیرونی تعلقات سے تبدیل کر کے بیکار کر لیتا ہے، تو خدا تعالیٰ اُس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان: ۷۸) مَیں نے ایک بار پہلے بھی بیان کیا تھا کہ مَیں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ ایک جنگل میں کھڑا ہوں۔ شرقاً غرباً اس میں ایک بڑی نالی چلی گئی ہے اس نالی پر بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اور ہر ایک قصاب کے جو ہر ایک بھیڑ پر مسلط ہے، ہاتھ میں چھری ہے۔ جو انہوں نے اُن کی گردن پر رکھی ہوئی ہے اور آسمان کی طرف مُنہ کیا ہوا ہے۔ مَیں اُن کے پاس ٹہل رہا ہوں۔ مَیں نے یہ نظارہ دیکھ کر سمجھا کہ یہ آسمانی حکم کے منتظر ہیں، تو مَیں نے یہی آیت پڑھی قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ۔

یہ سنتے ہی اُن قصابوں نے فی الفور چھریاں چلادیں اور یہ کہا کہ تم ہو کیا؟ آخر گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔
غرض خدا تعالیٰ متقی کی زندگی کی پروا کرتا ہے اور اس کی بقاء کو عزیز رکھتا ہے اور جو اُس کی مرضی کے برخلاف چلے وہ اس کی پروا نہیں کرتا اور اُس کو جہنم میں ڈالتا ہے، اس لیے ہر ایک کو لازم ہے کہ اپنے نفس کو شیطان کی غلامی سے باہر کرے۔ جیسے کلوروفارم نیند لاتا ہے اسی طرح پر شیطان انسان کو تباہ کرتا ہے اور اسے غفلت کی نیند سُلاتا ہے اور اسی میں اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

سُورۃ اَلْعَصْر میں دو سلسلوں کا ذکر

مَیں پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں کہ سورۃ العصر میں دو سلسلوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک ابرار و اخیار کا سلسلہ ہے اور دُوسرا فجار کا۔ کفار اور فجار کے سلسلہ کا ذکر یوں فرمایا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (العصر: ۳) اور دُوسرے سلسلہ کو اس طرح پر الگ کیا۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر: ۴) یعنی ایک وہ ہیں جو خُسران میں ہیں، مگر خسران میں مومن اور عملِ صالح کرنے والے نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خسران میں وہ ہیں جو مومن اور عملِ صالح کرنے والے نہیں ہیں۔ یاد رکھو کہ صلاح کا لفظ وہاں آتا ہے، جہاں فساد کا بالکل نام و نشان نہ رہے۔ انسان کبھی صالح نہیں کہلا سکتا جب تک وہ عقاید ردیہ اور فاسدہ سے خالی نہ ہو اور پھر اعمال بھی فساد سے خالی ہو جائیں۔ متقی کا لفظ بابِ افتعال سے آتا ہے اور یہ باب تصنّع کے لیے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متقی کو بڑا مجاہدہ اور کوشش کرنی پڑتی ہے اور اس حالت میں وہ نفسِ لوّامہ کے نیچے ہوتا ہے اور جب حیوانی زندگی بسر کرتا ہے، اس وقت امّارہ کے نیچے ہوتا ہے اور مجاہدہ کی حالت سے نکل کر جب غالب آجاتا ہے، تو مطمئنّہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ متقی نفسِ امّارہ کی حالت سے نکل کر آتا ہے اور لوّامہ کے نیچے ہوتا ہے۔ اسی لیے متقی کی شان میں آیا ہے کہ وہ نماز کو کھڑی کرتے ہیں۔ گویا اس میں بھی ایک قسم کی لڑائی ہی کی حالت ہوتی ہے۔ وساوس اور اوہام آ آکر حیران کرتے ہیں، مگر وہ گھبراتا نہیں اور یہ وساوس اُس کو درماندہ نہیں کر سکتے۔ وُہ بار بار خدا تعالیٰ کی استعانت چاہتا ہے اور خدا کے حضور چلاتا اور روتا ہے، یہانتک کہ غالب آجاتا ہے۔ ایسا ہی مال کے خرچ کرنے میں بھی شیطان اس کو روکتا ہے اور اسراف اور انفاق فی سبیل اللہ کو یکساں دکھاتا ہے؛ حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسراف کرنے والا اپنے مال کو ضائع کرتا ہے، مگر فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا اس کو پھر پاتا ہے اور خرچ سے زیادہ پاتا ہے۔ اس لیے ہی مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ: ۴) فرمایا ہے۔

صراطِ مستقیم

بات یہ ہے کہ صلاح کی حالت میں انسان کو ضروری ہے کہ ہر ایک قسم کے فساد سے خواہ وہ عقائد کے متعلق ہو یا اعمال کے متعلق، پاک ہو۔ جیسے انسان کا بدن صلاحیت کی حالت اس وقت رکھتا ہے، جبکہ سب اخلاط اعتدال کی حالت پر ہوں اور کوئی کم زیادہ نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی خلط بھی بڑھ جائے، تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پر رُوح کی صلاحیت کا مدار بھی اعتدال پر ہے۔ اسی کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں الصراط المستقیم ہے۔ صلاح کی حالت میں انسان محض خدا کا ہو جاتا ہے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حالت تھی۔ اور رفتہ رفتہ صالح انسان ترقی کرتا ہوا مطمئنّہ کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور یہاں ہی اس کا انشراح صدر ہوتا ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (الم نشرح : ۲) ہم انشراح صدر کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔

انسان کا سینہ بیت اللہ ہے اور دل حجرِ اسود

یہ بات بحضورِ دل یاد رکھو کہ جیسے بیت اللہ میں حجرِ اسود پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح قلب سینہ میں پڑا ہوا ہے۔ بیت اللہ پر بھی ایک زمانہ آیا ہوا تھا کہ کفار نے وہاں بُت رکھ دیئے تھے۔ ممکن تھا کہ بیت اللہ پر یہ زمانہ نہ آتا۔ مگر نہیں اللہ نے اس کو ایک نظیر کے طور پر رکھا قلبِ انسانی بھی حجرِ اسود کی طرح ہے اور اس کا سینہ بیت اللہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ ماسوی اللہ کے خیالات وُہ بُت ہیں جو اس کعبہ میں رکھے گئے ہیں۔ مکہ معظمہ کے بتوں کا قلع قمع اس وقت ہوا تھا جبکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ وہاں جا پڑے تھے اور مکہ فتح ہو گیا تھا۔ ان دس ہزار صحابہ کو پہلی کتابوں میں ملائکہ لکھا ہے اور حقیقت میں ان کی شان ملائکہ ہی کی سی تھی۔ انسانی قویٰ بھی ایک طرح پر ملائکہ ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ جیسے ملائکہ کی یہ شان ہے کہ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (النحل : ۵۱) اسی طرح پر انسانی قویٰ کا خاصہ ہے کہ جو حکم ان کو دیا جائے، اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔ ایسا ہی تمام قویٰ اور جوارح حکمِ انسانی کے نیچے ہیں پس ماسوی اللہ کے بتوں کی شکست اور استیصال کے لیے ضروری ہے کہ اُن پر اسی طرح سے چڑھائی کی جائے۔ یہ لشکر تزکیہ نفس سے تیار ہوتا ہے اور اسی کو فتح دی جاتی ہے جو تزکیہ کرتا ہے؛ چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ (الشمس : ۱۰) حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر قلب کی اصلاح ہو جائے، تو کُل جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور یہ کیسی سچی بات ہے۔ آنکھ۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ زبان وغیرہ جس قدر اعضاء ہیں، وہ دراصل قلب کے ہی فتوے پر عمل کرتے ہیں۔ ایک خیال آتا ہے، پھر وُہ جس عضو کے متعلق ہو وُہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

میری پیروی کرو اور میرے پیچھے چلے آؤ

غرض اس خانہ کو بتوں سے پاک و صاف کرنے کے لیے ایک جہاد کی ضرورت ہے اور اس جہاد کی راہ مَیں تمہیں بتاتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں۔ اگر تم اس پر عمل کرو گے، تو ان بتوں کو توڑ ڈالو گے اور یہ راہ مَیں اپنی خود تراشیدہ نہیں بتاتا۔ بلکہ خدا نے مجھے مامور کیا ہے کہ مَیں بتاؤں۔ اور وُہ راہ کیا ہے؟ میری پیروی کرو

اور میرے پیچھے چلے آؤ۔ یہ آواز نئی آواز نہیں ہے۔ مکہ کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کہا تھا۔ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران : ۳۲) اسی طرح پر اگر تم میری پیروی کرو گے، تو اپنے اندر کے بتوں کو توڑ ڈالنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اور اس طرح پر سینہ کو جو طرح طرح کے بتوں سے بھرا پڑا ہے۔ پاک کرنے کے لائق ہو جاؤ گے۔ تزکیہ نفس کے لیے چلہ کشیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے چلہ کشیاں نہیں کی تھیں۔ ارّہ اور نفی و اثبات وغیرہ کے ذکر نہیں کئے تھے، بلکہ اُن کے پاس ایک اور ہی چیز تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں محو تھے جو نور آپ میں تھا۔ وہ اس اطاعت کی نالی میں سے ہو کر صحابہؓ کے قلب پر گرتا اور ماسوی اللہ کے خیالات کو پاش پاش کرتا جاتا تھا۔ تاریکی کے بجائے اُن سینوں میں نور بھرا جاتا تھا۔ اس وقت بھی خوب یاد رکھو۔ وہی حالت ہے۔ جبتک کہ وہ نور جو خدا کی نالی میں سے آتا ہے تمہارے قلب پر نہیں گرتا۔ تزکیہ نفس نہیں ہو سکتا۔ انسان کا سینہ مَہْبِطُ الانوار ہے اور اسی وجہ سے وہ بیت اللہ کہلاتا ہے۔ بڑا کام یہی ہے کہ اس میں جو بت ہیں، وہ توڑے جائیں۔ اور اللہ ہی اللہ رہ جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَللّٰهُ اَللّٰهُ فِي أَصْحَابِي۔ میرے صحابہؓ کے دلوں میں اللہ ہی اللہ ہے۔ دل میں اللہ ہی اللہ ہونے سے یہ مُراد نہیں کہ انسان وحدتِ وجود کے مسئلہ پر عمل کرے اور ہر کتے اور گدھے کو معاذ اللہ خدا قرار دے بیٹھے۔ نہیں نہیں۔ اس سے اصل غرض یہ ہے کہ انسان کا جو کام ہو۔ اس میں مقصود فی الذّات اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہو نہ کچھ اور۔ اور یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جبتک خدا تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔

بر کریماں کار ہا دشوار نیست۔

قرآن کریم میں علمی اور عملی تکمیل کی ہدایت ہے

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں عملی اور علمی تکمیل کی ہدایت ہے، چنانچہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ (الفاتحہ : ۶) میں تکمیلِ علمی کی طرف اشارہ ہے اور تکمیلِ عملی کا بیان صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ : ۷) میں فرمایا کہ جو نتائج اکمل اور اَتم ہیں، وہ حاصل ہو جائیں۔ جیسے ایک پودا جو لگایا گیا ہے۔ جبتک پورا نشوونما حاصل نہ کرے، اس کو پھل پھول نہیں لگ سکتے۔ اسی طرح اگر کسی ہدایت کے اعلیٰ اور اکمل نتائج موجود نہیں ہیں۔ وہ ہدایت مُردہ ہدایت ہے، جس کے اندر کوئی نشوونما کی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ جیسے اگر کسی کو وید کی ہدایت پر پورا عمل کرنے سے کبھی یہ امید نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمیشہ کی مکتی یا نجات حاصل کرے گا اور کیڑے مکوڑے بننے کی حالت سے نکل کر دائمی سرور پائے گا، تو اس ہدایت سے کیا حاصل، مگر قرآن شریف ایک ایسی ہدایت ہے کہ اس پر عمل کرنے والا اعلیٰ درجہ کے کمالات حاصل کر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ سے اس کا ایک سچا تعلق پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے اعمالِ صالحہ جو قرآنی ہدایتوں کے موافق کیے جاتے ہیں۔ وہ ایک شجرِ طیب کی مثال جو قرآن شریف

یں دی گئی ہے۔ بڑھتے ہیں اور پھل پھول لاتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی حلاوت اور ذائقہ اُن میں پیدا ہوتا ہے پس اگر کوئی شخص اپنے ایمان میں نشوونما کا مادّہ نہیں رکھتا، بلکہ اس کا ایمان مُردہ ہے، تو اس پر اعمالِ صالحہ کے طیّب اشجار کے بارور ہونے کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحۃ: ۷) کہہ کر ایک قید لگا دی ہے۔ یعنی یہ راہ کوئی بے ثمر اور حیران اور سرگردان کرنے والی نہیں ہے، بلکہ اس پر چل کر انسان بامُراد اور کامیاب ہوتا ہے اور عبادت کے لیے تکمیلِ عملی ضروری شے ہے؛ ورنہ وہ محض ایک کھیل ہوگا، کیونکہ درخت اگر پھل نہ دے، خواہ وہ کتنا ہی اُونچا کیوں نہ ہو۔ مفید نہیں ہو سکتا۔

مامور من اللہ کے مخالفوں کا ایمان سلب ہو جاتا ہے

ہمارے مخالفوں کی حالت ایسی ہے جس سے سلبِ ایمان کا اندیشہ ہے۔

کیونکہ وہ نیک کو بُرا اور مامور من اللہ کو کذّاب سمجھتے ہیں جس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اور اب یہ صاف امر ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے مامور اور مسیح موعود کے نام سے دُنیا میں بھیجا ہے جو لوگ میری مخالفت کرنے والے ہیں وہ میری نہیں خدا تعالیٰ کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ جب تک میں نے دعویٰ نہ کیا تھا۔ بہت سے اُن میں سے مجھے عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنے ہاتھ سے لوٹا لیکر وضو کرانے کو ثواب اور فخر جانتے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے جو میری بیعت میں آنے کے لیے زور دیتے تھے لیکن جب خدا تعالیٰ کے نام اور اعلام سے یہ سلسلہ شروع ہوا، تو وہی مخالفت کے لیے اُٹھے۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اُن کی ذاتی عداوت میرے ساتھ نہ تھی، بلکہ عداوت اُن کو خدا تعالیٰ سے ہی تھی۔ اگر خدا تعالیٰ کے ساتھ اُن کو سچا تعلق تھا، تو اُن کی دینداری اور اتّقاء اور خداترسی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ سب سے اوّل وہ میرے اس اعلان پر لبّیک کہتے اور سجداتِ شکر کرتے ہوتے میرے ساتھ مصافحہ کرتے، مگر نہیں۔ وہ اپنے ہتھیاروں کو لے کر نکل کھڑے ہوتے اور انھوں نے مخالفت کو یہاں تک پہنچایا کہ مجھے کافر کہا اور بے دین کہا۔ دجّال کہا۔ افسوس! اِن احمقوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ جو شخص خدا تعالیٰ سے قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ تَوْحِيْدِيْ وَتَفْرِيْدِيْ کی آوازیں سُنتا ہو۔ وہ اُن کی بدگوئی اور گالیوں کی کیا پرواہ کر سکتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان نادانوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ کفر اور ایمان کا تعلق دُنیا سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اور خدا تعالیٰ میرے مومن اور مامور ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر ان بیہودگیوں کی مجھے پرواہ کیا ہو سکتی ہے؟

غرض ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ لوگ میرے مخالف نہ تھے بلکہ خدا تعالیٰ کی باتوں کی انہوں نے مخالفت کی اور یہی وجہ ہے جس سے مامور من اللہ کے مخالفوں کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اب یہ صاف ثابت ہے کہ میرے مخالف خدا تعالیٰ سے مخالفت کر رہے ہیں۔ میں اگر روشنی کی طرف آ رہا ہوں اور یہ یقینی امر ہے کہ

میں روشنی کی طرف آتا ہوں، کیونکہ خدا تعالیٰ کے بے شمار نشان میری تائید میں ظاہر ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ بارش کی طرح یہ نشان آسمان سے اُتر رہے ہیں۔ تو پھر یہ بھی یقینی امر ہے کہ میرے مخالف تاریکی کی طرف جاتے ہیں۔ روشنی اور نور رُوح القدس کو لاتا ہے اور تاریکی شیطان کی قربت پیدا کرتی ہے اور اس طرح پر دل کی مخالفت سلب ایمان کر دیتی ہے اور بِئسَ الْقَرِین سے جا ملاتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اصلاح تب ہوتی ہے کہ تکمیلِ عملی کے مراتب حاصل ہو جائیں پس سورۃ العصر میں جو اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فرمایا ہے۔ اس میں اٰمَنُوْا سے تکمیلِ علمی کی طرف ارشاد فرمایا۔ اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے تکمیلِ عملی کی طرف رہبری کی۔ حکمت کے بھی دو ہی حصے ہیں۔ ایک علم اکمل اور اتم ہو۔ دُوسرے عمل اتم اور اکمل ہو۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ خسر سے محفوظ رہتے ہیں۔ اوّل وہ تکمیلِ علمی کرتے ہیں اور پھر عمل بھی گندے نہیں کرتے بلکہ علمی تکمیل کو عملی تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور پھر یہ کہ جب انہیں کامل بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور ان کے کمالِ علم کا ثبوت کمالِ عمل سے ملتا ہے، تو پھر وہ بُخل نہیں کرتے، بلکہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ پر عمل کرتے ہیں۔ لوگوں کو بھی اس حق کی دعوت کرتے ہیں، جو انہوں نے پایا ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اعمال کی روشنی بھی دکھاتے ہیں۔ واعظ اگر خود عمل نہیں کرتا، تو اس کی باتوں کا کچھ بھی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ بھی قاعدہ کی بات ہے کہ اگر خود آدمی کہے اور کرے نہیں، تو اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اگر زناکار زنا سے منع کرے، تو اُس کی اِس حالت کے ثابت ہو جانے پر سُننے والوں کے دہریہ ہو جانیکا اندیشہ ہے، کیونکہ وہ خیال کریں گے کہ اگر زناکاری واقعی خطرناک چیز ہوتی اور خدا تعالیٰ کے حضور اس ناپاکی پر سزا ملتی اور خدا واقعی ہوتا، تو پھر یہ جو منع کرتا تھا، خود کیوں اس سے پرہیز نہ کرتا۔

مجھے معلوم ہے کہ ایک شخص ایک مولوی کی صحبت کے باعث مُسلمان ہونے لگا۔ ایک روز اُس نے دیکھا کہ وہی مولوی شراب پی رہا تھا، تو اس کا دل سخت ہو گیا اور وُہ رُک گیا۔ غرض تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ میں یہ فرمایا کہ وُہ اپنے اعمال کی روشنی سے دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اور پھر ان کا یہ شیوہ ہوتا ہے تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ یعنی صبر کے ساتھ وعظ و نصیحت کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔ جلدی جھاگ مُنہ پر نہیں لاتے۔ اگر کوئی مولوی اور پیش رو ہو کر، امام اور رہنما بن کر جلدی بھڑک اُٹھتا ہے اور اس میں برداشت اور صبر کی طاقت نہیں تو وہ لوگوں کو کیوں نقصان پہنچاتا ہے؟ دُوسرے یہ بھی مطلب ہے کہ جو باتیں سننے والا صبر سے نہ سُنے، وہ فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ ہمارے مخالف بُردباری کا دِل لے کر نہیں آتے اور صبر سے اپنی مشکلات پیش نہیں کرتے، بلکہ اُن کا تو یہ حال ہے کہ وہ کتاب تک تو دیکھنا نہیں چاہتے اور شور مچا کر حق کو ملتبس کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ پھر وُہ فائدہ اٹھائیں تو کیونکر

اُٹھائیں۔ ابوجہل اور ابولہب میں کیا تھا؟ یہی بے صبری اور بیقراری تو تھی۔ کہتے تھے کہ تُو خدا کی طرف سے آیا ہے، تو کوئی نہر لے آ۔ ان کم بختوں نے صبر نہ کیا اور ہلاک ہوگئے؛ ورنہ زبیدہ والی نہر تو آ ہی گئی۔ اسی طرح پر ہمارے مخالف بھی کہتے ہیں کہ ہمارے لیے دُعا کرو اور وہ معًا قبول ہو جائے اور پھر اس کو حق و باطل کا معیار ٹھہراتے ہیں اور اپنی طرف سے بعض اُمور پیش کر کے کہتے ہیں کہ یہ ہو جائے اور وُہ ہو جائے تو مان لیں گے لیکن آپ کسی شرط کے نیچے نہیں آتے۔ افسوس یہی لوگ ہیں جو لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (الشمس ۱۶) کے مصداق ہیں۔ یاد رکھو صابر ہی شرح صدر کا رتبہ پاتا ہے۔ جو صبر نہیں کرتا، وُہ گویا خدا پر حکومت کرتا ہے۔ خود اس کی حکومت میں رہنا نہیں چاہتا۔ ایسا گستاخ اور دلیر جو خدا تعالیٰ کے جلال اور عظمت سے نہیں ڈرتا وہ محروم کر دیا جاتا ہے اور اُسے کاٹ دیا جاتا ہے۔

صُحبتِ صادقین

پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ صبر کی حقیقت میں سے یہ بھی ضروری بات ہے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ ۱۱۹) صادقوں کی صُحبت میں رہنا ضروری ہے۔

بہت سے لوگ ہیں جو دُور بیٹھے رہتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ کبھی آئیں گے، اس وقت فرصت نہیں ہے۔ بھلا تیرہ سو سال کے موعود سلسلہ کو جو لوگ پالیں اور اُس کی نصرت میں شامل نہ ہوں اور خدا اور رسُولؐ کے موعود کے پاس نہ بیٹھیں، وہ فلاح پا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ؎

ہم خدا خواہی و ہم دُنیائے دوں — ایں خیال است و محال است و جنوں

دین تو چاہتا ہے کہ مصاحبت ہو۔ پھر مصاحبت سے گریز ہو تو دینداری کے حصُول کی اُمید کیوں رکھتا ہے؟

ہم نے بارہا اپنے دوستوں کو نصیحت کی ہے اور پھر کہتے ہیں کہ وہ بار بار یہاں آکر رہیں اور فائدہ اٹھائیں مگر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ لوگ ہاتھ میں ہاتھ دے کر دین کو دُنیا پر مقدم کر لیتے ہیں، مگر اس کی پروا کچھ نہیں کرتے۔ یاد رکھو قبریں آوازیں دے رہی ہیں اور موت ہر وقت قریب ہوتی جاتی ہے۔ ہر ایک سانس تمہیں موت کے قریب کرتا جاتا ہے اور تم اُسے فرصت کی گھڑیاں سمجھتے جاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ سے مکر کرنا مومن کا کام نہیں ہے۔ جب موت کا وقت آگیا پھر ساعت آگے پیچھے نہ ہوگی۔ وہ لوگ جو اس سلسلہ کی قدر نہیں کرتے اور انہیں کوئی عظمت اس کی معلوم ہی نہیں انکو جانے دو۔ مگر ان سب سے بڑھ کر بدقسمت اور اپنی جان پر ظلم کرنے والا تو وُہ ہے جس نے اس سلسلہ کو شناخت کیا اور اُس میں شامل ہونے کی فکر کی۔ لیکن اُس نے کچھ قدر نہ کی۔ وہ لوگ جو یہاں آکر میرے پاس کثرت سے نہیں رہتے اور اُن باتوں سے جو خدا تعالیٰ ہر روز اپنے سلسلہ کی تائید میں ظاہر کرتا ہے نہیں سُنتے اور دیکھتے۔ وہ اپنی جگہ پر کیسے ہی نیک اور متقی اور پرہیزگار ہوں۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ جیسا چاہیے۔ انہوں نے قدر نہیں کی۔ مَیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تکمیلِ علمی کے بعد تکمیلِ عملی کی ضرورت ہے۔ پس تکمیلِ عملی بدوں تکمیلِ علمی کے مُحال ہے اور جب تک یہاں آکر نہیں رہتے۔ تکمیلِ علمی مشکل ہے۔ بارہا خطوط آتے ہیں کہ فلاں شخص نے اعتراض کیا اور ہم

ہم جواب نہ دے سکے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ وہ لوگ یہاں نہیں آتے اور اُن باتوں کو نہیں سُنتے جو خدا تعالیٰ اپنے سلسلہ کی تائید میں علمی طور پر ظاہر کر رہا ہے۔

پس اگر تم واقعی اس سلسلہ کو شناخت کرتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو اور دین کو دُنیا پر مقدم کرنے کا سچا وعدہ کرتے ہو، تو مَیں پُوچھتا ہوں کہ اس پر عمل کیا ہوتا ہے کیا کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ ۱۱۹) کا حکم منسوخ ہو چکا ہے؟ اگر تم واقعی ایمان لاتے ہو اور سچی خوش قسمتی یہی ہے، تو اللہ تعالیٰ کو مقدم کرو۔ اگر ان باتوں کو ردّی اور فضول سمجھو گے، تو یاد رکھو خدا تعالیٰ سے ہنسی کرنے والے ٹھہرو گے۔

سُورۃ فاتحہ میں قرآنِ کریم کے تمام معارف درج ہیں

سورۃ فاتحہ پر جو قرآن شریف کا باریک نقشہ ہے اور اُمّ الکتاب بھی جس کا نام ہے خوب غور کرو کہ اس میں اجمال کے ساتھ قرآنِ کریم کے تمام معارف درج ہیں؛ چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے اس کو شروع کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام محامد اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اس میں یہ تعلیم ہے کہ تمام منافع اور تمدّنی زندگی کی ساری بہبودگیاں اللہ ہی کی طرف سے آتی ہیں، کیونکہ ہر قسم کی ستائش کا سزاوار جبکہ وہی ہے، تو مُعطیٔ حقیقی بھی وہی ہو سکتا ہے؛ ورنہ لازم آئے گا کہ کسی قسم کی تعریف و ستائش کا مستحق بھی وہ نہیں ہے، جو کفر کی بات ہے۔ پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں کیسی توحید کی جامع تعلیم پائی جاتی ہے، جو انسان کو دُنیا کی تمام چیزوں کی عبُودیت اور بالذّات نفع رساں نہ ہونے کی طرف لے جاتی ہے اور واضح اور بیّن طور پر یہ ذہن نشین کرتی ہے کہ ہر نفع اور سُود حقیقی اور ذاتی طور پر خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے۔ کیونکہ تمام محامد اسی کے لیے سزاوار ہیں۔ پس ہر نفع اور سُود میں خدا تعالیٰ ہی کو مقدم کرو۔ اس کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے اگر خلاف ہو تو اولاد بھی دشمن ہو سکتی ہے۔ اور ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اُمّہات الصّفات

پھر اسی سُورۃ فاتحہ میں خدا کا نقشہ دکھایا گیا ہے، جو قرآن کریم منوانا چاہتا ہے اور جس کو وہ دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی چار صفات کو ترتیب وار بیان کیا ہے جو اُمّہات الصّفات کہلاتی ہیں۔ جیسے سُورۃ فاتحہ اُمّ الکتاب ہے، ویسے ہی جو صفات اللہ تعالیٰ کی اس میں بیان کی گئی ہیں۔ وُہ بھی اُمّ الصّفات ہی ہیں اور وُہ یہ ہیں...... رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، الرَّحْمٰنِ، الرَّحِیْمِ، مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ ان صفاتِ اربعہ پر غور کرنے سے خدا تعالیٰ کا گویا چہرہ نظر آ جاتا ہے۔ ربوبیّت کا فیضان بہت ہی وسیع اور عام ہے اور اس میں کُل مخلوق کی کُل حالتوں تربیت اور اس کی تکمیل کے تکفّل کی طرف اشارہ ہے۔ غور تو کرو۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی رُبوبیّت پر سوچتا ہے، تو اس کی امید کس قدر وسیع ہو جاتی ہے اور پھر رحمانیّت یہ ہے کہ بدُوں کسی عملِ عامل کے اُن اسباب کو مہیّا کرتا ہے

جو بقا تے وجود کے لیے ضروری ہیں۔ دیکھو چاند، سُورج، ہوا، پانی وغیرہ بدُوں ہماری دُعا اور التجا کے اور بغیر ہمارے کسی عمل اور فعل کے اس نے ہمارے وجُود کے بقا کے لیے کام میں لگا رکھے ہیں اور پھر رحیمیت یہ ہے کہ اعمال کو ضائع نہ کرے اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ کا تقاضا یہ ہے کہ بامراد کر دے۔ جیسے ایک شخص امتحان کے لیے بہت محنت سے تیاری کرتا ہے، مگر امتحان میں دو چار نمبروں کی کمی رہ جاتی ہے، تو دُنیوی نظام اور سلسلہ میں تو اس کا لحاظ نہیں کرتے اور اس کو گرا دیتے ہیں، مگر خدا تعالیٰ کی رحیمیت اس کی پردہ پوشی فرماتی ہے اور اس کو پاس کرا دیتی ہے۔ رحیمیت میں ایک قسم کی پردہ پوشی بھی ہوتی ہے۔ عیسائیوں کا خدا ذرّہ بھی پردہ پوش نہیں ہے؛ ورنہ کفارہ کی کیا ضرورت رہتی؟ ایسا ہی آریوں کا خدا نہ ربّ ہے نہ رحمان، کیونکہ وہ تو بلا مُزد اور بلا عمل کچھ بھی کسی کو عطا نہیں کر سکتا۔ یہانتک کہ ویدوں کے اصول کے موافق گناہ کرنا بھی ضروری معلوم دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو اگر کسی اُس کے عمل کے معاوضہ میں گائے کا دُودھ دینا مطلوب ہے، تو بالمقابل یہ بھی ضرور ہے کہ کوئی برہمنی (اگر یہ روایت صحیح ہو) زنا کرے تاکہ اس فسق و فحش کے بدلہ میں وہ گائے کی جون میں جائے اور اس عامل کو دُودھ پلائے، خواہ وہ اس کا خاوند ہی کیوں نہ ہو۔ غرض جبتک ایسا سلسلہ نہ ہوگا، کوئی عامل اپنے عمل کی جزا ویدک ایشر کے خزانہ سے پا نہیں سکتا، کیونکہ اس کا سارا سلسلہ جوڑ توڑ ہی سے چلتا ہے۔

مگر اسلام نے وُہ خدا پیش کیا ہے جو جمیع محامد کا سزاوار ہے اس لیے مُعطی حقیقی ہے وُہ رحمٰن ہے بدُوں عمل عامل کے اپنا فضل کرتا ہے۔ پھر مالکیتِ یوم الدین جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، بامُراد کرتی ہے۔ دُنیا کی گورنمنٹ کبھی اس امر کا ٹھیکہ نہیں لے سکتی کہ ہر ایک بی اے پاس کرنے والے کو ضرور نوکری دے گی، مگر خدا تعالیٰ کی گورنمنٹ، کامل گورنمنٹ اور لا انتہا خزائن کی مالک ہے۔ اس کے حضور کوئی کمی نہیں۔ کوئی عمل کرنے والا ہو۔ وہ سب کو فائز المرام کرتا ہے اور نیکیوں اور حسنات کے مقابلہ میں بعض ضعفوں اور سقموں کی پردہ پوشی بھی فرماتا ہے۔ وہ توّاب بھی ہے ستّی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہزار ہا عیب اپنے بندوں کے معلوم ہوتے ہیں، مگر ظاہر نہیں کرتا۔ ہاں ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ بیباک ہو کر انسان اپنے عیبوں میں ترقی پر ترقی کرتا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی حیا اور پردہ پوشی سے نفع نہیں اُٹھاتا، بلکہ دہریّت کی رگ اس میں زور پکڑ جاتی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ کی غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اس بیباک کو چھوڑا جائے، اس لیے وہ ذلیل کیا جاتا ہے۔ مولوی عبد اللہ صاحب غزنوی کو محمد حسین کی نسبت الہام ہوا کہ اس میں کوئی عیب ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ ظاہر کر دیں، مگر انہوں نے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی حیا مانع ہے۔ پھر انہوں نے اس کی نسبت ایک رؤیا میں دیکھا کہ اس کے کپڑے پھٹ گئے ہیں؛ چنانچہ اب وہ رؤیا پوری ہو گئی۔

غرض میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ رحیمیت میں ایک خاصہ پردہ پوشی کا بھی ہے، مگر اس پردہ پوشی سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی عمل ہو اور اس عمل کے متعلق اگر کوئی کمی یا نقص رہ جائے، تو اللہ تعالیٰ اپنی رحیمیت

سے اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ رحمانیت اور رحیمیت میں فرق یہ ہے کہ رحمانیت میں فعل اور عمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا، مگر رحیمیت میں فعل و عمل کو دخل ہے لیکن کمزوری بھی ساتھ ہی ہے۔ خدا کا رحم چاہتا ہے کہ پردہ پوشی کرے۔ اسی طرح مالکِ یوم الدین وہ ہے کہ اصل مقصد کو پُورا کرے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ اُمّہات الصفات رُوحانی طور پر خدا نما تصویر ہیں۔ ان پر غور کرتے ہی معاً خدا سامنے ہو جاتا ہے اور رُوح ایک لذّت کے ساتھ اُچھل کر اُس کے سامنے سربسجود ہو جاتی ہے؛ چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے جو شروع کیا گیا تھا، تو غائب کی صُورت میں ذکر کیا ہے، لیکن ان صفاتِ اربعہ کے بیان کے بعد معاً صُورتِ بیان تبدیل ہو گئی ہے، کیونکہ ان صفات نے خدا کو سامنے حاضر کر دیا ہے۔ اس لیے حق تھا اور فصاحت کا تقاضہ تھا کہ اب غائب نہ رہے بلکہ حاضر کی صورت اختیار کی جائے۔ پس اس دائرہ کی تکمیل کے تقاضہ نے مخاطب کی طرف مُنہ پھیرا اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (الفاتحہ: ۵) کہا یاد رکھنا چاہیے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ہاں اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں ایک قسم کا تقدّم زمانی ہے کیونکہ جس حال میں محض اپنی رحمانیت سے بغیر ہماری دُعا اور درخواست کے ہمیں انسان بنایا اور انواع و اقسام کی قوتیں اور نعمتیں عطا فرمائیں، اسوقت ہماری دُعا نہ تھی بلکہ محض اس کا فضل ہمارے شاملِ حال تھا اور یہی تقدّم ہے۔

رحمانیّت اور رحیمیّت

مَیں پھر بیان کرتا ہوں اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رحم دو قسم کا ہوتا ہے۔ اوّل رحمانیّت اور دُوسرا رحیمیّت کے نام سے موسوم ہے۔ رحمانیّت تو ایسا فیضان ہے کہ جو ہمارے وجُود اور ہستی سے بھی پہلے شروع ہوا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہمارے وجُود سے بیشتر ہی زمین و آسمان، چاند و سُورج اور دیگر اشیاء ارضی و سماوی پیدا کی ہیں، جو سب کی سب ہمارے کام آنیوالی ہیں اور کام آتی ہیں۔ دُوسرے حیوانات بھی اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر وُہ جبکہ بجائے خود انسان ہی کے لیے مفید ہیں اور انسان ہی کے کام آتے ہیں۔ تو گویا مجموعی طور پر انسان ہی اُن سب سے فائدہ اُٹھانے والا ٹھہرا۔ دیکھو جسمانی اُمور میں کیسی اعلیٰ درجہ کی غذائیں کھاتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا گوشت انسان کے لیے ہے۔ ٹکڑے اور ہڈیاں کتّوں کے واسطے۔ جسمانی طور پر تو کسی حد تک حیوان بھی شریک ہیں، مگر رُوحانی لذّات میں جانور شریک نہیں ہیں۔ پس یہ دو قسم کی رحمتیں ہیں۔ ایک وُہ جو ہمارے وجود سے پہلے ہی عطا ہوئی ہیں اور دُوسری وُہ جو رحیمیّت کی شان کے نمونے ہیں اور وُہ دُعا کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اُن میں ایک فعل کی ضرورت ہوتی ہے۔

دُعا اور قانُونِ قدرت کا باہمی تعلق

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کو بیان کر دیا جائے کہ قانُونِ قدرت میں ہمیشہ دُعا کا تعلق ہے۔

آجکل کے نیچری طبع لوگ جو علومِ حقہ سے محض بے خبر اور ناواقف ہیں اور اُن کی ساری تگ و دَو کا نتیجہ یورپ کے طرزِ معاشرت کی نقل اُتارنا ہے، دُعا کو ایک بدعت سمجھتے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دُعا کے تعلق پر

کچھ مختصر سی بحث کی جائے۔

دیکھو ایک بچہ بھوک سے بیتاب اور بیقرار ہو کر دُودھ کے لیے چلّاتا ہے اور چیختا ہے، تو ماں کی پستان میں دُودھ جوش مار کر آجاتا ہے، حالانکہ بچہ تو دُعا کا نام بھی نہیں جانتا، لیکن یہ کیا سبب ہے کہ اُس کی چیخیں دُودھ کو جذب کر لیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ عموماً ہر ایک صاحب کو اس کا تجربہ ہے۔ بعض اوقات ایسا دیکھا گیا ہے کہ مائیں اپنی چھاتیوں میں دُودھ کو محسوس بھی نہیں کرتی ہیں اور بسا اوقات ہوتا بھی نہیں، لیکن جونہی بچہ کی دردناک چیخ کان میں پہنچی، فوراً دُودھ اُتر آیا ہے۔ جیسے بچے کی ان چیخوں کو دُودھ کے جذب اور کشش کے ساتھ ایک علاقہ ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری چلّاہٹ ایسی ہی اضطراری ہو تو وہ اُس کے فضل اور رحمت کو جوش دلاتی ہے اور اس کو کھینچ لاتی ہے اور میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ خدا کے فضل اور رحمت کو جو قبولیتِ دُعا کی صُورت میں آتا ہے، میں نے اپنی طرف کھینچتے ہوئے محسوس کیا ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دیکھا ہے۔ ہاں آج کل کے زمانہ کے تاریک دماغ فلاسفر اس کو محسوس نہ کر سکیں یا نہ دیکھ سکیں تو یہ صداقت دُنیا سے اُٹھ نہیں سکتی اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ میں قبولیتِ دُعا کا نمونہ دکھانے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔

تو غرض یہ ہے کہ قانونِ قدرت میں قبولیتِ دُعا کی نظیریں موجود ہیں اور ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ زندہ نمونے بھیجتا ہے۔ اسی لیے اس نے اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ (الفاتحۃ: ۶، ۷) کی دُعا تعلیم فرمائی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا منشاء اور قانون ہے اور کوئی نہیں جو اس کو بدل سکے۔ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ کی دُعا سے پایا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال کو اکمل اور اَتم کر۔ ان الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر تو اشارۃ النّص کے طور پر اس سے دُعا کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت مانگنے کی تعلیم ہے، لیکن اس کے سر پر اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ (الفاتحۃ: ۵) بتا رہا ہے کہ اس سے فائدہ اُٹھائیں یعنی صراطِ مستقیم کے منازل کے لیے قوائے سلیم سے کام لے کر استعانتِ الٰہی کو مانگنا چاہیے۔ پس ظاہری اسباب کی رعایت ضروری ہے۔ جو اس کو چھوڑتا ہے، وہ کافرِ نعمت ہے۔ دیکھو! یہ زبان جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور عروق و اعصاب سے اس کو بنایا ہے۔ اگر ایسی نہ ہوتی، تو ہم بول نہ سکتے۔ ایسی زبان دُعا کے لیے عطا کی جو قلب کے خیالات اور ارادوں کو ظاہر کر سکے (اگر ہم دُعا کا کام زبان سے کبھی نہ لیں، تو ہماری شور بختی ہے۔ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر وہ زبان کو لگ جائیں، تو وہ یکدفعہ ہی کام چھوڑ بیٹھتی ہے) یہ رحیمیت ہے۔ ایسا ہی قلب میں خشوع و خضوع کی حالت رکھی اور سوچنے اور تفکر کی قوتیں ودیعت کی ہیں پس یاد رکھو۔ اگر ہم ان قوتوں اور طاقتوں کو معطل چھوڑ کر دُعا کرتے ہیں، تو یہ دُعا کچھ بھی مفید اور کارگر نہ ہوگی۔ کیونکہ جب پہلے عطیہ سے کچھ کام نہیں لیا، تو دُوسرے سے کیا نفع اٹھائیں گے، اس لیے اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ سے پہلے اِيَّاكَ نَعۡبُدُ بتا رہا ہے کہ ہم نے

تیرے پہلے عطیوں اور قوتوں کو بیکار اور برباد نہیں کیا۔ یاد رکھو! رحمانیت کا خاصہ یہی ہے کہ وہ رحیمیت سے فیض اُٹھانے کے قابل بنا دے، اس لیے خدا تعالیٰ نے جو اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن : ۶۱) فرمایا یہ نری لفاظی نہیں ہے، بلکہ انسانی شرف اسی کا متقاضی ہے۔ مانگنا انسانی خاصہ ہے اور جو استجابت جو اللہ تعالیٰ کا نہیں وہ ظالم ہے۔ دُعا ایک ایسی سُرور بخش کیفیت ہے کہ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں کن الفاظ میں اس لذت اور سُرور کو دُنیا کو سمجھاؤں۔ یہ تو محسوس کرنے سے ہی پتہ لگے گا۔ مختصر یہ کہ دُعا کے لوازمات سے اوّل ضروری یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ اور اعتقاد پیدا کریں۔ کیونکہ جو شخص اپنے اعتقادات کو دُرست نہیں کرتا اور اعمالِ صالحہ سے کام نہیں لیتا اور دُعا کرتا ہے، وہ گویا خدا تعالیٰ کی آزمائش کرتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعا میں یہ مقصود ہے کہ ہمارے اعمال کو اکمل اور اَتم کر اور پھر یہ کہہ کر کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور بھی صراحت کر دی کہ ہم اس صراط کی ہدایت چاہتے ہیں جو منعم علیہ گروہ کی راہ ہے اور مغضوب گروہ کی راہ سے بچا۔ جن پر بداعمالیوں کی وجہ سے عذابِ الٰہی آ گیا اور الضَّآلِّيْنَ کہہ کر یہ دُعا تعلیم کی کہ اس سے بھی محفوظ رکھ کہ تیری حمایت کے بدوں بھٹکتے پھریں۔

ایک اور بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس جگہ لف ونشرِ مرتب ہے۔ اوّل اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہ اللہ مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ۔ ہر ایک خوبی کو اپنے اندر رکھنے والا اور ہر ایک عیب اور نقص سے منزہ ہے۔ دوم رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ سوم اَلرَّحْمٰنِ۔ چہارم اَلرَّحِيْمِ۔ پنجم مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اب اس کے بعد جو دَرخواستیں ہیں وہ ان پانچوں کے ماتحت ہیں۔ اب سلسلہ یُوں شروع ہوتا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ یہ فقرہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے مقابل ہے یعنی اے اللہ تُو جو ساری صفاتِ حمیدہ کا جامع ہے اور تمام بدیوں سے منزہ ہے۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ مسلمان اس خدا کو جانتا ہے، جس میں وہ تمام خُوبیاں جو انسانی ذہن میں آسکتی ہیں موجود ہیں اور اس سے بالاتر اور اَرفع ہے۔ کیونکہ یہ سچی بات ہے کہ انسانی عقل اور فکر اور ذہن خدا تعالیٰ کی ذات کا احاطہ ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے۔ ہاں تو مسلمان ایسے کامل الصفات خدا کو مانتا ہے کہ تمام قومیں مجلسوں میں اپنے خدا کا ذکر کرتے ہوئے شرمندہ ہو جاتی ہیں اور اُنہیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

ہندوؤں کے نزدیک خدا کا تصوّر

مثلاً ہندوؤں کا خدا جو اُنھوں نے مانا ہے اور کہا ہے کہ وید وں سے ایسے خدا ہی کا پتہ لگتا ہے۔ جب اُس کی نسبت وُہ یہ ذکر کریں گے کہ اُس نے دُنیا کا ایک ذرّہ بھی پیدا نہیں کیا اور نہ اس نے رُوحوں کو پیدا کیا ہے، تو کیا ایسے خدا کے ماننے والے کے لیے کوئی مفر رہ سکتا ہے۔ جب اُسے کہا جائے کہ ایسا خدا اگر مر جائے، تو کیا حرج ہے، کیونکہ جب یہ اشیاء اپنا وجود مستقل رکھتی ہیں اور قائم بالذات ہیں۔ پھر خدا کی زندگی کی اُنکی زندگی اور بقا کے لیے کیا ضرورت

ہے۔ جیسے ایک شخص اگر تیر چلائے اور وُہ تیر ابھی جا ہی رہا ہو کہ اُس شخص کا دم نکل جائے، تو بتاؤ اس تیر کی حالت میں کیا فرق آئے گا۔ ہاتھ سے نکلنے کے بعد وہ چلانے والے کے وجود کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح پر ہندوؤں کے خدا کے لیے اگر یہ تجویز کیا جائے کہ وُہ ایک وقت مر جاوے، تو کوئی ہندو اُس کی موت کا نقصان نہیں بتا سکتا۔ مگر ہم خدا کے لیے ایسا تجویز نہیں کر سکتے، کیونکہ اللہ کے لفظ ہی سے پایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی نقص اور بدی نہ ہو۔ ایسا ہی جبکہ آریہ مانتا ہے کہ اجسام اور رُوحیں انادی ہیں یعنی ہمیشہ سے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ جب تمہارا یہ اعتقاد ہے پھر خدا کی ہستی کا ثبوت ہی کیا دے سکتے ہو؟ اگر کہو کہ اس نے جوڑا جاڑا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ جب تم پر مانو اور پرکرتی کو قدیم سے مانتے ہو اور ان کے وجُود کو قائم بالذّات کہتے ہو، تو پھر جوڑنا جاڑنا، تو اَدنیٰ فعل ہے۔ وہ خود بھی سکتے ہیں اور ایسا ہی جب وُہ یہ تعلیم بتاتے ہیں کہ خدا نے وید میں مثلاً یہ حکم دیا ہے کہ اگر کسی عورت کے ہاں اپنے خاوند سے بچہ پیدا نہ ہو سکتا ہو، تو وہ کسی دُوسرے سے ہمبستر ہو کر اولاد پیدا کرے، تو بتاؤ ایسے خدا کی نسبت کیا کہا جائے گا؟ یا مثلاً یہ تعلیم پیش کی جائے کہ خدا کسی اپنے پریمی اور بھگت کو ہمیشہ کے لیئے مکتی یعنی نجات نہیں دے سکتا بلکہ مہاپرلے کے وقت اس کو ضروری ہوتا ہے کہ مکتی یافتہ انسانوں کو پھر اُسی تناسخ کے چکر میں ڈالے یا مثلاً خدا کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کسی کو اپنے فضل وکرم سے کچھ بھی عطا نہیں کر سکتا، بلکہ ہر ایک شخص کو وہی ملتا ہے جو اُس کے اعمال کے نتائج ہیں پھر ایسے خدا کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ غرض ایسا خدا ماننے والے کو سخت شرمندہ ہونا پڑے گا۔

عیسائیوں کے نزدیک خدا کا تصوّر

ایسا ہی عیسائی بھی جب یہ پیش کریں گے کہ ہمارا خدا یسُوع ہے اور پھر اُس کی نسبت وہ یہ بیان کریں گے کہ یہودیوں کے ہاتھوں سے اُس نے ماریں کھائیں۔ شیطان اُسے آزماتا رہا۔ بُھوک اور پیاس کا اثر اس پر ہوتا رہا۔ آخر ناکامی کی حالت میں پھانسی پر چڑھایا گیا۔ تو کون دانشمند ہوگا جو ایسے خدا کے ماننے کے لیے تیار ہوگا۔ غرض اسی طرح پر تمام قومیں اپنے مانے ہوئے خدا کا ذکر کرتی ہوئی شرمندہ ہو جاتی ہیں، مگر مسلمان کبھی اپنے خدا کا ذکر کرتے ہوئے کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہوتا، کیونکہ جو خُوبی اور عمدہ صفت ہے، وہ اُن کے مانے ہوئے خدا میں موجود اور جو نقص اور بدی ہے اُس سے وہ منزّہ ہے۔ جیسا کہ سُورۃ الفاتحہ میں اللّٰہ کو تمام صفاتِ حمیدہ کا موصوف قرار دیا ہے۔ تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے مقابل میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ ہے۔ اس کے بعد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ربوبیت کا کام ہے۔ تربیت اور تکمیل۔ جیسے ماں اپنے بچّہ کی پرورش کرتی ہے، اس کو صاف کرتی ہے۔ ہر قسم کے گند اور آلائش سے دُور رکھتی ہے اور دُودھ پلاتی ہے۔ دُوسرے الفاظ میں یُوں کہو کہ وہ اُس کی مدد کرتی ہے۔ اب اس کے مقابل میں یہاں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہے۔ پھر اَلرَّحْمٰنِ ہے جو بغیر خواہش، بدُوں درخواست اور بغیر اعمال کے اپنے فضل سے

دیتا ہے۔ اگر ہمارے وجود کی ساخت ایسی نہ ہوتی، تو ہم سجدہ نہ کر سکتے اور رکوع نہ کر سکتے۔ اس لیے ربوبیت کے مقابلہ میں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ فرمایا۔ جیسے باغ کا نشوونما پانی کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح پر اگر خدا کے فیض کا پانی نہ پہنچے تو ہم نشوونما نہیں پا سکتے۔ درخت پانی کو چوستا ہے۔ اس کی جڑوں میں دہانے اور سُوراخ ہوتے ہیں۔ علم طبعی میں یہ مسئلہ ہے کہ درخت کی شاخیں پانی کو جذب کرتی ہیں۔ اُن میں قوتِ جاذبہ ہے۔ اسی طرح پر عبُودیت میں ایک قوتِ جاذبہ ہوتی ہے جو خدا کے فیضان کو جذب کرتی ہے اور چُوستی ہے پس اَلرَّحْمٰن کے بالمقابل اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہے یعنی اگر اُس کی رحمانیت ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی۔ اگر یہ قویٰ اور طاقتیں اس نے عطا نہ کی ہوتیں، تو ہم اس فیض سے کیونکر بہرہ وَر ہو سکتے۔

ہدایت رحمانیتِ الٰہی سے ملتی ہے

پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اَلرَّحْمٰن کے بالمقابل ہے، کیونکہ ہدایت پانا کسی کا حق تو نہیں ہے، بلکہ محض رحمانیتِ الٰہی سے یہ فیض حاصل ہو سکتا ہے اور صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اَلرَّحِیْم کے بالمقابل ہے، کیونکہ اس کا وِرد کرنے والا رحیمیت کے چشمہ سے فیض حاصل کرتا ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ اے رحمِ خاص سے دُعاؤں کے قبول کرنے والے اُن رسُولوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحوں کی راہ ہم کو دکھا، جنھوں نے دُعا اور مجاہدات میں مصروف ہو کر تجھ سے انواع و اقسام کے معارف اور حقائق اور کشُوف اور الہامات کا انعام پایا اور دائمی دُعا اور تضرع اور اعمالِ صالحہ سے معرفتِ تامّہ کو پہنچے۔

رحیمیت کے مفہوم میں نقصان کا تدارک کرنا لگا ہوا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ اگر فضل نہ ہوتا، تو نجات نہ ہوتی۔ ایسا ہی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپؐ سے سوال کیا کہ یا حضرت! کیا آپؐ کا بھی یہی حال ہے۔ آپؐ نے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ ہاں۔ نادان اور احمق عیسائیوں نے اپنی نافہمی اور ناواقفی کی وجہ سے اعتراض کیے ہیں، لیکن وُہ نہیں سمجھتے کہ یہ آپؐ کی کمالِ عبُودیت کا اظہار تھا جو خدا تعالیٰ کی رُبُوبیّت کو جذب کر رہا تھا۔ ہم نے خود تجربہ کر کے دیکھا ہے اور متعدد مرتبہ آزمایا ہے، بلکہ ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ جب انکسار اور تذلّل کی حالت انتہا کو پہنچتی ہے اور ہماری رُوح اس عبُودیت اور فروتنی میں بہہ نکلتی ہے اور آستانۂ حضرتِ واہب العطایا پر پہنچ جاتی ہے تو ایک روشنی اور نور اُوپر سے اُترتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نالی کے ذریعے سے مصفّا پانی دُوسری نالی میں پہنچتا ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انوار و برکات

پس آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حالت جس قدر بعض مقامات پر فروتنی اور انکساری میں کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اسی قدر آپؐ رُوح القدس کی تائید اور روشنی سے مؤیَّد اور منوّر ہیں

جیساکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی اور فعلی حالت سے دکھایا ہے یہانتک کہ آپؐ کے انوار و برکات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ابدالآباد تک اس کا نمونہ اور ظلّ نظر آتا ہے؛ چنانچہ اس زمانہ میں بھی جو کچھ خدا تعالیٰ کا فیض اور فضل نازل ہو رہا ہے، وہ آپؐ ہی کی اطاعت اور آپؐ ہی کی اتباع سے ملتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ کوئی شخص حقیقی نیکی کرنے والا اور خدا تعالیٰ کی رضا کو پانے والا نہیں ٹھہر سکتا اور ان انعام و برکات اور معارف اور حقائق اور کشوف سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، جو اعلیٰ درجہ کے تزکیۂ نفس پر ملتے ہیں۔ جبتک کہ وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں کھویا نہ جائے اور اس کا ثبوت خود خدا تعالیٰ کے کلام سے ملتا ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آلِ عمران: ۳۲) اور خدا تعالیٰ کے اس دعویٰ کی عملی اور زندہ دلیل میں ہوں۔ ان نشانات کے ساتھ جو خدا تعالیٰ کے محبُوبوں اور ولیوں کے قرآن شریف میں مقرر ہیں مجھے شناخت کرو۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کمال یہانتک ہے کہ اگر کوئی بڑھیا بھی آپؐ کا ہاتھ پکڑتی تھی تو آپؐ کھڑے ہو جاتے اور اسکی باتوں کو نہایت توجہ سے سُنتے اور جب تک وہ خود آپؐ کو نہ چھوڑتی، آپؐ نہ چھوڑتے تھے۔

مغضُوب اور ضالین کی راہوں سے بچنے کی ہدایت

اور پھر غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے مقابل ہے۔ اس کا وِرد کرنے والا چشمہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے فیض پاتا ہے جس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ اے جزا و سزا کے دن کے مالک ہمیں اس سے بچا کہ یہودیوں کی طرح جو دُنیا میں طاعون وغیرہ بلاؤں کا نشانہ ہوئے اور اس کے غضب سے ہلاک ہو گئے یا نصاریٰ کی طرح نجات کی راہ کھو بیٹھیں۔ اس میں یہود کا نام مغضوب اس لیے رکھا گیا ہے کہ ان کی شامتِ اعمال سے بھی اُن پر عذاب آیا، کیونکہ اُنھوں نے خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں اور راستبازوں کی تکذیب کی اور بہت سی تکلیفیں پہنچائیں اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے جو یہاں سُورۂ فاتحہ میں یہودیوں کی راہ سے بچنے کی ہدایت فرمائی اور اس سُورہ کو اَلضَّآلِّیْنَ پر ختم کیا یعنی اُن کی راہ سے بچنے کی ہدایت فرمائی تو اس میں کیا سِر تھا۔ اس میں یہی راز تھا کہ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اسی قسم کا زمانہ آنے والا ہے، جبکہ یہود کی تتبع کرنے والے ظاہر پرستی کریں گے اور استعارات کو حقیقت پر حمل کر کے خدا کے راستباز کی تکذیب کے لیے اُٹھیں گے، جیساکہ یہود نے مسیح ابنِ مریم کی تکذیب کی تھی اور انہیں یہی مصیبت پیش آئی کہ اُنھوں نے اس کی تاویل پر ٹھٹھا کیا اور کہا کہ اگر خدا کا یہی مطلب تھا کہ ایلیا کا مثیل آئے گا، تو کیوں خدا نے اپنی پیشگوئی میں اس کی صراحت نہ کی۔ غرض اسی رَوِش اور طریق پر اس وقت ہمارے مخالفوں نے بھی قدم مارا ہے اور میری تکذیب اور ایذا دہی میں انہوں نے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ میرے قتل کے فتوے دیئے اور طرح طرح

کے حیلوں اور مکروں سے مجھے ذلیل اور نابود کرنا چاہا۔ اگر خدا تعالیٰ کے فضل سے گورنمنٹ برطانیہ کا اس مُلک میں راج نہ ہوتا، تو یہ مدت سے میرے قتل سے دل خوش کر لیتے، مگر خدا تعالیٰ نے ان کو ہر مُراد میں نامراد کیا اور وہ جو اس کا وعدہ تھا کہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: ۶۸) وُہ پورا ہوا۔

غرض اس دُعا میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ کا فقرہ مسلمانوں کے ایک گروہ کی اس حالت کا پتہ دیتا ہے، جو وہ مسیح موعود کے مقابل مخالفت اختیار کرے گا اور ایسا ہی اَلضَّآلِّیْن سے مسیح موعود کے زمانہ کا پتہ لگتا ہے کہ اس وقت صلیبی فتنہ کا زور اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ جائے گا۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے جو سلسلہ قائم کیا جائے گا وہ مسیح موعود ہی کا سلسلہ ہوگا اور اسی لیئے احادیث میں مسیح موعود کا نام خدا تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاسِر الصّلیب رکھا ہے۔ کیونکہ یہ سچی بات ہے کہ ہر ایک مجدد فتنِ موجودہ کی اصلاح کے لیے آتا ہے۔ اب اس وقت خدا کے لیے سوچو، تو کیا معلوم نہ ہوگا کہ صلیبی نجات کی تائید میں قلم اور زبان سے وُہ کام لیا گیا ہے کہ صفحاتِ عالم کو ٹٹولا جائے تو باطل پرستی کی تائید میں یہ سرگرمی اور زمانہ میں ثابت نہ ہوگی اور جبکہ صلیبی فتنہ کے حامیوں کی تحریریں اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی ہیں اور توحیدِ حقیقی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عفت عزت اور حقانیت اور کتاب اللہ کے منجانب اللہ ہونے پر ظلم اور زُور کی راہ سے حملے کیے گئے ہیں، تو کیا اللہ تعالیٰ کی غیرت کا تقاضہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اُس کاسِر الصّلیب کو نازل کرے؟ کیا خدا تعالیٰ اپنے وعدہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر: ۱۰) کو بھول گیا؟ یقیناً یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے وعدے سچے ہیں۔ اُس نے اپنے وعدہ کے موافق دنیا میں ایک نذیر بھیجا ہے۔ دُنیا نے اس کو قبول نہ کیا، مگر خدا تعالیٰ اُس کو ضرور قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی کو ظاہر کریگا۔ مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ مَیں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق مسیح موعود ہو کر آیا ہوں۔ چاہو تو قبول کرو چاہو تو رَدّ کرو۔

مگر تمہارے رَدّ کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا ہے، وُہ ہو کر رہے گا، کیونکہ خدا تعالیٰ نے پہلے سے براہین میں فرمادیا ہے۔

صَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا[1]

۱۲؍جنوری ۱۸۹۸ء

استغفار عذابِ الٰہی اور مصائبِ شدیدہ کیلیے سپر کا کام دیتا ہے

بجائے خود مرضِ طاعون عذابِ شدید ہے۔ دُوسرا قانون اس پر سخت ہے۔

[1] اَلحکم جلد ۵ نمبر ۲۸-۳۴ پرچہ ۳۱؍جولائی - ۱۷؍ستمبر ۱۹۰۱ء

جو دوسرا عذاب ہے اور مرض بھی بڑھ کر ہے۔ عورت ہو یا بچہ ہو الگ کیا جاتا ہے اور گھر کو خالی کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس مرض اور اس کے قانون پر غور کر کے میرے دل میں ایک درد پیدا ہوا اور میں نے تہجد میں اس کے متعلق دعا کی تو الہام ہوا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الرعد: ۱۲) اب خیال ہوتا ہے کہ وہ الہام جو ہوا تھا کہ : "کون کہہ سکتا ہے اے بجلی آسمان سے مت گر۔"

شاید اسی سے متعلق ہو۔

میں تمھیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ جو لوگ قبل از نزولِ بلا دعا کرتے ہیں اور استغفار کرتے اور صدقات دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن پر رحم کرتا ہے اور عذابِ الٰہی سے اُن کو بچا لیتا ہے۔ میری ان باتوں کو قصہ کے طور پر نہ سنو۔ میں نصحاً للہ کہتا ہوں اپنے حالات پر غور کرو۔ اور آپ بھی اور اپنے دوستوں کو بھی دعا میں لگ جانے کے لیے کہو۔ استغفار، عذابِ الٰہی اور مصائبِ شدیدہ کے لیے سپر کا کام دیتا ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : مَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَھُمْ وَھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ (الانفال: ۳۴) اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ اس عذابِ الٰہی سے تم محفوظ رہو، تو استغفار کثرت سے پڑھو۔

گورنمنٹ کو اختیار ہوگا کہ مبتلا اشخاص کو علیحدہ رکھا جائے۔ گویا وہ لوگ جو علیحدہ کیے جائیں گے قبروں میں ہی ہوں گے۔ امیر و غریب، مرد و عورت، بوڑھے جوان کا کوئی لحاظ نہ کیا جاوے گا۔ اس لیے خدانخواستہ اگر کسی ایسی جگہ طاعون پھیلے جہاں تم میں سے کوئی ہو، تو میں تمھیں ہدایت کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کے قوانین کی سب سے پہلے اطاعت کرنے والے تم ہو۔

اکثر مقامات میں سنا گیا ہے کہ پولیس والوں سے مقابلہ ہوا۔ میرے نزدیک گورنمنٹ کے قوانین کے خلاف کرنا بغاوت ہے، جو خطرناک جرم ہے۔ ہاں گورنمنٹ کا بیشک یہ فرض ہے کہ وہ ایسے افسر مقرر کرے جو خوش اخلاق، متدیّن اور ملک کے رسم و رواج اور مذہبی پابندیوں سے آگاہ ہوں۔ غرض تم خود ان قوانین پر عمل کرو اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کو اِن قوانین کے فوائد سے آگاہ کرو۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ دعاؤں کا وقت یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس وبا نے پنجاب کا رُخ کر لیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہر ایک متنبہ اور بیدار ہو کر دعا کرے اور توبہ کرے۔ قرآن شریف کا منشا یہ ہے کہ جب عذاب سر پر آ پڑے پھر توبہ عذاب سے نہیں چھڑا سکتی۔

عذابِ الٰہی سے بچنے کے طریقے

اس لیے اس سے پیشتر کہ عذابِ الٰہی آکر توبہ کا دروازہ بند کر دے، توبہ کرو۔ جبکہ دنیا کے قانون سے اس قدر ڈر پیدا ہوتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے قانون سے نہ ڈریں۔ جب بلا سر پر آ پڑے تو اس کا مزا چکھنا ہی پڑتا ہے۔ چاہیے کہ ہر شخص تہجد میں اُٹھنے کی کوشش کرے اور پانچ وقت کی نمازوں میں بھی قنوت ملا دیں۔ ہر ایک خدا کو

ناراضی کرنے والی بات سے توبہ کریں۔ توبہ سے مراد یہ ہے کہ ان تمام بدکاریوں اور خدا کی ناراضمندی کے باعثوں کو چھوڑ کر ایک سچی تبدیلی کریں اور آگے قدم رکھیں اور تقویٰ اختیار کریں۔ اس میں بھی خدا کا رحم ہوتا ہے۔ عاداتِ انسانی کو شائستہ کریں۔ غضب نہ ہو۔ تواضع اور انکساری اس کی جگہ لے لے۔ اخلاق کی درستی کے ساتھ اپنے مقدور کے موافق صدقات کا دینا بھی اختیار کرو۔ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا (الدھر:۹) یعنی خدا کی رضا کے لیے مسکینوں اور یتیموں اور اسیروں کو کھانا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خاص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہم دیتے ہیں اور اُس دن سے ہم ڈرتے ہیں جو نہایت ہی ہولناک ہے۔

قصّہ مختصر دُعا سے، توبہ سے کام لو اور صدقات دیتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ساتھ تم سے معاملہ کرے۔

جماعت کے لیے اخلاقی نصاب

اخلاقی حالت ایسی دُرست ہو کہ کسی کو نیک نیتی سے سمجھانا اور غلطی سے آگاہ کرنا ایسے وقت پر ہو کہ اُسے بُرا معلوم نہ ہو۔ کسی کو استخفاف کی نظر سے نہ دیکھا جاوے۔ دل شکنی نہ کی جاوے۔ جماعت میں باہم جھگڑے فساد نہ ہوں۔ دینی غریب بھائیوں کو کبھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ مال و دولت یا نسبی بزرگی پر بے جا فخر کر کے دوسروں کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھو۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک مُکرّم وہی ہے جو متقی ہے، چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات: ۱۴) دُوسروں کے ساتھ بھی پورے اخلاق سے کام لینا چاہیے۔ جو بداخلاقی کا نمونہ ہوتا ہے، وُہ بھی اچھا نہیں۔ ہماری جماعت کے ساتھ لوگ مقدمہ بازی کا صرف بہانہ ہی ڈھونڈتے ہیں۔ لوگوں کے لیے ایک طاعون ہے۔ ہماری جماعت کے لیے دو طاعون ہیں۔ اگر کوئی جماعت میں سے ایک شخص برائی کرے گا، تو اس ایک سے ساری جماعت پر حرف آئے گا۔ دانشمندی، حِلم اور دَرگذر کے مَلکہ کو بڑھاؤ۔ نادان سے نادان کی باتوں کا جواب بھی متانت اور سلامت رَوی سے دو۔ یاوہ گوئی کا جواب یاوہ گوئی نہ ہو۔ مَیں جانتا ہوں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی تعلیم میں بھی کچھ ایسی ہی حکمتِ عملی تھی کہ اگر ایسا نہ کرتے، تو روز ماریں کھاتے پھرتے۔ رُومیوں کی سلطنت تھی۔ یہود کے فقیہہ اور فریسی اس کے مُقرّب تھے۔ اس وقت اگر وہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال نہ پھیرتے تو روز ماریں کھایا کرتے اور روز مقدمے ہوتے۔ باوجودیکہ وہ ایسی نرم تعلیم دیتے تھے۔ پھر بھی یہود انہیں دم نہ لینے دیتے تھے۔ اُس وقت کی موجودہ حالت انجیل کی تعلیم ہی کو چاہتی ہوگی۔ اِس وقت ہماری جماعت کی حالت بھی قریباً ویسی ہی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مارٹن کلارک عیسائی کے مقدمہ میں محمد حسین نے بھی اسی کی گواہی دی۔ اب سمجھ لو کہ قوم سے بھی کوئی امید نہیں ہے۔ رہی گورنمنٹ اس کو بھی بدظن کیا جاتا ہے اور گورنمنٹ کسی حد تک معذور بھی ہے۔ اگر خدانخواستہ وُہ بدظن ہو، کیونکہ عالم الغیب نہیں ہے، اس لیے ہم کو اکثر مرتبہ گورنمنٹ کے حضور

خاص طور پر میموریل بھیجنے پڑے اور اپنے حالات سے خود اس کو مطلع کرنا پڑا، تاکہ اس کو صحیح اور سچے واقعات کا علم ہو۔ مناسب ہے کہ ان ابتلاء کے دنوں میں اپنے نفس کو مار کر تقویٰ اختیار کریں۔ میری غرض ان باتوں سے یہی ہے کہ تم نصیحت اور عبرت پکڑو۔

دُنیا فنا کا مقام ہے۔ آخر مرنا ہے۔ خوشی دین کی باتوں میں ہے۔ اصل مقصد تو دین ہی ہے۔

رمضان کی حقیقت

رَمض سُورج کی تپش کو کہتے۔ رَمضان میں چونکہ انسان اَکل و شُرب اور تمام جسمانی لذتوں پر صبر کرتا ہے۔ دُوسرے اللہ تعالیٰ کے احکام کے لیے ایک حرارت اور جوش پیدا کرتا ہے۔ رُوحانی اور جسمانی حرارت اور تپش مِل کر رَمضان ہوا۔ اہلِ لغت جو کہتے ہیں کہ گرمی کے مہینہ میں آیا، اس لیے رمضان کہلایا میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ عرب کے لیے یہ خصوصیت نہیں ہوسکتی۔ رُوحانی رمض سے مُراد رُوحانی ذوق و شوق اور حرارتِ دینی ہوتی ہے۔ رَمض اِس حرارت کو بھی کہتے ہیں، جس سے پتھر گرم ہوجاتے ہیں۔[1]

٭ ٭ ٭

۲۹ر جنوری ۱۸۹۸ء

رُوحانی طاقتوں پر معبُود کا اثر

انسان کی رُوحانی طاقتوں پر اس کے معبُود کا اثر پڑتا ہے۔ دیکھو! اگر کوئی ہندو آجاوے، تو دُور ہی سے اُس سے غفلت کی بُو آتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا خود ساختہ معبُود بھی تو ایسا ہی غافل ہے کہ جب تک ایک انگریز کے کھانے کی گھنٹی کی طرح گھنٹی نہ بجے، تو وہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رُوحانی زندگی سے جو معرفت اور شِفا حاصل ہوتی ہے، اس سے یہ لوگ محرُوم رہتے ہیں؛ ورنہ جسمانی طور پر تو بڑے متموّل اور آسُودہ حال ہوتے ہیں۔

رزقِ ابتلا اور رزقِ اصطفاء

اصل بات یہ ہے کہ رزق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ابتلاء کے طور پر، دُوسرے اصطفاء کے طور پر۔ رزقِ ابتلا کے طور پر تو وہ رزق ہے، جس کو اللہ سے واسطہ نہیں رہتا۔ بلکہ یہ رزق انسان کو خدا سے دُور ڈالتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کر کے فرمایا ہے لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ (المنافقون : ۱۰) تمہارے مال تم کو ہلاک نہ کر دیں اور رزقِ اصطفاء کے طور پر وہ ہوتا ہے، جو خدا کے لیے ہو۔ ایسے لوگوں کا متولّی خدا ہوجاتا ہے اور جو

---

[1] الحکم جلد ۵۔ ۲۷ پرچہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۱ء

کچھ اُن کے پاس ہوتا ہے، وُہ اس کو خدا ہی کا سمجھتے ہیں اور اپنے عمل سے ثابت کر دکھاتے ہیں۔ صحابہؓ کی حالت دیکھو! جب امتحان کا وقت آیا، تو جو کچھ کسی کے پاس تھا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سب سے اوّل کمبل پہن کر آ گئے۔ پھر اُس کمبل کی جزا بھی اللہ تعالیٰ نے کیا دی کہ سب سے اوّل خلیفہ وہی ہوئے۔ غرض یہ ہے کہ اصلی خوبی، خیر اور رُوحانی لذّت سے بہرہ ور ہونے کے لیے وہی مال کام آسکتا ہے، جو خدا کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔[۱]

۳۰ر جنوری ۱۸۹۸ء

دُنیا اور دنیوی خوشیوں کی حقیقت

دُنیا اور دُنیا کی خوشیوں کی حقیقت لہو ولعب سے زیادہ نہیں۔ عارضی اور چند روزہ ہیں اور ان خوشیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا سے دُور جا پڑتا ہے، مگر خدا کی معرفت میں جو لذّت ہے وُہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو نہ آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سُنی نہ کسی اور حِس نے اس کو محسوس کیا ہے۔ وُہ ایک چیر کر نکل جانے والی چیز ہے۔ ہر آن ایک نئی راحت اُس سے پیدا ہوتی ہے جو پہلے نہیں دیکھی ہوتی۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا ایک خاص تعلق ہے۔ اہلِ عرفان لوگوں نے بشریت اور ربوبیت کے جوڑہ پر بہت لطیف بحثیں کی ہیں۔ اگر بچے کا مُنہ پتھر سے لگائیں تو کیا کوئی دانشمند خیال کر سکتا ہے کہ اس پتھر میں سے دُودھ نکل آئے گا اور بچہ سیر ہو جائیگا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح پر جب تک انسان خدا تعالیٰ کے آستانہ پر نہیں گرتا، اس کی رُوح ہمہ نیستی ہو کر ربوبیت سے تعلق پیدا نہیں کر سکتی اور نہیں کرتی جبتک کہ وہ عدم یا مشابہ بالعدم نہ ہو، کیونکہ ربوبیت اسی کو چاہتی ہے۔ اس وقت تک وُہ رُوحانی دُودھ سے پرورش نہیں پا سکتا۔

لَہْو میں کھانے پینے کی تمام لذّتیں شامل ہیں۔ اُن کا انجام دیکھو کہ بجز کثافت کے اور کیا ہے۔ زینت، سواری، عمدہ مکانات پر فخر کرنا یا حکومت و خاندان پر فخر کرنا یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ بالآخر اس سے ایک قسم کی حقارت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو رنج دیتی اور طبیعت کو افسردہ اور بے چین کر دیتی ہے۔

لَعِب میں عورتوں کی محبت بھی شامل ہے۔ انسان عورت کے پاس جاتا ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ محبت اور لذّت کثافت سے بدل جاتی ہے لیکن اگر یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک حقیقی عشق ہونے کے بعد ہو، تو پھر راحت پر راحت اور لذّت پر لذّت ملتی ہے۔ یہانتک کہ معرفتِ حقّہ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ ایک اَبدی اور غیر فانی راحت میں داخل ہو جاتا ہے جہاں پاکیزگی اور طہارت کے سوا کچھ نہیں۔ وُہ خدا میں لذّت ہے۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اُسے ہی پاؤ کہ حقیقی لذّت وہی ہے۔[۲]

---

[۱] الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ پرچہ ۲۳ر جون ۱۸۹۹ء
[۲] الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ پرچہ ۲۳ر جون ۱۸۹۹ء

حضرتِ اقدسؑ کی ایک تقریر

فرمودہ ۱۲؍جنوری ۱۸۹۸ء بعد نماز فجر



انسان بالطبع کمال کی پیروی کرنا چاہتا ہے

یاد رکھو کہ فضائل بھی امراضِ متعدیہ کی طرح متعدی ہونے ضروری ہیں۔ مومن کے لیے حکم ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو اس درجہ پر پہنچاتے کہ وہ متعدی ہو جائیں۔ کیونکہ کوئی عمدہ سے عمدہ بات قابلِ پذیرائی اور واجب التعمیل نہیں ہو سکتی، جبتک اس کے اندر ایک چمک اور جذب نہ ہو۔ اس کی درخشانی دُوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور جذب ان کو کھینچ لاتا ہے اور پھر اس فعل کی اعلیٰ درجہ کی خوبیاں خود بخود دُوسرے کو عمل کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ دیکھو! حاتم کا نیک نام ہونا سخاوت کے باعث مشہور ہے۔ گو مَیں نہیں کہہ سکتا کہ وہ خلوص سے تھی۔ ایسا ہی رستم واسفندیار کی بہادری کے فسانے عام زبان زد ہیں؛ اگرچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وُہ خلوص سے تھے۔ میرا ایمان اور مذہب یہ ہے کہ جب تک انسان سچا مومن نہیں بنتا، اس کے نیکی کے کام خواہ کیسے ہی عظیم الشان ہوں ــــ وُہ ریاکاری کے ملمّع سے خالی نہیں ہوتے، لیکن چونکہ اُن میں نیکی کی اصل موجود ہوتی ہے اور یہ وُہ قابلِ قدر جوہر ہے، جو ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے باایں ہمہ ملمّع سازی وریاکاری وُہ عزت سے دیکھے جاتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے میرے پاس ایک نقل بیان کی تھی اور خود مَیں نے بھی اس قصہ کو پڑھا ہے کہ سر فلپ سِڈنی ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں قلعہ زٹفن ملک ہالینڈ کے محاصرہ میں جب زخمی ہوا، تو اس وقت عین نزع کی تلخی اور شدتِ پیاس کے وقت جب اس کے لیے ایک پیالہ پانی کا جو وہاں بہت کمیاب تھا، مہیا کیا گیا تو اُس کے پاس ایک اور زخمی سپاہی تھا جو نہایت پیاسا تھا۔ وُہ سر فلپ سڈنی کی طرف حسرت اور طمع کے ساتھ دیکھنے لگا۔ سڈنی نے اس کی یہ خواہش دیکھ کر پانی کا وہ پیالہ خود نہ پیا بلکہ بطور ایثار یہ کہہ کر اس سپاہی کو دیدیا کہ "تیری ضرورت مجھ سے زیادہ ہے۔" مرنے کے وقت بھی لوگ ریاکاری سے نہیں رُکتے۔ ایسے کام اکثر ریاکاروں سے ہو جاتے ہیں، جو اپنے آپ کو اخلاقِ فاضلہ والے انسان ثابت کرنا یا دکھانا چاہتے ہیں۔

غرض کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ اُس کی ساری باتیں بُری حالت کی اچھی ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ انسان

اچھی باتوں کی کیوں پیروی نہیں کرتے؟ میں اسکے جواب میں یہی کہونگا کہ اصل بات یہ ہے کہ انسان فطرتاً کسی بات کی پیروی نہیں کرتا جبتک کہ اُس میں کمال کی مہک نہ ہو اور یہی ایک سِر ہے جو اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرتا رہا ہے اور خاتم النبیین کے بعد مجددین کے سلسلہ کو جاری رکھا ہے، کیونکہ یہ لوگ اپنے عملی نمونہ کے ساتھ ایک جذب اور اثر کی قوت رکھتے ہیں اور نیکیوں کا کمال اُن کے وجود میں نظر آتا ہے اس لیے کہ انسان بالطبع کمال کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ اگر انسان کی فطرت میں یہ قوت نہ ہوتی، تو انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کی بھی ضرورت نہ رہتی۔

مامورین کی مخالفت کا سبب

لیکن یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام اور خدا تعالیٰ کے ماموروں کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے اور ان کی تعلیم کی طرف عدم توجہی کیوں کی جاتی ہے؛ اس کا باعث زمانہ کی وہ حالت ہوتی ہے جو اُن پاک وجودوں کی بعثت کا موجب ہوتی ہے۔ زمانہ میں فسق و فجور کا ایک دریا رواں ہوتا ہے اور ہر قسم کی بدکاریاں اور برائیاں خدا تعالیٰ سے بُعد اور حرمان اس نیک عمدہ مادے کو اپنے نیچے دبا لیتا ہے۔ چونکہ بدکاریوں کے کمال کا ظہور ہوا ہوتا ہے، اس لیے طبیعت کا یہ مادہ کہ وہ ہر کمال کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ اس طرف رجوع کر گیا ہوتا ہے اور یہی وہ سِر ہوتا ہے کہ ابتداءً انبیاء علیہم السلام اور ماموروں کی مخالفت اور اُن کی تعلیم سے بے پروائی ظاہر کی جاتی ہے، آخر ایک وقت آجاتا ہے کہ اس نیکی کے بروز اور کمال کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (الزخرف: ۳۶)

ظاہری نفاست کا اثر

غرض انسانی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ ہر کمال کی پیروی کرنا چاہتی ہے۔ دیکھ لو! انگریزوں کی نئی ایجادات سوئی، چاقو وغیرہ تک کی کس قدر عزت کی جاتی ہے اور دیسی اشیاء کے مقابلہ میں ان کو کس قدر پسند کیا جاتا ہے، حالانکہ اُن میں بعض اشیاء اصلی نہیں بلکہ اکثر ملمع کی ہوئی ہوتی ہیں، مگر ظاہری چمک دمک ایسی ہوتی ہے کہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور اُس کی روشنی ایک کشش کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ یہ جھوٹے زیور جو ملمع کیے ہوتے بکتے ہیں، ان کی تجارت کیسی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اصلی اشیاء کے مقابلہ میں ان کو رکھ کر دیکھو گے، تو معلوم ہوگا کہ اصلی، نقلی معلوم ہوتا ہے اور نقلی اصلی۔ ان اشیاء کی ظاہری چمک دمک میں ایک روشنی ہے جو ہمارے دیسی صناع اس کو دکھا نہیں سکتے، اس لیے باوجودیکہ لوگ صاف جانتے ہیں کہ یہ اشیاء ملمع شدہ ہیں۔ لیکن اس دجل کی کچھ بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ہر ایک چیز ان کی دیکھو۔ دیسی کپڑے، دیسی جوتے، جنٹلمین تعلیم یافتہ اُن سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ انگریزی اشیاء میں ایک خاص قسم کی نفاست اور عمدگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ چمڑے کو ایسا کماتے ہیں کہ اس میں نرمی اور چمک پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ کیا ہر ایک ادنیٰ سی چیز کو دیکھو

ایک تانگے ہی کو دیکھو، کیسا خوبصورت ہوتا ہے۔ بغرض ہر ایک دیسی چیز کو بالمقابل نکما کر دیا ہے، بلکہ میں نے تو سُنا ہے کہ بعض رئیس دیسی چیزوں سے یہانتک متنفر ہیں کہ ان کے کپڑے بھی پیرس سے دُھل کر آتے ہیں اور پینے کا پانی بھی ولایت سے منگواتے ہیں۔

اس خریداری کا سِرّ کیا ہے۔ اُنہوں نے ظاہری خُوبصورتی اور چمک اور خوشنمائی رکھ دی ہے۔ اس لیے لوگ اُدھر جھک گئے ہیں۔ جب یہ حالت ہے کہ دیانت دار اور بھی ہیں اور کفّار کا گروہ بھی ہے۔ لیکن کفار کی طرف رُجوع ان کی نفاست اور چمک کی وجہ سے ہے۔ یہی حال اخلاق اور اعمال کا ہے۔ پس جبتک ان کی چمک دمک یہاں تک نہ پہنچائی جاتے۔ نوعِ انسان پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ جو لوگ خود کمزور ہوتے ہیں۔ وہ دُوسرے کمزوروں کو جذب نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم میں مخلوق کی قسم کھانے کی حقیقت

خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (سورۃ العصر) قسم ہے اس زمانہ کی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ کی۔ آجکل ہمارے زمانہ کے کوتاہ اندیش مخالف یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں مخلوق کی قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں، حالانکہ دُوسروں کو منع کیا ہے۔ اور کہیں انجیر کی قسم ہے، کہیں دن اور رات کی اور کہیں زمین کی اور کہیں نفس کی؟ اس قسم کے اعتراضوں کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تمام قرآن شریف میں یہ ایک عام سُنّت اور عادتِ الٰہی ہے کہ وہ بعض نظری امور کے اثبات و احقاق کے لیے کسی ایسے اُمور کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے خواص کا عام طور پر بیّن اور کھُلا کھُلا اور بدیہی ثبوت رکھتے ہیں۔ پس اُن کی قسم کھانا ان کو بطور دلیل اور نظیر کے پیش کرنا ہوتا ہے۔

کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟

ہم اس اعتراض کا واضح جواب دینے سے پیشتر ایک ضروری امر اور بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ایک مُسلمان کو یاد رہے کہ ہم بلحاظ گورنمنٹ کے ہندوستان کو دار الحرب نہیں کہتے اور یہی ہمارا مذہب ہے؛ اگرچہ اس مسئلہ میں علماء مخالفین نے ہم سے سخت اختلاف کیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی دقیقہ ہم کو تکلیف دہی کا انھوں نے باقی نہیں رکھا، مگر ہم ان عارضی تکالیف اور آنی ضرر رسانیوں کے خوف سے حق کو کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ حکومت کے لحاظ سے ہندوستان ہرگز ہرگز دار الحرب نہیں ہے۔ ہمارا مقدمہ ہی دیکھ لو۔ اگر یہی مقدمہ سِکھوں کے عہدِ حکومت میں ہوتا اور دُوسری طرف ان کا کوئی گرو یا برہمن ہوتا، تو بدوں کِسی قسم کی تحقیق و تفتیش کے ہم کو پھانسی دے دینا کوئی بڑی بات نہ تھی، مگر انگریزوں کی سلطنت اور عہدِ

حکومت ہی کی یہ خوبی ہے کہ مقابل میں ایک ڈاکٹر[1] اور پھر مشہور پادری، لیکن تحقیقات اور عدالت کی کارروائی میں کوئی سختی کا برتاؤ نہیں کیا جاتا کیپٹن ڈگلس نے اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں کی کہ پادری صاحب کی ذاتی وجاہت یا اُن کے اپنے عہدہ اور درجہ کا لحاظ کیا جاوے؛ چنانچہ انہوں نے لیمار چنڈ صاحب سے جو پولیس گورداسپور کے اعلیٰ افسر ہیں، یہی کہا کہ ہمارا دل تسلی نہیں پکڑتا۔ پھر عبدالحمید سے دریافت کیا گیا۔ آخر کار انصاف کی رُو سے ہم کو اس نے بَری ٹھہرایا۔ پھر یہ لوگ ہم کو ارکانِ مذہب کی بجاآوری سے نہیں روکتے، بلکہ بہت سے برکات اپنے ساتھ لے کر آئے، جس کی وجہ سے ہم کو اپنے مذہب کی اشاعت کا خاطر خواہ موقع ملا اور اس قسم کا امن اور آرام نصیب ہوا کہ پہلی حکومتوں میں اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ پھر یہ صریح ظلم اور اسلامی تعلیم اور اخلاق سے بعید ہے کہ ہم ان کے شکر گذار نہ ہوں۔ یاد رکھو! انسان جو اپنے جیسے انسان کی نیکیوں کا شکر گذار نہیں ہوتا، وُہ خدا تعالیٰ کا شکر گذار نہیں ہو سکتا؛ حالانکہ وُہ اُسے دیکھتا ہے۔ تو غیب الغیب ہستی کے انعامات کا شکر گذار کیونکر ہوگا، جس کو وہ دیکھتا بھی نہیں، اس لیے محض حکومت کے لحاظ سے ہم اس کو دارُالحرب نہیں کہتے۔

ہاں! ہمارے نزدیک ہندوستان دارُالحرب ہے بلحاظ قلم کے۔ پادری لوگوں نے اسلام کے خلاف ایک خطرناک جنگ شروع کی ہوئی ہے۔ اس میدانِ جنگ میں وہ نیزہ ہائے قلم لے کر نکلے ہیں نہ سنان و تفنگ لے کر۔ اس لیے اس میدان میں ہم کو جو ہتھیار لے کر نکلنا چاہیے، وہ قلم اور صرف قلم ہے۔ ہمارے نزدیک ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس جنگ میں شریک ہو جاوے۔ اللہ اور اس کے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وُہ دِل آزار حملے کیے جاتے ہیں کہ ہمارا تو جگر پھٹ جاتا اور دِل کانپ اٹھتا ہے۔ کیا اُمہات المومنین یا دربارِ مُصطفائی کے اسرار جیسی گندی کتاب دیکھ کر ہم آرام کر سکتے ہیں، جس کا نام ہی اس طرز پر رکھا ہے۔ جیسے ناپاک ناولوں کے نام ہوتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ دربار لندن کے اسرار جیسی کتابیں تو گورنمنٹ کے اپنے علم میں بھی اس قابل ہوں کہ ان کی اشاعت بند کی جاتے، مگر آٹھ کروڑ مُسلمانوں کی دلآزاری کرنے والی کتاب کو نہ روکا جائے۔ ہم خود گورنمنٹ سے اس قسم کی درخواست کرنا ہرگز ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس کو بہت ہی نامناسب خیال کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اپنے میموریل کے ذریعہ سے واضح کر دیا، لیکن یہ بات ہم نے محض اس بنا پر کہی ہے کہ بجائے خود گورنمنٹ کا اپنا فرض ہے کہ وہ ایسی تحریروں کا خیال رکھے۔ بہرحال گورنمنٹ نے عام آزادی دے رکھی ہے کہ اگر عیسائی ایک کتاب اسلام پر اعتراض کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں، تو مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ اس کا

---

[1] یہاں اس مقدمہ قتل کی طرف اشارہ ہے، جو مشہور عیسائی پادری ڈاکٹر ہنری مارٹن کلارک نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خلاف دائر کیا تھا۔ (س-ع-ح)

جواب لکھنے اور عیسائی مذہب کی تردید میں کتابیں لکھنے کا اختیار ہے۔

اسلامی غیرت کا تقاضا

مَیں حلفاً کہتا ہوں کہ جب کوئی ایسی کتاب نظر پڑتی ہے تو دُنیا اور مافیہا ایک مکھی کے برابر نظر نہیں آتی۔ مَیں پوچھتا ہوں کہ جس کو وقت پر جوش نہیں آتا، کیا وُہ مسلمان ٹھہر سکتا ہے۔ کسی کے باپ کو بُرا بھلا کہا جائے، تو وہ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے، لیکن اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی جائیں، تو ان کی رگِ حمیّت میں جنبش بھی نہ آوے اور پروا بھی نہ کریں۔ یہ کیا ایمان ہے؟ پھر کس مُنہ سے مر کر خدا کے پاس جائیں گے۔ اگر مسلمانوں کا نمونہ دیکھنا چاہو، تو صحابہ کرامؓ کی جماعت کو دیکھو۔ جنھوں نے اپنے جان و مال کے کسی قسم کے نقصان کی پروا نہیں کی۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی رضا کو مقدّم کر لیا۔ خدا تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو جانا ہی ایک فعل تھا جو سارا قرآن شریف ان کی تعریف سے بھرا ہوا ہے اور رضی اللہ عنہم کا تمغہ ان کو مل گیا۔ پس جب تک تم اپنے اندر وُہ امتیاز۔ وہ جوش حمیّتِ اسلام کے لیے محسوس نہ کرو۔ ہرگز اپنے آپ کو کامل نہ سمجھو۔

ہماری جماعت یاد رکھے کہ ہم ہندوستان کو بلحاظ حکومت ہرگز ہرگز دَارُالحَرب قرار نہیں دیتے۔ بلکہ اس اُمن اور برکات کی وجہ سے جو اس حکومت میں ہم کو ملی ہیں اور اس آزادی سے جو اپنے مذہب کے ارکان کی بجا آوری اور اس کی اشاعت کے لیے گورنمنٹ نے ہم کو دے رکھی ہے۔ ہمارا دل عِطر کے شیشہ کی طرح وفاداری اور شکر گذاری کے جوش سے بھرا ہوا ہے، لیکن پادریوں کی وجہ سے ہم اس کو دارُالحرب قرار دیتے ہیں۔ پادریوں نے چھ کروڑ کے قریب کتابیں اسلام کے خلاف شائع کی ہیں۔ میرے نزدیک وہ لوگ مُسلمان نہیں ہیں جو ان حملوں کو دیکھیں اور سُنیں اور اپنے ہی ہم و غم میں مبتلا رہیں۔ اس وقت جو کچھ کسی سے ممکن ہو، وُہ اسلام کی تائید کے لیے کرے اور اس قلمی جنگ میں اپنی وفاداری دکھائے، جبکہ خود عادل گورنمنٹ نے ہم کو منع نہیں کیا ہے کہ ہم اپنے مذہب کی تائید اور غیر قوموں کے اعتراضوں کی تردید میں کتابیں شائع کریں، بلکہ پریس، ڈاک خانے اور اشاعت کے دوسرے ذریعوں سے مدد دی ہے، تو ایسے وقت میں خاموش رہنا سخت گناہ ہے۔ ہاں ضرورت ہے اس امر کی کہ جو بات پیش کی جاوے، وہ معقول ہو۔ اس کی غرض دل آزاری نہ ہو۔ جو اسلام کے لیے سینہ بریاں اور چشم گریاں نہیں رکھتا، وہ یاد رکھے کہ خدا تعالیٰ ایسے انسان کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس کو سوچنا چاہیے کہ جس قدر خیالات اپنی کامیابی کے آتے ہیں اور جتنی تدابیر اپنی دنیوی اغراض کے لیے کرتا ہے۔ اسی سوزش اور جلن اور دردِ دل کے ساتھ کبھی یہ خیال بھی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر حملے ہو رہے ہیں، مَیں ان کے دفاع کی بھی سعی کروں؟ اور اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تو کم از کم پُرسوز دل کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کروں؟ اگر اس قسم کی جلن اور دَرد دل میں ہو تو ممکن نہیں کہ سچّی محبّت کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ اگر لوٹی ہانڈی

بھی خریدی جائے، تو اس پر بھی رنج ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک سُوئی کے گم ہو جانے پر بھی افسوس ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسا ایمان اور اسلام ہے کہ اس خوفناک زمانہ میں کہ اسلام پر حملوں کی بُوچھاڑ ہو رہی ہے۔ اَمن اور آرام کے ساتھ خوابِ راحت میں سو رہے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہفتہ وار اور ماہواری اخباروں اور رسالوں کے علاوہ ہر روز وہ کس قدر دُو وَرقہ اشتہار اور چھوٹے چھوٹے رسالے تقسیم کرتے ہیں جن کی تعداد پچاس پچاس ہزار اور بعض وقت لاکھوں تک ہوتی ہے؟ اور کئی کئی مرتبہ اُن کو شائع کرنے میں کروڑ ہا روپیہ پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے۔

مسیحیت اسلام کے خلاف کیوں ہے؟

یہ خوب یاد رکھو کہ پادریوں کے ذہن اور تصوّر میں ہنود کچھ چیز نہیں ہیں اور نہ دُوسرے مذاہب وغیرہ کی ان کو چنداں پَروا ہے، چنانچہ کبھی نہیں سُنا ہوگا کہ جس قدر کتابیں اسلام کی تردید میں یہ لوگ شائع کرتے ہیں، اس کے مقابلہ میں آدھی بھی ہندو مذہب کے خلاف لکھتے ہوں۔ یہ لوگ دُوسرے مذاہب سے چنداں غرض نہیں رکھتے اس لیے کہ ان میں بجائے خود کوئی حقانیت اور صداقت کی رُوح نہیں ہے۔ وہ عیسویت کی طرح خود مُردہ مذاہب ہیں، لیکن اسلام جو ایک زندہ مذہب ہے، جو حیّ و قیّوم خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے خلاف سرتوڑ کوشش کر کے اس کو بھی مُردہ مِلّت بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مَیں نے انکے اعتراضوں کو ایک وقت شمار کیا تھا، ان کی تعداد تین ہزار تک پہنچ چکی ہے اور اب تو اس میں اور بھی اضافہ ہوا ہوگا۔

یاد رکھو مُفتری انسان وسوسہ میں ڈالتا ہے، چونکہ ان میں صِدق، عِفّت، راستبازی نہیں ہوتی، اس لیے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ امرتسری افغانوں کا پکا یقین ہے کہ یہ لوگ تارک الصلوٰۃ ہیں اور شراب پیتے ہیں جب دُوسروں کے سامنے وُہ اس قسم کے اعتراض کرتے ہیں، تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بزرگ زادہ ہیں، کیا جُھوٹ بولیں گے؟ اس سے وہ وسوسہ میں پڑتے ہیں اور مان لیتے ہیں کہ ہاں سچ ہی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔

غرض ایک تو پادری ہیں جو کُھلے طور پر اسلام کے خلاف کتابیں لکھتے اور شائع کرتے ہیں۔ دُوسرے انگریزی طرزِ تعلیم اور کتابوں میں بھی پوشیدہ طور پر زہریلا مادہ رکھا ہوا ہے۔ فلسفی اپنے طرز پر اور مؤرخ اپنے رنگ میں واقعات کو بُری صورت میں پیش کر کے اسلام پر حملہ کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس وقت دو ہی قسم کے حملے ہوتے ہیں۔ ایک پادریوں کے اور دُوسرے فلسفیوں کے۔ پس اس وقت اپنے اسلام کو ٹٹولنا چاہیے۔

قرآن کریم میں مخلوق کی قسم کھانے کی فلاسفی

مَیں پھر اصل کلام کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں کہ قرآن شریف کی قسموں پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ بھی اسی قسم کا ہے۔ بڑے غور و فکر کے بعد یہ راز ہم پر کُھلا ہے کہ قرآن شریف کے جس جس مقام پر کوتہ اندیشوں نے اعتراض کیے ہیں۔ اسی مقام پر اعلیٰ درجہ کی صداقتوں اور معارف کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔

جس پر اُن کو اس وجہ سے اطلاع نہیں ملی کہ وہ حق کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں اور قرآن شریف کو محض اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس پر نکتہ چینی اور اعتراض کریں۔ یاد رکھو قرآن شریف کے دو حصّے ہیں بلکہ تین۔ ایک تو وہ حصّہ ہے جس کو ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی جو اُمّی ہوتے ہیں سمجھ سکتے ہیں اور دُوسرا وہ حصّہ ہے جو اوسط درجہ کے لوگوں پر کھلتا ہے۔ اگرچہ وہ پورے طور پر اُمّی نہیں ہوتے، لیکن بہت بڑی استعدادِ علوم کی بھی نہیں رکھتے اور تیسرا حصّہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو اعلیٰ درجہ کے علوم سے بہرہ وَر ہیں اور فلاسفر کہلاتے ہیں۔ یہ قرآن ہی کا خاصّہ ہے کہ وہ تینوں قسم کے آدمیوں کو یکساں تعلیم دیتا ہے۔ ایک ہی بات ہے جو اُمّی اور اوسط درجہ کے آدمی اور اعلیٰ درجہ کے فلاسفر کو تعلیم دے جاتی ہے۔

یہ قرآن شریف ہی کا فخر ہے کہ ہر طبقہ اپنی استعداد اور درجہ کے موافق فیض پاتا ہے۔ الغرض یہ جو قرآنِ شریف کی قَسم پر اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قَسم ایک ایسی شے ہے جس کو ایک شاہد کے مفقود ہونے کی بجائے دوسرا شاہد قرار دیا جاتا ہے۔ قانوناً، شرعاً، عرفاً یہ عام مسلّم بات ہے کہ جب گواہ مفقود ہو اور موجود نہ ہو، تو صرف قَسم پر اکتفا کی جاتی ہے اور وہ قَسم گواہی کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ کی سنّت قرآنِ کریم میں اس طرح پر جاری ہے کہ نظریات کو ثابت کرنے کے واسطے بدیہات کو بطور شاہد پیش کرتا ہے تاکہ نظری امور ثابت ہوں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف میں یہ طرز اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے کہ نظری امور کے اثبات کے لیے امورِ بدیہی کو بطور شاہد پیش کرتا ہے اور یہ پیش کرنا قسموں کے رنگ میں ہے۔ اس بات کو بھی ہرگز بھولنا نہ چاہیے کہ اللہ جلّ شانہٗ کی قسموں کو انسانی قسموں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو غیر اللہ کی قَسم کھانے سے منع کیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جب قَسم کھاتا ہے، تو اس کا مدّعا یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قَسم کھائی ہے اس کو ایک ایسا گواہ رؤیت کا قائم مقام ٹھہراوے کہ جو اپنے ذاتی علم سے اُس کے بیان کی تصدیق یا تکذیب کر سکتا ہے، کیونکہ اگر سوچ کر دیکھا جاوے، تو قَسم کا اصل مفہوم جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا تھا، شہادت ہی ہوتا ہے۔ جب انسان معمولی شاہدوں کے پیش کرنے سے عاجز آجاتا ہے تو پھر قَسم کا محتاج ہوتا ہے تا اس سے وہ فائدہ اٹھاوے، جو ایک شاہدِ رؤیت کی شہادت سے اُٹھانا چاہتا ہے، لیکن ایسا تجویز کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ بجُز خدا تعالیٰ کے کوئی اور بھی حاضر ناظر ہے اور تصدیق یا تکذیب یا سزا دہی یا کسی اور امر پر قادر ہے صریح کلمۂ کُفر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام کتابوں میں انسانوں کو یہی ہدایت فرمائی ہے کہ غیر اللہ کی ہرگز قسم نہ کھاوے۔

اب اس بیان سے صاف معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کا قَسم کھانا کوئی اور رنگ اور شان رکھتا ہے اور غرض

اس سے یہی ہے کہ تا صحیفۂ قدرت کے بدیہیات کو شریعت کے اسرار دقیقہ کے حل و انکشاف کے لیے بطور شاہد پیش کرے اور چونکہ اس مدعا کو قسم سے ایک مناسبت تھی اور وہ یہ کہ جیسا کہ ایک قسم کھانے والا مثلاً خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے، تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اس واقعہ پر گواہ ہے۔ اسی طرح اور ٹھیک اسی رنگ میں اللہ تعالیٰ کے بعض ظاہر در ظاہر افعال، نہاں در نہاں اسرار اور افعال پر بطور گواہ ہیں۔ اس لیے اس نے قسم کے رنگ میں اپنے افعالِ بدیہیہ کو اپنے افعالِ نظریہ کے ثبوت میں جابجا قرآن شریف میں پیش کیا اور یہ کہنا سراسر نادانی اور جہالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کی قسم کھائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ درحقیقت اپنے افعال کی قسم کھاتا ہے نہ کسی غیر کی اور اس کے افعال اس کے غیر نہیں ہیں۔ مثلاً اس کا آسمان یا ستارہ کی قسم کھانا اس قصد سے نہیں ہے کہ وہ کسی غیر کی قسم ہے بلکہ اس کی منشاء یہ ہے کہ جو کچھ اس کے ہاتھوں کی صنعت اور حکمت آسمان اور ستاروں میں موجود ہے اس کی شہادت بعض اپنے افعالِ مخفیہ کے سمجھانے کے لیے پیش کرے۔

خدا تعالیٰ کی قسموں میں اسرارِ معرفت

غرض اللہ تعالیٰ کی قسمیں اپنے اندر لامحدود اسرارِ معرفت کے رکھتی ہیں۔ جن کو اہلِ بصیرت ہی دیکھ سکتے ہیں۔

پس خدا تعالیٰ قسم کے لباس میں اپنے قانونِ قدرت کے بدیہیات کی شہادت اپنی شریعت کے بعض دقائق حل کرنے کے لیے پیش کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب (قانونِ قدرت) اس کی قولی کتاب (قرآن شریف) پر شاہد ہو جاوے اور اُس کے قول اور فعل میں باہم مطابقت ہو کر طالبِ صادق کے لیے مزید معرفت اور سکینت اور یقین کا موجب ہو اور یہ طریق قرآن شریف میں عام ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ برہموؤں اور الہام کے منکروں پر یوں اتمامِ حجت کرتا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (الطارق ۱۲) قسم ہے بادلوں کی جن سے مینہ برستا ہے۔ رجعؔ بارش کو بھی کہتے ہیں۔ بارش کا بھی ایک مستقل نظام ہے۔ جیسے نظامِ شمسی ہے۔ رات اور دن کا اور کسوف خسوف کا بجائے خود ایک ایک نظام ہے۔ مرض کا بھی ایک نظام ہوتا ہے۔ طبیب اس نظام کے موافق کہہ سکتا ہے کہ فلاں دن بحران ہو گا۔ غرض یہ نظام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت اپنے اندر ایک ترتیب اور کامل نظام رکھتا ہے اور کوئی فعل اس کا ایسا نہیں جو نظام اور ترتیب سے باہر ہو۔

اللہ تعالیٰ جیسے یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس سے ڈریں۔ ویسے یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگوں میں علوم کی روشنی پیدا ہو وے اور اس سے وہ معرفت کی منزلوں کو طے کر جاویں کیونکہ علومِ حقہ سے واقفیت جہاں ایک طرف سچی خشیت پیدا کرتی ہے، وہاں دوسری طرف ان علوم سے خدا پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بعض بدقسمت ایسے بھی ہیں۔ جو علوم میں منہمک ہو کر قضاء و قدر سے دُور جا پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وجود پر ہی شکوک پیدا کر بیٹھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو قضاء و قدر

کے قائل ہوکر علوم ہی سے دستبردار ہو جاتے ہیں، مگر قرآن شریف نے دونوں تعلیمیں دی ہیں اور کامل طور پر دی ہیں۔
قرآن شریف علومِ حقّہ سے اس لیے واقف کرنا چاہتا ہے اور اس لیے ادھر انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی معرفت میں جُوں جُوں ترقی ہوتی ہے اسی قدر خدا تعالیٰ کی عظمت اور اُس سے محبّت پیدا ہوتی جاتی ہے اور انسان کو قضاء و قدر کے نیچے رہنے کی اس لیے تعلیم دیتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکّل اور بھروسہ کی صفت پیدا ہو اور وہ راضی برضا رہنے کی حقیقت سے آشنا ہو کر سچّی سکینت اور اطمینان، جو نجات کا اصل مقصد اور منشا ہے، حاصل کرے۔

ابھی جو مثال میں نے قرآن شریف سے قسم کے متعلق دی ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ یعنی قسم ہے آسمان کی جس میں اللہ تعالیٰ نے رجع کو رکھا ہے۔ سماء کا لفظ فضا اور جَوّ اور بارش اور بلندی کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ رجع بار بار وقت پر آنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ بارش برسات میں بار بار آتی ہے، اس لیے اس کا نام بھی رجع ہے۔ اسی طرح پر آسمانی بارش بھی اپنے وقتوں پر آتی ہے۔ وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ (الطارق: ۱۳) اور قسم ہے زمین کی کہ وُہ اُن وقتوں میں پھوٹ نکلتی ہے اور سبزہ نکالتی ہے۔

بارش کی جڑ زمین ہے۔ زمین کا پانی جو بخارات بن کر اُوپر اُڑ جاتا ہے وہ کرۂ زمہریر میں پہنچ کر بارش بن کر واپس آتا ہے اور اس صُورت میں چونکہ وہ آسمان سے آتا ہے، اس لیے آسمانی کہلاتا ہے۔ پھر بارش کی ضرورت کے لیے ایک اور وقتِ خاص ہے۔ جب مزارعین کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بیائی کے بعد پڑے، تو کچھ بھی نہ رہے اور پھر بعض اوقات نشوونما کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ بغرض بارش اور مینہ کی ضرورت اور اس کے مفاد اور اس کے آسمان سے آنے کا نظارہ بالکل بدیہی ہے اور ایک ادنیٰ درجہ کی عقل رکھنے والا گنوار دہقان بھی جانتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر آسمانی بارش نہ ہو، تو زمینی پانی بھی خشک ہونے لگتے ہیں؛ چنانچہ امساکِ باراں کے دِنوں میں بہت سے کوئیں خشک ہو جاتے ہیں اور اکثروں میں پانی بہت ہی کم رہ جاتا ہے، لیکن جب آسمان سے بارش آتی ہے، تو زمینی پانیوں میں بھی ایک جوش اور تموّج پیدا ہونے لگتا ہے۔
میرا مطلب اس مقام پر اس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کو ایک اور امر کے لیے بطور شاہد قرار دیا ہے، کیونکہ ان نظاروں سے تو ایک معمولی زمیندار بھی واقف ہے اور وُہ امر جو ان کے ذریعہ ثابت کیا ہے وہ یہ ہے اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ وَّمَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ (الطارق: ۱۴ و ۱۵) بیشک یہ خدا کا کلام ہے اور قولِ فصل ہے۔ اور وہ عین وقت پر ضرورتِ حقّہ کے ساتھ اور حق و حکمت کے ساتھ آیا ہے، بیہودہ طور پر نہیں آیا۔ اب دیکھ لو کہ قرآن شریف جس وقت نازل ہوا ہے۔ کیا اس وقت نظامِ روحانی یہ نہیں چاہتا تھا کہ خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہو اور کوئی مردِ آسمانی آوے، جو اس گمشدہ متاع کو واپس لاوے، رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانۂ بعثت کی

تاریخ پڑھو تو معلوم ہو جاوے گا کہ دُنیا کی کیا حالت تھی۔ خدا تعالیٰ کی پرستش دنیا سے اُٹھ گئی تھی اور توحید کا نقش پا مِٹ چکا تھا۔ باطل پرستی اور معبودانِ باطلہ کی پرستش نے اللہ جلّ شانہٗ کی جگہ لے رکھی تھی۔ دنیا پر جہالت اور ظلمت کا ایک خوفناک پردہ چھایا ہوا تھا۔ دُنیا کے تختہ پر کوئی مُلک، کوئی قطعہ، کوئی سرزمین ایسی نہ رہ گئی تھی جہاں خدائے واحد ہاں حیّ و قیوم خدا کی پرستش ہوتی ہو۔ عیسائیوں کی مُردہ پرست قوم تثلیث کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی اور ویدوں میں توحید کا بیجا دعویٰ کرنے والے ہندوستان کے رہنے والے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے پُجاری تھے۔ غرض خود خدا تعالیٰ نے جو نقشہ اُس وقت کی حالت کا اِن الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم : ۴۲) یہ بالکل سچا ہے اور اس سے بہتر انسانی زبان اور قلم اس حالت کو بیان نہیں کر سکتی۔ اب دیکھو کہ جیسے خدا تعالیٰ کا قانون عام ہے کہ عین امساکِ بارش کے وقت آخر اُس کا فضل ہوتا ہے اور بارانِ رحمت برس کر شادابی بخشتا ہے، اسی طرح پر ایسے وقت میں ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کا کلام آسمان سے نازل ہوتا۔ گویا اس جسمانی بارش کے نظام کو دکھا کر رُوحانی بارش کے نظام کی طرف رہبری کی ہے۔ اب اس سے کون انکار کریگا کہ بارش ہمارے مقاصد کے موافق ہوئی۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ جیسے وہ نظام رکھا ہے اسی طرح دوسری بارشوں کے لیے وقت رکھے ہیں۔ اب دیکھ لو کہ کیا یہ بارشِ روحانی کا وقت نہ تھا؟ کس قدر جھگڑے تم لوگوں میں بپا تھے۔ اعمال گندے اور ایمان بھی گندے تھے اور دُنیا ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والی تھی، پھر وہ کیونکر اپنے فضل کا مینہ نہ برساتا جس نے جسمِ فانی کی حفاظت کے لیے ایک خاص نظام رکھا ہے، پھر روحانی نظام کو کیونکر چھوڑتا۔ اس لیے بارش کے نظام کو بطور شاہد پیش کر کے قسم کے رنگ میں استعمال کیا، کیونکہ امرِ نبوت ایک رُوحانی اور نظری امر تھا اور کفارِ عرب اس نظام کو نہ سمجھ سکتے تھے، اس لیے وہ پہلا نظام پیش کر کے اُن کو سمجھا دیا۔ غرض یہ ایک سِر ہے جس کو جاہلوں نے سمجھا نہیں اور اپنی نادانی اور عداوتِ حق کی بنا پر اعتراض کر دیا ہے۔ اصل مفہوم کو جو اللہ تعالیٰ نے اس میں مقصود رکھا تھا چھوڑ دیا۔

اللہ کو قرض دینے کا مفہوم

اسی طرح پر ایک نادان کہتا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرہ : ۲۴۶) (کون شخص ہے جو اللہ کو قرض دے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ گویا معاذ اللہ خدا بھوکا ہے۔ احمق نہیں سمجھتا کہ اس سے بھوکا ہونا کہاں سے نکلتا ہے؟ یہاں قرض کا مفہوم اصل تو یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کے واپس کرنے کا وعدہ ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ افلاس اپنی طرف سے لگا لیتا ہے۔ یہاں قرض سے مراد ہے کہ کون ہے جو خدا تعالیٰ کو اعمالِ صالحہ دے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی جزا اُسے کئی گنا کر کے دیتا ہے۔ یہ خدا کی شان کے لائق ہے جو سلسلہ عبودیت کا ربوبیت کے ساتھ ہے۔ اس پر غور کرنے سے اس کا یہ مفہوم صاف سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ بِدُوں کسی نیکی، دُعا اور التجا اور بِدُوں تفرقہ کافر و مومن کے ہر ایک کی پرورش فرما رہا

ہے اور اپنی ربُوبیت اور رحمانیت کے فیض سے سب کو فیض پہنچا رہا ہے۔ پھر وُہ کسی کی نیکیوں کو کب ضائع کرے گا؟ اُس کی شان تو یہ ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ (الزلزال : ۸) جو ذرہ بھی نیکی کرے اس کا بھی اجر دیتا ہے اور جو ذرہ بدی کرے گا۔ اس کی پاداش بھی ملے گی۔ یہ ہے قرض کا اصل مفہوم جو اس آیت سے پایا جاتا ہے، چونکہ اصل مفہوم قرض کا اس سے پایا جاتا تھا اس لیے یہی کہہ دیا مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرۃ : ۲۴۶) اور اس کی تفسیر اس آیت میں موجود ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال : ۸)۔

عیسائیوں پر اُفتاد کی وجہ

جاہل عیسائی جنھوں نے ایک عاجز اور ناتوان انسان کو خدا بنالیا ہے اور اپنی بدکاریوں اور گناہوں کی گٹھڑی اُس کے سر پر رکھ دی ہے اور اُسے ملعُون تسلیم کیا ہے۔ باوجودیکہ اُن کے پاس لعنت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دُوسروں پر اعتراض کرتے ہیں۔ چونکہ خدا تعالیٰ کی پاک شریعت کو کفارہ کی بنا پر رَدّ کر چکے ہیں۔ اعمالِ صالحہ میں جو ایک لذت اور سُرور ہوتا ہے، وہ اُنہیں حاصل نہیں رہا اور خدا تعالیٰ کے سارے راستبازوں کو بٹمار اور ڈاکو قرار دینے کی وجہ سے ان پر وہ لعنت پڑی ہے۔ اس لیے یہ بات کبھی بھُولنی نہیں چاہیے کہ خدا تعالیٰ کے راستبازوں کا انکار اور تکذیب ایک ایسی شے ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے اور اُس کی رُوحانی طاقتوں اور قوتوں کے لیے زہرِ قاتل کا کام کرتی ہے۔ جو صادق کی نسبت سُوءِ ظن کرتا ہے اور اس کی بےادبی کرتا ہے وہ حقائق اور معارف سے بےنصیب کر دیا جاتا ہے۔ یہ لعنت عیسائیوں پر پڑی ہے کہ اُنھوں نے سارے راستبازوں کو خطاکار ٹھہرایا

غرض اس آیت میں یہ لطیفہ ہے کہ بارشوں کا جسمانی طور پر ایک نظام ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ اب بارش کے دن قریب ہیں۔ مثلاً یہ جانتے ہیں کہ پوہ اور ماگھ کے دنوں میں بارش ہوتی ہے اور ساون اور بھادوں کے دنوں میں ہوتی ہے۔ پھر ایک یہ راز ہے کہ بارش بیہودہ کبھی نہیں ہوتی۔ درحقیقت وہی اوقات بارش کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر رُوحانی بارشوں کا سِلسلہ چلتا ہے۔ یہ ایک نظری بحث ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے موٹی موٹی باتوں کو بطور شواہد کے پیش کیا ہے اور قَسم کا لفظ شاہد کا قائم مقام بیان فرمایا۔ اس لفظ کو اسی طرح بیان کیا ہے، جس طرح پر قرض کے لفظ کو جسے میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔

محدّثین اور مجدّدین کا سِلسلہ

اب ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ ایک بارش تخم ریزی کے لیے ہوتی ہے اور پھر ایک بارش اس تخم کے نشو و نما اور سرسبزی کے لیے ہوتی ہے۔ اسی طرح نبوت کی بارش تخم ریزی کے لیے ہوتی ہے اور محدّثین اور مجدّدین کی بارش جو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر : ۱۰) کے ضمن میں داخل ہیں۔ اس تخم کے بارور کرنے اور نشو و نما دینے کے لیے میں نے بارہا اس امر کا ذکر کیا ہے کہ نبوّت اُلوہیت کے لیے بطور میخ کے ہوتی ہے۔ جو شخص نبوّت کا انکار کرتا ہے، رفتہ رفتہ وہ اُلوہیت کے

کے انکار تک پہنچ جاتا ہے اور نبوّت کے لیے ولایت بطور مینخ کے ہوتی ہے۔ ولی کے انکار سے رفتہ رفتہ سلبِ ایمان ہو جاتا ہے۔

اس وقت دیکھو کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کو تیرہ سو برس سے زائد عرصہ گذر گیا۔ اگر خدا تعالیٰ اس وقت تک بالکل خاموش رہتا اور اپنی تجلّی نہ فرماتا تو اسلام ایک قصّہ اور کہانی سے بڑھ کر کوئی وقعت نہ رکھتا اور اسکو دُوسرے مذاہب پر کوئی خصوصیت اور فضیلت نہ ہوتی۔ جیسے ہندو اپنے بزرگوں سے منسوب خوارق کو پُرانوں اور شاستروں میں لکھا ہوا بیان کرتے ہیں اور دکھا کچھ نہیں سکتے، اسی طرح پر اسلام کے اعجازی نشانوں کا ذکر مسلمان انہی کتابوں ہی میں بتلاتے اور دکھا کچھ نہ سکتے، تو دوسرے مذاہب پر اس کو کیا فضیلت رہتی اور انسان کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اگر اسے دُوسرے پر کوئی فضیلت نظر نہ آئے، تو اس سے بے رغبتی اور بے دلی ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح پر گویا اسلام سے ایک قسم کا ضُعفِ ایمان پیدا ہوتا ہے، کیونکہ بدُوں فضیلت کے ایمان قوی رہ سکتا ہی نہیں۔ اس لیے نبوّت کی زراعت کے واسطے ولایت ایک باڑ لگا دی گئی ہے۔ پس غور کر کے دیکھو کہ قسم پر اعتراض کرنے والوں کا جواب کیسا صاف اور لطیف ہے۔

فترتِ وحی کی حکمت

اس مضمون کو دیکھ کر انسان کس قدر انشراح کے ساتھ قبول کر سکتا ہے کہ قرآن کریم کس قدر عالی مضامین کو کیسے انداز اور طرز سے بیان کرتا ہے پھر قرآن شریف میں ایک مقام پر رات کی قسم کھائی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت کی قسم ہے۔ جب وحی کا سلسلہ بند تھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک مقام ہے جو ان لوگوں کے لیے، جو سلسلۂ وحی سے اِفاضہ حاصل کرتے ہیں، آتا ہے۔ وحی کے سلسلہ سے شوق اور محبت بڑھتی ہے، لیکن مفارقت میں بھی ایک کشش ہوتی ہے جو محبت کے مدارجِ عالیہ پر پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس سے قلق اور کرب میں ترقی ہوتی ہے اور روح میں ایک بیقراری اور اضطراب پیدا ہوتا ہے جس سے وُہ دعاؤں کی رُوح اس میں نفخ کی جاتی ہے کہ وہ آستانۂ اُلوہیت پر یا رب! یا رب!! کہہ کر اور بڑے جوش اور شوق اور جذبہ کے ساتھ دوڑتی ہے۔ جیسا کہ ایک بچّہ جو تھوڑی دیر کے لیے ماں کی چھاتیوں سے الگ رکھا گیا ہو۔ بے اختیار ہو کر ماں کی طرف دوڑتا اور چلاتا ہے، اسی طرح پر بلکہ اس سے بھی بیحد اضطراب کے ساتھ رُوح اللہ کی طرف دوڑتی ہے اور اس دَوڑ دُھوپ اور قلق و کرب میں وہ لذّت اور سرور ہوتا ہے جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو! رُوح میں جس قدر اضطراب اور بے قراری خدا تعالیٰ کے لیے ہوگی۔ اسی قدر دُعاؤں کی توفیق ملے گی اور اُن میں قبولیت کا نفخ ہوگا۔ غرض یہ ایک زمانہ ماموروں اور مُرسلوں اور اُن لوگوں پر جن کے ساتھ مکالماتِ الٰہیہ کا ایک تعلق ہوتا ہے، آتا ہے اور اس سے غرض اللہ تعالیٰ کی یہ ہوتی ہے کہ تا اُن کو محبت کی چاشنی اور قبولیتِ دعا کے ذوق سے حصّہ دے اور اُن کو اعلیٰ مدارج پر پہنچا دے تو یہاں جو ضُحیٰ اور لَیْل کی قسم کھائی، اس میں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے

کے مدارجِ عالیہ اور مراتبِ محبت کا اظہار ہے اور آگے پیغمبرِ خدا کا ابرار کیا کہ دیکھو دن اور رات جو بناتے ہیں۔ ان میں کس قدر وقفہ ایک دُوسرے میں ڈال دیا ہے۔ ضُحیٰ کا وقت بھی دیکھو اور تاریکی کا وقت بھی خیال کرو۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ۔ خدا تعالیٰ نے تجھے رُخصت نہیں کر دیا۔ اس نے تجھ سے کینہ نہیں کیا بلکہ ہمارا یہ ایک قانون ہے۔ جیسے رات اور دن کو بنایا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ایک قانون ہے کہ بعض وقت وحی کو بند کر دیا جاتا ہے تاکہ اُن میں دُعاؤں کے لیے زیادہ جوش پیدا ہو۔ اور ضُحیٰ اور لَیل کو اس لیے بطور شاہد بیان فرمایا۔ تا آپؐ کی اُمید وسیع ہو اور تسلّی اور اطمینان پیدا ہو۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کے بیان کرنے سے اصل مدّعا یہ رکھا کہ تا بدیہات کے ذریعہ نظریات کو سمجھائے اب سوچ کر دیکھو کہ یہ کیسا پُرحکمت مسئلہ تھا۔ مگر ان بدبختوں نے اس پر بھی اعتراض کیا ؎

چشمِ بد اندیش کہ برکندہ باد   عیب نماید ہنرش درنظر

اِن قسموں میں ایسا فلسفہ بھرا ہوا ہے کہ حکمت کے اَبواب کھلتے ہیں۔

اس زمانہ کا جہاد

غرض یہ حرب ہمارا کام ہے جس کی آج ضرورت ہے۔ اس سے علوم کے دروازے بھی کھلتے ہیں اور مخالف بھی حجّت اور بیّنہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور یہ خدا کا فضل ہے کہ پنجاب کے لوگ جن معارف اور حقائق سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔ بلادِ شام اور دیگر ممالکِ اسلامیہ میں ان کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم پر تو یہ مصیبت آچکی ہے۔ ہر طرف سے حملہ پر حملہ ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم کو قوّتِ متفکرہ سے کام لینا پڑتا ہے اور دُعاؤں کے ذریعہ خدا تعالیٰ کے حضور ان مشکلات کو پیش کرنا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ہماری دستگیری فرماتا ہے اور اپنی پاک کتاب کے حقائق اور مَعارف سے اطلاع دیتا ہے۔ حکماء کہتے ہیں کہ جس قوّت کو چالیس دن استعمال نہ کیا جائے، وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک ماموں صاحب تھے، وہ پاگل ہو گئے۔ ان کی فصد لی گئی اور ان کو تاکید کی گئی کہ ہاتھ نہ ہلائیں۔ انھوں نے چند مہینے تک ہاتھ نہ ہلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ لکڑی کی طرح ہو گیا۔ غرض یہ ہے کہ جس عُضو سے کام نہ لیا جائے، وہ بے کار ہو جاتا ہے۔

ہندوؤں میں جوگی اور ایسا ہی راہب وغیرہ جو عورتوں کے قابل نہیں رہتے۔ اس کے دو ہی سبب ہوتے ہیں یا تو بدمعاشیوں کی کثرت کی وجہ سے یا انقطاعِ کُلّی کے بعد اور اس امر کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ جن اعضاء کو بیکار چھوڑا گیا۔ وہ آخر بالکل نکمّے ہو گئے۔

اِس وقت ہم پر قلم کی تلواریں چلائی جاتی ہیں۔ اور اعتراضوں کے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی قوّتوں کو بیکار نہ کریں اور خدا کے پاک دین اور اس کے برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کے اثبات کے لیے اپنی قلموں کے نیزوں کو تیز کریں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑھ کر ہم کو یہ موقع

دیا کہ اس نے سلطنت انگریزی میں ہم کو پیدا کیا۔

احسان کی قدر کرنا ہماری سرشت میں ہے

محسن کے احسانات کی شکرگذاری کے اصول سے ناواقف جاہل ہمارے اس قسم کے بیانات اور تحریروں کو خوشامد کہتے ہیں، مگر ہمارا خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم دُنیا میں کسی انسان کی خوشامد کر سکتے ہی نہیں۔ یہ قوت ہی ہم میں نہیں ہے۔ ہاں احسان کی قدر کرنا ہماری سرشت میں ہے اور محسن کُشی اور غداری کا ناپاک مادہ اُس نے اپنے فضل سے ہم میں نہیں رکھا۔ ہم گورنمنٹ انگلشیہ کے احسانات کی قدر کرتے ہیں اور اس کو خدا کا فضل سمجھتے ہیں کہ اس نے ایک عادل گورنمنٹ کو سکھوں کے پُرجفا زمانہ سے نجات دلانے کے لیے ہم پر حکومت کرنے کو کئی ہزار کوس سے بھیج دیا۔ اگر اس سلطنت کا وجُود نہ ہوتا، تو مَیں سچ کہتا ہوں کہ ہم اس قسم کے اعتراضوں کی بابت ذرا بھی سوچ نہ سکتے چہ جائیکہ ہم اُن کا جواب دے سکتے۔

اب ہم اُن اعتراضوں کا جواب بڑی آزادی سے دے سکتے ہیں۔ پھر ہم اگر اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر نہ کریں تو یقیناً سمجھو کہ بڑے ناقدرشناس اور ناشکرگذار ہوں گے۔ ہم کو غور اور فکر کا موقع ملا، دُعاؤں کا موقع ملا اور اس طرح پر خدا تعالیٰ نے اپنے فضل کے ابواب ہم پر کھولے؛ اگرچہ مبدءِ فیض وُہی ہے، لیکن انسان اپنے میں ایک شئے قابل بناتا ہے۔ اس پر بلحاظ اس کی استعداد اور ظرف کے فیض ملتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس تقریب کی وجہ سے ہندوستان اور پنجاب کے رہنے والے جوہرِ قابل بن رہے ہیں اور ان کی علمی طاقتیں بھی ترقی کر رہی ہیں۔

اس زمانہ کا ہتھیار قلم ہے

مختصر یہ کہ یہ مقام دُارالحرب ہے پادریوں کے مقابلہ میں۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہرگز بیکار نہ بیٹھیں۔ مگر یاد رکھو کہ ہماری حَرب اُن کے ہمرنگ ہو جس قسم کے ہتھیار لے کر میدان میں وہ آتے ہیں، اُسی طرز کے ہتھیار ہم کو لے کر نکلنا چاہیے اور وہ ہتھیار ہے **قلم**۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کا نام **سُلطان القلم** اور میرے قلم کو **ذُوالفقارِ علی** فرمایا۔ اس میں یہی سِر ہے کہ زمانہ جنگ و جدل کا نہیں ہے، بلکہ قلم کا زمانہ ہے۔

فتح کے لیے تقویٰ کی ضرورت ہے

پھر جب یہ بات ہے تو یاد رکھو کہ حقائق اور معارف کے دروازوں کے کھلنے کے لیے ضرورت ہے تقویٰ کی، اس لیے تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (النحل: ۱۲۹) اور مَیں گن نہیں سکتا کہ یہ الہام مجھے کتنی مرتبہ ہوا ہے۔ بہت ہی کثرت سے ہوا ہے۔

اگر ہم زری باتیں ہی باتیں کرتے ہیں، تو یاد رکھو کہ کچھ فائدہ نہیں ہے۔ فتح کے لیے ضرورت ہے تقویٰ کی۔ فتح

چاہتے ہو، تو متقی بنو۔

اشاعتِ اسلام کے لیے مالی قربانیوں کی ضرورت ہے

مَیں ہندوؤں اور عیسائیوں میں دیکھتا ہوں کہ عورتیں بھی بہت بڑی جائیدادیں اور روپیہ اس کام کے لیے وصیت کر جاتے ہیں۔ آجکل کے مُسلمانوں میں اس قسم کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

ہمارے لیے جو بڑی سے بڑی مشکل ہے وُہ اشاعت کے لیے مالی امداد کی ضرورت ہے۔ یہ تو تم یاد رکھو کہ آخر خدا تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے اُس نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ وہ خود ہی اس کا حامی و ناصر ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ اپنے بندوں کو ثواب کا مستحق بنا دے، اس لیے نبیوں کو مالی امداد کی ضرورت ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مدد مانگی۔ اُسی طرز پر جو منہاجِ نبوّت کی طرز ہے۔ ہم بھی اپنے دوستوں کو سلسلہ کی ضروریات سے اطلاع دیا کرتے ہیں، مگر مَیں پھر یہی کہوں گا کہ اگر ہم کچھ روپیہ بھی اشاعت کے لیے جمع کریں، تو یہ تو ظاہر بات ہے کہ اس قدر نہیں کر سکتے جس قدر پادریوں کے پاس ہے اور اگر اتنا بھی کریں تو بھی میرا ایمان یہی ہے کہ فتح اسی کو ملتی ہے، جس سے خدا خوش ہو۔

اخلاق و اعمال میں ترقی کریں

اس لیے ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور اعمال میں ترقی کریں۔ اور تقویٰ اختیار کریں تاکہ خدا تعالیٰ کی نصرت اور محبت کا فیض ہمیں ملے۔ پھر خدا کی مدد کو لے کر ہمارا فرض ہے اور ہر ایک ہم میں سے جو کچھ کر سکتا ہے، اس کو لازم ہے کہ وہ ان حملوں کے جواب دینے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ ہاں جواب دیتے وقت نیت یہی ہو کہ خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر ہو۔[۱]

جنوری ۱۸۹۸ء

مرکز میں آنے کی تلقین

فرمایا: لوگ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر یہ تو کہہ جاتے ہیں کہ دین کو دُنیا پر ترجیح دُوں گا، لیکن یہاں سے جا کر اس بات کو بھول جاتے ہیں وہ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اگر وُہ یہاں نہ آویں گے؟ دُنیا نے انکو پکڑ رکھا ہے۔ اگر دین کو دُنیا پر ترجیح ہوتی، تو وہ دنیا سے فرصت پا کر یہاں آتے۔[۲]

یکم فروری ۱۸۹۸ء

"آج تیسرا روز ہے۔ الہام ہوا کہ یَوْمَ تَاْتِیْکَ الْغَاشِیَۃُ۔ یَوْمَ تَنْجُوْ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ۔ یعنی ایک خوفناک غشی ڈالنے والا۔ انسان کو چاروں طرف سے گھیرنے والا وقت آنے والا ہے۔ اس وقت ہر ایک شخص اپنے اعمال کے سبب سے نجات پائے گا۔ اس وقت ہم ہر ایک

---

[۱] (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۰-۲۲ پرچہ ۱۹۰۱ء) [۲] (بدر جلد ۱۱ نمبر ۴-۵ صفحہ ۳ پرچہ ۱۶ نومبر ۱۹۱۱ء)

شخص کو اس کے اعمال کے موافق جزا دیں گے۔"

حضرتِ اقدسؑ نے اِن الہامات کے بعد جماعت کو بڑی تاکید کی کہ تیاری کرو۔ نمازوں میں عاجزی کرو۔ تہجد کی عادت ڈالو۔ تہجد میں رو رو کر دُعائیں مانگو کہ خدا تعالیٰ گڑگڑانے والوں اور تقویٰ اختیار کرنیوالوں کو ضائع نہیں کرتا۔

ہمارے مبارک امام علیہ السلام بھی بار بار یہی وصیت فرماتے ہیں کہ جماعت متّقی بن جاوے اور نمازوں میں خشوع وخضوع کی عادت کریں اور ایک روز بڑے دَرد سے فرمایا کہ اصلاح وتقویٰ پیدا کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تم میری راہ میں روک بن جاؤ۔[1]

بیرونی ممالک جانیوالوں کے لیے خاص نصائح

بابو محمد افضل صاحب نے ہندوستان سے افریقہ کی طرف روانگی کے موقعہ پر حضرت مسیح موعودؑ سے عرض کی کہ بعض غفلت کے مقامات سے شکوک وشبہات ونفسانی ظلمتوں کا ایک دریا ہمراہ لائے تھے اور اب پھر اُنہی مقامات کو جانا ہے، اس لیے دُعا کی جائے۔ حضرتِ اقدسؑ نے ایسی مشکلات سے نکلنے کے لیے مندرجہ ذیل چار امر بطور علاج بتائے:

(۱) قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہنا۔ (۲) موت کو یاد رکھنا۔ (۳) سفر کے حالات قلمبند کرتے رہنا۔ (۴) اگر ممکن ہو تو ہر روز ایک کارڈ لکھتے رہنا۔[2]

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک دُعا

پاک کلماتِ دُعائیہ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے مبارک ہونٹوں سے نکلے ہوتے ہیں۔

"اے ربّ العالمین! تیرے احسانوں کا مَیں شکر نہیں کر سکتا۔ تُو نہایت ہی رحیم وکریم ہے اور تیرے بے غایت مجھ پر احسان ہیں۔ میرے گناہ بخش تا مَیں ہلاک نہ ہو جاؤں۔ میرے دل میں اپنی خالص محبت ڈال تا مجھے زندگی حاصل ہو اور میری پردہ پوشی فرما اور مجھ سے ایسے عمل کرا جن سے تو راضی ہو جائے۔ مَیں تیرے وجہِ کریم کے ساتھ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر وارد ہو۔ رحم فرما اور دُنیا اور آخرت کی بلاؤں سے مجھے بچا کہ ہر ایک فضل وکرم تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ آمین۔ ثم آمین۔"[3]

---

[1] منقول از خط مولوی عبدالکریم صاحبؓ۔ محررہ ۴؍فروری ۱۸۹۸ء مندرجہ الحکم جلد ۲۔ نمبر ۱ صفحہ ۱ پرچہ ۶؍مارچ ۱۸۹۸ء۔

[2] الحکم جلد ۲ نمبر ۵،۶ صفحہ ۱۲ پرچہ ۱۳ و ۲۰۔ اپریل ۱۸۹۸ء۔ [3] الحکم جلد ۲ نمبر ۱ صفحہ ۹ پرچہ ۲۰؍فروری ۱۸۹۸ء۔

حضرت اقدسؑ کی پاک باتیں

۲۴؍فروری ۱۸۹۸ء

مُرید اور مُرشد کا تعلق فرمایا: مُرید و مُرشد کے تعلقات ایسے ہوتے ہیں کہ ماں باپ اولاد کو اتنا عزیز نہیں سمجھتے، جتنا مُرشد مُرید کو جانتا ہے۔ ماں باپ جسمانی تربیت اور تعلیم کے لیے کوششیں کرتے ہیں، مگر مُرشد مُرید کی رُوحانی پیدائش کا موجب ہوتا ہے اور اس کی اندرونی تعلیم اور تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے بشرطیکہ راستباز ہو۔ اگر ریاکار اور دھوکہ باز ہو تو وہ دشمن سے بھی بدتر ہوتا ہے۔[1]

فروری ۱۸۹۸ء

کثرتِ ازدواج کثرتِ ازدواج کے متعلق صاف الفاظ قرآن کریم میں دو دو، تین تین، چار چار کر کے ہی آئے ہیں مگر اسی آیت میں اعتدال کی بھی ہدایت ہے۔ اگر اعتدال نہ ہو سکے اور محبت ایک طرف زیادہ ہو جائے یا آمدنی کم ہو اور یا قوائے رجولیت ہی کمزور ہوں تو پھر ایک سے تجاوز کرنا نہیں چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہی بہتر ہے کہ انسان اپنے تئیں ابتلاء میں نہ ڈالے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ (البقرہ : ۱۹۱)

غرض اگر حلال کو حلال سمجھ کر بیویوں کا ہی بندہ ہو جائے، تو بھی غلطی کرتا ہے۔ ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی منشاء کو نہیں سمجھ سکتا۔ اُس کا یہ منشاء نہیں کہ بالکل زن مُرید ہو کر نفس پرست ہی ہو جاؤ اور وُہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ رہبانیت اختیار کرو بلکہ اعتدال سے کام لو اور اپنے تئیں بے جا کارروائیوں میں نہ ڈالو۔

انبیاء علیہم السلام کے لیے کوئی نہ کوئی تخصیص اگر اللہ تعالیٰ کر دیتا ہے، تو یہ کوتاہ اندیش لوگوں کی اَبلہ فریبی اور غلطی ہے کہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ دیکھو توریت میں کاہنوں کے فرقہ کے ساتھ خاص مراعات ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اور ہندوؤں کے برہمنوں کے لیے خاص رعائتیں ہیں۔ پس یہ نادانی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی کسی تخصیص پر اعتراض

---

[1] (الحکم جلد ۳ نمبر ۲ پرچہ ۹؍جون ۱۸۹۹ء)

کیا جاوے۔ ان کا نبی ہونا ہی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو اور لوگوں میں موجود نہیں۔

خدا کا تلوّن رحمت ہے

خدا کا تلوّن بھی رحمت ہے۔ دیکھو یونس علیہ السلام کی قوم کے معاملہ میں قطعی الہام دے کر جب لوگوں نے چیخنا چلانا شروع کیا تو عذاب ٹلا دیا اور رحمت کے ساتھ ان پر نگاہ کی پس خدا کے تلوّن میں بھی ایک خاص لطف ہے، مگر اس کو وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں، جو اس کے سامنے روتے اور عجز و نیاز ظاہر کرتے ہیں مجھے بارہا تعجب آتا ہے کہ لوگ اپنے جیسے انسان کی خوشامد تو کرتے ہیں، مگر افسوس خدا کی خوشامد نہیں کرتے۔

قبولیتِ دُعا میں توقف کامیابی کا موجب ہے

یہ یاد رکھو کہ دُعا کے لیے اگر جلدی جواب مل جاوے تو عموماً اچھا نہیں ہوتا۔ پس دُعا کرتے ناامید نہ ہو۔ دُعا میں جس قدر دیر ہو اس کا بظاہر کوئی جواب نہ ملے تو خوش ہو کر سجدہ ہائے شکر بجالاؤ۔ کیونکہ اس میں بہتری اور بھلائی ہے۔ توقف کامیابی کا موجب ہوتا ہے۔

یونس علیہ السلام کی قوم سے عذاب ٹلنے کی وجہ

دُعا بہت بڑی سپر کامیابی کے لیے ہے۔ یونسؑ کی قوم گریہ وزاری اور دُعا کے سبب آنیوالے عذاب سے بچ گئی۔ میری سمجھ میں مجابت مغاضبت کو کہتے ہیں اور حُوت مچھلی کو کہتے ہیں اور نُون تیزی کو بھی کہتے ہیں اور مچھلی کو بھی۔ پس حضرت یونسؑ کی وہ حالت ایک مغاضبت کی تھی۔ اصل یُوں ہے کہ عذاب کے ٹل جانے سے ان کو شکوہ اور شکایت کا خیال گزرا کہ پیشگوئی اور دُعایوں ہی رائیگاں گئی اور یہ بھی خیال گزرا کہ میری بات پوری کیوں نہ ہوئی۔ پس یہی مغاضبت کی حالت تھی۔ اس سے ایک سبق ملتا ہے کہ تقدیر کو اللہ بدل دیتا ہے اور رونا دھونا اور صدقات فردِ قرار دادِ جُرم کو بھی ردّی کر دیتے ہیں۔ اُصول خیرات کا اسی سے نکلا ہے۔ یہ طریق اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہیں۔ علم تعبیر الرّؤیا میں مال کلیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے خیرات کرنا جان دینا ہوتا ہے۔ انسان خیرات کرتے وقت کس قدر صدق و ثبات دکھاتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ صرف قیل و قال سے کچھ نہیں بنتا، جبتک کہ عملی رنگ میں لا کر کسی بات کو نہ دکھایا جاوے۔ صدقہ اس کو اسی لیے کہتے ہیں کہ صادقوں پر نشان کر دیتا ہے۔ حضرت یونسؑ کے حالات میں درِ منثور میں لکھا ہے کہ آپ نے کہا کہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ جب تیرے سامنے کوئی آوے گا۔ تجھے رحم آجائے گا ؎

ایں مُشتِ خاک را گر نہ بخشم چہ کنم

نمازِ عید شہر میں پڑھنے کی تعبیر

مُنشی رستم علی کورٹ انسپکٹر دہلی کے خواب کی تعبیر میں فرمایا کہ نمازِ عید شہر میں پڑھنا بہت بڑی کامیابی ہے۔

ابولہب اور حَمَّالَۃَ الحَطَبِ سے مراد

ابُولہب قرآن کریم میں عام ہے نہ خاص۔ مراد وہ شخص ہے جس میں التہاب و اشتعال کا مادۃ ہو۔ اسی طرح حمالۃ الحطب۔ ہیزم کش عورت سے مراد ہے۔ جو سخن چین ہو۔ آگ لگانے والی چغلخور عورت آدمیوں میں شرارت کو بڑھاتی ہے۔ سعدی کہتا ہے ؎

سُخن چین بدبخت ہیزم کش است

سورۃ تَبَّتْ پر اعتراض سُنکر فرمایا

دُنیا کی دولت اور سلطنت رُشک کا مقام نہیں۔ مگر رشک کا مقام دُعا ہے۔ مَیں نے اپنے احباب حاضرین اور غیر حاضرین کے لیے جن کے نام یاد آتے یا شکل یاد آئی۔ آج بہت دعا کی اور اتنی دُعا کی کہ اگر خشک لکڑی پر کی جاتی تو سرسبز ہو جاتی۔ ہمارے احباب کے لیے یہ بڑی نشانی ہے۔

رمضان کا مہینہ الحمدللہ گزر گیا۔ عافیت اور تندرستی سے یہ دن حاصل رہے۔ پھر اگلا سال خدا جانے کس کو آئے گا۔ کس کو معلوم ہے کہ اگلے سال کون ہوگا۔ پھر کس قدر افسوس کا مقام ہوگا۔ اگر اپنی جماعت کے ان لوگوں کو فراموش کر دیا جاوے جو انتقال کر گئے ہیں۔ یہ ایسے وقت میں فرمایا کہ جب فہرست میں زندوں کے نام ثبت ہو رہے تھے۔

ظاہر پرستی گمراہی کا موجب ہے

ظاہر پرستی سے یہُود گمراہ ہو گئے۔ ظاہر پرستی سے یہودیوں پر یہ آفت آئی کہ وہ مسیح علیہ السلام کا انکار کرتے رہے اور نہ صرف یہی بلکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی انکار کرتے رہے۔ اُن کو یہ خیال تھا کہ مسیح آئے گا تو ایک بادشاہ ہو کر آئیگا۔ اور بڑی شان و شوکت سے تختِ داؤد پر جلوہ افروز ہوگا اور اس کے آنے سے پیشتر ایلیا آسمان سے اُترے گا، مگر جب مسیح آیا۔ تو اس نے ایلیا تو یوحنّا کو بتایا اور آپ بجائے بادشاہ ہونے کے ایسی عاجزی دکھائی کہ سر رکھنے کو بھی جگہ نہ ملی۔ اب ظاہر پرست یہودی کیونکر مان لیتے۔ پس انہوں نے بڑے زور سے انکار کیا اور اب تک کر رہے ہیں۔ یہی مصیبت ہمارے زمانہ کے مولویوں اور مُلاؤں کو پیش آئی۔ وہ منتظر ہیں کہ مسیح اور مہدی آکر لڑائیاں کرے گا، مگر خدا تعالیٰ نے یہ امر ہی ملحوظ نہ رکھا تھا اور بخاری نے یَضَعُ الْحَرْبَ کہہ کر اس کا قضیہ ہی چکا دیا تھا۔ یہ امن اور سلامتی کے خواستگار کو ماننا نہیں چاہتے۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۲ ۔ پرچہ ۶ ر مارچ ۱۸۹۸ء

فروری ۱۸۹۸ء

آخرت پر نظر رکھنے والے ہمیشہ مبارک ہیں

مَیں دیکھتا ہوں کہ باوجود مصائب پر مصائب آنے کے اور ہر طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی دینے کے لوگ ابھی تک سنگدلی اور عُجب و نخوت سے کام لے رہے ہیں۔ نادان کب تک اس بے فکری میں بسر کریں گے۔ تا وقتیکہ لوگ ضِد نہیں چھوڑتے۔ اپنی بُری کرتوتوں سے باز نہیں آتے اور خدا تعالیٰ سے مصالحت نہیں کرتے، یہ بلائیں اور مصیبتیں دُور نہیں ہونے کی۔ مَیں نے دیکھا ہے اور خوب غور کیا ہے کہ قحط کے دنوں میں لوگوں نے ذرا بھی قحط کی مصیبت کو محسوس نہیں کیا۔ شراب خانے اسی طرح آباد تھے اور بدکاریوں اور بدمعاشیوں کے بازار برابر گرم تھے۔ ابتداء میں جب کبھی کوئی برائے نام فتوے مکّہ مدینہ کے نام سے آجایا کرتا تھا، تو لوگ ڈر جایا کرتے تھے اور مسجدیں آباد ہو جاتی تھیں، مگر اس وقت شوخی اور بیباکی حدسے بڑھ چلی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی فضل کرے۔

عقلمند وُہ ہے جو عذاب آنے سے پیشتر اس کی فکر کرتا ہے اور دُور اندیش وُہ ہے جو مصیبت سے پہلے اُس سے بچنے کی فکر کرے۔

انسان کو یہی لازم ہے کہ آخرت پر نظر رکھ کر بُرے کاموں سے توبہ کرے، کیونکہ حقیقی خوشی اور سچّی راحت اسی میں ہے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ کوئی بدکاری اور گناہ کا کام ایک لحظہ کے لیے بھی سچّی خوشی نہیں دے سکتا۔ بدکار بدمعاش کو تو ہر دم اظہارِ راز کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ پھر وُہ اپنی بدعملیوں میں راحت کا سامان کہاں دیکھے گا۔ آخرت پر نظر رکھنے والے ہمیشہ مبارک ہیں۔ ؏

مردِ آخر بیں مُبارک بندہ ایست

دیکھو اُن قوموں کا حال جن پر وقتاً فوقتاً عذاب آئے۔ ہر ایک کو یہی لازم ہے کہ اگر دل سخت بھی ہو تو اسے ملامت کرکے خشوع خضوع کا سبق دے۔ رونا اگر نہیں آتا، تو رونی صورت بنادے پھر خود بخود آنسو بھی نکل آئیں گے۔

اپنے اندر پاک تبدیلی پیدا کریں

ہماری جماعت کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وُہ اپنے اندر پاک تبدیلی کریں، کیونکہ اُن کو تو تازہ معرفت ملتی ہے اور اگر معرفت کا دعویٰ کرکے کوئی اس پر نہ چلے۔ تو یہ نِری لاف گزاف ہی ہے۔ پس ہماری جماعت کو دوسروں کی سُستی غافل نہ کردے اور اس کو کاہلی کی جُرأت نہ دلائے۔ وہ ان کی محبت سرد دیکھ کر خود بھی دل سخت نہ کرلے۔

انسان بہت آرزوئیں اور تمنائیں رکھتا ہے۔ مگر غیب کی قضاء و قدر کی کس کو خبر ہے۔ زندگی آرزوؤں کے

موافق نہیں چلتی۔ تمنّاؤں کا سلسلہ اور ہے، قضاء وقدر کا سلسلہ اور ہے۔ اور وُہی سچا سلسلہ ہے۔ خدا کے پاس انسان کے سوانح سچے ہیں۔ اسے کیا معلوم ہے اس میں کیا لکھا ہے۔ اس لیے دل کو جگا جگا کر غور کرنا چاہیے۔

توحید کا ایک پہلو توحید کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت میں اپنے نفس کے اغراض کو بھی درمیان سے اُٹھا دے اور اپنے وجود کو اس کی عظمت میں محو کر دے۔[1]

یکم مئی ۱۸۹۸ء

خلافِ اسلام کتابوں کی ضبطی "جناب مولانا مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی کے وُہ میموریل پڑھ چکنے کے بعد جو حضرت مسیح موعودؑ نے انجمن حمایتِ اسلام کے میموریل دربارہ "اُمّہات المومنین" کی اصلاح کی غرض سے لکھا تھا۔ حضرتِ اقدسؑ نے باآوازِ بلند فرمایا":

"چونکہ یہ میموریل اسلام اور اہلِ اسلام کی حمایت اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی عزت اور قرآنِ کریم کی عظمت قائم کرنے اور اسلام کی پاکیزہ اور اصفی اشکل دکھانے کے لیے لکھا گیا ہے، اس لیے اس کو آپ صاحبان کے سامنے پڑھے جانے سے صرف یہ غرض ہے کہ تا آپ لوگوں سے بطور مشورہ دریافت کیا جاتے کہ آیا مصلحتِ وقت یہ ہے کہ کتاب کا جواب لکھا جائے یا میموریل بھیج کر گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ وہ ایسے مصنّفین کو سرزنش کرے اور اشاعت بند کر دے۔ پس آپ لوگوں میں سے جو کوئی اس پر نکتہ چینی کرنا چاہے، تو وہ نہایت آزادی اور شوق سے کر سکتا ہے۔"

(مجمع میں سے) ایک شخص بولا کہ اگر کتاب کی اشاعت بند نہ ہوتی تو ہمیشہ تک طبع ہوتی رہے گی۔"

اس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا:

"اگر ہم واقعی طور پر کتاب کی اشاعت بند نہ کریں جو اس کے ردّ کرنے کی صُورت میں ہو سکتی ہے، تو گورنمنٹ سے ایک بار نہیں ہزار دفعہ اس قسم کی مدد لے کر اس کی اشاعت بند کی جائے، وہ رُک نہیں سکتی۔ اگر اس تھوڑے عرصہ کے لیے وُہ برائے نام بند بھی ہو جاتے، تو پھر بھی بہت سی کمزور طبیعت کے انسانوں اور بعض آنے والی نسلوں کے لیے یہ تجویز زہرِ قاتل ہوگی۔ کیونکہ جب اُن کو یہ معلوم ہوگا کہ فلاں کتاب کا جواب جب مُسلمانوں سے نہ ہو سکا تو اس کے لیے گورنمنٹ سے بند کرانے کی کوشش کی۔ اس سے ایک قسم کی بدظنّی ہمارے مذہب کی نسبت پیدا

---

[1] الحکم جلد ۲ مـ۳ پرچہ ۱۳ مارچ ۱۸۹۸ء

ہوگی۔ پس میرا یہ اُصول رہا ہے کہ ایسی کتاب کا جواب دیا جاوے اور گورنمنٹ کی ایک سچی امداد یعنی آزادی سے فائدہ اٹھایا جاتے اور ایسا شافی جواب دیا جائے کہ خود اُن کو اس کی اشاعت کرتے ہوتے ندامت محسوس ہو۔ دیکھو جیسے ہمارے مقدمہ ڈاکٹر کلارک میں اُن کو جب معلوم ہوگیا کہ مقدمہ میں جان نہیں رہی اور مصنوعی جادُو کا پُتلا ٹوٹ گیا، تو اُنھوں نے آتھم کی بیوی اور داماد جیسے گواہ بھی پیش نہ کیے۔ پس میری رائے یہی ہے اور میرے دل کا فتویٰ یہی ہے کہ اس کا دندان شکن جواب نہایت نرمی اور ملاطفت سے دیا جائے۔ پھر خدا چاہے گا تو ان کو خود ہی جُرأت نہ ہوگی[1]

۲؍مئی ۱۸۹۸ء بروز عید مقام قادیان زیر درخت بڑ۔ جانبِ شرقیہ۔ بعد نمازِ عید بتقریب جلسۂ طاعون۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مندرجہ ذیل تقسیر فرمائی

دُنیا فانی ہے

آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ اللہ جلشانہٗ نے قرآنِ شریف میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں بھی فرمایا ہے کہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ انسان، حیوان، چرند، پرند، زمین آسمان اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے کسی چیز کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف خدا ہی تھا۔ یہ اسلام کا عقیدہ ہے۔ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ۔ یعنی خدا کے ساتھ اور کوئی چیز نہ تھی۔ ہم کو اس نے قرآن اور حدیث کے ذریعہ خبر دی ہے کہ ایک زمانہ اور بھی آنیوالا ہے۔ جبکہ خدا کے ساتھ کوئی نہ ہوگا۔ وہ زمانہ بڑا خوفناک زمانہ ہے، کیونکہ اس پر ایمان لانا ہر مومن اور مسلمان کا کام ہے۔ جو شخص اس پر ایمان نہیں لاتا، وہ مسلمان نہیں کافر ہے اور بے ایمان ہے جس طرح سے بہشت، دوزخ، انبیاء اور کتابوں وغیرہ پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ ویسا ہی اُس ساعت پر ایمان لانا لازم ہے۔ جبکہ نفخ صُور ہوکر سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔ یہ سُنّت اللہ اور عادت اللہ ہے۔

آخرت کے وجُود پر تین دلائل اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے سمجھانے کے لیے تین طریق اختیار فرمائے ہیں:

ایکؔ یہ کہ انسان کو عقل دی ہے کہ اگر وُہ اس سے ذرا بھی کام لے اور غور کرے، تو یہ امر نہایت صفائی سے ذہن میں آسکتا ہے کہ انسان کی مختصر سی زندگی دوؔ عدموں کے درمیان واقع ہے۔ کبھی بھی ہمیشہ کے لیے باقی نہیں

---

[1] (رسالہ الانذار)

رہ سکتی۔ قیاس سے مجہولات کا پتہ لگ سکتا ہے اور انسان معلوم کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم غور کریں کہ ہمارے باپ دادے کہاں ہیں اور اسی ایک بات کو سوچیں، تو ہمیں یہ مان لینا پڑے گا کہ ہم سب کو بھی اسی راستہ پر چلنا ہوگا، جس پر وہ گئے ہیں۔ نادان ہے وُہ انسان جس کے سامنے ہزار ہا نمونے ہوں اور پھر بھی وہ اُن سے سبق حاصل نہ کرے اور عقل نہ سیکھے۔ عموماً دیکھا گیا ہے اور یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ہر گاؤں اور شہر میں زندہ لوگوں سے قبریں روز بروز زیادہ ہوتی جارہی ہیں اور بعض پُرانے لوگوں کی قبریں مخفی اور بعض ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ جب کسی شہر میں کنواں کھودا جاتا ہے، تو اس کی مٹی میں سے ہڈیاں نکلتی ہیں۔ گویا عام طور پر زمین کے نیچے ہر جگہ قبریں ہی قبریں موجود ہیں۔ یہ دُوسری بات ہے کہ وہ ظاہر طور پر نمودار نہ ہوں جس سے انسان کے نابُود شدہ طبقہ کا پتہ لگتا ہے۔

دوسری دلیل اس زمانہ کے وجُود پر یہ ہے کہ جس طرح پر کھیت میں سبزہ نکلتا ہے جو بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے مگر پھر ایک زمانہ اس پر آتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ زرد ہو کر خشک ہونے لگتا ہے اور پھر اس پر ایک دُوسری حالت آتی ہے کہ وہ گرنے لگتا ہے، تو اُس وقت جب اس طرح نقصان ہونے لگتا ہے تو بونے والا کسان اسے خود ہی کاٹ ڈالتا ہے تا ایسا نہ ہو کہ وہ اس طرح پر اُڑ اُڑ کر ضائع جاتے۔ ایسا ہی دُنیا خدا تعالیٰ کا کھیت ہے۔ جس طرح زمیندار مصلحت اور انجام بینی سے کبھی اپنے کھیت کو کچّا ہی کاٹ لیتا ہے اور کبھی ذرا پختہ ہونے پر کاٹتا ہے۔ اسی طرح سے ہم انسان بھی پرورش پاکر خداوندی مشیّت اور ارادے کے موافق ٹھیک اپنے اپنے وقت پر کاٹے جاتے ہیں۔ زمیندار کے فعل سے سبق اور عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ کیونکہ انسان کی زندگی کا بھی ٹھیک یہی طرز ہے۔ جس طرح سے بعض دانے اُگنے بھی نہیں پاتے بلکہ زمین کے اندر ہی اندر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض بچے شکمِ مادر ہی میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض دانے پیدا ہونے کے چند روز بعد ضائع ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی قانون اور عمل کے موافق انسان بھی بچہ، جوان اور بوڑھا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی مرضی کی درانتی اُسے وقتاً فوقتاً مصلحتِ الٰہی سے کاٹتی رہتی ہے۔ کبھی بچے مرتے ہیں جن کو کہتے ہیں کہ اُٹھرا سے مر گئے۔ صحیح البدن، توانا اور تندرست جوان بھی مرتے ہیں۔ پھر عمر رسیدہ ہو کر پیر ناتوان بھی آخر مر جاتے ہیں۔ غرض یہ سلسلہ قطع و بُرید کا دُنیا میں ایسا جاری ہے جو ہر آن انسانوں کو سبق دیتا رہتا ہے کہ دُنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں۔ پس یہ بھی ایک دلیل اس زمانہ کی آمد پر ہے۔

(۳) علاوہ ازیں اس زمانہ کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور دلیل بھی پیش کی ہے اور وُہ انبیاءؑ کے قہری معجزات ہیں جن کے باعث ایک ہی وقت میں دُنیا کے تختے اُلٹ دیئے گئے اور خلقت کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ انسان اللہ تعالیٰ کے قہر کے ہاتھ میں ہے۔ وُہ جب چاہے اُسے نابود کر دے۔ اسی امر کو اللہ تعالیٰ نے

دلیل کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ بعض امراض اس ہیبت اور شدت سے پھیلتی ہیں کہ جن لوگوں نے اُن کا دورہ دیکھا ہوگا، وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قیامت کا نمونہ ہوتا ہے۔

منجملہ اُن ہیبت ناک امراض کے ایک طاعون بھی ہے جو اس وقت ہمارے مُلک میں پڑی ہوئی ہے اور جس نے کراچی اور بمبئی میں بہت کچھ صفائی کر دی ہے اور اب پہاڑ پر سے (پالم پور) و نیز کلکتہ سے طاعون پھیلنے کی متوحش خبریں موصول ہوئی ہیں۔ غرض یہ ایک بڑا بھاری خطرہ ہے جو اس وقت سامنے ہے۔ اس لیے میری اِس تقریر کرنے سے غرض صرف یہ ہے کہ چونکہ انسان کو بڑے بڑے ابتلا پیش آتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ (البقرہ: ۱۵۶) یعنی ہم تمہیں آزماتے رہیں گے۔ کبھی ڈر سے اور کبھی مالوں میں نقصان کرنے سے اور کبھی ثمرات کو تلف کرنے سے۔

اتلافِ ثمرات سے مُراد

اتلافِ ثمرات سے مراد تفاسیر میں اولاد بھی لکھی ہے اور اسی میں کوششوں کا ضائع ہونا بھی شامل ہے۔ مثلاً حصولِ علم کی کوشش۔ تجارت میں کامیابی کی کوشش زمینداری کی کوشش۔ غرض ان کوششوں کا ضائع ہونا ایک بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ انسان کو ہر وقت خیال ہوتا ہے کہ کامیاب ہو جاؤں گا، مگر خدا تعالیٰ کے علم میں اس کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ ناکام رہے یا کھیتی پیدا نہیں ہوتی یا تجارت میں کامیاب نہیں ہوتا۔

طاعون۔ ایک قہری نشان

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے امتحان رکھے ہیں۔ اوّل خوف، دوم نقصانِ مال، سوم نقصانِ جان اور چہارم تلفِ ثمرات۔ مگر یہ ایک دہشتناک مقام اور خوف کی جگہ ہے کہ اس طاعون کی بیماری میں یہ ہر چہار امتحان مجموعی طور پر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ جن لوگوں کو واقعاتِ حاضرہ کی خبر ہے کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے اور انسان کیا کچھ بھگت رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وارداتِ طاعون سے درحقیقت یہ ہر چہار امتحان یکے بعد دیگرے پیش آجاتے ہیں۔ یہی نہیں کہ آدمی مر جاتا ہے، بلکہ گورنمنٹ انگلشیہ نے ایک خاص اور اشد ضرورت کی وجہ سے اور پھر مصلحت کی بناء پر جیسا کہ ایک مادرِ مہربان کو بعض دفعہ اپنے بچوں کی غور و پرداخت اور نگہداشت میں پیش آجاتی ہے۔ یہ قانون پاس کیا ہے کہ جس گھر میں طاعون کی واردات ہو۔ اس گھر سے تمام رہنے والے باہر نکال دیئے جائیں۔ اور عندالضرورت ہمسائے اور محلّہ دار بھی اور پھر اشد ضرورت کی صورت میں گاؤں کا گاؤں ہی خالی کر دیا جائے۔ بیمار الگ رکھے جائیں اور تندرست الگ۔ اور وُہ مقام جہاں ایسے لوگ رکھے جائیں کھلی ہوا میں ایسی جگہ پر ہو جس کے نشیب میں پانی نہ ہو اور تازہ ہوا کی خوب آمد و رفت ہو سکے۔ اس کے متصل ہی قبرستان بھی ہو تاکہ مرنے والے کو جلدی دفن کیا جا سکے۔ تا ایسا نہ ہو کہ اس کے تعفّن سے ہوا زیادہ زہریلی ہو جائے۔ یہ ایک ایسا

شدید ابتلاء ہے کہ جس کی وجہ سے بمبئی پونا اور بعض دیگر مقامات میں لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔

غرض گورنمنٹ نے ان تدابیر کے اختیار کرنے میں جو نیکی سوچی ہے اور درحقیقت اس میں نیکی ہی ہے۔ مگر اُسے بدی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ جس شخص سے نیکی کی جائے، وہ اُس نیکی کو بدی سمجھتا ہے۔ پھر اس پر مزید حیرت اور تعجب یہ ہے کہ گورنمنٹ نے یہ تدابیر انسدادِ مرض کچھ اپنے گھر سے وضع نہیں کیں بلکہ یونانی اطباء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جس گھر میں طاعون ہو جائے وہ نہ صرف اس گھر بلکہ شہر اور ملک تک کا صفایا کر دیتی ہے۔ اطباء نے اس کی بہت سی نظیریں بھی دی ہیں۔ کہ طاعون جیسی خوفناک مرض نے بس نہیں کیا جبتک کہ آبادی کو جنگل نہیں بنا دیا اور اسے اجاڑ نہیں دکھا دیا جسکی اکثر لوگوں کو خبر نہیں ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ باوجود دیکھنے یہ خطرناک مرض بہت بُری طرح پھیل رہی ہے اور ملک کے ایک بڑے بھاری حصّہ کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے، تاہم میں نہیں دیکھتا کہ لوگوں کو ایک کھا جانے والا غم پیدا ہوا ہو۔ جس کی وجہ سے وُہ توبہ اور استغفار میں مصروف ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ وُہ خدا تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتے ہوں یا نمازوں کی پابندی کا التزام کرتے ہوں بلکہ جہانتک دیکھا جاتا ہے۔ ہر جگہ ظلم اور بداخلاقی کے طریقے استعمال میں آ رہے ہیں۔ مرض طاعُون کا قاعدہ ہے کہ وہ پرواز کر کے پرندے کی طرح دُوسرے مقام پر جا پہنچتی ہے۔ اس کی رفتار میں ایسا نظام نہیں ہے کہ وہ منزل بہ منزل جائے بلکہ دو چار سو کوس کا فاصلہ طے کر کے یکلخت دوسرے مقام پر جا پہنچتی ہے۔ موجودہ حالات میں بمبئی اور جالندھر کے واقعات پر ہی غور کرو کہ ہر دو مقامات کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے۔ اب بتاؤ کہ انسان اس کے جالندھر پہنچنے کی بابت کیا نظامِ رفتار قائم کر سکتا ہے۔ الغرض اس کی رفتار کی نسبت کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج عافیت سے گذر رہی ہے، نہ معلوم کل کیا ہو۔ یہ نہایت خطرناک مرض ہے۔ اور اس کے دورے بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ساٹھ ساٹھ سال تک اس کا دَورہ رہتا ہے جو ایک مسلّمہ امر ہے۔ ہیضہ کی طرح نہیں کہ ساون، بھادوں کے مہینے میں آگیا اور بیس پچیس دن دورہ کر کے رُخصت ہو گیا۔ طاعون کو حکیموں نے نیزے سے مارنے والی لکھا ہے۔ طاعون مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا نشانہ خطا نہیں جاتا اور اس کے باعث کثرت سے اموات ہوتی ہیں۔ توراۃ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت یہ مرض یہودیوں میں پڑی تھی۔ توراۃ میں جہاں خدا نے پھوڑوں کی مار سے ڈرایا ہے، اس سے طاعُون ہی مراد ہے۔ قرآن کریم میں یہودیوں کو نافرمانی کی وجہ سے طاعون سے ہلاک کرنے کا ذکر ہے۔

طاعون آنے کی وجہ

توراۃ اور قرآن کریم کے ان مقامات پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ یہ مرض انسان کی نافرمانی اور بدکاری سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ سنّت اللہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اقوام معصیت کے وقت اسی بیماری سے ہلاک ہوئیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا

ایک قہری نشان ہے جیسا کہ مَیں نے پہلے بیان کیا ہے۔ یہ تیسرا نشان قیامت کا ہے۔ اس سے قیامتِ صغریٰ پیدا ہوتی ہے۔ شاید وُہ لوگ جن کو خبر نہیں، اس کو ایک افسانہ سمجھیں کہ جب یہ مرض یورپ اور بلادِ شام اور عراق عجم میں پھیلی تھی وہاں اس کا ڈیرہ جم گیا تھا۔ ابھی اِس مُلک میں نَووارد ہے۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کو اس کے اخلاق اور عادات کی کچھ خبر نہیں۔ ایک طرف تو یہ لوگ خدا تعالیٰ سے بے خوف اور بے خبر ہیں اور توبہ اور استغفار نہیں کرتے اور دُوسری طرف گورنمنٹ کی تجاویز پر بھی عملدرآمد نہیں کرنا چاہتے اور ان تجاویز کو بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مخالفت کا شور مچاتے ہیں۔

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ مُداہنہ کے طور پر کسی کی تعریف کرنا ہمارا کام نہیں۔ یہ اُصول ہے کہ جس گاؤں میں طاعون کی بیماری ہو، وہاں کے لوگ الگ کئے جائیں اور اس کی آمد و رفت کے راستے بند کیے جائیں اور مریضوں کو ایک کھلے میدان میں رکھا جائے اور بسا اوقات سارے گاؤں کو الگ کر دیا جائے۔ گویا اس سر زمین سے سب کو نکال دیا جائے۔ نہایت مفید اور ضروری ہے۔ ہماری کتابوں سے بھی اور توریت سے بھی یہ پتہ لگتا ہے کہ اس مرض کے مواد زمین سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مرض چوہوں کے ذریعے سے پھیلتی ہے۔ یہ بھی منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ہے۔ دراصل جو زمین بدکاریوں اور جفا کاریوں سے لعنتی ہو جاتی ہے، اس میں یہ سمیّت (زہر) پیدا ہو جاتی ہے اور بڑے بڑے خوفناک طریقوں پر وہ مبتلاءِ عذاب ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی ہمیں یہ تو بتائے کہ گورنمنٹ نے کیا برائی کی جو یہ کہا کہ وَبا زدہ مکان کو چھوڑ دو۔ جو کام ہماری بھلائی کے لیے ہو اس میں برائی کا خیال پیدا کرنا دانش مند انسان کا کام نہیں۔ جیسا کہ مَیں نے کہا ہے کہ اگر گورنمنٹ یہ حکم دے دے کہ طاعون کی مرض میں کوئی شخص گھر سے نہ نکلے، تو لوگ اس حکم کو اُس سے بھی زیادہ ناگوار سمجھیں گے، کیونکہ جب گاؤں میں طاعون پھیلے گی اور لوگ مرنے لگیں گے، تو کوئی شخص بھی برداشت نہ کرے گا کہ اُس گھر میں رہے۔ دیکھو جس گھر یا مکان سے کسی وقت سانپ نکلے تو اس گھر یا مکان میں داخل ہونے سے لوگ دہشت کھاتے ہیں، خواہ وہ سانپ مار بھی دیا جائے، تاہم تاریکی کے وقت اس مکان میں کوئی شخص داخل نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی ایک طبعی عادت ہے۔ پھر حیرت ہے کہ ایک انسان اندیشہ کی جگہ سے واقف ہو اور پھر امن و چین کے ساتھ اس میں رہے۔ کیا ہو سکتا ہے کہ جس گھر سے مُردہ پر مُردہ نکلنا شروع ہو جائے، تو اہلِ خانہ اس میں امن سے بیٹھے رہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ خود ہی اس گھر کو فی الفور چھوڑ دیں گے اور اُسے منحوس سمجھ کر اس سے کنارہ کر جائیں گے۔ اگر یہ لوگ اسی حالت میں چھوڑ دیے جاتے اور گورنمنٹ کسی قسم کی مداخلت نہ کرتی تو پھر بھی یہ لوگ خود بخود وہی کرتے جو آج گورنمنٹ کر رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو طاعون کی مرض کی خبر نہیں اور وہ اس کو نزلہ و زکام کی طرح ایک عام مرض سمجھتے ہیں۔

طاعُون عذاب ہے

اللہ تعالیٰ نے اس کا نام رِجز رکھا ہے۔ رِجز عذاب کو بھی کہتے ہیں۔ لُغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اُونٹ کی بُنِ ران میں یہ مرض ہوتا ہے اور اس میں ایک کیڑا پڑ جاتا ہے جسے نغف کہتے ہیں۔ اس سے ایک لطیف نکتہ سمجھ میں آتا ہے اور وُہ یہ کہ چونکہ اونٹ کی فطرت میں ایک قسم کی سرکشی پائی جاتی ہے۔ جس کو یہ مرض ہوتی ہے تو اس سے یہ پایا گیا کہ جب انسانوں میں بھی سرکشی کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے، تو اُس وقت اُن پر یہ عذابِ اَلیم نازل ہوتا ہے۔ رِجز کے معنی لُغت میں دَوام کے بھی آئے ہیں اور یہ مرض بھی دیرپا ہوتا ہے اور گھر سے سب کو رُخصت کر کے نکلتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بلا گھروں کی صفائی کر دینے والی، بچوں کو یتیم بناتی اور بیشمار بیکس عورتوں کو بیوہ بنا دیتی ہے۔

غیر صحت مندانہ ماحول بھی طاعُون کا باعث ہے

پھر رجز کے معنی میں غور کرنے سے اس کا باعث بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ مرض پلیدی اور ناپاکی سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اچھی طرح صفائی نہیں ہوتی اور مکان کی دیواریں بدنما اور قبروں کا نمونہ ہوتی ہیں۔ نہ روشنی کا انتظام ہوتا ہے، نہ تازہ ہوا آسکتی ہے۔ وہاں عفُونت کا زہریلا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، جس کے باعث یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں جو آیا ہے۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدّثر : ۶) کہ ہر ایک قسم کی پلیدی سے پرہیز کرو۔ ہجر دُور چلے جانے کو کہتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ رُوحانی پاکیزگی چاہنے والوں کے لیے ظاہری پاکیزگی اور صفائی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایک قوت کا اثر دوسری پر اور ایک پہلو کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے۔

ظاہری پاکیزگی کا اثر باطن پر

انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ جو شخص باطنی طہارت پر قائم ہونا چاہتا ہے وُہ ظاہری پاکیزگی کا بھی لحاظ رکھے۔ پھر ایک دُوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (البقرہ : ۲۲۳) یعنی جو لوگ باطنی اور ظاہری پاکیزگی کے طالب ہیں۔ مَیں اُن کو دوست رکھتا ہوں۔ ظاہری پاکیزگی باطنی طہارت کی ممد اور معاون ہے۔ اگر انسان اسے ترک کر دے اور پاخانہ پھر کر بھی طہارت نہ کرے، تو باطنی پاکیزگی پاس بھی نہیں پھٹکتی۔ پس یاد رکھو کہ ظاہری پاکیزگی اندرونی طہارت کو مُستلزم ہے۔ اس لیے ہر مُسلمان کے لیے لازم ہے کہ کم از کم جمعہ کے دن ضرور غسل کرے۔ ہر نماز میں وُضو کرے۔ جماعت کھڑی ہو تو خوشبو لگائے۔ عیدین اور جمعہ میں جو خوشبو لگانے کا حکم ہے وُہ اسی بنا پر قائم ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے اجتماع کے وقت عفونت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے غسل کرنے اور صاف کپڑے پہننے اور خوشبو لگانے سے سمیّت (زہر) اور عفونت سے روک ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی میں یہ قانون مقرر کیا ہے۔ ویسا ہی قانون مرنے کے بعد بھی رکھا ہے۔

❁ ❁ ❁

کافور کے خواص

اسی لیے مُسلمان کو مرتے وقت کافور کا استعمال کرنا سنّت ہے۔ یہ اس لیے کہ کافور ایک ایسی چیز ہے جو وبائی کیڑوں کو مارتی اور سمیّت کو دُور کرتی ہے اور انسان کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور بہت سی عفُونتی بیماریوں کو روکتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ شریف میں فرمایا ہے کہ مومنوں کو کافوری شربت پلایا جائے گا۔ آج کل کی تحقیقات سے بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ کافور جیسا کہ ہیضہ کے لیے مفید ہے، ویسا ہی طاعُون میں بہت فائدہ بخش ہے۔ مَیں اپنی جماعت کو بتلاتا ہوں کہ یہ بہت مفید چیز ہے اور میرا اعتقاد ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے بتلایا ہے کہ یہ جلن کو روکتا ہے اور دل کو سکینت اور تفریح دیتا ہے اور ہمیں رغبت دلائی کہ ہم کافور کا استعمال کیا کریں۔ آجکل ایک بات اور ثابت ہوئی ہے کہ کافور کے ساتھ جدوار استعمال کیا جائے تو از حد مفید ہے۔ جدوار کو سرکہ میں ملاکر گولیاں بنالینی چاہئیں اور دُو دُو رتی کی گولیاں بناکر تازہ لسّی کے ساتھ استعمال کی جائیں۔ اگر عورتوں اور بچّوں کو یہ گولیاں روزمرّہ استعمال کرائی جائیں، تو بہت مفید ہیں۔ ہم بھی ایک دوائی طاعون کے لیے تیار کر رہے ہیں جو خدا تعالیٰ نے چاہا تو بہت مفید ہوگی۔ دراصل یہ کمبخت مرض ایسا ہے کہ کسی علاج پر بھروسہ کرنا غلطی ہے، جبتک اللہ تعالیٰ کا ہی فضل نہ ہو۔ مگر عام اسبابِ تندرستی اور قانونِ صحت میں سے حفظِ ماتقدّم بھی ایک عمدہ چیز ہے اور فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ پس مناسب ہے کہ سمیّت اور عفُونت والی چیزوں سے پرہیز کیا جائے اور بعض تیز غذاؤں سے جو دورانِ خُون کو تیز کرتی ہیں۔ جیسا کہ بہت گوشت اور بہت میٹھا یا حد سے زیادہ دُھوپ میں پھرنا یا سخت اور شدید محنت کرنا۔ ان سے پرہیز کرنا مناسب ہے۔

رعایتِ اسباب منع نہیں ہے

رعایتِ اسباب ہماری اسلامی شریعت میں منع نہیں ہے۔ کسی شخص نے حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم دوا کریں۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: کہ ہاں دوا کرو۔ کوئی مرض ایسا نہیں، جس کی دوا نہ ہو۔ ہاں یہ بالکل سچی بات ہے کہ کوئی بَید یا ڈاکٹر یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اُس کی فلاں دوا ضرور فائدہ کرے گی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر کوئی شخص کیوں مرتا۔ طبیبوں اور ڈاکٹروں کو چاہیے کہ متّقی بن جاویں۔ دوا بھی کریں اور دُعا بھی۔ تنہائی میں بہت بہت دُعائیں مانگیں۔ جن لوگوں نے گھمنڈ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہی ذلیل کیا۔ لکھا ہے کہ جالینوس کو اسہال کے بند کرنے کا بڑا دعویٰ تھا۔ خدا کی شان کہ وُہ خود اسی مرض کا شکار ہوا۔ اسی طرح بعض طبیب مدقوق ہوکر اور بعض مسلُول ہوکر اس دُنیا سے چل دیتے۔

اللہ تعالیٰ پر ہی کامل بھروسہ کرنا چاہیے

اس بیان سے میری غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دعویٰ کی حقیقت کھول دی اور ان کی بیجا شیخی کا بھانڈا پھوڑ کر دکھا دیا۔ جس قسم کا دعویٰ کیا اسی دعوے میں پست اور ذلیل ہوتے۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کو کسی قسم کا دعویٰ

سزاوار نہیں۔ ہمارے والد صاحب مرحوم بھی مشہور طبیب تھے جن کا پچاس برس کا تجربہ تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حکمی نسخہ کوئی نہیں اور اصل حقیقت بھی یہی ہے کہ تصرف اللہ کا خانہ خالی رہتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے والا سعادت مند ہے۔ انسان مصیبت میں بد دماغ نہ ہو اور غیر اللہ پر بھروسہ نہ کرے۔ یکدفعہ ہی خفیف عوارض شدید ہونے لگ جاتے ہیں۔ کبھی قلب کا علاج کرتے کرتے دماغ پر آفت آجاتی ہے کبھی سردی کے پہلو پر علاج کرتے کرتے گرمی کا زور چڑھ جاتا ہے۔ کون ان بیماریوں پر حاوی ہو سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرنا چاہیے۔ انسان ان حشرات الارض اور سمیات کو کب گن سکتا ہے۔ صرف بیماریوں کو بھی نہیں گن سکتا۔ لکھا ہے کہ صرف آنکھ ہی کی تین ہزار بیماریاں ہیں۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے طور پر غلبہ کرتی ہیں کہ ڈاکٹر نسخہ نہیں لکھ چکتا جو بیمار کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ میں آنا چاہیے۔ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے سخت غفلت اور استغنا ہے۔ قبریں کھودی جا رہی ہیں۔ فرشتے ہلاکت کے مواد تیار کر رہے ہیں اور لوگ کاٹے جا رہے ہیں، مگر اس کے باوجود بھی نادان لوگ دھیان نہیں کرتے۔ یہ وبا قادیان سے ۳۵ کوس کے فاصلے پر ہے گو شدتِ حرارت کی وجہ سے کم ہوتی جاتی ہے، مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ شدتِ حرارت کے ایام میں کم ہو گئی تو آئندہ سال نہ آئے گی۔ مجھے چند مرتبہ بذریعہ الہام اور رؤیا معلوم ہوا ہے کہ یہ وبا اس ملک میں زور سے پھیلے گی۔ جیسے میں پیشتر ازیں شائع کر چکا ہوں کہ سیاہ رنگ کے پودے لگاتے جا رہے ہیں۔ لگانے والوں سے پوچھا، تو انہوں نے طاعون کے درخت بتلائے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

وعیدی پیشگوئیاں توبہ اور استغفار سے ٹل سکتی ہیں

ایسا ہی میں یہ بھی بتلا چکا ہوں کہ وعیدی پیشگوئیاں توبہ اور استغفار سے ٹل سکتی ہیں۔ یہانتک کہ دوزخ کا وعید بھی ٹل سکتا ہے۔ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس کی طرف توجہ کریں، تو اللہ تعالیٰ اس ملک اور خطہ کو چاہے گا، تو محفوظ رکھ لے گا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، مگر فرماتا ہے۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان: ۷۸) ان لوگوں کو کہدے کہ اگر تم میری بندگی نہ کرو، تو پرواکیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں گلی گلی میں حکیم ہیں۔ ہر جگہ ڈاکٹر موجود ہیں۔ شفاخانے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا علاج کر کے تندرست ہو جائیں گے، مگر ان کو معلوم نہیں کہ بمبئی اور کراچی میں کئی بڑے بڑے ڈاکٹر خود اس مرض میں مبتلا ہو کر چل بسے ہیں اور جو لوگ مریضوں کی خدمت پر مامور ہو کر گئے تھے وہ خود ہی اس مرض کا شکار ہو گئے اس طرح سے اللہ تعالیٰ اپنے تصرفات کا مشاہدہ کراتا ہے۔ کیونکہ محض ڈاکٹروں یا اُن کے علاج پر بھروسہ کرنا دانشمندی نہیں۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ دُوسرے عالم پر بھی ایمان پیدا ہو۔ اب لوگ زور لگا کر دکھا دیں کہ کس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو بدل سکتے ہیں۔ جس طرح انسان ایک

بالشت بھر زمین کے لیے مرتا ہے، سازشیں کرتا اور مقدمات کی تکالیف اور زیر باریاں برداشت کرتا ہے وہ سوچے کہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل نہ کرنے پر بھی ویسا ہی قلق اور کرب اپنے اندر پاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ نادان انسان جب شدید امراض میں مبتلا ہوجاتا ہے، تو اس وقت خدا تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ جس پر اُسے یونہی آزمائشی طور پر مہلت مل جاتی ہے، لیکن بعد اس کے پھر وہ ایسی چالیں چلتا ہے کہ گویا اس نے مرنا ہی نہیں۔ معمولی امراض میں مبتلا ہوکر مر جانے پر اب لوگوں کے دلوں پر بہت تھوڑا اثر ہوتا ہے جو صرف دو چار یوم برائے نام قائم رہتا ہے۔ بعد اس کے پھر وہی ہنسی ٹھٹھول اور مزخرفات شروع ہوجاتے ہیں۔ قبرستان میں جاتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے مُردے گاڑتے ہیں، مگر یہ کبھی نہیں سوچتے کہ آخر ایک دن مرکر ہم نے بھی خدا کے حضور جانا ہے۔ اس لیے اب خدا تعالیٰ نے دیکھا کہ معمولی اموات کچھ اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔ امرتسر، لاہور میں روزانہ اموات کی تعداد ساٹھ ستر ہوتی ہوگی اور کلکتہ و بمبئی میں اس سے بھی زیادہ لوگ مرتے ہوں گے۔ گو نفس الامر میں یہ ایک خوفناک نظارہ ہے، مگر کون اس پر غور کرتا ہے۔ کوتاہ اندیش انسان کہہ اُٹھتا ہے کہ اس قدر اموات آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہیں، اس لیے ان کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ چونکہ دوسروں کی موت سے خود کچھ بھی نفع نہیں اُٹھا سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے دوسرا نسخہ اختیار کیا ہے اور طاعون کے ذریعہ سے لوگوں کو متنبہ کرنا چاہا ہے۔ اس لیے مَیں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ یہ خیال کرکے کہ اب جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم خدا تعالیٰ کو بھی ناراض کرو اور گورنمنٹ کو خطاکار ٹھہراؤ۔ گورنمنٹ کو بدنام کرنے سے کیا حاصل۔ طاعون تمہاری اپنی شامتِ اعمال سے آئی، اس لیے گورنمنٹ پر بھی تمہاری بدولت آفت آئی۔

طاعون کے ایام میں گورنمنٹ کے اقدامات دُرست تھے

گورنمنٹ کو اگر تمہارے ساتھ سچی ہمدردی نہیں، تو تم خود ہی بتلاؤ کہ وہ کیوں اس قدر روپیہ اس مرض کے تدارک پر خرچ کرتی ہے۔ شفاخانے اور ڈاکٹر کیوں مقرر کیے جاتے ہیں۔ پولیس کے ہزاروں آدمی کیوں انتظام کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ کیا گورنمنٹ کو کچھ شوق ہے کہ اس قدر اخراجاتِ کثیر برداشت کرے؟ نہیں۔ بلکہ ملک کی یہ حالت دیکھ کر وہ اندر ہی اندر مادرِ مہربان کی طرح بے چین ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ بھی رعایا ہی سے ہے۔ لوگوں کو شاید خبر نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت میں لوگ طاعون سے مارے جائیں گے۔ منجموں کی باتیں گو قابلِ ذکر نہیں، مگر ہند اور یورپ کے منجم کہتے ہیں کہ نومبر ۱۸۹۹ء میں ستارے جمع ہوں گے اور خوفناک وقت آئے گا۔ ہمیں تو اس کی چنداں پروا نہیں تھی، مگر ہم کو تو یہ غم ہے کہ ہمارے الہامات میں بھی آئندہ دو جاڑوں کا سخت اندیشہ ہے، بشرطیکہ لوگ راہِ راست اختیار نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہ کریں۔ بدکاریاں، زناکاریاں، چوریاں اور ہر قسم کے مکر و فریب اور بداعمال چھوڑ کر نیکی اختیار کریں۔

اور بداعمالیوں سے کُلّی اجتناب کریں، ورنہ سخت خطرہ اور اندیشہ ہے اور ایک نہایت سہمناک اور ترسناک نظارہ ہمارے سامنے ہے۔ اب بتلاؤ کہ ہم گورنمنٹ کو کیوں قصوروار ٹھہرائیں۔

پس مَیں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ہماری جماعت کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وُہ جاہلوں کی رَوش اختیار کرے اور احمقوں اور کوتاہ اندیشوں کے نقشِ قدم پر چلے۔ مَیں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جس قدر ہدایات جاری کی ہیں، وہ صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔ ہماری تواریخ کی کتابوں مثل طبری وغیرہ میں جو ہزار سال سے پہلے کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ حضرت عُمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب لشکرِ اسلام ملکِ شام میں تھا تو وہاں وَبا پڑی، جس پر لشکرِ اسلام کو پہاڑ پر بھیجنا پڑا۔ تو گویا یہ اِس گورنمنٹ کا ہی مخترعہ نسخہ نہیں، بلکہ گذشتہ اہلِ اسلام کے طرزِ عمل سے بھی یُونہی ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح اُنھوں نے نشیب کو چھوڑ کر پہاڑ کی بلندی کو اختیار کیا۔ اسی طرح اب بھی مرطوب اور نشیبی مکانات کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں مریضوں کو رکھا جاتا ہے۔ بُوعلی سینا نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ جن گھروں میں وَبا، کا مرض ہو ان کی صفائی کی جائے کیونکہ جبتک سبب موجود ہے نتیجہ زائل نہیں ہوسکتا۔ طبیب کیا کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ماشہ دو ماشہ دوائی دے گا، مگر اس عفُونت کو جو سانس کے ذریعہ سے انسان کے جسم میں چلی جاتی ہے، اُسے دوائی کیا کرے گی اور ایسے گھر میں رہ کر طاعون کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔ لوگوں نے طاعُون سے فوت شدہ لوگ نہیں دیکھے۔ جس جگہ طاعون کا مریض مرجاتا ہے وہ جگہ ایسی عفُونت آمیز ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے گورنمنٹ کی تدابیرِ حفظِ صحت کی نسبت بدظنی کرنا ایک ناپاک خیال ہے۔ گورنمنٹ نے اس مرض کے دفعیہ کے لیے جو کچھ سوچا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ اس لیے ہماری جماعت کے لیے لازم ہے وہ اِس بارہ میں گورنمنٹ کی مدد کریں اور اپنے دوستوں ہمسائیوں اور دُوسرے لوگوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مُسلمان سمجھائیں اور غلط فہمیوں کو دُور کریں۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ گورنمنٹ نے رعایا کو مارنے کی یہ تجویز کی ہے۔ بھلا کوئی اِن نادانوں سے پُوچھے تو سہی کہ کیا گورنمنٹ یہ لکھو کھہا روپیہ صرف لوگوں کو مارنے پر صرف کر رہی ہے اور اُسے اس قدر تکالیف برداشت کرنے کا شوق ہے؟ نہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ طاعُون بہت مُہلک مرض ہے۔

طاعُون کیا ہوتی ہے؟

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ طاعون کیا ہوتی ہے۔ یہ ایک شدید تپ ہوتا ہے، جس کے ساتھ غشی، متلی، دردِ سر اور نسیان ہوتا ہے۔ لرزہ بہت ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بے چینی اور سراسیمگی ہوتی ہے۔ پھر چند روز کے بعد بُن ران یا گردن یا پس گوش ایک پھنسی نکل آتی ہے، جو کبھی تو چھوٹی سی ہوتی ہے اور کبھی بڑی۔ یہانتک کہ سرسام ہو جاتا ہے اور غالبًا یہ سب علامات چوبیس گھنٹہ کے اندر اندر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ عمُومًا ایسے مریضوں کا گورنمنٹ کو پتہ بمشکل لگتا ہے۔ کیونکہ بیس بائیس گھنٹہ تک تو لوگ اسے معمولی بخار سمجھ کر لاپرواہ رہتے ہیں، مگر بعد ازاں آثارِ طاعون دیکھ کر اُسے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

غرض جب مرض کا پُورا پُورا اثر ہو چکتا ہے، تو کہیں جا کر گورنمنٹ کے عمال کو پتہ لگتا ہے۔ اب اس ایک دو گھنٹہ کے علاج سے کیا بن سکتا ہے، وہ ہسپتال میں مریگا نہیں تو اور کیا ہوگا۔ پس یہ لوگوں کی اپنی نادانی اور حماقت ہے کہ اپنے قصور کو گورنمنٹ کے سر پر تھوپا جاتا ہے۔ اگر اس میں گورنمنٹ کا کچھ قصور یا غلطی ہے تو تمھیں حق پہنچتا ہے کہ اُسے ظاہر کرو۔ ورنہ اپنی غلطی کے لیے گورنمنٹ کو متہم کرنا ناواجب ہے۔ گورنمنٹ کی نیک نیتی اور خیر طلبی تو اس معاملہ میں یہانتک ہے کہ اس نے خود معززین سے مشورے لیے، پھر کارروائی کی، مگر چونکہ ہمارا ملک واقعی نیم وحشی اور جاہل ہے۔ اس لیے ان کے ہاتھ میں سوائے غصّہ اور بدظنی کے اور کچھ نہیں۔ اپنی غلط کاریوں کا الزام گورنمنٹ پر دیتے ہیں۔ اور ذرہ نہیں سوچتے۔ کاش کہ یہ صدہا انجمنیں، جو ہمارے ملک میں پھیل رہی ہیں، اس کام کی طرف توجہ کریں اور جہلا کے دلوں سے یہ بدظنیاں نکالنے کی کوشش کریں تو بنی نوع کی کس قدر بھلائی ہو۔ تم لوگ غفلت کے لحافوں میں پڑے سو رہے ہو اور جن بے آراموں اور تکالیف میں تمھارے ہم جنس مبتلا ہیں، تمھیں ان کی خبر تک نہیں۔ گورنمنٹ جس قدر روپیہ ان مصائب سے نجات دلانے کے لیے اپنی پیاری رعایا کی خاطر صرف کر رہی ہے۔ اگر چندہ کر کے وُہ صرف کرنا پڑتا اور یہ حکم ہوتا کہ گاؤں گاؤں کے لوگ چندہ دیں تو کوئی شخص بھی ایک پیسہ دینے پر راضی نہ ہوتا۔ مَیں نے بھی ایک دوائی تیار کرنی چاہی ہے۔ جس کی تیاری میں مَیں مصروف ہوں۔ اللہ تعالیٰ شیخ رحمت اللہ صاحب کو جزائے خیر دے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے دو صد روپیہ اس کارِ خیر میں دیا ہے۔ مَیں نے اس مرض کے اسباب کو خوب زیرِ نظر رکھ لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مرض کے کئی حصّے ہوتے ہیں۔ اس لیے طبیب کو مناسب اور لازم ہے کہ وُہ ہر حصّہ اور سبب کی رعایت کو ملحوظ رکھے۔ ردّی غذائیں اور سمّی ہوائیں اس مرض کو بہت زیادہ پھیلاتی اور خطرناک بنا دیتی ہیں۔ زمین کے نشیبی حصّہ سے ایسی سمّی ہوائیں تنفّس کے ذریعہ یا غذا کے ذریعہ سے انسان کے خون میں سمیت اور عفونت پیدا کر دیتی ہیں۔

جدید سائنسی تحقیقات سے اسلام کی تائید

آج کل کی تحقیقات میں طاعُون کی جڑ کیڑے یا اجرامِ صغیرہ ثابت ہوئے ہیں۔ مَیں بھی اس تحقیقات کو پسند کرتا ہوں کیونکہ اس سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت اور اسلام کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں جہاں طاعون کا ذکر آیا ہے وہاں نغف اس کا نام رکھا گیا ہے اور نغف اس کیڑے کو کہتے ہیں جو بکری اور اُونٹ کی ناک سے نکلتا ہے اور اُسے طاعُون قرار دیا گیا ہے۔ آج کل کی تحقیقات پر بڑا فخر کیا جاتا ہے، مگر جس شخص نے مقدس اسلام کے بانی علیہ السلام کے پاک کلام کو پڑھا ہے۔ اُسے کس قدر لُطف اور مزا آتا ہے جب وہ تیرہ سو برس بیشتر آپؐ کے پاک ہونٹوں سے نکلی ہوئی باتوں کو پُورا ہوتے دیکھتا ہے۔ قرآن شریف نے بھی طاعون کو کیڑا ہی بتلایا ہے۔

اے نئی تحقیقات پر اترانے والو! خدا کے لیے ذرا انصاف کو کام میں لاؤ اور بتلاؤ کہ کیا وہ مذہب انسانی افترا ہو سکتا ہے، جس میں ایسے حقائق پہلے سے موجود ہوں اور تیرہ سو سال کی محنتوں، تحقیقاتوں اور جان کنیوں کا نتیجہ ہوں۔ یہ قرآن کریم اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معقول معجزات ہیں اور دیکھو۔ قلب دِل کو کہتے ہیں اور قلب گردش دینے والے کو بھی کہتے ہیں۔ دِل پر مدار دورانِ خون کا ہے۔ آجکل کی تحقیقات نے تو ایک عرصہ درازکی محنت اور دماغ سوزی کے بعد دورانِ خون کا مسئلہ دریافت کیا لیکن اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر ہی سے دل کا نام قلب رکھ کر اس صداقت کو مرکوز اور محفوظ کر دیا۔

طاعون کے اسباب

اب مَیں پھر اصل مضمون کی طرف عَود کرتا ہوں۔ دُوسرا سبب پلیدی، تیسرا سبب سیئت، چوتھا سبب تپ، پانچواں پھوڑے۔ اب اس امر میں ایک اختلاف ہے کہ آیا اصل سبب پھوڑے ہیں یا تپ۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اصل تپ ہے اور یونانی پھوڑے کو اصل سبب ٹھہراتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی یُونانیوں کی رائے صحیح ہے، کیونکہ توراۃ میں بھی پھوڑوں ہی کا ذکر ہے۔ ہاں تپ لازمی ہے۔ بعض اوقات تپ قائم مقام ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، بلکہ بیمار تپ ہونے سے پہلے ہی رُخصت ہو جاتا ہے۔ غرض اس مرض کا اصل تپ نہیں بلکہ پھوڑا ہے۔ پھوڑا اگر چیرا جائے اور اس سے مواد نکال دیا جائے تو تپ بھی کم ہو جاتا ہے یہانتک کہ مریض تندرست ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ مرض سخت مُہلک اور خوفناک ہے۔ اسی لیے اس کے روکنے کی تدابیر بھی سخت ہونی لازمی ہیں، جن کے اجراء پر گورنمنٹ باوجودیکہ وہ سچی ہمدردی اور پُوری غمخواری کے ساتھ رعیت کی بھلائی میں مصروف ہے، بدنام ہو گئی ہے۔ جہانتک نیک نیتی اور بنی نوعِ انسان کی اس غمخواری کے خیال سے جو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈال رکھی ہے، مَیں نے ان تمام تجاویز پر جو گورنمنٹ نے مریضانِ طاعون کے متعلق شائع کی ہیں غور کیا ہے۔ مَیں بلاخوفِ لومۃ لائم کہتا ہوں کہ وہ تجاویز بہت مناسب اور موزُوں ہیں۔ وُہ یہ کہ اُس گھر کو یا بعض اوقات عند الضرورت محلّہ کو خالی کر دیا جائے اور مریض کو الگ رکھا جائے۔ یہ بالکل دُرست اور عین مناسب ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک بچہّ طاعون سے بیمار ہو اور اُسے بموجب قواعد ماں باپ سے علیحدہ کر دیا جائے، تو وہ ضرور مَر جائے گا۔ ایسے معترضین کو معلوم ہو کہ ایسی صُورت میں ماں باپ اُس کے ہمراہ رہ سکیں گے، مگر وہ بھی طاعُون کے مریض ہی شمار ہو کر ان تمام پابندیوں کے ماتحت ہوں گے، جو مبتلا شخص کے لیے ہیں۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ موجُودہ حالت میں گورنمنٹ کی نیت بالکل نیک ہے۔ اس کی یہ منشاء ہرگز نہیں کہ خواہ مخواہ لوگوں کو ایک دُوسرے سے علیحدہ کیا جائے۔

اُولِی الْاَمْر کی اطاعت

اور میری تو سمجھ میں ہرگز نہیں آتا کہ لوگوں کو خواہ مخواہ ایک دُوسرے سے علیحدہ کر کے گورنمنٹ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ یہ گورنمنٹ پر بدظنی

ہے۔ قرآن شریف میں حکم ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء : ۶۰) یہاں اُولی الامر کی اطاعت کا حکم صاف طور پر موجود ہے اور اگر کوئی شخص کہے کہ مِنْکُمْ میں گورنمنٹ داخل نہیں، تو یہ اُس کی صریح غلطی ہے۔ گورنمنٹ جو حکم شریعت کے مطابق دیتی ہے، وہ اُسے مِنْکُمْ میں داخل کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص ہماری مخالفت نہیں کرتا۔ وہ ہم میں داخل ہے۔ اِشارۃ النص کے طور پر قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کی اطاعت کرنی چاہیے اور اس کے حکم مان لینے چاہئیں۔ عام طور پر تو مسلمانوں کے لیے یہ لازم تھا کہ انسدادِ طاعون کے متعلق شکر گذاری کے میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجتے، مگر یہاں بجائے شکر گذاری کے ناشکر گذاری ہو رہی ہے اور کوئی معقول وجہ ناراضگی کی بجز اس کے معلوم نہیں ہوتی کہ عورتوں کی نبضیں مرد ڈاکٹر دیکھتے ہیں۔ سو اس بارہ میں یہ معلوم ہو کہ اوّل تو اس نقص کے معلوم ہو جانے پر گورنمنٹ نے اس شکایت کو رفع کر دیا ہے اور دائیاں مقرر کر دی ہیں جو مستورات کا ملاحظہ کرتی ہیں۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ اگر ایسا نہ بھی ہوتا، تو بھی اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔

خاص حالات میں پردہ

ایسی صورت اور حالت میں کہ قہرِ خدا نازل ہو رہا ہو اور ہزاروں لوگ مر رہے ہوں۔ پردہ کا اتنا تشدّد جائز نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ کی بیوی مر گئی، تو کوئی اُس کو اٹھانے والا بھی نہ رہا۔ اب اس حالت میں پردہ کیا کر سکتا تھا۔ مَثَل مشہور ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مردوں نے ہی جنازہ اُٹھایا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر بچہ رِحم میں ہو تو کبھی مرد اس کو نکال سکتا ہے۔ دینِ اسلام میں تنگی و حرج نہیں۔ جو شخص خواہ مخواہ تنگی و حرج کرتا ہے، وُہ اپنی نئی شریعت بناتا ہے۔ گورنمنٹ نے بھی پردہ میں کوئی تنگی نہیں کی اور اب قواعد بھی بہت آسان بنا دیتے ہیں۔ جو جو تجاویز و اصلاحات لوگ پیش کرتے ہیں گورنمنٹ انہیں توجّہ سے سُنتی اور ان پر مناسب اور مصلحتِ وقت کے موافق عمل کرتی ہے۔ کوئی شخص مجھے یہ تو بتائے کہ پردہ میں نبض دکھانا کہاں منع کیا ہے۔

سعادت کی راہیں اختیار کریں

اصل بات جو قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو نیک بختی اور تقویٰ کی طرف توجّہ کرنی چاہیے اور سعادت کی راہیں اختیار کرنی چاہئیں۔ تب ہی کچھ بنتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد : ۱۲) خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک کہ خود وُہ اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے۔ خواہ مخواہ کے ظنِ فاسد کرنے اور بات کو انتہا تک پہنچانا بالکل بیہودہ امر ہے۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ نمازیں پڑھیں، زکوٰۃ دیں، اتلافِ حق اور بدکاریوں سے باز آئیں۔ یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ بعض وقت جب صرف ایک شخص ہی بدی کا ارتکاب کرتا ہے، تو وُہ سارے گھر اور سارے شہر کی ہلاکت کا موجب ہو جاتی ہے۔ پس بدیوں کو چھوڑ دو کہ وُہ ہلاکت کا موجب ہیں۔ ضلع جالندھر اور ہوشیار پور کے اس وقت کئی گاؤں طاعون میں مبتلا ہیں۔

پھر بیماری کے انسداد سے کیوں غفلت کی جائے۔گورنمنٹ پر جاہلانہ طور سے بدگمانی نہ کرو اور اگر تمہارا ہمسایہ بدگمانی کرتا ہے، تو اس کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کرو اور اسے سمجھاؤ۔ انسان کہاں تک غفلت کرتا جائیگا۔اس دن سے ڈرنا چاہیے۔ جب ایک دفعہ ہی وبا آپڑے اور سب کو تباہ کر ڈالے۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ مصیبت کے وارد ہونے سے پہلے جو دُعا کی جائے، وُہ قبول ہوتی ہے، کیونکہ خوف و خطر میں مبتلا ہونے کے وقت تو ہر شخص دُعا اور رجُوع الی اللہ کر سکتا ہے۔ سعادت مندی یہی ہے کہ امن کے وقت دُعا کی جائے۔انسان کو چاہیے کہ ان لوگوں کی حالت سے عبرت حاصل کرے جو اس خطرہ میں مبتلا ہیں۔یہاں سے تو بہت قریب گاؤں میں یہ بیماری پھیلی ہوئی ہے۔وہاں کے حالات دریافت کرکے ہر شخص قبل از وقت عبرت حاصل کر سکتا ہے، اس وقت تک ضلع جالندھر میں یہ مرض بہت ترقی پر ہے۔ گو ضلع ہوشیار پور میں کچھ کمی ہے۔

نمازوں کو باقاعدہ التزام سے پڑھو

تاہم میں یقین نہیں کرتا کہ وہ بالکل نابید ہو جائے گی۔ابھی جاڑا آنے والا ہے، اس لیے پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ۔ نمازوں کو باقاعدہ التزام سے پڑھو بعض لوگ صرف ایک ہی وقت کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔وُہ یاد رکھیں کہ نمازیں معاف نہیں ہوتیں۔یہاں تک کہ پیغمبروں تک کو معاف نہیں ہوئیں۔ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نئی جماعت آئی۔انھوں نے نماز کی معافی چاہی۔آپؐ نے فرمایا کہ جس مذہب میں عمل نہیں وہ مذہب کچھ نہیں، اس لیے اس بات کو خوب یاد رکھو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اپنے عمل کرلو۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشانوں میں سے ایک یہ بھی نشان ہے کہ آسمان اور زمین اس کے اُمر سے قائم رہ سکتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ لوگ جن کی طبائع طبیعیات کی طرف مائل ہیں۔کہا کرتے ہیں کہ نیچری مذہب قابلِ اتباع ہے، کیونکہ اگر حفظِ صحت کے اصولوں پر عمل نہ کیا جائے، تو تقویٰ اور طہارت سے کیا فائدہ ہوگا؟ سو واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشانوں میں سے یہ بھی ایک نشان ہے کہ بعض وقت ادویات بے کار رہ جاتی ہیں اور حفظِ صحت کے اسباب بھی کسی کام نہیں آسکتے۔نہ دَوا کام آسکتی ہے نہ طبیبِ حاذق، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کا امر ہو تو اُلٹا سیدھا ہو جایا کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ابتلاء

دیکھو حضرت ابراہیمؑ کا ابتلاء کہ بچے اور اُس کی ماں کو کنعان سے بہت دُور لے جانے کا حکم ملا اور وُہ ایسی جگہ تھی جہاں نہ دانہ تھا نہ پانی۔وہاں پہنچ کر حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حضور عرض کی کہ اے اللہ میں اپنی ذریت کو ایسی جگہ چھوڑتا ہوں جہاں دانہ پانی نہیں ہے۔حضرت سارہ کا ارادہ یہ تھا کہ کسی طرح سے اسماعیلؑ مر جائے، اس لیے اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اسے کسی بے آب و گیاہ جگہ میں چھوڑ آ۔حضرت ابراہیمؑ کو یہ بات بُری معلوم ہوئی، مگر اللہ تعالیٰ

نے فرمایا کہ جو کچھ سارہ کہتی ہے، وہی کرنا ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ خدا تعالیٰ کو سارہ کا پاس تھا۔ حضرت سارہ نے اس واقعہ سے پہلے بھی ایک دفعہ حضرت ہاجرہ کو گھر سے نکالا تھا۔ اس وقت بھی خدا تعالیٰ کا فرشتہ اس سے ہم کلام ہوا تھا، کیونکہ نبیوں کے سوا غیر انبیاء سے بھی اللہ تعالیٰ بذریعہ فرشتہ کلام کیا کرتا ہے؛ چنانچہ حضرت ہاجرہ سے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کا مکالمہ ہوا۔ غرض حضرت ابراہیم نے ویسا ہی کیا اور کچھ تھوڑا سا پانی اور تھوڑی سی کھجوریں ہمراہ لے کر حضرت ہاجرہ اور اس کے بچے کو لے جا کر وہاں چھوڑ آئے جہاں اب مکہ آباد ہے۔ چند دن کے بعد نہ دانہ رہا اور نہ پانی۔ حضرت اسماعیلؑ شدتِ پیاس سے بے چین ہونے لگے، تو اس وقت حضرت ہاجرہ نے نہ چاہا کہ اپنے بچے کی ایسی بے بسی کی موت اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس لیے ہاجرہ چند مرتبہ اُس پہاڑ پر اِدھر اُدھر دوڑیں کہ شاید کوئی قافلہ ہو۔ پہاڑ پر چڑھ کر گریہ وزاری کرنے لگیں۔ یہ ایسا وقت تھا کہ ان کے پاس صرف ایک ہی بچہ تھا۔ خاوند سے الگ تھیں۔ دُوسرا بچہ پیدا ہونے کی اُمید نہیں تھی۔ گویا بیوہ کی مانند آپ کا حال تھا۔ آپ کی گریہ وزاری پر فرشتہ نے آواز دی۔ ہاجرہ! ہاجرہ!! جب آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا، تو کوئی شخص نظر نہ آیا۔ بچہ کے پاس جب آئی تو دیکھا کہ اس کے پاس پانی کا چشمہ بہہ رہا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مُردہ سے اُن کو زندہ کر دیا۔ حضرت نبی کریمؐ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس چشمہ کا پانی نہ روکتا، تو وہ تمام مُلک میں پھیل جاتا۔ اس قصہ کے بیان کرنے سے یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی جگہوں پر جہاں آب و دانہ کچھ نہ ہو۔ اس طرح اپنی قدرت کے کرشمے دکھایا کرتا ہے؛ چنانچہ پانی کے اس پہلے کرشمہ نے حضرت اسماعیلؑ کو زندہ کیا، مگر وہ پانی جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے پھیلایا گیا، اُس کی شان میں فرمایا۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الحدید: ۱۸) گویا اس پانی سے دُنیا زندہ ہوئی۔ مدعا یہ ہے کہ جہاں ظاہری اسباب موجود نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بچاؤ کی ایک راہ نکال دی اور اللہ تعالیٰ جو یہ فرماتا ہے کہ اس کے اَمر سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ تو غور کرو کہ وہ جنگل جہاں اس قدر گرمی پڑتی تھی اور جہاں انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا بابرکت بنا دیا کہ کروڑ ہا مخلوق وہاں جاتی ہے اور ہر مُلک اور ہر قوم کے لوگ وہاں موجود ہوتے ہیں۔ وہ میدان جہاں حج کے لیے لوگ جمع ہوتے ہیں، وُہی جگہ ہے جہاں نہ دانہ تھا نہ پانی۔

اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرو

اصل بات یہی ہے کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ویرانہ کو آبادی اور آبادی کو ویرانہ بنا دیتا ہے۔ شہر بابل کے ساتھ کیا کیا؟ جس جگہ انسان کا منصوبہ تھا کہ آبادی ہو، وہاں مشیّتِ ایزدی سے ویرانہ بن گیا اور اُلّوؤں کا مسکن ہو گیا اور جس جگہ انسان چاہتا تھا کہ ویرانہ ہو، وہ دُنیا بھر کے لوگوں کا مرجع ہو گیا۔ پس خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوا اور تدبیر پر بھروسہ کرنا حماقت ہے۔ اپنی زندگی میں ایسی تبدیلی پیدا کر لو کہ معلوم ہو کہ گویا نئی زندگی ہے۔ استغفار کی کثرت کرو۔ جن لوگوں کو کثرتِ اشغالِ دُنیا کے باعث کم فرصتی ہے، ان کو سب سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ ملازمت پیشہ لوگوں سے اکثر فرائضِ خداوندی فوت

ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مجبوری کی حالت میں ظُہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کا جمع کر کے پڑھ لینا جائز ہے۔ مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر حکام سے نماز پڑھنے کی اجازت طلب کر لی جائے، تو وہ اجازت دے دیا کرتے ہیں۔ نیز اعلیٰ حکام کی طرف سے ماتحت افسروں کو اس بارہ میں خاص ہدایات ملی ہوتی ہیں۔ ترکِ نماز کے لیے ایسے بے جا عُذر بجُز اپنے نفس کی کمزوری کے اور کوئی نہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ظلم و زیادتی نہ کرو۔ اپنے فرائضِ منصبی نہایت دیانتداری سے بجالاؤ۔ گورنمنٹ پر ایک سیکنڈ کے لیے بھی بدظنّی نہ کرو۔ کیا تمھیں سکھوں کے عہدِ حکومت کے واقعات معلوم نہیں، جس وقت مسجدوں میں اذان دینی موقوف ہوگئی تھی۔ گائے کو ذراسی تکلیف دینے پر سخت ایذائیں اور بے حد ظُلم ہوتے تھے۔ پس ایسی مصیبت سے تم کو خلاصی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ بہت فاصلہ سے اس سلطنت کو لایا، جس سے ہم نے بہت فائدہ حاصل کیا اور اَمن و امان سے اپنے فرائضِ مذہبی ادا کرنے لگے۔ اس لیے ہمیں کس قدر شکریہ اس گورنمنٹ کا کرنا چاہیے۔ خُوب یاد رکھو کہ جو شخص انسان کا شکر نہیں کرتا، وہ خدا کا بھی شکر نہیں کرتا۔ یہ قاعدہ ہے کہ اگر انسان اپنے کسی عضو سے کام نہ لے، تو وہ ایک عرصہ بعد بیکار ہو جایا کرتا ہے۔ مشہور ہے کہ اگر آنکھ کو چالیس۴۰ دن بند رکھا جائے، تو وہ بالکل اندھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں تم کو تاکید نصیحت کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کے احسان ہم پر بہت ہیں۔ حقائق اور معارف کی کثیر التعداد کتب کہاں کہاں سے ہمیں میسّر آتی ہیں۔ اُن کی سلطنت کی آزادی سے ہم نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ ہمارے مذہب پر حملے ہوئے اور دیگر مشکلات کا سامنا ہوا، تو ہم نے کس طرح آزادی سے اُن کا دفعیہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حسبِ وعدہ وَالَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۷۰) ہم پر کس کس قسم کے معارف کھولے جنھیں ہم نے دُور و نزدیک شائع کیا۔ گورنمنٹ کی آزادی بھی ایک باعث اُن کے کُھلنے کا ہے۔ بالآخر مَیں پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے سچّا رشتہ قائم کرو اور گورنمنٹ کی نسبت بدظنّی مت کرو بلکہ اس کی ہدایات کی تعمیل کرو اور اُسے مدد دو۔[1]

۱۶؍ مئی ۱۸۹۸ء

تم خدا کے عزیزوں میں شامل ہو جاؤ

دن بہت ہی نازک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے غضب سے سب کو ڈرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی پروا نہیں کرتا، مگر صالح بندوں کی۔ آپس میں اخوت اور محبت کو پیدا کرو اور دَرندگی اور اختلاف کو چھوڑ دو۔ ہر ایک قسم کے ہزل اور تمسخر سے کنارہ کش ہو جاؤ، کیونکہ تمسخر انسان کے دل کو صداقت سے دُور کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔ آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ عزت سے پیش آؤ۔ ہر ایک اپنے آرام پر اپنے بھائی کے آرام کو ترجیح دیوے۔ اللہ تعالیٰ سے

---

[1] (رسالہ الانذار صفحہ ۵۴-۴۳)

ایک سچی صلح پیدا کرو اور اس کی اطاعت میں واپس آجاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا غضب زمین پر نازل ہو رہا ہے اور اُس سے بچنے والے وہی ہیں جو کامل طور پر اپنے سارے گناہوں سے توبہ کرکے اُس کے حضور میں آتے ہیں۔

تم یاد رکھو کہ اگر اللہ تعالیٰ کے فرمان میں تم اپنے تئیں لگاؤ گے اور اس کے دین کی حمایت میں ساعی ہو جاؤ گے۔ تو خدا تمام رکاوٹوں کو دُور کر دے گا اور تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کسان عمدہ پودوں کی خاطر کھیت میں سے ناکارہ چیزوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور کھیت کو خوشنما درختوں اور بار آور پودوں سے آراستہ کرتا اور ان کی حفاظت کرتا اور ہر ایک ضرر اور نقصان سے اُن کو بچاتا ہے، مگر وہ درخت اور پودے جو پھل نہ لاویں اور گلنے اور خشک ہونے لگ جاویں، اُن کی مالک پروا نہیں کرتا کہ کوئی مویشی آکر اُن کو کھا جاوے یا کوئی لکڑہارا اُن کو کاٹ کر تنور میں پھینک دیوے۔ سو ایسا ہی تم بھی یاد رکھو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے حضور میں صادق ٹھہرو گے، تو کسی کی مخالفت تمہیں تکلیف نہ دے گی۔ پر اگر تم اپنی حالتوں کو دُرست نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے فرمانبرداری کا ایک سچا عہد نہ باندھو، تو پھر اللہ تعالیٰ کو کسی کی پروا نہیں۔ ہزاروں بھیڑیں اور بکریاں ہر روز ذبح ہوتی ہیں۔ پر اُن پر کوئی رحم نہیں کرتا اور اگر ایک آدمی مارا جاوے، تو کتنی باز پُرس ہوتی ہے۔ سو اگر تم اپنے آپ کو درندوں کی مانند بیکار اور لاپروا بناؤ گے، تو تمہارا بھی ایسا ہی حال ہوگا۔ چاہیے کہ تم خدا کے عزیزوں میں شامل ہو جاؤ۔ تاکہ کسی وَبا کو یا آفت کو تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکے، کیونکہ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر زمین پر ہو نہیں سکتی۔ ہر ایک آپس کے جھگڑے اور جوش اور عداوت کو درمیان میں سے اُٹھا دو کہ اب وُہ وقت ہے کہ تم ادنیٰ باتوں سے اعراض کرکے اہم اور عظیم الشان کاموں میں مصروف ہو جاؤ۔ لوگ تمہاری مخالفت کریں گے اور انجمن کے ممبر تم پر ناراض ہوں گے۔ پر تم ان کو نرمی سے سمجھاؤ اور جوش کو ہرگز کام میں نہ لاؤ۔ یہ میری وصیت ہے۔ اور اس بات کو وصیت کے طور پر یاد رکھو کہ ہرگز تندی اور سختی سے کام نہ لینا بلکہ نرمی اور آہستگی اور خُلق سے ہر ایک کو سمجھاؤ اور انجمن کے ممبروں کے ذہن نشین کراؤ کہ ایسا میموریل[1] فی الحقیقت دین کو ایک نقصان پہنچانے والا اَمر ہے اور اسی واسطے ہم نے اس کی مخالفت کی کہ دین کو صدمہ پہنچتا ہے[2]۔

۲۵؍ جولائی ۱۸۹۸ء

گالیوں کا احسن جواب

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اپنے رسالہ اشاعۃ السنہ نمبر پنجم لغایت

---

[1] احمد شاہ شائق نام عیسائی نے ایک دلخراش کتاب بنام امہات المؤمنین چھپوا کر ایک ہزار جلد ۱۸۹۸ء میں ہندوستان کے نامور مسلمانوں کو بلا طلب مُفت بھیجی تھی، اسکے خلاف انجمن حمایتِ اسلام لاہور نے ایک میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجا تھا، جوکہ بیہودہ ثابت ہوا۔ اس میں اس میموریل کی طرف اشارہ ہے۔

[2] الحکم جلد ۲ صفحہ ۱۲-۱۳ صفحہ ۱ پرچہ ۲۰-۲۷ مئی ۱۸۹۸ء

دوازدہم جلد ہشتدہم بابت ۱۸۹۵ء بدست محمد ولد چوغطہ قوم اعوان ساکن ہتوں گکھڑ ضلع سیالکوٹ بھیجا جس میں حضرت مسیح موعودؑ پر بہت ناواجب حملے کئے گئے تھے۔ آپؑ نے ۲۵ر جولائی ۱۸۹۸ء کی سہ پہر کو اصل مرسلہ رسالہ کی پیشانی پر مندرجہ ذیل عبارت لکھ کر قاصد کو دے دیا[1] :

"رَبِّ اِنْ کَانَ ھٰذَا الرَّجُلُ صَادِقًا فِیْ قَوْلِہٖ فَاَکْرِمْہُ وَاِنْ کَانَ کَاذِبًا فَخُذْہُ - اٰمِیْن"[2]

یکم اگست ۱۸۹۸ء

صبح کی نماز کے بعد حضرت اقدسؑ نے فرمایا :

خواب میں ہاتھ سے دانت کا گرانا مُنذر ہوتا ہے

"مَیں نے خواب میں دیکھا کہ ایک ڈاڑھ کا حصّہ جو بوسیدہ ہوگئی ہے۔ اس کو مَیں نے مُنہ سے نکالا اور وہ بہت صاف تھا اور اُسے ہاتھ میں رکھا۔" پھر فرمایا کہ

"خواب میں دانت اگر ہاتھ سے گرایا جاوے، تو وُہ مُنذر ہوتا ہے ورنہ مُبَشّر"

زاں بعد محمد صادق نے اپنے دو خواب سُنائے جن میں سے ایک میں نُور کے کپڑوں کا ملنا اور دُوسرے میں حضرتِ اقدسؑ کے دیتے ہوئے مضمون کا خوشخط نقل کرنا تھا جس کی تعبیر حضرت اقدسؑ نے کامیابی مقاصد فرمائی۔

تائیدِ الٰہی سے مضامین کا دل پر نزول

اس کے بعد حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ "تائیداتِ الٰہیہ ایک تو بیّن اور ظاہر طور پر ظہور پذیر ہوتی ہیں اور عام لوگ اُن کو دیکھ سکتے ہیں، مگر بعض مخفی تائیدات ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے میری سمجھ میں کوئی قاعدہ نہیں آتا کہ عوام النّاس کو کیونکر دکھا سکوں۔ مثلاً یہی عربی تصنیف ہے۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ عربی ادب میں کہاں تک دسترس ہے، لیکن جب مَیں تصنیف کا سلسلہ شروع کرتا ہوں، تو یکے بعد دیگرے اپنے اپنے محل اور مَوقع پر موزون طور پر آنے والے الفاظ القاء ہوتے جاتے ہیں۔ اب کوئی بتلائے کہ ہم کیونکر اس تائیدِ الٰہی کو دکھلا سکیں کہ خدا کیونکر سینہ پر الفاظ نازل کرتا ہے۔ اور دیکھو اس اَیّامُ الصُّلح میں اکثر مضامین ایسے ہیں جن کا میری پہلی تصنیفات میں نام تک نہیں اور اللہ تعالیٰ خُوب جانتا ہے کہ اس سے پہلے وہ کبھی ذہن میں نہ گذرے تھے، لیکن اب وہ ایسے طور پر آکر قلب پر نازل ہوئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آسکتا، جبتک خود تائیدِ الٰہی شاملِ حال ہو کر اس کو اس قابل نہ بنادیوے اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے جو وہ ایسے بندوں پر کرتا ہے جن سے کوئی کام لینا ہوتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۲ نمبر ۲۰-۲۱ - پرچہ ۲۰ - ۲۷ جولائی ۱۸۹۸ء

[2] ترجمہ از مُرتّب : اے میرے رب! اگر یہ شخص اپنی بات میں سچا ہے تو تُو اسکی عزّت افزائی فرما۔ اگر جھوٹا ہے تو تُو اسے گرفت کر۔ آمین۔

یہ بھی ایک سچی بات ہے کہ تصنیفات کے لیے جبتک صحت اور فراغت نہ ہو، یہ کام نہیں ہوسکتا اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل اُن لوگوں ہی کو ملتا ہے جن سے وہ کوئی کام لینا چاہتا ہے۔ پھر ان کو یہ سب سامان جو تصنیف کے لیے ضروری ہوتے ہیں، یکجا جمع کر دیتا ہے۔"

رعایتِ اسباب

جناب مولانا مولوی نور دین صاحب رضی اللہ عنہٗ کی طبیعت ۲۱؍ جولائی ۱۸۹۸ء سے بعارضہ دردِ شکم علیل تھی، تو حضرت اقدسؑ نے آدمی بھیج کر خبر منگوائی اور افاقہ کی خبر سُنکر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فرمایا۔ اور فرمایا :

"مولوی صاحب کا سن اب انحطاط کا ہے، اس لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے گویا پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، لیکن انسان کو یہ بھی مناسب نہیں کہ وُہ اسباب کی رعایت نہ رکھے۔"

پھر فرمایا۔ کہ :

"دراصل انحطاط کا زمانہ ۴۰ سال کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ افراط اور تفریط اس سن میں اچھی نہیں ہوتی۔ میں نے بعض آدمی دیکھے ہیں کہ گِنا تُلا آٹا دیتے اور پانی بھی اندازہ اور وزن کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور بعض یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ان کو کسی قسم کا اندازہ ہی نہیں رہتا۔ یہ دونوں باتیں ٹھیک نہیں۔"

"جیسا میں نے کہا۔ زمانۂ شباب تیس سال تک ہے اور یہ بھی اس صُورت میں کہ قویٰ مضبوط اور تندرست ہوں، ورنہ بعض تو اوائل ہی میں تشبّہ بالشیوخ رکھتے ہیں۔"[1]

۲۳؍ اگست ۱۸۹۸ء کی شام

حضورؑ نے پُوچھا کہ :

جدید فلسفہ بے دینی کیوں پیدا کرتا ہے؟ "یہ موجودہ فلسفہ اکثر طبیعتوں میں بے دینی کیوں پیدا کر دیتا ہے۔"

ماسٹر غلام محمد صاحب سیالکوٹی نے کہا کہ "دراصل جو طبیعتیں پہلے ہی سے بے دینی کی طرف مائل ہوتی ہیں، وہی اس سے اثر پذیر ہوتی ہیں، ورنہ اکثر بڑے بڑے فلاسفر مزاج پادری اپنے مذہب میں

---

[1] الحکم جلد ۲ نمبر ۲۲-۲۳ صفحہ ۱۱ پرچہ ۶-۱۳ اگست ۱۸۹۸ء

پکّے ہوتے ہیں۔"

حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ:

"ان باتوں پر غور کرنے کے بعد افسوس کے ساتھ ذہن دُوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو یہ پادری لوگ کالجوں اور سکولوں میں فلسفہ اور منطق پڑھاتے ہیں اور دُوسری طرف مسیح کو ابن اللہ اور اللہ مانتے ہیں اور تثلیث وغیرہ عقائد کے قائل ہیں، جو سمجھ ہی میں نہیں آتا کیونکہ اس کو فلاسفہ سے مطابق کرتے ہیں۔ انگریزی منطق کی بنا تو منطق استقرائی ہی پر ہے۔ پھر یہ کونسا استقراء ہے کہ یسوع ابن اللہ ہے۔ کونسی شکل پیدا کرتے ہوں گے۔ یہی ہوگا کہ مثلاً اس قسم کے خواص جن لوگوں کے اندر ہوں وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہوتے ہیں اور مسیح میں یہ خواص تھے۔ پس وہ بھی خدا یا خدا کا بیٹا تھا۔ اس سے تو کثرت لازم آتی ہے جو مُحالِ مطلق ہے۔ مَیں تو جب اس پر غور کرتا ہوں، حیرت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ نہیں معلوم یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے؟

اسلام کے پاک اصُول ایسے نہیں ہیں کہ فلسفہ یا استقراء کی محک پر بھی کامل المعیار ثابت نہ ہوں، بلکہ مَیں نے بارہا غور کی ہے کہ قرآنِ کریم کی نسبت جو آیا ہے فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ (الواقعہ: ۷۹) یہ کتابِ مکنُون زمین اور آسمان کی چھپی ہوئی کتاب ہے، جس کے پڑھنے پر ہر شخص قادر نہیں ہو سکتا اور قرآن کریم اسی کتاب کا آئینہ ہے اور قرآن کریم نے وہی خدا دکھایا ہے، جس پر آسمان و زمین شہادت دیتے ہیں۔ مگر یہ اُنیس سَو برس کا تراشا ہوا جعلی مُردہ خدا کس سَنَد اور شہادت پر خدا بنایا گیا ہے۔ پس یہ اسلام ہی کی خوبی اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی فخر ہے کہ وہ ایسا دین لے کر آئے کہ جو ہمیشہ سے ہے اور جس کی تعلیم زمین اور آسمان کے اَوراق میں بھی واضح طور پر موجود ہے۔"[1]

۲۵ راگست ۱۸۹۸ء

موجودہ فارسی

۲۵ راگست کی صُبح کو فارسی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی نے کہا کہ "ایرانیوں نے آجکل اپنی توجہ تصنیفات کی طرف بہت مبذول کی ہے اور اس کثرت سے عربی الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ بجُز روابط کے فارسی زبان کو کم دخل دیتے ہیں اور باب مفاعلہ، انفعال۔ استفعال وغیرہ کو اس قدر کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ عقل حیران ہوتی ہے۔"

اس پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ "فہمیدن وغیرہ قدیم زمانے میں استعمال کرتے تھے۔ آج کل بہت کم استعمال رہ گیا ہے۔"

---

[1] الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴-۲۵ صفحہ ۹ پرچہ ۲۰-۲۷ راگست ۱۸۹۸ء

پھر مولانا عبدالکریم صاحب نے عرض کیا کہ "جناب ! آج کل تو مفاہمہ، تفہیم وغیرہ ہی بولتے ہیں۔"

عربی زبان کی وسعت اور اسلام کی تائید

اس کے بعد اسی سلسلہ میں حضرتؑ نے فرمایا : کہ

"عربی زبان بہت وسیع ہے اور ہر ایک قسم کی اصطلاحیں اس میں موجود ہیں اور تصنیفات اس قدر کثرت سے ہو رہی ہیں کہ جن کا علم بجز خدا کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ صرف حدیث ہی کو دیکھو کہ کوئی کامل طور پر دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے علم حدیث کی کُل کتابوں کو دیکھا ہو۔"

پھر مولانا مولوی عبدالکریم صاحب نے علی سبیل الذکر فرمایا کہ "حال ہی میں مولوی نورالدین صاحب کے پاس مصر سے کُتب خانہ خدیویہ کی ایک فہرست سات جلدوں میں آئی ہے۔ وہ فہرست ایسے طور پر مرتّب کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر بھی ایک مزہ آتا ہے۔ ایسے ڈھنگ پر کتابوں کے نمبر دیتے ہیں کہ ایک بالکل اجنبی بھی اگر لائبریری میں چلا جاوے، تو وہ بلا تکلیف عین کتاب پر ہاتھ ڈالے گا، بشرطیکہ اُس نے فہرست کو ایکبار دیکھا ہو۔"

اس پر حضرت اقدسؑ نے پوچھا کہ "وُہ کتابیں باہر جا سکتی ہیں؟"

"مولوی صاحب نے فرمایا: "ہاں - وُہ لائبریریاں ایسی نہیں۔ کتابیں نقل ہو سکتی ہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ"

اس پر جناب امام ہمام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ کہ :

"خداتعالیٰ نے اسلام کی کس قدر تائید کی ہے۔ اگر کوئی نادان اسلام کی اس تائیدِ الٰہی کا انکار کرتا ہے، تو اُسے ماننا پڑے گا کہ کبھی بھی دُنیا میں خدا نے کسی کی تائید نہیں کی۔ زبان کا اس قدر وسیع ہونا اور پھر اس میں اس قدر کثرت سے تصنیفات کا ہونا بھی اسلام ہی کی تائید ہے، کیونکہ قرآن شریف ہی کی تائید ہوئی ہے۔ کوئی اہلِ لغت جب کسی لفظ کے معنے لکھتا ہے، تو اگر وہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے، تو ساتھ ہی اُس نے وُہ آیت بھی ضرور لکھ دی ہے۔"

یہاں مولانا عبدالکریم صاحب نے فرمایا کہ "لسان العرب نے تو یہ طریق لازمی طور پر رکھا ہے۔" پھر حضرتؑ نے اپنے سلسلۂ تقریر میں فرمایا۔ کہ :

"سنسکرت وغیرہ زبانیں تو قریباً مُردہ ہو گئی ہیں۔ نہ اُن میں تصنیفات ہیں نہ کچھ اور۔ ایسا ہی عیسائیوں کا حال ہے کہ اُن کی انجیل کو اصلی زبان کی طرف توجّہ ہی نہیں رہی۔"

اسلام کا پیدا کردہ رُوحانی انقلاب

پھر اسی سلسلہ میں حضورؑ نے فرمایا :

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ پھر اسلام سے کیوں پرخاش رکھی جاتی ہے۔ اسلام کا خدا کوئی مصنوعی خدا نہیں، بلکہ وہی قادر خدا ہے جو ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور پھر رسالت کی طرف دیکھو کہ اصل غرض رسالت کی کیا ہوتی ہے؟

اوّل یہ کہ رسول ضرورت کے وقت پر آئے اور پھر اس ضرورت کو بوجہ احسن پورا کرے۔ سو یہ فخر بھی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ عرب اور دنیا کی حالت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی تھے۔ کھانے پینے کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ نہ حقوق العباد سے آشنا، نہ حقوق اللہ سے آگاہ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ اُن کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ یَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد: ۱۳) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا۔ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان: ۶۵) کی حالت ہوگئی۔ یعنی اپنے رب کی یاد میں راتیں سجدے اور قیام میں گذار دیتے تھے۔ اللہ! اللہ! کس قدر فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب سے ایک بےنظیر انقلاب اور عظیم الشان تبدیلی واقع ہوگئی۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزانِ اعتدال پر قائم کر دیا اور مُردار خور اور مُردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا۔ دونوں ہی خوبیاں ہوتی ہیں۔ علمی یا عملی۔ عملی حالت کا تو یہ حال کہ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان: ۶۵) اور علمی کا یہ حال کہ اس قدر کثرت سے تصنیفات کا سلسلہ اور توسیع زبان کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

دوسری طرف جب عیسائیوں کو دیکھتا ہوں، تو مجھے حیران ہی ہونا پڑتا ہے کہ حواریوں نے عیسائی ہو کر کیا ترقی کی۔ یہوداہ اسکریوطی جو یسوع کا خزانچی تھا۔ کبھی کبھی تغلب بھی کر لیا کرتا تھا اور تیس۳۰ روپے لے کر اُستاد کو پکڑوا نا تو اس کا ظاہر ہی ہے۔ یسوع کی تھیلی میں دو ہزار روپے رہا کرتے تھے۔ ایک طرف تو اُن کا یہ حال ہے بالمقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال کہ بوقتِ وفات پوچھا کہ کیا گھر میں کچھ ہے۔ جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایک دینار ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اسے تقسیم کر دو۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کا رسول خدا تعالیٰ کی طرف سفر کرے اور گھر میں ایک دینار چھوڑ جاوے۔

مجھے تو حیران ہی ہونا پڑتا ہے کہ عیسائی لوگ فلسفہ فلسفہ پکارتے ہیں۔ اُن کی الٰہیات کی فلاسفی خدا جانے کہاں گئی۔ کفارہ ہی کو دیکھو۔ ایک تصوری جانور کی طرح ہے۔ کفارہ نے کیا بنایا۔ علمی دلائل کو چھوڑ دیا جاوے۔ تو بھی دیکھو کہ حواریوں کی نہ تو علمی اصلاح ہوئی اور نہ عملی۔ علمی اصلاح کے لیے تو انجیل نے خود فیصلہ کر دیا کہ وہ موٹی عقل والے تھے اور کم فہم اور لالچی تھے اور عملی اصلاح کا خاکہ بھی انجیل ہی نے کھینچ کر دکھلا دیا کہ کوئی لعنتیں بھیجتا ہے اور کوئی تیس۳۰ روپے پر پکڑ واتا ہے اور کیا کچھ گناہ کے آثار۔ تاریکی اور ظلمت تو اس دنیا ہی میں شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے فرمایا مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل: ۷۳) اب یسوع کے شاگردوں کو دیکھو کہ کیا اُن کی حالت میں تبدیلی ہوئی۔ گناہ کے دُور ہونے سے تو ایک قسم کی بصیرت اور روشنی پیدا ہوتی ہے، مگر اُن میں کہاں۔ پھر کفارہ نے کیا بنایا؟"

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴-۲۵، پرچہ ۲۰-۲۷ اگست ۱۸۹۸ء)

کامیابی کی بشارت

۲۶ر ستمبر ۱۸۹۸ء ۲۶ ستمبر کی صبح کو بعد نماز فجر حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ

"اب میری حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی خواب بھی آتا ہے، تو میں اُسے اپنی ذات یا نفس سے مخصوص نہیں سمجھتا، بلکہ اسلام اور اپنی جماعت ہی کے متعلق سمجھتا ہوں اور میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اپنے نفس کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ چنانچہ رات میں نے دیکھا کہ ایک بڑا پیالہ شربت کا دیا۔ اس کی حلاوت اس قدر ہے کہ میری طبیعت برداشت نہیں کرتی۔ باینہمہ میں اُس کو پیئے جاتا ہوں اور میرے دل میں یہ خیال بھی گذرتا ہے کہ مجھے پیشاب کثرت سے آتا ہے اتنا میٹھا اور کثیر شربت میں کیوں پی رہا ہوں، مگر اس پر بھی میں اس پیالے کو پی گیا۔ شربت سے مراد کامیابی ہوتی ہے اور یہ اسلام اور ہماری جماعت کی کامیابی کی بشارت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس قدر تعلقات انسان کے وسیع ہوتے جاتے ہیں، اسی قدر سلسلہ اُس کے خواب کا بلحاظ تعلقات وسیع ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کلکتہ کا کوئی ایسا شخص ہو جس کو ہم جانتے بھی نہیں، تو اس کے متعلق کوئی خواب بھی نہ آئے گی؛ چنانچہ کئی سال پہلے جب مجھے صرف چند آدمی جانتے تھے، اس وقت جو خواب آتی تھی وہ اُن تک ہی محدود ہوتی تھی اور اب کئی ہزار سے تعلق رکھتی ہے۔"

اُدویات کے متعلق سلسلہ گفتگو کا چل پڑا اور وہ اس تقریب پر کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو کوئی دوا حضرت اقدسؑ نے شبِ گذشتہ کو دی تھی۔ اس کے اثر کے متعلق حضرتؑ نے دریافت فرمایا۔ اسی ضمن میں ایسٹرن سیرپ اور کچلہ وغیرہ پر مختلف ذکر ہوتا رہا اور ان کے خواص میں سے اعصاب کی تقویت کا تذکرہ ہوا۔

عربی زبان کے کمالات جس پر حضرتِ اقدسؑ کو مولانا مولوی عبدالکریم نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ عَصَبَ کے لفظ میں فلاسفی بھری ہوئی ہے کیونکہ عَصَب کے معنی ہیں باندھنا اور پٹھے بھی انسان کے اعضاء کو رسیوں کی طرح باندھے رکھتے ہیں اور بالمقابل نَرْوْ (NERVE) کے لفظ میں بجز لفظ کے کچھ بھی نہیں۔ اس پر حضرتؑ نے فرمایا:

"یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ الفاظ کے اندر علمی باتیں بھری ہوئی ہیں اور عربی زبان اسی لیے خاتم الالسنہ ہے۔ چونکہ قرآن جیسا عظیم الشان معجزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا، اس لیے اس کی عظمت علمی پہلو سے بہت بڑی ہے۔"

پھر اسی کے ضمن میں مِننُ الرّحمٰن کی اشاعت کے متعلق تذکرہ ہوتا رہا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ بعض اسباب

اور سامان کے بہم پہنچ جانے پر جو اس کے لیے ضروری ہیں، شائع ہوگی۔"

اپنی صداقت پر چار قسم کے نشانات

پھر اسی ذکر میں آپؑ نے فرمایا "مَیں نے بارہا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے نشان مجھے دیئے ہیں۔ جن کو مَیں نے بڑے دعوے کے ساتھ متعدد مرتبہ لکھا اور شائع کیا ہے۔"

اوّل۔ عربی دانی کا نشان ہے اور یہ اُس وقت سے مجھے ملا ہے، جب سے کہ محمد حسین (بٹالوی صاحب) نے یہ لکھا کہ یہ عاجز عربی کا ایک صیغہ بھی نہیں جانتا، حالانکہ ہم نے کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا کہ عربی کا صیغہ آتا ہے۔ جو لوگ عربی املاء اور انشاء میں پڑے ہیں وہ اس کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور اُس کی خوبیوں کا لحاظ رکھ سکتے ہیں۔ مولوی صاحب (مولوی عبدالکریم صاحب سے مراد تھی) شروع سے دیکھتے رہے ہیں کہ کس طرح پر اللہ تعالیٰ نے اعجازی طور پر مدد دی ہے۔ بڑی مشکل آکر یہ پڑتی ہے۔ جب میٹھے زبان کا لفظ مناسب موقع پر نہیں ملتا، اس وقت خدا تعالیٰ وہ الفاظ القاء کرتا ہے۔ نئی اور بناوٹی زبان بنالینا آسان ہے، مگر ٹھیٹھ زبان مشکل ہے۔ پھر ہم نے ان تصانیف کو بیش قرار انعامات کے ساتھ شائع کیا ہے اور کہا ہے کہ تم جس سے چاہو، مدد لے لو اور خواہ اہلِ زبان بھی بلالو۔ مجھے خدا تعالیٰ نے اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ وہ ہرگز قادر نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ نشان قرآنِ کریم کے خوارق میں سے ظلّی طور پر مجھے دیا گیا ہے۔

دوم۔ دُعاؤں کا قبول ہونا۔ مَیں نے عربی تصانیف کے دوران میں تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ کس قدر کثرت سے میری دُعائیں قبول ہوئی ہیں۔ ایک ایک لفظ پر دُعا کی ہے اور مَیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو مُستثنیٰ کرتا ہوں۔ (کیونکہ اُن کے طفیل اور اقتداء سے تو یہ سب کچھ مِلا ہی ہے) اور مَیں کہہ سکتا ہوں کہ میری دُعائیں اس قدر قبول ہوئی ہیں کہ کسی کی نہیں ہوتی ہوں گی۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ دس ہزار یا دو لاکھ یا کتنی اور بعض نشانات قبولیت کے تو ایسے ہیں کہ ایک عالم اُن کو جانتا ہے۔

تیسرا۔ نشان پیشگوئیوں کا ہے یعنی اِظہَار عَلَی الغَیب۔ یُوں تو نجومی اور رمال لوگ بھی اٹکل بازیوں سے بعض باتیں ایسی کہہ دیتے ہیں کہ اُن کا کچھ نہ کچھ حصہ ٹھیک ہوتا ہے اور ایسا ہی تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی کاہن لوگ تھے جو غیب کی خبریں بتلاتے تھے، چنانچہ سطیح بھی ایک کاہن تھا، مگر ان اٹکل بازرمالوں اور کاہنوں کی غیب دانی اور مامُور من اللہ اور ملہم کے اظہارِ غیب میں فرق ہوتا ہے کہ مُلہم کا اظہارِ غیب اپنے اندر الٰہی طاقت اور خدائی ہیبت رکھتا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم نے صاف فرمایا ہے۔ لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن: ۲۷، ۲۸) یہاں اظہار کا لفظ ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے اندر ایک شوکت اور قوّت ہوتی ہے۔

چوتھا نشان قرآن کریم کے دقائق اور معارف کا ہے، کیونکہ معارفِ قرآن اُس شخص کے سوا اور کسی پر نہیں کھل سکتے، جس کی تطہیر ہو چکی ہو۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ : ۸۰) میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میرے مخالف بھی ایک سورۃ کی تفسیر کریں اور میں بھی تفسیر کرتا ہوں۔ پھر مقابلہ کر لیا جاوے، مگر کسی نے جرأت نہیں کی۔ محمد حسین وغیرہ نے تو یہ کہہ دیا کہ ان کو عربی کا صیغہ نہیں آتا اور جب کتابیں پیش کی گئیں تو بودے اور رکیک عذر کر کے ٹال دیا کہ یہ عربی تو اُردو کی چاٹو ہے، مگر یہ نہ ہو سکا کہ ایک صفحہ ہی بنا کر پیش کر دیتا اور دکھا دیتا کہ عربی یہ ہے۔

غرض یہ چار نشان ہیں جو خاص طور پر میری صداقت کے لیے مجھے ملے ہیں۔[1]"

۳ر اکتوبر ۱۸۹۸ء

ایک رویاء ۳ر اکتوبر کی صبح کو بعد نماز فجر فرمایا کہ

"رات کو بعد تہجد لیٹ گیا تو تھوڑی سی غنودگی کے بعد دیکھا کہ میرے ہاتھ میں "سُرمہ چشم آریہ" کے چار ورق ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ آریہ لوگ اب خود اس کتاب کو چھپوا رہے ہیں۔" تعبیر میں فرمایا کہ "شاید اس سے یہ مراد ہو کہ آریہ لوگوں کو جو بعض حجاب اور وساوس ہماری پیشگوئیوں مثل پیشگوئی متعلقہ لیکھرام وغیرہ کے متعلق ہیں۔ وہ دور ہو جاویں۔ اور اُن پر اصل حقیقت کا انکشاف ہو جاوے۔ مقدمہ کلارک میں رام بھجدت وکیل آریہ تھا۔ جب اُمرت سر کے سٹیشن پر مجھ سے ملا، تو اُس نے صاف کہا کہ میں بلا فیس اس مقدمہ میں اس لیے گیا تھا کہ شاید قتل لیکھرام کا کوئی سراغ ملے، کیونکہ اُس کے قتل کا بالیقین ہم کو آپ پر تھا۔ ایسا ہی اور اقوام کو ایسا خیال ہو سکتا ہے پس اس خواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ان پر اصل حقیقت کھول کر حجتِ مُلزمہ قائم کر دے۔" پھر فرمایا کہ "پٹی والے جو اشتہار دکھائے گئے تھے، اُس میں بھی یہی تھا کہ وہ لوگ خود چھپوا رہے ہیں۔"

پیشگوئی کی عظمت اس پر مولانا مولوی نورالدین صاحبؓ نے فرمایا کہ جب وُہ اَمر پورا ہوگا۔ جس قدر عظمت اور قدر ہم کو ہوگی اور لوگوں کو کہاں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ کیسے مشکلات درپیش ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ

"بیشک صرف اسی میں نہیں بلکہ ہر دُعا اور پیشگوئی کی عظمت اور قبولیت میں یہی حال ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی لق و دق میدان میں جہاں ہزار ہا کوس تک پانی نہیں ملتا۔ کوئی شخص دُعا کرے اور خدا تعالیٰ اپنے فضل سے اُسے پانی

---

[1] الحکم جلد ۲ نمبر ۲۸-۲۹ پرچہ ۲۰-۲۷ ستمبر ۱۸۹۸ء

کا پایہ عطا کرے تو اس امر کو مجمل طور پر ان مشکلات اور لوازمات کو نظرانداز کر کے بیان کیا جاوے۔ تو لوگ جو کل حالات پر آگاہ نہیں، بجائے عظمت کے ہنسی کریں گے۔ مگر جب مشکلات سے واقف ہوں، تو پھر ایک خاص عظمت اور ہیبت سے اُس کو دیکھیں گے۔ ایسا ہی اگر کوئی ناخواندہ اور اُمّی آدمی انگریزی کی کتاب پڑھ جاوے، تو اس کی اُمیت سے واقف لوگ اُسے عظمت کی نگاہ سے دیکھیں گے، مگر ایک ایم۔اے اور بی۔اے اگر اُس کتاب کو پڑھ جاوے تو چنداں کیا، بالکل وقعت نہ دیں گے، معمولی امر خیال کریں گے۔

غرض ہر ایک اَمر کی عظمت اور عدم عظمت اس کے حصول کے لوازمات اور مشکلات پر ہوتی ہے۔"

تیس ہزار دعاؤں کی قبولیت

پھر فرمایا کہ

"لوگ اس امر کو بھی جھوٹ جانیں گے۔ جو ہم نے لکھ دیا ہے کہ میری تیس ہزار دُعائیں کم از کم قبول ہوئی ہیں، مگر میرا خدا خوب جانتا ہے کہ یہ سچ ہے اور اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں۔ کیونکہ ہر ایک کام کے لیے خواہ دینی ہو یا دُنیوی دُعا کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے موزوں اور طیب بنا دیا ہے۔"

عربی تصنیفات میں دُعا کے اثرات

عربی تصنیفات میں ایک ایک لفظ دُعا ہی کا اثر ہے اور نہ انسانی طاقت کا کام نہیں کہ تحدی کرے۔ اگر دُعا کا اثر نہیں تو پھر کیوں کوئی مولوی یا اہلِ زبان دم نہیں مار سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اہلِ زبان کے رنگ اور محاورہ پر ہماری کتب تصنیف ہوئی ہیں، ورنہ اہلِ زبان بھی سارے اس پر قادر نہیں ہوتے کہ کُل مُسلّم محاوراتِ زبان پر اطلاع رکھتے ہوں۔ پس یہ خدا ہی کا فضل ہے۔"

۲/جنوری ۱۸۹۹ء

رسالہ کشف الغطا کی تصنیف کا مقصد

۸ بجے دن کے حضرت اقدس امام ہمامؑ ایک کثیر التعداد احباب کے ہمراہ سیر کو تشریف لے گئے۔ اثنائے راہ میں فرمایا:

"یہ تکالیف اور ایذائیں جو مخالف کبھی بدزبانیوں کے رنگ میں اور جھوٹ اور افتراء سے بھرے ہوئے اشتہاروں کے ذریعے اور کبھی گورنمنٹ اور حکومت کو خلافِ واقعہ اور محض جھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے بدظن کر کے ہم کو پہنچاتے ہیں۔ اگر ہماری اپنی ہی ذات تک محدود اور مخصوص ہوتیں، تو خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم کو ذرا بھی خیال نہ ہوتا، کیونکہ ہم تو قربانی کے بکرے کی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر وقت تیار ہیں، مگر اس کا اثر ہماری قوم پر پہنچتا ہے۔ اور بعض لوگ ابھی ایسے کمزور بھی ہیں جو ابتلا برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان

کُل حالات کو چھاپ کر گورنمنٹ کے پاس بھیج دیں، کیونکہ اگر ہم خاموش رہیں تو ادھر مخالف ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ پھر اس کا اثر اچھا نہیں پڑتا۔ چونکہ ہمارے دل صاف ہیں اور ہم بد باطن لوگوں کی طرح نفاق اور مداہنت سے کام نہیں لیتے اس لیے ہم کو کامل امید ہے کہ یہ رسالہ کشف الخطاء گورنمنٹ عالیہ کو ہمارے حالات اور ہمارے تعلقات سے اطلاع دے گا اور ہمارے ہر دوست کے پاس بطور سارٹیفکیٹ کے رہے گا۔"

۵؍جنوری ۱۸۹۹ء

مُہرِ نبوت کی اصل حقیقت

بعد نمازِ صبح مولوی قطب الدین صاحب ساکن بدّوملہی نے سوال کیا کہ "رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کتفین مبارک کے درمیان جو مُہرِ نبوت بتلائی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ رسولی کی طرح تھی۔ اُس کی اصل حقیقت کیا ہے؟"

"فرمایا: رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہرِ نبوت کے متعلق جو اعتراض کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بالکل غلط بات ہے۔ مگر مَیں یہ بات اپنے سچے جوش اور اخلاص سے کہتا ہوں کہ میرا ایمان یہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی نشانِ نبوّت کو رسولی وغیرہ الفاظ سے نسبت دینا ایک مومن اور سچے مسلمان کا کام نہیں۔ یہ گستاخی اور شوخی ہے۔ جو کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم کو ایسے معاملات میں زیادہ تفتیش اور چھان بین کی ضرورت نہیں کہ وہ مُہرِ نبوت کیا تھی؟ اور کیسی تھی؟ کیونکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے بیشمار نشانات بیّن اور واضح طور پر رکھے تھے۔ ان میں سے ایک مُہرِ نبوت بھی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجُود با جُود سے انبیاء علیہم السّلام کو ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ہلال کو بدر سے ہوتی ہے۔ ہلال کا وجود ایک تاریکی میں ہوتا ہے، لیکن جب وہ اپنے کمال کو پہنچ کر بدر بن جاتا ہے، تو وہ بدر اپنی پہلی حالتِ ہلال کا مثبت اور مُصدّق ہو جاتا ہے۔ پس یقیناً سمجھو کہ اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے تو پہلے نبی اور ان کی نبوتوں کے پہلو مخفی رہتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسیح علیہ السلام پر احسان

اب سوچو اور بتلاؤ کہ کیا موجُودہ اناجیل سے انسان طریقِ توحید کا پتہ لگا سکتا ہے۔ کیسی حیران کر دینے والی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا نبی اُس کی توحید کو قائم کرنے آیا کرتا ہے یا اپنی خدائی منوانے؟ پس اب موجودہ انجیل نے یہی نہیں کہ طریقِ توحید کو گم کیا۔ بلکہ ساتھ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور نبوّت کو اُڑا دیا اور جبکہ وہ خدا یا ابنِ خدا بنتے۔ اُن کو نبی کے درجہ سے بھی گرا کر معاذ اللہ بہت بُرے درجہ کا آدمی بنا دیا۔ مگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات نے آکر اُن کی تعلیم کو زندہ کیا اور خود مسیح کی اپنی ذات اور وجود کے لیے مسیحائی کی کہ اس کو مُردوں

سے نکال کر اس زندگی میں داخل کیا، جو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں اور رسولوں کو دی جاتی ہے۔

اسلام کی برتری

تعلیم وہی کامل ہو سکتی ہے جو انسانی قویٰ کی پوری مربّی اور متکفّل ہو۔ نہ یہ کہ ایک ہی پہلو پر واقع ہوئی ہو۔ انجیل کی تعلیم کو دیکھو کہ وہ کیا کہتی ہے اور اس کے بالمقابل قویٰ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ انسانی قویٰ اور فطرت خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب ہے۔ پس اس کی قولی کتاب جو کتاب اللہ کہلاتی ہے یا اُسے تعلیمِ الٰہی کہو۔ اس کی ساخت اور بناوٹ کے مخالف اور متضاد کیونکر ہوگی؟ اسی طرح پر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے، تو انبیاء سابقین کے اخلاق، ہدایات، معجزات اور قوتِ قدسیہ پر اعتراض ہوتے، مگر حضورؐ نے آکر اُن سب کو پاک ٹھہرایا۔ اس لیے آپؐ کی نبوت کے نشانات سورج سے زیادہ روشن ہیں اور بے انتہا اور بے شمار ہیں۔ پس آپؐ کی نبوت یا نشاناتِ نبوت پر اعتراض کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ دن چڑھا ہوا ہو اور کوئی احمق نابینا کہہ دے کہ ابھی تو رات ہی ہے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ دوسرے مذاہب تاریکی ہی میں رہتے، اگر اب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے، ایمان تباہ ہو جاتا اور زمین لعنت اور عذابِ الٰہی سے تباہ ہو جاتی۔ اسلام شمع کی طرح منوّر ہے۔ جس نے دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالا ہے۔ توریت کو پڑھو تو بہشت اور دوزخ کا پتہ ہی ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انجیل کو دیکھو تو توحید کا نشان نہیں ملتا۔ اب بتلاؤ کہ اس میں تو شک نہیں کہ یہ دونوں کتابیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تھیں اور ہیں۔ لیکن ان میں کون سی روشنی مل سکتی ہے۔ سچی روشنی اور حقیقی نور جو نجات کے لیے مطلوب ہے، وہ اسلام ہی میں ہے۔ توحید ہی کو دیکھو کہ جہاں سے قرآن کو کھولو وہ ایک شمشیرِ برہنہ نظر آتا ہے کہ شرک کی جڑھ کاٹ رہا ہے۔ ایسا ہی نبوت کے تمام پہلو ایسے صاف اور روشن نظر آتے ہیں کہ اُن سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

ختمِ نبوت کی حقیقت

ختمِ نبوت کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں پر دلائل اور معرفت طبعی طور پر ختم ہو جاتے ہیں، وہ وہی حد ہے جس کو ختمِ نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ملحدوں کی طرح نکتہ چینی کرنا بے ایمانوں کا کام ہے۔ ہر بات میں بیّنات ہوتے ہیں اور ان کا سمجھنا معرفتِ کاملہ اور نورِ بصر پر موقوف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ایمان اور عرفان کی تکمیل ہوئی۔ دوسری قوموں کو روشنی پہنچی۔ کسی اور قوم کو روشن اور بیّن شریعت نہیں ملی۔ اگر ملی تو کیا وہ عرب پر کچھ بھی اپنا اثر نہ ڈال سکتی۔ عرب سے وہ آفتاب نکلا کہ اس نے ہر قوم کو روشن کیا اور ہر بستی پر اپنا نور ڈالا۔ یہ قرآن کریم ہی کو فخر حاصل ہے کہ وہ توحید اور نبوت کے مسئلہ میں کُل دنیا کے مذاہب پر فتحیاب ہو سکتا ہے۔ یہ فخر کا مقام ہے کہ ایسی کتاب مسلمانوں کو ملی ہے۔ جو لوگ حملہ کرتے ہیں اور تعلیم و ہدایتِ اسلام پر معترض ہوتے ہیں۔ وہ بالکل کور باطنی اور بے ایمانی سے بولتے ہیں۔

تعددِ ازدواج کی اجازت

مثلاً کثرتِ ازدواج پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے بہت عورتوں کی اجازت دی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ کیا کوئی ایسا دلیر اور مردِ میدان معترض ہے جو ہم کو یہ دکھلا سکے کہ قرآن کہتا ہے کہ ضرور ضرور ایک سے زیادہ عورتیں کرو۔ ہاں یہ ایک سچی بات ہے اور بالکل طبعی امر ہے کہ اکثر اوقات انسان کو ضرورت پیش آجاتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں کرے۔ مثلاً عورت اندھی ہوگئی یا کسی اور خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر اس قابل ہوگئی کہ خانہ داری کے اُمور سرانجام نہیں دے سکتی اور مرد ازراہِ ہمدردی یہ بھی نہیں چاہتا کہ اُسے علیحدہ کرے یا رِحم کی خطرناک بیماریوں کا شکار ہو کر مرد کی طبعی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتی، تو ایسی صورت میں اگر نکاحِ ثانی کی اجازت نہ ہو، تو بتلاؤ کیا اس سے بدکاری اور بداخلاقی کو ترقی نہ ہوگی؟ پھر اگر کوئی مذہب و شریعت کثرتِ ازدواج کو روکتی ہے، تو یقیناً وہ بدکاری اور بداخلاقی کی مؤید ہے، لیکن اسلام جو دُنیا سے بداخلاقی اور بدکاری کو دُور کرنا چاہتا ہے، اجازت دیتا ہے کہ ایسی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ ایسا ہی اولاد کے نہ ہونے پر جبکہ لاولد کے پس مرگ خاندان میں بہت سے ہنگامے اور کُشت و خون ہونے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایک ضروری امر ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں کرکے اولاد پیدا کرے، بلکہ ایسی صورت میں نیک اور شریف بیبیاں خود اجازت دے دیتی ہیں پس جس قدر غور کروگے یہ مسئلہ صاف اور روشن نظر آئے گا۔ عیسائی کو تو حق ہی نہیں پہنچتا کہ اس مسئلہ پر نکتہ چینی کرے، کیونکہ اُن کے مسلّمہ نبی اور مُلہم بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بزرگوں نے سات سات سو اور تین تین سو بیبیاں کیں اور اگر وہ کہیں کہ وہ فاسق فاجر تھے، تو پھر ان کو اس بات کا جواب دینا مشکل ہوگا کہ اُن کے الہام خدا کے الہام کیونکر ہوسکتے ہیں؟ عیسائیوں میں بعض فرقے ایسے بھی ہیں جو نبیوں کی شان میں ایسی گستاخیاں جائز نہیں رکھتے۔ علاوہ ازیں انجیل میں صراحت سے اس مسئلہ کو بیان ہی نہیں کیا گیا۔ لنڈن کی عورتوں کا زور ایک باعث ہوگیا کہ دُوسری عورت نہ کریں۔ پھر اس کے نتائج خود دیکھ لو کہ لنڈن اور پیرس میں عفت اور تقویٰ کی کیسی قدر ہے۔

اسلام کی لڑائیاں دفاعی تھیں

ایسا ہی دُوسرے مسائل غلامی اور جہاد پر بھی ان کے اعتراض درست نہیں، کیونکہ توریت میں ایک لمبا سلسلہ ایسی جنگوں کا چلتا ہے، حالانکہ اسلام کی لڑائیاں ڈیفنسو (دفاعی) تھیں اور وُہ صرف دس سال ہی کے اندر ختم ہوگئیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ مسائل اُن کی کتابوں میں سے نکال سکتا ہوں۔ اور ایسے ہی میرا دعویٰ ہے کہ تمام صداقتیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اگر کوئی مدعی ایسی صداقت پیش کرے کہ وُہ قرآن میں نہیں۔ مَیں اُسے نکال کر دکھانے کو تیار ہوں۔

ف: DEFENSIVE

اسلامی شریعت نے وہ مسائل لیے ہیں جو طبعی اور فطرتی طور پر انسان کے لیے مطلوب ہیں اور جو ہر پہلو سے اُس کے قویٰ کی تربیت کرتے ہیں۔ ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں! اسلام کے جو اعتراض غیر مذاہب پر ہیں وُہ اُن کا جواب نہیں دے سکتے۔

سعید اور شقی کا چہرہ

پس مَیں پھر کہتا ہوں کہ میری باتوں کو استخفاف اور استہزاء کی نظر سے نہ دیکھیں استہزاء سے کفر کا اندیشہ ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا ادب اور خوف ہونا چاہیے۔ ہر ایک عارف ان باتوں کے ہزارہا جواب دے سکتا ہے۔ کیا چہروں میں ایسی علامات نہیں ہوتیں جن کو دیکھ کر ہم ایک سعید اور شقی، بدمعاش اور خوش اطوار میں تمیز کر سکتے ہیں اور پہچان لیتے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھا ہے کہ ایک شخص نے آپؐ کو دیکھ کر کہا کہ یہ جھوٹوں کا مُنہ نہیں۔ اب وہ کونسا نشان تھا جو جھوٹوں میں ہوتا ہے اور آپؐ میں نہ تھا۔ ایک امتیاز تو تھا جس کو بصیرت والا انسان دیکھ سکتا ہے۔ ایسا ابلہ اور احمق کون ہے، جو نیک اور بد کو چہرہ سے دیکھ کر تمیز نہیں کر سکتا۔ مومن کا چہرہ اور ہر عضو اس کو ایک امتیاز بخشتا ہے اور اس کے باخدا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہرِ نبوت میں ایک خصوصیت ہو تو بتلاؤ اس سے کیا استبعاد لازم آتا ہے۔ سب کچھ ممکن ہے۔

صرف امورِ ایمانی پر ایمان لانا ضروری ہے

بالآخر یہ یاد رکھو کہ یہ ایک فروعی بات ہے۔ ہم کو ضرورت نہیں کہ ان باتوں میں پڑیں۔ اصول پر بحث ہونی چاہیے۔ اصول کے اثبات پر فرع خود ہی ثابت ہو جاتی ہے۔ ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کی کیفیت اور کُنہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں۔ دشمن اگر گفتگو کرے، تو ہم اُس کو روک سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کی صفات پر، ملائکہ اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام وغیرہ امُورِ ایمانی پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان سب باتوں کا ماننا اصول ہے اور باقی امُور اُن پر متفرع ہیں اور یہ سب صفائی کے ساتھ ثابت شدہ صداقتیں ہیں۔ تعلیمِ اسلام ایسی صاف ہے کہ ہر قوت کو اعتدال اور عین محل پر رکھتی اور تربیت کرتی ہے اور یہ عظیم الشان معجزہ ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ دُوسری تعلیمیں ایسی نہیں۔ کسی کا ناک نہیں تو کسی کے کان نہیں ہیں۔ غرض وہ ناقص اور ادھوری ہیں۔ مکمّل خلقت تعلیمِ اسلام ہی کی ہے۔ توحید، صفاتِ باری تعالیٰ، نبوّت اور اخلاقِ فاضلہ، تکمیلِ نفس وغیرہ امور جن کا انسان محتاج ہے۔ وہ ایسے کامل اور روشن طور پر بیان ہوئے ہیں کہ ان میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں پڑتی۔ باقی امُور کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر کھاتے تھے؟ کتنے بڑے نوالے لیتے تھے۔ ان جھگڑوں میں پڑنے کی مومن کو کیا ضرورت ہے؟ مدارِ نجات ان باتوں پر نہیں ہے۔ ایسی باتیں جو اکثر کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ اگر وہ نبوّتِ حقّہ کے خلاف نہیں بلکہ مشابہ ہیں تو ایمان لائیں؛ ورنہ تاویل کریں۔ کچھ ضرورت نہیں کہ اس پر چُناں اور چُنیں کر کے لمبی اور فضول

بحثوں میں پڑیں۔

خَاتَمُ النَّبِیِّین کے معنی ختم نبوت کے متعلق میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ خاتم النبیین کے بڑے معنے یہی ہیں کہ نبوت کے اُمور کو آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔

یہ موٹے اور ظاہر معنے ہیں۔ دُوسرے یہ معنے ہیں کہ کمالاتِ نبوت کا دائرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ قرآن نے ناقص باتوں کا کمال کیا اور نبوت ختم ہوگئی، اس لیے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (المائدہ : ۴) کا مصداق اسلام ہوگیا۔ غرض یہ نشاناتِ نبوت ہیں۔ اُن کی کیفیت اور کُنہ پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصُول صاف اور روشن ہیں اور وُہ ثابت شدہ صداقتیں کہلاتی ہیں۔ ان باتوں میں پڑنا مومن کو ضروری نہیں۔ ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر کوئی مخالف اعتراض کرے تو ہم اُس کو روک سکتے ہیں۔ اگر وُہ بند نہ ہو تو ہم اس کو کہہ سکتے ہیں کہ پہلے اپنے جُزوی مسائل کا ثبوت دے۔ الغرض مُہرِ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشاناتِ نبوت میں سے ایک نشان ہے، جس پر ایمان لانا ہر مسلمان مومن کو ضروری ہے[1]۔

۵؍جنوری ۱۸۹۹ء

قبر سے رُوح کا تعلق (سوال مولوی قطب الدین صاحب) "رُوح کا تعلق جو قبور سے بتلایا گیا ہے۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟"

فرمایا: اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ ارواح کے تعلقِ قبور کے متعلق احادیثِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا ہے، وہ بالکل سچ اور درُست ہے۔ ہاں یہ دُوسرا امر ہے کہ اس تعلق کی کیفیت اور کُنہ کیا ہے؟ جس کے معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں! البتہ یہ ہمارا فرض ہوسکتا ہے کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ اس قسم کا تعلق قبوُر کے ساتھ ارواح کا ہوتا ہے اور اس میں کوئی مُحالِ عقلی لازم نہیں آتا۔

اور اس کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت میں ایک نظیر پاتے ہیں۔ درحقیقت یہ امر اسی قسم کا ہے، جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اُمور کی سچائی اور حقیقت صرف زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے اور اس کو ذرا وسیع کرکے ہم یوں کہتے ہیں کہ حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقے رکھے ہیں۔ بعض خواص آنکھ کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں اور بعض صداقتوں کا پتہ صرف کان لگاتا ہے اور بعض ایسی ہیں کہ حسِ مشترک سے ان کا سراغ چلتا ہے اور کتنی ہی سچائیاں ہیں کہ وہ مرکزِ قویٰ یعنی دل سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے صداقت کے معلوم کرنے کے لیے

---

[1] الحکم جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۹ پرچہ ۱۰؍جنوری ۱۸۹۹ء

مختلف طریق اور ذریعے رکھے ہیں۔ مثلاً مصری کی ایک ڈلی کو کان پر رکھیں، تو اس کا مزہ معلوم نہ کر سکیں گے اور نہ اُس کے رنگ کو بتلا سکیں گے۔ ایسا ہی اگر آنکھ کے سامنے کریں گے، تو وہ اُس کے ذائقہ کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے گی۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے کے لیے مختلف قویٰ اور طاقتیں ہیں۔ اب آنکھ کے متعلق اگر کسی چیز کا ذائقہ معلوم ہو اور وُہ آنکھ کے سامنے پیش ہو، تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اس چیز میں کوئی ذائقہ ہی نہیں یا آواز نکلتی ہو اور کان بند کر کے زبان سے وہ کام لینا چاہیں، تو کب ممکن ہے۔ آج کل کے فلسفی مزاج لوگوں کو یہ بڑا دھوکا لگا ہوا ہے کہ وہ اپنے عدمِ علم کی وجہ سے کسی صداقت کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں دیکھا جاتا ہے کہ سب کام ایک شخص نہیں کرتا بلکہ جُداگانہ خدمتیں مقرر ہیں۔ سقہ پانی لاتا ہے۔ دھوبی کپڑے صاف کرتا ہے، باورچی کھانا پکاتا ہے۔ غرضیکہ تقسیمِ محنت کا سلسلہ ہم انسان کے خود ساختہ نظام میں بھی پاتے ہیں۔ پس اس اصل کو یاد رکھیں کہ مختلف قوتوں کے مختلف کام ہیں۔ انسان بڑے قویٰ لے کر آیا ہے اور طرح طرح کی خدمتیں اس کی تکمیل کے لیے ہر ایک قوت کے سپرد ہیں۔ نادان فلسفی ہر بات کا فیصلہ اپنی عقلِ خام سے چاہتا ہے؛ حالانکہ یہ بات غلط محض ہے۔ تاریخی امور تو تاریخ ہی سے ثابت ہوں گے اور خواص الاشیاء کا تجربہ بدوں تجربۂ صحیحہ کے کیونکر لگ سکے گا۔ امورِ قیاسیہ کا پتہ عقل دے گی۔ اسی طرح پر متفرق طور پر الگ الگ ذرائع ہیں۔ انسان دھوکہ میں مبتلا ہو کر حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے سے تب ہی محروم ہو جاتا ہے جبکہ وہ ایک ہی چیز کو مختلف اُمور کی تکمیل کا ذریعہ قرار دے لیتا ہے۔

میں اس اصول کی صداقت پر زیادہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ ذرا سے فکر سے یہ بات خوب سمجھ میں آجاتی ہے اور روزمرہ ہم ان باتوں کی سچائی دیکھتے ہیں پس جب رُوح جسم سے مفارقت کرتی ہے یا تعلق پکڑتی ہے، تو ان باتوں کا فیصلہ عقل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو فلسفی اور حکماء ضلالت میں مبتلا نہ ہوتے۔

رُوح کے متعلق علوم چشمۂ نبوت سے ملتے ہیں

اسی طرح قبور کے ساتھ جو تعلق ارواح کا ہوتا ہے۔ یہ ایک صداقت تو ہے، مگر اس کا پتہ دینا اس آنکھ کا کام نہیں۔ یہ کشفی آنکھ کا کام ہے کہ وُہ دکھلاتی ہے۔ اگر محض عقل سے اس کا پتہ لگانا چاہو تو کوئی عقل کا پُتلا اتنا ہی بتلاتے کہ رُوح کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ ہزار اختلاف اس مسئلہ پر موجود ہیں اور ہزارہا فلاسفر دہریہ مزاج موجود ہیں جو منکر ہیں۔ اگر نری عقل کا یہ کام تھا، تو پھر اختلاف کا کیا کام؟ کیونکہ جب آنکھ کا کام دیکھنا ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ زید کی آنکھ تو سفید چیز کو دیکھے اور بکر کی ویسی ہی آنکھ اُسی سفید چیز کا ذائقہ بتلاتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نری عقل رُوح کا وجود بھی یقینی طور پر نہیں بتلا سکتی، چہ جائیکہ اس کی کیفیت اور تعلقات کا علم پیدا کر سکے۔ فلاسفر تو رُوح کو ایک سبز لکڑی کی طرح مانتے ہیں اور رُوح فی الخارج ان کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ تفاسیر رُوح کے وجود اور اس کے تعلق وغیرہ کی چشمۂ نبوت سے ملی ہیں اور نرے عقل والے تو دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔ اگر کہو کہ بعض فلاسفروں نے کچھ لکھا ہے تو

یاد رکھو کہ اُنھوں نے منقولی طور پر چشمۂ نبوّت سے کچھ لے کر کہا ہے۔ پس جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ رُوح کے متعلق علوم چشمۂ نبوّت سے ملتے ہیں تو یہ امر کہ ارواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، اُسی چشم سے دیکھنا چاہیے اور کشفی آنکھ نے بتلایا ہے کہ اس تودۂ خاک سے رُوح کا ایک تعلق ہوتا ہے اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ کہنے سے جواب ملتا ہے۔ پس جو آدمی ان قویٰ سے کام لے جن سے کشفِ قبور ہو سکتا ہے، وہ اُن تعلقات کو دیکھ سکتا ہے۔

ہم ایک بات مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ایک نمک کی ڈلی اور مصری کی ڈلی رکھی ہو۔ اب عقل محض ان پر کیا فتویٰ دے سکے گی۔ ہاں اگر اُن کو چکھیں گے، تو جُداگانہ مزوں سے معلوم ہو جاوے گا کہ یہ نمک ہے اور وہ مصری ہے، لیکن اگر حسِ لسان ہی نہیں تو نمکین اور شیریں کا فیصلہ کوئی کیا کرے گا؟ پس ہمارا کام صرف دلائل سے سمجھا دینا ہے۔ آفتاب کے چڑھنے میں جیسے ایک اندھے کے انکار سے فرق نہیں آسکتا اور ایک مسلوب القوۃ کے طریقِ استدلال سے فائدہ نہ اٹھانے سے اس کا ابطال نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پر اگر کوئی شخص کشفی آنکھ نہیں رکھتا، تو وہ اُس تعلقِ ارواح کو کیونکر دیکھ سکتا ہے؟ پس محض اس لیے کہ وُہ دیکھ نہیں سکتا، اس کا انکار جائز نہیں ہے۔ ایسی باتوں کا پتہ نری عقل اور قیاس سے کچھ نہیں لگتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے انسان کو مختلف قویٰ دیئے ہیں۔ اگر ایک ہی سب کام دیتا تو پھر اس قدر قویٰ کے عطا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بعض کا تعلق آنکھ سے ہے اور بعض کا کان سے۔ بعض زبان سے متعلق ہیں اور بعض ناک سے۔ مختلف قسم کی حِسّیں انسان رکھتا ہے۔ قبور کے ساتھ تعلقِ ارواح دیکھنے کے لیے کشفی قوّت اور حِس کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے، تو وہ غلط کہتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ایک کثیر تعداد کروڑ ہا اولیاء وصُلحا کا سلسلہ دُنیا میں گذرا ہے اور مجاہدات کرنے والے بیشمار لوگ ہو گذرے ہیں اور وہ سب اس اَمر کی زندہ شہادت ہیں۔ گو اُس کی اصلیت اور تعلقات کی وجہ عقلی طور پر ہم معلوم کر سکیں یا نہ، مگر نفسِ تعلق سے انکار نہیں ہو سکتا۔ غرض کشفی دلائل ان ساری باتوں کا فیصلہ کیے دیتے ہیں۔ کان اگر نہ دیکھ سکیں تو ان کا کیا قصور؟ وہ اور قوّت کا کام ہے۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں کہ رُوح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میّت سے کلام کر سکتا ہے رُوح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے، جہاں اس کے لیے ایک مقام ملتا ہے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک ثابت شدہ صداقت ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس کی گواہی موجود ہے۔ یہ مسئلہ عام طور پر مسلّمہ مسئلہ ہے۔ بجز اس فرقہ کے جو نفیٔ بقائے رُوح کرتا ہے اور یہ امر کہ کس جگہ تعلق ہے کشفی قوّت خود ہی بتلادے گی۔ جیالوجسٹ (عالمِ علم طبقات الارض) بتلا دیتے ہیں کہ یہاں فلاں دھات ہے اور وہاں فلاں کان ہے۔ دیکھو ان میں یہ ایک قوت ہوتی ہے جو فی الفور بتلادیتی ہے۔ پس یہ بات ایک سچی بات ہے کہ ارواح کا تعلق قبوُر سے ضرور ہوتا ہے۔ یہانتک کہ اہلِ کشف توجہ سے میّت کے ساتھ کلام بھی کر سکتے ہیں اور اوہام اور اعتراضوں کا سلسلہ تو ایسا لمبا ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔[۱]

---

[۱] الحکم جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۱-۲ پرچہ ۲۳ ؍جنوری ۱۸۹۹ء

دُعا کی برکات

"اگر دُعا نہ ہوتی، تو کوئی انسان خداشناسی کے بارے میں حق الیقین تک نہ پہنچ سکتا۔ دُعا سے الہام ملتا ہے۔ دُعا سے ہم خدا تعالیٰ سے کلام کرتے ہیں۔ جب انسان اخلاص اور توحید اور محبت اور صدق اور صفا کے قدم سے دُعا کرتا کرتا فنا کی حالت تک پہنچ جاتا ہے۔ تب وُہ زندہ خدا اس پر ظاہر ہوتا ہے، جو لوگوں سے پوشیدہ ہے۔"

مُبارک وہ جو سمجھے

"خدا سے صُلح کرو۔ سچی پرہیزگاری سے کام لو۔ آسمان اپنے غیر معمولی حوادث سے ڈرا رہا ہے۔ زمین بیماریوں سے انذار کر رہی ہے مُبارک وُہ جو سمجھے[1] (حضرت مسیح موعودؑ)

۲۶ر جنوری ۱۸۹۹ء

ایڈیٹر صاحب اخبار الحکم لکھتے ہیں۔ جب لیّل (دھاریوال کے پاس ایک گاؤں ہے) جہاں حضرت اقدسؑ نے بغرض پیروی مقدمہ ضمانت برائے حفظ امن منجانب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی، دھاریوال تشریف لے جاتے ہوئے قیام فرمایا تھا۔ (مُرتّب) سے روانہ ہو کر کھنڈہ (جہاں حضرت اقدسؑ تشریف فرماتے تھے۔ (مُرتّب) آ پہنچے۔ تو حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ:

"اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ چونکہ سُنا گیا ہے کہ محمد حسین بھی وہیں اُترنے والا تھا۔ اس لیے اچھا ہوا کہ ہم وہاں نہیں ٹھہرے۔ ایسے لوگوں سے دُور ہی رہنا اچھا ہے۔"

(نوٹ از مُرتّب) تبدیلِ فرودگاہ کا باعث یہ ہوا کہ حضرت اقدسؑ بسواری پالکی روانہ ہوئے تھے اور حضرت مولانا نورالدین صاحبؓ اور چند اور دوست بٹالہ کے راستہ سے گاڑی پر سوار ہوئے تھے اور یہ امر مقرر شدہ تھا کہ مقامِ نزول لیّل ہی ہوگا، مگر حضرتِ اقدسؑ کو راستہ میں رانی ایشرکور (سکنہ دھام۔ سردار جیمل سنگھ کی بیوہ بہو) کا خاص آدمی پیغام لے کر ملا کہ آپؑ میرے ہاں قیام فرمادیں؛ چنانچہ حضرتِ اقدسؑ نے اس کا پیغام منظور فرما لیا اور وہیں قیام فرما ہوئے، مگر گاڑی والے دوستوں کو اطلاع نہ ہوئی، اس لیے وہ لیّل ہی پہنچے۔ بعد میں حضرتِ اقدسؑ کے بُلوانے پر سب وہیں اکٹھے ہوگئے۔)

غیر مسلم کی دعوت اور نذر

تھوڑی دیر کے بعد رانی ایشرکور نے اپنے اہلکاروں کے ہاتھ ایک تھال مصری کا اور ایک بادامول کا بطور نذر پیش کیا اور کہلا بھیجا، بڑی مہربانی فرمائی۔ میرے واسطے آپؑ کا تشریف لانا ایسا ہے، جیسے سردار جیمل سنگھ آنجہانی کا آنا۔ حضرتِ اقدسؑ نے نہایت سادگی اور اُس لہجہ میں

[1] (الحکم جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۲ پرچہ ۲۳ر جنوری ۱۸۹۹ء)

جوان لوگوں میں خداداد ہوتا ہے، فرمایا کہ "اچھا آپ نے چونکہ دعوت کی ہے ہم یہ نذر بھی لے لیتے ہیں"

استقلال

کھانا کھا چکنے کے بعد ایک سفید ریش شخص کی بابت عرض کیا گیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ حضرتِ اقدسؑ نے نہایت فراخدلی سے فرمایا "ہاں" چنانچہ وہ شخص پیش ہوا اور اس نے اپنی درخواست منظوم پیش کی۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ "استقلال سے اگر طبیب کا علاج کیا جاوے وہ بہت مہربان ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ فائدہ بھی دیتا ہے۔"

سفر میں روزہ

آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ سفر کے لیے روزہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟ آپؑ نے فرمایا کہ:

"قرآن کریم سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (سورہ بقرہ: ۱۸۵) یعنی مریض اور مُسافر روزہ نہ رکھے۔ اس میں امر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ جس کا اختیار ہو رکھ لے جس کا اختیار ہو نہ رکھے۔ میرے خیال میں مسافر کو روزہ نہیں رکھنا چاہیے اور چونکہ عام طور پر اکثر لوگ رکھ لیتے ہیں، اس لیے اگر کوئی تعامل سمجھ کر رکھ لے، تو کوئی ہرج نہیں، مگر عِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کا پھر بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔"

اس پر مولانا نورالدین صاحبؓ نے فرمایا کہ "یُوں بھی تو انسان کو مہینے میں کچھ روزے رکھنے چاہئیں"

ہم اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ایک موقعہ پر حضرت اقدسؑ نے بھی فرمایا "سفر میں تکالیف اُٹھا کر جو انسان روزہ رکھتا ہے تو گویا اپنے زورِ بازو سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہتا ہے۔ اس کو اطاعتِ امر سے خوش نہیں کرنا چاہتا۔ یہ غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ امر اور نہی میں سچا ایمان ہے۔"

۲۷ر جنوری ۱۸۹۹ء

بعد نمازِ صبح روانگی کا حکم ہوا۔ جب کارخانہ (دھاریوال) کے قریب سے گذرے، تو اس کے متعلق ذکر میں فرمایا:

"اس کو کسی وقت دیکھنا چاہیے۔ دیکھی ہوئی چیز کچھ کام ہی دیتی ہے"

ایک شخص نے کہا کہ حضرت میں نے ایک بار دیکھا، تو مجھے خدا تعالیٰ کی قدرت پر عجب جوش آیا اور جب تک میں نے چار رکعت نماز نہ پڑھ لی صبر نہ آیا۔ حضرت نے فرمایا:

"اصل بات یہ ہے کہ یہ ساری باتیں اس لیے ہیں کہ وہ اپنا جلوہ دکھا رہا ہے، دیکھو کیڑے تک کو کس قدر طاقتیں دی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تو ساری طاقتیں اور قوتیں ہیں"

حضورؑ کے لیے خیمہ چونکہ نہر پر لگایا گیا تھا۔ نہر کو دیکھ کر اور اس کے اردگرد درختوں کے نظّارہ کو دیکھ کر فرمایا "بہت اچھی جگہ ہے"

(الحکم جلد ۳ نمبر ۴۔ پرچہ ۳۱ر جنوری ۱۸۹۹ء)

۲۶ر فروری ۱۸۹۹ء

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کے ایک لیکچر کی تعریف

حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹیؓ کے لیکچر (موسومہ حضرت اقدسؑ مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا اصلاح اور تجدید کی) کو حضرتِ اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے پڑھا اور ۲۶ر فروری ۱۸۹۹ء کو مسجد مُبارک میں احباب سے فرمایا کہ :

"مَیں چاہتا ہوں کہ ہمارے سب دوست اسے ضرور پڑھیں۔ اس لیے کہ اس میں بہت سے نکاتِ لطیفہ ہیں اور یہ نمونہ ہے ایک شخص کی قوتِ تقریر کا اور اسی منوال پر مخصوصاً ہماری جماعت کو مُقرر بننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

۱۰ر مارچ ۱۸۹۹ء

بلند ہمّتی اور شجاعت

صُبح سیر کو جاتے ہوئے حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا :

"ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ہمت اخلاقِ فاضلہ میں سے ہے اور مومن بڑا بلند ہمت ہوتا ہے اور اُسے ہر وقت خدا تعالیٰ کے دین کی نصرت اور تائید کے لیے تیار رہنا چاہیے اور کبھی بُزدلی ظاہر نہ کرنی چاہیے۔ بزدلی منافق کا نشان ہے۔ مومن دلیر اور شجاع ہوتا ہے، مگر شجاعت سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس میں موقع شناسی نہ ہو۔ موقع شناسی کے بغیر جو فعل کیا جاتا ہے۔ وہ تہوّر ہوتا ہے۔ مومن میں شتاب کاری نہیں ہوتی، بلکہ وہ نہایت ہوشیاری اور تحمّل کے ساتھ نصرتِ دین کے لیے تیار رہتا ہے اور بُزدل نہیں ہوتا۔ انسان سے کبھی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیتا ہے اور کبھی خوش کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر کسی سائل کو دھکا دیا تو وہ سختی کا موجب ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا فعل ہوتا ہے، اس لیے اُسے توفیق نہ ملے گی کہ وہ اُسے کچھ دے سکے، لیکن اگر اس سے نرمی اور اخلاق سے پیش آئے گا، تو خواہ اسے پانی کا پیالہ ہی دیدے، تو وُہ بھی ازالۂ قبض کا موجب ہو جائے گا۔

استغفار۔ قبض کا علاج

انسان پر قبض اور بسط کی حالت آتی رہتی ہے۔ بسط کی حالت میں ذوق اور شوق بڑھ جاتا ہے اور قلب میں ایک انشراح پیدا ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ بڑھ جاتی ہے۔ نمازوں میں لذت اور سرُور پیدا ہوتا ہے، لیکن بعض وقت ایسی حالت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وُہ ذوق اور شوق جاتا رہتا ہے اور دل میں ایک تنگی کی حالت ہو جاتی ہے۔ جب ایسی حالت ہو جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ کثرت کے ساتھ استغفار کرے اور پھر درود شریف بہت پڑھے۔ نماز بھی بار بار پڑھے قبض کے دور ہونے

ؔ الحکم جلد نمبر ۱۰ نمبر ۳۵ صفحہ

کا یہی علاج ہے۔

حقیقی علم علم سے مُراد منطق یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ حقیقی علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۹) اگر علم سے اللہ تعالیٰ کی خشیت میں ترقی نہیں ہوئی، تو یاد رکھو کہ وہ علم ترقیِ معرفت کا ذریعہ نہیں ہے[1]

۲۰ / اپریل ۱۸۹۹ء بوقت عصر

خدا کا بھروسہ

"اسلام کا خاصہ ہے کہ خدا پر بھروسہ ہوتا ہے۔ مسلمان وہی ہے جو صدقات اور دُعا کا قائل ہو۔ عیسائیوں کو اس بات پر یقین نہیں۔ کیوں؟ انہوں نے جسمانی خدا بنایا ہے۔

انسان کی بڑی خوشی جو زوال پذیر نہیں ہوتی، اور خطرات کے وقت اُسے سنبھال لیتی ہے۔ وہ خدا پر بھروسہ ہے اور یہ صرف اسلام ہی کی تعلیم ہے کہ خدا پر بھروسہ کرو[2]"

۲۱ / اپریل ۱۸۹۹ء یومِ عید اضحیٰ۔

والدہ کی خدمت

"پہلی حالت انسان کی نیک بختی کی ہے کہ والدہ کی عزّت کرے۔ اُویس قرنیؓ کے لیے بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمن کی طرف کو مُنہ کرکے کہا کرتے تھے کہ مجھے یمن کی طرف سے خدا کی خوشبو آتی ہے۔ آپؐ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنی والدہ کی فرمانبرداری میں بہت مصروف رہتا ہے اور اسی وجہ سے میرے پاس بھی نہیں آسکتا۔ بظاہر یہ بات ایسی ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، مگر وُہ ان کی زیارت نہیں کر سکتے۔ صرف اپنی والدہ کی خدمت گذاری اور فرمانبرداری میں پوری مصروفیت کی وجہ سے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوؔ ہی آدمیوں کو السلام علیکم کی خصُوصیت سے وصیت فرمائی۔ یا اُویسؓ کو یا مسیحؑ کو۔ یہ ایک عجیب بات ہے، جو دُوسرے لوگوں کو ایک خصوصیت

---

[1] الحکم جلد ۷ صفحہ ۲۱

[2] الحکم جلد ۳ نمبر ۱۵ صفحہ ۹

کے ساتھ نہیں ملی، چنانچہ لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اُن سے ملنے کو گئے، تو اُویس نے فرمایا کہ والدہ کی خدمت میں مصروف رہتا ہوں اور میرے اونٹوں کو فرشتے چرایا کرتے ہیں۔ ایک تو یہ لوگ ہیں جنھوں نے والدہ کی خدمت میں اس قدر سعی کی اور پھر یہ قبولیت اور عزت پائی۔ ایک وُہ ہیں جو پیسہ پیسہ کے لیے مقدمات کرتے ہیں اور والدہ کا نام ایسی بُری طرح لیتے ہیں کہ رذیل قومیں چُوہڑے چمار بھی کم لیتے ہوں گے۔ ہماری تعلیم کیا ہے؟ صرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ہدایت کا بتلا دینا ہے۔ اگر کوئی میرے ساتھ تعلق ظاہر کرکے اس کو ماننا نہیں چاہتا، تو وہ ہماری جماعت میں کیوں داخل ہوتا ہے؟ ایسے نمونے سے دُوسروں کو ٹھوکر لگتی ہے اور وُہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسے لوگ ہیں جو ماں باپ تک کی بھی عزت نہیں کرتے۔

مادر پدر آزاد کبھی خیر و برکت کا مُنہ نہ دیکھیں گے

مَیں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مادر پدر آزاد کبھی خیر و برکت کا مُنہ نہ دیکھیں گے۔ پس نیک نیتی کے ساتھ اور پوری اطاعت اور وفاداری کے رنگ میں خدا رسُول کے فرمودہ پر عمل کرنے کو تیار ہو جاؤ۔ بہتری اسی میں ہے، ورنہ اختیار ہے۔ ہمارا کام صرف نصیحت کرنا ہے۔

عربی اور انگریزی سیکھنے کی تلقین

مَیں یہ بھی اپنی جماعت کو نصیحت کرنی چاہتا ہوں کہ وُہ عربی سیکھیں کیونکہ عربی کی تعلیم کے بدُوں قرآن کریم کا مزا نہیں آتا۔ پس ترجمہ پڑھنے کے لیے ضروری اور مناسب ہے کہ تھوڑا تھوڑا عربی زبان کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ آج کل تو آسان آسان طریق عربی پڑھنے کے نکل آئے ہیں۔ قرآن شریف کا پڑھنا جبکہ ہر مُسلمان کا فرض ہے تو کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش نہ کی جاوے اور ساری عمر انگریزی اور دُوسری زبانوں کے حاصل کرنے میں کھودی جاوے۔ ہاں یہ بات بھی یاد رکھو کہ چونکہ استحکام گورنمنٹ نے ایک قومی گورنمنٹ کی صورت اختیار کرلی ہے اس لیے قومی گورنمنٹ کی زبان بھی ایک قومیت کا رنگ رکھتی ہے پس ضروری ہے کہ اپنے مطالب و اغراض کو حکام پر پورے طور سے ذہن نشین کرنے کے لیے انگریزی پڑھو، تاکہ تم گورنمنٹ کو فائدہ اور مدد پہنچا سکو۔"

فونوگراف

پھر زبانوں کے تذکرے پر فرمایا: "فونوگراف کیا ہے؟ گویا مُطلع ناطق ہے۔"

تکلیف کی دو حیثیتیں

کوئی تکلیف نہیں پہنچتی جبتک آسمان پر فتویٰ نہ ہو، اگرچہ تکالیف تو پیغمبروں کو بھی پہنچتی ہیں، مگر وہ از راہ محبت ہوتی ہیں اور اُن میں ایک قسم کی تعلیم مخفی ہوتی ہے، جو ان مشکلات میں انبیاء علیہم السلام کا پاک گروہ اپنے طرزِ عمل اور چال چلن سے دیتا ہے اور بعض لوگوں پر دُکھ کی مار ہوتی ہے اور وُہ اُن کی اپنی ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال: ۹) پس آدمی کو لازم ہے

کر توبہ و استغفار میں لگا ہے اور دیکھتا ہے کہ ایسا نہ ہو، بداعمالیاں حد سے گذر جاویں اور خدا تعالیٰ کے غضب کو کھینچ لاویں۔

توبہ و استغفار جب خدا تعالیٰ کسی پر فضل کے ساتھ نگاہ کرتا ہے، تو عام طور پر دلوں میں اُس کی محبت کا القا کر دیتا ہے، لیکن جس وقت انسان کا شر حد سے گذر جاتا ہے، اُس وقت آسمان پر اُس کی مخالفت کا ارادہ ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے موافق لوگوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں، مگر جُونہی وہ توبہ و استغفا کے ساتھ خدا کے آستانہ پر گر کر پناہ لیتا ہے، تو اندر ہی اندر ایک رحم پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں لگتا کہ اس کی محبت کا بیج لوگوں کے دلوں میں بو دیا جاتا ہے۔ غرض توبہ و استغفار ایسا مجرب نسخہ ہے کہ خطا نہیں جاتا۔[1]

۱۲ / اپریل ۱۸۹۹ء قبل مغرب

مسیح موعود کا کارنامہ کسرِ صلیب یہ کتاب[2] جو لکھی گئی ہے، جب شائع ہوگی، تو اُن لوگوں کو بھی پتہ لگ جاوے گا جو بار بار اعتراض کرتے ہیں کہ آکر کیا بنایا؟ مَیں حیران ہو جاتا ہوں جب اس قسم کے اعتراض سُنتا ہوں۔ کیا پھونک مار کر کچھ بنا دیا جاتا؟ مگر یہ لوگ دیکھیں گے اور خدا تعالیٰ نمایاں طور پر دکھا دے گا کہ کیا بنایا ہے۔ کاش یہ لوگ موجودہ حالتِ وقت پر غور کرتے۔ صدی میں سے سولہ[16] سال گذر گئے۔ ظلمت انتہا تک پہنچ گئی اور کوئی نہ آیا۔ جو اصلاح کرتا۔ یہ لوگ ذرا بھی انصاف نہیں کرتے۔ مجھ پر اعتراض کرتے کرتے خدا پر اعتراض جا کرتے ہیں۔ کیونکہ مَیں نے تو آکر کچھ بنایا نہیں اور خدا نے بنانے والا بھیجا نہیں، بلکہ باوجود اس کے کہ اور ضرورتیں اگر چھوڑ بھی دی جاویں تو ان ناعاقبت اندیش معترضوں کے موافق ایک گمراہ کرنے والا بھی آ گیا اور پھر بھی وہ اصل مہدی نہ آیا اور نہ خدا نے اُسے بھیجا۔ چودھویں صدی کو مبارک سمجھتے تھے پر کیا خاک مُبارک نکلی، جبکہ ایک دجال آگیا!!! صدیق حسن اور عبدالحی جو دعویٰ کرنے والے تھے وُہ صدی کے سر پر ہی فوت ہو گئے، ورنہ شاید وُہی ان لوگوں کا سہارا ہوتے، لیکن خدا نے اپنے فضل سے دکھا دیا کہ یہ کام اُن کا نہ تھا بلکہ کسی اور کا۔

مجدد جو آیا کرتا ہے، وُہ ضرورتِ وقت کے لحاظ سے آیا کرتا ہے نہ استنجے اور وُضو کے مسائل بتلانے۔ خدا جو مدبر اور حکیم خدا ہے، کیا وہ نہیں دیکھتا کہ دُنیا پر طبعیات اور فلسفہ کی زہریلی ہوا چلی ہے جس نے ہزار ہا انسانوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ صلیب پرست عیسائیوں نے کس کس رنگ میں لکھوکھہا رُوحوں کو خدا سے دُور پھینک دیا ہے۔

---

[1] (اَلحکم جلد ۳ نمبر ۱۸ صفحہ ۷ پرچہ ۱۲ / مئی ۱۸۹۹ء)

[2] "مسیح ہندوستان میں" (مُرتّب)

تو پھر کیا اس وقت ایسے مجدد کی ضرورت نہ تھی جو کسرِ صلیب کرے اور دلائل و بیّنات سے دکھا دے کہ صلیبی مذہب میں حقانیت کا نور نہیں۔ اور ایک لکڑی پر ایمان لا کر انسان نجات کا وارث نہیں ٹھہر سکتا۔ آئے دن پچاس ہزار اور ایک ایک لاکھ اشتہار چھاپ چھاپ کر یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں اور ٹڈی دل کی طرح عورتیں بچے جوان بوڑھے لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اسلام پر حملہ کریں۔ اس وقت اسلام پر وہ حملہ ہوا ہے جس کی انتہا نہیں۔ ادھر خدا کا یہ وعدہ کہ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) اور ادھر ان ناعاقبت اندیش معترضین کی یہ دانائی کہ اسلام میں حفاظتِ دین کے لیے معرفت کا نور لے کر کوئی نہیں آیا، بلکہ دجّال آیا ہے۔ افسوس! صد افسوس!! آہ! صد آہ!

یہی تو وقت تھا کہ خدا اپنی نصرت اور تائید کا روشن ہاتھ دکھاتا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس نے دکھایا اور وہ اپنی چمکار دکھائے گا اور مخالفوں کو شرمندہ کر کے بتلا دیگا، کہ آنے والے نے آکر کیا بنایا؟[1]"

۲۱/ اپریل ۱۸۹۹ء

ستّاری

خدا کی ستاری ایسی ہے کہ وہ انسان کے گناہ اور خطاؤں کو دیکھتا ہے، لیکن اپنی اس صفت کے باعث اس کی غلط کاریوں کو اُس وقت تک جب تک کہ وہ اعتدال کی حد سے نہ گذر جاوے ڈھانپتا ہے، لیکن انسان کسی دُوسرے کی غلطی دیکھتا بھی نہیں اور شور مچاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کم حوصلہ ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات حلیم و کریم ہے ظالم انسان اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی خدا تعالیٰ کے حِلم پر پوری اطلاع نہ رکھنے کے باعث بیباک ہو جاتا ہے اس وقت ذوانتقام کی صِفت کام کرتی ہے اور پھر اُسے پکڑ لیتی ہے۔ ہندو لوگ کہا کرتے ہیں کہ پرمیشر اور اَنت میں دیر ہے۔ یعنی خدا حد سے بڑھی ہوئی بات کو عزیز نہیں رکھتا۔ باایں ہمہ بھی وہ ایسا رحیم کریم ہے کہ ایسی حالت میں بھی اگر انسان نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ آستانۂ الٰہی پر جا گرے، تو وہ رحم کے ساتھ اُس پر نظر کرتا ہے۔ غرض یہ ہے۔ کہ جیسے اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں پر معاً نظر نہیں کرتا اور اپنی ستاری کے طفیل رُسوا نہیں کرتا، تو ہم کو بھی چاہیے کہ ہر ایسی بات پر جو کسی دُوسرے کی رسوائی یا ذلّت پر مبنی ہو۔ فی الفور مُنہ نہ کھولیں۔

غفلت کا علاج استغفار ہے

بعض لوگوں کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ اُن کو ایسے اسباب پیش آجاتے ہیں مثلاً ملازمت یا کوئی اور وجہ کہ ان کی عُمر کا ایک بڑا حصّہ ظلمانی حالت میں گذرتا ہے۔ نہ پابندیٔ نماز کی طرف توجہ کرتے ہیں، نہ قَالَ اللّٰہُ اور قَالَ الرَّسُوْلُ سُننے

---

[1] (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۸ صفحہ ۷ پرچہ ۱۹/ مئی ۱۸۹۹ء)

کا موقع ملتا ہے۔ کتاب اللہ پر غور کرنے کا اُن کو خیال تک بھی نہیں آتا۔ ایسی صورت میں جب ایک زمانہ ظلمت کا گذر جاوے تو یہ خیالات راسخ ہو کر طبیعتِ ثانیہ کا رنگ پکڑ جاتے ہیں۔ پس اس وقت اگر انسان توبہ اور استغفار کی طرف توجہ نہ کرے تو سمجھو کہ بڑا ہی بدقسمت ہے۔ غفلت اور سُستی کا بہترین علاج استغفار ہے۔ سابقہ غفلتوں اور سُستیوں کی وجہ سے کوئی ابتلا بھی آجاوے تو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر سجدے اور دُعائیں کرے اور خدائے تعالیٰ کے حضور ایک سچی اور پاک تبدیلی کا وعدہ کرے۔

۲۲؍اپریل ۱۸۹۹ء

افترا کرنیوالا کبھی مُہلت نہیں پا سکتا

ہمارے دعوئے الہام و مکالمۃ الٰہیہ کی اشاعت کو یُوں تو بہت سال گذرے لیکن اگر براہین کی اشاعت سے بھی لیا جائے تو بیس سال ہو چکے۔ ہمارے مخالف جو ہم کو جھوٹا اور اپنے دعوے میں مُفتری قرار دیتے ہیں۔ اُن سے کوئی سوال کرے کہ خدا تعالیٰ تو کسی ایسے مفتری کو جو اُس پر الہام اور مکالمہ کا افترا کرے مُہلت نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی فرمایا۔ کہ اگر تُو بعض باتیں اپنی طرف سے کہتا، تو ہم شاہ رگ سے پکڑ لیتے۔ پھر کسی اور کی کیا خصُوصیت ہو سکتی ہے؟ اس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر الہام کا افترا کرنے والا کبھی بھی مُہلت نہیں پا سکتا۔ اب ہم پُوچھتے ہیں کہ اگر یہ ہمارا سلسلہ خدا تعالیٰ کا قائم کردہ نہیں ہے۔ تو کسی قوم کی تاریخ سے ہم کو پتہ دو کہ خدائے تعالیٰ پر کسی نے افترا کیا ہو اور پھر اُسے مُہلت دی گئی ہو۔ ہمارے لیے تو یہ معیار صاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا زمانہ ۲۳ سال تک کا ایک دراز زمانہ ہے۔ اُس صادق اور کامل نبی کے زمانہ سے قریباً ملتا ہوا زمانہ اللہ تعالیٰ نے ابتک ہم کو دیا۔ کیونکہ براہین کی اشاعت پر بیس سال ہوئے جو نا عاقبت اندیش معترضوں کے نزدیک افترا کا پہلا زمانہ ہے۔ اُبتک تو ہم ایک مُسلم و صادق بلکہ جُملہ صادقوں کے سرتاج صادقؐ کے زمانہ سے ملتا ہوا زمانہ پیش کرتے ہیں اور یہ ظالم کہے جاتے ہیں کہ جھُوٹ ہے۔ افسوس ہماری تکذیب کے خیال میں یہ لوگ یہاں تک اندھے ہو گئے ہیں کہ اُن کو یہ بھی نظر نہیں آتا کہ اس انکار کی زد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسی پڑتی ہے، کیونکہ اگر بیس بائیس سال تک بھی خدا کسی مُفتری کو مدد دے سکتا ہے تو پھر مجھے تو تعجب ہی آتا ہے۔ نہیں، بلکہ دل کانپ اُٹھتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت پر یہ کیا دلیل پیش کریں گے؟ ایک مسلمان، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سچے مُتبع کے مُنہ سے جب وہ اتنا دراز عرصہ تک مدّعی کو مُہلت پاتے ہوئے دیکھ لے کبھی یہ نہیں نکل سکتا کہ جھوٹا اور کاذب بھی اس قدر عرصۂ دراز کی مُہلت پا لیتا ہے۔ اگر اور کوئی بھی نشان اور دلیل ایسے مدّعی کی صداقت کی نہ ملے۔ تب بھی ایک سچے مُسلمان کو حُسنِ ظن اور ایمانداری کے رُو سے لازم آتا ہے کہ انکار نہ کرے، کیونکہ اس کا زمانہ رسُول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مشابہ ہوگیا ہے۔
اگر کوئی عیسائی کہے کہ مفتری کو مہلت مل سکتی ہے، تو اس امر کا ثبوت دے، مگر مسلمان تو ایسا کہہ ہی نہیں سکتا۔ پس اب ہمارے مخالف بتلائیں کہ کیا ایک کاذب دجّال، مفتری علی اللہ طرزِ استدلالِ نبوّت میں شریک ہو سکتا ہے؟ ماننا پڑے گا کہ ہرگز نہیں۔ پھر وہ ہمارے دعوے کو سوچیں اور اس زمانہ پر غور کریں جو استدلالِ نبوت کا زمانہ ہے۔ غرض ہر پہلو میں بہت سی باتیں ہیں جو سوچنے والے کو مل سکتی ہیں اور ایک دُور اندیش اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔[1]

۲۲ر جون ۱۸۹۹ء

حضرت اقدسؑ نے کل باتوں باتوں میں فرمایا کہ
"یقیناً یاد رکھو کہ خدا اپنے بندے کو کبھی ضائع نہیں کریگا اور ہرگز نہیں اُٹھائے گا، جبتک اُس کے ہاتھ سے وُہ باتیں پوری نہ ہو جائیں۔ جن کے لیے وہ آیا ہے۔ اسے کسی کی خصومت اور کسی کی بدُعا کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔"
اس کی تحریک یُوں ہوئی کہ کسی نے کہا کہ اب مخالف مُلہم[2] صاحب کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی تباہی اب قریب ہے۔
کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا (الکھف : ۶) پھر بڑے درد دل سے فرمایا کہ:

تقویٰ و طہارت

"کل (یعنی ۲۲ر جون ۱۸۹۹ء) بہت دفعہ خدا کی طرف سے الہام ہوا کہ تم لوگ متقی بن جاؤ اور تقویٰ کی باریک راہوں پر چلو تو خدا تمہارے ساتھ ہوگا۔"

فرمایا: "اس سے میرے دل میں بڑا درد پیدا ہوتا ہے کہ مَیں کیا کروں کہ ہماری جماعت سچا تقویٰ و طہارت اختیار کرے۔" پھر فرمایا کہ "مَیں اتنی دُعا کرتا ہوں کہ دُعا کرتے کرتے ضعف کا غلبہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات غشی اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔" فرمایا "جبتک کوئی جماعت خدا تعالیٰ کی نگاہ میں متقی نہ بن جائے۔ خدا تعالیٰ کی نصرت اس کے شاملِ حال نہیں ہوسکتی۔" فرمایا "تقویٰ خلاصہ ہے تمام صُحفِ مقدسہ اور توریت و انجیل کی تعلیمات کا۔ قرآنِ کریم نے ایک ہی لفظ میں خدا تعالیٰ کی عظیم الشان مرضی اور پُوری رضا کا اظہار کر دیا ہے۔" فرمایا "مَیں اس فکر میں بھی ہوں کہ اپنی جماعت میں سے سچے متقیوں، دین کو دُنیا پر مقدم کرنے والوں اور منقطعین الی اللہ کو الگ کروں اور بعض دینی کام انہیں سپرد کروں اور پھر میں دُنیا کے ہم و غم میں مبتلا رہنے والوں اور رات دن مُردار دُنیا ہی کی طلب میں جان کھپانے والوں کی کچھ پروا نہ کروں گا۔"

---

[1] الحکم جلد ۳ نمبر ۲۱ پرچہ ۱۶ر جون ۱۸۹۹ء
[2] منشی الٰہی بخش اکونٹنٹ مصنف عصائے موسیٰ ۔ (مُرتّب)

رات کس درد سے حضرت امامؑ فرماتے ہیں۔ آہ! اب تو خدا کے سوا کوئی بھی ہمارا نہیں۔ اپنے پرائے سب ہی اس پر تُلے ہوئے ہیں کہ ہمیں ذلیل کر دیں۔ رات دن ہماری نسبت مصائب اور گردشوں کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اب اگر خدا تعالےٰ ہماری مدد نہ کرے، تو ہمارا ٹھکانہ کہاں؟[1]

۲۵؍ جون ۱۸۹۹ء

صاحبزادہ مرزا مبارک احمد کا عقیقہ

صاحبزادہ مبارک احمد صاحب کے عقیقہ کے لیے ۲۵ جون اتوار کا دن مقرر تھا۔ حضرت اقدسؑ نے اس کام کا اہتمام منشی نبی بخش صاحب کے سپرد کیا تھا، مگر اس دن صبح صادق سے پہلے بارش شروع ہو گئی۔ صبح کی نماز معمول سے سویرے پڑھی گئی اور دوست تاریکی اور ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے سو گئے۔ جب دن چڑھے حضرت اقدسؑ بیدار ہوتے تو دریافت کیا کہ عقیقہ کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ گاؤں کے لوگوں کو دعوت کی گئی تھی اور باہر سے بھی کچھ احباب تشریف لائے تھے۔ حضرتؑ کو فکر ہوئی کہ مہمانوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ ادھر مہتمم منشی صاحب بڑے مضطرب اور نادم تھے کہ حضور پاک میں کیا عذر کروں۔ منشی صاحب حاضر ہوئے اور معذرت کی۔ خیر کریم انسان اور رحیم ہادی کی ذات میں دُرشتی اور سخت نکتہ چینی تو تھی ہی نہیں۔ فرمایا: "اچھا فُعِلَ مَا قُدِّر" تاہم مہتمم صاحب بار بار معذرت کے لیے حضرت اقدسؑ کی خدمت میں دوڑے جاتے۔ اُن کے اِس حال کو دیکھ کر حضرتِ اقدسؑ کو اپنی ایک رؤیا یاد آ گئی جو چودہ سال ہوئے دیکھی تھی جس کا مضمون یہ ہے کہ "ایک چوتھا بیٹا ہوگا اور اس کا عقیقہ سوموار کو ہوگا۔"

خدا تعالیٰ کی بات کے پُورا ہونے اور اللہ تعالیٰ کے اس عجیب تصرّف سے حضرت اقدسؑ کو بڑی خوشی ہوئی۔ دُوسرے دن سوموار کو جب سب خدّام صحنِ اندرونِ خانہ میں بیٹھے تھے اور صاحبزادہ مبارک احمد صاحب کا سَر مونڈا جا رہا تھا۔ حضرتِ اقدسؑ نے بڑے جوش اور خوشی سے یہ رؤیا سُنائی۔[2]

۳۰؍ جون ۱۸۹۹ء

رات کو امراضِ وبائیہ کا تذکرہ ہوا۔ فرمایا:

"یہ ایّام برسات کے معمولاً خطرناک ہوا کرتے ہیں۔ ہند کے طبیب کہتے ہیں کہ ان تین مہینوں میں جو بچ رہے، وہ گویا

---

1. خط مولوی عبدالکریم صاحب مورخہ ۲۳ جون ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ صفحہ ۸
2. از خط حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحبؓ سیالکوٹی مندرجہ الحکم جلد ۳ نمبر ۲۳ صفحہ ۶ پرچہ ۳۰ جون ۱۸۹۹ء

نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے۔" پھر فرمایا: "یہ جاڑا بھی خوفناک ہی نظر آتا ہے۔" فرمایا: "اطبا بڑے بڑے پرہیزوں اور حفظِ ماتقدم کے لیے احتیاطیں بتاتے ہیں، اگرچہ سلسلہ اسباب کا اور اُن کی رعایت دُرست ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ محدوُد العلم ضعیف انسان کہاں تک بچار بچار کر غذا اور پانی کا استعمال کیا کرے۔ میرے نزدیک تو استغفار سے بڑھ کر کوئی تعویذ و حرزِ اور کوئی احتیاط و دوا نہیں۔ میں تو اپنے دوستوں کو کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ سے صلح و موافقت پیدا کرو اور دُعاؤں میں مصروف رہو۔

ایک حدیث کا مطلب

فرمایا: "میں تو بڑی آرزو رکھتا ہوں اور دُعائیں کرتا ہوں کہ میرے دوستوں کی عُمریں لمبی ہوں، تاکہ اس حدیث کی خبر پُوری ہو جائے جس میں لکھا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں چالیس برس موت دُنیا سے اُٹھ جائے گی۔" فرمایا: "اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمام جانداروں سے اس عرصہ میں موت کا پیالہ ٹل جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں جو نافع الناس اور کام کے آدمی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں برکت بخشے گا۔"[1]

۱۰ر جولائی ۱۸۹۹ء سے قبل

"مجھے خوب یاد ہے کہ جس روز ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ صاحب قادیان میں حضرت کے مکان کی تلاشی کے لیے آئے تھے اور قبل از وقت اس کا کوئی پتہ اور خبر نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ ماموریں کی رسوائی پسند نہیں کرتا

اس کی صبح کو کہیں سے ہمارے میر صاحب نے سُن لیا کہ آج وارنٹ ہتھکڑی سمیت آویگا۔ میر صاحب حواس باختہ سراز پا نشناختہ حضرت کو اس کی خبر کرنے اندر دوڑے گئے اور غلبہ رقت کی وجہ سے بصد مشکل اس ناگوار خبر کے مُنہ سے برقع اتارا۔ حضرت اس وقت نور القرآن لکھ رہے تھے اور بڑا ہی لطیف اور نازک مضمون در پیش تھا۔ سر اُٹھا کر اور مُسکرا کر فرمایا۔ کہ:

"میر صاحب! لوگ دُنیا کی خوشیوں میں چاندی سونے کے کنگن پہنا ہی کرتے ہیں، ہم سمجھ لیں گے کہ ہم نے اللہ تعالےٰ کی راہ میں لوہے کے کنگن پہن لیے۔" پھر ذرا تامل کے بعد فرمایا: "مگر ایسا نہ ہوگا، کیونکہ خدا تعالیٰ کی اپنی گورنمنٹ کے مصالح ہوتے ہیں وہ اپنے خلفائے ماموریں کی ایسی رسوائی پسند نہیں کرتا۔"[2]

---

[1] از خط مولوی عبدالکریم صاحبؓ یکم جولائی ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ نمبر ۲۳ صفحہ ۵

[2] از خط حضرت مولانا عبدالکریم صاحبؓ مندرجہ الحکم جلد ۳ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۰-۲

ہفتہ مختتمہ ۱۰؍جولائی ۱۸۹۹ء

ایک دینی خوشخبری پر بے پایاں مسرت

اس ہفتہ میں سب سے عجیب اور دلچسپ بات جو واقع ہوئی اور جس نے ہمارے ایمانوں کو بڑی قوت بخشی وہ ایک چٹھی کا حضرت کے نام آنا تھا۔ اس میں پختہ ثبوت اور تفصیل سے لکھا تھا کہ جلال آباد (علاقہ کابل) کے علاقہ میں یوز آسف نبی کا چبوترہ موجود ہے اور وہاں مشہور ہے کہ دو ہزار برس ہوتے کہ یہ نبی شام سے یہاں آیا تھا اور سرکار کابل کی طرف سے کچھ جاگیر بھی اس چبوترہ کے نام ہے۔ زیادہ تفصیل کا محل نہیں۔ اس خط سے حضرتِ اقدس اس قدر خوش ہوئے کہ فرمایا:

"اللہ تعالیٰ گواہ اور علیم ہے کہ اگر مجھے کوئی کروڑوں روپے لا دیتا تو مَیں کبھی اتنا خوش نہ ہوتا جیسا اِس خط نے مجھے خوشی بخشی ہے۔"

برادران! دینی بات پر یہ خوشی کیا منجانب اللہ ہونے کا نشان نہیں؟ کون ہے آج جو اعلائے کلمۃ اللہ کی باتوں پر ایسی خوشی کرے؟

ایک رؤیا اور اس کی تعبیر

ہمارے ایمان کی تجدید و تقویت کے لیے ایک نشان یہ ظاہر ہوا کہ ظہر کے وقت اچانک یہ خط آتا ہے اور صبح حضرتِ اقدسؑ کو یہ رؤیا ہوتی ہے کہ حضرت ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند گویا حضرتِ اقدس کے گھر میں رونق افروز ہوئی ہیں۔ حضرتِ اقدسؑ رؤیا میں عاجز عبدالکریم کو جو اس وقت حضورِ اقدسؑ کے پاس بیٹھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت ملکہ معظمہ کمال شفقت سے ہمارے ہاں قدم رنجہ فرما ہوئی ہیں اور دو روز قیام فرمایا ہے۔ ان کا کوئی شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے۔

اس رؤیا کی تعبیر یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ کوئی نصرتِ الٰہی شامل ہوا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ حضرت ملکہ معظمہ کا اسم مبارک وکٹوریہ ہے، جس کے معنی ہیں۔ مظفرہ منصورہ اور نیز چونکہ اس وقت حضرت ملکہ معظمہ کُل رُوئے زمین کے سلاطین میں سب سے زیادہ کامیاب اور خوش نصیب ہیں، اس لیے آپ کا مہربانی کے لباس میں آپؑ کے مکان میں تشریف لانا بڑی برکت و کامیابی کا نشان ہے۔ خدا کا علم و قدرت دیکھئے۔ ظہر کے وقت اس رؤیا کی صحیح تعبیر پوری ہو گئی۔ اللہ اللہ! اس سے زیادہ نصرت کیا ہے کہ ایسے سامان مِل رہے ہیں کہ جن سے دُنیا کے کُل نصاریٰ پر خدا کی روشن حجت پوری ہوتی ہے۔

مسیح موعود کا مشن

حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا: "مَیں حیران ہوتا ہوں کہ ان کا فرضی مسیح اور کام کیا کرتا یا کریگا؟ اس کی اوقاتِ زندگی کی یہی تقسیم بتاتے ہیں کہ دن کا ایک حصّہ تو لکڑی یا لوہے یا پیتل یا سونے چاندی کی صلیبوں کے توڑنے میں بسر کرے گا اور ایک حصّہ سوّروں کے قتل کرنے میں صرف

کرے گا۔ بس یہی کہ کچھ اور بھی؟ فرمایا: "یہ لوگ نہیں سوچتے کہ وُہ بات کیا ہے جس سے اتنے کروڑ نصاریٰ پر حجّتِ حق پوری ہو کیونکہ اگر نری تلوار ہو تو وہ تو احقاقِ حق کے لیے کبھی آلہ بن نہیں سکتی۔ کیا ایمان کبھی درشتی سے دلوں میں اُتر سکتا ہے اور حجّت اللہ اکرہ سے کسی کے دل کو فریفتہ کر سکتی ہے؟ وہ تو اور بھی الزام کا موجب ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھ میں بجز ظلم لٹھا ہونے کے دلیل کوئی نہیں۔" فرمایا: "آگے عقوڑا مخالفین الزام لگاتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا اور مسلمان یوں اُسے سچا کر دینا چاہتے ہیں اور معمولی کرامات و معجزات سے بھی یورپ و دیگر نصاریٰ پر اثر نہیں پڑ سکتا، اس لیے کہ اُن کی کتاب میں لکھا ہے کہ بہت سے جھُوٹے نبی آئیں گے جو نشان دکھائیں گے۔ پھر اب کیا ہے بجز اس کے کہ کوئی ایسی حجّت ظاہر ہو جس کے آگے گردنیں خم ہو جائیں اور وہ وُہی راہ ہے جو خدا میرے ہاتھ سے پُوری کریگا۔"

مامُور سے مقابلہ کی تین راہیں

اسی ہفتہ لاہوری مُلہم صاحب کا خط آیا جس میں اس نے حضرت مسیح موعودؑ اور آپؑ کے سلسلہ کے خلاف ایک دو پیشگوئیاں کی تھیں۔

اس کے متعلق آپؑ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ان لوگوں کی ہمدردی کے لیے کس قدر میرے دل میں تڑپ اور جوش ہے اور میں حیران ہوں کہ کس طرح ان لوگوں کو سمجھاؤں۔ یہ لوگ کسی طرح بھی مقابلہ میں نہیں آتے۔ تین ہی راہیں ہیں یا گذشتہ زمانہ کے نشانوں سے میرے اپنے نشانوں کا مقابلہ کریں یا آئندہ نشانوں میں مقابلہ کریں یا اور نہیں تو یہی دُعا کریں کہ جس کا وجود نافع الناس ہے وہ بموجب وعدہ الٰہی۔ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (الرعد: ۱۸) دراز زندگی پائے۔ پھر عیاں ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں کون مقبول و منظور ہے۔" فرمایا:

خدائی الہام کا معیار

"افسوس یہ لوگ چھوٹے چھوٹے معمولی الہامی ٹکڑوں اور خوابوں پر اتراتے بیٹھے ہیں اور سمجھ نہیں سکتے کہ کسی الہام کے خدا کی طرف سے ہونے اور دخلِ شیطان سے پاک ہونے کا معیار کیا ہے؟ معیار یہی ہے کہ اُس (خدائی الہام) کے ساتھ نصرتِ الٰہی ہو اور اقتداری علمِ غیب اور قاہر پیشگوئی اس کے ساتھ ہو، ورنہ وہ فضول باتیں ہیں جو نافع الناس نہیں ہوسکتیں۔" فرمایا: "اگر کوئی شخص کسی جلسہ کے وقت دُور بیٹھا ہوا کسی عظیم الشان بادشاہ کی باتیں معمولاً سُن لے اور لوگوں کے سامنے آکر کہے کہ میں نے فلاں بادشاہ کی باتیں سُنی ہیں تو اس کے کہنے سے اُسے اور دُوسرے لوگوں کو کیا حاصل؟ تقربِ سُلطانی کے بعد کی باتوں کے نشان اور ہی ہوا کرتے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر ایک عالَم پکار اُٹھتا ہے کہ فلاں شخص درحقیقت بادشاہ کا مہبطِ کلام و سلام ہے۔" فرمایا: "اگر میرے الہامات بھی ویسے ہی معمولی اور فضول ٹکڑے ہوتے۔ اور ہر ایک میں علمِ غیب اور اقتداری پیشگوئیاں نہ ہوتیں تو میں انہیں محض ہیچ سمجھتا۔" فرمایا: "بھلا کوئی شخص لیکھرام والی پیشگوئی کے برابر کوئی ایک ہی الہام بتا دے۔" فرمایا: "میرے الہاموں سے قوم کا فائدہ اور اسلام کا فائدہ ہوتا ہے اور یہی معیار بڑا بھاری معیار ہے جو میرے الہامات

کے منجانب اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔" فرمایا" میرے ساتھ خدا تعالیٰ کے معاملات اور تصرفات اور اُس کے نشان میری تائید میں عجیب ہیں کچھ تو میری ذات کے متعلق ہیں۔ کچھ میری اولاد کے متعلق ہیں اور کچھ میرے اہلِ بیت کے متعلق ہیں اور کچھ میرے دوستوں کے متعلق ہیں اور کچھ میرے مخالفوں کے متعلق ہیں اور کچھ عامۃ النّاس کے متعلق ہیں۔

لاہوری مُہم کے دوستوں میں سے ایک حافظ صاحب کا پیغام پہنچا کہ وہ گذشتہ نشانوں کا حوالہ سُننا نہیں چاہتے۔ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا :

بار بار ملنے کی تلقین

افسوس یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ کی کوئی بات بھی ناقدردانی کے قابل نہیں ہوتی۔ کیا ایک قوم کو ان سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا۔ اَوَلَمْ یَکْفِھِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْھِمْ (العنکبوت : ۵۲) کیا یہ گذشتہ نشانوں کا حوالہ نہیں"۔ فرمایا " اب ایسا وقت ہے کہ ہمارے دوستوں کو چاہیے کہ بہت دفعہ ملاقات کیا کریں، تاکہ نئے نئے نشانوں کے دیکھنے سے جو روز بروز نازل ہوتے ہیں۔ اُن کے ایمان و تقویٰ میں ترقی ہو۔[1]

---

[1] از خط مولوی عبدالکریم صاحبؓ ۱۰ر جولائی ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ ۲۴ صفحہ ۲،۳

سلسلہ احمدیہ کے قیام کا مقصد

جولائی ۱۸۹۹ء

ایک معزز افسر جو کسی تقریب پر اگلے دن قادیان میں تشریف لائے، تو حضرت اقدس امامنا مرزا غلام احمد صاحب رئیس قادیان نے بھی ان کی دعوت کی جبکہ سب مہمان کھانے کے واسطے جمع ہوتے تو دستر خوان کے بچھائے جانے سے پہلے حضرت اقدس نے اس مہمان کو اور دوسرے احباب کو مخاطب کرکے فرمایا۔[1]

"جب کبھی آپ اس جگہ قادیان میں تشریف لاویں، بے تکلف ہمارے گھر میں تشریف لایا کریں۔ ہمارے ہاں مطلقاً تکلف نہیں ہے۔ ہمارا سب کاروبار دینی ہے۔ اور دُنیا اور اس کے تعلقات اور تکلفات سے ہم بالکل جُدا ہیں۔ گویا ہم دنیاداری کے لحاظ سے مثل مُردہ کے ہیں۔ ہم محض دین کے ہیں اور ہمارا سب کارخانہ دینی ہے۔ جیساکہ اسلام میں ہمیشہ بزرگوں اور اماموں کا ہوتا آیا ہے اور ہمارا کوئی نیا طریق نہیں بلکہ لوگوں کے اُس اعتقادی طریق کو جو کہ ہر طرح سے اُن کے لیے خطرناک ہے دُور کرنا اور اُن کے دلوں سے نکالنا ہمارا اصل منشاء اور مقصود ہے مثلاً بعض نادان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ غیر قوموں کے لوگوں کی چیزیں چُرا لینا جائز ہے اور کافروں کا مال ہمارے لیے حلال ہے اور پھر اپنی نفسانی خواہشوں کی خاطر اس کے مطابق حدیثیں بھی گھڑ رکھی ہیں۔ پھر وُہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ جو دوبارہ دنیا میں آنے والے ہیں، تو ان کا کام لاٹھی مارنا اور خونریزیاں کرنا ہے، حالانکہ جبر سے کوئی دین دین نہیں ہوسکتا۔ غرض اسی قسم کے خوفناک عقیدے اور غلط خیالات اِن لوگوں کے دلوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ جن کو دُور کرنے کے واسطے اور پُرامن عقائد اُن کی جگہ قائم کرنے کے واسطے ہمارا سلسلہ ہے۔ جیساکہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے کہ مُصلحوں کی اور اولیاء اللہ کی اور نیک باتیں سکھانے والوں کی دُنیادار مخالفت کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے اور مخالفوں نے غلط خبریں محض افترا

---

[1] جناب مفتی محمد صادق صاحب لکھتے ہیں: "یہ گفتگو ایسی مفید اور کارآمد باتوں پر مشتمل تھی کہ مَیں نے اکثر فقروں کو اپنی عادت کے موافق اُسی وقت اپنی نوٹ بُک میں جمع کیا اور بعد میں مجھے خیال آیا کہ بذریعہ اخبار الحکم مَیں دُوسرے احباب کو بھی اس پُرلطف تقریر کے مضمون سے حظ اُٹھانے کا موقع دُوں۔ لہٰذا ان فقرات کی مدد سے اپنی یادداشت کے ذریعہ مَیں نے مفصلہ ذیل عبارت ترتیب دی ہے۔"

اور جھوٹ کے ساتھ ہمارے برخلاف مشہور کیں یہانتک کہ ہم کو ضرر پہنچانے کے واسطے گورنمنٹ تک غلط رپورٹیں کیں کہ یہ مُفسد آدمی ہیں اور بغاوت کے ارادے رکھتے ہیں اور ضرور تھا کہ یہ لوگ ایسا کرتے، کیونکہ نادانوں نے اپنے خیرخواہوں یعنی انبیاء اور ان کے وارثین کیساتھ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ایسا ہی سلوک کیا ہے، مگر خدا تعالیٰ نے انسان میں ایک زیرکی رکھی ہے اور گورنمنٹ کے کارکُن ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔

کپتان ڈگلس کی دانائی اور انصاف

چنانچہ کپتان ڈگلس صاحب کی دانائی کی طرف خیال کرنا چاہیے کہ جب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے میری نسبت کہا کہ یہ بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اشتہار اس کے سامنے پڑھا گیا، تو اس نے بڑی زیرکی سے پہچانا کہ یہ سب ان لوگوں کا افترا ہے اور ہمارے مخالف کی کسی بات پر توجہ نہ کی، کیونکہ اس میں شک نہیں کہ ازالہ اوہام وغیرہ دوسری کتب میں ہمارا لقب سُلطان لکھا ہوا ہے، مگر یہ آسمانی سلطنت کی طرف اشارہ ہے اور دُنیوی بادشاہوں سے ہمارا کچھ سروکار نہیں ایسا ہی ہمارا نام حکم عام بھی ہے۔ جس کا ترجمہ اگر انگریزی میں کیا جائے تو گورنر جنرل ہوتا ہے اور شروع سے یہ سب باتیں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں میں موجود ہیں کہ آنے والے مسیح کے یہ نام ہیں۔ یہ سب ہمارے خطاب کتابوں میں موجود ہیں اور ساتھ ہی ان کی تشریح بھی موجود ہے کہ یہ آسمانی سلطنتوں کی اصطلاحیں ہیں اور زمینی بادشاہوں سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم شر کو چاہنے والے ہوتے تو ہم جہاد وغیرہ سے لوگوں کو کیوں روکتے اور درندگی سے ہم مخلوقات کو کیوں منع کرتے۔ غرض کپتان ڈگلس صاحب عقل سے ان سب باتوں کو پا گیا اور پورے پورے انصاف سے کام لیا اور دونوں فریق میں سے ذرہ بھی دُوسری طرف نہیں جُھکا اور ایسا نمونہ انصاف پروری اور دادرسی کا دکھلایا کہ ہم بدل خواہشمند ہیں کہ ہماری گورنمنٹ کے تمام معزز حکام ہمیشہ اسی اعلیٰ درجہ کے نمونۂ انصاف کو دکھلاتے رہیں جو نوشیروانی انصاف کو بھی اپنے کامل انصاف کی وجہ سے ادنیٰ درجہ کا ٹھہراتا ہے اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی اس گورنمنٹ کے پُرامن زمانہ کو بُرا خیال کرے اور اس کے برخلاف منصوبہ بازی کی طرف اپنا ذہن لے جاوے۔

سکھوں کے زمانہ میں مُسلمانوں پر مظالم

یہ ہمارے دیکھنے کی باتیں ہیں کہ سکھوں کے زمانہ میں مُسلمانوں کو کس قدر تکلیف ہوتی تھی۔ صرف ایک گائے کے اتفاقاً ذبح کیے جانے پر سکھوں نے چھ سات ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا اور نیکی کی راہ اس طرح پر مسدود تھی کہ ایک شخص مستی کتے شاہ اس آرزو میں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دُعائیں مانگتا تھا کہ ایک دفعہ صحیح بخاری کی زیارت ہو جاتے اور دُعا کرتا کرتا رو پڑتا تھا اور زمانہ کے حالات کی وجہ سے ناامید ہو جاتا تھا۔ آج گورنمنٹ کے قدم کی برکت سے وہی صحیح بخاری چار پانچ روپے میں مل جاتی ہے۔ اور اُس زمانہ میں لوگ اس قدر دُور جا پڑے تھے کہ ایک مُسلمان نے جسکا

نام خدا بخش تھا، اپنا نام خدا سنگھ رکھ لیا تھا۔ بلکہ اس گورنمنٹ کے ہم پر اس قدر احسان ہیں کہ اگر ہم یہاں سے نکل جائیں تو نہ ہمارا مکہ میں گذارہ ہو سکتا ہے اور نہ قسطنطنیہ میں، تو پھر کس طرح سے ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے برخلاف کوئی خیال اپنے دل میں رکھیں۔ اگر ہماری قوم کو خیال ہے کہ ہم گورنمنٹ کے برخلاف ہیں یا ہمارا مذہب غلط ہے تو ان کو چاہیے کہ وُہ ایک مجلس قائم کریں۔ اس میں ہماری باتوں کو ٹھنڈے دل سے سُنیں تاکہ ان کی تسلی ہو اور اُن کی غلط فہمیاں دُور ہوں۔ جھوٹے کے مُنہ سے بدبو آتی ہے اور فراست والا اُس کو پہچان جاتا ہے۔ صادق کے کام سادگی اور یکرنگی سے ہوتے ہیں اور زمانہ کے حالات اس کے مؤید ہوتے ہیں۔

ضرورتِ زمانہ

آجکل دیکھنا چاہیے کہ لوگ کس طرح عقائدِ حقہ سے پھر گئے ہیں۔ ۲۰ کروڑ کتاب اسلام کے خلاف شائع ہوئی اور کئی لاکھ آدمی عیسائی ہو گئے ہیں۔ ہر ایک بات کے لیے ایک حد ہوتی ہے اور خشک سالی کے بعد جنگل کے حیوان بھی بارش کی امید میں آسمان کی طرف مُنہ اُٹھاتے ہیں۔ آج ۱۳۰۰ برس کی دھوپ اور امساکِ باراں کے بعد آسمان سے بارش اُتری ہے اب اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ برسات کا جب وقت آگیا ہے تو کون ہے جو اُس کو بند کرے۔ یہ ایسا وقت ہے کہ لوگوں کے دل حق سے بہت ہی دُور جا پڑے ہیں۔ ایسا کہ خود خدا پر بھی شک ہو گیا ہے۔

ایمان باللہ کی اہمیت

حالانکہ تمام اعمال کی طرف حرکت صرف ایمان سے ہوتی ہے مثلاً سمّ الفار کو اگر کوئی شخص طباشیر سمجھے تو بلا خوف و خطر کئی ماشوں تک کھا جاوے گا۔ اگر یقین رکھتا ہو کہ یہ زہر قاتل ہے تو ہرگز اس کو مُنہ کے قریب بھی نہ لائے گا۔ حقیقی نیکی کے واسطے یہ ضروری ہے کہ خُدا کے وجود پر ایمان ہو، کیونکہ مجازی حکام کو یہ معلوم نہیں کہ کوئی گھر کے اندر کیا کرتا ہے اور پس پردہ کسی کا کیا فعل ہے۔ اور اگرچہ کوئی زبان سے نیکی کا اقرار کرے، مگر اپنے دل کے اندر وُہ جو کچھ رکھتا ہے اس کے لیے اُس کو ہمارے مؤاخذہ کا خوف نہیں اور دُنیا کی حکومتوں میں سے کوئی ایسی نہیں جس کا خوف انسان کو رات میں اور دن میں اندھیرے میں اور اُجالے میں، خلوت میں اور جلوت میں، ویرانے میں اور آبادی میں، گھر میں اور بازار میں ہر حالت میں یکساں ہو۔ پس دُرستیِ اخلاق کے واسطے ایسی ہستی پر ایمان کا ہونا ضروری ہے جو ہر حال اور ہر وقت میں اس کی نگران اور اس کے اعمال اور افعال اور اس کے سینہ کے بھیدوں کی شاہد ہے۔ کیونکہ دراصل نیک وہی ہے جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو اور جس کا دل اور باہر ایک ہے۔ وہ زمین پر فرشتہ کی طرح چلتا ہے۔ دہریہ ایسی گورنمنٹ کے نیچے نہیں کہ وُہ حُسنِ اخلاق کو پا سکے۔ تمام نتائج ایمان سے پیدا ہوتے ہیں؛ چنانچہ سانپ کے سُوراخ کو پہچان کر کوئی انگلی اس میں نہیں ڈالتا۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ایک مقدار اسٹرکنیا کی قاتل ہے، تو ہمارا اس کے قاتل ہونے پر ایمان ہے اور اس ایمان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس کو مُنہ نہیں لگائیں گے اور مرنے سے بچ جائیں گے۔

خدا تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت

تقدیر یعنی دُنیا کے اندر تمام اشیاء کا ایک اندازہ اور قانون کے ساتھ چلنا اور ٹھہرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا کوئی مُقدّر یعنی اندازہ

باندھنے والا ضرور ہے۔ گھڑی کو اگر کسی نے بالارادہ نہیں بنایا، تو وُہ کیوں اس قدر ایک باقاعدہ نظام کے ساتھ اپنی حرکت کو قائم رکھ کر ہمارے واسطے فائدہ مند ہوتی ہے۔ ایسا ہی آسمان کی گھڑی کہ اُس کی ترتیب اور باقاعدہ اور باضابطہ انتظام یہ ظاہر کرتا ہے کہ وُہ بالارادہ خاص مقصد اور مطلب اور فائدہ کے واسطے بنائی گئی ہے۔ اس طرح انسان مصنوع سے صانع کو اور تقدیر سے مقدر کو پہچان سکتا ہے۔

لیکن اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کے ثبوت کا ایک اور ذریعہ قائم کیا ہوا ہے اور وُہ یہ ہے کہ وہ قبل از وقت اپنے برگزیدوں کو کسی تقدیر سے اطلاع دے دیتا ہے اور اُن کو بتلا دیتا ہے کہ فلاں وقت اور فلاں دن میں مَیں نے فلاں امر کو مقدر کر دیا ہے؛ چنانچہ وہ شخص جس کو خدا نے اس کام کے واسطے چُنا ہوا ہوتا ہے۔ پہلے سے لوگوں کو اطلاع دے دیتا ہے کہ ایسا ہوگا اور پھر ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ اُس نے کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت کے واسطے یہ ایسی دلیل ہے کہ ہر ایک دہریہ اس موقع پر شرمندہ اور لاجواب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہزاروں ایسے نشانات عطا کیے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر لذیذ ایمان پیدا ہوتا ہے۔ ہماری جماعت کے اس قدر لوگ اس جگہ موجود ہیں۔ کون ہے جس نے کم از کم دو چار نشان نہیں دیکھے اور اگر آپ چاہیں تو کئی سو آدمی کو باہر سے بلوائیں اور اُن سے پُوچھیں۔ اس قدر اخیار اور ابرار اور متقی اور صالح لوگ جو کہ ہر طرح سے عقل اور فراست رکھتے ہیں اور دُنیوی طور پر اپنے معقول روزگار پر قائم ہیں۔ کیا ان کو تسلی نہیں ہوئی۔ کیا اُنھوں نے ایسی باتیں نہیں دیکھیں جن پر انسان کبھی قادر نہیں ہے۔ اگر ان سے سوال کیا جائے تو ہر ایک اپنے آپ کو اوّل درجہ کا گواہ قرار دے گا۔ کیا ممکن ہے کہ ایسے ہر طبقہ کے انسان، جن میں عاقل اور فاضل اور طبیب اور ڈاکٹر اور سوداگر اور مشائخ سجادہ نشین اور وکیل اور معزز عہدہ دار ہیں۔ بغیر پُوری تسلی پانے کے یہ اقرار کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس قدر آسمانی نشان بچشمِ خود دیکھے؟ اور جبکہ وہ لوگ واقعی طور پر ایسا اقرار کرتے ہیں جس کی تصدیق کے لیے ہر وقت شخص مکذب کو اختیار ہے، تو پھر سوچنا چاہیے کہ ان مجموعۂ اقرارات کا طالبِ حق کے لیے اگر وہ فی الحقیقت طالبِ حق ہے کیا نتیجہ ہونا چاہیے۔ کم سے کم ایک ناواقف اتنا تو ضرور سوچ سکتا ہے کہ اگر اس گروہ میں جو لوگ ہر طرح سے تعلیمیافتہ اور دانا اور آسودہ روزگار اور بفضلِ الٰہی مالی حالتوں میں دوسروں کے محتاج نہیں ہیں۔ اگر اُنھوں نے پورے طور پر میرے دعوے پر یقین حاصل نہیں کیا اور پُوری تسلی نہیں پائی تو کیوں وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اور عزیزوں سے علیحدہ ہو کر غربت اور مسافری میں اس جگہ میرے پاس بسر کرتے ہیں اور اپنی اپنی مقدرت کے موافق مالی امدادیں میرے سلسلہ کے لیے فدا اور دلدادہ ہیں۔

ہر ایک بات کا وقت ہے۔ بہار کا بھی وقت ہے اور برسات کا بھی وقت ہے اور کوئی نہیں جو خدا کے ارادے ٹال دے[1]۔

---

[1] الحکم جلد ۳ نمبر ۲۶ صفحہ ۵، ۶ پرچہ ۲۴ جولائی ۱۸۹۹ء

یکم اگست ۱۸۹۹ء

معرفتِ الٰہی کے موضوع پر ایک ہندو سادھو سے مکالمہ

یکم اگست ۱۸۹۹ء کو بعد مغرب ایک مشہور ہندو سادھو صاحب حضرت اقدسؑ کی ملاقات کے لیے تشریف لائے اور حضورؑ سے باتیں کرتے رہے۔ یہ اس گفتگو کا خلاصہ یا مفہوم ہے جس کو حافظہ کی مدد سے ہم نے اپنے الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ (ایڈیٹر الحکم)

حضرتِ اقدسؑ: آپ کے ہاں جوگ کا طریق سناتن دھرم کے اصول پر ہے یا آریہ سماج کے اصول پر۔

سادھو: سناتن دھرم کے موافق۔

حضرت اقدسؑ: آریہ سماج ایک ایسا فرقہ ہے جس میں صرف کہنا ہے کرنا نہیں۔

سادھو: بیشک یہ لوگ گرو کی ضرورت نہیں سمجھتے اور یہاں تک کہ دیانند کو بھی گرو کی حیثیت سے نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک راہ بتا گیا ہے، اس پر چلنا چاہیے۔

حضرتِ اقدسؑ: آپ کے جوگ کے لیے بڑی بڑی مشقتیں ہیں۔

سادھو: جی ہاں۔

حضرتِ اقدسؑ: اس مشقت کے بعد کیا کوئی ایسی قوت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس پریم کا پتہ لگ جاوے جو اس ریاضت کرنے والے کو خدا کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ محبت کا پتہ اور وجود اس وقت تک نہیں ملتا جبتک کہ دونوں طرف سے کامل محبت کا اظہار نہ ہو۔ اِدھر سے محبت کے جوش میں ہر قسم کے دکھ اور تکالیف کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو اور اُدھر سے یعنی پرمیشر کی طرف سے ایسا پرکاش (روشنی یا نور) اس کو ملے کہ وہ عام طور پر لوگوں میں متمیز ہو جاوے۔

سادھو: ہاں کچھ بل اور طاقت آہی جاتا ہے۔

حضرتِ اقدسؑ: بھلا کوئی ایسی طاقت اور بل کی بات آپ سنائیں جو آپ کی سُنی ہوئی نہ ہو بلکہ دیکھی ہوئی ہو۔ یعنی آپ کے گرو میں یا اُن کے گرو میں۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ سُنی ہوئی بات کچھ ایسی موثر نہیں ہوتی خواہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو بلکہ قصے کہانی کے ذیل میں سمجھی جاتی ہے۔ جیسے مثلاً کوئی کہے کہ ایک دیش ہے، وہاں آدمی اُڑا کرتے ہیں اب ہم کو اُس کے ماننے میں ضرور تامل ہوگا۔ کیونکہ ہم نے نہ تو ایسے آدمی اُڑتے دیکھے ہیں اور نہ خود اُڑے ہیں۔ پس قوتِ ایمان اور یقین کے بڑھانے کے لیے سُنی سنائی باتیں فائدہ نہیں پہنچاتیں ہیں۔ بلکہ تازہ بتازہ جو سامنے

دیکھی جاویں اور اس سے بھی بڑھ کر وہ جو خود انسان کی اپنی حالت پر وارد ہوں پس میرے اس سوال سے یہ غرض ہے کہ آپ کوئی ایسی بات بتلائیں، جو اس ریاضت کرنے والوں میں آپ نے دیکھی ہو یا سُنی ہو۔

سادھو: ہاں ہمارے جو گرُو تھے ان میں بعض بعض باتیں ایسی تھیں جو دوسرے کے مَن کی بات بُوجھ لیتے تھے اور پھر جو مُنہ سے کہہ دیتے تھے ہو جاتا تھا اور جو اُن کے گرُو تھے ان میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں، مگر اُن کو دیکھا نہیں، تاہم دیکھنے کے برابر ہے، کیونکہ اُن کو مرے کوئی اسی برس کے قریب ہوتے اور اُن کے دیکھنے والے ابھی موجود ہیں۔

حضرت اقدسؑ: آپ نے بھی کوئی ریاضتیں کی تھیں؟

سادھو: جی ہاں۔ میں نے بھی کی ہیں۔

حضرت اقدسؑ: کیا کیا؟

سادھو: پہلے چِلّہ کشی کیا کرتے تھے۔ یہانتک کہ آٹھ مہینے کا ایک ہی چِلّہ تھا۔

حضرت اقدسؑ: اس میں کیا کھاتے تھے؟

سادھو: پہلے چاولوں کا آٹا کھایا کرتے تھے۔ پھر صرف پانی جو پکا کر رکھا ہوا تھا یعنی ایک گاگر کا نصف جب رہ جاوے تو وُہ رکھ لیا کرتے تھے اور اس میں سے سیر کچا صُبح کو پی لیا کرتے تھے اور اسی وقت پیشاب کر لیا کرتے تھے اور پھر کچھ نہیں۔

حضرت اقدسؑ: کیا اس میں لو ہا وغیرہ تو نہ ہوتا تھا؟

سادھو: نہیں۔

حضرت اقدسؑ: پھر کیا اس ریاضت کی حالت میں آپ کو کچھ عجیب وغریب نظارے نظر آتے؟

سادھو: ہاں کبھی روشنی نظر آتی تھی جو اندر ہو جاتی تھی اور دُور دُور سے آتے جاتے آدمی نظر آجاتے تھے۔

(اس کے بعد چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر اس مُہرِ سکوت کو سادھو صاحب نے اپنے اس ایک سوال سے توڑا) (ایڈیٹر)

سادھو: کیا آپ پرمیشر کو اکار مانتے ہیں یا نِراکار؟

(حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ نے اس موقعہ پر بطور تشریح عرض کیا کہ مُورتی کے قابل یا ایسا خدا کہ مُورتی کی ضرورت نہ ہو)

اسلام کا خدا

حضرتِ اقدسؑ: ہم جس خدا کو مانتے ہیں۔ اس کی عبادت اور پرستش کے لیے نہ تو ان مشقتوں اور ریاضتوں کی ضرورت ہے اور نہ کسی مورتی کی حاجت ہے۔ اور

ہمارے مذہب میں خدائے تعالیٰ کو حاصل کرنے اور اس کی قدرت نمائیوں کے نظارے دیکھنے کے لیے ایسی تکالیف کے برداشت کرنے کی کچھ بھی حاجت نہیں، بلکہ وُہ اپنے سچے پریمی بھگتوں کو آسان طریق سے جو ہم نے خود تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے، بہت جلد ملتا ہے۔ انسان اگر اس کی طرف ایک قدم اُٹھاتا ہے، تو وُہ دو قدم اُٹھاتا ہے۔ انسان اگر تیز چلتا ہے تو وہ دوڑ کر اس کے ہردے میں پرکاش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حالتِ غیب میں رہنے کی حکمت

میرے نزدیک مُورتی بنانے والوں نے خدا تعالیٰ کی اس حکمت اور راز کو نہیں سمجھا جو اس نے اپنے آپ کو بظاہر ایک حالتِ غیب میں رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ کا غیب میں ہی ہونا انسان کے لیے تمام تلاش اور جستجو اور کُل تحقیقاتوں کی راہوں کو کھولتا ہے۔ جس قدر علوم اور معارف انسان پر کھلے ہیں، وہ گو موجود تھے اور ہیں، لیکن ایک وقت میں وُہ غیب میں تھے۔ انسان کی سعی اور کوشش کی قوّت نے اپنی چمکار دکھائی اور گوہر مقصود کو پالیا۔ جس طرح پر ایک عاشق صادق ہوتا ہے۔ اس کے محبوب اور معشوق کی غیر حاضری اور آنکھوں سے بظاہر دُور ہونا اس کی محبت میں کچھ فرق نہیں ڈالتا بلکہ وہ ظاہری ہجر اپنے اندر ایک قسم کی سوزش پیدا کر کے اس پریم بھاؤ کو اور بھی ترقی دیتا ہے۔ اسی طرح پر مُورتی لے کر خدا کو تلاش کرنے والا کب سچّی اور حقیقی محبت کا دعویدار بن سکتا ہے؟ جبکہ مُورتی کے بدوں اس کی توجہ کامل طور پر اس پاک اور کامل حسن ہستی کی طرف نہیں پڑ سکتی۔ انسان اپنی محبت کا خود امتحان کرے۔ اگر اس کو اس سوختہ دل عاشق کی طرح چلتے پھرتے، بیٹھتے اُٹھتے غرض ہر حالت میں بیداری کی ہو یا خواب کی، اپنے محبوب کا ہی چہرہ نظر آتا ہے اور کامل توجہ اسی طرف ہے تو سمجھ لے کہ واقعی مجھے خدا تعالیٰ سے ایک عشق ہے اور ضرور ضرور خدا تعالیٰ کا پرکاش اور پریم میرے اندر موجود ہے، لیکن اگر درمیانی امور اور خارجی بندھن اور رکاوٹیں اس کی توجہ کو پھرا سکتی ہیں اور ایک لحظہ کے لیے بھی وہ خیال اس کے دل سے نکل سکتا ہے تو مَیں سچ کہتا ہوں کہ وہ خدائے تعالیٰ کا عاشق نہیں اور اس سے محبت نہیں کرتا اور اسی لیے وُہ روشنی اور نُور جو سچے عاشقوں کو ملتا ہے اُسے نہیں ملتا۔ یہی وُہ جگہ ہے جہاں آکر اکثر لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور خدا کا انکار کر بیٹھے ہیں۔ نادانوں نے اپنی محبت کا امتحان نہیں کیا اور اُس کا وزن کئے بدوں ہی خدا پر بدظن ہو گئے ہیں۔ پس میرے خیال میں خدا تعالیٰ کا غیب میں رہنا انسان کی سعادت اور رُشد کو ترقی دینے کی خاطر ہے اور اس کی رُوحانی قوتوں کو صاف کر کے جِلا دینے کے لیے تاکہ وُہ نُور اس میں پرکاش ہو۔ ہم جو بار بار اشتہار دیتے ہیں اور لوگوں کو تجربہ کے لیے بُلاتے ہیں بعض لوگ ہم کو دوکاندار کہتے ہیں۔ کوئی کچھ بولتا ہے کوئی کچھ۔ غرض ان بھانت بھانت کی بولیوں کو سُن کر ہم جو ہر مُلک میں جو اس دُنیا پر آباد ہے۔ یورپ، امریکہ وغیرہ میں اشتہار دیتے ہیں اُس کی غرض کیا ہے۔

ہماری غرض

ہماری غرض بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ لوگوں کو اُس خدا کی طرف رہنمائی کریں جسے ہم نے خود دیکھا ہے سُنی سنائی بات اور قصّہ کے رنگ میں ہم خدا کو دکھانا نہیں چاہتے بلکہ ہم اپنی ذات

اور اپنے وجود کو پیش کر کے دُنیا کو خدا تعالیٰ کا وجود منوانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک سیدھی بات ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف جس قدر کوئی قدم اٹھاتا ہے خدا تعالیٰ اس سے زیادہ سُرعت اور تیزی کے ساتھ اُس کی طرف آتا ہے دُنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک معزز آدمی کا منظورِ نظر عزیز اور واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے والا اپنے اندر ان نشانات میں سے کچھ بھی حصّہ نہ لے گا جو خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور بے انتہا طاقتوں کا نمونہ ہوں۔

مقربانِ بارگاہِ الٰہی کا مقام

یہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کی غیرت کبھی تقاضا نہیں کرتی کہ اس کو ایسی حالت میں چھوڑے کہ وہ ذلیل ہو کر پیسا جاوے۔ نہیں بلکہ وہ خود وحدہٗ لاشریک ہے وہ اپنے اس بندہ کو بھی ایک فرد اور وحدہٗ لاشریک بنا دیتا ہے۔ دُنیا کے تختہ پر کوئی انسان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہر طرف سے اُس پر حملے ہوتے ہیں اور ہر حملہ کرنے والا اُس کی طاقت کے اندازہ سے بے خبر ہو کر جانتا ہے کہ میں اُسے تباہ کر ڈالوں گا، لیکن آخر اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا بچ نکلنا انسانی طاقت سے باہر کسی قوت کا کام ہے۔ کیونکہ اگر اُسے پہلے سے یہ علم ہوتا تو وُہ حملہ بھی نہ کرتا۔ پس وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے حضور ایک تقرب حاصل کرتے ہیں اور دُنیا میں اُس کے وجُود اور ہستی پر ایک نشان ہوتے ہیں۔ بظاہر اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ہر ایک مخالف اپنے خیال میں یہ سمجھتا ہے کہ میرے مقابلہ میں یہ بچ نہیں سکتا، کیونکہ ہر قسم کی تدبیر اور کوشش کے نتائج اسے یہیں تک پہنچاتے ہیں، لیکن جب وُہ اس زد میں سے ایک عزت اور احترام کے ساتھ اور سلامتی سے نکلتا ہے تو ایک دم کے لیے تو اُسے حیران ہونا پڑتا ہے کہ اگر انسانی طاقت کا ہی کام تھا، تو اس کا بچنا مُحال تھا، لیکن اب اس کا صحیح سلامت رہنا انسان کا نہیں بلکہ خدا کا کام ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ مُقربانِ بارگاہِ الٰہی پر جو مخالفانہ حملے ہوتے ہیں، وہ کیوں ہوتے ہیں؟ معرفت اور گیان کے کُوچہ سے بے خبر لوگ ایسی مخالفتوں کو ایک ذلت سمجھتے ہیں، مگر اُن کو کیا خبر ہوتی ہے کہ اس ذلت میں اُن کے لیے ایک عزت اور امتیاز نکلتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور ہستی پر ایک نشان ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ وجُود آیات اللہ کہلاتے ہیں۔

غرض ہم جو اشتہار دے کر لوگوں کو بُلاتے ہیں تو ہماری یہی آرزو ہے کہ اُن کو اُس خدا کا پتہ دیں جسے ہم نے پایا اور دیکھا ہے اور وہ اقرب راہ بتلائیں، جس سے انسان جلد باخدا ہو جاتا ہے پس ہمارے خیال میں قصّہ کہانی سے کوئی معرفت اور گیان ترقی نہیں پا سکتا جبتک کہ خود عملی حالت سے انسان نہ دیکھے اور یہ بدُوں اس راہ کے جو ہماری راہ ہے میسّر نہیں اور اس راہ کے لیے ایسی صعوبتوں اور مشقتوں کی ضرورت نہیں۔ یہاں دِل بکار ہے۔ خدا تعالیٰ کی نگاہ دِل پر پڑتی ہے اور جس دل میں محبت اور عشق ہو اس کو مُورتی سے کیا غرض؟ مُورتی پوجا سے انسان کبھی صحیح اور یقینی نتائج پر پہنچ نہیں سکتا۔

خدا تعالیٰ اخلاص و محبت کو دیکھتا ہے

خدا تعالیٰ کی نگاہ انسانِ مخلص کے دل کے ایک نقطہ پر ہوتی ہے جسے وُہ دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کی خاطر وُہ خوش دلی سے ہر صعُوبت و مکروہ کو برداشت کرے گا۔ یہ ضرور نہیں کہ کوئی بڑی بڑی مشقتیں کرے اور دائم حاضر باش رہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خاکروب ہمارے مکان میں آکر بڑی تکلیف اُٹھاتا ہے اور جو کام وہ کرتا ہے ہمارا ایک بڑا معزز مخلص دوست وُہ کام نہیں کرسکتا، تو کیا ہم اپنے وفادار احباب کو بے قدر سمجھیں اور خاکروب کو معزز و محترم خیال کریں۔ بعض ہمارے ایسے بھی احباب ہیں جو مدتوں کے بعد تشریف لاتے ہیں اور انہیں ہر وقت ہمارے پاس بیٹھنا میسّر نہیں آتا، مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ اُن کے دلوں کی بناوٹ ایسی ہے اور وُہ اخلاص و مودّت سے ایسے خمیر کیے گئے ہیں کہ ایک وقت ہمارے بڑے بڑے کام آسکتے ہیں۔ نظامِ قدرت میں بھی ہم ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ جتنا شرف بڑھ جاتا ہے، محنت اور کام ہلکا ہو جاتا ہے۔ ایک مزدوری کو دیکھو۔ اُنبار پر واؤں کا اُسے دیا جاتا ہے اور ایک ہفتہ کے اندر حکم ہے کہ تعمیل کر کے حاضر ہو۔ برسات ہو، دُھوپ ہو، جاڑا ہو، دیہات کے راستے خراب ہوں۔ کوئی عُذر سُنا نہیں جاتا اور تنخواہ پوچھو تو پانچ روپے۔ اور حکّامِ بالا دست کا معاملہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔

رہبانیت معرفتِ تامّہ کا ذریعہ نہیں ہے

اس قانون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا قانون بھی اپنے برگزیدوں سے ایسا ہی ہے۔ خطرناک ریاضتیں کرنا اور اعضاء اور قویٰ کو مجاہدات میں بیکار کر دینا محض نکمّی بات اور لاحاصل ہے۔ اسی لیے ہمارے ہادیِ کامل علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ یعنی جب انسان کو صفتِ اسلام (گردن نہادن بر حکمِ خدا و موافقتِ تامّہ بتقادیرِ آلہیہ) میسّر آجائے، تو پھر رہبانیت یعنی ایسے مجاہدوں اور ریاضتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

(اس کے بعد سادھو صاحب تشریف لے گئے اور کھانا رکھا گیا۔ حضرتِ اقدسؑ نے فرمایا کہ:)

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت کو نہیں رکھا۔ اس لیے کہ وہ معرفتِ تامّہ کا ذریعہ نہیں ہے۔[1]

۱۰؍ اگست ۱۸۹۹ء سے قبل:

دنیا کی خوشامد

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب تحریر فرماتے ہیں:

مَیں نے بارہا اپنے محبوب مُرشد سیّدالاولیاء مسیحِ موعُود علیہ السّلام کی زبانِ مبارک سے سُنا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

---

[1] الحکم جلد ۳ نمبر ۲۸ صفحہ ۳-۵

"ہم اس پر قادر ہیں کہ ایسی تقریریں کریں اور ایسی تحریریں شائع کریں کہ لوگوں کی مصطلح صُلح کل کے ڈھانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوں اور سب قومیں علیٰ اختلاف المشارب خوش ہو جاویں اور حکام اور رعایا میں سے کسی کو بھی کبھی اُن پر نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے، مگر اس خسیس دُنیا کو خوش کر کے اپنے خدا کی دھتکار کی طاقت ہم کہاں رکھ سکتے ہیں[1]"

ہفتہ مختتمہ ۱۱ر اگست ۱۸۹۹ء

بعض لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں دُعا کے لیے لکھا کرتے تھے جس کے جواب میں اُن کو تحریر کیا جاتا تھا کہ دُعا کی گئی، مگر بعد ازاں وُہ دوبارہ لکھ دیا کرتے کہ "کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اور یہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو آپ نے دُعا نہیں کی یا اگر کی ہے تو توجّہ سے نہیں کی" حضرت مولوی عبد الکریم صاحبؓ نے اس بارہ میں ایک دن عرض کی تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

دُعا کی حقیقت

"سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دُعا کے مضمون پر پھر قلم اٹھایا جائے کیونکہ پہلے مضامین اس بارہ میں کافی ثابت نہیں ہوتے۔ دُعا نہایت نازک امر ہے اور اس کے لیے شرط ہے کہ مُستدعی اور داعی میں ایسا مستحکم رابطہ ہو جائے کہ ایک کا دَرد دُوسرے کا دَرد ہو جائے اور ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہو جائے۔ جس طرح شیر خوار بچہ کا رونا ماں کو بے اختیار کر دیتا ہے اور اس کی چھاتیوں میں دُودھ اُتار دیتا ہے، ویسے ہی مُستدعی کی حالتِ زار اور استغاثہ پر داعی سراسر رقت اور عقدِ ہمّت بن جائے۔

توجّہ اور رِقّت بھی خدا تعالیٰ کے ہاں سے نازل ہوتی ہے

فرمایا: اصل بات یہ ہے کہ سب اُمور خدا تعالیٰ کی مَوہبت ہیں۔ اکتساب کو ان میں دخل نہیں۔ توجّہ اور رقّت بھی خدا تعالیٰ کے ہاں سے نازل ہوتی ہے۔ جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی کے لیے کامیابی کی راہ نکال دے، تو وُہ داعی کے دل میں توجّہ اور رقّت ڈال دیتا ہے، مگر سلسلہ اسباب میں ضروری ہوتا ہے کہ داعی کو کوئی محرکِ شدید جنبش اور حرکت دینے والا ہو۔ اس کی تدبیر بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ مُستدعی اپنی حالت ایسی بنائے کہ اضطراراً داعی کو اُس کی طرف توجّہ ہو جائے۔"

دُعا اور خدمتِ دین

فرمایا: "جو حالت میری توجّہ کو جذب کرتی ہے اور جسے دیکھ کر مَیں دُعا کیلئے اپنے اندر تحریک پاتا ہوں۔ وُہ ایک ہی بات ہے کہ مَیں کسی شخص کی نسبت معلوم کر لوں کہ یہ خدمتِ دین کے سزاوار ہے اور اس کا وجود خدا تعالیٰ کیلئے، خدا کے رسُول کیلئے، خدا کی کتاب کیلئے اور خدا کے بندوں کیلئے نافع ہے۔ ایسے شخص کو جو دَرد و الم پہنچے وہ درحقیقت مجھے پہنچتا ہے۔" فرمایا: "ہمارے دوستوں کو چاہیے کہ وُہ اپنے دلوں میں خدمتِ دین کی نیّت باندھ لیں۔ جس طرز اور جس رنگ کی خدمت جس سے بن پڑے کرے۔" پھر فرمایا:

"مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اُس شخص کی قدر و منزلت ہے، جو دین کا خادم اور نافع الناس ہے۔

---

[1] از خط مولانا عبد الکریم صاحبؓ مندرجہ الحکم جلد ۳ نمبر ۲۱ صفحہ ۲

ورنہ وُہ کچھ پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ کتّوں اور بھیڑوں کی موت مرجائیں۔"

خدا تعالیٰ اور بندہ کا رابطہ ایک دن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا، کہ

"دو دوستوں میں دوستی اسی صورت میں نبھ سکتی ہے کہ کبھی وُہ اِس کی مان لے اور کبھی یہ اُس کی۔ اگر ایک شخص سدا اپنی ہی منوانے کے دَرپے ہو جائے، تو معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ یہی حال خدا تعالیٰ اور بندہ کے رابطہ کا ہونا چاہیے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اس کی سُن لے اور اس پر فضل کے دروازے کھول دے اور کبھی بندہ اُس کی قضا و قدر پر راضی ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق خدا تعالیٰ کا ہی ہے کہ وہ بندوں کا اِمتحان لے اور یہ اِمتحان اس کی طرف سے انسان کے فوائد کے لیے ہوتے ہیں۔ اُس کا قانونِ قدرت ایسا ہی واقع ہوا ہے کہ امتحان کے بعد جو اچھے نکلیں انہیں اپنے فضلوں کا وارث بناتا ہے۔"

دُنیاوی اُمور میں کھویا جانا خسارتِ آخرت کا موجب ہوتا ہے ایک نوجوان شخص نے حضرت مسیح موعودؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر دُنیاوی مصائب کی کہانی شروع کی اور اپنے طرح طرح کے ہم و غم بیان کیے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے بہت سمجھایا اور فرمایا کہ "ہمہ تن دُنیاوی اُمور میں کھویا جانا خسارتِ آخرت کا موجب ہوتا ہے اور اس قدر جزع و فزع مومن کو نہیں چاہیے۔" مگر وہ زور زور سے رونے لگا۔ جس پر آپ نے سخت ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر کہا۔ کہ "بس کرو۔ مَیں ایسے رونے کو جہنّم کا موجب جانتا ہوں۔ میرے نزدیک جو آنسو دنیا کے ہم و غم میں گرائے جاتے ہیں۔ وہ آگ ہیں جو بہانے والے کو ہی جلا دیتے ہیں۔ میرا دل سخت ہو جاتا ہے ایسے شخص کے حال کو دیکھ کر جو جیفۂ دنیا کی تڑپ میں کُڑھتا ہے۔"

مثالی توکّل کی کیفیت ایک دن مجلسِ مسیح موعودؑ میں توکّل کی بات چل پڑی، جس پر آپؑ نے فرمایا :

"مَیں اپنے قلب کی عجیب کیفیت پاتا ہوں۔ جیسے سخت حبس ہوتا اور گرمی کمال شدّت کو پہنچ جاتی ہے، تو لوگ وثوق سے امید کرتے ہیں کہ اب بارش ہوگی۔ ایسا ہی جب مَیں اپنی صندوقچی کو خالی دیکھتا ہوں تو مجھے خدا کے فضل پر یقینِ واثق ہوتا ہے کہ اب یہ بھرے گی اور ایسا ہی ہوتا ہے۔" اور خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر فرمایا کہ :

"جب میرا کیسہ خالی ہوتا ہے تو جو ذوق و سُرور اللہ تعالیٰ پر توکّل کا اس وقت مجھے حاصل ہوتا ہے میں اُس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا اور وُہ حالت بہت ہی زیادہ راحت بخش اور طمانیت انگیز ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کیسہ بھرا ہوا ہو۔" اور فرمایا :

"اُن دنوں میں جبکہ دُنیوی مقدّمات کی وجہ سے والد صاحب اور بھائی صاحب طرح طرح کے ہموم و غموم میں

مبتلا رہتے تھے وہ بسا اوقات میری حالت دیکھ کر رشک کھاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ بڑا ہی خوش نصیب آدمی ہے۔ اس کے نزدیک کوئی غم نہیں آتا۔"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما کا مقام

ایک دفعہ ایک دوست نے جو محبتِ مسیح موعودؑ میں فنا شدہ تھے۔ آپ کی خدمت میں عرض کی کہ کیوں نہ ہم آپؑ کو مدارج میں شیخینؓ سے افضل سمجھا کریں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب مانیں؟ اللہ اللہ! اس بات کو سُنکر حضرتِ اقدسؑ کا رنگ اڑ گیا اور آپ کے سراپا پر عجیب اضطراب و بیتابی مستولی ہوگئی۔ میں خدائے غیور و قدوس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس گھڑی نے میرا ایمان حضورِ اقدسؑ کی نسبت اور بھی زیادہ کردیا۔ آپؑ نے برابر چھ گھنٹے کامل تقریر فرمائی۔ بولتے وقت میں نے گھڑی دیکھ لی تھی اور جب آپؑ نے تقریر ختم کی۔ جب بھی دیکھی۔ پورے چھ ہوتے۔ ایک منٹ کا فرق بھی نہ تھا۔

اتنی مدت تک ایک مضمون کو بیان کرنا اور مسلسل بیان کرنا ایک خرقِ عادت تھا۔ اس سارے مضمون میں آپؑ نے رسولِ کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کے محامد و فضائل اور اپنی غلامی اور کفش برداری کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اور جنابِ شیخین علیہم السلام کے فضائل بیان فرماتے اور فرمایا:

"میرے لیے یہ کافی فخر ہے کہ میں ان لوگوں کا مداح اور خاکِ پا ہوں۔ جو جزئی فضیلت خدا تعالیٰ نے انھیں بخشی ہے، وہ قیامت تک کوئی اور شخص نہیں پاسکتا۔ کب دوبارہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں پیدا ہوں اور پھر کسی کو ایسی خدمت کا موقع ملے جو جنابِ شیخین علیہما السلام کو ملا۔"[۱]

۱۷ راگست ۱۸۹۹ء

چند روز ہوئے۔ بریلی سے ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں لکھا کہ کیا آپ وُہی مسیح موعود ہیں، جس کی نسبت رسُولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے احادیث میں خبر دی ہے؟ خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر آپ اس کا جواب لکھیں۔ مَیں نے معمولاً رسالہ "تریاق القلوب" سے دو ایک ایسے فقرے جو اس کا کافی جواب ہو سکتے تھے لکھ دیئے۔ وہ شخص اس پر قانع نہ ہوا اور پھر مجھے مخاطب کر کے لکھا کہ مَیں چاہتا ہوں کہ حضرت مرزا صاحبؑ خود اپنے قلم سے قسمیہ لکھیں کہ آیا وُہ وہی مسیح موعُود ہیں جس کا ذکر احادیث اور قرآن شریف میں ہے؟ مَیں نے شام کی نماز کے بعد دوات قلم اور کاغذ حضرتؑ کے آگے رکھ دیا اور عرض کیا کہ ایک شخص ایسا لکھتا ہے۔ حضرتؑ نے فوراً کاغذ ہاتھ میں لیا اور یہ چند سطریں لکھ دیں۔

---

[۱] از خط جناب مولوی عبدالکریم صاحبؓ مورخہ ۱۱ راگست ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ صفحہ ۲۹

"مَیں نے پہلے بھی اس اقرارِ مفصّل ذیل کو اپنی کتابوں میں قسم کے ساتھ لوگوں پر ظاہر کیا ہے اور اب بھی اس پرچہ میں اُس خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر لکھتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ مَیں وہی مسیح موعود ہوں جس کی خبر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن احادیث صحیحہ میں دی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دُوسری صحاح میں درج ہیں۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا ۱۔"

الراقم مرزا غلام احمد عفا اللہ عنہ وایّد، ۱۷ر اگست ۱۸۹۹ء

اس ذکر سے میری دو غرضیں ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی جماعت کا ایمان بڑھے اور انھیں وُہی ذوق اور سرور حاصل ہو جو یہاں کے خوش قسمت حاضرین کو اُس گھڑی حاصل ہوا اور انھوں نے سچّے دل سے اعتراف کیا کہ اُن کو نیا ایمان ملا ہے اور دُوسرے یہ کہ منکرین اور بدظن اس علیٰ بصیرۃ قسم پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ مُتعمّد کذّاب اور مفتری مُختلِق کی یہ شان اور اُسے یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ ذُوالجلال خدا کی ایسی اور اس طرح اور ایسے مجمع میں قسم کھاتے۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!![۱]

۱۲ر اکتوبر ۱۸۹۹ء :-

لالہ کیشو داس صاحب تحصیلدار بٹالہ اتفاقِ حسنہ سے قادیان میں وارد ہوئے اور حضرتِ اقدسؑ کی ملاقات کے لیے تشریف لائے اور عرض کیا کہ مجھے فقراء سے ملنے کا کمال شوق ہے۔

اور اسی شوق کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرتِ اقدسؑ نے فرمایا :

مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کی غرض ـــ زندہ خدا پر زندہ ایمان پیدا کرنا

بیشک اگر آپ کے دل میں اہلِ دل لوگوں کے ساتھ محبت نہ ہوتی، تو آپ ہمارے پاس کیوں آتے اور ایک دُنیادار کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وُہ ایک دُنیا سے الگ گوشہ نشین کے پاس جاوے۔ مناسبت ایک ضروری شے ہے اور اصل تو یہ ہے کہ جبکہ انسان ایک فنا ہونے والی ہستی ہے اور موت کا کچھ بھی پتہ نہیں کہ کب آجاوے اور عُمر ایک ناپائیدار شے ہے پھر کس قدر ضروری ہے کہ اپنی اصلاح اور فلاح کی فکر میں لگ جاوے، مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ دُنیا اپنی دُھن میں ایسی لگی ہے کہ اس کو آخرت کا کچھ فکر اور خیال ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ سے ایسے لاپروا ہو رہے ہیں گویا وُہ کوئی ہستی ہی نہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ دُنیا کی ایمانی حالت اس حد تک کمزور ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور کر کے بھیجا ہے تاکہ مَیں زندہ ایمان زندہ خدا پر پیدا کرنے کی راہ بتلاؤں۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ

۱؎ از خط مولانا عبدالکریم صاحبؓ مندرجہ الحکم جلد ۳ نمبر ۳۲ صفحہ ۵

کا عام قانون ہے۔ بہت لوگوں نے جو سعادت اور رُشد سے حصّہ نہ رکھتے تھے۔ خدا ترسی اور انصاف سے بے بہرہ تھے۔ مجھے جھوٹا اور مفتری کہا اور ہر پہلو سے مجھے دکھ دینے اور تکلیف پہنچانے کی کوشش کی۔ کفر کے فتوے دے کر مسلمانوں کو بدظن کرنا چاہا اور خلافِ واقعہ امور کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کر کے اس کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ جھوٹے مقدمات بنائے۔ گالیاں دیں۔ قتل کرنے کے منصوبے کیے۔ غرض کونسا امر تھا جو اُنھوں نے نہیں کیا، مگر میرا خدا ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اُس نے مجھے اُن کی ہر شرارت سے پہلے اُن کے فتنہ اور اس کے انجام کی خبر دی اور آخر وہی ہوا جو اُس نے ایک عرصہ پہلے مجھے بتلایا تھا اور کچھ وہ لوگ بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سعادت، خدا ترسی اور نورِ ایمان سے حصّہ دیا ہے۔ جنھوں نے مجھے پہچانا اور اُس نور کے لینے کے واسطے میرے گرد جمع ہو گئے جو مجھے خدا تعالیٰ نے اپنی بصیرت اور معرفت بخشی ہے۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے عالم ہیں۔ گریجویٹ ہیں، وکیل اور ڈاکٹر ہیں، معزز عہدہ داران گورنمنٹ ہیں۔ تاجر اور زمیندار ہیں اور عام لوگ بھی ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ نا اہل مخالف اتنا بھی تو نہیں کرتے کہ ایک حق بات جو ہم پیش کرتے ہیں۔ اُس کو آرام سے سن ہی لیں۔ اُن میں ایسے اخلاقِ فاضلہ کہاں؟ ورنہ حق پرستی کا تقاضا تو یہ ہے ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش گر نوشت است پند بر دیوار

مذہبِ حق اور توحید

اس زمانہ میں مذہب کے نام سے بڑی نفرت ظاہر کی جاتی ہے اور مذہبِ حقّہ کی طرف آنا، تو گویا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔ مذہبِ حق وہ ہے جس پر باطنی شریعت بھی شہادت دے اُٹھے۔ مثلاً ہم اسلام کے اصولِ توحید کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی حقانی تعلیم ہے کیونکہ انسان کی فطرت میں توحید کی تعلیم ہے اور نظارۂ قدرت بھی اس پر شہادت دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو متفرق پیدا کر کے وحدت ہی کی طرف کھینچا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت ہی منظور تھی۔ پانی کا ایک قطرہ اگر چھوڑیں۔ تو وہ گول ہوگا۔ چاند، سورج سب اجرام فلکی گول ہیں اور کرویت وحدت کو چاہتی ہے۔

تثلیث

ہم اس وقت بے انتہا خداؤں کا ذکر چھوڑ دیتے ہیں، کیونکہ یہ تو ہے بھی ایک بیہودہ اور بے معنی اعتقاد اور بے شمار خدا ماننے سے امان اُٹھ جاتا ہے، مگر ہم تثلیث کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم نے جیسا کہ قدرت کے نظائر سے ثابت کیا ہے کہ خدا ایک ہی ہے۔ اس طرح پر اگر خدا معاذ اللہ تین ہوتے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں تو چاہیے تھا کہ پانی، آگ کے شعلے اور زمین آسمان کے اجرام سب کے سب سہ گوشہ ہوتے تا کہ تثلیث پر گواہی ہوتی اور نہ انسانی نورِ قلب کبھی تثلیث پر گواہی دیتا ہے۔ پادریوں سے پوچھا ہے کہ جہاں انجیل نہیں گئی، وہاں تثلیث کا سوال ہوگا یا توحید کا، تو انھوں نے صاف اقرار کیا ہے کہ توحید کا، بلکہ ڈاکٹر فنڈر نے اپنی تصنیف میں یہ اقرار درج کر دیا ہے اب ایسی کھلی شہادت کے ہوتے پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ تثلیث کا عقیدہ کیوں پیش کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ سہ گوشہ خدا بھی عجیب ہیں ہر ایک

کے کام الگ الگ ہیں۔ گویا ہر ایک بجائے خود ناقص اور ناتمام ہے اور ایک دُوسرے کا مُتمّم ہے۔

مسیح کی الوہیت

اور مسیح جس کو خدا بنایا جاتا ہے۔ اس کی تو کچھ پُوچھو ہی نہیں۔ ساری عمر پکڑ دھکڑ میں گزری اور ابنِ آدم کو سر دھرنے کو جگہ ہی نہ ملی۔ اخلاق کا کوئی کامل نمونہ ہی موجود نہیں تعلیم ایسی ادھوری اور غیر مکتفی کہ اس پر عمل کر کے انسان بہت نیچے جا گرتا ہے۔

وہ کسی دوسرے کو اقتدار اور عزت کیا دے سکتا ہے۔ جو اپنی بےبسی کا خود شاکی ہے، اَوروں کی کیا سُن سکتا ہے۔ جس کی اپنی ساری رات کی گریہ وزاری اکارت گئی اور چلّا چلّا کر ایلی ایلی لما سبقتانی بھی کہا مگر شُنوائی ہی نہ ہوئی اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ آخر یہودیوں نے پکڑ کر صلیب پر لٹکا دیا اور اپنے اعتقاد کے موافق ملعون قرار دیا۔ خود عیسائیوں نے لعنتی مانا۔ مگر یہ کہہ دیا کہ ہمارے لیے لعنتی ہوا؛ حالانکہ لعنت ایسی چیز ہے کہ انسان اس سے سیاہ باطن ہو جاتا ہے اور وہ خدا سے دُور اور خدا اُس سے دُور ہو جاتا ہے۔ گویا خدا سے اس کا کچھ تعلق نہیں رہتا۔ اس لیے ملعُون شیطان کا نام بھی ہے۔ اب اس لعنت کو مان کر اور مسیح کو ملعُون قرار دے کر عیسائیوں کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے "لعنت نال لکھ نیتں رہندا" گلے پڑا ڈھول ہے جو یہ لوگ بجا رہے ہیں۔ غرض ان لوگوں کے عقائد کا کہاں تک ذکر کیا جاوے۔ حقیقت وہی ہے جو اسلام لے کر آیا اور خدا تعالیٰ نے مجھے مامُور کیا کہ مَیں اس نُور کو جو اسلام میں ملتا ہے۔ اُن کو جو حقیقت کے جویاں ہوں دکھاؤں۔ سچ یہی ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے اور میرا تو یہ مذہب ہے کہ اگر انجیل اور قرآن کریم اور تمام صُحفِ انبیاء بھی دُنیا میں نہ ہوتے تو بھی خدا تعالیٰ کی توحید ثابت تھی، کیونکہ اس کے نقوش فطرتِ انسانی میں موجُود ہیں۔

مسیح کی ابنیت

خدا کے لیے بیٹا تجویز کرنا گویا اللہ تعالیٰ کی موت کا یقین کرنا ہے۔ کیونکہ بیٹا تو اس لیے ہوتا ہے کہ وہ یادگار ہو۔ اب اگر مسیح خدا کا بیٹا ہے تو پھر سوال ہوگا کہ کیا خدا کو مرنا ہے؟ مختصر یہ ہے کہ عیسائیوں نے اپنے عقائد میں نہ خدا کی عظمت کا لحاظ رکھا اور نہ قوائے انسانی کی قدر کی ہے اور ایسی باتوں کو مان رکھا ہے کہ جن کے ساتھ آسمانی روشنی کی تائید نہیں ہے۔ ایک بھی عیسائی ایسا نظر نہ آیا جو خوارق دکھا سکے اور اپنے ایمان کو اُن نشانات سے ثابت کر سکے جو مومنوں کے ہوتے ہیں۔ یہ فضیلت اور فخر اسلام ہی کو ہے کہ ہر زمانہ میں تائیدی نشان اُس کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس زمانہ کو بھی خدا نے محروم نہیں رکھا۔ مجھے اِسی غرض کے لیے بھیجا ہے کہ اُن تائیدی نشانوں سے جو اسلام کا خاصہ ہے۔ اس زمانہ میں اسلام کی صداقت دُنیا پر ظاہر کروں۔ مُبارک وُہ جو ایک سلیم دل لے کر میرے پاس حق لینے کے لیے آتا ہے اور پھر مُبارک وُہ جو حق دیکھے تو اس کو قبول کرتا ہے[1]"

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۲۸، صفحہ ۳، ۴ پرچہ ۹؍ اگست ۱۹۰۰ء

جلسۃ الوداع کی تقریب پر حضرت اقدسؑ کی تقریر

بعثت کی غرض

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر سے زندہ اُتر آنے اور اس حادثہ سے بچ جانے کا قرآن شریف میں صحیح اور یقینی علم دیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ پچھلے ہزار برس میں جہاں اسلام پر اور بہت سی آفتیں آئیں۔ وہاں یہ مسئلہ بھی تاریکی میں پڑ گیا اور مُسلمانوں میں بدقسمتی سے یہ خیال راسخ ہوگیا کہ حضرت مسیحؑ زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں اور وہ قیامت کے قریب آسمان سے اُتریں گے، مگر اس چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے مجھے مامُور کر کے بھیجا تاکہ میں اندرونی طور پر جو غلطیاں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی ہیں، اُن کو دُور کروں اور اسلام کی حقیقت دُنیا پر ظاہر کروں اور بیرونی طور پر جو اعتراضات اسلام پر کئے جاتے ہیں۔ اُن کا جواب دُوں اور دُوسرے مذاہب باطلہ کی حقیقت کھول کر دکھاؤں۔ خصوصیت کے ساتھ وہ مذہب جو صلیبی مذہب ہے۔ یعنی عیسائی مذہب، اس کے غلط اعتقادات کا استیصال کروں جو انسان کے لیے خطرناک طور پر مُضر ہیں اور انسان کی رُوحانی قوتوں کے نشوونما اور ترقیات کے لیے ایک روک ہیں۔

عیسیٰ ابن مریم کے متعلق اصل حقائق

منجملہ اُن کے ایک یہی مسئلہ ہے جو مسیح کے آسمان پر جانے کے متعلق ہے اور جس میں بدقسمتی سے بعض مُسلمان بھی اُن کے شریک ہوگئے ہیں اسی ایک مسئلہ پر عیسائیت کا دار و مدار ہے کیونکہ عیسائیت کی نجات کا مدار اِسی صلیب پر ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ مسیح ہمارے لیے مصلوب ہوا اور پھر وہ زندہ ہو کر آسمان پر

---

[1] جن دنوں حضرت مسیح موعودؑ کتاب "مسیح ہندوستان میں" تالیف کر رہے تھے انہیں ایام میں معلوم ہوا کہ نصیبین (مُلک عراق عرب) میں حضرت مسیح ناصریؑ کے بعض آثار موجود ہیں۔ جن سے اُن کے اس سفر کا پتہ ملتا ہے اور تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کشمیر میں آکر رہے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے قرینِ مصلحت سمجھا تھا کہ ایک کمیشن (وفد) بھیجا جائے جو ان آثار و حالات کی خود تفتیش اور تحقیقات کرے اور پھر اُسی راستہ سے جو حضرت مسیحؑ نے کشمیر آنے کے لیے تجویز کیا تھا۔ واپس ہوتے ہوئے قادیان پہنچ جائے۔ اس وفد کو رخصت اور وداع کرنے کے لیے ایک جلسہ تجویز ہوا تھا جس کا نام جلسۃ الوداع رکھا گیا تھا۔ اگرچہ بعض پیش آمدہ امورِ ضروریہ کی وجہ سے اس کمیشن کا بھیجا جانا ملتوی ہوگیا۔ مگر یہ جلسہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ر نومبر ۱۸۹۹ء کو خوب دھوم دھام سے ہوا۔ اس میں آپؑ نے یہ تقریر فرمائی۔

چلا گیا۔ جو گویا اس کی خدائی کی دلیل ہے۔

جن مسلمانوں نے اپنی غلطی سے اُن لوگوں کا ساتھ دیا ہے۔ وہ یہ تو نہیں مانتے کہ مسیح صلیب پر مرگیا، مگر وہ اتنا ضرور مانتے ہیں کہ وُہ زندہ (بجسدِ عنصری) آسمان پر اٹھایا گیا ہے۔ لیکن جو حقیقت اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھولی ہے وہ یہ ہے کہ مسیحؑ ابنِ مریم اپنے ہمعصر یہودیوں کے ہاتھوں سخت ستایا گیا جس طرح پر راستباز لوگ اپنے زمانہ میں نادان مخالفوں کے ہاتھوں ستائے جاتے ہیں اور آخر بان یہودیوں نے اپنی منصوبہ بازی اور شرارتوں سے یہ کوشش کی کہ کسی طرح پر آپ کا خاتمہ کردیں اور آپ کو مصلوب کرادیں۔ بظاہر وہ اپنی ان تجاویز میں کامیاب ہوگئے کیونکہ حضرت مسیحؑ ابنِ مریم کو صلیب پر چڑھائے جانے کا حکم دیدیا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو اپنے راستبازوں اور ماموروں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ ان کو اس لعنت سے جو صلیب کی موت کے ساتھ وابستہ تھی بچالیا اور ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ وُہ اس صلیب پر سے زندہ اُتر آئے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے بہت سے دلائل ہیں جو خاص انجیل سے ہی مل سکتے ہیں، لیکن اس وقت ان کا بیان کرنا میری غرض نہیں ہے، جو شخص ان واقعات پر جو صلیب کے متعلق انجیل میں درج ہیں، غور کرے گا۔ تو ان کے پڑھنے سے اُسے صاف معلوم ہو جائے گا کہ حضرت مسیحؑ ابنِ مریم صلیب پر سے زندہ اُتر آتے تھے اور پھر یہ خیال کرکے کہ اس ملک میں اُن کے بہت سے دشمن تھے اور دشمن بھی وُہ جو اُن کے جانی دشمن تھے اور جیسا کہ وُہ پہلے کہہ چکے تھے کہ نبی بے عزت نہیں ہوتا، مگر اپنے وطن میں جس سے ان کی ہجرت کا پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس ملک کو چھوڑ دیں اور اپنے فرضِ رسالت کو پورا کرنے کے لیے وُہ بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں نکلے اور نصیبین کی طرف سے ہوتے ہوتے افغانستان کے راستہ کشمیر میں آکر بنی اسرائیل کو جو کشمیر میں موجود تھے، تبلیغ کرتے رہے اور اُن کی اصلاح کی اور آخر کار اُن میں ہی وفات پائی۔ یہ امر ہے جو مجھ پر کھولا گیا ہے۔

اس مسئلہ کی اہمیت

اس ایک مسئلہ سے ہی عیسائیت کا ستون ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ جب صلیب پر مسیحؑ کی موت ہی نہیں ہوتی اور وُہ تین دن کے بعد زندہ ہو کر آسمان پر گئے ہی نہیں، تو اُلوہیت اور کفارہ کی عمارت تو بیخ و بنیاد سے گر پڑی اور مسلمانوں کا غلط خیال (جس سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین ہوتی تھی کہ حضرت مسیحؑ زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں اور پھر دوبارہ نازل ہوں گے؛ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا یا پرانا نبی نہیں آسکتا جس کی نبوت پر آپؐ کی مُہر نہ ہو) بھی دُور ہوگیا۔ اور قرآن شریف کی اصل اور پاک تعلیم سچی ثابت ہوگئی۔ کیونکہ قرآن شریف میں تو مسیحؑ کا صاف اقرار فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کا موجود ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

وفاتِ مسیحؑ کے مسئلہ پر زور دینے کی وجہ

یہی وجہ ہے کہ ہم وفاتِ مسیحؑ کے مسئلہ پر زیادہ زور دیتے ہیں، کیونکہ اسی موت کے ساتھ عیسائی مذہب کی بھی

موت ہے اور اسی غرض سے میں نے کتاب "مسیح ہندوستان میں" لکھنی شروع کی ہے اور اس کتاب کے بعض مطالب کی تکمیل کے لیے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اپنی جماعت میں سے چند آدمیوں کو بھیجوں۔ جو اُن علاقہ جات میں جاکر اُن آثار کا پتہ لگائیں، جن کا وہاں موجود ہونا بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس غرض کو مدّنظر رکھ کر ہم نے یہ جلسہ کیا ہے تاکہ ان دوستوں کو رخصت کرنے کے لیے پہلے ہم سب مل کر اُن کے لیے دُعائیں کریں کہ وُہ خیر و عافیت کے ساتھ اس مبارک سفر کے لیے رخصت ہوں اور کامیاب ہو کر واپس آئیں۔

حضرت مسیح کا واقعۂ صلیب کے بعد نصیبین جانا

اگرچہ میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ سفر جو تجویز کیا گیا ہے۔ اگر نہ بھی کیا جاتا، تو بھی خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس قدر شواہد اور دلائل ہم کو اس امر کے لیے دیدیئے ہیں جن کو مخالف کا قلم اور زبان توڑ نہیں سکتی، لیکن مومن ہمیشہ ترقیات کی خواہش کرتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ حقائق اور معارف کا بھوکا پیاسا ہوتا ہے۔ کبھی ان سے سیر نہیں ہوتا۔ اس لیے ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ جس قدر ثبوت اور دلائل اور مل سکیں۔ وہ اچھا ہے۔ اسی مقصد کے لیے یہ تقریب پیش آئی ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو نصیبین کی طرف بھیجتے ہیں۔ جس کے متعلق ہمیں پتہ ملا ہے کہ وہاں کے حاکم نے حضرت مسیحؑ کو (جبکہ وہ اپنی ناشکرگزار قوم کے ہاتھ سے تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ لکھا تھا کہ آپ میرے پاس چلے آئیے اور واقعہ صلیب سے بچ جانے کے بعد اس مقام پر پہنچ کر انہوں نے بدقسمت قوم کے ہاتھ سے نجات پائی۔ وہاں کے حاکم نے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ میرے پاس آجائیں گے تو آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کروں گا اور میں بیمار ہوں میرے لیے دُعا بھی کریں) اگرچہ یہ امر ہمیں ایک انگریزی کتاب سے معلوم ہوا ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ روضۃ الصفا جو ایک اسلامی تاریخ ہے۔ اس قسم کا مفہوم اس سے بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ یقین ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نصیبین میں ضرور آئے اور اسی راستے سے وہ ہندوستان کو چلے آئے۔ سارا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے لیکن ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے کہ اس سفر سے انشاء اللہ حقیقت کھل جائے گی اور اصل معاملہ صاف ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ اس سفر میں ایسی تحریریں پیش ہو جاویں یا ایسے کتبے نکل آویں، جو حضرت مسیحؑ کے اس سفر کے متعلق بعض اُمور پر روشنی ڈالنے والے ہوں یا حواریوں میں سے کسی کی قبر کا کوئی پتہ چل جائے یا اور اس قسم کے بعض امور نکل آویں، جو ہمارے اس مقصد میں مؤیّد ثابت ہو سکیں، اس لیے میں نے اپنی جماعت میں سے تین آدمیوں کو اس سفر کے لیے تیار کیا ہے۔ اُن کے لیے ایک عربی تصنیف بھی میں کرنی چاہتا ہوں، جو بطور تبلیغ کے ہو اور جہاں جہاں وُہ جاویں۔ اس کو تقسیم کرتے رہیں اس طرح اس سفر سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہمارے سلسلہ کی اشاعت بھی ہوتی جائے گی۔

ایک مخلص اور وفادار جماعت

اور میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایک مخلص اور وفادار جماعت عطا کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جس کام

اور مقصد کے لیے مَیں اُن کو بُلاتا ہوں۔ نہایت تیزی اور جوش کے ساتھ ایک دُوسرے سے پہلے اپنی ہمت اور توفیق کے موافق آگے بڑھتے ہیں اور مَیں دیکھتا ہوں کہ اُن میں ایک صدق اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ میری طرف سے کسی امر کا ارشاد ہوتا ہے اور وہ تعمیل کے لیے تیار۔

حقیقت میں کوئی قوم اور جماعت تیار نہیں ہو سکتی۔ جبتک کہ اُس میں اپنے امام کی اطاعت اور اتباع کے لیے اس قسم کا جوش اور اخلاص اور وفا کا مادہ نہ ہو۔ حضرت مسیح کو جو مشکلات اور مصائب اٹھانے پڑے۔ اُن کے عوارض اور اسباب میں سے جماعت کی کمزوری اور بیدلی بھی تھی ، چنانچہ جب اُن کو گرفتار کیا گیا، تو پطرس جیسے اعظم الحواریین نے اپنے آقا اور مرشد کے سامنے انکار کر دیا اور نہ صرف انکار کیا ، بلکہ تین مرتبہ لعنت بھی بھیجدی۔ اور اکثر حواری ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے وُہ صدق و وفا کا نمونہ دکھایا ، جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ انھوں نے آپ کی خاطر ہر قسم کا دُکھ اُٹھانا سہل سمجھا۔ یہانتک کہ عزیز وطن چھوڑ دیا اپنے املاک و اسباب اور احباب سے الگ ہو گئے اور بالآخر آپ کی خاطر جان تک دینے سے تامل اور افسوس نہیں کیا۔ یہی صدق اور وفا تھی جنے اُن کو آخر کار بامُراد کیا۔ اسی طرح مَیں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری جماعت کو بھی اس کی قدر اور مرتبہ کے موافق ایک جوش بخشا ہے اور وُہ وفاداری اور صدق کا نمونہ دکھاتے ہیں۔ جس دن سے مَیں نے نصیبین کی طرف ایک جماعت کے بھیجنے کا ارادہ کیا ہے۔ ہر ایک شخص کوشش کرتا ہے کہ اس خدمت پر مامور کیا جاتے اور دوسرے کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور آرزو کرتا ہے کہ اس کی جگہ اگر اس کو بھیجا جائے۔ تو اُس کی بڑی ہی خوش قسمتی ہے۔ بہت سے احباب نے اس سفر پر جانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا ، لیکن میں اُن درخواستوں سے پہلے مرزا خدابخش صاحب کو اس سفر کے واسطے منتخب کر چکا تھا اور مولوی قطب الدین اور میاں جمال دین کو ان کے ساتھ جانے کے واسطے تجویز کر لیا تھا۔ اس واسطے مجھے ان احباب کی درخواستوں کو رد کرنا پڑا۔ تاہم مَیں جانتا ہوں کہ وُہ لوگ جنھوں نے بعد شکل اور سچے اخلاص کے ساتھ اپنے آپ کو اس خدمت کیلئے پیش کیا ہے اللہ تعالیٰ اُن کی پاک نیتوں کے ثواب کو ضائع نہیں کرے گا اور وُہ اپنے اخلاص کے موافق اَجر پائیں گے۔

خدا تعالیٰ کی خاطر سفر کی عظمت

دُور دراز بلاد اور ممالکِ غیر کا سفر آسان امر نہیں ہے، اگرچہ یہ سچ ہے کہ اس وقت سفر آسان ہو گئے ہیں، لیکن پھر بھی یہ کس کو علم ہو سکتا ہے، کہ اس سفر سے کون زندہ آئے گا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بیویوں اور دُوسرے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر جانا کوئی سہل بات نہیں۔ اپنے کاروبار اور معاملات کو ابتری اور پریشانی کی حالت میں چھوڑ کر ان لوگوں نے اس سفر کو اختیار کیا ہے اور انشراحِ صدر سے اختیار کیا ہے، جس کے لیے مَیں یقین رکھتا ہوں کہ بڑا ثواب ہے۔ ایک تو سفر کا ثواب ہے، کیونکہ یہ سفر محض خدا تعالیٰ کی عظمت اور توحید کے اظہار کے واسطے ہے۔

دُوسرے اس سفر میں جو مشقتیں اور تکالیف ان لوگوں کو اٹھانی پڑیں گی، ان کا بھی ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا، جبکہ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال: ۸) کے موافق وہ کسی کی ذرہ بھر نیکی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، تو اتنا بڑا سفر جو اپنے اندر ہجرت کا نمونہ رکھتا ہے۔ اس کا اجر کبھی ضائع ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ صدق اور اخلاص ہو۔ ریا اور دُوسرے اغراض شہرت و نمود کے نہ ہوں اور میں جانتا ہوں کہ بر و بحر کے شدائد و مصائب کو برداشت کرنا اور ایک موت کو قبول کر لینا بجز صدق کے نہیں ہو سکتا۔ بہت سے بھائی اُن کے لیے دُعائیں کرتے رہیں گے اور میں بھی ان کے واسطے دعاؤں میں مصروف رہوں گا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اس مقصد میں کامیاب کرے اور خیر و عافیت سے واپس لا دے اور سچ تو یہ ہے کہ ملائکہ بھی ان کے واسطے دُعائیں کریں گے اور وُہ اُن کے ساتھ ہوں گے۔

جماعت کی مروّت اور ہمّت

اب میں یہ بھی ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اس موقعہ پر ہماری جماعت نے دو قسم کی مروّت اور ہمّت دکھائی ہے۔ ایک تو یہ گروہ ہے جنھوں نے سفر اختیار کیا اور اپنے آپ کو سفر کے خطرات میں ڈالا ہے اور ان مصائب اور شدائد کے برداشت کرنے کو تیار ہو گئے ہیں جو اس راہ میں انھیں پیش آئیں گی۔ دُوسرا وہ گروہ ہے جنھوں نے میری دینی اغراض و مقاصد میں ہمیشہ دل کھول کر چندے دیئے ہیں۔ میں کچھ ضرورت نہیں سمجھتا کہ تفصیل کروں، کیونکہ ہر شخص کم و بیش اپنی استطاعت اور مقدرت کے موافق حصّہ لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کس اخلاص اور وفاداری سے ان چندوں میں شریک ہوتے ہیں۔ میں یہ خوب جانتا ہوں کہ ہماری جماعت نے وُہ صدق اور وفا دکھایا ہے جو صحابہؓ ساعت العُسرہ میں دکھاتے تھے۔ اگرچہ اشتہار میں میں نے چند دوستوں کے نام لکھے ہیں، جنھوں نے اپنے صدق و ہمّت کا نمونہ دکھایا ہے، لیکن اس سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ میں دُوسروں سے بے خبر ہوں یا اُن کی خدمات کو قابلِ قدر نہیں سمجھتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کون سرگرمی اور اخلاص کے ساتھ میری راہ میں دوڑتا ہے۔ میں چونکہ بیمار تھا اور ابھی تک طبیعت ناساز ہے، اس لیے میں پوری تفصیل نہ دے سکا اور نہ مختصر سے اشتہار میں اتنی تفصیل ہو سکتی تھی۔ پس جن لوگوں کے نام درج نہیں ہوتے۔ اُن کو افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے صدق اور اخلاص کو خُوب جانتا ہے۔

مالی قربانی محض لِلّٰہ ہو

اگر کوئی شخص اس غرض کیلئے چندہ دیتا ہے یا ہماری دینی ضروریات میں شریک ہوتا ہے کہ اُس کا نام شائع کیا جائے، تو یقیناً سمجھو کہ وُہ دُنیا کی شہرت اور نام و نمود کا خواہشمند ہے، لیکن جو شخص محض اللہ تعالیٰ کے لیے اس راہ میں قدم رکھتا ہے اور خدمتِ دین کے لیے کمربستہ ہوتا ہے، اُس کو اس بات کی کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ دُنیا کے نام کچھ حقیقت اور اثر اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں۔ نام وہی بہتر ہوتے ہیں، جو آسمان پر رکھے جائیں۔ کاغذات کا کیا اثر ہے۔ ایک دن ہوتے ہیں اور دُوسرے دن ضائع ہو جاتے

ہیں، لیکن جو کچھ آسمان پر لکھا جاتا ہے وہ کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ اس کا اثر ابدالآباد کے لیے ہوتا ہے۔ میرے بہت سے مخلص احباب ایسے ہیں جن کو تم میں سے شاید بہت ہی کم جانتے ہوں، لیکن انھوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ مثلاً میں نظیر کے طور پر کہتا ہوں کہ میرزا یوسف بیگ صاحب میرے بہت ہی مخلص اور صادق دوست ہیں۔ میں نے اُن کا ذکر اس واسطے کیا ہے کہ اس طرح پر بھائیوں میں باہم تعارف بڑھتا ہے اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ میرزا صاحب اس وقت سے میرے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جبکہ مَیں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اُن کا دل محبت اور اخلاص سے بھرا ہوا ہے اور وُہ ہر وقت سلسلہ کی خدمت کے لیے اپنے اندر ایک جوش رکھتے ہیں۔ ایسا ہی اور بہت سے عزیز دوست ہیں اور سب اپنے اپنے ایمان اور معرفت کے موافق اخلاص اور جوشِ محبت سے لبریز ہیں۔

جبتک ایمان قوی نہ ہو کچھ نہیں ہوتا

اگرچہ مَیں جانتا ہوں کہ اعمال کی توفیق رفتہ رفتہ ملتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جبتک ایمان قوی نہ ہو کچھ نہیں ہوتا۔ جس قدر ایمان قوی ہوتا ہے اسی قدر اعمال میں بھی قوت آتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ قوتِ ایمانی پورے طور پر نشوونما پا جاوے تو پھر ایسا مومن شہید کے مقام پر ہوتا ہے، کیونکہ کوئی امر اس کے سدِّراہ نہیں ہو سکتا۔ وُہ اپنی عزیز جان تک دینے میں بھی تامل اور دریغ نہ کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآنِ کریم کے نزول کی غرض

مَیں نے کئی دفعہ اس سے پہلے بھی بیان کیا ہے اور اب بھی اس کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے، اس لیے مَیں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو انبیاءؑ کو بھیجتا ہے اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے دُنیا کی ہدایت کے واسطے بھیجا اور قرآن مجید کو نازل فرمایا تو اس کی غرض کیا تھی؟ ہر شخص جو کام کرتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے۔ ایسا خیال کرنا کہ قرآن شریف نازل کرنے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض اور مقصد نہیں ہے، کمال درجہ کی گستاخی اور بے ادبی ہے۔ کیونکہ اس میں (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کی طرف ایک فعلِ عبث کو منسوب کیا جائے گا؛ حالانکہ اس کی ذات پاک ہے (سُبحانہٗ وتعالیٰ شانہٗ)

پس یاد رکھو کہ کتابِ مجید کے بھیجنے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ تا دُنیا پر عظیم الشان رحمت کا نمونہ دکھاوے۔ جیسے فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) اور ایسا ہی قرآن مجید کے بھیجنے کی غرض بتائی کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ: ۳) یہ ایسی عظیم الشان اغراض ہیں کہ اُن کی نظیر نہیں پائی جا سکتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ جیسے تمام کمالاتِ متفرقہ جو انبیاءؑ میں تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں جمع کر دیئے اسی طرح تمام خوبیاں اور کمالات جو متفرق کتابوں میں تھے، وہ قرآن شریف میں جمع کر دیئے۔ اور ایسا ہی جس قدر کمالات تمام اُمتوں میں تھے وُہ اس اُمت میں جمع کر دیئے پس خدا تعالیٰ چاہتا

ہے کہ ہم ان کمالات کو پالیں اور یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ جیسے وہ عظیم الشان کمالات ہم کو دینا چاہتا ہے، اُسی کے موافق اس نے ہمیں قویٰ بھی عطا کیے ہیں۔ کیونکہ اگر اس کے موافق قویٰ نہ دیئے جاتے، تو پھر ہم ان کمالات کو کسی صورت اور حالت میں پا ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک گروہ کی دعوت کرے، تو ضرور ہے کہ وہ اُس گروہ کی تعداد کے موافق کھانا تیار کرے اور اُسی کے موافق ایک مکان ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ دعوت تو ایک ہزار آدمی کی کرے اور اُن کے بٹھانے کے واسطے ایک چھوٹی سی کُٹیا بنا دے۔ نہیں۔ بلکہ وہ اُس تعداد کا پُورا لحاظ رکھے گا۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ کی کتاب بھی ایک دعوت اور ضیافت ہے جس کے لیے کُل دُنیا کو بلایا گیا ہے۔ اس دعوت کے لیے خدا تعالیٰ نے جو مکان تیار کیا ہے وُہ انسانی قویٰ ہیں۔ جو اُن لوگوں کو دیئے گئے ہیں جو اس امّت میں ہیں۔ قویٰ کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اب اگر بَیل، کتّے یا کسی اور جانور کے سامنے قرآن کی تعلیمات کو پیش کریں تو وُہ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے کہ اُن میں وُہ قویٰ نہیں ہیں جو قرآن کریم کی تعلیمات کو برداشت کر سکیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو وُہ قویٰ دیئے ہیں کہ ہم اُن سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ خاتم النبیین

ہمیں اللہ تعالیٰ نے وہ نبیؐ دیا، جو خاتَم المؤمنینؐ، خاتَم العارفینؐ اور خاتَم النبیینؐ ہے اور اسی طرح پر وہ کتاب اس پر نازل کی جو جامع الکُتب اور خاتَم الکُتب ہے۔ رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتَم النبیین ہیں اور آپؐ پر نبوّت ختم ہوگئی۔ تو یہ نبوّت اس طرح پر ختم نہیں ہوئی جیسے کوئی گلا گھونٹ کر ختم کر دے۔ ایسا ختم قابلِ فخر نہیں ہوتا، بلکہ رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت ختم ہونے سے یہ مُراد ہے کہ طبعی طور پر آپؐ پر کمالاتِ نبوّت ختم ہوگئے۔ یعنی وہ تمام کمالاتِ متفرقہ جو آدمؑ سے لے کر مسیحؑ ابن مریمؑ تک نبیوں کو دیئے گئے تھے کسی کو کوئی اور کسی کو کوئی۔ وہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع کر دیئے گئے اور اس طرح پر طبعاً آپؐ خاتَم النبیین ٹھہرے اور ایسا ہی وہ جمیع تعلیمات، وصایا اور معارف جو مختلف کتابوں میں چلے آتے ہیں، وہ قرآن شریف پر آکر ختم ہوگئے اور قرآن شریف خاتَم الکُتب ٹھہرا۔

ہم بصیرتِ تام سے رسُول اللہ کو خاتَم النبیین مانتے ہیں

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتَم النبیین نہیں مانتے۔ یہ ہم پر افترائے عظیم ہے۔ ہم جس قوّتِ یقین، معرفت اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتَم الانبیاء مانتے اور یقین کرتے ہیں، اس کا لاکھواں حصّہ بھی دُوسرے لوگ نہیں مانتے۔ اور ان کا ایسا ظرف ہی نہیں ہے۔ وُہ اس حقیقت اور راز کو جو خاتَم الانبیاء کی ختمِ نبوّت میں ہے، سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ انھوں نے صرف باپ دادا سے ایک لفظ سُنا ہوا ہے، مگر اُس کی حقیقت سے بے خبر

ہیں اور نہیں جانتے کہ ختمِ نبوت کیا ہوتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا مفہوم کیا ہے؟ مگر ہم بصیرتِ تام سے (جس کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے ہم پر ختمِ نبوت کی حقیقت کو ایسے طور پر کھول دیا ہے کہ اس عرفان کے شربت سے جو ہمیں پلایا گیا ہے ایک خاص لذّت پاتے ہیں جس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا بجز اُن لوگوں کے جو اس چشمہ سے سیراب ہوں۔

دُنیا کی مثالوں میں سے ہم ختمِ نبوت کی مثال اس طرح پر دے سکتے ہیں کہ جیسے چاند ہلال سے شروع ہوتا ہے اور چودھویں تاریخ پر آکر اُس کا کمال ہو جاتا ہے جبکہ اُسے بدر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے۔ جو لوگ یہ مذہب رکھتے ہیں کہ نبوت زبردستی ختم ہو گئی اور آنحضرتؐ کو یونسؑ بن متّٰیؑ پر بھی ترجیح نہیں دینی چاہیے۔ اُنھوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہی نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور کمالات کا کوئی علم ہی اُن کو نہیں ہے۔ باوجود اس کمزوریِ فہم اور کمی علم کے ہم کو کہتے ہیں کہ ہم ختمِ نبوت کے منکر ہیں۔ مَیں ایسے مریضوں کو کیا کہوں اور اُن پر کیا افسوس کروں۔ اگر اُن کی یہ حالت نہ ہو گئی ہوتی اور وہ حقیقتِ اسلام سے بکلّی دُور نہ جا پڑے ہوتے، تو پھر میرے آنے کی ضرورت کیا تھی؟ ان لوگوں کی ایمانی حالتیں بہت کمزور ہو گئی ہیں اور وہ اسلام کے مفہوم اور مقصد سے محض ناواقف ہیں؛ ورنہ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اہلِ حق سے عداوت کرتے جس کا نتیجہ کافر بنا دیتا ہے۔

اعمالِ صالحہ کی پہچان

یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ ہم میں کون سی بات اسلام کے خلاف ہے۔ ہم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے کے دنوں میں روزے بھی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ اُن کے تمام اعمال، اعمالِ صالحہ کے رنگ میں نہیں ہیں، بلکہ محض ایک پوست کی طرح ہیں جس میں مغز نہیں ہے؛ ورنہ اگر یہ اعمالِ صالحہ ہیں تو پھر ان کے پاک نتائج کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ اعمالِ صالحہ تو تب ہو سکتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے فساد اور ملاوٹ سے پاک ہوں لیکن اُن میں یہ باتیں کہاں ہیں؟ مَیں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ ایک شخص مومن اور متقی ہو اور اعمالِ صالحہ کرنے والا ہو اور وہ اہلِ حق کا دشمن ہو؛ حالانکہ یہ لوگ ہم کو بے قید اور دہریہ کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ مَیں نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر بیان کیا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے مامور کر کے بھیجا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی کچھ عظمت اُن کے دل میں ہوتی، تو وہ انکار نہ کرتے اور اس سے ڈر جاتے کہ ایسا نہ ہو کہ ہم خدا تعالیٰ کے نام کی تخفیف کرنے والے ٹھہریں، لیکن یہ تب ہوتا جبکہ اُن میں حقیقی اور اصل ایمان اللہ تعالیٰ پر ہوتا اور وہ یوم الجزاء سے ڈرتے اور لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل: ۳۷) پر اُن کا عمل ہوتا۔

اولیاء اللہ کا انکار سلبِ ایمان کا موجب ہو جاتا ہے

اُن کی دماغی قوت اور ایمانی طاقت نے تو یہاں تک اُنہیں پہنچا دیا ہے کہ وہ

کہتے ہیں کہ نبی کا منکر تو کافر ہوتا ہے، مگر ولی کے انکار سے کفر کیونکر لازم آتا ہے۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص کے انکار سے کیا حرج ؟ یہ لوگ انکارِ اولیاء اللہ کو معمولی بات سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے کیا بگڑتا ہے ؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ اولیاء اللہ کا انکار سلبِ ایمان کا مُوجب ہو جاتا ہے۔ جو شخص اس معاملہ میں غور کرے گا، اسے اچھی طرح نظر آجائے گا، بلکہ ایسے طور پر نظر آجائے گا، جیسے شیشہ میں کوئی شکل دیکھ لیتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ سلبِ ایمان دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک تو انبیاء کے انکار سے، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں اور یہ مسلّم بات ہے۔ دُوسرا اولیاء اللہ اور مامُورین کے انکار سے سلبِ ایمان ہوتا ہے۔

انبیاء کے انکار سے سلبِ ایمان تو بالکل واضح امر ہے اور سب جانتے ہیں، لیکن پھر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انبیاء کے انکار سے سلبِ ایمان اس لیے ہوتا ہے کہ نبی کہتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں یہ میرا قول ہے۔ یہ میرا نبی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ میری کتاب کو مانو اور میرے احکام پر عمل کرو۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان نہیں لاتا اور اُن وصایا اور حُدود پر جو اس میں بیان کئے گئے ہیں، عمل نہیں کرتا ہے۔ وہ اُن سے منکر ہو کر کافر ہو جاتا ہے۔

لیکن وُہ صورت جس سے اولیاء اللہ کے انکار سے سلبِ ایمان ہوتا ہے، اور ہے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : مَنْ عَادَ لِیْ وَلِیًّا فَاٰذَنْتُہٗ لِلْحَرْبِ۔ یعنی جو شخص میرے وَلی کے ساتھ دشمنی کرتا ہے، وہ گویا میرے ساتھ جنگ کرنے کو تیار ہوتا ہے۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہو اور محبت بھی ایسی جیسے کوئی اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ اور ایک دُوسرا شخص بار بار کہے کہ یہ شخص مَر جائے یا اُس کی نسبت اور اسی قسم کی دلآزاری کی باتیں کہے اور اُسے تکلیف دے تو وُہ شخص ایسی باتوں سے کیونکر خوش ہو سکتا ہے اور وُہ باپ جس کے بچّے کے لیے کوئی شخص بددُعائیں کر رہا ہو یا دیگر رنجدہ کلمات اُس کے بچّے کی نسبت استعمال کر رہا ہو ایسے شخص سے کب محبت کر سکتا ہے ؟ اسی طرح پر اولیاء اللہ بھی اطفال اللہ کا رنگ رکھتے ہیں، کیونکہ اُنھوں نے جسمانی بلوغ کا چولا اُتارا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت میں پرورش پاتے ہیں۔ وہ خود اُن کا متوّلی، متکفّل اور اُن کے لیے غیرت رکھنے والا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص (خواہ وہ کیسا ہی نماز، روزہ رکھنے والا ہو) اُن کی مخالفت کرتا ہے اور ان کے دُکھ دینے پر کمربستہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش مارتی ہے اور اُن مخالفت کرنے والوں پر اُس کا غضب بھڑکتا ہے۔ اس لیے کہ اُنھوں نے اُس کے ایک محبُوب کو دُکھ دینا چاہا ہے۔ اس وقت پھر نہ وُہ نماز کام آتی ہے اور نہ وہ روزہ۔ کیونکہ نماز اور روزہ کے ذریعہ سے اُسی ذات کو خوش کرنا تھا جس کو ایک دُوسرے فعل سے ناراض کر لیا ہے۔ پھر وُہ رضا کا مقام کیونکر ملے۔ جبتک غضبِ الٰہی دُور نہ ہو۔ وُہ اولیاء اللہ کا مخالف نادان اُن اسبابِ غضب سے ناواقف ہوتا ہے، بلکہ

اپنے نماز روزہ پر اسے ایک ناز اور گھمنڈ ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا غضب دن بدن بڑھتا جاتا ہے اور وہ بجائے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے دن بدن اللہ تعالیٰ سے دُور ہٹتا جاتا ہے یہانتک کہ بالکل راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے وہ شخص جو بالکل فنا کی حالت میں ہے اور آستانۂ الوہیت پر گرا ہوا ہے اور آغوشِ ربوبیت میں پرورش پا رہا ہے اور خدا تعالیٰ کی رحمت نے اُسے ڈھانپ لیا ہے۔ یہانتک کہ اسکا بات کرنا خدا تعالیٰ کا بات کرنا ہوتا ہے اور اُس کا دوست خدا کا دوست اور اُس کا دشمن خدا کا دشمن ہو جاتا ہے۔ پس ایسے مومنِ کامل کا دشمن رہ کر کوئی شخص کیونکر مومنِ کامل ہو سکتا ہے اور ایسے ہی مومنِ کامل کی دشمنی سے اس کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اور اُسے مغضوب علیہم میں سے بنا دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے ماموروں اور اولیاء اللہ کی مخالفت اور اُن کی ایذا رسانی کبھی اچھا پھل نہیں دے سکتی۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اُن کو ستا کر اور دُکھ دے کر بھی آرام پا سکتا ہوں وہ سخت غلطی کرتا ہے اور اُس کا نفس اُسے دھوکا دے رہا ہے۔

دُوسری وجہ سلبِ ایمان کی یہ ہوتی ہے کہ ولی اللہ خدا تعالیٰ کے مقرب ہوتے ہیں، کیونکہ ولی کے معنے قریب کے ہیں۔ یہ لوگ گویا اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھتے ہیں اور دُوسرے لوگ ایک محجوب کی طرح ہوتے ہیں، جن کے سامنے ایک دیوار حائل ہو۔ اب یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں، کیونکہ ایک تو اُن میں سے ایسا ہے کہ جس کے سامنے کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے اُسے آنکھیں دے دی ہیں اور اُسے ایسی بصیرت عطا کی ہے کہ اُس کا ہر قول و فعل علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے۔ اعمیٰ کی طرح نہیں، جو ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے اور ٹکریں مارتا رہتا ہے، بلکہ اُس کے دل پر تو خدا تعالیٰ کا نزول ہوتا ہے اور ہر قدم پر وُہی اس کا رہنما اور متکفل بن جاتا ہے۔ شیطان کی شرارت کی تاریکی اُس کے نزدیک نہیں آ سکتی، بلکہ ظلمت جل کر بالکل بھسم ہو جاتی ہے اور اُسے سب کچھ روشن نظر آتا ہے۔ وہ جو کچھ بیان کرتا ہے وہ حقائق اور معارف ہوتے ہیں۔ وہ احادیث شریفہ کی جو تاویل کرتا ہے، وہ صحیح ہوتی ہے، کیونکہ وہ براہِ راست بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن لیتا ہے اور اس طرح وُہ اس کی اپنی روایت ہوتی ہے؛ حالانکہ دوسرے لوگوں کو تیرہ سو برس کے وسائط سے کہنا پڑتا ہے۔ پھر ان ہر دو میں کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ ولی اللہ کا سارا ذخیرہ پاک معارف اور نُور ہوتا ہے، لیکن جو شخص اس سے عداوت کرتا ہے، وہ اس کی ہر بات کی تکذیب کرتا ہے۔ گویا کہ وہ یہ شرط کر لیتا ہے کہ وُہ ولی اللہ کے ہر نکتۂ معرفت کا انکار کرے گا۔ پھر وُہ اس کی ہر بات کا انکار کرتا رہتا ہے۔ اس طرح پر اس کی ایمانی عرفانی دیوار کی اینٹیں گرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ جب ایک شخص صراطِ مستقیم بتلا رہا ہے اور معارف اور حقائق کھول کھول کر بیان کر رہا ہے اور دُوسرا شخص اُس کی تکذیب کرتا ہے۔ اس مقابلہ میں انجام کار نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی کہ (مؤخر الذکر) قرآن شریف کے عقائد کے مجموعہ کی تکذیب کرتا ہے۔ کرتا رہے گا اور اسی لیے وُہ خدا تعالیٰ کا بھی منکر ہو جاتا ہے اور اس طرح اُس کا ایمان سلب ہو جائے گا۔

غرض اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اولیاء اللہ کے انکار سے سلبِ ایمان ہو جاتا ہے۔ اس لیے

اولیاء اللہ کے انکار سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ یہودیوں پر جو آفت آئی اور وہ مغضوب ہوگئے۔ اس کی بھاری وجہ یہی تھی کہ وہ خدا تعالیٰ کے ماموروں اور مرسلین سے انکار کرتے رہے اور ہمیشہ اُن کی مخالفت اور ایذا رسانی میں حصہ لیتے رہے جس کا انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر نازل ہوا۔

آنحضرتؐ کے خاتم النّبیین ہونے کا ایک اور پہلو

پھر میں اپنے پہلے کلام کی طرف رجوع کرکے کہتا ہوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اس اُمت میں بڑی بڑی استعدادیں رکھ دی ہیں۔ یہاں تک کہ عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ بھی حدیث میں آیا ہے؛ اگرچہ محدثین کو اس پر جرح ہو، مگر ہمارا نورِ قلب اس حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے اور ہم بغیر چُون وچرا کے اس کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی بزرگ نے بذریعہ کشف بھی اس حدیث کا انکار نہیں کیا، بلکہ اگر کچھ کیا ہے تو تصدیق ہی کی ہے۔ اس حدیث کے یہ معنے نہیں کہ میری اُمت کے عُلماء ظاہری بنی اسرائیل کے نبیوں جیسے ہیں۔ عُلماء کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ بعض لوگ الفاظ پر اَڑ بیٹھتے ہیں اور اُن کے معانی کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ قرآن شریف کی تفسیر میں مقابلہ نہیں کر سکتے۔

عالمِ ربانی کی تعریف

یاد رکھو کہ عالمِ ربانی سے یہ مُراد نہیں ہوا کرتی کہ وہ صَرف ونحو یا منطق میں بے مثل ہو بلکہ عالمِ ربانی سے مُراد وہ شخص ہوتا ہے جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اُس کی زبان بیہودہ نہ چلے، مگر موجودہ زمانہ اس قسم کا آگیا ہے کہ مُردہ شو تک بھی اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں اور اس لفظ کو اپنی ذات میں داخل کرلیا ہے۔ اس طرح پر اس لفظ کی بڑی تحقیر ہوئی ہے اور خدا تعالیٰ کے منشاء اور مقصد کے خلاف اس کا مفہوم لے لیا گیا ہے؛ ورنہ قرآن شریف میں تو علماء کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۹) یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے۔ اللہ تعالیٰ کے وہ بندے ہیں جو عُلماء ہیں۔ اب یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ جن لوگوں میں یہ صفات خوف وخشیّت اور تقویٰ اللہ کی نہ پائی جائیں وہ ہرگز ہرگز اس خطاب سے پُکارے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔

اصل میں عُلماء عالِم کی جمع ہے اور علم اس چیز کو کہتے ہیں جو یقینی اور قطعی ہو اور سچا علم قرآن شریف سے ملتا ہے۔ یہ نہ یونانیوں کے فلسفہ سے ملتا ہے۔ نہ حال کے انگلستانی فلسفہ سے، بلکہ یہ سچا ایمانی فلسفہ قرآن کریم کے طفیل سے ملتا ہے۔ مومن کا کمال اور معراج یہی ہے کہ وہ علماء کے درجہ پر پہنچے اور اُسے حق الیقین کا وہ مقام حاصل ہو جو علم کا انتہائی درجہ ہے، لیکن جو لوگ علوم حقہ سے بہرہ وَر نہیں ہیں اور معرفت اور بصیرت کی راہیں اُن پر کُھلی ہوئی نہیں ہیں وُہ گو اپنے مُنہ سے اپنے آپ کو عالِم کہیں مگر فی الحقیقت ایسے لوگ علم کی خوبیوں اور صفات سے بالکل

بے بہرہ ہیں اور وہ روشنی اور نور جو حقیقی علم سے ملتا ہے۔ اُن میں بالکل پایا نہیں جاتا، بلکہ ایسے لوگ سراسر خسارہ اور نقصان میں ہیں۔ یہ اپنی آخرت دُخان اور تاریکی سے بھر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل: ۷۳) جو آدمی اس دُنیا میں اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا اُٹھایا جائے گا یعنی جس کو یہاں علم بصیرت اور معرفت نہیں دی گئی، اُسے وہاں کیا علم ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والی آنکھ اِسی دُنیا سے لے جانی پڑتی ہے۔ جو آدمی یہاں ایسی آنکھ پیدا نہیں کرتا، اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کو آخرت کے دن دیکھ لے گا۔

لیکن جن لوگوں کو سچی معرفت اور بصیرت دی جاتی ہے اور وہ علم، جس کا نتیجہ خشیتہ اللہ ہے، عطا کیا جاتا ہے۔ وُہ وہی لوگ ہیں جن کو اِس حدیث میں انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

سچے علوم کا سرچشمہ قرآن مجید ہے

اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سچے علوم کا منبع اور سرچشمہ قرآنِ شریف میں اس اُمت کو دیا ہے۔ جو شخص ان حقائق اور معارف کو پالیتا ہے، جو قرآنِ شریف میں بیان کیے گئے ہیں اور جو محض حقیقی تقویٰ اور خشیتہ اللہ سے حاصل ہوتے ہیں، اُسے وُہ علم ملتا ہے جو اس کو انبیاء بنی اسرائیل کا مثیل بنا دیتا ہے۔ ہاں یہ بات بالکل سچ ہے کہ ایک شخص کو جو ہتھیار دیا گیا ہے اگر وُہ اُس سے کام نہ لے تو یہ اُس کا اپنا قصور ہے نہ کہ اس ہتھیار کا۔ اس وقت دُنیا کی یہی حالت ہو رہی ہے۔ مُسلمانوں نے باوجودیکہ قرآنِ شریف جیسی بے مثل نعمت ان کے پاس تھی جو اُن کو ہر گمراہی سے نجات بخشتی اور ہر تاریکی سے نکالتی ہے، لیکن اُنھوں نے اِس کو چھوڑ دیا اور اس کی پاک تعلیموں کی کچھ پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وُہ اسلام سے بالکل دُور جا پڑے ہیں۔ یہانتک کہ اب اگر حقیقی اسلام اُن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، تو چونکہ وُہ اس سے بکلّی بے خبر اور غافل ہیں، اس لیے حقیقی مومن کو بھی کافر کہہ دیتے ہیں۔

ولی بننے کے لیے خداداد قویٰ سے کام لو

بہت سے لوگ ہیں جو اوباشانہ اور عیاشانہ حالات زندگی رکھتے ہیں اور وہ دُنیا کا فخر، دُنیا کی عزّت اور املاک و دولت چاہتے ہیں۔ اس قسم کی آرزوؤں اور تمناؤں اور اُن کے پورا کرنے کی تدبیروں اور تجویزوں میں ہی اپنی عمر کھو بیٹھتے ہیں۔ اُن کی آرزوؤں کی اِنتہا نہیں ہوتی کہ پیغامِ موت آجاتا ہے۔ اب اُن کو بھی اللہ تعالیٰ نے قویٰ تو دیئے تھے۔ انہیں قویٰ سے اگر کام لیتے تو حق کو پا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے تو کسی سے بخل نہیں کیا، لیکن ایسے لوگ خود قویٰ سے کام نہیں لیتے۔ یہ اُن کی اپنی بدبختی ہے۔ نیک بخت اور مُبارک ہے وہ شخص جو اُن خداداد قویٰ سے کام لے بہت سے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب اُن کو کہا جاتا ہے کہ تم خدا تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے اوامر کی پیروی کرو اور نواہی سے پرہیز کرو۔ تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم نے کیا ولی بننا ہے؟ اس قسم کا کلمہ میرے نزدیک کلمۂ کفر ہے۔ یہ خدا تعالیٰ

پر بدگمانی ہے۔ خدا تعالیٰ کے حضور کیا کمی ہے۔ اُس کے پاس سرکار کی طرح کوئی محدود نوکریاں تو نہیں ہیں جو ختم ہو جائیں۔ بلکہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلقات پیدا کرے وہ ان فیوض سے بہرہ ور ہو سکتا ہے جو پہلے راستبازوں کو دیئے گئے تھے ؎ بر کریماں کارہا دشوار نیست۔ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے محبوب بندوں کا نام ولی رکھا ہے تو کیا ولی بنانا خدا تعالیٰ کے نزدیک مشکل ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ اُس کے نزدیک بہت سہل امر ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انسان راستی کے ساتھ اس کی راہ میں قدم رکھنے والا ہو اور اُس کے راستے میں صبر و استقلال اور وفاداری کے ساتھ چلنے والا ہو۔ کوئی دُکھ اور تکلیف اور مصیبت اس کے قدم کو ڈگمگا نہ سکے۔ جب انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرتا ہے اور اُن باتوں سے الگ ہو جاتا ہے جو خدا تعالیٰ کی نارضامندی کا موجب ہوتی ہیں۔ اور سچی پاکیزگی اور طہارت اختیار کر لیتا ہے اور گندی باتوں سے پرہیز کرتا ہے، تو خدا تعالیٰ بھی اُس کے ساتھ ایک تعلق پیدا کر لیتا ہے اور اس کے قریب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے دُوری اختیار کرے اور گندگی سے نکلنے کی کوشش نہ کرے، تو پھر خدا تعالیٰ بھی اُس کی پروا نہیں کرتا۔ جیسے کہ فرمایا: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ۔ (الصّف: ۶)۔

سلوک کی آسان راہ

ہماری جماعت کو چاہیئے کہ ہمت نہ ہار بیٹھے۔ یہ بڑی مشکلات نہیں ہیں۔ مَیں تمہیں یقیناً کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے ہماری مشکلات آسان کر دی ہیں۔ کیونکہ ہمارے سلوک کی راہیں اور ہیں۔ ہمارے ہاں یہ حالت نہیں ہے کہ کمریں جھک جائیں یا ناخن بڑھا لیں، یا پانی میں کھڑے رہیں اور چلّہ کشیاں کریں یا اپنے ہاتھ خشک کریں اور یہاں تک نوبت پہنچے کہ اپنی صورتیں بھی مسخ ہو جائیں۔ ان صُورتوں کے اختیار کرنے سے بعض لوگ بخیالِ خویش باخدا بننا چاہتے ہیں، لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ ایسی ریاضتوں سے خدا تو کیا ملنا ہے، انسانیت بھی جاتی رہتی ہے، لیکن ہمارے سلوک کا یہ طریق ہرگز نہیں ہے، بلکہ اسلام نے اس کے لیے نہایت آسان راہ رکھ دی ہے اور وُہ کشادہ راہ وُہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یُوں فرمایا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ: ۶) یہ دُعا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھلائی ہے۔ تو ایسے طور پر نہیں کہ دُعا تو سکھا دی، لیکن سامان کچھ بھی مہیا نہ کیا ہو۔ نہیں بلکہ جہاں دُعا سکھلائی ہے وہاں اس کے لیے سامان بھی مہیا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سے اگلی سُورۃ میں اُس قبولیت کا اشارہ ہے، جہاں فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (البقرہ: ۳) یہ گویا ایسی دعوت ہے جس کا سامان پہلے سے تیار کر رکھا ہے۔

غرض یہ قویٰ جو انسان کو دیئے گئے ہیں۔ اگر وُہ اُن سے کام لے تو یقیناً ولی ہو سکتا ہے۔ مَیں یقیناً کہتا ہوں کہ اس اُمت میں بڑی قوت کے لوگ آتے ہیں جو نُور اور صدق اور وفا سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے کوئی شخص اپنے آپ کو ان قویٰ سے محروم نہ سمجھے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی فہرست شائع کر دی ہے، جس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ

ہمیں اُن برکات سے حصّہ نہیں ملے گا۔ خدا تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اس کی کریمی کا بڑا گہرا سمندر ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اور جس کو تلاش کرنے والا اور طلب کرنے والا کبھی محروم نہیں رہا۔ اس لیے تم کو چاہیے کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دُعائیں مانگو اور اُس کے فضل کو طلب کرو۔ ہر ایک نماز میں دُعا کے لیے کئی مواقع ہیں۔ رکوع، قیام، قعدہ، سجدہ وغیرہ۔ پھر آٹھ پہروں میں پانچ مرتبہ نماز پڑھی جاتی ہے۔ فجر، ظہر، عصر، شام اور عشاء۔ ان پر ترقی کرکے اشراق اور تہجد کی نمازیں ہیں۔ یہ سب دُعا ہی کے لیے مواقع ہیں۔

نماز کی اصل غرض اور مغز دُعا ہے

نماز کی اصل غرض اور مغز دُعا ہی ہے اور دُعا مانگنا اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ مثلاً ہم عام طور پر دیکھتے ہیں کہ جب بچہ روتا دھوتا ہے اور اضطراب ظاہر کرتا ہے، تو ماں کس قدر بے قرار ہوکر اس کو دُودھ دیتی ہے۔ اُلوہیت اور عبودیت میں اسی قسم کا ایک تعلق ہے، جس کو ہر شخص سمجھ نہیں سکتا۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کے دروازہ پر گر پڑتا ہے اور نہایت عاجزی اور خشوع و خضوع کے ساتھ اس کے حضور اپنے حالات کو پیش کرتا ہے اور اس سے اپنی حاجات کو مانگتا ہے، تو اُلوہیت کا کرم جوش میں آتا ہے اور ایسے شخص پر رحم کیا جاتا ہے۔

گریہ وزاری

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا دُودھ بھی ایک گریہ کو چاہتا ہے، اس لیے اس کے حضور رونے والی آنکھ پیش کرنی چاہیے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کے حضور رونے دھونے سے کچھ نہیں ملتا۔ بالکل غلط اور باطل ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے صفاتِ قدرت و تصرف پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر اُن میں حقیقی ایمان ہوتا، تو وہ ایسا کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ جب کبھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے حضور آیا ہے اور اس نے سچی توبہ کے ساتھ رُجوع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اس پر اپنا فضل کیا ہے۔ یہ کسی نے بالکل سچ کہا ہے۔

عاشق کہ شُد کہ یار بحالش نظر نہ کرد   اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

خدا تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ تم اُس کے حضور پاک دل لے کر آجاؤ۔ صرف شرط اتنی ہے کہ اس کے مناسبِ حال اپنے آپ کو بناؤ۔ اور وہ سچی تبدیلی جو خدا تعالیٰ کے حضور جانے کے قابل بنا دیتی ہے، اپنے اندر کرکے دکھاؤ۔ میں تمھیں سچ سچ کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ میں عجیب در عجیب قدرتیں ہیں اور اس میں لا انتہا فضل و برکات ہیں، مگر ان کے دیکھنے اور پانے کے لیے محبت کی آنکھ پیدا کرو۔ اگر سچی محبت ہو تو خدا تعالیٰ بہت دُعائیں سُنتا ہے اور تائیدیں کرتا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ محبت اور اخلاص خدا تعالیٰ سے ہو۔

خدا کی محبت اور فضل

خدا کی محبت ایک ایسی شے ہے جو انسان کی سفلی زندگی کو جلا کر اسے ایک نیا اور مصفّٰی انسان بنا دیتی ہے۔ اس وقت وہ وُہ کچھ دیکھتا ہے جو پہلے نہیں دیکھتا تھا اور وہ وُہ کچھ سُنتا ہے جو پہلے نہیں سُنتا تھا۔ غرض خدا تعالیٰ نے جو کچھ مائدہ فضل و کرم کا انسان کے

لیے تیار کیا ہے، اس کے حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اِستعدادیں بھی عطا کی ہیں۔ اگر وہ استعدادیں تو عطا کرتا، لیکن سامان نہ ہوتا تب بھی ایک نقص تھا۔ یا اگر سامان تو ہوتا، لیکن استعدادیں نہ ہوتیں، تو کیا فائدہ تھا؟ مگر نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اس نے اِستعداد بھی دی اور سامان بھی مہیا کیا۔ جس طرح پر ایک طرف روٹی کا سامان پیدا کیا، تو دُوسری طرف آنکھ، زبان، دانت اور معدہ دے دیا اور جگر اور امعاء کو کام میں لگا دیا اور ان تمام کاموں کا مدار غذا پر رکھ دیا۔ اگر پیٹ کے اندر ہی کچھ نہ جائے گا، تو دل میں خون کہاں سے آئے گا۔ کیلوس کہاں سے بنے گا؟

اسی طرح پر سب سے اوّل اس نے یہ فضل کیا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اسلام جیسا مکمل دین دے کر بھیجا اور آپؐ کو خاتم النبیّین ٹھہرایا اور قرآن شریف جیسی کامل اور خاتم الکتاب عطا فرمائی۔ جس کے بعد قیامت تک نہ کوئی کتاب آئے گی اور نہ کوئی نیا نبی نئی شریعت لے کر آئے گا۔ پھر جو قویٰ سوچ اور فکر کے ہیں۔ ان سے اگر ہم کام نہ لیں اور خدا تعالیٰ کی طرف قدم نہ اُٹھائیں تو کس قدر سستی اور کاہلی اور ناشکری ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد

غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پہلی ہی سُورت میں ہمارے لیے کس قدر مبسُوط طریق پر فضل کی راہ بتادی ہے۔ اِس سُورت میں جس کا نام خاتم الکتاب اور اُم الکتاب بھی ہے۔ صاف طور پر بتادیا ہے کہ انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے اور اس کے حصُول کی کیا راہ ہے؟ اِیَّاكَ نَعْبُدُ (گویا انسانی فطرت کا اصل تقاضا اور منشاء ہے اور اسے اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (الفاتحہ: ۵) پر مقدّم کر کے یہ بتایا ہے کہ پہلے ضروری ہے کہ جہاں تک انسان کی اپنی طاقت، ہمّت اور سمجھ میں ہو، خدا تعالیٰ کی رضامندی کی راہوں کے اختیار کرنے میں سعی اور مجاہدہ کرے اور خدا تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں سے پُورا کام لے اور اس کے بعد پھر خدا تعالیٰ سے اس کی تکمیل اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے دُعا کرے۔ انسانی زندگی کا مقصد اور غرض صراطِ مستقیم پر چلنا اور اس کی طلب ہے۔ جس کو اس سُورۃ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ: ۶) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ: ۷) یا اللہ۔ ہم کو سیدھی راہ دکھا۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہوا۔ یہ وُہ دُعا ہے جو ہر نماز میں اور ہر رکعت میں مانگی جاتی ہے۔ اس دُعا کا اس قدر تکرار ہی اس کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے

جماعتِ احمدیہ کا نصب العین

ہماری جماعت یاد رکھے کہ یہ معمولی سی بات نہیں ہے اور صرف زبان سے طوطے کی طرح ان الفاظ کا رٹ دینا اصل مقصُود نہیں ہے، بلکہ یہ دُعا انسان کو انسانِ کامل بنانے کا ایک کارگر اور خطا نہ کرنے والا نسخہ ہے، جسے ہر وقت نصب العین رکھنا چاہیے اور تعویذ کی طرح مدِّنظر رکھنا چاہیے۔ اس آیت میں چار قسم کے کمالات کے حاصل کرنے کی التجا ہے۔

اگر انسان ان چار قسم کے کمالات کو حاصل کرے گا، تو گویا دُعا مانگنے اور خَلقِ انسانی کے حق کو ادا کر دے گا اور ان استعدادوں اور قوٰی کے بھی کام میں لانے کا حق ادا ہو جائے گا۔ جو اس کو دی گئی ہیں۔

آیت اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ کی تفسیر

اِس بات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیے کہ قرآن شریف کے بعض حصّے دُوسرے حصّوں کی تفسیر اور شرح ہیں۔ ایک جگہ ایک امر بطریقِ اجمال بیان کیا جاتا ہے، تو دُوسری جگہ وُہی امر کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا دُوسرا پہلے کی تفسیر ہے پس اس جگہ جو یہ فرمایا: صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحہ : ۷) تو یہ بطریقِ اجمال ہے، لیکن دُوسرے مقام پر منعم علیہم کی خود ہی تفسیر کر دی ہے۔ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ (النساء : ۷۰) منعم علیہم لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں۔ نبی، صدیق، شہید، صالح، انبیاءؑ میں یہ چاروں شانیں جمع ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ اعلیٰ کمال ہے۔ ہر ایک انسان کا یہ فرض ہے کہ وُہ اِن کمالات کے حاصل کرنے کے لیے جہاں تک مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت ہے اس طریق پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے دکھا دیا ہے۔ کوشش کرے۔

آنحضرت کی راہ کو ہرگز نہ چھوڑو

مَیں یہ بھی تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں جو اپنے تراشے ہوئے وظائف اور اَوراد کے ذریعہ سے ان کمالات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یا خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں، لیکن مَیں تمھیں کہتا ہوں کہ جو طریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار نہیں کیا۔ وہ محض فضول ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مُنعَم علیہم کی راہ کا سچا تجربہ کار اور کون ہو سکتا ہے۔ جن پر نبوّت کے بھی سارے کمالات ختم ہو گئے۔ آپؐ نے جو راہ اختیار کی وہ بہت ہی صحیح اور اقرب ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر دُوسری راہ ایجاد کرنا، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی خوش کُن معلوم ہوتی ہو۔ میری رائے میں ہلاکت ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایسا ہی ظاہر کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتّباع سے خدا ملتا ہے اور آپؐ کی اتباع کو چھوڑ کر خواہ کوئی ساری عمر ٹکریں مارتا رہے، گوہرِ مقصود اس کے ہاتھ نہیں آسکتا؛ چنانچہ سعدی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی ضرورت بدیں الفاظ بتاتا ہے:؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا   ولیکن میفزائے بر مصطفٰے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو ہرگز نہ چھوڑو۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ قسم قسم کے وظیفے لوگوں نے ایجاد کر لیے ہیں۔ اُلٹے سیدھے لٹکتے ہیں اور جوگیوں کی طرح راہبانہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، لیکن یہ سب بے فائدہ ہیں۔ انبیاء کی یہ سُنّت نہیں کہ وہ اُلٹے سیدھے لٹکتے رہیں یا نفی اثبات کے ذکر کریں اور اَرّہ کے ذکر کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے اُسوۂ حسنہ فرمایا لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب : ۲۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

نقشِ قدم پر چلو اور ایک ذرّہ بھر بھی اِدھر یا اُدھر ہونے کی کوشش نہ کرو۔

جماعتِ احمدیہ کے قیام کا مقصد

غرض مُنعم علیہم لوگوں میں جو کمالات ہیں اور صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحہ : ۷) میں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ ان کو حاصل کرنا ہر انسان کا اصل مقصد ہے اور ہماری جماعت کو خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کے قائم کرنے سے یہی چاہا ہے کہ وہ ایسی جماعت تیار کرے جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کی تھی تاکہ اس آخری زمانہ میں یہ جماعت قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور عظمت پر بطور گواہ ٹھہرے۔

مقامِ نبوّت

ان کمالات میں سے جو منعم علیہم گروہ کو دیئے جاتے ہیں۔ پہلا کمال نبوّت کا کمال ہے۔ جو بہت ہی اعلیٰ مقام پر واقع ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ وُہ الفاظ نہیں ملتے جن میں اس کمال کی حقیقت بیان کر سکیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر کوئی چیز اعلیٰ ہو اس کے بیان کرنے کے واسطے اُسی قدر الفاظ کمزور ہوتے ہیں اور نبوّت تو ایسا مقام ہے کہ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی درجہ اور مرتبہ نہیں ہے، تو پھر یہ الفاظ میں کیونکر بیان ہو سکے۔ مختصر اور ناکافی طور پر ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان سفلی زندگی کو چھوڑ دیتا ہے اور بالکل سانپ کی کینچلی کی طرح اس زندگی سے الگ ہو جاتا ہے۔ اُس وقت اس کی حالت اور ہو جاتی ہے۔ وہ بظاہر اسی زمین پر چلتا پھرتا کھاتا پیتا ہے اور اس پر قانونِ قدرت کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے۔ جیسے دُوسرے لوگوں پر، لیکن باوجود اس کے بھی وُہ اس دُنیا سے الگ ہوتا ہے اور وُہ ترقی کرتے کرتے اُس مقام پر جا پہنچتا ہے، جو نقطۂ نبوّت کہلاتا ہے۔ اور جہاں وہ خدا تعالیٰ سے مکالمہ کرتا ہے۔ یہ مکالمہ یُوں شروع ہوتا ہے کہ جب وُہ نفس اور اُس کے تعلقات سے الگ ہو جاتا ہے، تو پھر اس کا تعلق محض اللہ تعالیٰ سے ہی ہوتا ہے اور اُسی سے وُہ مکالمہ کرتا ہے۔

کلامِ نفس

انسان کی حالت ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہ کبھی نکمّا اور بیکار نہیں رہتا اور نفس کلام سے بھی کبھی فارغ نہیں ہوتا ہے۔ نفس اور شیطان سے ہی اُس کا مکالمہ شروع رہتا ہے اگر کوئی اور بات کرنے والا نہ ہو۔ بعض اوقات لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان بالکل خاموش ہے، لیکن درحقیقت وُہ خاموش نہیں ہوتا۔ اس کا سلسلۂ کلام اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ بہت ہی لمبا ہوتا ہے۔ اور شیطانی رنگ میں اُسے خود لمبا کرتا ہے اور بے شرمی سے اُسے لمبا ہونے دیتا ہے۔ یہ سلسلۂ کلام کبھی خیالی فسق کے رنگ میں ہوتا ہے اور کبھی بے ہُودہ اور جھُوٹی تمنّاؤں کے رنگ میں اور اس سے وہ کبھی فارغ نہیں رہتا۔ جبتک کہ اِس سفلی زندگی کو چھوڑ نہ دے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس قسم کے خطرات اور خیالات کا سلسلہ جیسے

انسان لمبا نہیں ہونے دیتا اور ایک معمولی خیال کی طرح آکر دل سے محو ہو جاتا ہے وُہ معاف ہیں، لیکن جب اس سلسلہ کو لمبا کرتا ہے اور اس پر عزیمت کرتا ہے، تو وہ گناہ ہے اور ان کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔

جب انسان اُن خیالات کو جو اُس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ دُور کر دیتا ہے اور اُن کو لمبا نہیں ہونے دیتا، تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وُہ معافی کے قابل ہیں، لیکن جب اُن کے سلسلہ کی درازی میں ایک لذّت پاتا ہے اور اُن کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ تب وہ قابلِ مواخذہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُن میں عزیمت شامل ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی مَیں نے بیان کیا ہے۔ اس بات کو خوب یاد رکھو کہ کلامِ نفسی دو قسم کا ہوتا ہے۔ کبھی شیطانی جو خیالِ فسق و فجور کے سلسلہ میں چلا جاتا ہے اور آرزوؤں کے ایک لمبے سلسلہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان ان دونوں سلسلوں میں پھنسا ہوا ہے، اُسے شیطانی دخل کا بہت اندیشہ ہوتا ہے اور اس امر کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ وہ اس طرح سے نقصان اُٹھائے اور شیطان اُسے زخمی کر دے۔ مثلاً کبھی کوئی منصوبہ باندھتا ہے کہ فلاں شخص میری فلاں غرض اور مقصد میں بڑا مُخل ہے، اُسے مار دیا جائے یا فلاں شخص نے مجھے تُو کر کے بلایا ہے اس کا بدلہ لیا جائے۔ اور اس کی ناک کاٹ دی جائے۔ غرض اسی قسم کے منصوبوں اور ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ یہ مرض سخت خطرناک ہے۔ وُہ نہیں سمجھتا کہ ایسی باتوں سے نفس کا کیا نقصان کر رہا ہوں اور اس سے میری اخلاقی اور رُوحانی قوتوں پر کس قسم کا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ اس لیے اس قسم کے خیالات سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ جب کبھی کوئی ایسا بیہودہ سلسلہ خیالات شروع ہو، تو فوراً اس کے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ استغفار پڑھو۔ لاحول کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی مدد اور توفیق چاہو اور خدا تعالیٰ کی کتاب کے پڑھنے میں اپنے آپ کو مصروف کر دو اور یہ سمجھ لو کہ اس قسم کے خیالی سلسلہ سے کچھ بھی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ اگر دشمن مر بھی جاوے تو کیا اور زندہ رہے تو کیا؟ نفع و نقصان کا پہنچانا خدا تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ کوئی شخص کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ سعدی نے گلستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ نوشیرواں بادشاہ کے پاس کوئی شخص خوشخبری لے کر گیا کہ تیرا فلاں دشمن مارا گیا ہے اور اس کا ملک اور قلعہ ہمارے قبضہ میں آگیا ہے۔ نوشیرواں نے اس کا کیا اچھا جواب دیا ؎

مرا بمرگِ عدو جائے شادمانی نیست ۔۔۔ کہ زندگانیٔ ما نیز جاودانی نیست

پس انسان کو چاہیے کہ اس امر پر غور کرے کہ اس قسم کے منصوبوں اور ادھیڑ بن سے کیا فائدہ اور کیا خوشی۔ یہ سلسلہ تو بہت ہی خطرناک ہے اور اس کا علاج ہے توبہ، استغفار، لاحول اور خدا تعالیٰ کی کتاب کا مطالعہ، بیکاری اور بے شغلی میں اس قسم کا سلسلہ بہت لمبا ہو جایا کرتا ہے۔

دوسری قسم کلامِ نفس کی آمانی ہے۔ یہ سلسلہ بھی چونکہ بے جا خواہشوں کو پیدا کرتا ہے اور طمع، حسد اور خود غرضی کے امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے جونہی کہ یہ سلسلہ پیدا ہو۔ فوراً اُس کی صف لپیٹ دو۔ میں نے یہ

تقسیم کلامِ نفس کی جو کی ہے یہ دونوں قسمیں انجام کار انسان کو ہلاک کر دیتی ہیں، لیکن نبی ان دونوں قسم کے سلسلۂ کلام سے پاک ہوتا ہے۔

مقامِ نبوّت کی حقیقت

نبوّت کیا ہے؟ یہ ایک جوہرِ خداداد ہے۔ اگر کسب سے ہوتا تو سب لوگ نبی ہو جاتے۔ نبیوں کی فطرت ہی اس قسم کی نہیں ہوتی کہ وُہ اس بے جا سلسلۂ کلام میں مبتلا ہوں۔ وُہ نفسی کلام کرتے ہی نہیں ؛ حالانکہ دوسرے لوگوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وُہ ان سلسلوں میں کچھ ایسے مبتلا ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا خانہ ہی خالی رہ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے نبی ان دونوں سلسلوں سے الگ ہو کر خدا تعالیٰ میں کچھ ایسے گم ہوتے ہیں اور اُسکے مخاطبہ مکالمہ میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ ان سلسلوں کیلئے ان کے دل و دماغ میں سمائی اور گنجائش بھی نہیں ہوتی، بلکہ اُنکے دل و دماغ میں صرف خدا تعالیٰ ہی کا سلسلۂ کلام رہ جاتا ہے۔ چونکہ اُنکے پاس صرف وہی حصّہ باقی ہوتا ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ اُن سے کلام کرتا ہے اور وُہ خدا تعالیٰ کو مخاطب کرتے رہتے ہیں۔ تنہائی اور بیکاری میں بھی جب ایسے خیالات کا سلسلہ ایک انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص نبی کو بھی ویسی ہی حالت میں دیکھے، تو شاید غلطی اور ناواقفی سے سمجھ لے گا کہ اب اس کا سلسلۂ کلام بھی خدا تعالیٰ سے نہ ہوگا، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ نبی ہر وقت خدا تعالیٰ ہی سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ اور یہی دُعا کرتا رہتا ہے کہ اے خدا میں تجھ سے پیار کرتا ہوں اور تیری ہی رضا کا طالب ہوں۔ مجھ پر ایسا فضل کر کہ میں اُس نقطہ اور مقام تک پہنچ جاؤں جو تیری رضا کا مقام ہے۔ مجھے ایسے اعمال کی توفیق دے جو تیری نظر میں پسندیدہ ہوں۔ دُنیا کی آنکھ کھول کہ وُہ تجھے پہچانے اور تیرے آستانہ پر گرے۔ یہ اُس کے خیالات ہوتے ہیں اور یہی اُس کی آرزوئیں۔ اور اُن میں وُہ ایسا محو اور فنا ہوتا ہے کہ دُوسرا آدمی اُس کو شناخت نہیں کر سکتا۔ نبی اس سلسلہ کو ذوق کے ساتھ دراز کرتا ہے اور پھر اس میں اُس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اُس کا دل پگھل جاتا ہے اور اس کی رُوح بہہ نکلتی ہے۔ وہ پُورے زور اور طاقت کے ساتھ آستانۂ اُلوہیت پر گرتی اور اَنْتَ رَبِّیْ۔ اَنْتَ رَبِّیْ کہہ کر پکارتی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم جوش میں آتا ہے اور وُہ اس کو مخاطب کرتا اور اپنے کلام سے اُس کو جواب دیتا ہے۔ یہ ایسا لذیذ سلسلہ ہے کہ ہر شخص اُس کو سمجھ نہیں سکتا اور یہ لذت ایسی ہے کہ الفاظ اُس کو ادا نہیں کر سکتے۔ پس وہ بار بار مستسقی کی طرح بابِ ربوبیت کو ہی کھٹکھٹاتا رہتا ہے اور وہاں ہی اپنے لیے راحت و آرام پاتا ہے۔ وہ دُنیا میں ہوتا ہے لیکن دُنیا سے الگ ہوتا ہے۔ وہ دُنیا کی کسی چیز کا آرزومند نہیں ہوتا لیکن دُنیا اس کی خادم ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اُس کے قدموں پر دُنیا کو لا ڈالتا ہے۔

یہ ہے مختصر حقیقت نبوّت کے مقام کی۔ یہاں کلامِ نفسی کے دونوں سلسلے بھسم ہو جاتے ہیں اور تیسرا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا مبداء اور منتہا خدا تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ خدا تعالیٰ کے کلام کو جذب کرتا

ہے اور اس میں اس قسم کے دُخان اور اضغاث، احلام نہیں ہوتے جو نفسی کلام میں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ دُنیا سے انقطاعِ کلّی کیے ہوئے ہوتا ہے۔ جیسے ایک نفسانی خواہشوں کا اسیر اپنی محبُوبہ سے تعلق پیدا کر کے ہمہ گوش ہو کر تصوّر کرتا ہے اور اسے نفسانی لذات کا معراج پاتا ہے اور قطعاً نہیں چاہتا کہ وہ کسی دوسرے کو ملے۔ اسی طرح پر نبی خدا تعالیٰ سے اپنے تعلقات کو یہاں تک پہنچاتا ہے کہ وُہ اس تنہائی اور خلوت میں کسی دُوسرے کا دخل ہرگز پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے محبوب سے ہمکلام ہوتا ہے اور اسی میں لذت اور راحت پاتا ہے۔ وُہ ایک دم کے لیے بھی اس خلوت کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا، لیکن خدا تعالیٰ اُس کو دُنیا کے سامنے لاتا ہے تاکہ وہ دُنیا کی اصلاح کرے اور خدا نما آئینہ ٹھہرے۔ نبی طبعًا ایک لذت اور کیفیت پاتا ہے اور اسے خدا تعالیٰ ہی میں چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ میں اس کیفیت وحقیقت کو بیان نہیں کر سکتا؛ اگرچہ دل اس لذت سے بھرا ہوا ہے اور اس ذکر کی درازی اور بھی لذت بخش ہے۔ مگر وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جن میں اس کو ظاہر کر سکوں۔

کیا وجہ ہے کہ انبیاء بیویاں اور بچے بھی رکھتے ہیں؟

بعض نادان لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ جبکہ انبیاء ایسے فنافی اللہ ہوتے ہیں اور دُنیا اور اُس کی لذتوں سے دُور بھاگتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وُہ بیویاں اور بچے بھی رکھتے ہیں؟ ایسے معترضین اتنا نہیں سمجھتے کہ ایک شخص تو ان باتوں کا اسیر اور ان فانی لذتوں میں فنا ہو جاتا ہے، لیکن اس کے خلاف انبیاء کا گروہ ان باتوں سے پاک ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اُن کے لیے محض خادم کے طور پر ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں انبیاءؑ ہر قسم کی اصلاح کے لیے آتے ہیں پس اگر وُہ بیوی بچے نہ رکھتے ہوں، تو اس پہلو میں تکمیلِ اصلاح کیونکر ہو، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ عیسائی لوگ معاشرت کے متعلق حضرت مسیحؑ کا دُنیا کے رُوبرو کیا نمونہ پیش کر سکتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ جب وُہ اس راہ سے ہی ناواقف ہیں اور مدارج سے ہی بے خبر، تو وُہ کیا اصلاح کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی کمال ہے کہ ہر پہلو میں آپؐ کا نمونہ کامل ہے۔ دُنیا اور اس کی چیزیں انبیاء پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں اور وہ فانی لذتوں کی کچھ بھی پروا نہیں کیا کرتے بلکہ اُن کا دل خدا تعالیٰ کی طرف اُس دریا کی ایک تیز دھار کی طرح جو پہاڑ سے گرتی ہے بہتا ہے اور اس کی رَو میں ہر خس و خاشاک بہہ جاتا ہے۔

غرض انبیاء علیہم السلام ان چیزوں کے غلام نہیں ہوتے، بلکہ یہ چیزیں اُن کے لیے بطور خادم ہوتی ہیں اور اُن کے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی کمالات کا نمونہ اُن کے اس ذکر اور ذوق میں جو خدا تعالیٰ کے تصوّر اور محویّت میں انہیں ملتا ہے، کچھ ہرج پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کچھ ایسے محو اور فنا ہوتے ہیں کہ دُنیا سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ جب اس قسم کی ربودگی ہوتی ہے، تو پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے آوازیں آنے لگتی ہیں اور مکالماتِ الٰہیہ ہوتے ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب جذب کی قوت کسی چیز میں ہوتی ہے تو وہ دُوسرے کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ انبیاءؑ

کے جذب میں اس قدر قوت ہوتی ہے کہ دُنیا اور مافیہا کی ساری باتیں اس میں مجسم ہو جاتی ہیں اور وُہ خدا تعالیٰ کے فضل اور فیض کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے اور اس سلسلہ کو باقی تمام سلسلوں پر تقدم اور فوق ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے مجاہدۂ صحیحہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر یہ راہ نہیں کھلتی۔ جیسا کہ فرمایا : وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (العنکبوت : ۷۰) اور اسی کی طرف اشارہ ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں۔ اگرچہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پر تقدم ہے، لیکن پھر بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت نے سبقت کی ہوئی ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ بھی کسی قوت نے کہلوایا ہے اور وہ قوت جو پوشیدہ ہی پوشیدہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا اقرار کراتی ہے، کہاں سے آئی؟ کیا خدا تعالیٰ نے ہی وُہ عطا نہیں فرمائی ہے؟ بے شک وہ خدا تعالیٰ کا ہی عطیہ ہے جو اس نے محض رحمانیت سے عطا فرمائی ہے۔ اسی کی تحریک اور توفیق سے یہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ بھی کہتا ہے۔ اس پہلو سے اگر غور کریں، تو اس کو تاخر ہے اور دُوسرے پہلو سے اس کو تقدم ہے۔ یعنی جب یہ قوت اس کو اس بات کی طرف لاتی ہے تو یہ تاخر ہو گیا اور بصورتِ اوّل تقدم۔ اسی طرح پر سلسلۂ نبوت کی فلاسفی کا خلاصہ یا مفہوم ہے۔

لوازمِ نبوت

یہ تو ممکن ہے کہ ہزاروں ہزار انسان مُلہَم ہونے کا دعویٰ کریں اور اثباتِ نبوت اور کلامِ الٰہی کی حجت قائم کرنے کے واسطے یہ ضروری اَمر ہے، لیکن امرِ نبوت میں مقصود بالذات ایک اور امر ہوتا ہے جو خاص نبیوں سے مخصوص ہوتا ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی شئے آتی ہے تو اس کے لوازم اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ لوازم سے الگ ہو۔ مثلاً جب کھانا آتے گا، تو اس کے لوازم ساتھ ہی ہوں گے۔ ہر قسم کے برتن، پانی، یہانتک کہ خلال بھی دیں گے۔ اسی طرح پر نبوت کے ساتھ لوازماتِ نبوت بھی ساتھ ہوتے ہیں اور منجملہ اُن لوازمات کے ایک یہ بھی ہے کہ کلامِ نفسانی کا سلسلہ بالکل ختم ہو جاتا ہے اور یہ امر اصل کیفیت کے لوازم میں سے ہے اور اس کے آثار اور علامات کی دلیل وُہ پیشگوئیاں ہوتی ہیں جو خدا تعالیٰ انہیں عطا کرتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ نبیوں کا ایک اور نام آسمان پر ہوتا ہے جس سے دُوسرے لوگ آشنا بھی نہیں ہوتے اور بعض وقت جب وُہ آسمانی نام دُنیا کے سامنے پیش ہوتا ہے، تو لوگوں کو ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ مثلاً میرے ہی معاملہ میں خدا تعالیٰ نے میرا نام مسیح ابن مریم بھی رکھا ہے۔ جس پر بعض نادان اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارا نام تو غلام احمد ہے، مگر وُہ اِس راز کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہ اسرارِ نبوت میں سے ایک بات ہے۔

غرض جب دونوں قسم کے جھوٹے مکالمے ختم ہو جاتے ہیں، تو پھر اُس کا دل بولتا ہے اور ہر وقت بولتا رہتا ہے۔ حرکت کرتا ہے۔ تب بھی اس سے آواز آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں ہزار لوگ اس کے پاس اَور اَور قسم کی باتوں میں مشغول ہوں، مگر یہ اپنے اس سلسلہ میں لذت پاتا ہے اور اپنے محبوب سے کلام کرنے میں مصروف رہتا ہے۔

یہی وجہ اس کی جمعیتِ قلب کی ہوتی ہے۔ کوئی شور و شر اس کو پراگندہ نہیں کر سکتا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک عاشق چاہتا ہے کہ وہ اپنے معشوق اور محبوب کے حُسن و جمال پر پُوری طرح اطلاع پائے اور ہر وقت اُس سے کلام کرتا رہے، مگر ایسا نہیں ہوا کرتا۔ اور اس قسم کی دُنیاوی خواہشیں ذلیل ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والے اور اس کے عشق میں گمشدہ قوم یعنی انبیاءؑ ان جھوٹے اور فانی عاشقوں کے عشق سے کہیں بڑھ کر اپنے اندر جوش رکھتے ہیں، کیونکہ اُن کا خدا وہ خدا ہے جو جھکنے والوں کی طرف جھکتا ہے۔ اور وُہ اُن پر بہت زیادہ توجہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف آنے والا اگر معمولی چال سے چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ پس جس شخص کی توجہ ایسے خدا کی طرف ہو جائے اور وہ اس کی محبت میں کھویا جائے، تو اس محبت اور عشقِ الٰہی کی آگ اُس کے نفسانی اور نفسانی خیالات کو جلا دیتی ہے اور اس کے اندر رُوحِ ناطق بھر جاتی ہے اور وہ پاک نُطق جو اس کے اندر شروع ہوتا ہے، وہ خدا تعالیٰ کا نطق ہوتا ہے جسے دوسرے رنگ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے۔ پس یہ ایک کمالِ نبوت ہے۔ جسے اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری بات ہے کہ جب انسان اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحۃ) کی دُعا مانگے، تو اس کے پیشِ نظر یہ رہنا چاہیے کہ وہ اس کمالِ نبوت کو حاصل کرے۔

مقامِ صدیقیت

پھر دوسرا کمال صدیقوں کا کمال ہے۔ صِدّیق مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی جو بالکل راستبازی میں فنا شدہ ہو اور کمال درجہ کا پابند راستباز اور عاشقِ صادق ہو۔ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جب ایک شخص اس درجہ پر پہنچتا ہے، تو وُہ ہر قسم کی صداقتوں اور راستبازیوں کا مجموعہ اور ان کو کشش کرنے والا ہو جاتا ہے۔ جس طرح پر صدیق کمالاتِ صداقت کا جذب کرنے والا ہوتا ہے۔ بقول شخصے ؎
زر زر کشد در جہاں گنج گنج۔ جب ایک شے بہت بڑا ذخیرہ پیدا کر لیتی ہے، تو اس میں اپنی قسم کی اشیاء کو جذب کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

کمالِ صدیقیت کے حصُول کا فلسفہ

صدیق کے کمال کے حصُول کا فلسفہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی کمزوری اور ناداری کو دیکھ کر اپنی طاقت اور حیثیت کے موافق اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہتا ہے اور صدق اختیار کرتا اور جھوٹ کو تُرک کر دیتا ہے اور ہر قسم کے رِجس اور پلیدی سے جو جھُوٹ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ دُور بھاگتا ہے اور عہد کر لیتا ہے کہ کبھی جھُوٹ نہ بولوں گا، جھُوٹی گواہی نہ دُوں گا اور نہ جذبہ نفسانی کے رنگ میں کوئی جھُوٹا کلام کروں گا۔ نہ لغو طور پر نہ کسبِ خیر اور نہ دفعِ شر کے لیے۔ یعنی کسی رنگ اور حالت میں بھی جھُوٹ کو اختیار نہیں کروں گا۔ جب اس حد تک وعدہ کرتا ہے تو گویا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ پر وہ ایک خاص عمل کرتا ہے۔ اور اس کا وُہ عمل اعلیٰ درجہ کی عبادت ہوتی ہے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے آگے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہے۔ خواہ یہ اُس

کے مُنہ سے نکلے یا نہ نکلے لیکن اللہ تعالیٰ جو مبدء الفیوض اور صدق اور راستی کا سرچشمہ ہے۔ اس کو ضرور مدد دے گا اور صداقت کے اعلیٰ اصول اور حقائق اس پر کھول دے گا۔ مثلاً جیسے کہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو تاجر اچھے اصُولوں پر چلتا ہے اور راستبازی اور دیانتداری کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اگر وُہ ایک پیسہ سے بھی تجارت کرے، تو اللہ تعالیٰ اُسے ایک پیسہ کے بدلے لاکھوں روپے دے دیتا ہے۔

صدیق پر معارفِ قرآنی کھولے جاتے ہیں

اسی طرح جب عام طور پر ایک انسان راستی اور راستبازی سے محبت کرتا ہے اور صدق کو اپنا شعار بنا لیتا ہے، تو وہی راستی اس عظیم الشان صدق کو کھینچ لاتی ہے جو خدا تعالیٰ کو دکھا دیتی ہے۔ صدقِ مجسم قرآن شریف ہے اور پیکرِ صدق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ذات ہے۔ اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ کے مامور و مُرسل حق اور صدق ہوتے ہیں۔ پس جب وہ اُس صدق تک پہنچ جاتا ہے، تب اس کی آنکھ کھلتی ہے اور اسے ایک خاص بصیرت ملتی ہے جس سے معارفِ قرآنی اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ مَیں اس بات کے ماننے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوں کہ وہ شخص جو صدق سے محبت نہیں رکھتا اور راستبازی کو اپنا شعار نہیں بناتا وہ قرآن کریم کے معارف کو سمجھ بھی سکے۔ اس لیے کہ اس کے قلب کو اس سے مناسبت ہی نہیں، کیونکہ یہ تو صدق کا چشمہ ہے اور اس سے وہی پی سکتا ہے جس کو صدق سے محبت ہو۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ معارفِ قرآنی صرف اسی بات کا نام نہیں کہ کبھی کسی نے کوئی نکتہ بیان کر دیا۔ اس کی تو وہی مثال ہے ؎

گاہ باشد کہ کودکے ناداں ۔۔۔ بغلط بر ہدف زَنَد تیرے

انہیں قرآنی حقائق و معارف کے بیان کرنے کے لیے قلب کو مناسبت اور کشش اور تعلق حق اور صدق سے ہو جاتا ہے اور پھر یہاں تک اس میں ترقی اور کمال ہوتا ہے کہ وہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم:۴) کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اُس کی نگاہ جب پڑتی ہے، صدق پر ہی پڑتی ہے۔ اور اس کو ایک خاص قوت اور امتیازی طاقت دی جاتی ہے۔ جس سے وہ حق و باطل میں فی الفور امتیاز کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے دل میں ایک قوت آ جاتی ہے جس کی ایسی تیز حس ہوتی ہے کہ اسے دُور سے ہی باطل کی بُو آ جاتی ہے۔ یہی وُہ سِر ہے جو لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ:۸۰) میں رکھا گیا ہے۔

جھُوٹ ترک کئے بغیر انسان مُطہر نہیں ہو سکتا

حقیقت میں جب تک انسان جھُوٹ کو ترک نہیں کرتا، وہ مُطہر نہیں ہو سکتا۔ نابکار دنیا دار کہہ سکتے ہیں کہ جھُوٹ کے بغیر گذارہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک بیہودہ گوئی ہے۔ اگر سچ سے گذارہ نہیں ہو سکتا، تو پھر

جھُوٹ سے ہرگز گذارہ نہیں ہو سکتا۔ افسوس کہ یہ بدبخت لوگ خدا تعالیٰ کی قدر نہیں کرتے۔ وُہ نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے بدُوں گذارہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنا معبُود اور مُشکل کُشا جھُوٹ کی نجاست ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ شریف میں جھُوٹ کو بتوں کی نجاست کے ساتھ وابستہ کرکے بیان فرمایا ہے۔ یقیناً سمجھو کہ ہم ایک قدم کیا ایک سانس بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہیں لے سکتے۔ ہمارے جسم میں کیا کیا قویٰ ہیں لیکن کیا ہم اپنی طاقت سے اُن سے کام لے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے معنی

جو لوگ اپنی قوّتِ بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اُن کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہے، بلکہ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب سے کام لینا اور اُس کے عطا کردہ قویٰ کو کام میں لگانا۔ پھر نتیجہ کے لیے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنا ہی حقیقی راہ ہے اور خدا تعالیٰ کی قدر ہے، جو لوگ خداداد قویٰ سے کام نہیں لیتے اور صرف مُنہ سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں وہ جھُوٹے ہیں اور وُہ خدا تعالیٰ کی قدر نہیں کرتے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کو آزماتے ہیں اور اُس کی عطا کردہ قوتوں اور طاقتوں کو لغو قرار دیتے ہیں اور اس طرح پر اس کے حضور شوخی اور گستاخی کرتے ہیں اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے مفہوم سے دُور جا پڑتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے، بلکہ بغیر اس پر عمل کیے اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا ظہور چاہتے ہیں۔ یہ ہرگز مناسب نہیں بلکہ جہانتک ہو سکے اور انسان کے امکان اور طاقت میں ہو۔ رعایتِ اسباب ضرور کرنی چاہیے، لیکن ان اسباب کو اپنا معبُود اور مُشکل کُشا قرار نہ دے، بلکہ اُن سے کام لے کر پھر انجام کو تفویض الی اللہ کرے اور اس بات پر سجداتِ شکر بجا لائے کہ خدا نے اس کو وہ طاقتیں اور قویٰ عطا فرمائے ہیں۔

فانی فی اللہ کا مقام

خدا تعالیٰ کے فضل اور تائید کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف انسان کھینچا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ میں فنا ہو جاتا ہے تو اس سے وہ کام صادر ہوتے ہیں، جو خدائی کام کہلاتے ہیں اور اس پر اعلیٰ سے اعلیٰ انوار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ انسانی کمزوری کا تو کچھ بھی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ ایک قدم بھی خدا تعالیٰ کے فضل اور تائید کے بغیر نہیں چل سکتا۔ مَیں تو یہانتک یقین رکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُسے مدد نہ ملے تو وہ رفعِ حاجت کے بعد ازار بند تک بھی باندھنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔ طبیبوں نے ایک مرض لکھی ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ انسان جب چھینک لے تو اس کے ساتھ ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ یقیناً یاد رکھو کہ انسان کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء : ۲۹) انسان کا اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک اتنے اعضاء نہیں رکھتا، جس قدر کہ اس کو امراض لاحق ہوتے ہیں۔ جب وہ اتنی کمزوریوں کا نشانہ اور مجموعہ ہے تو پھر اس کے لیے امن اور عافیت کی یہی

سبیل ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ اُس کا معاملہ صاف ہو اور وہ اُس کا سچا اور مخلص بندہ بن جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وُہ صِدق کو اختیار کرے۔ جسمانی نظام کی کَل بھی صِدق ہی ہے۔ جو لوگ صِدق کو چھوڑ دیتے ہیں اور خیانت کر کے جرائم کو پناہ میں لانے والی سپر کذب کو خیال کرتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔

کِذب اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے

آنی اور عارضی طور پر ممکن ہے اِس سے کسی انسان کو کچھ فائدہ حاصل ہو جائے، لیکن فی الحقیقت کِذب کے اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اسے ایک دیمک لگ جاتی ہے۔ ایک جھُوٹ کے لیے پھر اسے بہت سے جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں، کیونکہ اس جھُوٹ کو سچائی کا رنگ دینا ہوتا ہے۔ اسی طرح اندر ہی اندر اُس کے اخلاقی اور رُوحانی قویٰ زائل ہو جاتے ہیں اور پھر اُسے یہاں تک جرأت اور دلیری ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھی افترا کر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے مُرسلوں اور ماموروں کی تکذیب بھی کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک اَظلَم ٹھہر جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (الانعام: ۲۱) یعنی اُس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھُوٹ اور افترا باندھے یا اس کی آیات کی تکذیب کرے۔ یقیناً یاد رکھو کہ جھُوٹ بہت ہی بُری بلا ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر جھوٹ کا خطرناک نتیجہ اور کیا ہو گا کہ انسان خدا تعالیٰ کے مرسلوں اور اُس کی آیات کی تکذیب کر کے سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ پس تمہارے لیے یہ ضروری بات ہے کہ صِدق اختیار کرو۔

صِدق کے متعلق حضرت سید عبد القادر جیلانیؒ کا واقعہ

حضرت سیّد عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں درج ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے طلبِ علم کے لیے نکلے، تو آپؒ کی والدہ صاحبہؓ نے ان کے حصّہ کی اَسّی اشرفیاں اُن کی بغل کے نیچے پیراہن میں سی دیں اور یہ نصیحت کی کہ بیٹا جھُوٹ ہرگز نہ بولنا۔ حضرت سیّد عبد القادرؒ جب گھر سے رخصت ہوئے، تو پہلی ہی منزل میں ایک جنگل میں سے اُن کا گذر ہوا۔ جہاں چوروں اور قزّاقوں کا ایک بڑا قافلہ رہتا تھا۔ جہاں اُن کو چوروں کا ایک گروہ ملا۔ اُنھوں نے آپؒ کو پکڑ کر پُوچھا کہ تمھارے پاس کیا ہے؟ آپؒ نے دیکھا کہ یہ تو پہلی ہی منزل میں امتحان درپیش آیا۔ اپنی والدہ صاحبہؓ کی آخری نصیحت پر غور کی اور فوراً جواب دیا کہ میرے پاس اَسّی اشرفیاں ہیں جو میری بغل کے نیچے میری والدہ صاحبہ نے سی دی ہیں۔ وُہ چور یہ سُن کر سخت حیران ہوئے کہ یہ فقیر کیا کہتا ہے! ایسا راستباز ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ وُہ آپؒ کو پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گئے اور سارا قصّہ بیان کیا۔ اس نے بھی جب آپؒ سے سوال کیا، تب بھی آپؒ نے وہی جواب دیا۔ آخر جب آپ کے پیراہن کے اس حصّہ کو پھاڑ کر دیکھا گیا، تو واقعی اس میں اَسّی اشرفیاں موجود تھیں۔ اُن سب کو حیرانی ہوئی۔ اس پر اُن کے سردار نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ اس پر آپؒ نے

اپنی والدہ صاحبہ کی نصیحت کا ذکر کر دیا اور کہا کہ مَیں طلبِ دین کے لیے گھر سے نکلا ہوں، اگر پہلی ہی منزل پر جھوٹ بولتا تو پھر کیا حاصل کر سکتا۔ اس لیے مَیں نے سچ کو نہیں چھوڑا۔ جب آپ نے یہ بیان فرمایا، تو قزاقوں کا سردار چیخ مار کر رو پڑا اور آپؒ کے قدموں پر گر گیا اور اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کی۔ کہتے ہیں کہ آپؒ کا سب سے پہلا مُرید یہی شخص تھا۔

غرض صِدق ایسی شے ہے جو انسان کو مشکل وقت میں بھی نجات دلا دیتی ہے۔ سَعدیؒ نے سچ کہا ہے کہ ؎ کس ندیدم کہ گم شُد از رہِ راست۔ پس جس قدر انسان صِدق کو اختیار کرتا ہے اور صِدق سے محبت کرتا ہے اسی قدر اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کے کلام اور انبیاءؑ کی محبت اور معرفت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ وُہ تمام راستبازوں کے نمونے اور چشمے ہوتے ہیں۔ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ: ۱۱۹) کا ارشاد اسی اُصول پر ہے۔

صدیق پر قرآنِ کریم کے معارف کا فیضان

مختصر یہ کہ دُوسرا کمال اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں صدیقوں کا کمال ہے اور اس کمال کے حاصل ہونے پر قرآن شریف کے حقائق اور معارف کھلتے ہیں، لیکن یہ فضل اور فیض بھی محض تائیدِ الٰہی سے آتا ہے۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائید اور فضل کے بغیر ایک اُنگلی کا ہلانا بھی مشکل ہے۔ ہاں یہ انسان کا فرض ہے کہ سعی اور مجاہدہ کرے۔ جہاں تک اس سے ممکن ہو اور اس کی توفیق بھی خدا تعالیٰ سے ہی چاہے۔ کبھی اس سے مایُوس نہ ہو۔ کیونکہ مومن کبھی مایُوس نہیں ہوتا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے خود بھی فرمایا ہے۔ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ (یوسف: ۸۸) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر نا امید ہوتے ہیں۔ نا امیدی بہت ہی بُری بلا ہے۔ اصل میں نا امید وہ ہوتا ہے، جو خدا تعالیٰ پر بدظنی کرتا ہے۔

بدظنّی صِدق کی جڑ کاٹنے والی چیز ہے

یہ خُوب یاد رکھو کہ ساری خرابیاں اور برائیاں بدظنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے بہت منع فرمایا ہے اور پھر فرمایا کہ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات: ۱۳) اگر مولوی لوگ ہم سے بدظنی نہ کرتے اور صِدق اور استقلال کے ساتھ وہ ہماری باتیں سُنتے، ہماری کتابیں پڑھتے اور ہمارے پاس رہ کر ہمارے حالات کا مشاہدہ کرتے، تو ان الزامات کو جو وُہ ہم پر لگاتے ہیں، ہرگز نہ لگاتے۔ لیکن جب اُنھوں نے خدا تعالیٰ کے اس ارشاد کی عظمت نہ کی اور اس پر کاربند نہ ہوئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر بدظنی کی اور میری جماعت پر بھی بدظنی کی اور جھوٹے الزامات اور اتہامات لگانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ بعض نے بڑی بیباکی سے یہ لکھ دیا کہ یہ تو دہریوں کا گروہ ہے اور یہ لوگ نمازیں نہیں پڑھتے۔ روزے نہیں رکھتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر وُہ اِس بدظنی سے بچتے تو اُن کو جھوٹ کی لعنت کے نیچے نہ آنا پڑتا اور وُہ اس سے بچ جاتے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ بدظنی بہت ہی بُری بلا ہے جو انسان کے ایمان کو تباہ کر دیتی ہے اور صِدق اور راستی سے دُور پھینک دیتی ہے اور دوستوں کو دشمن بنا دیتی ہے۔ صدیقوں کے کمال حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بدظنی سے بہت ہی بچے۔ اور اگر کسی کی نسبت کوئی سُوءِ ظن پیدا ہو، تو کثرت کے

ساتھ استغفار کرے اور خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرے تاکہ اس معصیت اور اس کے بُرے نتیجہ سے بچ جاوے جو اس بدظنی کے پیچھے آنے والا ہے۔ اس کو کبھی معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے جس سے انسان بہت جلد ہلاک ہو جاتا ہے۔

غرض بدظنی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہاں تک لکھا ہے کہ جس وقت دوزخی لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ اُن سے یہی فرمائے گا کہ تم نے اللہ تعالیٰ پر بدظنی کی۔ بعض لوگ اس خیال کے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خطاکاروں کو معاف کر دے گا اور نیکو کاروں کو عذاب دے گا۔ ایسا خیال بھی اللہ تعالیٰ پر بدظنی ہے۔ اس لیے کہ اُس کی صفتِ عدل کے سراسر خلاف ہے۔ گویا نیکی اور اس کے نتائج کو جو قرآن شریف میں اس نے مقرر فرمائے ہیں، بالکل ضائع کر دینا اور بیسُود ٹھہرانا ہے۔ پس خوب یاد رکھو کہ بدظنی کا انجام جہنم ہے۔ اس کو معمولی مرض نہ سمجھو۔ بدظنی سے نا امیدی اور نا اُمیدی سے جرائم اور جرائم سے جہنم ملتا ہے۔ بدظنی صدق کی جڑ کاٹنے والی چیز ہے۔ اس لیے تم اس سے بچو اور صدیق کے کمالات حاصل کرنے کے لیے دُعائیں کرو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ کا بے نظیر صدق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا خطاب دیا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپؓ میں کیا کیا کمالات تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اس چیز کی وجہ سے ہے جو اس کے دل کے اندر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں حضرت ابوبکرؓ نے جو صدق دکھایا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہر زمانہ میں جو شخص صدیق کے کمالات حاصل کرنے کی خواہش کرے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ابوبکری خصلت اور فطرت کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو مجاہدہ کرے اور پھر حتی المقدور دُعا سے کام لے۔ جب تک ابوبکری فطرت کا سایہ اپنے اوپر ڈال نہیں لیتا اور اسی رنگ میں رنگین نہیں ہو جاتا۔ صدیقی کمالات حاصل نہیں ہو سکتے۔

ابوبکری فطرت کیا ہے؟

ابوبکری فطرت کیا ہے؟ اس پر مفصل بحث اور کلام کا یہ موقعہ نہیں، کیونکہ اس کے تفصیلی بیان کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ میں مختصراً ایک واقعہ بیان کر دیتا ہوں اور وہ یہ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اظہار فرمایا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہٗ شام کی طرف سوداگری کرنے کے لیے گئے ہوتے تھے۔ جب واپس آتے، تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ ایک شخص آپؓ سے ملا۔ آپؓ نے اس سے مکّہ کے حالات دریافت فرمائے اور پوچھا کہ کوئی تازہ خبر سناؤ۔ جیسا کہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان سفر سے واپس آتا ہے، تو راستہ میں اگر کوئی اہلِ وطن مل جائے، تو اس سے اپنے وطن کے حالات دریافت کرتا ہے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ نئی بات یہ ہے کہ تیرے دوست محمدؐ نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔

آپؐ نے یہ سنتے ہی فرمایا کہ اگر اس نے یہ دعویٰ کیا ہے، تو بلاشبہ وُہ سچا ہے۔ اسی ایک واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آپؓ کو کس قدر حسنِ ظن تھا معجزے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ معجزہ وہ شخص مانگتا ہے جو مدعی کے حالات سے ناواقف ہو اور جہاں غیریت ہو اور مزید تسلی کی ضرورت ہو۔ لیکن جس شخص کو حالات سے پوری واقفیت ہو تو اُسے معجزہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ الغرض حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راستہ میں ہی آنحضرتؐ کا دعوائے نبوت سُن کر ایمان لے آئے۔ پھر جب مکہ میں پہنچے تو آں حضرتؐ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ کیا آپؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں یہ دُرست ہے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپؐ گواہ رہیں کہ مَیں آپؐ کا پہلا مصدق ہوں۔ آپؓ کا ایسا کہنا محض قول ہی قول نہ تھا، بلکہ آپؓ نے اپنے افعال سے اُسے ثابت کر دکھایا اور مرتے دم تک اُسے نبھایا اور بعد مرنے کے بھی ساتھ نہ چھوڑا۔

قول اور فعل میں مطابقت

درحقیقت اس امر کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ انسان کا قول اور فعل باہم مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر ان میں مطابقت نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: ۴۵) یعنی تم لوگوں کو تو نیکی کا امر کرتے ہو، مگر اپنی جانوں کو اس نیکی کے امر کا مخاطب نہیں بناتے بلکہ بھول جاتے ہو۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصّف: ۳) مومن کو دورنگی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ بزدلی اور نفاق ہر دو مومن سے دُور رہتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے قول اور فعل کو دُرست اور مطابق رکھو۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی زندگیوں میں کر کے دکھایا، ایسا ہی تم بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے صدق اور وفا کے نمونے دکھاؤ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نمونہ اپنے سامنے رکھو

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نمونہ ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زمانہ پر غور کرو کہ جب دشمن قریش ہر طرف سے شرارت پر تُلے ہوئے تھے اور اُنھوں نے آپؐ کے قتل کا منصوبہ کیا۔ وہ زمانہ بڑا ابتلاء کا زمانہ تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو حقِ رفاقت ادا کیا، اس کی نظیر دُنیا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ طاقت اور قوت بجز صدقِ ایمان کے ہرگز نہیں آسکتی۔ آج جسقدر تم لوگ بیٹھے ہوئے ہو۔ اپنی اپنی جگہ سوچو کہ اگر اس قسم کا کوئی اِبتلا ہم پر آجائے، تو کتنے ہیں جو ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ مثلاً گورنمنٹ کی طرف سے ہی یہ تفتیش شروع ہو جائے کہ کس کس شخص نے اس شخص کی بیعت کی ہے، تو کتنے ہوں گے جو دلیری کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ ہم مبائعین میں داخل ہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ یہ بات سُن کر بعض لوگوں کے ہاتھ پاؤں سُن ہو جائیں گے اور ان کو فوراً اپنی جائدادوں اور رشتہ داروں کا خیال آجائے گا کہ اُن کو چھوڑنا پڑے گا۔

مشکلات ہی کے وقت ساتھ دینا ہمیشہ کامل الایمان لوگوں کا کام ہوتا ہے، اس لیے جبتک انسان عملی طور پر

ایمان کو اپنے اندر داخل نہ کرے۔ محض قول سے کچھ نہیں بنتا اور بہانہ سازی اُس وقت تک دُور ہی نہیں ہوتی۔ عملی طور پر جب مصیبت کا وقت ہو۔ تو اس وقت ثابت قدم نکلنے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ حضرت مسیح ناصری کے حواری اس آخری گھڑی میں جو اُن کی مصیبت کی گھڑی تھی۔ انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلے اور بعض نے تو مُنہ کے سامنے ہی آپؑ پر لعنت کر دی۔

حقیقت میں یہ بڑی غیرت کا مقام ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پر بھی ایک ایسا وقت آیا تھا کہ جب مسلمؓ نے ۸۰ ہزار آدمیوں کو نماز پڑھائی اور اُن سے حضرت امام حسینؓ کی رفاقت کا عہد لیا، مگر جب کسی شخص نے یزید کے آنے کی خبر دی تو سب کے سب آپؓ کو تنہا چھوڑ گئے۔

عمل ایمان کا زیور ہے

اِس قسم کے واقعات بہت ڈرلتے ہیں، اس لیے اپنے ایمانوں کو وزن کرو۔ عمل ایمان کا زیور ہے۔ اگر انسان کی عملی حالت دُرست نہیں ہے، تو ایمان بھی نہیں ہے۔ مومن حسین ہوتا ہے۔ جس طرح ایک خوب صورت انسان کو معمولی اور ہلکا سا زیور بھی پہنا دیا جائے تو وہ اسے زیادہ خوب صورت بنا دیتا ہے۔ اگر وُہ بدعمل ہے تو پھر کچھ بھی نہیں۔ انسان کے اندر جب حقیقی ایمان پیدا ہو جاتا ہے، تو اُس کو اعمال میں ایک خاص لذت آتی ہے۔ اور اُس کی معرفت کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔ وُہ اس طرح نماز پڑھتا ہے جس طرح نماز پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ گناہوں سے اُسے بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ناپاک مجلس سے نفرت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسُول کی عظمت اور جلال کے اظہار کے لیے اپنے دل میں ایک خاص جوش اور تڑپ پاتا ہے۔ ایسا ایمان اُسے حضرت مسیحؑ کی طرح صلیب پر چڑھ جانے سے بھی نہیں روکتا۔ وُہ خدا کے لیے اور صرف خدا تعالیٰ کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی طرح آگ میں بھی پڑ جانے سے راضی ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی رضا کو رضائے الٰہی کے ماتحت کر دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جو علیمٌ بذاتِ الصّدور ہے، اُس کا محافظ اور نگران ہو جاتا ہے اور اُسے صلیب پر سے بھی زندہ اُتار لیتا ہے اور آگ میں سے بھی صحیح وسلامت نکال لیتا ہے، مگر ان عجائبات کو وُہی لوگ دیکھا کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔

غرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا صِدق اس مصیبت کے وقت ظاہر ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کیا گیا۔ گو بعض کفار کی رائے اِخراج کی بھی تھی۔ مگر اصل مقصد اور کثرت رائے آپؐ کے قتل پر تھی۔ ایسی حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صدق اور وفا کا وہ نمونہ دکھلایا۔ جو ابدالآباد تک کے لیے نمونہ رہے گا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انتخاب ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت اور اعلیٰ وفاداری کی ایک زبردست دلیل ہے۔ دیکھو۔ اگر وائسرائے ہند کسی شخص کو کسی خاص کام کے لیے انتخاب کرے تو اس کی رائے صائب اور بہتر ہوگی یا ایک چوکیدار کی۔ ماننا پڑے گا کہ وائسرائے کا انتخاب بہرحال موزون اور

مناسب ہوگا، کیونکہ جس حال میں کہ وُہ سلطنت کی طرف سے نائب السّلطنت مقرر کیا گیا ہے اور اس کی وفاداری، فراست اور پختہ کاری پر سلطنت نے اعتماد کیا ہے۔ تب ہی تو زمام سلطنت اس کے ہاتھ میں دی ہے۔ پھر اس کی صائب تدبیری اور معاملہ فہمی کو پس پُشت ڈال کر ایک چوکیدار کے انتخاب اور رائے کو صحیح سمجھ لینا نامناسب امر ہے۔

ہجرت میں رفاقت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کا سِر

یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتخاب کا تھا۔ اس وقت آپؐ کے پاس ستّر اسّی صحابہؓ موجود تھے، جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے، مگر ان سب میں سے آپؐ نے اپنی رفاقت کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی انتخاب کیا۔ اس میں کیا سِر ہے؟ بات یہ ہے کہ نبی خدا تعالیٰ کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کا فہم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کشف اور الہام سے بتا دیا کہ اس کام کے لیے سب سے بہتر اور موزون حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں۔ ابوبکرؓ اس ساعتِ عُسر میں آپؐ کے ساتھ ہوئے۔ یہ وقت خطرناک آزمائش کا تھا۔ حضرت مسیحؑ پر جب اس قسم کا وقت آیا، تو اُن کے شاگرد اُن کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایک نے لعنت بھی کی۔ مگر صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک نے پُوری وفاداری کا نمونہ دکھایا۔ غرض حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کا پورا ساتھ دیا اور ایک غار میں جس کو غارِ ثور کہتے ہیں، آپؐ جا چھپے۔ شریر کفار جو آپؐ کی ایذا رسانی کے لیے منصوبے کر چکے تھے تلاش کرتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ اب تو یہ بالکل سر پر ہی آپہنچے ہیں اور اگر کسی نے ذرا نیچے نگاہ کی تو وہ دیکھ لے گا اور ہم پکڑے جائیں گے۔ اس وقت آپؐ نے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ : ۴۰) کچھ غم نہ کھاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اِس لفظ پر غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں؛ چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ مَعَنَا میں آپ دونوں شریک ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ تیرے اور میرے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک پلّہ پر آنحضرتؐ کو اور دُوسرے پر حضرت صدیقؓ کو رکھا ہے۔ اس وقت دونوں ابتلا میں ہیں۔ کیونکہ یہی وُہ مقام ہے جہاں سے یا تو اسلام کی بنیاد پڑنے والی ہے یا خاتمہ ہو جانے والا ہے۔ دشمن غار پر موجود ہیں اور مختلف قسم کی رائے زنیاں ہو رہی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس غار کی تلاشی کرو، کیونکہ نشانِ پا یہاں تک ہی آکر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اُن میں سے بعض کہتے ہیں کہ یہاں انسان کا گذر اور دخل کیسے ہوگا۔ مکڑی نے جالا تنا ہوا ہے۔ کبوتر نے انڈے دیئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کی آوازیں اندر پہنچ رہی ہیں اور آپ بڑی صفائی سے اُن کو سُن رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دشمن آتے ہیں کہ وُہ خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور دیوانے کی طرح بڑھتے آتے ہیں، لیکن آپؐ کی کمال شجاعت کو دیکھو کہ دشمن سر پر ہے اور آپؐ اپنے رفیقِ صادق صدیقؓ کو فرماتے ہیں۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ یہ الفاظ بڑی صفائی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ آپؐ نے زبان ہی سے فرمایا، کیونکہ یہ آواز کو چاہتے ہیں۔ اشارہ سے کام نہیں چلتا۔ باہر دشمن مشورہ کر

کر رہے ہیں اور اندر غار میں خادم و مخدوم بھی باتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس امر کی پروا نہیں کی گئی کہ دشمن آواز سُن لیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر کمال ایمان اور معرفت کا ثبوت ہے۔ خدا تعالیٰ کے وعدوں پر پُورا بھروسہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کے لیے تو یہ نمونہ کافی ہے۔ ابوبکر صدیقؓ کی شجاعت کے لیے ایک دُوسرا گواہ اِس واقعہ کے سوا اور بھی ہے۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت حضرت ابوبکرؓ کی شجاعت

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار کھینچ کر نکلے کہ اگر کوئی کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا ہے، تو میں اسے قتل کر دُوں گا۔ ایسی حالت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بڑی جرأت اور دلیری سے کلام کیا اور کھڑے ہو کر خُطبہ پڑھا۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران : ۱۴۵) یعنی محمدؐ بھی اللہ تعالیٰ کے ایک رسُول ہی ہیں اور آپؐ سے پہلے جسقدر نبی ہو گذرے ہیں، سبھی نے وفات پائی۔ اس پر وُہ جوش فرو ہوا۔ اس کے بعد بادیہ نشین اعراب مرتد ہو گئے۔ ایسے نازک وقت کی حالت کو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یُوں ظاہر فرمایا ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو چکا ہے اور بعض جھوٹے مدّعی نبوت کے پیدا ہو گئے ہیں اور بعضوں نے نمازیں چھوڑ دیں اور رنگ بدل گیا ہے۔ ایسی حالت میں اور اس مصیبت میں میرا باپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ اور جانشین ہوا میرے باپ پر ایسے ایسے غم آئے کہ اگر پہاڑوں پر آتے، تو وہ بھی نابُود ہو جاتے۔ اب غور کرو کہ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے پر بھی ہمت اور حوصلہ کو نہ چھوڑنا یہ کسی معمولی انسان کا کام نہیں۔ یہ استقامت صدق ہی کو چاہتی تھی اور صدیقؓ نے ہی دکھائی۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی دوسرا اس خطرہ کو سنبھال سکتا۔ تمام صحابہؓ اس وقت موجود تھے۔ کسی نے نہ کہا کہ میرا حق ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ آگ لگ چکی ہے۔ اس آگ میں کون پڑے۔ حضرت عمرؓ نے اس حالت میں ہاتھ بڑھا کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر سب نے یکے بعد دیگرے بیعت کر لی۔ یہ اُن کا صِدق ہی تھا کہ اِس فتنہ کو فرو کیا اور اُن موذیوں کو ہلاک کیا۔ مسیلمہ کے ساتھ ایک لاکھ آدمی تھا اور اس کے مسائل اباحت کے مسائل تھے۔ لوگ اس کی اباحتی باتوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کے مذہب میں شامل ہوتے جاتے تھے، لیکن خدا تعالیٰ نے اپنی معیت کا ثبوت دیا اور ساری مشکلات کو آسان کر دیا۔

عیسائیت قبول کرنے کی ترغیبات

خُونِ مسیحؑ پر ایمان لانا بھی سہل بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اس پر ایمان لانے سے ایک تو روٹی مل جاتی ہے دوسرے اباحت کی زندگی۔ اسلام میں تو اللہ اکبر کی آواز سے ہی نماز کے لیے اُٹھنا پڑتا تھا، مگر اب یہ حال کہ خُونِ مسیحؑ پر ایمان لا کر رات کو شراب پی کر سو گئے اور جب جی چاہا اُٹھے۔ کوئی باز پُرس نہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کا رجُوع عیسائیت کی طرف ہونا لازمی امر ہے۔ لوگوں کی حالت کچھ اِس قسم کی ہو گئی ہے کہ کہتے ہیں۔ ”ایہہ جہان مِٹھا، اگلا کس ڈِٹھا“

اس جہان میں بدمعاشیاں کرو، آگے دیکھا جائے گا۔ اس قسم کے لوگ روٹی، بے قیدی اور آرام کی زندگی عیسائیت ہی میں پا سکتے ہیں۔ اُن کے لیے کوئی ضروری اُمر نہیں۔ خواہ دس برس تک بھی غُسلِ جنابت نہ کریں۔ پس ان لوگوں کو جو عیسائی ہوتے ہیں دیکھ کر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دہریہ مَنِش جو مُرتد ہوئے ہیں، اگر عیسائی نہ ہوتے تو باطنی طور پر بھی تو مُرتد ہی تھے۔

چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک ازلی کافر جو بے قیدی اور اباحت کی زندگی کو چاہتے ہیں۔ اور تین قسم کے مومن۔ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ۔ مُقْتَصِدٌ۔ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ۔ پہلی قسم کے مومن وہ ہیں جو ظالم ہیں، یعنی ان پر کچھ جذباتِ نفس غالب آجاتے ہیں۔ دُوسرے میانہ رو اور تیسرے خیرِ مجسّم۔ اب ازلی کافر جو نفس کے غلام اور بندے ہیں۔ جن کی غرض و غایت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ بے قیدی کی زندگی بسر ہو اور روپیہ بھی برباد ہو۔ اُن کو اسلام سے کیا مناسبت، وہ تو عیسائیت کو پسند کریں گے کہ تنخواہ مل جائے اور کسی چیز کی ضرورت نہ رہے۔ اگر جائیں گے، تو وہاں بھی محض اس غرض سے کہ صد ہا خوبصورت عورتیں اچھے لباس پہن کر جاتی ہیں۔ وہاں بدنظری کے لیے جا بیٹھے۔ غرض اس قسم کی اباحتی زندگی والوں کو اسلام سے کوئی مناسبت ہو ہی نہیں سکتی۔

حضرت ابوبکرؓ اسلام کے لیے آدمِ ثانی ہیں

اُس زمانہ میں بھی مسیلمہ نے اباحتی رنگ میں لوگوں کو جمع کر رکھا تھا۔ ایسے وقت میں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوتے تو انسان خیال کر سکتا ہے کہ کس قدر مشکلات پیدا ہوئی ہوں گی۔ اگر وُہ قوی دل نہ ہوتا اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا رنگ اُس کے ایمان میں نہ ہوتا، تو بہت ہی مشکل پڑتی اور گھبرا جاتا، لیکن صدیقؓ نبیؐ کا ہم سایہ تھا۔ آپؐ کے اخلاق کا اثر اس پر پڑا ہوا تھا اور دل نُورِ یقین سے بھرا ہوا تھا۔ اس لیے وُہ شجاعت اور استقلال دکھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اُن کی زندگی اسلام کی زندگی تھی۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر کسی لمبی بحث کی حاجت ہی نہیں۔ اُس زمانہ کے حالات پڑھ لو اور پھر جو اسلام کی خدمت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی ہے اس کا اندازہ کرلو۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسلام کے لیے آدمِ ثانی ہیں۔ مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکرؓ کا وجود نہ ہوتا، تو اسلام بھی نہ ہوتا۔ ابوبکر صدیقؓ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے اسلام کو دوبارہ قائم کیا۔ اپنی قوتِ ایمانی سے کُل باغیوں کو سزا دی۔ اور امن کو قائم کر دیا۔ اسی طرح پر جیسے خدا تعالیٰ نے فرمایا اور وعدہ کیا تھا کہ مَیں سچے خلیفہ پر امن کو قائم کروں گا۔ یہ پیشگوئی حضرت صدیقؓ کی خلافت پر پُوری ہوئی اور آسمان نے اور زمین نے عملی طور پر شہادت دے دی۔ پس یہ صدیق کی تعریف ہے کہ اُس میں صدق اس مرتبہ اور کمال کا ہونا چاہیئے۔ نظائر سے مسائل بہت جلد حل ہو جاتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا مقامِ صدیقیت

اگر گذشتہ زمانہ میں اس کی نظیر دیکھی جائے تو پھر یوسفؑ صدیق ہے۔ جس نے ایسا صدق دکھایا کہ یوسفؑ صدیق کہلایا۔ ایک خوبصورت، معزز اور جوان عورت جو بڑے بڑے دعوے کرتی ہے، عین تنہائی اور تخلیہ میں ازتکابِ فعلِ بد چاہتی ہے، لیکن آفرین ہے اس صدیق پر کہ خدا تعالیٰ کے حدود کو توڑنا پسند نہ کیا اور اس کے بالمقابل ہر قسم کی آفت اور دُکھ اُٹھانے کو آمادہ ہوگیا۔ یہانتک کہ قیدی کی زندگی بسر کرنی منظور کرلی؛ چنانچہ کہا: رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ (یوسف: ۳۴) یعنی یوسف علیہ السلام نے دُعا کی کہ اے ربّ مجھ کو قید پسند ہے۔ اس بات سے جس کی طرف وُہ مجھے بُلاتی ہے۔ اس سے حضرت یوسفؑ کی پاک فطرت اور غیرتِ نبوّت کا کیسا پتہ لگتا ہے کہ دُوسرے اَمر کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیا مطلب کہ اُس کا نام نہیں لیا۔ یوسفؑ اللہ تعالیٰ کے حُسن واحسان کے گرویدہ اور عاشقِ زار تھے۔ اُن کی نظر میں اپنے محبُوب کے سوا دوسری کوئی بات جچ نہ سکتی تھی۔ وُہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے کہ حدُود اللہ کو توڑیں۔

کہتے ہیں کہ ایک لمبا زمانہ جو بارہ برس کے قریب بتایا جاتا ہے، وُہ جیل میں رہے۔ لیکن اس عرصہ میں کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کی تقدیر پر پُورے راضی رہے۔ اس عرصہ میں بادشاہ کو کوئی عرضی بھی نہیں دی کہ اُن کے معاملہ کو سوچا جائے یا اُنھیں رہائی دی جائے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس خودغرض عورت نے تکالیف کا سلسلہ بڑھادیا۔ کہ کسی طرح پر وُہ پھسل جاویں، مگر اس صدیق نے اپنا صِدق نہ چھوڑا۔ خدا نے ان کو صدیق ٹھہرایا۔ یہ بھی صدق کا ایک مقام ہے کہ دُنیا کی کوئی آفت، کوئی تکلیف اور کوئی ذلّت اُسے حدُود اللہ کے توڑنے پر آمادہ نہیں کرسکتی۔ جس قدر بلائیں بڑھتی جاویں، وُہ اُس کے مقامِ صدق کو زیادہ مضبوط اور لذیذ بناتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جیسا کہ مَیں بیان کرچکا ہوں کہ جب انسان اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ کر صِدق اور وفاداری کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہے، تو خدا تعالیٰ ایک بڑی نہر صِدق کی کھول دیتا ہے جو اس کے قلب پر آگرتی ہے اور اُسے صِدق سے بھر دیتی ہے وہ اپنی طرف سے بضاعتِ مُزجاۃ لاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اعلیٰ درجہ کی گراں قدر جنس اُسے عطا کرتا ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس مقام میں انسان یہانتک قدم مارتا ہے کہ وُہ صدق اس کے لیے ایک خارقِ عادت نشان ہوجاتا ہے۔ اس پر اس قدر معارف اور حقائق کا دریا کھُلتا ہے یعنی قوت دی جاتی ہے کہ ہر شخص کی طاقت نہیں ہے کہ اس کا مقابلہ کرسکے۔

مقامِ شہادت

تیسرا کمال شُہَدَاء کا ہے۔ عام لوگ تو شہید کے لیے اِتنا ہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ شہید وُہ ہوتا ہے، جو تیر یا بندوق سے مارا جائے یا کسی اور اتفاقی موت سے مرجائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہادت کا یہی مقام نہیں ہے۔ مَیں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ سرحد کے پٹھانوں کو یہ بھی

ایک خبط سمایا ہوا ہے کہ وُہ انگریز افسروں پر آکر حملے کرتے ہیں اور اپنی شوریدہ سری سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ اُنہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اگر ہم کسی کافر یا غیر مذہب والے کو ہلاک کر دیں گے، تو ہم غازی ہوں گے اور اگر مارے جائیں گے تو شہید ہوں گے۔ مجھے ان کمینہ فطرت مُلّانوں پر بھی افسوس ہے، جو ان شوریدہ سر پٹھانوں کو اُکساتے ہیں۔ وہ اُنہیں نہیں بتاتے کہ تم اگر کسی شخص کو بلا وجہ قتل کرتے ہو، تو غازی نہیں، ظالم ٹھہرتے ہو۔ تم اگر وہاں ہلاک ہو جاتے ہو تو شہید نہیں بلکہ خودکشی کر کے حرام موت مرتے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (البقرہ ۱۹۶:) وُہ اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور فساد کرتے ہیں۔ مَیں یقین رکھتا ہوں کہ وہ سخت سزا کے مستوجب ہیں۔ غرض عام لوگوں نے تو شہادت یہی سمجھ رکھی ہے اور شہید کا یہی مقام ٹھہرا لیا ہے۔ مگر میرے نزدیک شہید کی حقیقت قطع نظر اس کے کہ اس کا جسم کاٹا جائے کچھ اور بھی ہے اور وہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق دل سے ہے۔ یاد رکھو کہ صدیق نبی سے ایک قُرب رکھتا ہے اور وُہ اس سے دُوسرے درجے پر ہوتا ہے اور شہید صدیق کا ہمسایہ ہوتا ہے۔ نبی میں تو سارے کمالات ہوتے ہیں، یعنی وہ صدیق بھی ہوتا ہے اور شہید بھی ہوتا ہے اور صالح بھی ہوتا ہے۔ لیکن صدیق اور شہید دو الگ الگ مقام ہیں۔ اس بحث کی بھی حاجت نہیں کہ آیا صدیق، شہید ہوتا ہے یا نہیں؟ وُہ مقام کمال جہاں ہر ایک امر خارقِ عادت اور معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ وُہ ان دونوں مقاموں پر اپنے رُتبہ اور درجہ کے لحاظ سے جُدا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اُسے ایسی قوّت عطا کرتا ہے کہ جو عمدہ اعمال ہیں اور جو عمدہ اخلاق ہیں۔ وہ کامل طور پر اور اپنے اصل رنگ میں اُس سے صادر ہوتے ہیں اور بلا تکلف صادر ہوتے ہیں۔ کوئی خوف اور رجاء اُن اعمالِ صالحہ کے صدُور کا باعث نہیں ہوتا، بلکہ وُہ اُس کی فطرت اور طبیعت کا جزو ہو جاتے ہیں۔ تکلف اُس کی طبیعت میں نہیں رہتا۔ جیسے ایک سائل کسی شخص کے پاس آوے، تو خواہ اُس کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو، تو اُسے دینا ہی پڑے گا۔ اگر خدا کے خوف سے نہیں تو خلقت کے لحاظ سے ہی سہی۔ مگر شہید میں اس قسم کا تکلف نہیں ہوتا اور یہ قوّت اور طاقت اُس کی بڑھتی جاتی ہے اور جُوں جُوں بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر اُس کی تکلیف کم ہوتی جاتی ہے اور وُہ بوجھ کا احساس نہیں کرتا۔ مثلاً ہاتھی کے سر پر ایک چیونٹی ہو تو وُہ اس کا کیا احساس کرے گا۔

کیا کسی مقام پر نماز ساقط ہو جاتی ہے؟

"فتوحاتِ مکیہ" کی ایک عبارت کی تشریح

فتوحات میں اس مقام کی طرف اشارہ کر کے ایک لطیف بات لکھی ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ جب انسان کامل درجہ پر پہنچتا ہے، تو اُس کے لیے نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ جاہلوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ نماز ہی معاف ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بعض بے قید فقیر کہتے ہیں۔ اُن کو اس مقام کی خبر نہیں اور اس لطیف نکتہ پر اطلاع نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ

ابتدائی مدارج سلوک میں نماز اور دُوسرے اعمالِ صالحہ ایک قسم کا بوجھ معلوم ہوتے ہیں اور طبیعت میں ایک کسل اور تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن جب انسان خدا تعالیٰ سے قوت پاکر اس مقام شہید پر پہنچتا ہے تو اس کو ایسی طاقت اور استقامت دی جاتی ہے کہ اُسے اُن اعمال میں کوئی تکلیف محسوس ہی نہیں ہوتی۔ گویا وہ اُن اعمال پر سوار ہوتا ہے اور صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، ہمدردیِ بنی نوع، مروّت، فتوّت غرض تمام اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کا صدور قوتِ ایمانی سے ہوتا ہے۔ کوئی مصیبت، دُکھ اور تکلیف خدا تعالیٰ کی طرف قدم اُٹھانے سے اُسے روک نہیں سکتی۔ شہید اُسی وقت کسی شخص کو کہیں گے جب اُس کی قوتِ ایمانی اس سے وہ فعل دکھائے کہ آرام سے ان افعال کا صدور ہو۔ جیسے پانی اُوپر سے نیچے کو گرتا ہے۔ اسی طرح پر شہید سے اعمالِ صالحہ کا صدور ہوتا ہے۔ شہید اللہ تعالیٰ کو گویا دیکھتا ہے اور اُس کی طاقتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جب یہ مقام کامل درجہ پر پہنچے، تو یہ ایک نشان ہوتا ہے۔

ابتلاء اور آزمائش میں شہید کا رویہ

بعض آدمی دیکھے گئے ہیں کہ جب کوئی ابتلاء آجائے تو گھبرا اُٹھتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتے ہیں۔ اُن کی طبیعت میں ایک افسردگی پائی جاتی ہے، کیونکہ وہ صُلح جو کلّی طور پر خدا تعالیٰ سے ہونی چاہیے، اُن کو حاصل نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ سے انسان کی اُسی وقت تک صُلح رہ سکتی ہے کہ جبتک اُس کی مانتا رہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کا معاملہ ایک دوست کا معاملہ ہے۔ کبھی ایک دوست دُوسرے کی مان لیتا ہے اور دُوسرے وقت اُس کو اس دوست کی ماننی پڑتی ہے اور یہ تسلیم خوشی اور انشراحِ صدر سے ہونی چاہیے نہ کہ مجبوراً۔

اللہ تعالیٰ ایک جگہ قرآن شریف میں فرماتا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ (البقرہ : ۱۵۶) یعنی ہم آزماتے رہیں گے کبھی ڈرا کر، کبھی بھوک سے۔ کبھی مالوں اور ثمرات وغیرہ کا نقصان کر کے۔ یہاں ثمرات میں اولاد بھی داخل ہے اور یہ بھی کہ بڑی محنت سے کوئی فصل تیار کی اور یکایک اُسے آگ لگ گئی اور وہ تباہ ہوگئی۔ یا دیگر اُمور کے لیے محنت اور مشقت کی، مگر نتیجہ میں ناکام رہ گیا۔ غرض مختلف قسم کے ابتلاء اور عوارض انسان پر آتے ہیں اور یہ خدا تعالیٰ کی آزمائش ہے۔ ایسی صُورت میں جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی اور اُس کی تقدیر کے لیے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ وُہ بڑی شرحِ صدر سے کہتے ہیں: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ : ۱۵۷) کسی قسم کا شکوہ اور شکایت یہ لوگ نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ - الخ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کے حصّہ میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں کو مشکلات میں راہ دکھا دیتا ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی کریم و رحیم اور با مروّت ہے۔ جب کوئی شخص اس کی رضا کو مقدم کر لیتا ہے اور اُس کی مرضی پر راضی ہو جاتا ہے تو وُہ اُس کو اُس کا بدلہ دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ غرض یہ تو وُہ مقام اور مرحلہ ہے جہاں وُہ اپنی بات منوانی چاہتا ہے۔

دُوسرا مقام اور مرحلہ وُہ ہے جو اس نے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن : ۶۱) میں فرمایا ہے۔ یہاں وُہ بندے کی

بات ملنے کا وعدہ فرماتا ہے۔ پس شہید اس پہلے مقام پر کھڑا ہوتا ہے یعنی انشراح صدر کے ساتھ خدا تعالیٰ کی بات مانتا ہے وُہ دوست کے ایلام کو بر رنگِ انعام مشاہدہ کرتا ہے۔

مقامِ صالحیت چوتھا درجہ صالحین کا ہے۔ یہ بھی جب کمال کے درجہ پر ہو، تو ایک نشان اور معجزہ ہوتا ہے۔ کامل صلاح یہ ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی فساد باقی نہ رہے۔ بدنِ صالح میں کسی قسم کا کوئی خراب اور زہریلا مادہ نہیں ہوتا، بلکہ جب صاف اور مویدِ صحت مواد اس میں ہو، تو اس وقت صالح کہلاتا ہے۔ جب تک صالح مادہ نہیں، تب تک اس کے لوازم بھی صالح نہیں ہوتے۔ یہانتک کہ مٹھاس بھی اُسے کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح پر جبتک انسان صالح نہیں بنتا اور ہر قسم کی بدیوں سے نہیں بچتا اور خراب مادے نہیں نکلتے، اس وقت تک عبادات کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ نماز پڑھتا ہے، لیکن اُسے کوئی لذت اور سُرور نہیں آتا۔ وہ ٹکریں مار کر منحوس مُنہ سے سلام پھیر کر رخصت ہوتا ہے، لیکن عبادات میں مزا اُسی وقت آتا ہے، جب گندے مواد اندر سے نکل جاتے ہیں۔ پھر اُنس اور ذوق شوق پیدا ہوتا ہے۔ اصلاح انسانی اسی درجہ سے شروع ہوتی ہے[ؐ]۔ (اس قدر تقریر کے بعد حضرت مسیح موعودؑ نے دُعا فرمائی۔ اور جلسہ برخاست ہو گیا۔)

۱۰؍ دسمبر ۱۸۹۹ء بروز اتوار ۹ بجے صُبح۔ قادیان

مُفتی محمد صادق صاحب سے جو لاہور سے تین سال کے اندر طلبِ نشان والی پیشگوئی کے اشتہار کا انگریزی ترجمہ کرا کر ہمراہ لائے تھے۔ سیر پر جانے سے پہلے فرمایا "آپ نے اس کام میں خوب ہمت کی" فرمایا

حصُولِ ثواب کی راہ "اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ہم نے انگریزی نہیں پڑھی۔ وُہ آپ لوگوں کو ثواب میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم انگریزی پڑھے ہوئے ہوتے، تو اُردو کی طرح اس کے بھی دو چار صفحے ہم روز لکھ دیا کرتے، مگر خدا نے چاہا کہ جیسے آپ ہیں اور مولوی محمد علی صاحب ہیں آپ لوگوں کو بھی ثواب دیا جاتے۔"

[اس پر مفتی محمد صادق صاحب نے عرض کی کہ یہ ہمت اور ثواب تو مولوی محمد علی صاحب کا ہی حصہ ہے۔]

فرمایا: "عالمگیر کے زمانہ میں مسجد شاہی کو آگ لگ گئی، تو لوگ دوڑے دوڑے بادشاہ سلامت کے پاس پہنچے اور عرض کی کہ مسجد کو تو آگ لگ گئی۔ اس خبر کو سُنکر وہ فوراً سجدہ میں گرا اور شکر کیا۔ حاشیہ نشینوں نے تعجب سے پُوچھا کہ حضور سلامت یہ کونسا وقت شکر گذاری کا ہے کہ خانۂ خدا کو آگ لگ گئی اور مسلمانوں کے دلوں کو سخت صدمہ

ؐ الحکم جلد ۹ ۱۰-۹ پرچہ جات ۱۷ مارچ تا ۲۴ مئی ۱۹۰۵ء

پہنچا ہے تو بادشاہ نے کہا کہ مَیں مُدت سے سوچتا تھا اور آہِ سرد بھرتا تھا کہ اتنی بڑی عظیم الشان مسجد جو بنی ہے اور اس عمارت کے ذریعہ سے ہزار ہا مخلوقات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ کاش کوئی ایسی تجویز ہوتی کہ اس کارِ خیر میں کوئی میرا بھی حِصّہ ہوتا لیکن چاروں طرف سے مَیں اِس کو ایسا مکمل اور بے نقص دیکھتا تھا کہ مجھے کچھ سوجھ نہ سکتا تھا کہ اس میں میرا ثواب کسی طرح ہو جائے سو آج خدا تعالیٰ نے میرے واسطے حصُولِ ثواب کی ایک راہ نکال دی۔ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔“

پھر لیکھرام کے متعلق دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ فرمایا :

لیکھرام اور اس کے ساتھی

”اسلام پر حملہ کرنے میں اور مسلمانوں کے بیجا دل دُکھانے میں آریوں کے درمیان ایک طرح کی تریمورتی تھی۔ جن میں سے سب سے بڑھ کر لیکھرام تھا اور اس کے بعد اندرمن اور الکھ دھاری تھے۔“ فرمایا:” دیانند بھی تھا مگر اس کو ایسا موقعہ نہیں تھا اور نہ وُہ اس طرح سے کتابیں لکھتا تھا۔ ان تینوں نے اور خصوصاً لیکھرام نے بڑی بے ادبیاں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا طریق ہے کہ جس راہ سے کوئی بدی کرے، اُسی راہ سے گرفتار کیا جاتا ہے؛ چونکہ لیکھرام نے زبان کی چھُری کو اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف حد سے بڑھ کر چلایا۔ اِس واسطے خدا تعالیٰ نے اُس کو چھُری سے سزا دی۔

لیکھرام کے معاملہ میں غیب کا ہاتھ

لیکھرام کے معاملہ میں غیب کا ہاتھ کام کرتا ہوا صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس شخص (یعنی قاتل) کا شُدھ ہونے کے لیے اُس کے پاس آنا۔ اُس کا اس پر بھروسہ کرنا۔ یہانتک کہ اپنے گھر میں بلاتکلف اُس کو لے جانا، شام کے وقت دیگر ملاقاتیوں کا چلا جانا۔ ان کا اکیلا رہ جانا، عین عید کے دُوسرے دن اُس کا اِس کام کے لیے عازم ہونا لیکھرام کا لکھتے لکھتے کھڑے ہو کر انگڑائی لینا اور اپنے پیٹ کو سامنے نکالنا اور چھُری کا وار کاری پڑنا۔ مرتے دم تک اُس کی زبان کو خدا کا ایسا بند کرنا کہ باوجود ہوش کے اور اس علم کے کہ ہم نے اُس کے برخلاف پیش گوئی کی ہوئی ہے۔ ایک سیکنڈ کے واسطے اس شُبہ کا اظہار بھی نہ کرنا کہ مجھے مرزا صاحب پر شک ہے۔ پھر آجتک اُس کے قاتل کا پتہ نہ چلنا۔ یہ سب خدا تعالیٰ کے فعل ہیں جو ہیبت ناک طور پر اس کی قُدرت اور طاقت کا جلوہ دکھا رہے ہیں۔“ فرمایا :

” لیکھرام بڑا ہی زبان دراز تھا اور اس کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ اِذَا ھَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ۔ اب اللہ تعالیٰ زمین کو ایسے لوگوں سے پاک رکھے گا۔“

دیگر انبیاء کے معجزات

فرمایا: ”دُنیا کے اندر جو نشانات حضرت موسیٰؑ یا دیگر انبیاءؑ نے اس طرح کے دکھائے۔ جیسا کہ سوٹے سے سانپ بنانا۔ یہ سب شُبہ میں ڈالنے والی باتیں ہیں۔ خصوصاً اس موجودہ زمانہ میں جبکہ ہر طرح کی شعبدہ بازیاں مداری لوگ دکھاتے ہیں کہ انسان کی سمجھ میں

ہرگز نہیں آتا کہ یہ امر کس طرح سے ہوگیا۔ انگریز لوگ ایسے ایسے کرتب شعبدہ بازی کے دکھاتے ہیں کہ مرا ہوا آدمی واپس آ جاتا ہے اور ٹوٹی ہوئی چیزیں ثابت دکھائی دیتی ہیں۔ جیساکہ آئینِ اکبری میں بھی ابوالفضل نے ایک قِصّہ بیان کیا ہے کہ ایک شعبدہ باز آسمان پر لوگوں کے سامنے چڑھ گیا اور اُوپر سے اس کے اعضاء ایک ایک ہو کر گرے اور اُس نے اپنی بیوی کے لیے مطالبہ کیا اور ایک وزیر پر شبہ کیا کہ اُس نے چھپا رکھی ہے اور یہ اُس پر عاشق ہے اور پھر اُس کی تلاشی کی اجازت بادشاہ سے لے کر اُسی کی بغل سے نکال لی۔"

فرمایا: "ایسی صُورتوں میں پھر سوائے اس کے اور کچھ بات باقی نہیں رہتی کہ انسان ایمان سے کام لے اور انبیاءؑ کے کاموں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور شعبدہ بازوں کے کاموں کو دھوکا اور فریب خیال کرے اور اس طرح سے یہ معاملہ بہت نازک ہو جاتا ہے۔"

قرآن شریف کا معجزہ

لیکن خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو جو معجزہ عطا فرمایا ہے، وُہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم اور اُصولِ تمدّن اور اُس کی فصاحت و بلاغت کا ہے جس کا مقابلہ کوئی انسان ہرگز نہیں کرسکتا اور ایسا ہی معجزہ غیب کی خبروں اور پیشگوئیوں کا ہے۔ اس زمانہ کا کوئی شعبدہ بازی کا اُستاد ایسا کرنے کا ہرگز دعویٰ نہیں کرتا۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے نشانات کو ایک صاف تمیز عطا فرمائی ہے تاکہ کسی شخص کو حیلہ حجّت بازی کا نہ رہے اور اس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے نشانات کھول کھول کر دکھاتے ہیں جن میں کوئی شک و شُبہ اپنا دخل پیدا نہیں کرسکتا۔"

(ایک شخص نے عرض کی کہ ایک معترض اعتراض کرتا تھا کہ مرزا صاحب نے لیکھرام کو خود مروا ڈالا ہے)

فرمایا کہ "یہ ایک بے ہُودہ اور جھوٹ بات ہے، مگر ان لوگوں کو یہ تو خیال کرنا چاہیے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابورافع اور کعب کو کیوں قتل کروا دیا تھا۔"

فرمایا: "ہماری سب پیشگوئیاں اقتداری پیشگوئیاں ہیں اور یہ اس بات کا نشان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔"

قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت

فرمایا: "لوگوں کی فصاحت اور بلاغت الفاظ کے ماتحت ہوتی ہے اور اس میں سوائے قافیہ بندی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جیساکہ ایک عرب نے لکھا ہے کہ سَافَرْتُ اِلَی رُوْمٍ وَاَنَا عَلٰی جَمَلٍ مَا تُوْمٍ۔ میں رُوم کو روانہ ہوا اور میں ایک ایسے اُونٹ پر سوار ہوا جس کا پیشاب بند تھا۔ یہ الفاظ صرف قافیہ بندی کے واسطے لائے گئے ہیں۔ مگر یہ قرآن شریف کا اعجاز ہے کہ اس میں سارے الفاظ ایسے موتی کی طرح پروئے گئے ہیں اور اپنے اپنے مقام پر رکھے گئے ہیں کہ کوئی ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ نہیں رکھا جاسکتا اور کسی کو دُوسرے لفظ سے بدلا نہیں جاسکتا، لیکن باوجود اس کے کہ قافیہ بندی

اور فصاحت اور بلاغت کے تمام لوازم موجود ہیں ‘‘

[ایک شخص نے کسی صوفی گدی نشین کی تعریف کی کہ وُہ آدمی بظاہر نیک معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر اس کو سمجھایا جائے تو امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس بات کو پا جائے اور عرض کی کہ میرا اس کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے کہ اگر حضور مجھے ایک خط اُن کے نام لکھ دیں، تو مَیں لے جاؤں گا اور امید ہے کہ اُن کو فائدہ ہو۔ اس پر آپؑ نے فرمایا : کہ]

’’آپ دو چار دن اور یہاں ٹھہریں۔ مَیں انتظار کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ خود بخود استقامت کے ساتھ کوئی بات دل میں ڈال دے، تو مَیں آپ کو لکھ دُوں ‘‘ پھر فرمایا :

’’ جبتک اِن لوگوں کو اِستقامت حُسنِ نیت کے ساتھ چند دن کی صحبت نہ حاصل ہو جائے، تب تک مشکل ہے۔ چاہیے کہ نیکی کے واسطے دل جوش مارے اور خدا کی رضا کے حصُول کے لیے دل ترساں ہو ‘‘

کلمہ طیبہ شجاعت پیدا کرتا ہے

اس شخص نے پھر عرض کی کہ ان لوگوں کو اکثر یہ حجاب بھی ہوتا ہے کہ شاید کسی کو معلوم ہو جائے، تو لوگ ہمارے پیچھے پڑ جائیں۔ فرمایا :

’’ اس کا سبب یہ ہے کہ ایسے لوگ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کے قائل نہیں ہوتے اور سچے دل سے اس کلمہ کو زبان سے نکالنے والے نہیں ہوتے ‘‘ فرمایا : جب زید و بکر کا خوف درمیان میں ہے، تب تک لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کا نقش دل میں نہیں جم سکتا ‘‘ فرمایا :

’’ یہ جو رات دن مُسلمانوں کو کلمہ طیبہ کہنے کے واسطے تحریص اور تاکید ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شجاعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب آدمی لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے تو تمام انسانوں اور چیزوں اور حاکموں اور افسروں اور دشمنوں اور دوستوں کی قوت اور طاقت ہیچ ہو کر انسان صرف اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور اس کے سوائے سب اُس کی نظروں میں ہیچ ہو جاتے ہیں پس وُہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اور کوئی ڈرانے والا اُس کو ڈرا نہیں سکتا ‘‘

فراست

فرمایا : فراست بھی ایک چیز ہے۔ جیسا کہ ایک یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ مَیں ان میں نبوت کے نشان پاتا ہوں اور ایسا ہی مباہلہ کے وقت عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر نہ آئے، کیونکہ اُن کے مشیر نے ان کو کہہ دیا تھا کہ مَیں ایسے مُنہ دیکھتا ہوں کہ اگر وہ پہاڑ کو کہیں گے کہ یہاں سے ٹل جا، تو وُہ ٹل جائے گا ‘‘

فرمایا : ’’ اگر کسی کے باطن میں کوئی حصّہ روحانیت کا ہے، تو وُہ مجھ کو قبول کرے گا ‘‘

کتابِ تعلیم لکھنے کی خواہش

فرمایا: "مَیں چاہتا ہوں کہ ایک کتاب تعلیم کی لکھوں اور مولوی محمد علی صاحب اُس کا ترجمہ کریں۔ اس کتاب کے تین حِصّے ہوں گے :

ایکؔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہمارے کیا فرائض ہیں اور دوسؔرے یہ کہ اپنے نفس کے کیا کیا حقوق ہم پر ہیں۔ اور تیسؔرے یہ کہ بنی نوع کے ہم پر کیا کیا حقوق ہیں۔"

اولیاء کی کرامات

فرمایا: "زمانۂ نبوّت تو نورٌ علیٰ نور تھا اور ایک آفتاب تھا، لیکن اُس کے بعد کے اولیاء کے جو خوارق و کرامات بتلائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ انکشاف نہیں رکھتے اور اُن کی تاریخ کا صحیح پتہ نہیں لگ سکتا؛ چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات اُن کی وفات کے دو سو سال بعد لکھی گئیں اور علاوہ اس کے اُن لوگوں کو یہ موقع دشمن کے مقابلہ کا نہیں ملا اور نہ اُن کو ایسا فتنہ درپیش آیا، جیسا کہ ہم کو۔"

امرِ مقدّر

فرمایا: "ابھی ہمارے مخالفوں میں سے بہت سے ایسے آدمی ہیں جن کا ہماری جماعت میں داخل ہونا مقدر ہے۔ وہ مخالفت کرتے ہیں پر فرشتے ان کو دیکھ کر ہنستے ہیں کہ تم بالآخر انہی لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ وُہ ہماری مخفی جماعت ہے جو کہ ہمارے ساتھ ایک دن مِل جائے گی۔"

(سَیر سے واپس آکر آپؑ اندر تشریف لے گئے اور کھانے کے وقت دوبارہ تشریف لائے اور ملّانوں کی نفس پرستیوں اور طلاق و حلالہ کی منحوس رسومات پر مختلف گفتگو فرماتے رہے۔ ظہر و عصر کی نمازوں میں جماعت کے ساتھ شریک ہوئے پھر شام کی نماز پڑھ لینے کے بعد سے نماز عشاء سے فراغت حاصل کر لینے تک احباب میں تشریف فرما رہے۔ ایک دوست کا خط اور دیگر دو اخبارات بعد نماز سُنے۔ مولوی عبدالکریم صاحب نے میر حامد شاہ صاحب کی ایک نظم سُنائی جس سے آپؑ بہت خوش ہوئے اور اسے اخبار میں چھپوا دینے کا حکم دیا۔ وُہ نظم یہ تھی ؎

ڈنکا بجا جہاں میں مسیحا کے نام کا خادم ہے دینِ پاکِ رسولِ انام کا

لوقا

دُوسرے دن صبح نو بجے کی سَیر میں لوقا کے ذکر پر جس کا بیان سیالکوٹ کے ایک اخبار میں سے گزشتہ دن سُنایا گیا تھا جس میں مرہمِ عیسیٰ کے ضمن میں لکھا گیا تھا۔ بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آپؑ نے مفتی محمد صادق صاحب اور مولوی اللہ دیا لودھیانوی کو مزید تحقیقات کا حکم دیا۔ دورانِ گفتگو میں فرمایا:

"عربی میں لق چٹنی کو کہتے ہیں" جس پر مفتی محمد صادق صاحب نے کہا کہ انگریزی میں لِق چاٹنے کو کہتے ہیں۔ اس پر آپؑ نے فرمایا کہ چٹنی تک تو بات پہنچ گئی ہے امید ہے کہ مرہم پٹی تک بھی بات نکل آوے۔" فرمایا۔ "انگریزی کتابوں اور تاریخ کلیسا سے اس کے حالات کے متعلق تحقیقات کرنی چاہیے۔ یہ ایک نئی بات نکلی ہے۔ پھر فرمایا: "یہ کچھ مشکل امر نہیں ہے۔ اگر ہم چاہیں تو لوقا پر توجہ کریں اور اس سے سب حال دریافت کریں، مگر ہماری طبیعت اس امر سے کراہت

کرتی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی اور کی طرف توجہ کریں۔ خدا تعالیٰ آپ ہمارے سب کام بناتا ہے۔

کشفِ قبور

یہ لوگ جو کشفِ قبور لیے پھرتے ہیں، یہ سب جھوٹ اور لغو اور بیہودہ بات ہے اور شرک ہے۔ ہم نے سنا ہے۔ اس طرف ایک شخص پھرتا ہے اور اس کو بڑا دعویٰ کشفِ قبور کا ہے۔ اگر اس کا علم سچا ہے، تو چاہیے کہ وہ ہمارے پاس آئے اور ہم اُس کو ایسی قبروں پر لے جائیں گے جن سے ہم خُوب واقف ہیں، مگر یہ سب بیہودہ باتیں ہیں اور اُن کے پیچھے پڑنا، وقت کو ضائع کرنا ہے۔ سعید آدمی کو چاہیے کہ ایسے خیالات میں اپنے اوقات کو خراب نہ کرے۔ اس طریق کو اختیار کرے، جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے صحابہؓ نے اختیار کیا۔

سرود

اس کے بعد مختلف گدی نشینوں کے حالات پر افسوس ہوتا رہا۔ جو سرود وغیرہ بدعات میں گرفتار ہیں۔ اس پر آپؑ نے فرمایا کہ:

" انسان میں ایک ملکہ اِحتظاظ کا ہوتا ہے کہ وُہ سرود سے حظ اُٹھاتا ہے اور اُس کے نفس کو دھوکا لگتا ہے کہ میں اس مضمون سے سُرور پا رہا ہوں، مگر دراصل نفس کو صرف حظ درکار ہوتا ہے۔ خواہ اُس میں شیطان کی تعریف ہو یا خدا کی۔ جب یہ لوگ اس میں گرفتار ہو کر فنا ہو جاتے ہیں، تو اُن کے واسطے شیطان کی تعریف یا خدا کی سب برابر ہو جاتے ہیں۔"

(اس پر آج کی سیر ختم ہوئی۔ پھر کھانے کے وقت آپؑ باہر تشریف لائے اور کھانا کھانے کے بعد حضور اقدسؑ نے ایک تقریر فرمائی۔ جو کچھ میں اس میں سے ضبط رکھ سکا وہ لکھتا ہوں۔ اس زمانہ کے فتنہ و فساد کا ذکر تھا۔ فرمایا:)

اِس زمانہ کی بڑی عبادت

ایک مُسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس زمانہ کے درمیان جو فتنہ اسلام پر پڑا ہوا ہے، اس کے دُور کرنے میں کچھ حصّہ لے۔ بڑی عبادت یہی ہے کہ اِس فِتنہ کے دُور کرنے میں ہر ایک مُسلمان کچھ نہ کچھ حِصّہ لے۔ اس وقت جو بدیاں اور گُستاخیاں پھیلی ہوئی ہیں چاہیے کہ اپنی تقریر اور علم کے ذریعہ سے اور ہر ایک قوّت کے ساتھ جو اس کو دی گئی ہے۔ مخلصانہ کوشش کے ساتھ ان باتوں کو دُنیا سے اُٹھا دے۔ اگر اسی دُنیا میں کسی کو آرام اور لذّت مل گئی، تو کیا فائدہ۔ اگر دُنیا میں ہی درجہ پا لیا تو کیا حاصل۔ عقبیٰ کا ثواب لو جس کی انتہا نہیں۔ ہر ایک مسلمان کو خدا تعالیٰ کی توحید و تفرید کے لیے ایسا جوش ہونا چاہیے، جیسا کہ خود اللہ کو اپنی توحید کا جوش ہے۔ غور کرو کہ دُنیا میں اس طرح کا مظلوم کہاں ملے گا۔ جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کوئی گند اور گالی اور دُشنام نہیں جو آپ کی طرف نہ پھینکی گئی ہو۔ کیا یہ وقت ہے کہ مُسلمان خاموش ہو کر بیٹھ رہیں؟ اگر اس وقت کوئی شخص کھڑا نہیں ہوتا اور حق کی گواہی دے کر جھُوٹے کے مُنہ کو بند نہیں کرتا اور جائز رکھتا ہے کہ کافر لوگ بے حیائی سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتہام لگاتے جائیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے جائیں۔ تو یاد رکھو کہ وہ بیشک بڑی باز پرس کے نیچے ہے۔ چاہیے کہ جو کچھ علم اور واقفیت تمہیں حاصل ہے، وُہ اس راہ میں خرچ کرو۔ اور لوگوں کو اس

مصیبت سے بچاؤ۔ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ اگر تم دجّال کو نہ مارو تب بھی وہ مر ہی جائے گا۔ مثل مشہور ہے ؎
ہر کمالے را زوالے۔ تیرھویں صدی سے یہ آفتیں شروع ہوئیں اور اب وقت قریب ہے کہ اُس کا خاتمہ ہو جائے اس لیے ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جہانتک ہو سکے پوری کوشش کرے۔ نُور اور روشنی لوگوں کو دکھائے۔

خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے ظاہر ہونے کی تمنا

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ولی اللہ اور صاحب برکات وہی شخص ہے، جس کو یہ جوش حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کا جلال ظاہر ہو۔ نماز میں جو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہا جاتا ہے، وُہ بھی خدا تعالیٰ کے جلال کے ظاہر ہونے کی تمنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی عظمت ہو جس کی نظیر نہ ہو۔ نماز میں تسبیح و تقدیس کرتے ہوئے یہی حالت ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے کہ طبعاً جوش کے ساتھ اپنے کاموں سے اور اپنی کوششوں سے دکھا دے کہ اُس کی عظمت کے برخلاف کوئی شے مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔ یہ بڑی عبادت ہے۔ جو لوگ اس کی مرضی کے مطابق جوش رکھتے ہیں، وُہی مؤیّد کہلاتے ہیں اور وہی برکتیں پاتے ہیں۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال اور تقدیس کے لیے جوش نہیں رکھتے۔ اُن کی نمازیں جھوٹی ہیں اور ان کے سجدے بے کار ہیں۔ جبتک خدا تعالیٰ کے لیے جوش نہ ہو۔ یہ سجدے صرف منتر جنتر ٹھہریں گے۔ جن کے ذریعہ سے یہ بہشت کو لینا چاہتا ہے۔ یاد رکھو کوئی جسمانی بات جس کے ساتھ کیفیت نہ ہو، فائدہ مند نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو قربانی کے گوشت نہیں پہنچتے۔ ایسا ہی تمہارے رکوع اور سجود بھی نہیں پہنچتے، جبتک اُن کے ساتھ کیفیت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کیفیت کو چاہتا ہے اور اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی عزت اور عظمت کے لیے جوش رکھتے ہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ ایک باریک راہ سے گذرتے ہیں اور کوئی دوسرا شخص اُن کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ جب تک کیفیت نہ ہو انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ گویا خدا تعالیٰ نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اُس کے لیے جوش نہ ہو کوئی لذّت نہیں دے گا۔

ہر ایک آدمی کے ساتھ ایک تمنا ہوتی ہے لیکن کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ ساری تمناؤں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو مقدّم نہ کرے۔ ولی قریبی اور دوست کو کہتے ہیں۔ جو دوست چاہتا ہے، وُہی یہ چاہتا ہے۔ تب یہ ولی کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات : ۵۷) انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے جوش رکھے۔ تب وُہ اپنے ابنائے جنس سے بڑھ جائے گا اور خدا تعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے بن جائے گا۔ مُردوں میں سے نہیں ہونا چاہیے کہ مُردہ کے مُنہ میں ایک شئے ایک طرف سے ڈالی جاتی ہے، تو دُوسری طرف سے نکل آتی ہے۔ اسی طرح شقاوت کی حالت میں کوئی اچھی چیز اندر نہیں جا سکتی۔ یاد رکھو کہ کوئی عبادت اور صدقہ قبول نہیں ہوتا جبتک کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ذاتی جوش نہ ہو۔ جس کے ساتھ

کوئی ملونی ذاتی فوائد اور منافع کی نہ ہو اور ایسا جوش ہو کہ خود بھی نہ جان سکے کہ یہ جوش مجھ میں کیوں ہے۔ بہت ضرورت ہے کہ ایسے لوگ بکثرت پیدا ہوں، مگر سوائے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے کچھ ہو نہیں سکتا۔

حالاتِ زمانہ اور ضرورتِ مُصلح

اور جو لوگ اس طرح دینی خدمات میں مصروف ہوتے ہیں، وہ یاد رکھیں کہ وہ خدا تعالیٰ پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہر ایک فصل کے کاٹنے کا وقت آجاتا ہے۔ ایسا ہی اب مفاسد کے دُور کر دینے کا وقت آگیا ہے۔ تثلیث پرستی حد کو پہنچ گئی ہے۔ صادق کی توہین اور گستاخی انتہا تک کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر مکھی اور زنبور جتنی بھی نہیں کی گئی۔ زنبور سے بھی انسان ڈرتا ہے اور چیونٹی سے بھی اندیشہ کرتا ہے، لیکن حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا کہنے میں کوئی نہیں جھجکتا۔ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کے مِصداق ہو رہے ہیں۔ جتنا مُنہ اُن کا کھُل سکتا ہے۔ اُنھوں نے کھولا اور مُنہ پھاڑ پھاڑ کر سب وشتم کیے۔ اب واقعی وہ وقت آگیا ہے کہ خدا تعالیٰ اُن کا تدارک کرے۔ ایسے وقت میں وہ ہمیشہ ایک آدمی کو پیدا کیا کرتا ہے، جو اُس کی عظمت اور جلال کے لیے بہت جوش رکھتا ہے۔ ایسے آدمی کو باطنی مدد کا سہارا ہوتا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ سب کچھ آپ ہی کرتا ہے، مگر اس کا پیدا کرنا ایک سنّت کا پُورا کرنا ہوتا ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔ (الفتح: ۲۴) اب وہ وقت آگیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں عیسائیوں کو نصیحت فرمائی تھی کہ اپنے دین میں غُلو نہ کریں، پر اُنھوں نے اِس نصیحت پر عمل نہ کیا۔ اور پہلے وُہ ضالین تھے، مگر اب مُضلّین بھی بن گئے۔ خدا تعالیٰ کے صحیفہ قُدرت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بات حد سے گذر جاتی ہے، تو آسمان پر تیاری کی جاتی ہے۔ یہی اس کا نشان ہے کہ یہ تیاری کا وقت آگیا ہے۔ سچّے نبی و رسول و مجدّد کی بڑی نشانی یہی ہے کہ وہ وقت پر آوے اور ضرورت کے وقت آوے۔ لوگ قسم کھا کر کہیں کہ کیا یہ وقت نہیں کہ آسمان پر کوئی تیاری ہو، مگر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ آپ ہی کیا کرتا ہے۔ ہم اور ہماری جماعت اگر سب کے سب حجروں میں بیٹھ جائیں۔ تب بھی کام ہو جائے گا۔ اور دجّال کو زوال آجائے گا۔ تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (آل عمران: ۱۴۱) اُس کا کمال بتاتا ہے کہ اب اُس کے زوال کا وقت قریب ہے۔ اُس کا ارتفاع ظاہر کرتا ہے کہ اب وُہ نیچا دیکھے گا۔ اُس کی آبادی اُس کی بربادی کا نشان ہے۔ ہاں ٹھنڈی ہوا چل پڑی۔ اللہ تعالیٰ کے کام آہستگی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

اگر ہمارے پاس کوئی بھی دلیل نہ ہوتی، تاہم زمانہ کے حالات پر نظر کر کے مُسلمانوں پر واجب تھا کہ وُہ دیوانہ وار پھرتے اور تلاش کرتے کہ مسیحؑ اب تک کیوں نہیں کسرِ صلیب کے لیے آیا۔ اُن کو یہ نہ چاہیے تھا کہ اُسے اپنے جھگڑوں کے لیے بُلاتے، کیونکہ اُس کا کام کسرِ صلیب ہے اور اُسی کی زمانہ کو ضرورت ہے۔ اِسی لیے اُس کا نام مسیح موعُود ہے۔ اگر مُلّاؤں کو بنی نوع کی بھلائی اور بہبُودی مدِّنظر ہوتی، تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے جیسا ہم سے کر رہے ہیں۔ اُن کو سوچنا چاہیے تھا کہ اُنھوں نے ہمارے خلاف فتویٰ لکھ کر کیا بنا لیا ہے۔ جسے خدا تعالیٰ نے کہا کہ ہو جائے اُسے کون کہہ سکتا ہے

کہ نہ ہو۔ یہ لوگ جو ہمارے مخالف ہیں یہ بھی ہمارے نوکر چاکر ہیں کہ کسی نہ کسی رنگ میں ہماری بات مشرق و مغرب تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہم نے ابھی سُنا ہے کہ پیر گولڑوی ہمارے خلاف ایک کتاب لکھنے والا ہے۔ اس پر ہم خوش ہوئے کہ اس کے مریدوں میں سے جس کو ہمارے نام و دعوے کی خبر نہ تھی، اُس کو بھی خبر ہو جائے گی۔ اور اس طرح انھیں ہماری کتابیں دیکھنے کی ایک تحریک پیدا ہو گی[1]

---

[1] بدر جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۶،۳ پرچہ ۱۹؍ مارچ ۱۹۰۸ء

جلسہ سالانہ کی تقریر

◎

۲۸؍دسمبر ۱۸۹۹ء

تقریر اور وعظ میں محض للّٰہیت مقصود ہو

سب صاحبان متوجہ ہو کر سُنیں۔ مَیں اپنی جماعت اور خود اپنی ذات اور اپنے نفس کے لیے یہی چاہتا اور پسند کرتا ہوں کہ ظاہری قیل وقال جو لیکچروں میں ہوتی ہے۔ اُس کو ہی پسند نہ کیا جاوے اور ساری غرض وغایت آکر اُس پر ہی نہ ٹھہر جائے کہ بولنے والا کیسی جادُو بھری تقریر کر رہا ہے۔ الفاظ میں کیسا زور ہے۔ مَیں اس بات پر راضی نہیں ہوتا۔ مَیں تو یہی پسند کرتا ہوں اور نہ بناوٹ اور تکلف سے بلکہ میری طبیعت اور فطرت کا ہی یہی اقتضا ہے کہ جو کام ہو اللہ کے لیے ہو جو بات ہو۔ خدا کے واسطے ہو۔ اگر اللہ کی رضا اور اُس کے احکام کی تعمیل میرا مقصد نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ مجھے تقریریں کرنی اور وعظ سُنانا تو ایک طرف، مَیں تو ہمیشہ خلوت ہی کو پسند کرتا ہوں اور تنہائی میں وُہ لذت پاتا ہوں جس کو بیان نہیں کر سکتا، مگر کیا کروں بنی نوع کی ہمدردی کھینچ کھینچ کر باہر لے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حُکم ہے، جس نے مجھے تبلیغ پر مامُور کیا ہے۔ مَیں نے یہ بات، کہ ظاہری قیل وقال ہی کو پسند نہ کیا جائے، اس لیے بیان کی ہے کہ ہر خیر میں بھی شیطان کا حِصّہ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ پس جب انسان وعظ کے لیے کھڑا ہوتا ہے، تو اس میں شک نہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہت ہی عُمدہ کام ہے، مگر اس منصب پر کھڑا ہونے والے کو ڈرنا چاہیے کہ اس میں مخفی طور پر شیطان کا بھی حِصّہ ہے۔ کچھ تو واعظ کے بخرہ میں آتا ہے اور کچھ سُننے والوں کے حِصّہ میں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب واعظ وعظ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، تو مقصد اور دلی تمنا صرف یہ ہوتی ہے کہ مَیں ایسی تقریر کروں کہ سامعین خوش ہو جائیں۔ ایسے الفاظ اور فقرات بولوں کہ ہر طرف سے واہ واہ کی آوازیں آئیں۔ مَیں اس قسم کی تقریر کرنے والوں کے مقاصد کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ جیسے بھڑ توے، نقال، قوال، گویئے یہی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے سُننے والے ان کی تعریفیں کریں۔ پس جب ایک مجمع کثیر سُننے والا ہو اور اس میں ہر ایک مذاق اور درجہ کے لوگ موجود ہوں، تو خدا کی طرف کی آنکھ کھُلی نہیں ہوتی۔ اِلّا ماشاءاللہ مقصود یہی ہوتا ہے کہ سننے والے واہ واہ کریں۔ تالیاں بجائیں اور چیرز دیں۔ غرض یہ حِصّہ شیطان کا واعظ یا بولنے والے میں ہوتا ہے اور سامعین میں شیطانی حِصّہ یہ ہوتا ہے کہ وُہ بولنے والے کی فصاحت

بلاغتِ زبان پر پوری حکومت اور قادرالکلامی، برمحل اشعار، کہانیوں اور ہنسانے والے لطیفوں کو پسند کریں اور داد دیں تاکہ سخن فہم ثابت ہوں۔ گویا اُن کا مقصود بجائے خود خدا سے دُور ہوتا ہے اور بولنے والے کا الگ۔ وُہ بولتا ہے مگر خدا کے لیے نہیں اور یہ سُنتے ہیں، مگر ان باتوں کو دل میں جگہ نہیں دیتے، اس لیے کہ وہ خدا کے لیے نہیں سُنتے۔ یہ کیوں ہوتا ہے صرف اس بات کے واسطے کہ ایک لذّت حاصل کریں۔ یاد رکھو! انسان دو قسم کی لذّتوں کا مجموعہ ہے۔ ایک رُوح کی لذّت ہے۔ دُوسری نفس کی لذّت۔

رُوحانی لذّت تو ایک باریک اور عمیق راز ہے جس پر اگر کسی کو اطلاع مِل جائے اور ساری عُمر میں ایک مرتبہ بھی جس کو یہ سُرور اور ذوق مِل جائے وہ اس سے سرشار اور مست ہو جائے۔ نفسانی لذّتیں ایسی ہیں کہ ہمیشہ آنی اور فانی ہوتی ہیں۔ نفسانی لذّت وہ لذّت ہے، جس کے ساتھ ایک طوائف بازاروں میں ناچ کرتی ہے۔ وُہ بھی اس لذّت میں شریک ہیں۔ جیسے مولوی واعظ کی حیثیت میں گاتا ہے اور لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔ ویسے ہی بازاری عورت گاتی ہے، اُسے بھی پسند کرتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نفس یہی چیز ہے جو ایک واعظ کے وعظ سے بھی لذّت اُٹھاتا ہے اور دُوسری طرف ایک بدکار عورت کے گانے سے بھی لذّت اُٹھاتا ہے، حالانکہ وُہ خوب جانتا ہے کہ یہ عورت بدکار ہے۔ اُس کے اخلاق، اس کی معاشرت بہت ہی قابلِ نفرت ہے، لیکن اس پر بھی اگر وُہ اُس کی باتوں اور اُس کے گانے سے لذّت اُٹھاتا ہے اور اُس کو نفرت اور بدبُو نہیں آتی، تو یقیناً سمجھو کہ یہ نفسانی لذّت ہے، ورنہ رُوح تو ایسی گھناؤنی اور متعفّن شئے پر راضی نہیں ہوسکتی۔ اِس قابلِ رحم واعظ کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھ میں پاک حِصّہ نہیں ہے۔ ایسا ہی اپنی جانوں پر ظُلم کرنے والے سامعین نہیں سمجھتے کہ ہم یہاں صرف نفسانی لذّت کے لیے بیٹھے ہیں اور خدا کا بخرہ ہم میں نہیں ہے۔ پس میں خدا تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وُہ ہماری تقریروں، ہمارے بولنے والوں اور سُننے والوں میں سے اِس ناپاک اور خبیث رُوح کے حِصّہ کو نکال کر محض للّٰہیت بھردے۔ ہم جو کچھ کہیں خدا کے لیے، اُس کی رضا حاصل کرنے کے واسطے اور جو کچھ سُنیں، خدا کی باتیں سمجھ کر سُنیں اور نیز عمل کرنے کے واسطے سُنیں اور مجلسِ وعظ سے ہم صرف اتنا ہی حِصّہ نہ لے جائیں کہ یہ کہیں آج بہت اچھا وعظ ہوا۔

راستباز اور ربّانی واعظ

مُسلمانوں میں ادبار اور زوال آنے کی یہ بڑی بھاری وجہ ہے، ورنہ اس قدر کانفرنسیں اور انجمنیں اور مجلسیں ہوتی ہیں اور وہاں بڑے بڑے لسّان اور لیکچرار اپنے لیکچر پڑھتے اور تقریریں کرتے، شاعر قوم کی حالت پر نوحہ خوانیاں کرتے ہیں۔ وہ بات کیا ہے کہ اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ قوم دن بدن ترقی کی بجائے تنزّل ہی کی طرف جاتی ہے۔ بات یہی ہے کہ ان مجلسوں میں آنے جانیوالے اخلاص لے کر نہیں جاتے۔ وہاں لیکچراروں کی غرض جیسا کہ مَیں نے ابھی بیان کیا ہے۔ خواہ وہ مولوی ہوں یا نئے تعلیمیافتہ مشائخ ہوں یا صُوفی صرف واہ واہ سُننا ہوتی ہے۔ تقریر کرتے وقت ان کے معبُود سامعین ہوتے ہیں۔

جن کی خوشی اور رضامندی اُن کو مطلوب ہوتی ہے نہ خدا کی رضا، لیکن راستباز اور حقانی لوگ جو قیامت تک ہوں گے، اُن کا یہ مقصد اور منشا کبھی نہیں ہوتا۔ اُن کا مقصود اور مطلوب خدا ہوتا ہے اور بنی نوع انسان کی سچی ہمدردی اور غمگساری جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ وُہ دُنیا کو دکھانا چاہتے ہیں، جو خود اُنھوں نے دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جلال ظاہر کرنا اُن کی تمنا ہوتی ہے، اس لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں بلا خوفِ لومۃ لائم کہتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں سامعین ایک مُردہ کیڑے ہوتے ہیں۔ نہ اُن سے کوئی اجر مقصود ہوتا ہے۔ نہ اُن کے واہ واہ کی پرُوا۔ غرض یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات لوگ اُن کی باتیں سُن کر گھبرا جاتے ہیں اور درمیان تقریر میں اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اور لبا اوقات گالیاں دیتے اور دُکھ دینے والی باتوں ہی پر اکتفا نہ کر کے قسم قسم کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ نفسانی لذّت کا طالب اور خواہشمند کون ہوتا ہے اور نفسانی لذّت ہوتی کیا ہے۔ ایک طوائف کا ناچ ہو تو ساری رات بھی جاگنا اور زر دادن و دردِ سر خریدن کا مصداق ہونا بھی منظور، لیکن ایک حقانی واعظ کے چند کلمے جو نہایت خلوص اور سچے جوش اور حقیقی ہمدردی کی بنا پر اس کے پاک مُنہ سے نکلتے ہیں۔ اُن کے لیے سُننا دشوار اور گراں۔ مگر یہ حقانی واعظوں کی جماعت اِن باتوں سے نہ کبھی گھبراتی اور نہ تھکتی ہے کیوں؟ ان کے پیشِ نظر خدا ہوتا ہے۔ جو اپنی لاانتہا قدرتوں اور فوق الفوق طاقتوں کے ساتھ اُن پر جلوہ نمائی کرتا ہے، جو اُن پر سکینت اور استقلال نازل فرماتا ہے۔ پھر وُہ مُردہ دُنیا داروں کی پرُوا کیا کر سکتے ہیں۔

ربّانی واعظ کا اثر رُوح پر

یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی پیدائش میں ایک رُوح کا حصّہ ہے دُوسرے نفس کا، جو بہت پھیلا ہوا ہے۔ اب آپ لوگ یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جو چیز زیادہ ہوگی، اُس کا اثر زیادہ ہوگا۔ رُوح کا جوش ایسا ہے جیسے کوئی غریب الوطن ناواقف لوگوں میں آکر بسے۔ پس رُوح جو گمنام حالت میں ہوتی ہے، اُس پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔ رُوح کے اثر کی علامت یہ ہے کہ جب ربّانی واعظ اور حقانی ریفارمر بولتا ہے، تو وُہ اپنے وعظ میں سامعین کو کالعدم سمجھتا ہے اور پیغام رساں ہو کر باتیں پہنچاتا ہے۔ ایسی صورت میں رُوح میں ایک گدازش پیدا ہوتی ہے۔ یہانتک کہ وُہ پانی کے ایک آبشار کی طرح جو پہاڑ کے بلند کڑاڑے سے نشیب کی طرف گرتا ہے، بے اختیار ہو کر گرتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف بہتی ہے اور اس بہاؤ میں وہ ایک ایسی لذّت اور سرور محسوس کرتی ہے۔ جس کو مَیں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ پس وہ اپنے بیان اور اپنی تقریر میں وجہ اللہ کو دیکھتا ہے۔ سامعین کی اُسے پرُوا بھی نہیں ہوتی کہ وہ سُن کر کیا کہیں گے۔ اس کو ایک اور طرف سے ایک لذّت آتی ہے اور اندر ہی اندر خوش ہوتا ہے کہ مَیں اپنے مالک اور حکمران کے حکم اور پیغام کو پہنچا رہا ہوں۔ اس پیغام رسانی میں جو مشکلات اور تکالیف اُسے پیش آتی ہیں وہ بھی اُس کے لیے محسوس اللذات اور مدرک الحلاوت ہوتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حد درجہ ہمدردی و غمگساری

ایسے لوگ چونکہ بنی نوع کی ہمدردی میں محو ہوتے ہیں، اس لیے رات دن سوچتے رہتے ہیں اور اسی فکر میں کُڑھتے ہیں کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس راہ پر آجائیں اور ایک بار اس چشمہ سے ایک گھونٹ پی لیں یہ ہمدردی، یہ جوش ہمارے سید و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں غایت درجہ کا تھا۔ اس سے بڑھ کر کسی دُوسرے میں ہو سکتا ہی نہیں، چنانچہ آپ کی ہمدردی اور غمگساری کا یہ عالم تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء ۴) یعنی کیا تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اس غم میں کہ یہ کیوں مومن نہیں ہوتے۔ اس آیت کی حقیقت آپ پورے طور پر نہ سمجھ سکیں، تو جُدا امر ہے۔ مگر میرے دل میں اس کی حقیقت یوں پھرتی ہے، جیسے بدن میں خُون ۔

بدل دردیکہ دارم از برائے طالبانِ حق نمے گردد بیاں آں درد از تقریر کوتاہم

میں خُوب سمجھتا ہوں کہ ان حقانی واعظوں کو کس قسم کا جانگزا درد اصلاحِ خلق کا لگا ہوا ہوتا ہے۔

متأثر ہونے کی اِستعداد

پھر یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ معلّم جس رنگ اور طاقت کا ہو۔ اس کا اثر اسی حیثیت سے حسب اِستعداد سُننے والوں پر ہوتا ہے، بشرطیکہ استعداد میں قابلیت ہو۔ جو لوگ خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور خوف اور خشیت رکھتے ہیں۔ اُن پر اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا نشان یہ ہے کہ رُوح تزکیۂ نفس کے لیے دوڑتی ہے اور بے اختیار ہو ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔ اگر نفسِ امّارہ کے ساتھ تعلق زیادہ ہے اور اُس کی حکومت کے نیچے ہے، تو طبیعت میں ایک اضطراب اور قلق سا پیدا ہوتا ہے۔ اُس کی باتوں سے نفرت معلوم ہوتی ہے۔ وہاں بیٹھنے اور سُننے کو جی نہیں چاہتا، بلکہ گھبراہٹ معلوم ہوتی ہے۔ جب انسان اس قسم کی بے چینی اور بے لذتی ایک حقانی واعظ کی باتوں سے اپنے دل میں پائے تو اُس کو واجب ہے کہ وہ اپنی رُوح کی فکر کرے کہ وہ ہلاکت کے گڑھے پر پہنچی ہوئی ہے۔ خدا کی باتوں سے بے لُطفی اور بے ذوقی۔

رُوحانی بیماریوں کا علاج

اِس سے بڑھ کر دُنیا میں ہلاک کرنے والی چیز کیا ہوگی، اس کا علاج کیا ہے؟ اُس کا علاج استغفار، خدا کے حضور رجُوع، اپنے گناہوں کی معافی کے لیے دعائیں اور اُن پر دوام۔ اگر اس نسخہ کو استعمال کیا جائے تو میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ اس بے لُطفی سے ایک لُطف اور اس بے ذوقی میں سے ایک ذوق پیدا ہو جائے گا۔ پھر وہی رُوح جو خدا کے حضور جانے سے بھاگتی اور خدا کی باتوں کے سُننے سے نفرت کرتی تھی۔ خدا کی طرف گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی چلی جائے گی۔

نفس کی تین اقسام

نفس کی تین قسمیں ہیں۔ امّارہ ۔ لوّامہ ۔ مُطمئنّہ۔ مطمئنّہ کی ایک حالت نفسِ زکیہ کہلاتی ہے۔ نفسِ زکیہ بچوں کا نفس ہوتا ہے، جس کو

کوئی ہوا نہیں لگی ہوتی ہے اور وُہ ہر قسم کے نشیب و فراز سے ناواقف ایک ہموار سطح پر چلتے ہیں۔ نفسِ امّارہ وہ ہے جب کہ دُنیا کی ہوا لگتی ہے۔ نفسِ لوّامہ وہ نفس ہے جبکہ ہوش آتا ہے اور لغزشوں کو سوچتا ہے اور کوشش کرتا ہے اور بدیوں سے بچنے کے لیے دُعا کرتا ہے۔ اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہوتا ہے اور نفسِ مطمئنّہ وُہ ہوتا ہے جبکہ ہر قسم کی بدیوں سے بچنے کی بفضلِ الٰہی قوت اور طاقت پاتا ہے اور ہر قسم کی آفتوں اور مصیبتوں سے اپنے آپ کو امن میں پاتا ہے اور اس طرح پر ایک بُرودت اور اطمینان قلب کو حاصل ہوتا ہے کہ کسی قسم کی گھبراہٹ اور اضطراب باقی نہ رہے۔

دماغ، دل اور زبان کا دائرۂ کار

اس کی مثال اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں تین قسم کی حکومت رکھی ہے۔ ایک دماغ، دُوسرا دل، تیسری زبان۔ دماغ عقول اور براہین سے کام لیتا ہے اور اُس کا یہ کام ہے کہ ہر وقت وہ ایک تراش خراش میں لگا رہتا ہے اور نئی نئی براہین اور حجج کو سوچتا رہتا ہے۔ اس کے سپرد یہی خدمت ہے کہ وہ مقدمات مرتب کر کے نتائج نکالتا رہتا ہے۔ قلب تمام وجود کا بادشاہ ہے۔ یہ دلائل سے کام نہیں لیتا؛ چونکہ اس کا تعلق مَلِکُ المُلوک سے ہے، اس لیے کبھی صریح الہام سے کبھی خفی الہام سے اطلاع پاتا ہے۔ یُوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دماغ وزیر ہے۔ وزیر مدبّر ہوتے ہیں۔ اس لیے دماغ تجاویز، اسباب، دلائل اور نتائج کے متعلق کام میں لگا رہتا ہے۔ قلب کو اُن سے کام نہیں ہے۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے قوتِ حاسّہ رکھی ہے۔ جیسے چیونٹی جہاں کوئی شیرینی رکھی ہوئی ہو، معاً اس جگہ پر پہنچ جاتی ہے؛ حالانکہ اس کے لیے دلیل اس امر کی نہیں ہوتی کہ وہاں شیرینی ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے اس میں ایک قوتِ حاسّہ رکھی ہوئی ہوتی ہے جو اس کی رہبری کرتی ہے۔ اسی طرح پر قلب کو چیونٹی کے ساتھ مشابہت ہے، کیونکہ اس میں بھی وہ قوتِ حاسّہ موجود ہے، جو اس کی رہنمائی کرتی ہے اور وہ دلائل و براہین اور ترتیبِ مقدمات اور استخراجِ نتائج کی ضرورت نہیں رکھتا۔ گو یہ امرِ دیگر ہے کہ دماغ اس کے لیے یہ اسباب اور اُمور بھی بہم پہنچا دیتا ہے۔

قلب کے معنی

قلب کے معنے ایک ظاہری اور جسمانی ہیں اور ایک رُوحانی۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ پھیرنے والا۔ چونکہ دورانِ خُون اسی سے ہوتا ہے، اس لیے اس کو قلب کہتے ہیں۔ رُوحانی طور پر اس کے یہ معنی ہیں کہ جو ترقیات انسان کرنا چاہتا ہے وہ قلب ہی کے تصرف سے ہوتی ہیں۔ جس طرح یہ دورانِ خُون انسانی زندگی کے لیے اشد ضروری چیز ہے، اسی قلب سے ہوتا ہے، اسی طرح پر رُوحانی ترقیوں کا اسی کے تصرف پر انحصار ہے۔

قلب اور دماغ کی ماہیت

بعض نادان آج کل کے فلسفی بے خبر ہیں۔ وہ تمام عُمدہ کاروبار کو دماغ سے ہی منسُوب کرتے ہیں، مگر وہ اتنا نہیں جانتے کہ دماغ تو صرف دلائل و براہین کا ملکہ ہے۔ قوتِ متفکرہ اور حافظہ دماغ میں ہے، لیکن قلب میں ایک ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے وُہ

سرداب ہے یعنی دماغ میں ایک قسم کا تکلف ہے اور قلب میں نہیں بلکہ وُہ بلا تکلف ہے۔ اس لیے قلب ربّ العرش سے ایک مناسبت رکھتا ہے۔ صرف قوتِ حاسّہ کے ذریعہ دلائل و براہین کے بغیر پہچان جاتا ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے۔ استفت القلب یعنی قلب سے فتوےٰ پوچھ لے۔ یہ نہیں کہ دماغ سے فتویٰ پوچھ لو۔ الوہیت کی تار اسی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کوئی اس کو بعید نہ سمجھے۔ یہ بات ادق اور مشکل تو ہے، مگر تزکیہ نفس کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ کرشمات قلب میں موجود ہیں۔ اگر قلب میں یہ طاقتیں نہ ہوتیں، تو انسان کا وجود ہی بیکار سمجھا جاتا۔ صوفی اور مجاہدہ کرنے والے لوگ جو تصوف اور مجاہدات کے مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں۔ وُہ خوب جانتے ہیں کہ قلب سے روشنی اور نُور کے ستون شہودی طور پر نکلتے ہوتے دیکھتے ہیں اور ایک خطِ مستقیم میں آسمان کو جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ بدیہی اور یقینی ہے۔ مَیں اس کو خاص مثال کے ذریعہ سے بیان نہیں کرسکتا۔ ہاں جن لوگوں کو مجاہدات کرنے پڑتے ہیں یا جنھوں نے سلوک کی منزلوں کو طے کرنا چاہا ہے۔ انھوں نے اس کو اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے صحیح پایا ہے۔ قلب اور عرش کے درمیان گویا باریک تار ہے قلب کو جو حکم کرتا ہے اسی سے ہی لذت پاتا ہے۔ خارجی دلائل اور براہین کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ ملہم ہوکر خدا سے اندر ہی اندر باتیں پاکر فتویٰ دیتا ہے۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ جبتک قلب قلب ہے لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ (الملک : ۱۱) کا مصداق ہوتا ہے یعنی انسان پر ایک وہ زمانہ آتا ہے کہ جس میں قلب و دماغ کی قوتیں اور طاقتیں نہیں ہوتی ہیں۔ پھر ایک زمانہ دماغ کا آتا ہے۔ دماغی قوتیں اور طاقتیں نشو و نما پاتی ہیں اور ایک ایسا زمانہ آتا ہے کہ قلب منوّر اور مشتعل اور روشن ہو جاتا ہے۔ جب قلب کا زمانہ آتا ہے۔ اس وقت انسان روحانی بلوغ حاصل کرتا ہے اور دماغ قلب کے تابع ہو جاتا ہے اور دماغی قوتوں کو قلب کی خاصیتوں اور طاقتوں پر فوق نہیں ہوتا۔ یہ بھی یاد رہے کہ دماغی حالتوں کو مومنوں سے ہی خصوصیت نہیں ہے۔ ہندو اور چوہڑے وغیرہ بھی سب کے سب ہر ایک دماغ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ دُنیوی معاملات اور تجارت کے کاروبار میں مصروف ہیں، وہ سب کے سب دماغ سے کام لیتے ہیں۔ ان کی دماغی قوتیں پورے طور پر نشو و نما پائی ہوئی ہوتی ہیں اور ہر روز نئی نئی باتیں اپنے کاروبار کے متعلق ایجاد کرتے ہیں۔ یورپ اور نئی دُنیا کو دیکھو کہ یہ لوگ کس قدر دماغی قوتوں سے کام لیتے ہیں اور کس قدر آئے دن نئی ایجادیں کرتے ہیں۔ قلب کا کام جب ہوتا ہے، جب انسان خدا کا بنتا ہے۔ اس وقت اندر کی ساری طاقتیں اور ریاستیں معدوم ہوکر قلب کی سلطنت ایک اقتدار اور قوت حاصل کرتی ہے۔ تب انسان کامل انسان کہلاتا ہے۔ یہ وہی وقت، ہوتا ہے۔ جبکہ وہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر : ۳۰) کا مصداق ہوتا ہے اور ملائکہ تک اُسے سجدہ کرتے ہیں۔ اُس وقت وُہ ایک نیا انسان ہوتا ہے۔ اُس کی رُوح پوری لذت اور سُرور سے سرشار ہوتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ لذت ایسی لذت نہیں جیسا کہ ایک ناعاقبت اندیش بدکار زنا کرنے میں پاتا ہے یا خوش الحانی کا شائق سرود اور خوش گلو کے گانے میں پاتا ہے۔ نہیں بلکہ اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ رُوح کی لذت اُس وقت ملتی ہے۔ جب

انسان گداز ہوکر پانی کی طرح بہنا شروع ہوتا ہے اور خوف خشیت سے بہہ نکلتا ہے۔ اس مقام پر وہ کلمہ بنتا ہے اور اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (یٰسٓ : ۸۳) کا مفہوم اُس میں کام کرنے لگتا ہے۔

کلمۃ اللہ اور رُوح کی حقیقت

لوگوں نے کَلِمَۃُ اللّٰہ کے لفظ پر جو مسیحؑ کی نسبت آیا ہے سخت غلطی کھائی ہے اور مسیح کی کوئی خصوصیت سمجھی ہے، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہر انسان جب نفسانی ظلمتوں اور گندگیوں اور تیرگیوں سے نکل آتا ہے، اس وقت وہ کَلِمَۃُ اللّٰہ ہوتا ہے۔

یاد رکھو۔ انسان کلمۃ اللہ ہے، کیونکہ اس کے اندر رُوح ہے، جس کا نام قرآن شریف میں اَمرِ رَبّی رکھا گیا ہے۔ لیکن انسان نادانی اور ناواقفی سے رُوح کی کچھ قدر نہ کرنے کے باعث اُس کو انواع و اقسام کی سلاسل اور زنجیروں میں مقید کر دیتا ہے اور اُس کی روشنی اور صفائی کو خطرناک تاریکیوں اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے اندھا اور سیاہ کر دیتا ہے اور اُسے ایسا دُھندلا بنا تا ہے کہ پتہ بھی نہیں لگتا، لیکن جب توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی ناپاک اور تاریک زندگی کی چادر اُتار دیتا ہے، تو قلب منوّر ہونے لگتا ہے اور پھر اصل مبدء کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تقویٰ کے انتہائی درجہ پر پہنچ کر سارا میل کچیل اُتر کر پھر وہ کلمۃ اللہ ہی رہ جاتا ہے۔ یہ ایک باریک علم اور معرفت کا نکتہ ہے۔ ہر شخص اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

انسان کا کمال

انسان کا کمال یہ ہے کہ اُس میں حقیقی معرفت اور سچی فراست جو ایمانی فراست کہلاتی ہے (جس کے ساتھ اللہ کا ایک نُور ہوتا ہے جو اُس کی ہر راہ میں رہنمائی کرتا ہے) پیدا ہو۔ بدوں اس کے انسان دھوکے سے بچ نہیں سکتا اور رسم و عادت کے طور پر کبھی کبھی نہیں بلکہ بسا اوقات ستم قاتل پر خوش ہو جاتا ہے۔ پنجاب و ہندوستان کے سجادہ نشین اور گدیوں کے پیرزادے قوالوں کے گانے سے اور ہُو حق کے نعرے مارنے اور اُلٹے سیدھے لٹکنے ہی میں اپنی معرفت اور کمال کا اِنتہا جانتے ہیں اور ناواقف پیر پرست ان باتوں کو دیکھ کر اپنی رُوح کی تسلّی اور اطمینان اِن لوگوں کے پاس تلاش کرتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھو کہ یہ لوگ اگر فریب نہیں دیتے، تو اس میں شک نہیں ہے کہ فریب خوردہ ضرور ہیں۔ کیونکہ سچا رشتہ جو عبودیّت اور اُلوہیت کے درمیان ہے۔ جس کے حقیقی پیوند سے ایک نُور اور روشنی نکلتی ہے اور ایسی لذّت پیدا ہوتی ہے کہ دُوسری لذّت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اُس کو اِن قلا بازیوں سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ ہم نہایت نیک نیتی کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ہماری نیت کیسی ہے۔ پُوچھتے ہیں کہ اگر اس قسم کے مشغلے عبادتِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی کا موجب ہو سکتے ہیں اور انسانی رُوح کے کمال کا باعث بن سکتے ہیں، تو پھر بازیگروں کو معرفت کی معراج پر پہنچا ہوا سمجھنا چاہیے۔ اور انگریزوں نے تو اِن کھیلوں اور کرتبوں میں اور بھی حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں اور باوجود ان ترقیوں کے اُن کی معرفت خدا کی نسبت یا تو یہ ہے کہ وہ سِرے سے ہی مُنکر اور دہریہ ہیں اور اگر اقرار بھی کیا ہے تو یہ کہ ایک ناتوان بیکس انسان کو جو ایک

عورت مریمؑ کے پیٹ سے پیدا ہوا، خدا بنالیا۔ اور ایک خدا کو چھوڑ کر تین خداؤں کے قائل ہوئے۔ جن میں سے ایک کو ملعون اور ہاویہ میں تین دن رہنے والا تجویز کیا۔ اب اے دانشمندو! سوچو، اور اے سلیم فطرت والو! غور کرو کہ اگر اس اُلٹا سیدھا ٹھکنے اور طبلہ اور سارنگی ہی کے ذریعہ خدا کی معرفت اور انسانی کمال حاصل ہو سکتا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس فن میں ماہر اور موجد انگریزوں کو جو قسم قسم کے باجے اور گانے کے سامان نکالتے ہیں، ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ خدا کے بالکل منکر یا تثلیث کے قائل ہو گئے۔ باوجودیکہ دُنیوی اُمور میں ایجادات اور اختراعات میں ان کی عقلیں ترقی پذیر بھی جاتی ہیں۔ پھر اس پر اور بھی غور کرو اور سوچو کہ اگر یہی معرفت کا ذریعہ تھا، تو تھیٹروں میں ناچنے والے اور اچھا ناچنے گانے والے سب اعلیٰ درجے کے صاحبِ دل اور صاحبِ کمال ماننے پڑیں گے! افسوس ان لوگوں کو خبر ہی نہیں کہ خدا کی معرفت ہوتی کیا ہے؟ اور انسانی کمال نام کس کا ہے؟ وُہ شیطانی حصّہ کی شناخت نہیں کر سکے۔

رقت اور گریہ و بُکا

اُنھوں نے صرف چند قطرے آنسوؤں کے بہالینا اور دو تین چیخیں مار دینا ہی رُوح کی تسلّی اور اطمینان کا موجب سمجھ رکھا ہے۔ بسا اوقات انسان ناول پڑھتا ہے۔ جب اُس کے کسی دردناک حِصّہ پر پہنچتا ہے، باوصفیکہ جانتا ہے کہ یہ ایک فرضی کہانی اور جھُوٹا قصّہ ہے، لیکن پھر بھی وہ ضبط نہیں کر سکتا اور بعض دفعہ چیخیں مار مار کر رو پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض رونا اور چلّانا بھی اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ ملوکِ چغتائیہ کے عہدِ سلطنت میں بعض لوگ ایسے ہوتے تھے جو شرط لگا کر یقیناً رُلا دیتے تھے اور ہنسا دیتے تھے اور اب تو صریح یہ بات موجود ہے کہ طرح طرح کے ناول موجود ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے اور بعض ایسے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر دل بے اختیار ہو کر دردمند ہو جاتا ہے؛ حالانکہ اُن کو یقیناً بناوٹی قصّے اور فرضی کہانیاں جانتے ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ انسان دھوکا کھاتا ہے اور یہ اُس وقت ہوتا ہے، جب انسان نفسانی اغراض اور رُوحانی مطالب میں تمیز نہیں کرتا۔ جس قدر لوگ دُنیا میں ہیں، ان میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جو علاماتِ حقیقیہ سے بے نصیب ہیں۔ اُن کے مُنہ سے معارف اور حقائق نہیں نکلتے، پھر رُلا دیتے ہیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ حقائق اور معارف سے بہرہ ور ہیں۔ جو عبودیت کے رنگ سے رنگین ہو کر اُلوہیت کے عظمت و جلال سے خائف اور ترساں ہو کر بولتے ہیں۔ بلکہ اس کی تہہ میں وُہی بات ہوتی ہے جو مَیں نے ابھی ناولوں اور کہانیوں کے متعلق بیان کی ہے۔ وہ خود بھی نفس کی ہوا میں مُبتلا ہوتے ہیں اور یُوں رونا کچھ فائدہ نہیں رکھتا۔

آنسو کا ایک قطرہ بھی دوزخ کو حرام کر دیتا ہے

ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت اور اس کی خشیت کا غلبہ دل پر ہو اور اس میں ایک رقت اور گداز ش پیدا ہو کر خدا کے لیے ایک قطرہ بھی آنکھ سے نِکلے، تو وُہ یقیناً دوزخ کو حرام کر دیتا

ہے۔ پس انسان اِس سے دھوکہ نہ کھائے کہ مَیں بہت روتا ہوں۔ اس کا فائدہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آنکھ دُکھنے آ جاتے گی اور یُوں امراضِ چشم میں مبتلا ہو جائے گا۔

مَیں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کے حضُور اس کی خشیت سے متاثر ہو کر رونا دوزخ کو حرام کر دیتا ہے، لیکن یہ گریہ و بکا نصیب نہیں ہوتا جبتک کہ خدا کو خدا اور اس کے رسول کو رسول نہ سمجھے اور اس کی سچّی کتاب پر اطلاع نہ ہو نہ صرف اطلاع بلکہ ایمان۔

طبیب جیسے ایک مریض کو جُلاب دیتا ہے اور اس کو ہلکے ہلکے دَست آتے ہیں۔ وہ مرض کو ضائع نہیں کرتے، جب تک جگری دَست نہ آویں جو اپنے ساتھ تمام مواد ردیّہ اور فاسدہ کو لے کر نکلتے ہیں اور ہر قسم کی عُفونتیں اور زہریں جنھوں نے مریض کو اندر ہی اندر مضمحل اور مضطرب کر رکھا تھا، اُن کے ساتھ نکل جاتی ہیں۔ تب اُس کو شفا ہوتی ہے۔ اسی طرح پر جگری گریہ و بکا آستانۂ اُلوہیّت پر ہر ایک قسم کی نفسانی گندگیوں اور مُفسد مواد کو لے کر نکل جاتا ہے اور اس کو پاک صاف بنا دیتا ہے۔ اہلِ اللہ کا ایک آنسو جو توبۃ النصوح کے وقت نکلتا ہے۔ ہَوا و ہوس کے بندے اور رِیاکار اور ظُلمتوں کے گرفتار کے ایک دریا بہا دینے سے افضل اور اعلیٰ ہے، کیونکہ وُہ خدا کے لیے ہے۔ اور یہ خلق کے لیے یا اپنے نفس کے واسطے۔

اِس بات کو کبھی اپنے دل سے محو نہ کرو کہ خدا تعالیٰ کے حضور اخلاص اور راستبازی کی قدر ہے۔ تکلّف اور بناوٹ اُس کے حضُور کچھ کام نہیں دے سکتی۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے حصُول کے ذرائع

اب اگر یہ سوال ہو کہ پھر اس درجہ کے حصُول کے لیے کیا کیا جائے اور قرآن کریم نے اس درجہ پر پہنچنے کا کیا ذریعہ بتایا ہے، ؟ تو اُس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دو باتیں اس کے لیے بطور اصُول کے رکھی ہیں۔ اوّل یہ کہ دُعا کرو۔ یہ سچّی بات ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء: ۲۹) انسان کمزور مخلوق ہے۔ وُہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم کے بُدوں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا وجُود اور اس کی پرورش اور بقاء کے سامان سب کے سب اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہیں۔ احمق ہے وہ انسان جو اپنی عقل و دانش یا اپنے مال و دولت پر ناز کرتا ہے، کیونکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے۔ وُہ کہاں سے لایا؟ اور دُعا کے لیے یہ ضروری بات ہے کہ انسان اپنے ضُعف اور کمزوری کا پورا خیال اور تصوّر کرے۔ جُوں جُوں وہ اپنی کمزوری پر غور کرے گا، اسی قدر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج پائے گا اور اس طرح پر دُعا کے لیے اس کے اندر ایک جوش پیدا ہو گا۔ جیسے انسان جب مصیبت میں مُبتلا ہوتا ہے اور دُکھ یا تنگی محسوس کرتا ہے، تو بڑے زور کے ساتھ پُکارتا اور چلّاتا ہے اور دُوسرے سے مدد مانگتا ہے۔ اسی طرح اگر وُہ اپنی کمزوریوں اور لغزشوں پر غور کرے گا اور اپنے آپ کو ہر آن اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج پائے گا، تو اُس کی رُوح پورے جوش اور درد

سے بے قرار ہوکر آستانۂ الوہیت پر گرے گی اور چلائے گی اور یارب یارب کہہ کر پکارے گی۔ غور سے قرآن کریم کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ پہلی ہی سورت میں اللہ تعالیٰ نے دعا کی تعلیم دی ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ (الفاتحہ : ۶-۷)

دعا تب ہی جامع ہو سکتی ہے کہ وہ تمام منافع اور مفاد کو اپنے اندر رکھتی ہو اور تمام نقصانوں اور مضرتوں سے بچاتی ہو۔ پس اس دعا میں بہترین منافع جو ہو سکتے ہیں اور ممکن ہیں وہ اس دعا میں مطلوب ہیں اور بڑی سے بڑی نقصان رساں چیز جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اُس سے بچنے کی دعا ہے۔

منعم علیہ گروہ کی چار اقسام

میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ منعم علیہ چار قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل نبی۔ دوم صدیق۔ سوم شہید، چہارم صالحین۔ پس اس دعا میں گویا ان چاروں گروہوں کے کمالات کی طلب ہے۔

نبی

نبیوں کا عظیم الشان کمال یہ ہے کہ وہ خدا سے خبریں پاتے ہیں؛ چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن: ۲۷: ۲۸) یعنی خدا تعالیٰ کے غیب کی باتیں کسی دوسرے پر ظاہر نہیں ہوتیں۔ ہاں اپنے نبیوں میں سے جس کو وہ پسند کرے، جو لوگ نبوت کے کمالات سے حصہ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو قبل از وقت آنے والے واقعات کی اطلاع دیتا ہے اور یہ بہت بڑا عظیم الشان نشان خدا کے مأموروں اور مرسلوں کا ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہیں پیش گوئی بہت بڑا معجزہ ہے۔ تمام کتب سابقہ اور قرآن کریم سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ پیشگوئی سے بڑھ کر کوئی نشان نہیں ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل اور دائمی معجزات

نادان اور بد اندیش مخالفوں نے اس علم پر کبھی غور نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر اعتراض کیا ہے۔ مگر افسوس ہے اُن آنکھ بند کر کے اعتراض کرنے والوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ جس قدر معجزات ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دنیا میں کُل نبیوں کے معجزات کو بھی اگر اُن کے مقابلہ میں رکھیں، تو میں ایمان سے کہتا ہوں کہ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بڑھ کر ثابت ہوں گے۔ قطع نظر اس بات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں سے قرآن شریف بھرا پڑا ہے اور قیامت تک اور اس کے بعد تک کی پیشگوئیاں اس میں موجود ہیں۔ سب سے بڑھ کر ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کا یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اُن پیشگوئیوں کا زندہ ثبوت دینے والا موجود ہوتا ہے؛ چنانچہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بطور نشان کھڑا کیا اور پیشگوئیوں کا ایک عظیم الشان نشان مجھے دیا تا میں اُن لوگوں کو جو حقائق سے بے بہرہ اور معرفت الٰہی سے بے نصیب ہیں۔ روز روشن کی طرح دکھا دوں کہ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کیسے مستقل اور دائمی ہیں۔

زندہ رسُول ابدالآباد کیلئے صرف محمدؐ رسُول اللہؐ ہی ہیں

کیا بنی اسرائیل کے بقیۃ یہود یا حضرت مسیح علیہ السلام کو خُداوند خُداوند پکارنے والے عیسائیوں میں کوئی ہے جو ان نشانات میں میرا مقابلہ کرے۔ مَیں پکار کر کہتا ہوں کہ کوئی بھی نہیں۔ ایک بھی نہیں۔ پھر یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداری معجزہ نمائی کی قوت کا ثبوت ہے۔ کیونکہ یہ مسلم مسئلہ ہے کہ نبی متبوع کے معجزات ہی وہ معجزات کہلاتے ہیں، جو اس کے کسی متبع کے ہاتھ پر سرزد ہوں۔ پس جو نشانات خوارقِ عادات مجھے دیئے گئے ہیں۔ جو پیشگوئیوں کا عظیم الشان نشان مجھے عطا ہوا ہے۔ یہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ معجزات ہیں۔ اور کسی دُوسرے نبی کے مُتبع کو یہ آج فخر نہیں ہے کہ وُہ اس طرح پر دعوت کر کے ظاہر کرے کہ وہ بھی اپنے اندر اپنے ہی متبوع کی قُدسی قوت کی وجہ سے خوارق دکھا سکتا ہے۔ یہ فخر صرف اسلام کو ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ رسُول ابدالآباد کے لیے صرف محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں، جن کے انفاسِ طیبہ اور قوتِ قُدسیہ کے طفیل سے ہر زمانہ میں ایک مردِ خدا خدا نمائی کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔

نبی کا سب سے بڑا کمال، اظہار علی الغیب

غرض بات تو یہ تھی کہ اسی دُعا میں نبیوں کے کمالات سے حصّہ لینے کی بھی دُعا ہے۔ کیونکہ منعم علیہ گروہ میں سب کا سردار انبیاء علیہم السلام کا گروہ ہے اور اُس کے کمالات میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُن پر غیب کی باتیں جن کو پیش گوئیاں بھی کہتے ہیں، ظاہر کی جاتی ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس دُعا میں درحقیقت پیشگوئیاں مانگنے کی دُعا نہیں ہے۔ بلکہ اُس مرتبہ کے حصول کی ہی دُعا ہے جہاں پہنچ کر پیش گوئی کرتا ہے۔ پیش گوئی کا مقام اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ درجہ کے قُرب کے بدُوں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ وُہ مقام ہوتا ہے جہاں وہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم: ۴) کا مصداق ہوتا ہے اور یہ درجہ تب ملتا ہے جب دَنَا فَتَدَلّٰى (النجم: ۹) کے مقام پر پہنچے۔ جب تک ظلی طور پر اپنی انسانیت کی چادر کو پھینک کر اُلوہیت کی چادر کے نیچے اپنے آپ کو نہ چھپائے۔ یہ مقام اسے کب مل سکتا ہے۔ یہ وُہ مقام ہے جہاں بعض سلوک کی منزلوں سے ناواقف صُوفیوں نے اکثر ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے آپ کو وہ خدا سمجھ بیٹھے ہیں اور اُن کی اِس ٹھوکر سے ایک خطرناک غلطی پھیلی ہے، جس نے بہتوں کو ہلاک کر ڈالا اور وُہ وحدت وجود کا مسئلہ ہے جس کی حقیقت سے یہ لوگ ناواقفِ محض ہوتے ہیں۔

میرا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ مَیں تمھیں یہ بتاؤں کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کے درجہ پر جب تک انسان نہ پہنچے۔ اس وقت تک اُسے پیشگوئی کی قوت نہیں مل سکتی۔ اور یہ درجہ اُس وقت حاصل ہوتا ہے، جبکہ انسان قربِ الٰہی حاصل کرے۔ قُربِ الٰہی کے لیے یہ ضروری بات ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ پر عمل ہو، کیونکہ جبتک اللہ تعالیٰ کی صفات کو ملحُوظِ خاطر رکھ کر اُن کی عزت نہ کرے گا اور اُن کا پَرتَو اپنی حالت اور اخلاق سے نہ دکھائے۔ وُہ خدا

کے حضور کیونکر جا سکتا ہے۔ مثلاً خدا کی ایک صفت قُدُّوس ہے۔ پھر ایک ناپاک، غلیظ، ہر قسم کے فسق و فجور کی ناپاکی میں مُبتلا انسان اللہ تعالیٰ کے حضور کیونکر جا سکتا ہے اور وُہ خدا تعالیٰ سے تعلق کیونکر پیدا کر سکتا ہے۔

غرض اِس دُعا میں اوّل منعم علیہ گروہ کے کمالِ مراتب کے حصول کی دُعا ہے۔ پس جب تک انسان اپنے اندرونی سلسلۂ خیالات کو چھوڑ کر اَنَا الْمَوْجُوْد کی آواز نہ سُنے دعاؤں میں لگا رہے۔ یہ کمالِ تام کا درجہ ہوتا ہے۔

صدّیق

پھر دُوسرا مرتبہ صدّیق کا ہے۔ صدقِ کامل اُس وقت تک جذب نہیں ہوتا جب تک توبۃ النصوح کے ساتھ صدق کو نہ کھینچے۔ قرآنِ کریم تمام صداقتوں کا مجموعہ اور صدقِ تام ہے۔ جب تک خود صادق نہ بنے۔ صدق کے کمال اور مراتب سے کیونکر واقف ہو سکتا ہے۔

صدّیق کے مرتبہ پر قرآن کریم کی معرفت اور اس سے محبت اور اس کے نکات و حقائق پر اطلاع ملتی ہے کیونکہ کِذب کِذب کو کھینچتا ہے، اس لیے کبھی بھی کاذب قرآنی معارف اور حقائق سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ (الواقعہ : ۸۰)۔ فرمایا گیا ہے۔

شہید

پھر تیسرا مرتبہ شہید کا ہے۔ عام لوگوں نے شہید کے معنی صرف یہی سمجھ رکھے ہیں کہ جو شخص لڑائی میں مارا گیا یا دریا میں ڈوب گیا یا وبا میں مر گیا وغیرہ۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ اسی پر اکتفاء کرنا اور اسی حد تک اس کو محدود رکھنا مومن کی شان سے بعید ہے۔ شہید اصل میں وہ شخص ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ سے اِستقامت اور سکینت کی قوّت پاتا ہے۔ اور کوئی زلزلہ اور حادثہ اس کو متغیّر نہیں کر سکتا۔ وُہ مصیبتوں اور مشکلات میں سینہ سپر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر محض خدا تعالیٰ کے لیے اُس کو جان بھی دینی پڑے تو فوق العادت استقلال اُس کو ملتا ہے اور وُہ بدوں کسی قسم کا رنج یا حسرت محسوس کیے اپنا سَر رکھ دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ بار بار مجھے زندگی ملے اور بار بار اس کو اللہ کی راہ میں دُوں۔ ایک ایسی لذّت اور سُرور اس کی رُوح میں ہوتا ہے کہ ہر تلوار جو اُس کے بدن پر پڑتی ہے اور ہر ضرب، جو اس کو پیس ڈالے، اُس کو پہنچتی ہے۔ وُہ اُس کو ایک نئی زندگی، نئی مسرت اور تازگی عطا کرتی ہے۔ یہ ہیں شہید کے معنی۔

پھر یہ لفظ شہد سے بھی نکلا ہے۔ عبادتِ شاقّہ جو لوگ برداشت کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں ہر ایک تلخی اور کدورت کو جھیلتے ہیں اور جھیلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وُہ شہد کی طرح ایک شیرینی اور حلاوت پاتے ہیں۔ اور جیسے شہد فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (النحل : ۷۰) کا مصداق ہے۔ یہ لوگ بھی ایک تریاق ہوتے ہیں۔ اُن کی صحبت میں آنے والے بہت سے امراض سے نجات پا جاتے ہیں۔

اور پھر شہید اس درجہ اور مقام کا نام بھی ہے جہاں انسان اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے یا کم از کم خدا کو دیکھتا ہوا یقین کرتا ہے۔ اس کا نام احسان بھی ہے۔

صالح

چوتھا درجہ صالحین کا ہے۔ جن کو موادِ رَدّیہ سے صاف کر دیا گیا ہے اور اُن کے قلوب صاف ہو گئے ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جبتک موادِ رَدّیہ دُور نہ ہوں اور سُوءِ مزاج رہے، تو مزہ زبان تک کا بھی بگڑ جاتا ہے، تلخ معلوم دیتا ہے اور جب بدن میں پُوری صلاحیت اور اصلاح ہو اس وقت ہر ایک شے کا اصل مزہ معلوم ہوتا ہے اور طبیعت میں ایک قسم کی لذّت اور سرُور اور چُستی اور چالاکی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح پر جب انسان گُناہ کی ناپاکی میں مُبتلا ہوتا ہے اور رُوح کا قوام بگڑ جاتا ہے تو رُوحانی قوتیں کمزور ہونی شروع ہو جاتی ہیں، یہانتک کہ عبادات میں مزہ نہیں رہتا۔ طبیعت میں ایک گھبراہٹ اور پریشانی پائی جاتی ہے۔ لیکن جب موادِ ردّیہ جو گناہ کی زندگی سے پیدا ہوتے تھے، توبۃ النصوح کے ذریعہ خارج ہونے لگیں تو رُوح میں وہ اضطراب اور بے چینی کم ہونے لگتی ہے۔ یہانتک کہ آخر ایک سکون اور تسلّی ملتی ہے۔ پہلے جو گناہ کی طرف قدم اُٹھانے میں راحت محسوس ہوتی تھی اور پھر اُسی فعل میں جو نفس کی خواہش کا نتیجہ ہوتا تھا اور جھکنے میں خوشی ملتی تھی۔ اب اس طرف جُھکتے ہوئے دکھ اور رنج معلوم ہوتا ہے۔ رُوح پر ایک لرزہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس تاریک زندگی کا وہم یا تصوّر بھی آجائے اور پھر عبادات میں ایک لُطف، ذوق، جوش اور شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ رُوحانی قویٰ جو گناہ آمیز زندگی سے مُردہ ہو چکے تھے، اُن کا نشوونما شروع ہوتا ہے اور اخلاقی طاقتیں اپنا ظہور کرتی ہیں۔

یہ چار چیزیں ہیں۔ جن کے لیے ہر انسان دنیا میں مامُور کیا گیا ہے اور اس کے حصُول کے لیے دُعا ہی ایک زبردست ذریعہ ہے اور ہم کو موقع دیا گیا ہے کہ پانچ وقت اُن مراتب کو مانگیں، لیکن یہاں ایک اور مشکل ہے کہ اگرچہ اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ (المومن : ۶۱) فرمایا اور کہا گیا ہے اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ : ۱۸۷) اور قرآن شریف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دُعاؤں کو سنتا ہے اور وُہ بہت ہی قریب ہے۔

قبولیتِ دُعا کے آداب

لیکن اگر خدا تعالیٰ کی صفات اور اسماء کا لحاظ نہ کیا جائے اور دُعا کی جائے، تو وُہ کچھ بھی اثر نہیں رکھتی۔ صرف اس ایک راز کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ معلوم نہ کرنے کی وجہ سے دُنیا ہلاک ہو رہی ہے۔ مَیں نے بہت لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ ہم نے بہت دُعائیں کیں اور ان کا نتیجہ کچھ نہیں ہوا۔ اور اس نتیجہ نے اُن کو دہریہ بنا دیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہر امر کے لیے کچھ قواعد اور قوانین ہوتے ہیں۔ ایسا ہی دُعا کے واسطے قواعد و قوانین مقرر ہیں۔ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہماری دُعا قبول نہیں ہوئی، اس کا باعث یہی ہے کہ وہ ان قواعد اور مراتب کا لحاظ نہیں رکھتے جو قبولیتِ دُعا کے واسطے ضروری ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب ایک لانظیر اور بیش بہا خزانہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور ہم میں سے ہر ایک اس کو پا سکتا ہے اور لے سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کبھی بھی جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو قادر خدا مان کر یہ تجویز کریں کہ جو کچھ اس نے

ہمارے سامنے رکھا ہے اور جو ہمیں دکھایا ہے یہ محض سراب اور دھوکا ہے۔ ایسا وہم بھی انسان کو ہلاک کر سکتا ہے نہیں۔ بلکہ ہر ایک اس خزانہ کو لے سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر ایک کو یہ خزانے دے سکتا ہے پھر بھی اس میں کمی نہیں آسکتی۔

غرض وہ تو ہم کو نبوت کے کمالات تک دینے کو تیار ہے، لیکن ہم اس کے لینے کی بھی سعی کریں پس یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ اور دھوکا ہے جو اس پیرایہ میں دیا جاتا ہے کہ دُعا قبول نہیں ہوتی۔ اصل یہی ہے کہ وہ دعا قبولیت کے آداب اور اسباب سے محض خالی ہے۔ پھر آسمان کے دروازے اس کے لیے نہیں کھلتے۔ سُنو! قرآن شریف نے کیا کہا ہے۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدہ: ۲۸) اللہ تعالیٰ متقیوں کی دُعائیں قبول کرتا ہے۔ جو لوگ متقی نہیں ہیں، ان کی دُعائیں قبولیت کے لباس سے ننگی ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمانیت ان لوگوں کی پرورش میں اپنا کام کر رہی ہے۔

متقی کی بعض دعاؤں کے حسبِ منشاء پورا نہ ہونے کی حکمت

دُعاؤں کی قبولیت کا فیض ان لوگوں کو ملتا ہے، جو متقی ہوتے ہیں۔ اَب میں بتاؤں گا کہ متقی کون ہوتے ہیں، مگر ابھی میں ایک اور شبہ کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بعض لوگ جو متقی ہوتے ہیں۔ بظاہر اُن کی بعض دُعائیں اُن کے حسبِ منشاء پوری نہیں ہوتی ہیں، یہ کیوں ہوتا ہے ؟ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان لوگوں کی کوئی بھی دُعا درحقیقت ضائع نہیں کی جاتی، لیکن چونکہ انسان عالم الغیب نہیں ہے اور وُہ نہیں جانتا کہ اس دُعا کے نتائج اس کے حق میں کیا اثر پیدا کرنے والے ہیں پس اللہ تعالیٰ کمال شفقت اور مہربانی سے اس دُعا کو اپنے بندہ کے لیے اس صورت میں منتقل کر دیتا ہے، جو اس کے واسطے مفید اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ جیسے ایک نادان بچہ سانپ کو ایک خوبصورت اور نرم شے سمجھ کر پکڑنے کی جرأت کرے یا آگ کو روشن دیکھ کر اپنی ماں سے مانگ بیٹھے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ وُہ ماں خواہ وُہ کیسی ہی نادان سے نادان بھی کیوں نہ ہو۔ کبھی پسند کرے گی کہ اُس کا بچہ سانپ کو پکڑ لے یا اپنی خواہش کے موافق آگ کا ایک روشن کوئلہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دے ؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ یہ اُس کی زندگی کو گزند پہنچائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب اور عالم الکل ہے اور مہربان ماں سے بھی زیادہ رحیم کریم ہے اور ماں کے دل میں بھی یہ رأفت اور محبت اُسی نے ڈالی ہے وہ کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ اس کا عزیز بندہ اپنی کمزوری اور غلطی اور ناواقفی کی وجہ سے کسی ایسی چیز کے لیے دُعا کر بیٹھے جو اُس کے حق میں مضرت بخش ہے تو وہ اُس کو فی الفور منظور کرے۔ نہیں بلکہ وہ اس کو رَدّ کر دیتا ہے اور اس کے بجائے اس سے بھی بہتر اُس کو عطا کرتا ہے اور وہ یقیناً سمجھ لیتا ہے کہ یہ میری فلاں دُعا کا اثر اور نتیجہ ہے۔ اپنی غلطی پر بھی اس کو اطلاع ملتی ہے۔ غرض یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ متقیوں کی بھی بعض دُعا قبول نہیں ہوتی۔ نہیں اُن کی تو ہر دُعا قبول ہوتی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنی کمزوری اور نادانی

کی وجہ سے کوئی ایسی دُعا کر بیٹھیں جو ان کے لیے عُمدہ نتائج پیدا کرنے والی نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس دُعا کے بدلہ میں اُن کو وہ چیز عطا کرتا ہے، جو اُن کی شئے مطلوبہ کا نعم البدل ہو۔

مُتقی کون ہوتے ہیں؟

اب اس کے بعد پھر میں اصل مطلب کی طرف آتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ مُتقی کون ہوتے ہیں؟

درحقیقت مُتقیوں کے واسطے بڑے بڑے وعدے ہیں اور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مُتقیوں کا ولی ہوتا ہے۔ جھُوٹے ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ ہم مقربِ بارگاہِ الٰہی ہیں اور پھر مُتقی نہیں ہیں بلکہ فسق و فجور کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ایک ظلم اور غضب کرتے ہیں جبکہ وہ ولایت اور قربِ الٰہی کے درجہ کو اپنے ساتھ منسوب کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مُتقی ہونے کی شرط لگا دی ہے۔

نصرت

پھر ایک اور شرط لگاتا ہے یا یہ کہو، مُتقیوں کا ایک نشان بتاتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا۔ خدا اُن کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اُن کی نصرت کرتا ہے جو مُتقی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معیت کا ثبوت اس کی نصرت ہی سے ملتا ہے۔ پہلا دروازہ ولایت کا دیسے بند ہوا۔ اب دُوسرا دروازہ معیت اور نصرتِ الٰہی کا اس پر بند ہوا۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نصرت کبھی بھی ناپاکوں اور فاسقوں کو نہیں مِل سکتی۔ اس کا انحصار تقویٰ ہی پر ہے۔ خدا کی اعانت مُتقی ہی کے لیے ہے۔

معاشی وسعت

پھر ایک اور راہ ہے کہ انسان مشکلات اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے اور حاجات مختلف رکھتا ہے۔ اُن کے حل اور روا ہونے کے لیے بھی تقویٰ ہی کو اصول قرار دیا ہے۔ معاش کی تنگی اور دوسری تنگیوں سے راہِ نجات تقویٰ ہی ہے۔ فرمایا۔ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (الطّلاق: ۴،۳) خدا مُتقی کے لیے ہر مشکل میں ایک مخرج پیدا کر دیتا ہے اور اس کو غیب سے اُس سے مخلصی پانے کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ اُس کو ایسے طور سے رزق دیتا ہے کہ اُس کو پتہ بھی نہ لگے۔ اب غور کر کے دیکھ لو کہ انسان اس دُنیا میں چاہتا کیا ہے۔ انسان کی بڑی سے بڑی خواہش دنیا میں یہی ہے کہ اس کو سُکھ اور آرام ملے اور اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راہ مقرر کی ہے جو تقویٰ کی راہ کہلاتی ہے اور دوسرے لفظوں میں اُس کو قرآن کریم کی راہ کہتے ہیں اور یا اس کا نام صِراطِ مُستقیم رکھتے ہیں۔

کفّار کے مال و دولت

کوئی یہ نہ کہے کہ کفّار کے پاس بھی مال و دولت اور املاک ہوتے ہیں اور وہ اپنی عیش و عشرت میں منہمک اور مُست رہتے ہیں۔ میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ وُہ دُنیا کی آنکھ میں بلکہ ذلیل دنیا داروں اور ظاہر پرستوں کی آنکھ میں خوش معلوم دیتے ہیں، مگر درحقیقت وہ ایک جلن اور دُکھ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تم نے اُن کی صُورت کو دیکھا ہے مگر میں ایسے لوگوں کے قلب پر نگاہ کرتا ہوں۔

وہ ایک سعیر اور سلاسل و اغلال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جیسے فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغۡلٰلًا وَّ سَعِیۡرًا (الدھر: ۵) وہ نیکی کی طرف آ ہی نہیں سکتے۔ وہ ایسے اغلال ہیں کہ خدا کی طرف اُن اغلال کی وجہ سے ایسے دبے پڑے ہیں کہ حیوانوں اور بہائم سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھ ہر وقت دُنیا کی طرف ہی لگی رہتی ہے اور زمین کی طرف جھکتے جاتے ہیں۔ پھر اندر ہی اندر ایک سوزش اور جلن بھی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر مال میں کمی ہو جائے یا حسب مراد تدبیر میں کامیابی نہ ہو تو کڑھتے اور جلتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات سودائی اور پاگل ہو جاتے ہیں یا عدالتوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ واقعی بات ہے کہ بے دین آدمی سعیر سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کو قرار اور سکون نصیب نہیں ہوتا، جو راحت اور تسلّی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسے شرابی ایک جام شراب پی کر ایک اور مانگتا ہے اور مانگتا ہی جاتا ہے اور ایک جلن سی لگی رہتی ہے۔ ایسا ہی دُنیا دار بھی سعیر میں ہے۔ اس کی آتشِ آز ایک دم بھی بجھ نہیں سکتی۔ سچی خوشحالی حقیقت میں ایک متقی ہی کے لیے ہے۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کے لیے دو جنت ہیں۔

سچی خوشحالی

متقی سچی خوشحالی ایک جھونپڑی میں پا سکتا ہے، جو دُنیا دار اور حرص و آز کے پرستار کو رفیع الشان قصر میں بھی نہیں مِل سکتی۔ جس قدر دنیا زیادہ ملتی ہے، اسی قدر بلائیں زیادہ سامنے آجاتی ہیں۔ پس یاد رکھو کہ حقیقی راحت اور لذّت دُنیا دار کے حصّہ میں نہیں آتی۔ یہ مت سمجھو کہ مال کی کثرت عمدہ عمدہ لباس اور کھانے کسی خوشی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ اُس کا مدار ہی تقویٰ پر ہے۔

زبان کی حفاظت

جبکہ اِن ساری باتوں سے معلوم ہو گیا کہ سچے تقویٰ کے بغیر کوئی راحت اور خوشی مِل ہی نہیں سکتی، تو معلوم کرنا چاہیے کہ تقویٰ کے بہت سے شعبے ہیں جو عنکبوت کے تاروں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ تقویٰ تمام جوارح انسانی اور عقائد زبان اخلاق وغیرہ سے متعلق ہے۔ نازک ترین معاملہ زبان سے ہے۔ بسا اوقات تقویٰ کو دُور کر کے ایک بات کہتا ہے اور دل میں خوش ہو جاتا ہے کہ مَیں نے یُوں کہا اور ایسا کہا، حالانکہ وُہ بات بُری ہوتی ہے۔ مجھے اس پر ایک نقل یاد آتی ہے کہ ایک بزرگ کی کسی دُنیا دار نے دعوت کی۔ جب وہ بزرگ کھانا کھانے کے لیے تشریف لے گئے تو اُس متکبّر دُنیا دار نے اپنے نوکر کو کہا کہ فلاں تھال لانا جو ہم پہلے حج میں لائے تھے اور پھر کہا دوسرا تھال بھی لانا جو دُوسرے حج میں لائے تھے اور پھر کہا کہ تیسرے حج والا بھی لیتے آنا۔ اُس بزرگ نے فرمایا کہ تُو تو بہت ہی قابلِ رحم ہے۔ ان تین فقروں میں تُو نے اپنے تین ہی حجوں کا ستیاناس کر دیا۔ تیرا مطلب اس سے صرف یہ تھا کہ تو اِس امر کا اظہار کرے کہ تُو نے تین حج کیے ہیں۔ اس لیے خدا نے تعلیم دی ہے کہ زبان کو سنبھال کر رکھا جائے اور بے معنی، بیہودہ، بے موقع غیر ضروری باتوں سے احتراز کیا جائے۔

دیکھو۔ اللہ تعالیٰ نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کی تعلیم دی ہے۔ اب ممکن تھا کہ انسان اپنی قوت پر بھروسہ کر لیتا اور خُدا

سے دُور ہو جاتا، اس لیے ساتھ ہی اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کی تعلیم دے دی کہ یہ مت سمجھو کہ یہ عبادت جو میں کرتا ہوں اپنی قوت اور طاقت سے کرتا ہوں، ہرگز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی استعانت جبتک نہ ہو اور خود وہ پاک ذات جبتک توفیق اور طاقت نہ دے، کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور پھر اِیَّاكَ اَعْبُدُ یا اِیَّاكَ اَسْتَعِیْنُ نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس میں نفس کے تقدّم کی بُو آتی تھی اور یہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ تقویٰ والا کُل انسانوں کو لیتا ہے۔ زبان سے ہی انسان تقویٰ سے دُور چلا جاتا ہے۔ زبان سے تکبّر کر لیتا ہے اور زبان سے ہی فرعونی صفات آ جاتی ہیں اور اسی زبان کی وجہ سے پوشیدہ اعمال کو ریاکاری سے بدل لیتا ہے اور زبان کا زیاں بہت جلد پیدا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص ناف کے نیچے کے عُضو اور زبان کو شرّ سے بچاتا ہے اس کی بہشت کا ذمہ دار میں ہوں۔ حرام خوری اس قدر نقصان نہیں پہنچاتی جیسے قولِ زُور۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ حرام خوری اچھی چیز ہے۔ یہ سخت غلطی ہے۔ اگر کوئی ایسا سمجھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اضطراراً سؤر کھا لے، تو یہ امرِ دیگر ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی زبان سے خنزیر کا فتویٰ دیدے تو وُہ اسلام سے دور نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال ٹھہراتا ہے۔ غرض اس سے معلوم ہوا کہ زبان کا زیان خطرناک ہے۔ اس لیے متقی اپنی زبان کو بہت ہی قابو میں رکھتا ہے۔ اس کے مُنہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکلتی، جو تقویٰ کے خلاف ہو۔ پس تم اپنی زبان پر حکومت کرو۔ نہ یہ کہ زبانیں تم پر حکومت کریں اور اناپ شناپ بولتے رہو۔

ہر ایک بات کہنے سے پہلے سوچ لو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت اُس کے کہنے میں کہاں تک ہے۔ جبتک یہ نہ سوچ لو مت بولو۔ ایسے بولنے سے جو شرارت کا باعث اور فساد کا موجب ہو، نہ بولنا بہتر ہے، لیکن یہ بھی مومن کی شان سے بعید ہے کہ امرِ حق کے اظہار میں رُکے۔ اس وقت کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور خوف زبان کو نہ روکے۔ دیکھو ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا، تو اپنے پرائے سب کے سب دشمن ہو گئے، مگر آپؐ نے ایک دم بھر کے لیے کبھی کسی کی پرواہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب ابُوطالب آپؐ کے چچا نے لوگوں کی شکایتوں سے تنگ آکر کہا۔ اُس وقت بھی آپؐ نے صاف طور پر کہہ دیا کہ مَیں اس کے اظہار سے نہیں رُک سکتا۔ آپ کا اختیار ہے، میرا ساتھ دیں یا نہ دیں۔

پس زبان کو جیسے خدا تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف کسی بات کے کہنے سے روکنا ضروری ہے۔ اسی طرح امرِ حق کے اظہار کے لیے کھولنا لازمی امر ہے۔ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران ۱۱۵) مومنوں کی شان ہے۔ امر بالمعرُوف اور نہی عن المنکر کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اپنی عملی حالت سے ثابت کر دکھائے کہ وُہ اس قوّت کو اپنے اندر رکھتا ہے کیونکہ اس سے پیشتر کہ وہ دُوسروں پر اپنا اثر ڈالے اس کو اپنی حالت اثر انداز بھی تو بنانی ضروری ہے۔ پس یاد رکھو کہ زبان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی مت روکو۔ ہاں محل اور موقع کی شناخت بھی ضروری ہے اور اندازِ بیان ایسا ہونا چاہیے جو نرم ہو اور سلاست لیے اندر رکھتا ہو اور ایسا ہی تقویٰ کے خلاف

بھی زبان کا کھولنا سخت گناہ ہے۔

قرآنِ کریم کی علّتِ غائی تقویٰ ہے

پھر دیکھو کہ تقویٰ ایسی اعلیٰ درجہ کی ضروری شے قرار دیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کی علّتِ غائی اسی کو ٹھہرایا ہے، چنانچہ دُوسری سُورۃ کو جب شروع کیا ہے، تو یُوں ہی فرمایا ہے: الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ: ۲، ۳) میرا مذہب یہی ہے کہ قرآنِ کریم کی یہ ترتیب بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس میں عِلَلِ اربعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ علّتِ فاعلی، مادی، صوری، غائی۔ ہر ایک چیز کے ساتھ یہ چار ہی علل ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم نہایت اکمل طور پر اُن کو دکھاتا ہے۔ الٓمّٓ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت جاننے والا ہے۔ اس کلام کو حضرت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل کیا ہے۔ یعنی خدا اس کا فاعل ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یہ مادہ بتایا۔ یا یہ کہو کہ یہ علّتِ مادی ہے۔ علّتِ صوری لَا رَيْبَ فِيْهِ ہر ایک چیز میں شک و شبہ اور ظنُونِ فاسدہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر قرآنِ کریم ایسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی رَیب نہیں ہے۔ لاریب اسی کے لیے ہے۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی شان یہ بتائی ہے کہ لاریب فیہ۔ تو ہر ایک سلیم الفطرت اور سعادت مند انسان کی رُوح اُچھلے گی اور خواہش کرے گی کہ اُس کی ہدایتوں پر عمل کرے۔ ہم افسوس سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی اعلیٰ اور اصفیٰ شان کو دُنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا؛ ورنہ قرآن شریف کی خُوبیاں اور اس کے کمالات، اس کا حُسن اپنے اندر ایک ایسی کشش اور جذب رکھتا ہے کہ بے اختیار ہو ہو کر دل اِس کی طرف چلے آئیں۔ مثلاً اگر ایک خوشنما باغ کی تعریف کی جاوے اور اُس کے خوشبودار درختوں اور دل کو ترو تازہ کرنے والی بُوٹیوں اور رَوشوں اور مصفا پانی کی بہتی ہوئی ندیوں اور نہروں کا تذکرہ کیا جاوے، تو ہر ایک شخص کا دل چاہے گا کہ اس کی سیر کرے اور اس سے حظ اُٹھاوے۔ اور اگر یہ بھی بتایا جاوے کہ اُس میں بعض چشمے ایسے جاری ہیں، جو امراضِ مُزمنہ اور مُہلکہ کو شفا دیتے ہیں تو اور بھی زیادہ جوش اور طلب کے ساتھ لوگ وہاں جائیں گے۔ اسی طرح پر قرآن شریف کی خُوبیوں اور کمالات کو اگر نہایت ہی خُوب صُورت اور مؤثر الفاظ میں بیان کیا جاوے، تو رُوح پُورے جوش کے ساتھ اُس کی طرف دوڑتی ہے۔

قرآنی علوم کے انکشاف کے لیے تقویٰ شرط ہے

اور حقیقت میں رُوح کی تسلّی اور سیری کا سامان اور وُہ بات جس سے رُوح کی حقیقی احتیاج پُوری ہوتی ہے۔ قرآن کریم ہی میں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور دُوسری جگہ کہا لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعۃ: ۸۰) اس سے مُراد وہی متقین ہیں جو ہُدیً للمتقین میں بیان ہوئے ہیں۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ قرآنی علوم کے انکشاف کے لیے تقویٰ شرط ہے۔ علومِ ظاہری اور علومِ قرآنی کے حصُول کے درمیان ایک عظیم الشان فرق ہے۔ دنیوی اور رسمی علوم کے حاصل کرنے کے واسطے تقویٰ شرط نہیں ہے۔ صرف و نحو۔

طبعی، فلسفہ، ہیئت وطبابت پڑھنے کے واسطے یہ ضروری امر نہیں ہے کہ وہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور امر الٰہی اور نواہی کو ہر وقت مدِ نظر رکھتا ہو۔ اپنے ہر قول وفعل کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکومت کے نیچے رکھے۔ بلکہ بسا اوقات عموماً دیکھا گیا ہے کہ دُنیوی علوم کے ماہر اور طلبگار دہریہ منش ہو کر ہر قسم کے فسق وفجور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آج دنیا کے سامنے ایک زبردست تجربہ موجود ہے۔ یورپ اور امریکہ باوجودیکہ وہ لوگ ارضی علوم میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں اور آئے دن نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں، لیکن اُن کی رُوحانی اور اخلاقی حالت بہت ہی قابلِ شرم ہے۔ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے حالات جو کچھ شائع ہوئے ہیں ہم تو اُن کا ذکر بھی نہیں کر سکتے۔ مگر علومِ آسمانی اور اسرارِ قرآنی کی واقفیت کے لیے تقویٰ پہلی شرط ہے۔ اس میں توبۃ النصوح کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان پُوری فروتنی اور انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ اُٹھائے۔ اور اس کے جلال وجبروت سے لرزاں ہو کر نیازمندی کے ساتھ رجوع نہ کرے، قرآنی علوم کا دروازہ نہیں کُھل سکتا اور رُوح کے ان خواص اور قویٰ کی پرورش کا سامان اُس کو قرآن شریف سے نہیں مِل سکتا جس کو پاکر رُوح میں ایک لذت اور تسلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اُس کے علوم خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ پس اس کے لیے تقویٰ بطور نردبان کے ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ بے ایمان، شریر، خبیث النفس، ارضی خواہشوں کے اسیر اُن سے بہرہ ور ہوں۔ اس واسطے اگر ایک مُسلمان مسلمان کہلا کر خواہ وہ صرف ونحو، معانی وبدیع وغیرہ علوم کا کتنا ہی بڑا فاضل کیوں نہ ہو۔ دُنیا کی نظر میں شیخ الکل فی الکل بنا بیٹھا ہو، لیکن اگر تزکیہ نفس نہیں کرتا، تو قرآن شریف کے علوم سے اس کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اس وقت دُنیا کی توجہ ارضی علوم کی طرف بہت جُھکی ہوئی ہے اور مغربی روشنی نے تمام عالم کو اپنی نئی ایجادوں اور صنعتوں سے حیران کر رکھا ہے۔ مُسلمانوں نے بھی اگر اپنی فلاح اور بہتری کی کوئی راہ سوچی، تو بدقسمتی سے یہ سوچی ہے کہ وہ مغرب کے رہنے والوں کو اپنا امام بنالیں اور یورپ کی تقلید پر فخر کریں۔ یہ تو نئی روشنی کے مسلمانوں کا حال ہے۔ جو لوگ پُرانے فیشن کے مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو حامی دینِ متین سمجھتے ہیں۔ اُن کی ساری عُمر کی تحصیل کا خلاصہ اور لُبِّ لباب یہ ہے کہ صَرف ونحو کے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ضَالِّیْن کے تلفظ پر مرمٹے ہیں۔ قرآن شریف کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں اور ہو کیونکر جبکہ وہ تزکیہ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ہاں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تزکیہ نفس کے دعوے کرتا ہے۔ وہ صُوفیوں اور سجادہ نشینوں کا گروہ ہے، مگر ان لوگوں نے قرآن شریف کو تو چھوڑ دیا ہے اور اپنے ہی طریق اختراع کر لیے ہیں۔ کوئی چلہ کشیاں کرتا ہے۔ کوئی اِلَّا اللّٰہ کے نعرے مارتا ہے۔ کوئی نفی اثبات۔ تو کوئی حبسِ دم وغیرہ میں مبتلا ہے۔ غرض ایسے طریقے نکالے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہوتے اور نہ قرآن شریف کا یہ منشا ہے اور نہ کبھی سلسلہ نبوت نے ایسے طریقوں کو پسند کیا۔ غرض یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک انسان ایک پاک تبدیلی نہیں کرتا اور نفس کا تزکیہ نہیں کرتا، قرآن شریف

کے معارف اور خوبیوں پر اطلاع نہیں ملتی۔ قرآن شریف میں وُہ نکات اور حقائق ہیں جو رُوح کی پیاس کو بُجھا دیتے ہیں۔

کاش دُنیا کو معلوم ہوتا کہ رُوح کی لذت کس چیز میں ہے اور پھر وُہ معلوم کرتی کہ وُہ قرآن شریف اور صرف قرآن شریف میں موجود ہے۔

اَبدال کون ہیں

دیکھو! جس جس قدر انسان تبدیلی کرتا جاتا ہے، اسی قدر وُہ ابدال کے زُمرہ میں داخل ہوتا جاتا ہے۔ حقائقِ قرآنی نہیں کُھلتے، جبتک اَبدال کے زمرہ میں داخل نہ ہو۔ لوگوں نے ابدال کے معنے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے اور اپنے طور پر کچھ کا کچھ سمجھ لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابدال وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اندر پاک تبدیلی کرتے ہیں اور اس تبدیلی کی وجہ سے اُن کے قلب گُناہ کی تاریکی اور زنگ سے صاف ہو جاتے ہیں۔ شیطان کی حکومت کا استیصال ہو کر اللہ تعالیٰ کا عرش ان کے دل پر ہوتا ہے۔ پھر وُہ رُوح القدس سے قوت پاتے اور خدا تعالیٰ سے فیض پاتے ہیں۔ تم لوگوں کو مَیں بشارت دیتا ہوں کہ تم میں سے جو اپنے اندر تبدیلی کرے گا، وُہ ابدال ہے۔ انسان اگر خدا کی طرف قدم اُٹھائے، تو اللہ تعالیٰ کا فضل دوڑ کر اس کی دستگیری کرتا ہے۔ یہ سچی بات ہے اور مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ چالاکی سے علُومُ القرآن نہیں آتے۔ دماغی قوت اور ذہنی ترقی قرآنی علوم کو جذب کرنے کا اکیلا باعث نہیں ہو سکتا۔ اصل ذریعہ تقویٰ ہی ہے۔ متقی کا معلم خدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں پر اُمیّت غالب ہوتی ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے اُمّی بھیجا گیا اور باوجودیکہ آپؐ نے نہ کسی مکتب میں تعلیم پائی اور نہ کسی کو اُستاد بنایا پھر آپؐ نے وہ معارف اور حقائق بیان کیے جنھوں نے دنیوی علُوم کے ماہروں کو دَنگ اور حیران کر دیا۔ قرآن شریف جیسی پاک، کامل کتاب آپؐ کے لبوں پر جاری ہوئی جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے عرب کو خاموش کرا دیا۔ وہ کیا بات تھی جس کے سبب سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم علُوم میں سب سے بڑھ گئے۔ وہ تقویٰ ہی تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مطہر زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف جیسی کتاب وُہ لائے جس کے علُوم نے دُنیا کو حیران کر دیا۔

آپؐ کا اُمّی ہونا ایک نمونہ اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآنی علُوم یا آسمانی علُوم کے لیے تقویٰ مطلوب ہے نہ دنیوی چالاکیاں۔

تلاوتِ قرآن کریم کی غرض

غرض قرآن شریف کی اصل غرض اور غایت دُنیا کو تقویٰ کی تعلیم دینا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ ہدایت کے منشاء کو حاصل کر سکے۔ اب اس آیت میں تقویٰ کے تین مراتب کو بیان کیا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (البقرہ: ۴) لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں، مگر طوطے کی طرح یُونہی بغیر سوچے سمجھے چلے جاتے ہیں۔ جیسے ایک پنڈت اپنی پوتھی کو اندھا دُھند پڑھتا جاتا ہے۔ نہ خود سمجھتا ہے اور نہ سُننے والوں کو پتہ لگتا ہے۔ اسی طرح پر قرآن شریف

کی تلاوت کا طریق صرف یہ رہ گیا ہے کہ دو چار سپارے پڑھ لیے اور کچھ معلوم نہیں کہ کیا پڑھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ سُر لگا کر پڑھ لیا اور ق اور ع کو پُورے طور پر اَدا کر دیا۔ قرآن شریف کو عمدہ طور پر اور خوش الحانی سے پڑھنا بھی ایک اچھی بات ہے، مگر قرآن شریف کی تلاوت کی اصل غرض تو یہ ہے کہ اس کے حقائق اور معارف پر اطلاع ملے اور انسان ایک تبدیلی اپنے اندر پیدا کرے۔

نظامِ قرآنی اور آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ کے الفاظ کی ترتیب

یہ یاد رکھو کہ قرآن شریف میں ایک عجیب و غریب اور سچا فلسفہ ہے۔ اس میں ایک نظام ہے جس کی قدر نہیں کی جاتی۔ جب تک نظام اور ترتیب قرآنی کو مدِ نظر نہ رکھا جاوے اور اس پر پُورا غور نہ کیا جاوے، قرآن شریف کی تلاوت کے اغراض پُورے نہ ہوں گے۔ اگر یہ لوگ جو قرآن شریف کے قٓ اور عینؔ اور ضادؔ پر لڑتے جھگڑتے ہیں اور ایک دُوسرے کی تفسیق پر مُنہ کھولتے ہیں۔

نظامِ قرآنی کی قدر کرتے، تو اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ (آلِ عمران: ۵۶) میں میرے ساتھ کیوں برسرِ پرخاش ہوتے جبکہ وُہ دیکھتے کہ قرآن شریف ایک ترتیب کے طور پر اُن واقعات کو بیان کرتا ہے جو خارجی طور پر اپنا ایک وجود رکھتے ہیں، کہ اے عیسیٰ۔ مَیں تجھے وفات دینے والا ہوں۔ سوچنا چاہیے تھا کہ یَا عِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ۔ قرآن شریف نے کہا کیوں۔ اس کی ضرورت کیا پیش آئی تھی؟

یہودیوں ہی سے پُوچھ لیتے تو یہ پتہ لگ جاتا۔ اصل بات جس کو مَیں نے بارہا بیان کیا ہے یہ ہے کہ یہوُد حضرت مسیحؑ کو ملعون قرار دیتے ہیں۔ معاذ اللہ۔ اور اس کا ثبوت وہ دیتے ہیں کہ اُنھوں نے مسیحؑ کو صلیب کے ذریعہ قتل کر دیا، مگر قرآن شریف نے اس الزام کو دُور کیا اور یہوُد کو مُلزم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے پاک بندوں کو ذلیل نہیں کرتا اور لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا۔ (النساء: ۱۴۲) اس کا سچا وعدہ ہے۔ حضرت مسیحؑ جب صلیب پر چڑھائے گئے تو اُن کو اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ مجھے صلیبی موت سے ہلاک کرنے کا موجب ٹھہرے ہیں اور اس طرح پر یہ لعنتی موت ہوگی۔ اس ہلاکت کی گھڑی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کو یہ بشارت دی کہ مَیں تجھے طبعی موت سے وفات دُوں گا اور تیرا رفع کرنے والا ہوں اور تجھے پاک کرنے والا ہوں۔ اس آیت کا ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے، مگر افسوس یہ لوگ کچھ بھی غور نہیں کرتے اور قرآن کریم کی ترتیب کو بدل کر تحریف کرنا چاہتے ہیں۔

کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہ تھا جو یُوں کہہ دیتا کہ یَا عِیْسٰٓی اِنِّیْ رَافِعُكَ اِلَى السَّمَآءِ۔

پھر وہ کونسی دِقّت اور مشکل اُس کو پیش آگئی تھی جو یَا عِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ ہی کہا۔ غرض اس آیت میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہ واقعات کی بناء پر ہے۔ وہ احمق ہے جو کہتا ہے کہ ترتیب واؤ سے نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہی غبی ہے کہ وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا، تو اُسے واقعات پر نظر کرنی چاہیے اور دیکھے کہ تطہیر رفع کے بعد ہوتی ہے یا پہلے اس تطہیر میں دراصل

اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تیرے بعد ایک رسُول آئیگا جو حَکَم ہو کر تیری نسبت جھگڑے کو فیصل کر دے گا اور جس قدر الزامات یہودی تجھ پر لگاتے ہیں، اُن سے تجھے پاک ٹھہرائے گا۔ تین ترتیبوں کے تو یہ مخالف بھی قائل ہیں یعنی رَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ یہ تو مانتے ہیں کہ مرتب کلام ہے۔ اس میں جو کچھ وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، وہ پُورا ہو گیا جسمانی رفع کے قائل اس میں کچھ کہہ نہیں سکتے، مگر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب تین ترتیبوں کے وہ قائل ہیں اور انہوں نے اسکو تسلیم کر لیا ہے تو تَوَفِّی کے لفظ کو اُٹھانے کی بے فائدہ کوشش کیوں کرتے ہیں۔ بھلا یہ یہودی طرز اختیار کر کے بتاؤ تو سہی اس لفظ کو رکھو گے کہاں؟ اگر رفع کے بعد رکھو تو واقعاتِ خارجیہ کے خلاف ہے۔ رفع اور تطہیر میں فاصلہ نہیں ہے، بلکہ رفع کے بعد تطہیر ہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے اس الزام سے کہ وُہ نبی بھی نہیں مانتے تھے اور ملعُون قرار دیتے تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ ابن اللہ اور اللہ ہیں جس کو آسمان پر اُٹھایا گیا اور وُہ ہمارے لیے ملعُون ہوا۔ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو بَری کیا ہے۔ یہ دو انگلیوں کی طرح ہیں۔ اُن کو الگ کر سکتے ہی نہیں۔ اور جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ کو دیکھو، تو وہ قیامت تک مُطَهِّرُكَ کے بعد کسی دُوسرے لفظ کو آنے ہی نہیں دیتا۔ پھر اس کو رکھو گے، تو کہاں رکھو گے۔ جس طرح پر واقعات ظہور میں آئے۔ اسی طرز سے بیان کیا ہے۔ اب اُلٹ پلٹ کر کہاں رکھ سکتے ہو۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ تمھیں خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ اس قدر دشمنی کیوں ہے، جو اس کی ترتیب توڑنا چاہتے ہو۔

عقیدہ حیاتِ مسیح کے نقصانات

کیا تم کو یہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کی خدائی ثابت کرو عیسائیوں کے اس مُردہ خدا کو کہیں تو مرنے دو۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو تم کہتے ہو کہ ہم مسیح کو محض ایک بندہ اور نبی مانتے ہیں، دُوسری طرف اُن کی نسبت ایسے عقیدے رکھنے چاہتے ہو جو اُن کو خدا بناتے ہیں۔ اس کی وُہی مثال ہے کہ ایک شخص تو کسی کی نسبت کہتا ہے کہ وُہ مر گیا، مگر دُوسرا کہتا ہے کہ نہیں مرا تو نہیں مگر نبض اُس کی نہیں چلتی۔ بدن بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ سانس بھی نہیں آتا۔

اے دانشمندو! غور تو کرو۔ اُس کے مرنے میں کیا شک رہا جس کی زندگی کا کوئی بھی اثر نہیں پایا جاتا۔

تم کہتے ہو کہ مسیح خدا نہیں، مگر مانتے ہو کہ وُہ آج تک زندہ ہے اور زمانہ کے اثر سے محفوظ اور لا تبدیل غیر متغیر ہے۔

تم کہتے ہو مسیح خالق نہیں، مگر مانتے ہو کہ اس نے بھی کچھ چڑیاں بنائی تھیں، جو ان چڑیوں میں مِل گئی ہیں۔

تم کہتے ہو کہ مسیح عالم الغیب نہیں، مگر یہ مانتے ہو کہ وہ تمھارے کھانے پینے کی چیزوں اور تمہارے گھروں کے ذخیروں کی اطلاع دے دیتا تھا۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ مُسلمان کہلا کر ایک خدا کو تمام صفاتِ کاملہ سے موصوف مان کر پھر اُس کی صفات ایک عاجز انسان کو دو۔ کچھ تو خدا کا خوف بھی کرو۔ یہی باتیں ہیں جنھوں نے نصاریٰ کی قوم کو

جرأت دلادی اور اُنھوں نے تمھاری قوم کا ایک بڑا حصّہ گمراہ کر ڈالا۔

تمھیں کب خبر ہوگی، جب سارا گھر لُٹ چکے گا؟ تم میرے ساتھ دشمنی نہیں کرتے، مگر اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہو۔ مَیں نے کونسی انوکھی بات کہی تھی۔ مَیں تم سے کیا کچھ مانگتا ہوں۔ پھر مجھ سے عداوت کی کیا وجہ؟ کیا اس لیے کہ مَیں کہتا ہوں کہ ایک ہی کامل الصفات ذات ہے جو عبادت کے قابل ہے۔ اس کے صفات کسی انسان کو نہ دو۔ کیا اس لیے کہ مَیں یہ کہتا ہوں کہ دُنیا میں ایک ہی کامل انسان گزرا ہے۔ جس کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ کیا اس لیے کہ مَیں کہتا ہوں کہ مسیح کے درجات کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات سے ہرگز نہ بڑھاؤ۔ اس لیے کہ وُہ اُن صفات سے ہرگز موصُوف نہیں، جن سے تم موصُوف مانتے ہو۔ خدا کے لیے سوچو! یہ یاد رکھو کہ آخر مرنا ہے اور خدا کے حضُور جانا ہے۔

تقویٰ کے تین مراتب

غرض بات یہ تھی کہ قرآن شریف میں ترتیب کو مدّنظر رکھنا ضروری ہے اور یہ آیتیں جو مَیں نے پڑھی تھیں، اُن میں ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (البقرہ: ۴)۔

یاد رکھو اِتّقا تین قسم کا ہوتا ہے۔ پہلی قسم اِتقا کی علمی رنگ رکھتی ہے۔ یہ حالت ایمان کی صورت میں ہوتی ہے۔ دُوسری قسم عملی رنگ رکھتی ہے۔ جیسا کہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں فرمایا ہے۔ انسان کی وُہ نمازیں جو شبہات اور وساوس میں مبتلا ہیں۔ کھڑی نہیں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یَقْرَؤُنَ نہیں فرمایا بلکہ یُقِیْمُوْنَ فرمایا۔ یعنی جو حق ہے اُس کے ادا کرنے کا۔ سُنو! ہر ایک چیز کی ایک علتِ غائی ہوتی ہے۔ اگر اس سے رہ جاوے تو وُہ بے فائدہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک بیل جو قلبہ رانی کے واسطے خریدا گیا ہے۔ اپنے منصب پر اُس وقت قائم سمجھا جاوے گا، جب وہ کر کے دکھا دے لیکن اگر اس کی غرض غایت کھانے پینے ہی تک محدُود رہے، تو اپنی علتِ غائی سے دُور ہے اور اس قابل ہے کہ اُس کو ذبح کیا جاوے۔

اقامتِ صلوٰۃ

اسی طرح یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں لوازم الصلوٰۃ معراج ہے۔ اور یہ وُہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق شروع ہوتا ہے۔ مکاشفات اور رویاء صالحہ آتے ہیں۔ لوگوں سے اِنقطاع ہوتا جاتا ہے اور خدا کی طرف ایک تعلق پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ تبتّلِ تام ہو کر خدا میں جا ملتا ہے۔

صلی جلنے کو کہتے ہیں۔ جیسے کباب بھُونا جاتا ہے، اسی طرح نماز میں سوزش لازمی ہے۔ جبتک دِل بریان نہ ہو نماز میں لذّت اور سرُور پیدا نہیں ہوتا۔ اور اصل تو یہ ہے کہ نماز ہی اپنے سچّے معنوں میں اُسی وقت ہوتی ہے۔ نماز میں شرط ہے کہ وہ بجمیع شرائط ادا ہو۔ جب تک وُہ ادا نہ ہو وُہ نماز نہیں ہے اور نہ وُہ کیفیت جو صلوٰۃ میں یعنی نماز کی ہے حاصل ہوتی ہے۔

یاد رکھو صلوٰۃ میں حال اور قال دونوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ بعض وقت اعلام تصویری ہوتا ہے۔ ایسی تصویر

دکھائی جاتی ہے، جس سے دیکھنے والے کو پتہ ملتا ہے کہ اُس کا منشا یہ ہے۔ ایسا ہی صلوٰۃ میں منشائے الٰہی کی تصویر ہے۔ نماز میں جیسے زبان سے کچھ پڑھا جاتا ہے ویسے ہی اعضاء وجوارح کی حرکات سے کچھ دکھایا بھی جاتا ہے۔ جب انسان کھڑا ہوتا ہے اور تحمید و تسبیح کرتا ہے، اس کا نام قیام رکھا گیا ہے۔ اب ہر ایک شخص جانتا ہے کہ حمد و ثناء کے مناسب حال قیام ہی ہے۔ بادشاہوں کے سامنے جب قصائد سنائے جاتے ہیں، تو آخر کھڑے ہو کر ہی پیش کرتے ہیں۔ تو ادھر ظاہری طور پر قیام رکھا گیا ہے اور اُدھر زبان سے حمد و ثنا بھی رکھی ہے۔ مطلب اس کا یہی ہے کہ رُوحانی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو۔ حمد ایک بات پر قائم ہو کر کی جاتی ہے۔ جو شخص مُصدِق ہو کر کسی کی تعریف کرتا ہے، تو ایک رائے پر قائم ہو جاتا ہے۔ اس الحمد للہ کہنے والے کے واسطے یہ ضروری ہوا کہ وہ سچے طور پر الحمد للہ اسی وقت کہہ سکتا ہے کہ پورے طور پر اس کو یقین ہو جائے کہ جمیع اقسام محامد کے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ جب یہ بات دل میں انشراح کے ساتھ پیدا ہو گئی، تو یہ رُوحانی قیام ہے۔ کیونکہ دل اس پر قائم ہو جاتا ہے اور پھر سمجھا جاتا ہے کہ وہ کھڑا ہے۔ حال کے موافق کھڑا ہو گیا، تاکہ رُوحانی قیام نصیب ہو۔

پھر رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کہتا ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کسی کی عظمت مان لیتے ہیں۔ تو اس کے حضور جھکتے ہیں۔ عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے رکُوع کرے۔ پس سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ زبان سے کہا اور حال سے جُھکنا دکھایا۔

یہ اُس قول کے ساتھ حال دکھایا۔ پھر تیسرا قول ہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ اَعْلٰی افعلُ تفضیل ہے۔ یہ بالذات سجدہ کو چاہتا ہے۔ اس لیے اُس کے ساتھ حالی تصویر سجدہ میں گرنا ہے۔ اس اقرار کے مناسبِ حال ہیئت فی الفور اختیار کر لی۔

اس قال کے ساتھ تین حال جسمانی ہیں۔ ایک تصویر اس کے آگے پیش کی گئی ہر ایک قسم کا قیام بھی کیا گیا ہے۔ زبان جو جسم کا ٹکڑا ہے۔ اس نے بھی کہا اور وہ شامل ہو گئی۔

تیسری چیز اور ہے وہ اگر شامل نہ ہو، تو نماز نہیں ہوتی۔ وُہ کیا ہے؟ وہ قلب ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قلب کا قیام ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر نظر کر کے دیکھے کہ درحقیقت وہ حمد بھی کرتا ہے اور کھڑا بھی ہے اور رُوح بھی کھڑا ہوا حمد کرتا ہے۔ جسم ہی نہیں بلکہ رُوح بھی کھڑا ہے اور جب سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کہتا ہے تو دیکھے کہ اتنا ہی نہیں کہ صرف عظمت کا اقرار ہی کیا ہے۔ نہیں بلکہ ساتھ ہی جھکا بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی روح بھی جُھک گیا ہے۔ پھر تیسری نظر میں خدا کے حضور سجدہ میں گرا ہے۔ اس کی علوِشان کو ملاحظہ میں لا کر اُس کے ساتھ ہی دیکھے کہ رُوح بھی اُلوہیت کے آستانہ پر گری ہوئی ہے۔ غرض یہ حالت جب تک پیدا نہ ہولے۔ اس وقت تک مطمئن نہ ہو، کیونکہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے معنی یہی ہیں۔ اگر یہ سوال ہو کہ یہ حالت پیدا کیونکر ہو، تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ نماز پر مداومت کی جاتے اور

وساوس اور شبہات سے پریشان نہ ہو۔ ابتدائی حالت میں شکوک وشبہات سے ایک جنگ ضرور ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ نہ تھکنے والے استقلال اور صبر کے ساتھ لگا رہے اور خدا تعالیٰ سے دُعائیں مانگتا رہے آخر وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یہ تقویٰ عملی کا ایک جزو ہے۔

انفاقِ رزق

اور دُوسری جُزو اس کی مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۴:) ہے کہ جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں عام لوگ رزق سے مُراد اشیاء خوردنی لیتے ہیں۔ یہ غلط ہے جو کچھ قویٰ کو دیا جاوے وُہ بھی رزق ہے۔ علوم وفنون وغیرہ معارف حقائق عطا ہوتے ہیں جسمانی طور پر معاش مال میں فراخی ہو۔ سب رزق ہے۔

رزق میں حکومت بھی شامل ہے اور اخلاقِ فاضلہ بھی رزق ہی میں داخل ہیں یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس میں خرچ کرتے ہیں یعنی روٹی میں سے روٹی دیتے ہیں، علم میں سے علم اور اخلاق میں سے اخلاق۔ علم کا دینا تو ظاہر ہی ہے۔

بُخل

یہ یاد رکھو کہ وُہی بخیل نہیں ہے جو اپنے مال میں سے کسی مستحق کو کچھ نہیں دیتا بلکہ وہ بھی بخیل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہو اور وہ دُوسروں کو سکھانے میں مضائقہ کرے۔ محض اس لیے اپنے علوم وفنون سے کسی کو واقف نہ کرنا کہ اگر وہ سیکھ جاوے گا، تو ہماری بے قدری ہو جاوے گی یا آمدنی میں فرق آ جائے گا، شرک ہے، کیونکہ اِس صورت میں وُہ اس علم یا فن کو ہی اپنا رازق اور خُدا سمجھتا ہے۔ اسی طرح پر جو اپنے اخلاق سے کام نہیں لیتا، وہ بھی بخیل ہے۔ اخلاق کا دینا یہی ہوتا ہے کہ جو اخلاقِ فاضلہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے دے رکھے ہیں، اُس کی مخلوق سے اُن اخلاق سے پیش آوے۔ وہ لوگ اس کے نمونہ کو دیکھ کر خود بھی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

خُلق کی تعریف

اخلاق سے اس قدر ہی مراد نہیں ہے کہ زبان کی نرمی اور الفاظ کی نرمی سے کام لے۔ نہیں بلکہ شجاعت، مروت، عِفّت جس قدر قوتیں انسان کو دی گئی ہیں۔ دراصل سب اخلاقی قوتیں ہیں، اُن کا برمحل استعمال کرنا ہی اُن کو اخلاقی حالت میں لے آتا ہے۔ ایک موقعہ مناسب پر غضب کا استعمال بھی اخلاقی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

یہ نہیں کہ انجیل کی طرح ایک ہی پہلو اپنے اندر رکھتی ہے کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دُوسری پھیر دو۔ یہ اخلاق نہیں ہے اور نہ یہ تعلیم حکمت کے اصُول پر مبنی ہوسکتی ہے اگر ایسا ہو تو تمام فوجوں کا موقوف کر دینا اور ہر قسم کے آلاتِ حرب کو توڑ دینا لازم آئے گا اور مسیحی دُنیا کو بطور ایک خادم کے رہنا پڑے گا، کیونکہ اگر کوئی کُرتہ مانگے، تو جُبّہ بھی دینا پڑے گا۔ ایک کوس بیگار لے جانا چاہے، تو دو کوس جانے کا حکم ہے۔ پھر عیسائی لوگوں کو کس قدر مشکلات پیش آئیں اگر وہ

اس تعلیم پر عمل کریں تو نہ صرف اُن کے پاس ضروریاتِ زندگی بسر کرنے کو کچھ رہے اور نہ کوئی آرام کی صورت کیونکہ جو کچھ اُن کے پاس ہو کوئی مانگ لے، تو پھر اُن کے پاس کیا رہ جاوے؟ اگر محنت مزدوری سے کمانا چاہیں، تو کوئی بیگار میں لگا دے۔ غرض اس تعلیم پر زور تو بہت دیا گیا ہے اور پادریوں کو دیکھا ہے کہ وُہ بازاروں میں اس تعلیم کی بڑے شدّ و مد سے تعریف کر کے وعظ کرتے ہیں، لیکن جب عمل پُوچھو تو کچھ نہیں۔ گویا گفتن ہی سب کچھ ہے۔ کرنے کے واسطے کچھ نہیں۔ اس لیے اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔ اخلاق یہ ہے کہ تمام قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں برمحل استعمال کیا جاوے۔ مثلاً عقل دی گئی ہے اور کوئی دوسرا شخص جس کو کسی امر میں واقفیّت نہیں اس کے مشورہ کا محتاج ہے اور یہ پُوری واقفیّت رکھتا ہے تو اخلاق کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اپنی عقلِ سلیم سے اُس کو پُوری مدد دے اور اس کو سچّا مشورہ دے۔ لوگ اِن باتوں کو معمولی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اس کو خراب ہونے دو۔ یہ شیطانی فعل ہے۔ انسانیت سے بعید ہے کہ وہ کسی دُوسرے کو بگڑتا دیکھے اور اُس کی مدد کے لیے تیار نہ ہو۔ نہیں بلکہ چاہیے کہ نہایت توجہ اور دلدہی سے اس کی بات سُنے اور اپنی عقل و سمجھ سے اُس کو ضروری مدد دے۔

لیکن اگر کوئی یہاں یہ اعتراض کرے کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ کیوں فرمایا مِمَّا کے لفظ سے بُخل کی بُو آتی ہے۔ چاہیے تھا کہ ؎

ہر چہ داری خرچ کُن در راہِ اُو

اصل بات یہ ہے کہ اس سے بُخل ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن شریف خدائے حکیم کا کلام ہے۔ حکمت کے معنی ہیں۔ شے را برمحل داشتن۔ پس مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ میں اسی اَمر کی طرف اشارہ ہے کہ محل اور موقع کو دیکھ کر خرچ کرو۔ جہاں تھوڑا خرچ کرنے کی ضرورت ہے، وہاں تھوڑا خرچ کرو۔ جہاں بہت خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہاں بہت خرچ کرو۔

عفو

اب مثلاً عفو ہی ایک اخلاقی قوّت ہے۔ اس کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا عفو کے لائق ہے یا نہیں۔ مُجرم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض تو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُن سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جاتی ہے جو غصّہ تو دلاتی ہے، لیکن وُہ معافی کے قابل ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کی کسی شرارت پر چشم پوشی کی جاوے اور اُن کو مُعاف کر دیا جاوے تو وُہ زیادہ دلیر ہو کر مزید نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً ایک خدمتگار ہے جو بڑا نیک اور فرماں بردار ہے۔ وہ چائے لایا۔ اِتّفاق سے اُس کو ٹھوکر لگی اور چائے کی پیالی گر کر ٹوٹ گئی اور چائے بھی مالک پر گر گئی۔ اگر وہ اُس کو مارنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو اور تیز اور تُند ہو کر اُس پر جا پڑے، تو یہ سفاہت ہوگی۔ یہ عفو کا مقام ہے، کیونکہ اس نے عمداً شرارت نہیں کی ہے اور عفو اس کو زیادہ شرمندہ کرتا اور آئندہ کے لیے محتاط بناتا ہے، لیکن اگر کوئی ایسا شریر ہے کہ وہ ہر روز توڑ تا ہے اور یُوں نقصان پہنچاتا ہے، تو اس پر رحم یہی ہوگا کہ اُس کو سزا دی جائے۔ پس یہی حکمت ہے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں ہر ایک مومن اپنے نفس کا مُجتہد ہوتا ہے وُہ محل اور موقع کی شناخت کرے اور جس قدر مناسب ہو خرچ کرے۔

انجیل کی ناقابلِ عمل تعلیم

مَیں ابھی بتا چکا ہوں کہ قرآن شریف کی تعلیم حکیمانہ نظام اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کے بالمقابل انجیل کی تعلیم کو دیکھو کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دُوسری پھیر دے وغیرہ وغیرہ۔ کیسی قابلِ اعتراض ہے کہ اس کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتی اور اس کی تمدّنی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑا نرم خُو اور تقدس مآب پادری بھی اس تعلیم پر عمل نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی انجیل کی اس تعلیم کا عملی ثبوت لینے کے لیے کسی پادری صاحب کے مُنہ پر طمانچہ مارے، تو وُہ بجائے اِس کے کہ دُوسری گال پھیرے۔ پولیس کے پاس دوڑا جاوے گا اور اس کو حکام کے سپرد کرا دے گا۔

اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انجیل معطّل پڑی ہے اور قرآن شریف پر عمل ہو رہا ہے۔ ایک مُفلس اور نادار بڑھیا بھی جس کے پاس ایک جَو کی روٹی کا ٹکڑا ہے، اس ٹکڑے میں سے ایک حِصّہ دے کر مِمَّا رَزَقْنَا هُمْ میں داخل ہو سکتی ہے۔ لیکن انجیل کی طمانچہ کھا کر گال پھیرنے کی تعلیم میں مقدّس سے مقدّس پادری بھی شامل نہیں ہو سکتا۔ ع

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

انجیل تو اس پہلو میں یہاں تک گری ہوئی ثابت ہوتی ہے کہ اور تو اور خود حضرت مسیح بھی اس پر پُورا عمل نہ دکھا سکے۔ اور وہ تعلیم جو خود پیش کی تھی، عملی پہلو میں اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ وُہ کہنے ہی کے لیے ہے؛ ورنہ چاہیے تھا کہ اس سے پیشتر کہ وُہ گرفتار ہوتے خود اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دیتے اور دُعائیں مانگنے اور اضطراب ظاہر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس سے نہ صِرف یہ ثابت ہوتا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ثابت ہو جاتا کہ وہ کفارہ ہی کے لیے آئے ہیں۔ کیونکہ اگر اُن کی زندگی کا یہی کام تھا کہ وہ خودکشی کے طریق سے دُنیا کو نجات دیں اور بقول عیسائیوں کے خدا بجز اس صورت کے نجات ہی نہیں دے سکتا تھا، تو اُن کو چاہیے تھا کہ جس کام کے لیے وہ بھیجے گئے تھے وُہ تو یہی تھا۔ پھر وعظ اور تبلیغ کی ضرورت ہی کیا تھی؛ کیوں نہ آتے ہی یہ کہہ دیا کہ مجھے پکڑو اور پھانسی دے دو۔ تاکہ دُنیا کی رُستگاری ہو۔

قرآنی تعلیم انسانی قویٰ کی تکمیل کرتی ہے

غرض قرآن شریف کی تعلیم ثابت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور ذرّہ ذرّہ اس کے آگے ہے اور اس نے ایسی تعلیم دی ہے، جو انسانی قویٰ کی تکمیل کرتی ہے اور عفو اور انتقام کو محل اور موقع پر رکھنے کے واسطے اِس سے بڑھ کر تعلیم نظر نہیں آئے گی۔ اگر کوئی اس تعلیم کے خلاف اور کچھ پیش کرتا ہے تو وہ گویا قانونِ الٰہی کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ بعض طبائع طبعاً عفو چاہتی ہیں اور بعض مار کھانے کے قابل ہوتی ہیں۔ سب عدالتیں قرآن شریف کی تعلیم کے موافق کھُلی رہ سکتی ہیں۔ اگر انجیل کے موافق کریں، تو آج ہی سب کچھ بند کرنا پڑے اور پھر دیکھو کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ انسان انجیلی تعلیم پر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ پس یہ دو نمونے علمی اور عملی تقویٰ کے ہوتے ہیں۔

۳- کلامِ الٰہی پر ایمان

لیکن اس کے سوا تیسری قسم تقویٰ کی ہے وَیُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (البقرہ: ۵) انسان قوتِ شہادت کا محتاج ہے۔ ایسی راہ اختیار نہ کرے کہ پاک شہادتوں سے دُور ہو۔ وُہ راہ خطرناک راہ ہے جس میں راستبازوں کی شہادتیں موجود نہیں ہیں۔ تقویٰ کی راہ یہی ہے کہ جس میں زبردست شہادتیں ہر زمانہ میں زندہ موجود ہیں۔ مثلاً تم نے راہ پُوچھا کسی نے کچھ کہا کہ یہ راہ فلاں طرف جاتا ہے، مگر دس کہتے ہیں کہ نہیں یہ تو فلاں طرف جاتا ہے، تو اب تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ ان بھلے مانس آدمیوں کی بات مان لو۔ یہ یاد رکھو کہ شہادت پاکبازوں کی ہی مقبول اور مُوزون ہوتی ہے۔ بدمعاشوں کی شہادت کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ یہ تیسری قسم تقویٰ کی ہے جو یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو چھوڑ کر بھی لوگ بہت خراب ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ جو لوگوں نے مخالفت کی ہے، تو اسی وجہ سے اُنھوں نے تقویٰ کی اِس قسم کو چھوڑ دیا ہے۔

وفاتِ مسیح

خدا تعالیٰ کا کلام تیس آیتوں میں ہمارا مؤید ہے۔ کبھی وہ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ (آلِ عمران: ۵۶) کہہ کر کبھی فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کہہ کر کبھی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آلِ عمران: ۱۴۵) کہہ کر۔ غرض کبھی کسی پیرایہ میں کبھی کسی صُورت میں پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہی راہ سچی ہے۔ جس پر ہم بفضلہٖ تعالیٰ قائم ہیں اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیحؑ کو حضرت یحیٰؑ کے ساتھ معراج میں دیکھتے ہیں۔ اور یہ پکی بات ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص فرق جو زندوں اور مُردوں میں ہونا چاہیے، نہیں بتایا۔ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی عمر بتا کر یہ شہادت دیتے ہیں کہ وُہ مر گیا اور کبھی آنے والے مسیح موعود اور اسرائیلی مسیح کا حُلیہ جُدا جُدا بتا کر سمجھاتے ہیں کہ وُہ مر گیا۔ یہ شہادتیں تو حدیث اور قرآن کی ہیں۔ ان کے علاوہ تمام صحابہؓ کی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی وفات پر یہ ہوئی ہے کہ سب نبی مر گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کہ ابھی نہیں مرے اور تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، مگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر یہ خطبہ پڑھتے ہیں کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آلِ عمران: ۱۴۵) اب اس موقعہ پر جو ایک قیامت ہی کا میدان تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں اور کُل صحابہؓ جمع ہیں۔ یہانتک کہ اُسامہ کا لشکر بھی روانہ نہیں ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر حضرت ابو بکرؓ باوازِ بلند کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور اس پر استدلال کرتے ہیں مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ سے۔ اب اگر صحابہؓ کے وہم وگمان میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہوتی تو ضرور بول اُٹھتے، مگر سب خاموش ہو گئے اور بازاروں میں یہ آیت پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ گویا یہ آیت آج اُتری ہے۔

معاذ اللہ صحابہؓ منافق نہ تھے جو وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے رُعب میں آ کر خاموش ہو رہے اور حضرت ابو بکرؓ کی تردید نہ کی۔ نہیں، اصل بات یہی تھی جو حضرت ابو بکرؓ نے بیان کی۔ اس لیے سب نے گردن جُھکالی۔

یہ ہے اجماع صحابہؓ کا۔ حضرت عمرؓ بھی تو یہی کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر آئیں گے۔ اگر یہ استدلال کامل نہ ہوتا (اور کامل تب ہی ہوتا کہ کسی قسم کا استثناء نہ ہوتا) کیونکہ اگر حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر چلے گئے تھے اور اُنھوں نے پھر آنا تھا تو پھر یہ استدلال کیا یہ تو ایک مسخری ہوتی، تو خود حضرت عمرؓ ہی تردید کرتے۔

حضرت ابوبکرؓ کا فہم قرآن

جبکہ آیت میں استثناء نہ تھا اور امر واقعی یہی تھا۔ اس لیے سب صحابہؓ نے بالاتفاق اس امر کو تسلیم کر لیا اور حضرت ابوبکرؓ جن کو قرآن شریف کا یہ فہم ملا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (المائدہ : ۴) پڑھی تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے۔ کسی نے پوچھا کہ یہ بڈھا کیوں روتا ہے، تو آپ نے کہا کہ مجھے اس آیت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بو آتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام بطور حکام کے ہوتے ہیں۔ جیسے بندوبست کا ملازم جب اپنا کام کر چکتا ہے، تو وہاں سے چل دیتا ہے۔ اسی طرح پر انبیاء علیہم السلام جس کام کے واسطے دنیا میں آتے ہیں، جب اس کو کر لیتے ہیں تو پھر وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں پس جب اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی صدا پہنچی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ یہ آخری صدا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا فہم بہت بڑھا ہوا تھا اور یہ جو احادیث میں آیا ہے کہ مسجد کی طرف سب کھڑکیاں بند کی جاویں، مگر ابوبکرؓ کی کھڑکی مسجد کی طرف کھلی رہے گی۔ اس میں یہی ستر ہے کہ مسجد چونکہ مظہر اسرار الٰہی ہوتی ہے اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف یہ دروازہ بند نہیں ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام استعارات اور مجازات سے کام لیتے ہیں۔ جو شخص خشک ملاؤں کی طرح یہ کہتا ہے کہ نہیں ظاہر ہی ظاہر ہوتا ہے وہ سخت غلطی کرتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو یہ کہنا کہ یہ دہلیز بدل دے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سونے کے کڑے دیکھنا وغیرہ اُمور اپنے ظاہری معنوں پر نہیں تھے بلکہ استعارہ اور مجاز کے طور پر تھے، ان کے اندر ایک اور حقیقت تھی۔

غرض مدعا یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو فہم قرآن سب سے زیادہ دیا گیا تھا۔ اسی لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ استدلال کیا۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ اگر یہ معنی بظاہر معارض بھی ہوتے۔ تب بھی تقویٰ اور دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ ابوبکرؓ ہی کی مانتے۔ مگر یہاں تو ایک بھی لفظ قرآن شریف میں ایسا نہیں ہے، جو حضرت ابوبکرؓ کے معنوں کا معارض ہو

اب مولویوں سے پوچھو کہ ابوبکرؓ دانشمند تھا یا نہیں؟ کیا یہ وہ ابوبکرؓ نہیں تھا جو صدیق کہلایا؟ کیا یہی وہ شخص نہیں جو سب سے پہلے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنا؟ جس نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی کہ خطرناک ارتداد کی وبا کو روک دیا۔ اچھا اور باتیں جانے دو یہی بتاؤ کہ ابوبکرؓ کو منبر پر چڑھنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ پھر تقویٰ سے یہ بتاؤ کہ اُنھوں نے جو مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران : ۱۴۵) پڑھا تو اس سے استدلال تام کرنا تھا یا ایسا ناقص کہ ایک بچہ بھی کہہ سکتا کہ عیسیٰؑ کو موتی سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے۔

افسوس! اِن مخالفوں نے میری مخالفت اور عداوت میں یہی نہیں کہ قرآن کو چھوڑا بلکہ میری عداوت نے اُن کی یہانتک نوبت پہنچائی ہے کہ صحابہؓ کی کُل جماعت پر اُنھوں نے اپنے طریقِ عمل سے کفر کا فتویٰ دے دیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے استدلال کو استخفاف کی نظر سے دیکھا۔

وفاتِ مسیحؑ پر اجماع

سارا قرآن شریف ہمارے ساتھ ہے۔ تیس آیات مخصوصًا مسیح علیہ السلام کی وفات پر گواہ ہیں معراج کی رات، ابوبکر صدّیقؓ کی تقریر اور صحابہؓ کا اجماع شاہد ہے۔

یہ لوگ جو ہمارے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اجماع کے خلاف ایک بات کہی ہے۔ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اجماع اُن کے ساتھ ہرگز نہیں ہے۔ اوّل تو اجماع صحابہؓ ہی تک ہے اور ہم نے ابھی بتایا ہے کہ صحابہؓ کا اجماع رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مسیحؑ کی وفات پر ہو چکا ہے۔ امام احمد حنبلؒ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے بعد اجماع کا دعوےٰ جھوٹا ہے ماسوائے اِس کے بھی بہت سے لوگ اُنکے خلاف اور ہمارے ساتھ ہیں معتزلہ مسیحؑ کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کے قائل نہیں ہیں۔ صوفیوں کا یہی مذہب ہے کہ وہ کہتے ہیں مسیح کی آمد بروزی ہے۔ وَقَالَ مَالِكٌ مَاتَ۔ امام مالکؒ موت ہی کے قائل ہیں۔ ابنِ حزم کا بھی مذہب یہی ہے۔ اب مالکی۔ ابنِ حزم کے ماننے والے اور معتزلہ اس مسئلہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ لیکن پھر بھی، علی اسبیلِ تنزل، اگر ہم مان لیں کہ کوئی بھی ہمارے ساتھ اُن میں سے نہیں، تو بھی ہم تو کہتے ہیں کہ قرونِ ثلاثہ کے بعد زمانہ کا نام فیج اعوج رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے یعنی ایک ٹیڑھا گروہ اور ان کی نسبت فرمایا لَيْسُوْا مِنِّىْ وَلَسْتُ مِنْهُمْ۔ اب اُن کے ہاتھ میں کیا رہا۔

صحابہؓ کے وارث ہم، قرآن اور حدیث کے مغز کے وارث تو ہم ہی ٹھہرے۔ باقی رہی یہ بات کہ لکھا ہوا ہے کہ مسیحؑ نازل ہوگا۔ پس یاد رہے کہ نزول کا لفظ بہت وسیع ہے۔ نزیل مسافر کو بھی کہتے ہیں۔

مسئلہ بروز

ماسوا اس کے اصل بات یہ ہے جس کو یاد رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو آخری زمانہ کا علم دیا گیا تھا۔ آپؐ نے اِس علم کے موافق دو۲ بروزوں کی خبر دی تھی۔

اہلِ اللہ اِس بات کے قائل ہیں کہ مراتبِ وجُود دَوری ہیں۔ مَیں اس کو مانتا ہوں۔ قرآن شریف سے یہی مُستنبط ہوتا ہے۔ صُوفیائے کرام اس کو مانتے ہیں کہ کسی گذرے ہوئے انسان کی طبیعت، خُو، اخلاق ایک اور میں آتے ہیں۔ اُن کی اصطلاح میں یہ کہتے ہیں کہ فُلاں شخص قدمِ آدم پر ہے یا قدمِ نوحؑ پر ہے۔ اُس کو بعض بُروز بھی بولتے ہیں۔ اُن کا مذہب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لیے بُروز ہے۔ جیسے ہابیل کا بُروز شیث علیہ السّلام اور یہ پہلا بروز تھا۔

ہبل نوحہ کو کہتے ہیں۔ خدا نے شیثؑ کو یہ بُروز دیا۔ پھر یہ سلسلہ برابر چلتا گیا۔ یہانتک کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا بروز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اسی لیے قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا (البقرہ : ۱۳۶) فرمایا۔ اس میں یہی سِر ہے۔ ابراہیمؑ دو اڑھائی ہزار سال کے بعد عبداللہ کے گھر میں ظاہر ہوا۔ غرض بُروز کا مذہب ایک متفق علیہ مسئلہ

ظہورات کا ہے۔

آخری زمانہ کے دو فتنے

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانہ کے واسطے خبر دی تھی کہ اُس وقت دو رنگ کے فتنے ہوں گے۔ ایک اندرونی، دوسرا بیرونی۔ اندرونی فتنہ یہ ہوگا کہ مسلمان سچی ہدایت پر قائم نہ رہیں گے اور شیطانی عمل دخل کے نیچے آجائیں گے۔ قمار بازی، زناکاری، شراب خوری اور ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہو کر حدود اللہ سے نکل جائیں گے اور خدا تعالیٰ کی نواہی کی پروا نہ کریں گے صوم و صلوٰۃ کو ترک کر دیویں گے اور امرِ الٰہی کی بے حرمتی کی جائے گی اور قرآنی احکام کے ساتھ ہنسی ٹھٹھا کیا جائے گا۔ بیرونی فتنہ یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر افترا کیے جائیں گے اور ہر قسم کے دل آزار حملوں سے اسلام کی توہین اور تخریب کی کوشش کی جاوے گی۔ یہ مسیح کی خدائی کو منوانے کے لیے اور اس کی صلیبی لعنت پر ایمان لانے کے واسطے ہر قسم کے حیلے اور تدابیر عمل میں لائی جاویں گی۔ غرض ان دونوں اندرونی اور بیرونی عظیم الشان فتنوں کی اصلاح کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ ہی یہ بشارت ملی کہ ایک شخص آپؐ کی اُمت میں سے مبعوث کیا جاوے گا جو بیرونی فتنہ اور صلیبی مذہب کی حقیقت کو توڑ دینے والا ہوگا اور اسی لحاظ سے وہ مسیح ابن مریمؑ ہوگا اور اندرونی تفرقوں اور بے راہیوں کو دور کر کے ہدایت کی سچی راہ پر قائم کرے گا۔ اس لیے مہدی کہلائے گا۔ اسی بشارت کی طرف وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں بھی اشارہ ہے۔ جبکہ یہ دونوں فتنے ہوں گے۔ ان فتنوں کی بنیاد دو خبیث چیزوں پر ہوگی۔ ایک فرقہ ہوگا جو الدجال کہلائے گا۔ اور ایک یاجوج۔

دجّال

الدجال۔ دجل یہ ہے کہ اندر ناقص چیز اور اُوپر کوئی صاف چیز ہو۔ مثلاً اوپر سونے کا ملمع ہو اور اندر تانبہ ہو۔ یہ دجل ابتدائے دُنیا سے چلا آتا ہے۔ مکر و فریب سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔ زرگر کیا کرتے ہیں۔ جیسے دُنیا کے کاموں میں دجل ہے ویسے ہی رُوحانی کاموں میں بھی دجل ہوتا ہے یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ (النساء: ۴۷) بھی دجل ہے۔ جو یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ (آل عمران: ۵۶) کو اُلٹاتے ہیں۔ یہ بھی دجل ہے۔ مگر آخری زمانے کا دجل عظیم الشان دجل ہوگا۔ گویا دجالیت کا ایک دریا بہہ نکلے گا۔ اَلدَّجَّال پر، اَلْ استغراق کا ہے۔ پس الدجال دجاجلہ مختلفہ کا بروز ہے۔ یعنی پہلے جس قدر مختلف اور متفرق کید، حیلے، ضلالت اور کفر کے تھے۔ کسی زمانہ میں نابکار لوگوں نے کچھ کہا۔ کسی نے کچھ کہا۔ متفرق طور پر جس قدر اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے، مگر وہ ایک حد تک تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس وقت اعتراضات کا ایک دریا بہہ نکلے گا۔ جیسے چھوٹی چھوٹی نہریں ندیاں مل کر ایک دریا بن جاتا ہے۔ اسی طرح کُل دجل مل کر ایک بڑا دجل ہوگا۔

چنانچہ اس زمانہ میں دیکھو کتنا بڑا دجل ہو رہا ہے۔ ہر طرف سے اسلام پر نکتہ چینیاں اور اعتراض کیے جاتے ہیں۔

اور عیسائیوں نے تو حد کر دی ہے۔ میں نے ان اعتراضوں کو جمع کیا ہے، جو عیسائیوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے ہیں۔ اُن کی تعداد تین ہزار تک پہنچتی ہے اور جس قدر کتابیں اور رسالے اور اشتہار آئے دن ان لوگوں کی طرف سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضوں کی شکل میں شائع ہوتے ہیں۔ اُن کی تعداد چھ کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ گویا ہندوستان کے مُسلمانوں میں سے ہر ایک آدمی کے ہاتھ میں یہ لوگ کتاب دے سکتے ہیں پس سب سے بڑا فِتنہ یہی نصاریٰ کا فِتنہ ہے اور الدجّال کا بُروز ہے۔

یاجُوج وماجُوج

ایسا ہی یاجُوج۔ یہ لفظ اجیج سے مُشتق ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آتشی کاموں کے ساتھ اُن کا بہت بڑا تعلق ہوگا اور وُہ آگ سے کام لینے میں بہت مہارت رکھیں گے۔ گویا آگ اُن کے قابو میں ہوگی اور دُوسرے لوگ اِس آتشی مقابلہ میں ان سے عاجز رہ جائیں گے۔ اب یہ کیسی صاف بات ہے۔ دیکھ لو کہ آگ کے ساتھ اس قوم کو کس قدر تعلق ہے۔ کلیں کس قدر جاری ہیں۔ اور دن بدن آگ سے کام لینے میں ترقی کر رہے ہیں۔

یہ دونوں بُروز ہیں اور یہ دونوں کیفیتیں جو متفرق طور پر تھیں، ایک وجُود میں آئی ہیں۔ ایسا ہی ماجُوج ہیں اور یہ ایک پکّی بات ہے کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ۔ انسان پر مُلوک کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ مُلوک تو مُلوک ہوتے ہیں۔ ادنیٰ درجہ کے نمبرداروں تک کا اثر پڑتا ہے۔ سکھوں کے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے کیس رکھ لیے تھے اور کچھ پہن لیے تھے۔ ایک شخص ہمارے قریب ایک گاؤں میں بھی رہتا تھا۔ اس کا نام خدا بخش تھا۔ اس نے اپنا نام خدا سنگھ رکھ لیا تھا۔

موضع ڈلّہ میں گلاب شاہ اور مہتاب شاہ دو بھائی تھے۔ وہ گرنتھ ہی پڑھا کرتے تھے اور یہ معمولی بات ہے کہ مُلوک کے خیالات کا مذہب، طرزِ لباس، ہر قسم کے اُمور کا اخلاقی ہوں یا مذہبی بہت بڑا اثر رعایا پر پڑتا ہے۔ جیسے ذکور کا اثر اناث پر پڑتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: ۳۵) اسی طرح پر رعایا پر مُلوک کا اثر ضروری ہے۔ سکھوں کی عملداری میں وہ پگڑیاں باندھا کرتے تھے اور اب تک بھی ریاستوں میں اس کا بقیہ چلا جاتا ہے۔ جب ایک دُوسرے سے مِلا کرتے تھے، تو سب ایک ہی لفظ بولا کرتے تھے "سُکھ ہے"

ایسا ہی اب اِس عملداری میں سلطنت کا اثر رعایا پر پڑتا ہے۔ طرزِ لباس ہی کو دیکھو کہ ہر ایک شخص انگریزی لباس کوٹ پتلون کو پہن کر فخر کرتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو انگریزی ٹوپیاں بھی پہنتے ہیں۔ سلطنت کی طرف سے کسی قسم کی ترغیب نہیں دی جاتی، کوئی حکم جاری نہیں کیا جاتا کہ لوگ اس قسم کا لباس پہنیں، مگر خود بخود طبائع میں ایک شوق دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ باوجودیکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس لباس کی تبدیلی کو اچھّی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور اپنی جگہ سعی بھی کرتے ہیں کہ یہ طریق ترقی نہ پکڑے، مگر نہیں یہ ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے اور رُک نہیں سکتا۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزی طرزِ لباس ترقی پر ہے۔ یہاں تک کہ حجامت بنوانے میں بھی انگریزی طرز اور فیشن کو مقدّم سمجھا جاتا ہے۔

یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ ۔ یہ مت سمجھو کہ طرزِ لباس ہی نے ترقی کی ہے۔ نہیں یہ طرز بجائے خود ایک خطرناک ترغیب ہے اور بہت سی باتوں کے لیے۔

انگریزی لباس کے بعد انگریزی طرز کی مجلسوں کا مذاق ترقی کرے گا اور کر رہا ہے۔ عیسائیت نے خمر کو حرام نہیں کیا۔ اس میں پردہ بھی ضروری نہیں۔ قماربازی بھی ممنوع نہیں۔ پھر کھانے میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں پس اس آزادی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبِ حقیقی جو انسان کو ایک حدبندی کے درمیان رکھنا چاہتا ہے، اس سے لوگوں نے تجاوز شروع کیا۔ انگریزی مجلسی مذاق میں شراب کا پینا لازمی امر ہے۔ جس محفل میں شراب نہ ہو وہ گویا مجلس ہی قابلِ نفرت ہے۔

پس وہ لوگ جو انگریزی طرز اور فیشن کے دلدادہ ہیں وُہ کب دین کی حدود کے اندر آنے لگے؟ اور مذہب کی طرف بلانے والوں کی طرف اُن کو رغبت ہو تو کس طرح؟

مَیں سچ کہتا ہوں کہ لوگوں نے اس امر پر غور نہیں کی کہ عیسائیت کیونکر اندر ہی اندر سرایت کر رہی ہے۔ مَیں نے اس پر بہت غور کی ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ہر ایک امر اس وقت عیسائیت کی طرف لے جانا چاہتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ان پادریوں نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ بھی اُس کو پھیلانے میں فروگذاشت نہیں کیا۔ ہر قسم کے طریقِ اشاعت کو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ یہ انگریزی فیشن ہی کا اثر ہے کہ اب علانیہ شراب پی جاتی ہے۔ زناکاری کے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے، بلکہ اس کے مُمد اور معاون اُمور پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ قماربازی گو قانوناً جُرم ہو، مگر اُس کی بعض ایسی صُورتیں پیدا کر لی گئی ہیں کہ وُہ قانوناً جائز ہی قرار دی گئی ہے۔ عیسائی عورتوں کا بے پردہ پھرنا اور عام طور پر غیر مردوں سے ملنا جُلنا اِس نے ایسا خطرناک اثر کیا ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جو عورتوں کو بے پردہ سیر کرانا پسند کرتے ہیں اور مُسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہیں، ان کو پردہ میں نہ رکھا جاوے کیونکہ یہ ظُلم ہے۔

اِسلامی پردہ

اِسلامی پردہ پر اعتراض کرنا اُن کی جہالت ہے اللہ تعالیٰ نے پردہ کا ایسا حکم دیا ہی نہیں، جس پر اعتراض وارد ہو۔

قرآن مُسلمان مردوں اور عورتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ غَضِّ بَصَر کریں۔ جب ایک دُوسرے کو دیکھیں گے ہی نہیں، تو محفوظ رہیں گے۔ یہ نہیں کہ انجیل کی طرح یہ حکم دے دیتا کہ شہوت کی نظر سے نہ دیکھ۔ افسوس کی بات ہے کہ انجیل کے مصنّف کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شہوت کی نظر کیا ہے؟ نظر ہی تو ایک ایسی چیز ہے جو شہوت انگیز خیالات کو پیدا کرتی ہے۔ اِس تعلیم کا جو نتیجہ ہوا ہے وُہ اُن لوگوں سے مخفی نہیں ہے جو اخبارات پڑھتے ہیں اُن کو معلوم ہوگا کہ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے کیسے شرمناک نظّارے بیان کیے جاتے ہیں۔

اِسلامی پردہ سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ عورت جیل خانہ کی طرح بند رکھی جاوے۔ قرآن شریف کا مطلب یہ

ہے کہ عورتیں سترکریں۔ وہ غیر مرد کو نہ دیکھیں۔ جن عورتوں کو باہر جانے کی ضرورت تمدنی اُمور کے لیے پڑے، اُن کو گھر سے باہر نکلنا منع نہیں ہے، وہ بیشک جائیں، لیکن نظر کا پردہ ضروری ہے۔

مساوات کے لیے عورتوں کے نیکی کرنے میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی ہے اور نہ اُن کو منع کیا گیا ہے کہ وہ نیکی میں مشابہت نہ کریں۔ اسلام نے یہ کب بتایا ہے کہ زنجیر ڈال کر رکھو۔ اسلام شہوات کی بناء کو کاٹتا ہے۔ یورپ کو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کُتوں اور کُتیوں کی طرح زنا ہوتا ہے اور شراب کی اس قدر کثرت ہے کہ تین میل تک شراب کی دکانیں چلی گئی ہیں۔ یہ کس تعلیم کا نتیجہ ہے؟ کیا پردہ داری یا پردہ دری کا۔

اسلام کی بات کو بگاڑنا اور اندھا دُھند اعتراض کرنا ظلم ہے۔ اسلام تقویٰ سکھانے کے واسطے دُنیا میں آیا ہے۔

مَیں یہ بیان کر رہا تھا کہ لوگ مُلوک کے دین پر ہوتے ہیں اور مَیں نے مختلف مثالوں کے ذریعہ اس اَمر کو بیان کر دیا ہے۔ اب دیکھ لو کہ جو حالاتِ اَبتر اس مُلک میں ہوتے ہیں وہ کسی اور ملک میں نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ مکّہ مدینہ میں بھی نہیں ہوئے۔ ایسی آزادی اور اباحت جو یہاں ہے، اُس کی نظیر کسی دُوسرے ملک میں نہ ملے گی اور اُن ملکوں میں چونکہ اس قسم کے محرکات پیش نہیں آتے، اس لیے وہاں خیالات بھی بہت اَبتر نہیں ہوئے۔

برائی کے دو بروز۔ دجّال اور یاجُوج وماجُوج

اب مَیں پھر اصل مطلب کی طرف آتا ہوں۔ مَیں نے یہ بیان کیا ہے کہ دو بروز ہیں۔ ایک الدّجال دُوسرا یاجُوج ماجُوج کا۔ الدجال کا بُروز وہ ہے جو آدم علیہ السّلام سے لے کر ایک سلسلہ چلا جاتا تھا جس قسم کی بدیاں اور شرارتیں مختلف طور پر مختلف وقتوں میں ظاہر ہوئیں۔ آج اُن سب کو جمع کر دیا گیا ہے اور ایک عجیب نظارۂ قدرت دکھایا ہے۔ چونکہ اب انسانی عمروں کا خاتمہ ہے، اس لیے خاتمہ پر ایک بدیوں کا اور ایک نیکیوں کا بُروز بھی دکھایا۔

بدیوں کا بُروز وہی ہے جس کو مَیں نے اَلدّجال کہا ہے۔ تمام مکائد اور شرارتوں کا وُہ مجموعہ ہے۔ اس آخری زمانہ میں ایک گروہ کو سفلی عقل اس قدر دی گئی ہے کہ تمام چھپی ہوئی چیزیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اُس نے دو قسم کا دجل دکھایا۔ ایک قسم کا حملہ نبوّت پر کیا اور ایک خدا پر۔ نبوّت پر تو یہ حملہ تھا کہ منشائے الٰہی کو بگاڑا اور دماغی طاقتوں کو انتہائی مدارج پر پہنچا کر اُلوہیت پر تصرّف کرنے کے لیے خدا پر حملہ کیا۔ امراضِ مزمنہ کے علاج کی طرف توجّہ کرنا، ایک کا نُطفہ لیکر رحم میں بذریعۂ کَل ڈالنا۔ بارش برسانے کے آلات ایجاد کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اُمور اس قسم کے ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اُلوہیت پر تصرف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گروہ خود خدا بن رہا ہے اور دُوسرا گروہ کسی اور انسان کو خدا بناتا ہے۔ جو کچھ آج کل یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے، اس کی غرض کیا ہے۔ یہی کہ ایک آزادی اور حرص جو پیدا ہوگئی ہے۔ اس کو پورے طور پر کام میں لا کر ربُوبیّت کے بھیدوں کو معلوم کرکے خدا سے آزاد ہو جائیں۔

غرض جان ڈالنے کے، مُردوں کے زندہ کرنے کے، بارش برسانے کے تجربے کرتے ہیں۔ یہاں تک ہی محدُود نہیں،

بلکہ اُن کی تو کوشش یہ ہو رہی ہے کہ جو کچھ دُنیا میں ہو رہا ہے وُہ سب ہمارے ہی قبضہ میں آجاوے۔

اگرچہ مَیں اس بات کو مانتا ہوں کہ تدبیر کرنا منع نہیں ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گناہ ہمیشہ افراط یا تفریط سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر انسان کو صرف ہاتھ لگا دو، تو گناہ نہیں ہے، لیکن اگر اس کو ایک مُکّا مار دو تو یہ گناہ ہے۔ یہ افراط ہے اور تفریط یہ ہے کہ کسی کو اگر ایک پیالہ پانی دینے کی ضرورت ہو، تو وُہ اس کو ایک قطرہ دے۔ غرض موجودہ زمانہ میں دجّال کا بُروز ایک معجونِ مرکب ہے۔ ایک حملہ خدا پر ہو رہا ہے ایک نبوّت پر۔ ایک خدا کو انسان بناتا ہے دُوسرا آپ ہی خدا بنتا ہے؟ کیا یہ بات سچ نہیں ہے۔ کتابیں دیکھو، اخبارات پڑھو تو پتہ لگے گا کہ کس قدر فساد برپا ہو رہا ہے۔ اور یہ دو رنگی ظلم ڈھا رہی ہے۔

یاجُوج ماجوج کے فساد کی نسبت مَیں نے بتا دیا ہے کہ اس کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ اُس کو شوکت ہے۔ خدا کی طرف رجُوع کرنا، امانت دیانت کا اختیار کرنا، شراب، زنا، بدنظری، بدکاری، قمار بازی سے بچنا مشکل ہو رہا ہے۔ بہت ہی تھوڑے شاید ایک آدمی فی ہزار جو بچتے ہوں گے۔

نیکی کے دُو بُروز

اب یہ بات کیسی صاف ہے کہ جبکہ بدی کے دو بُروز تھے، تو ایسا ہی نیکی کے بھی دُو بُروز بدی کے مقابل ضروری تھے؛ چنانچہ دُو بُروز نیکی کے بھی رکھے۔ دراصل وُہ بھی ایک ہی چیز ہے جس کے دُو نام ہیں۔ جیسے ایک ہی حالت میں مجسٹریٹ اور کلکٹر دو جداگانہ عُہدے ہوتے ہیں۔ وہ نیکی کے بروز یہ ہیں کہ ایک تو اندرونی لحاظ سے ہے اور دُوسرا بیرُونی لحاظ سے۔ اندرونی لحاظ سے وُہ مہدی اور بیرُونی لحاظ سے مسیح ابنِ مریم۔

مسیح بن مریم

بیرونی طور پر مسیح کا کام کیا ہے؟ جو اس کا یہ نام رکھا۔ مسیح ابن مریم کا کام دفعِ شر ہوگا اور مہدی کا کام کسبِ خیر؛ چنانچہ غور کرو کہ مسیح کا کام یَقْتُلُ الْخِنْزِیْر اور یَکْسِرُ الصَّلِیْب بتایا ہے۔ یہی دفعِ شر ہے، لیکن ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں ہے کہ وہ دفعِ شر کے لیے تیغ و سنان لے کر جنگ کے واسطے نکلے گا۔ مُلّا جو یہ کہتے ہیں کہ وہ جنگ کرے گا یہ صحیح نہیں بلکہ بالکل غلط ہے۔ یہ کیا اصلاح ہوئی کہ ابھی آپ آتے اور آتے ہی تلوار پکڑ کر لڑائی کے واسطے میدان میں نکل آتے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ صحیح اور سچّی بات وہی ہے جو خدا تعالیٰ نے ہم پر کھولی، جو احادیث کے منشاء کے موافق ہے کہ مسیح کوئی خونی جنگ نہ کرے گا اور نہ تلوار پکڑ کر لڑنا اس کا منصب ہے۔ بلکہ وُہ تو اصلاح کے لیے آئے گا۔ ہاں یہ ہم مانتے ہیں کہ اس کا کام دفعِ شر ہے اور وہ حجج اور براہین سے کرے گا۔

مہدی

اور مہدی کا کام کسبِ خیر ہے۔ یعنی جو بدعادات اور فسق و فجور پھیلا ہوا ہوگا۔ وہ اس کو ہدایت سے بدل دے گا۔ عیسٰی کا لفظ عَوس سے لیا ہے، جو دفعِ شر کی طرف ایماء ہے۔ ان ہر دو بُروزوں میں بہتر یہ ہے کہ مہدی کا بروز اکمل ہے، کیونکہ اس کا کام اِفاضۂ خیر اور اِفاضۂ خیر دفعِ شر کی نسبت اکمل بات ہے۔ ایک شخص ہے جو کسی کی راہ سے صرف کانٹے اُٹھا دے۔ یہ بے شک بڑا کام ہے، لیکن جو اس کو سواری دے اور

اپنے گھر سے جاکر روٹی بھی کھلاتے، یہ اس بھی بڑھ کر ہے۔ پس مہدی اکمل ہے۔ اسی لیے وُہ خلیفۃ اللہ ہے۔ عیسیٰ ابنِ مریم جو مہدی خلیفۃ اللہ کی بیعت کرے گا، اس میں یہی سِرّ ہے اور مہدی کا بُروز یوُں بھی اکمل ہے کہ وہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بُروز ہوگا اور آپؐ خاتم الانبیاء تھے اور اکمل الانبیاء، اس لیے اس کا بُروز بھی اکمل ہی ہوگا۔

یہ دُو بُروز تھے۔ علماء نے کیسا ظلم کیا کہ ایک بُروز کو تو اُنھوں نے مان لیا کہ مہدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خُلق اور نام پر ہوگا، لیکن عیسیٰ ابن مریمؑ کی نسبت یہی تجویز کیا کہ وہی آسمان سے اُتر کر آئے گا۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ کیسے ذہن متنزّل ہوگئے ہیں جو تناقض پیدا کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ ایک جگہ تو بُروز رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مان لیا۔ اُس کا قائم مقام خلیفۃ اللہ بن گیا۔ گر پھر یہ کیا ہوا کہ جو چھوٹا تھا، اُسے خود کیوں آنا پڑا۔ وُہ مہدی جس کو افاضۂ خیر دیا گیا ہے اور جو اکمل ہے اس کو بروزی رنگ میں لانے اور مسیح ابن مریمؑ کو اُس کی بیعت کرانے کے واسطے خود اتارتے ہیں ؎

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ کے معنی

جب اُن سے پُوچھا جاوے کہ تم ایک نبی کو اُتار کر جو اس کی بیعت مہدی کے ہاتھ پر کرلتے ہو۔ یہ کیا بات ہے۔ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا کیا جاوے، حدیث میں آیا ہے۔ اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر اس حدیث کے وہی معنے ہوں جو تم قرار دیتے ہو تو چاہیے تھا کہ سلطنت رُوم کے سب لوگ باغی ہوتے۔

اگر پیش گوئی کے طور پر ہی نہ سمجھا جاوے۔ پھر جو سُلطانِ رُوم کو خلیفۃ المسلمین قرار دیتے ہیں۔ اس کے کیا معنی ہوتے؟ اصل بات یہ ہے کہ پیغمبرِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کشفی طور پر دکھایا گیا تھا کہ خلیفے قریش سے ہوں گے۔ خواہ حقیقی طور پر یا بروزی طور پر۔ جیسے دجّال کا بُروز بتایا۔ اسی طرح پر سلاطین مغلیہ وغیرہ بروزی طور پر قریش ہی ہیں۔ خدا نے جو عہدہ اُن کو دیا وہ اس کے متکفل رہے۔ جبتک خدا نے چاہا وُہ سلطنت کرتے رہے۔ جبتک کوئی بروز کے مسئلہ کو نہیں سمجھتا، اس پیش گوئی کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا اور آخر اُس کو اس پیشگوئی کو جھٹلانا پڑے گا۔

جب اصل قریش میں استعداد نہ رہی اور اِس قوم میں وہ استعداد پائی گئی، تو خدا نے وُہ عہدہ اس کے حوالے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ طبعًا سلطان رُوم کی متابعت اختیار کی اور سچّی محبت سے اُس کو قبول کیا۔ یہ تصنّع اور بناوٹ سے نہیں ہوا، بلکہ دلوں نے یہ فتویٰ دیا کہ وُہ خادمِ حرمین الشریفین ہے۔ اظلالی اُمور ہمیشہ ہوتے ہیں اور ہوں گے یہ معنے ہیں اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ کے۔

غرض یہ دُو نام ایک ہی شخص کے تھے۔ ایک کو اِفاضۂ خیر کا درجہ ملا۔ دُوسرے کو دفعِ شرّ کا۔ اِفاضۂ خیر چونکہ بڑھ کر ہے۔ اس کو دفعِ شرّ پر بزرگی دی جاتی ہے، اس لیے اس حیثیت سے وُہ خلیفۃ اللہ کہلایا۔

پس جیسے مقابل پر دُو خبیث بُروز تھے۔ یہ خیر کے بُروز ہیں۔

اب اس کے متعلق ایک اور نکتہ بیان کرکے اس بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ عیسیٰ کے نام میں دفعِ شر کا مفہوم پایا جاتا ہے اور احمدؐ یا محمدؐ کے نام میں افاضۂ خیر کا مفہوم یعنی نہایت ہی تعریف کیا گیا۔ تعریف اس نام پر ہوتی ہے۔ جس کو خیر پہنچاؤ گے وُہ بے اختیار تعریف کرے گا۔ حمد کرنے کے ساتھ لازمی طور پر مُنعَم علیہ ہونا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمدؐ اس لیے ہی تھا کہ وہ افاضۂ خیر ہے جو خلق کی طرف کرتا ہے۔ احمدؐ منعم ہے اور محمدؐ منعم علیہ ہے اور عیسیٰ کے معنی میں بچایا گیا۔ یہ تو دفعِ شر کی طرف اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے وہ قصہ یاد دلایا۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ: ۳۱) اس قصہ میں پیشگوئی مذکور ہے۔ اب مَیں اُس کا بیان لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ بس اسی پر ختم کرتا ہوں کہ مسیح اور مہدی دراصل ایک ہی شخص کے دو نام ہیں جو اس کی دو مختلف حیثیتوں کو ظاہر کرتے ہیں جو دفعِ شر اور افاضۂ خیر ہیں۔ افسوس ان علماء پر کہ اُنھوں نے افاضۂ خیر کے بروز کو مانا اور دفعِ شر کے بروز سے انکار کیا۔"

مرکز میں بار بار آنے کی تاکید

دسمبر ۱۸۹۹ء کے جلسہ سالانہ پر بہت کم لوگ آئے۔ اس پر حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے بہت اظہارِ افسوس کیا اور فرمایا:

"ہنوز لوگ ہمارے اغراض سے واقف نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں کہ وُہ بن جائیں۔ وُہ غرض جو ہم چاہتے ہیں اور جس کے لیے ہمیں خدا تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے، وُہ پوری نہیں ہوسکتی۔ جب تک لوگ یہاں بار بار نہ آئیں اور آنے سے ذرا بھی نہ اکتائیں۔" اور فرمایا:

"جو شخص ایسا خیال کرتا ہے کہ آنے میں اُس پر بوجھ پڑتا ہے یا ایسا سمجھتا ہے کہ یہاں ٹھہرنے میں ہم پر بوجھ ہوگا اسے ڈرنا چاہیے کہ وُہ شرک میں مُبتلا ہے۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ اگر سارا جہان ہمارا عیال ہو جائے، تو ہمارے مُہمات کا متکفل خدا تعالیٰ ہے۔ ہم پر ذرا بھی بوجھ نہیں۔ ہمیں تو دوستوں کے وجود سے بڑی راحت پہنچتی ہے۔ یہ وسوسہ ہے جسے دلوں سے دُور پھینکنا چاہیے۔ مَیں نے بعض کو یہ کہتے سُنا ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کر کیوں حضرت صاحب کو تکلیف دیں۔ ہم تو نکمے ہیں۔ یوں ہی روٹی بیٹھ کر کیوں توڑا کریں۔ وہ یہ یاد رکھیں، یہ شیطانی وسوسہ ہے جو شیطان نے اُن کے دلوں میں ڈالا ہے کہ اُن کے پَیر یہاں جمنے نہ پائیں۔"

[ایک دن حکیم فضل دین صاحب نے عرض کیا کہ حضورؑ میں یہاں نکما بیٹھا کیا کرتا ہوں۔ حکم ہو تو بھیرہ چلا جاؤں۔ وہاں درسِ قرآنِ کریم ہی کروں گا۔ یہاں مجھے بڑی شرم آتی ہے کہ مَیں حضورؑ کے کسی کام نہیں آتا اور شاید بیکار بیٹھنے میں کوئی معصیت نہ ہو۔" فرمایا: "آپ کا یہاں بیٹھنا ہی جہاد ہے اور یہ بیکاری ہی بڑا کام ہے۔"

غرض بڑے دردناک اور افسوس بھرے لفظوں میں نہ آنے والوں کی شکایت کی اور فرمایا: "یہ عُذر کرنے والے وہی ہیں جنھوں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور عُذر کیا تھا اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ اور خدا تعالیٰ نے اُنکی تکذیب

کردی کہ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (الاحزاب: ۱۴) فرمایا: "ہمارے دوستوں کو کس نے بتایا ہے کہ زندگی بڑی لمبی ہے۔ موت کا کوئی وقت نہیں کہ کب سر پر ٹوٹ پڑے۔ اس لیے مناسب ہے کہ جو وقت ملے اُسے غنیمت سمجھیں۔"

فرمایا: "یہ ایّام پھر نہ ملیں گے اور یہ کہانیاں رہ جائیں گی۔"

اپنے نفس پر قابو

فرمایا: "مَیں اپنے نفس پر اتنا قابو رکھتا ہوں اور خدا تعالیٰ نے میرے نفس کو ایسا مسلمان بنایا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سال بھر میرے سامنے میرے نفس کو گندی سے گندی گالی دیتا رہے۔ آخر وہی شرمندہ ہوگا اور اسے اقرار کرنا پڑے گا کہ وہ میرے پاؤں جگہ سے اُکھاڑ نہ سکا۔"

لوگوں کی تکالیف اور شرارتوں سے آپ کبھی مرعوب نہیں ہوتے۔ اِس بارہ میں فرمایا:

"کوئی معاملہ زمین پر واقعہ نہیں ہوتا، جبتک پہلے آسمان پر طے نہ ہو جائے اور خدا تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا اور وُہ اپنے بندہ کو ذلیل اور ضائع نہیں کرے گا۔"

اِبتلاء کے وقت حضرت اقدسؑ کا حال

جالندھر کے مقام میں فرمایا:

"ابتلاء کے وقت ہمیں اندیشہ اپنی جماعت کے بعض ضعیف دلوں کا ہوتا ہے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ اگر مجھے صاف آواز آوے کہ تو مخذول ہے اور تیری کوئی مُراد ہم پوری نہ کریں گے تو مجھے خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ اس عشق اور محبّتِ الٰہی اور خدمتِ دین میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ اس لیے کہ مَیں تو اُسے دیکھ چکا ہوں۔" پھر یہ پڑھا: هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا۔ (مریم: ۶۶)

عفو و درگذر

اپنے خادم حامد علی کو اپنی ڈاک ڈاکخانہ میں ڈالنے کو دی۔ اُسے وہ کہیں فراموش ہوگئی۔ ایک ہفتہ کے بعد کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اُس کے برآمد ہونے پر حامد علی کو بُلوا کر اور خطوط دکھا کر بڑی نرمی سے صرف اِتنا ہی کہا:

"حامد علی۔ تمہیں نسیان بہت ہوگیا ہے۔ فکر سے کام کیا کرو۔"

دین کی ہتک

حرمات اللہ کی ہتک آپؑ کو گوارا نہ تھی۔ اِس بارہ میں فرمایا:

"میری جائیداد کا تباہ ہونا اور میرے بچوں کا آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہونا مجھ پر آسان ہے بہ نسبت دین کی ہتک اور استخفاف کے دیکھنے اور اُس پر صبر کرنے کے۔"

نیکی کا اخفاء

اخراجات کے بارہ میں احباب کے خیالات پر آپؑ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ کھانے کے متعلق میں اپنے نفس میں اتنا تحمل پاتا ہوں کہ ایک پیسہ پر دُو دُو وقت بڑے آرام سے بسر کرسکتا ہوں۔ ایک دفعہ میرے دل میں آیا کہ انسان کہاں تک بھوک کی برداشت کرسکتا ہے۔ اس امتحان کے لیے چھ ماہ تک مَیں نے کچھ نہ کھایا۔ کبھی کوئی ایک آدھ لقمہ کھا لیا اور چھ ماہ کے بعد مَیں

نے اندازہ کیا کہ چھ سال تک بھی یہ حالت لمبی کی جا سکتی ہے۔ اس اثناء میں دو وقت کھانا گھر سے برابر آتا تھا اور مجھے اپنی حالت کا اخفاء منظور تھا۔ اس اخفاء کی تدابیر کے لیے جو زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ شاید وہ زحمت اَوروں کو بھوک سے نہ ہوتی ہوگی۔ مَیں وہ دو وقت کی روٹی دو تین مسکینوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس حال میں نماز پانچوں وقت مسجد میں پڑھتا اور کوئی میرے آشناؤں میں سے کسی نشان سے پہچان نہ سکا کہ میں کچھ نہیں کھایا کرتا۔"

مناسبِ حال قویٰ

"خدا تعالیٰ نے جس کام کے لیے کسی کو پیدا کیا ہے۔ اس کی تیاری اور لوازم اور اُس کے سرانجام اور مہمات کے طے کے لیے اس میں قویٰ بھی مناسبِ حال پیدا کیے ہیں۔ دُوسرے لوگ جو حقیقتاً فطرت کے مقتضاء سے وہ قویٰ نہیں رکھتے اور ریاضتوں میں پڑ جاتے ہیں۔ آخر کار دیوانے اور مختبط الحواس ہو جاتے ہیں۔"

نزولِ الہام کی کیفیت

اِسی ضمن میں فرمایا:

"طبیبوں نے نیند کے لیے طبعی اسباب مقرر کیے ہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ ہم سے کلام کرے۔ اس وقت پوری بیداری میں ہوتے ہیں اور یکدم رُبودگی اور غنودگی وارد کر دیتا ہے اور اس جسمانی عالَم سے قطعاً باہر لے جاتا ہے، اس لیے کہ اُس عالَم سے پوری مناسبت ہو جائے۔ پھر یُوں ہوتا ہے کہ جب ایک مرتبہ کلام کر چکتا ہے۔ پھر ہوش و حواس واپس دے دیتا ہے۔ اس لیے کہ مُلہَم اس کو محفوظ کر لے۔ اس کے بعد پھر رُبودگی طاری کرتا ہے۔ پھر یاد کرنے کے لیے بیدار کر دیتا ہے۔ غرض اس طرح کبھی پچاس دفعہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے وہ ایک تصرفِ الٰہی ہوتا ہے۔ اس طبعی نیند سے اس کو کوئی تعلق نہیں اور اطبّاء اور ڈاکٹر اس کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔"

سائل کے لیے بے قراری

ایک دن ایک سائل نے بعد فراغتِ نماز جبکہ آپؑ اندرونِ خانہ تشریف لے جا رہے تھے، سوال کیا۔ مگر ہجوم کے باعث اس کی آواز اچھی طرح نہ سُنی جا سکی۔ اندر جا کر واپس تشریف لائے اور خدام کو سوالی کے بلانے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑایا، مگر وُہ نہ ملا۔ شام کو وہ پھر آیا۔ اس کے سوال کرنے پر آپؑ نے اپنی جیب سے نکال کر کچھ دیا۔ چند یوم بعد کسی تقریب پر فرمایا کہ:

"اُس دن جو وُہ سائل نہ ملا۔ میرے دل پر ایسا بوجھ تھا کہ جس نے مجھے سخت بے قرار کر رکھا تھا اور مَیں ڈرتا تھا کہ مجھ سے معصیت سرزد ہوئی ہے کہ مَیں نے سائل کی طرف دھیان نہ کیا اور یُوں جلدی اندر چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وُہ شام کو واپس آ گیا؛ ورنہ خدا جانے میں کس اضطراب میں پڑا رہتا اور مَیں نے دُعا بھی کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اُسے واپس لائے۔"[1]

کوئی نسخہ حکمی نہیں

۱۸۹۹ء: "ہمارے گھر میں مرزا صاحب (مُراد اپنے والد بزرگوار مرزا غلام مُرتضیٰ

---

[1] (از خط مولانا عبدالکریم صاحبؓ مورخہ ۶ر جنوری ۱۹۰۰ء مندرجہ الحکم جلد ۴ نمبر ۳ صفحہ ۶-۱۱)

خانصاحب مرحوم) پچاس برس تک علاج کرتے رہے۔ وُہ اس فنِ طبابت میں بہت مشہور تھے، مگر اُن کا قول تھا کہ کوئی حکمی نسخہ نہیں ملا۔ حقیقت میں اُنھوں نے سچ فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر کوئی ذرّہ جو انسان کے اندر جاتا ہے کچھ اثر نہیں کرسکتا۔"

حکام اور برادری سے حُسنِ سلوک

ایک شخص نے پُوچھا کہ حکام اور برادری کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ فرمایا کہ:

"ہر ایک سے نیک سلوک کرو۔ حکام کی اطاعت اور وفاداری ہر مُسلمان کا فرض ہے، وہ ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کی مذہبی آزادی ہمیں دے رکھی ہے۔ مَیں اِس کو بڑی بے ایمانی سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کی اطاعت اور وفاداری سچے دل سے نہ کی جائے۔"

برادری کے حقوق ہیں۔ اُن سے بھی نیک سلوک کرنا چاہیے، البتہ اُن باتوں میں جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف ہیں، اُن سے الگ رہنا چاہیے۔

ہمارا اُصول تو یہ ہے کہ ہر ایک سے نیکی کرو اور خدا تعالیٰ کی کُل مخلوق سے احسان کرو۔"

دُعا اور قضاء و قدر

"جب اللہ تعالیٰ کا فضل قریب آتا ہے تو وُہ دُعا کی قبولیت کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ دِل میں ایک رِقّت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے، لیکن جب دُعا کی قبولیت کا وقت نہیں ہوتا تو دل میں اطمینان اور رجُوع پیدا نہیں ہوتا۔ طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالو، مگر طبیعت متوجہ نہیں ہوتی۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی خدا تعالیٰ اپنی قضاء و قدر منوانا چاہتا ہے اور کبھی دُعا قبول کرتا ہے۔ اس لیے مَیں تو جبتک اذنِ الٰہی کے آثار نہ پاؤں، قبولیت کی کم اُمید کرتا ہوں اور اُس کی قضاء و قدر پر اس سے زیادہ خوشی کے ساتھ جو قبولیتِ دُعا میں ہوتی ہے راضی ہو جاتا ہوں، کیونکہ اِس رضا بالقضاء کے ثمرات اور برکات اس سے بہت زیادہ ہیں۔"

نسب کا تکبّر نیکیوں سے محرُوم کر دیتا ہے

"اللہ تعالیٰ پوست کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تو رُوحانیت اور مغز کو قبول کرتا ہے۔ اس لیے قرآن شریف میں فرمایا۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج: ۳۸) اور دُوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدہ: ۲۸) حقیقت میں یہ بڑی نازک جگہ ہے۔ یہاں پیغمبرزادگی بھی کام نہیں آسکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ سے بھی ایسا ہی فرمایا اور قرآن شریف میں بھی صاف الفاظ ہیں۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (الحجرات: ۱۴)۔

یہودی بھی تو پیغمبرزادے ہیں۔ کیا صدہا پیغمبر اُن میں نہیں آئے تھے؟ مگر اس پیغمبرزادگی نے اُن کو کیا فائدہ پہنچایا۔ اگر اُن کے اعمال اچھے ہوتے تو وُہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ۔ (البقرہ: ۶۲) کے مِصداق کیوں ہوتے۔

خدا تعالیٰ تو ایک پاک تبدیلی کو چاہتا ہے بعض اوقات انسان کو تکبّرِ نسب بھی نیکیوں سے محروم کر دیتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اسی سے نجات پاؤں گا۔ جو بالکل خیالِ خام ہے۔ کبیر کہتا ہے کہ اچھا ہوا ہم نے چماروں کے گھر جنم لیا۔ کبیر اچھا ہوا ہم نیچے بھلے سب کو کریں سلام۔ خدا تعالیٰ وفاداری اور صدق سے پیار کرتا ہے اور اعمالِ صالحہ کو چاہتا ہے۔ لاف و گزاف اُسے راضی نہیں کر سکتے۔

رفع کے معنی

فرمایا کہ "قرآن شریف تو رفعِ اختلاف کے لیے آیا ہے۔ اگر ہمارے مخالف رَافِعُكَ اِلَيَّ کے یہ معنے کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ جسم سمیت آسمان پر چڑھ گئے تو وہ ہمیں یہ بتائیں کہ کیا یہود کی یہ غرض بھی اور وہ یہ کہتے تھے کہ مسیح آسمان پر نہیں چڑھا؟ اُن کا اعتراض تو یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ کا رفع الی اللہ نہیں ہوا۔ یعنی اُسے قربِ الی اللہ نصیب نہیں ہوا۔ اگر رَافِعُكَ اِلَيَّ اِس اعتراض کا جواب نہیں، تو پھر چاہیے کہ اُن کے اِس اعتراض کا جواب دیا اور دکھایا جاتے۔"

مرکز میں رہائش کی غرض دین ہو

ایک مرتبہ کسی دوست نے عرض کی کہ وُہ تجارت کے لیے قادیان آنا چاہتا ہے۔ اس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا کہ:

"یہ نیت ہی فاسد ہے۔ اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ یہاں تو دین کے واسطے آنا چاہیے اور اصلاحِ عاقبت کے خیال سے یہاں رہنا چاہیے۔ اصل نیت یہی ہو۔ اور اگر پھر اُس کے ساتھ کوئی تجارت وغیرہ یہاں رہنے کی اغراض کو پورا کرنے کے لیے ہو، تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اصل مقصد دین ہو نہ کہ دُنیا۔ کیا تجارتوں کے لیے اور شہر موزوں نہیں۔ یہاں آنے کی اصل غرض کبھی دین کے سوا اور نہ ہونی چاہیے۔ پھر جو کچھ حاصل ہو جائے وُہ خدا کا فضل سمجھو۔"

ہمدردیٔ خلائق

"میری تو یہ حالت ہے کہ اگر کسی کو درد ہوتا ہو اور میں نماز میں مصروف ہوں، میرے کان میں اُس کی آواز پہنچ جائے تو میں تو یہ چاہتا ہوں کہ نماز توڑ کر بھی اگر اس کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں تو فائدہ پہنچاؤں اور جہاں تک ممکن ہے اُس سے ہمدردی کروں۔ یہ اخلاق کے خلاف ہے کہ کسی بھائی کی مصیبت اور تکلیف میں اس کا ساتھ نہ دیا جائے۔ اگر تم کچھ بھی اس کے لیے نہیں کر سکتے تو کم از کم دُعا ہی کرو۔

اپنے تو درکنار، میں تو یہ کہتا ہوں کہ غیروں اور ہندوؤں کے ساتھ بھی اعلیٰ اخلاق کا نمونہ دکھاؤ۔ اور اُن سے ہمدردی کرو۔ لااُبالی مزاج ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ایک مرتبہ میں باہر سیر کو جا رہا تھا۔ ایک پٹواری عبد الکریم میرے ساتھ تھا۔ وُہ ذرا آگے تھا اور میں پیچھے۔ راستہ میں ایک بڑھیا کوئی ۷۰، ۷۵ برس کی ضعیفہ ملی۔ اُس نے ایک خط اُسے پڑھنے کو کہا، مگر اُس نے اُس کو جھڑکیاں دے کر ہٹا دیا۔ میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ اُس نے وُہ خط مجھے دیا۔ میں اُس کو لے کر ٹھہر گیا۔ اور اس کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھا دیا۔ اس پر پٹواری کو بہت شرمندہ ہونا پڑا، کیونکہ ٹھہرنا تو پڑا اور ثواب سے بھی محروم رہا۔

جماعت کے مستقبل کے متعلق ایک کشف

"مجھے بڑے ہی کشفِ صحیح سے معلوم ہوا ہے کہ ملوک بھی اس سلسلہ میں داخل ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ مُلوک مجھے دکھلائے بھی گئے ہیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَیں تجھے یہاں تک برکت دُوں گا کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔

اللہ تعالیٰ ایک زمانہ کے بعد ہماری جماعت میں ایسے لوگوں کو داخل کرے گا اور پھر اُن کے ساتھ ایک دُنیا اُس طرف رجُوع کرے گی۔"[1]

۱۸۹۹ء

صحبتِ صالحین

قرآن شریف میں آیا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس: ۱۰) اُس نے نجات پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔ تزکیۂ نفس کے واسطے صحبتِ صالحین اور نیکوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا بہت مفید ہے۔ جھُوٹ وغیرہ اخلاقِ رذیلہ دُور کرنے چاہئیں اور جو راہ پر چل رہا ہے۔ اُس سے راستہ پُوچھنا چاہیے۔ اپنی غلطیوں کو ساتھ ساتھ دُرست کرنا چاہیے۔ جیسا کہ غلطیاں نکالنے کے بغیر اِملا درست نہیں ہوتا۔ ویسا ہی غلطیاں نکالنے کے بغیر اخلاق بھی دُرست نہیں ہوتے۔ آدمی ایسا جانور ہے کہ اُس کا تزکیہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے، تو سیدھی راہ پر چلتا ہے؛ ورنہ بہک جاتا ہے۔"[2]

۱۸۹۹ء - فرمایا:

خوفِ خدا

"رات کے وقت جب ہر طرف خاموشی ہوتی ہے اور ہم اکیلے ہوتے ہیں، اس وقت بھی خدا کی یاد میں دل ڈرتا رہتا ہے کہ وُہ بے نیاز ہے۔"

اِنکسار

فرمایا: "جب انسان کو کامیابی حاصل ہوجاتی ہے اور عجز و مصیبت کی حالت نہیں رہتی، تو جو شخص اس وقت انکسار کو اختیار کرے اور خدا کو یاد رکھے وہ کامل ہے۔ ؎ چوں بدولت برسی مست نگردی مردی۔"

رویائے صادقہ خدا کے وجود پر دلیل ہیں

مفتی محمد صادق صاحب نے اپنے گذشتہ رات کے خواب کا ذکر کیا۔ جو صبح پُورا ہوا۔ اس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:

"جس چیز کا وجود نہیں اور وہ چیز موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ پہلے سے اُس کی خبر دے دیتا ہے۔ دہریہ لوگ کیوں اس پر غور نہیں کرتے۔"

ایک الہام

فرمایا: "مجھے الہام ہوا ہے۔ گورنر جنرل کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آگیا۔"
فرمایا: "گورنر جنرل سے مُراد "رُوحانی عہدہ" ہے۔"[3]

End Vol - 1

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵-۲۶ صفحہ ۱۴ پرچہ ۳۱ جولائی و ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء
[2] بدر جلد ۱۰ نمبر ۴۴، ۴۵ صفحہ ۹ پرچہ ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء
[3] بدر جلد ۱۰ نمبر ۴۶، ۴۷ صفحہ ۱۲ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۱ء

۶؍جنوری ۱۹۰۰ء

حُسنِ معاشرت

عورتوں کے ساتھ حُسنِ معاشرت کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا :

"فحشاء کے سوا باقی تمام کج خُلقیاں اور تلخیاں عورتوں کی برداشت کرنی چاہئیں اور فرمایا۔ ہمیں تو کمال بے شرمی معلوم ہوتی ہے کہ مرد ہو کر عورت سے جنگ کریں۔ ہم کو خدا نے مرد بنایا ہے اور درحقیقت یہ ہم پر اتمامِ نعمت ہے۔ اس کا شکر یہ ہے کہ ہم عورتوں سے لُطف اور نرمی کا برتاؤ کریں۔"

ایک دفعہ ایک دوست کی دُرشت مزاجی اور بدزبانی کا ذکر ہوا اور شکایت ہوئی کہ وہ اپنی بیوی سے سختی سے پیش آتا ہے۔ حضورؑ اس بات سے بہت کبیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا :

"ہمارے احباب کو ایسا نہ ہونا چاہیے۔"

حضورؑ بہت دیر تک معاشرتِ نسواں کے بارہ میں گفتگو فرماتے رہے اور آخر پر فرمایا :

"میرا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی پر آوازہ کسا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ وُہ بانگِ بلند دل کے رنج سے ملی ہوئی ہے اور بایں ہمہ کوئی دل آزار اور دُرشت کلمہ مُنہ سے نہیں نکالا تھا۔ اس کے بعد میں بہت دیر تک استغفار کرتا رہا اور بڑے خشوع اور خضوع سے نفلیں پڑھیں اور کچھ صدقہ بھی دیا کہ یہ درشتی زوجہ پر کسی پنہانی معصیتِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔"

عفو و درگذر

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ محمود[1] چار ایک برس کا تھا۔ حضورؑ معمولاً اندر بیٹھے لکھ رہے تھے اور مسوّدات لکھے ہوئے سارے رکھے تھے۔ میاں محمود دیاسلائی لے کر وہاں تشریف لائے اور آپ کے ساتھ بچوں کا ایک غول بھی تھا۔ پہلے کچھ دیر آپس میں کھیلتے رہے پھر جو کچھ دل میں آئی ان مسوّدات کو آگ لگا دی اور آپ لگے خوش ہونے اور تالیاں بجانے۔ اور حضرتؑ لکھنے میں مصروف ہیں۔ سَر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں آگ بُجھ گئی اور قیمتی مسوّدات راکھ کا ڈھیر ہو گئے اور بچوں کو کسی اور مشغلہ نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ حضرت کو کسی عبارت کے سیاق کے لیے کسی گذشتہ کاغذ کے دیکھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ اِس سے پُوچھتے ہیں خاموش۔ اُس سے پُوچھتے ہیں، دُبکا جاتا ہے۔ آخر ایک بچہ بول اُٹھا کہ میاں صاحب نے کاغذ جلا دیے ہیں۔ عورتیں، بچے اور گھر کے سب لوگ حیران اور انگشت بدنداں کہ اب کیا ہوگا ...... حضورؑ مسکرا کر فرماتے ہیں :

"خوب ہوا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی بڑی مصلحت ہوگی اور اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس سے بہتر مضمون ہمیں سمجھائے۔"

---

[1] حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

اسی طرح ایک دفعہ حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ سے ایک مضمون حضرت مسیح موعودؑ کا گم ہوگیا جس کی تلاش میں انہیں بڑی تشویش ہوئی۔ جب حضورؑ کو خبر ملی، تو حضورؑ نے آکر مولوی صاحب سے بڑا عُذر کیا کہ کاغذ کے گم ہو جانے سے انہیں اتنی تشویش ہوئی۔ پھر فرمایا:

"مجھے افسوس ہے کہ اس کی جستجو میں اس قدر دوادوش اور تگاپو کیوں کیا گیا۔ میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی بہتر ہمیں عطا فرمائے گا۔"

حیا

ایک دفعہ حضورؑ کو سخت سر درد تھا۔ پاس بچّوں اور عورتوں کا شور و غُل بپا تھا۔ مولوی عبدالکریم صاحب نے عرض کی کہ جناب کو اس شور سے تکلیف تو نہیں ہوتی۔ حضورؑ نے فرمایا: "ہاں اگر چُپ ہو جائیں تو آرام ملتا ہے۔"

مولوی صاحب نے عرض کیا کہ پھر حضورؑ کیوں حکم نہیں فرماتے۔ حضورؑ نے فرمایا:

"آپ ان کو نرمی سے کہدیں۔ مَیں تو نہیں کہہ سکتا۔"

چشم پوشی

ایک خادمہ نے گھر سے چاول چُراتے اور پکڑی گئی۔ گھر کے سب لوگوں نے اُسے ملامت شروع کر دی۔ اتفاقاً حضرت اقدسؑ کا بھی اس طرف سے گذر ہوا۔ واقعہ سنائے جانے پر حضورؑ نے فرمایا:

"مُحتاج ہے۔ کچھ تھوڑے سے اُسے دے دو اور فضیحت نہ کرو۔ خدا تعالیٰ کی ستّاری کا شیوہ اختیار کرو۔"

خدمتِ خلق

دیہاتی عورتیں ایک دن بچّوں کے لیے دوائی وغیرہ لینے آئیں۔ حضورؑ اُن کو دیکھنے اور دوائی دینے میں مصروف رہے۔ اس پر مولوی عبدالکریم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو بڑی زحمت کا کام ہے اور اس طرح حضورؑ کا قیمتی وقت ضائع جاتا ہے۔ اس کے جواب میں حضورؑ نے فرمایا:

"یہ بھی تو ویسا ہی دینی کام ہے۔ یہ مسکین لوگ ہیں یہاں کوئی ہسپتال نہیں۔ مَیں ان لوگوں کی خاطر ہر طرح کی انگریزی اور یُونانی دوائیں منگوا رکھا کرتا ہوں، جو وقت پر کام آجاتی ہیں۔ یہ بڑا ثواب کا کام ہے۔ مومن کو ان کاموں میں سُست اور بے پرواہ نہ ہونا چاہیئے۔"

بچّوں کو مارنا شرک میں داخل ہے

ایک مرتبہ ایک دوست نے اپنے بچے کو مارا۔ آپؑ اس سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں بُلا کر بڑی دردانگیز تقریر فرمائی اور فرمایا:

"میرے نزدیک بچّوں کو یُوں مارنا شرک میں داخل ہے۔ گویا بد مزاج مارنے والا ہدایت اور ربُوبیّت میں اپنے تئیں حصّہ دار بنانا چاہتا ہے۔ ایک جوش والا آدمی جب کسی بات پر سزا دیتا ہے تو اشتعال میں بڑھتے بڑھتے ایک دشمن کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور جُرم کی حد سے سزا میں کوسوں تجاوز کر جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص خوددار اور اپنے نفس کی باگ کو قابُو سے نہ دینے والا اور پُورا متحمل اور بُردبار اور باسکون اور باوقار ہو، تو اُسے البتّہ حق پہنچتا ہے کہ کسی وقت مناسب پر کسی حد تک بچہ کو سزا دے یا چشم نمائی کرے۔ مگر مغلوب الغضب اور سُبک سر اور طائش العقل ہرگز سزاوار نہیں

کہ بچوں کی تربیت کا متکفل ہو جس طرح اور جس قدر سزا دینے میں کوشش کی جاتی ہے، کاش دُعا میں لگ جائیں اور بچوں کے لیے سوزِ دل سے دُعا کرنے کو ایک حزب ٹھہرالیں۔ اس لیے کہ والدین کی دُعا کو بچوں کے حق میں خاص قبول بخشا گیا ہے۔

حضورؑ کی چند دُعائیں

فرمایا : میں التزاماً چند دُعائیں ہر روز مانگا کرتا ہوں۔

اوّل۔ اپنے نفس کے لیے دُعا مانگتا ہوں کہ خداوند کریم مجھ سے وہ کام لے جس سے اُس کی عزت و جلال ظاہر ہو اور اپنی رضا کی پوری توفیق عطا کرے۔

دوم۔ پھر اپنے گھر کے لوگوں کے لیے دُعا مانگتا ہوں کہ اُن سے قرۃ عین عطا ہو اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی راہ پر چلیں۔

سوم : پھر اپنے بچوں کے لیے دُعا مانگتا ہوں کہ یہ سب دین کے خدام بنیں۔

چہارم : پھر اپنے مخلص دوستوں کے لیے نام بنام۔

پنجم : اور پھر اُن سب کے لیے جو اس سلسلہ سے وابستہ ہیں خواہ ہم انہیں جانتے ہیں، یا نہیں جانتے۔

تربیتِ اولاد

فرمایا : "حرام ہے مشیخی کی گدی پر بیٹھنا اور پیر بننا اس شخص کو جو ایک منٹ بھی اپنے متوسلین سے غافل رہے۔ فرمایا۔ ہدایت اور تربیتِ حقیقی خدا کا فعل ہے۔ سخت پیچھا کرنا اور ایک امر پر اصرار کو حد سے گذار دینا یعنی بات بات پر بچوں کو روکنا اور ٹوکنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا ہم ہی ہدایت کے مالک ہیں۔ اور ہم اُس کو اپنی مرضی کے مطابق ایک راہ پر لے آئیں گے۔ یہ ایک قسم کا شرکِ خفی ہے۔ اس سے ہماری جماعت کو پرہیز کرنا چاہیے۔ آپؑ نے قطعی طور پر فرمایا اور لکھ کر بھی ارشاد کیا کہ ہمارے مدرسہ میں جو استاد مارنے کی عادت رکھتا اور اپنے اس ناسزا فعل سے باز نہ آتا ہو، اسے یکلخت موقوف کردو۔ فرمایا : ہم تو اپنے بچوں کے لیے دُعا کرتے ہیں اور سرسری طور پر قواعد اور آدابِ تعلیم کی پابندی کراتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ اور پھر اپنا پورا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھتے ہیں۔ جیسا کسی میں سعادت کا تخم ہوگا۔ وقت پر سرسبز ہو جائے گا۔"[1]

تکلفات سے پرہیز

جب مہمانوں کی ضرورت کے لیے مکان بنوانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو بار بار ہی تاکید فرمائی ہے کہ اینٹوں اور پتھروں پر روپیہ خرچ کرنا عبث ہے۔ اتنا ہی کام کرو جو چند روز بسر کرنے کی گنجائش ہو جائے۔ نجار تیر بندیاں اور تختے رندے سے صاف کر رہا تھا۔ حضورؑ نے اُسے روک دیا اور فرمایا :

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۱۱ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۰ء خط نمبر ۲ مولانا عبدالکریم صاحبؓ

"یہ محض تکلف ہے اور ناحق کی دیر لگانا ہے۔ مختصر کام کرو۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ہمیں کسی مکان سے کوئی اُنس نہیں۔ ہم اپنے مکانوں کو اپنے اور اپنے دوستوں میں مشترک جانتے ہیں اور بڑی آرزو ہے کہ مل کر چند روز گزارہ کرلیں اور فرمایا کہ ایک ایسا مکان ہو کہ چاروں طرف ہمارے احباب کے گھر ہوں اور درمیان میرا گھر ہو اور ہر گھر میں میری ایک کھڑکی ہو کہ ہر ایک سے ہر ایک وقت واسطہ و رابطہ رہے۔"

وقت کی قدر

تکلفات میں وقت ضائع کرنا حضورؑ کو ناپسند تھا۔ اس کے متعلق حضورؑ نے فرمایا:

"میرا تو یہ حال ہے کہ پاخانہ اور پیشاب پر بھی مجھے افسوس آتا ہے کہ اتنا وقت ضائع جاتا ہے، یہ بھی کسی دینی کام میں لگ جائے اور فرمایا۔ کوئی مشغولی اور تصرف جو دینی کاموں میں حارج ہو اور وقت کا کوئی حصّہ لے مجھے سخت ناگوار ہے اور فرمایا۔ جب کوئی دینی ضروری کام آ پڑے، تو مَیں اپنے اوپر کھانا پینا اور سونا حرام کرلیتا ہوں۔ جب تک وہ کام نہ ہوجائے۔ فرمایا: ہم دین کے لیے ہیں اور دین کی خاطر زندگی بسر کرتے ہیں بس دین کی راہ میں ہمیں کوئی روک نہ ہونی چاہیے۔"

خدمت گذاری

ایک دفعہ مولوی عبدالکریم صاحب اپنے مکان میں ایک چارپائی پڑی تھی، جس پر سو رہے تھے۔ وہاں حضورؑ ٹہل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جاگے، تو دیکھا کہ حضورؑ فرش پر چارپائی کے نیچے لیٹے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب اَدب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضورؑ نے محبّت سے پوچھا کہ کیوں اُٹھ بیٹھے؟ اُنھوں نے پاسِ اَدب کا عُذر کیا۔ اس پر حضورؑ نے فرمایا:

"مَیں تو آپ کا پہرہ دے رہا تھا۔ لڑکے شور کرتے تھے انہیں روکتا تھا کہ آپ کی نیند میں خلل نہ آوے۔"

خاکساری

لوگوں کو حضورؑ سے گفتگو کرنے میں کمال آزادی تھی اور ہر شخص بلا روک ٹوک حضورؑ سے بات چیت کرسکتا تھا۔ اس بارے میں حضورؑ نے فرمایا:

"میرا یہ مسلک نہیں کہ مَیں ایسا تُند خُو اور بھیانک بن کر بیٹھوں کہ لوگ مُجھ سے ایسے ڈریں، جیسے درندہ سے ڈرتے ہیں اور مَیں بُت بننے سے سخت نفرت رکھتا ہوں۔ مَیں تو بُت پرستی کو رَدّ کرنے آیا ہوں نہ یہ کہ مَیں خود بُت بنوں اور لوگ میری پُوجا کریں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ مَیں اپنے نفس کو دُوسروں پر ذرا بھی ترجیح نہیں دیتا۔ میرے نزدیک متکبّر سے زیادہ کوئی بُت پرست اور خبیث نہیں۔ متکبّر کسی خدا کی پرستش نہیں کرتا، بلکہ وُہ اپنی پرستش کرتا ہے۔"

خلوت پسندی

حضرتِ اقدسؑ خلوت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اس بارہ میں فرمایا:

"اگر خدا تعالیٰ مجھے اختیار دے کہ خلوت اور جلوت میں سے تُو کس کو پسند کرتا ہے، تو اس پاک ذات کی قسم ہے کہ مَیں خلوت کو اختیار کروں۔ مجھے تو کشاں کشاں میدانِ عالم میں اُسی نے نکالا ہے، جو لذت مجھے خلوت میں آتی ہے۔ اس سے بجز خدا تعالیٰ کے کون واقف ہے۔ مَیں قریب ۲۵ سال تک خلوت

میں بیٹھا رہا ہوں اور کبھی ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں چاہا کہ دربارِ شہرت میں کرسی پر بیٹھوں۔ مجھے طبعاً اس سے کراہت ہے کہ لوگوں میں مل کر بیٹھوں، مگر اَمرِ آمر سے مجبور ہوں۔ فرمایا: میں جو باہر بیٹھتا ہوں یا سیر کرنے جاتا ہوں اور لوگوں سے بات چیت کرتا ہوں یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے امر کی تعمیل کی بنا پر ہے۔"

خادمِ دین ہی ہماری دُعاؤں کا مستحق ہے

تائیدِ حق پر اگر کوئی قلم اُٹھائے یا کوشش کرے تو حضورؑ بڑی قدر کرتے تھے۔ اس بارہ میں فرمایا:

"اگر کوئی تائیدِ دین کے لیے ایک لفظ نکال کر ہمیں دیدے تو ہمیں موتیوں اور اشرفیوں کی جھول سے بھی زیادہ بیش قیمت معلوم ہوتا ہے۔ جو شخص چاہے کہ ہم اُس سے پیار کریں اور ہماری دُعائیں نیازمندی اور سوز سے اس کے حق میں آسمان پر جائیں۔ وُہ ہمیں اس بات کا یقین دلادے کہ وُہ خادمِ دین ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بارہا قسم کھا کر فرمایا کہ ہم ہر ایک شئے سے محض اللہ تعالیٰ کے لیے پیار کرتے ہیں۔ بیوی ہو، بچے ہوں، دوست ہوں۔ سب سے ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔"

عہدِ دوستی کی رعایت

"میرا یہ مذہب ہے کہ جو شخص ایک دفعہ مجھ سے عہدِ دوستی باندھے۔ مجھے اس عہد کی اتنی رعایت ہوتی ہے کہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اور کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، میں اُس سے قطع نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر وُہ خود قطع تعلق کر دے تو ہم لاچار ہیں؛ ورنہ ہمارا مذہب تو یہ ہے کہ اگر ہمارے دوستوں سے کسی نے شراب پی ہو اور بازار میں گرا ہوا ہو اور لوگوں کا ہجوم اس کے گرد ہو تو بلاخوفِ لومۃ لائم کے اسے اُٹھا کر لے آئیں گے۔ فرمایا: عہدِ دوستی بڑا قیمتی جوہر ہے، اُس کو آسانی سے ضائع کر دینا نہ چاہیے اور دوستوں سے کیسی ہی ناگوار بات پیش آوے اُسے اغماض اور تحمّل کے محل میں اُتارنا چاہیے۔"[1]

۱۰ر جنوری ۱۹۰۰ء

سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب مدراسی نے اپنے کسی ضروری کام کے لیے مدراس واپس جانے کی اجازت طلب کی کیونکہ ان کو واپسی کے لیے تار بھی آیا تھا۔ اس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:

رمضان المبارک میں حضورؑ کی مصروفیات

"آپ کا اس مبارک مہینہ (رمضان) میں یہاں رہنا ازبس ضروری ہے اور فرمایا: ہم آپ کے لیے وُہ دُعا کرنے کو تیار ہیں جس سے باذن اللہ پہاڑ بھی ٹل جاتے۔ فرمایا: آج کل میں احباب کے پاس کم بیٹھتا ہوں اور زیادہ

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۳ پرچہ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۰ء

حصّہ اکیلا رہتا ہوں۔ یہ احباب کے حق میں ازبس مُفید ہے۔ میں تنہائی میں بڑی فراغت سے دُعائیں کرتا ہوں اور رات کا بہت سا حصّہ بھی دعاؤں میں صرف ہوتا ہے۔[1]"

۲؍فروری ۱۹۰۰ء

اسلام ایک پاکیزہ دین

عیدالفطر کی تقریب پر حضرت اقدسؑ نے ایک خاص جلسہ اس غرض کے لیے منعقد فرمایا کہ تا جنگِ ٹرانسوال کی کامیابی کے لیے دُعا کی جاوے اور مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کے حقوق اور اُن کے فرائض سے آگاہ کیا جاوے۔ حضرت اقدسؑ نے عیدالفطر کے خطبہ میں مفصلہ ذیل تقریر فرمائی:

"مُسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا بہت شُکر کرنا چاہیے، جس نے اُن کو ایک ایسا دین بخشا ہے جو علمی اور عملی طور پر ہر ایک قسم کی فساد اور مکروہ باتوں اور ہر ایک نوع کی قباحت سے پاک ہے۔"

حمد کا حقیقی مستحق اللہ تعالیٰ ہے

اگر انسان غور اور فکر سے دیکھے تو اُس کو معلوم ہوگا کہ واقعی طور پر تمام محامد اور صفات کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور کوئی انسان یا مخلوق واقعی اور حقیقی طور پر حمد و ثنا کی مستحق نہیں ہے اگر انسان بغیر کسی قسم کی غرض کی ملونی کے دیکھے تو اس پر بدیہی طور پر کھُل جاوے گا کہ کوئی شخص جو مستحقِ حمد قرار پاتا ہے وہ یا تو اس لیے مستحق ہو سکتا ہے کہ کسی ایسے زمانہ میں جبکہ کوئی وجود اور موجود کی خبر نہ تھی وُہ اُس کا پیدا کرنے والا ہو یا اس وجہ سے کہ ایسے زمانہ میں کہ کوئی وجود نہ تھا اور نہ معلوم تھا کہ وجُود اور بقاءِ وجود اور حفظِ صحت اور قیامِ زندگی کے لیے کیا کیا اسباب ضروری ہیں۔ اُس نے وہ سب سامان مہیا کیے ہوں یا ایسے زمانہ میں کہ اس پر بہت سی مصیبتیں آسکتی تھیں۔ اُس نے رحم کیا ہو اور اُس کو محفوظ رکھا ہو اور یا اس وجہ سے مستحقِ تعریف ہو سکتا ہے کہ محنت کرنے والے کی محنت کو ضائع نہ کرے اور محنت کرنے والوں کے حقوق پورے طور پر ادا کرے؛ اگرچہ بظاہر محنت کرنے والے کے حقوق کا دینا معاوضہ ہے، لیکن ایسا شخص بھی مُحسن ہو سکتا ہے جو پُورے طور پر حقوق دے۔ یہ صفات اعلیٰ درجہ کی ہیں جو کسی کو مستحقِ حمد و ثنا بنا سکتی ہیں۔ اب غور کرکے دیکھ لو کہ حقیقی طور پر ان سب محامد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو کامل طور پر ان صفات سے متصف ہے۔ اور کسی میں یہ صفات نہیں ہیں۔

اوّل دیکھو صفتِ خلق اور پرورش۔ یہ صفت اگرچہ انسان گمان کر سکتا ہے کہ ماں باپ اور دیگر محسنوں میں بھی

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۳ مورخہ ۲۴؍جنوری ۱۹۰۰ء

پائی جاتی ہے، لیکن اگر انسان زیادہ غور کرے گا، تو اُس کو معلوم ہو جاوے گا کہ ماں باپ اور دیگر محسنوں کے اغراض و مقاصد ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ احسان کرتے ہیں۔ اِس پر دلیل یہ ہے کہ مثلاً بچہ تندرست، خوبصورت توانا پیدا ہو تو ماں باپ کو خوشی ہوتی ہے اور اگر لڑکا ہو تو پھر یہ خوشی اور بھی بڑی ہوتی ہے۔ شادیانے بجائے جاتے ہیں لیکن اگر لڑکی ہو تو گویا وُہ گھر ماتم کدہ اور وُہ دن سوگ کا دن ہو جاتا ہے اور اپنے تئیں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتے۔ بسا اوقات بعض نادان مختلف تدابیر سے لڑکیوں کو ہلاک کر دیتے ہیں یا اُن کی پرورش میں کم التفات کرتے ہیں اور اگر بچہ لُنجا، اندھا، اپاہج پیدا ہو۔ تو چاہتے ہیں کہ وُہ مر جاوے اور اکثر دفعہ تعجب نہیں کہ خود بھی وبالِ جان سمجھ کر مار دیں۔ مَیں نے پڑھا ہے کہ یُونانی لوگ ایسے بچوں کو عمداً ہلاک کر دیتے تھے، بلکہ اُن کے ہاں شاہی قانون تھا کہ اگر کوئی ناکارہ بچہ اپاہج اندھا وغیرہ پیدا ہو تو اُس کو فوراً مار دیا جاوے۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ انسانی خیالات پرورش اور خبرگیری کے ساتھ ذاتی اور نفسانی اغراض سے ملے ہوئے ہوتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی اس قدر مخلوق کی (جس کے تصور اور بیان سے وہم اور زبان قاصر ہے اور جو آسمان اور زمین میں بھری پڑی ہے) خلق اور پرورش سے کوئی غرض ہرگز نہیں ہے۔ وہ والدین کی طرح خدمت اور رزق نہیں چاہتا بلکہ اُس نے مخلوق کو محض ربوبیت کے تقاضا سے پیدا کیا ہے۔ ہر ایک شخص مان لے گا کہ بُوٹا لگانا پھر آب پاشی کرنا اور اس کی خبرگیری رکھنا اور ثمردار درخت ہونے تک محفوظ رکھنا ایک بڑا احسان ہے۔ پس انسان اور اُس کی حالت اور غور و پرداخت پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ خدا تعالیٰ نے کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اِس قدر انقلابات اور تغیرات میں اس کی دستگیری فرمائی ہے۔

دُوسرا پہلو جو مَیں نے ابھی بیان کیا ہے کہ قبل از پیدائشِ وجُود ایسے سامان ہوں کہ تمدنی زندگی اور قویٰ کے کام کے لیے پُورا پُورا سامان موجود ہو۔ دیکھو ابھی ہم پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ سامان پہلے ہی پیدا کر دیا۔ منوّر سُورج جو جو اَب چڑھا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے عام روشنی پھیلی ہوئی ہے اور دن چڑھا ہوا ہے اگر نہ ہوتا۔ کیا ہم دیکھ سکتے تھے یا روشنی کے ذریعہ جو فوائد اور منافع ہمیں پہنچ سکتے ہیں ہم کس ذریعہ سے حاصل کر سکتے تھے؟ اگر سُورج اور چاند یا اور کسی قِسم کی روشنی نہ ہوتی تو بینائی بے کار ہوتی، اگرچہ آنکھوں میں ایک قوّت دیکھنے کی ہے، مگر وُہ بیرونی اور خارجی روشنی کے بدوں محض نکمی ہے پس یہ کس قدر احسان ہے کہ قویٰ سے کام لینے کے لیے اُن ضروری سامانوں کو پہلے سے مہیا کر دیا اور پھر یہ کس قدر رحمت ہے کہ ایسے قویٰ دیئے ہیں اور ان میں بالقوّہ ایسی استعدادات رکھ دی ہیں جو انسان کی تکمیل اور وصُول اِلی الغایتہ کے لیے از بس ضروری ہیں۔ دماغ میں، اعصاب میں، عُروق میں ایسے خواص رکھے ہیں کہ انسان اُن سے کام لیتا ہے اور اُن کی تکمیل کر سکتا ہے، اس لیے کہ قوتوں کی تکمیل کا سامان ساتھ ہی پیدا کر دیا ہے۔ یہ تو اندرونی نظام کا حال ہے کہ ہر ایک قوّت اُس منشاء اور مفاد سے پوری مناسبت رکھتی ہے، جس میں انسان

کی فلاح ہے اور بیرونی طور پر بھی ایسا ہی انتظام رکھا ہے کہ ہر شخص جس قسم کا حرفہ رکھتا ہے اس کے مناسبِ حال ادویات و آلات قبل از وجود مہیا کر رکھے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی جوتا بنانے والا ہے تو اس کو چمڑہ اور دھاگہ نہ ملے تو وہ کہاں سے لائے اور کیونکر اپنے حرفہ کی تکمیل کرے۔ اسی طرح درزی کو اگر کپڑا نہ ملے تو کیونکر سیئے۔ اسی طرح ہر متنفس کا حال ہے۔ طبیب کیسا ہی حاذق اور عالم ہو، لیکن اگر ادویہ نہ ہوں تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ بڑی سوچ اور فکر سے ایک نسخہ لکھ دے گا، لیکن بازار سے وہ دوا نہ ملے، تو کیا کرے گا۔ کس قدر فضل ہے کہ ایک طرف علم دیا ہے اور دُوسری طرف نباتات، جمادات، حیوانات جو مریضوں کے مناسبِ حال تھے پیدا کر دیئے ہیں اور اُن میں قسم قسم کے خواص رکھے ہیں جو ہر زمانہ میں ناانديشہ ضروریات کے کام آسکتے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بھی غیر مفید پیدا نہیں کی اور نہ جس کے خواص محدود ہوں۔ یہاں تک کہ پسّو اور جُوں تک بھی غیر مفید نہیں، لکھا ہے کہ اگر کسی کا پیشاب بند ہو تو بعض وقت جُوں کو احلیل میں دینے سے پیشاب جاری ہو جاتا ہے۔ انسان اِن اشیاء کی مدد سے کہاں تک فائدہ اُٹھاتا ہے۔ کوئی تصوّر کر سکتا ہے؟ پھر چوتھی بات پاداشِ محنت ہے۔ اِس کے لیے بھی خدا کا فضل درکار ہے۔ مثلاً انسان کس قدر محنت و مشقت سے زراعت کرتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی مدد اُس کے ساتھ نہ ہو تو کیونکر اپنے گھر میں غلّہ لا سکے۔ اسی کے فضل و کرم سے اپنے وقت پر ہر ایک چیز ہوتی ہے، چنانچہ اب قریب تھا کہ اس خشک سالی میں لوگ ہلاک ہو جاتے، مگر خدا نے اپنے فضل سے بارش کر دی اور بہت سے حصّہ مخلوق کو سنبھال لیا۔ غرض اوّلاً بالذّات اکمل اور اعلیٰ مستحقِ تعریف کا خدا تعالیٰ ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی دُوسرے کا ذاتی طور پر کوئی بھی استحقاق نہیں۔

سورۃ النّاس میں تین حقوق کا بیان

اگر کسی دُوسرے کو استحقاق تعریف کا ہے تو صرف طفیلی طور پر ہے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کا رحم ہے کہ باوجودیکہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے، مگر طفیلی طور پر بعض کو اپنے محامد میں شریک کر لیا ہے۔ جیسے اس سُورۃ شریفہ میں بیان فرمایا ہے؛ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ۔ (الناس : ۲تا۷) اس میں اللہ تعالیٰ نے حقیقی مستحقِ حمد کے ساتھ عارضی مستحقِ حمد کا بھی اشارۃً ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ اخلاقِ فاضلہ کی تکمیل ہو، چنانچہ اس سُورۃ میں تین قسم کے حق بیان فرمائے ہیں۔

فرمایا "تم پناہ مانگو اللہ کے پاس جو جامع جمیع صفاتِ کاملہ کا ہے اور جو ربّ ہے اور جو مَلِک ہے لوگوں کا پھر جو معبُود و مطلُوبِ حقیقی ہے لوگوں کا۔ یہ سُورۃ اس قسم کی ہے کہ اس میں اصل توحید کو تو قائم رکھا ہے، مگر ساتھ ہی اشارہ کیا ہے کہ دُوسرے لوگوں کے حقوق بھی ضائع نہ کریں جو ان اسماء کے مظہرِ ظلّی طور پر ہیں۔ ربّ کے لفظ میں اشارہ ہے کہ گو حقیقی طور پر خدا ہی پرورش کرنے والا اور تکمیل تک پہنچانیوالا ہے۔

رُبوبیت کے دو مظہر والدین اور رُوحانی مُرشد

لیکن عارضی اور ظلّی طور پر دو اور بھی وجود ہیں جو رُبوبیت کے مظہر ہیں۔ ایک جسمانی طور پر، دُوسرا روحانی طور پر۔ جسمانی طور پر والدین ہیں اور رُوحانی طور پر مُرشد اور ہادی ہیں۔ دُوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ بھی ذکر فرمایا ہے۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ (بنی اسرائیل : ۲۴) یعنی خدا نے یہ چاہا ہے کہ کسی دُوسرے کی بندگی نہ کرو اور والدین سے احسان کرو۔ حقیقت میں کیسی رُبوبیت ہے کہ انسان بچہ ہوتا ہے اور کسی قسم کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس حالت میں ماں کیا کیا خدمات کرتی ہے اور والد اس حالت میں ماں کی مہمات کا کس طرح متکفل ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ناتواں مخلوق کی خبر گیری کے لیے دو محل پیدا کر دیتے ہیں اور اپنی محبت کے انوار سے ایک پَرتَو محبت کا اُن میں ڈال دیا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ماں باپ کی محبت عارضی ہے اور خدا تعالیٰ کی محبت حقیقی ہے۔ اور جب تک قلوب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا القاء نہ ہو تو کوئی فردِ بشر خواہ وہ دوست ہو یا کوئی برابر کے درجہ کا ہو یا کوئی حاکم ہو کسی سے محبت نہیں کر سکتا اور یہ خدا کی کمال رُبوبیت کا راز ہے کہ ماں باپ بچوں سے ایسی محبت کرتے ہیں کہ اُن کے تکفل میں ہر قسم کے دُکھ شرحِ صدر سے اُٹھاتے ہیں یہاں تک کہ اُن کی زندگی کے لیے مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ پس خدا تعالیٰ نے تکمیلِ اخلاقِ فاضلہ کے لیے ربّ الناس کے لفظ میں والدین اور مُرشد کی طرف ایما فرمایا ہے تاکہ اس مجازی اور مشہُود سلسلۂ شکرگزاری سے حقیقی ربّ اور ہادی کی شکرگزاری میں لے لیے جائیں۔ اسی راز کے حل کی یہ کلید ہے کہ اس سُورۃ شریفہ کو رَبّ الناس سے شروع فرمایا ہے۔ اِلٰہ النّاس سے آغاز نہیں کیا؛ چونکہ مُرشد رُوحانی تربیت خدا تعالیٰ کے منشاء کے موافق اس کی توفیق و ہدایت سے کرتا ہے۔ اس لیے وہ بھی اس میں شامل ہے۔ پھر دُوسرا ٹکڑا اس میں مَلِکِ النّاس ہے۔ تم پناہ مانگو خدا کے پاس جو تمہارا بادشاہ ہے۔ یہ ایک اور اشارہ ہے تا لوگوں کو متمدن دُنیا کے اُصول سے واقف کیا جاوے اور مہذب بنایا جاوے۔ حقیقی طور پر تو اللہ تعالیٰ ہی بادشاہ ہے، مگر اس میں اشارہ ہے کہ ظلّی طور پر دُنیا میں بھی بادشاہ ہوتے ہیں اور اسی لیے اس میں اشارۃً مَلِکِ وقت کے حقوق کی نگہداشت کی طرف بھی ایما ہے۔ یہاں کافر اور مشرک اور موحّد بادشاہ کسی قسم کی قید نہیں بلکہ عام طور پر ہے۔ کسی مذہب کا بادشاہ ہو۔ مذہب اور اعتقاد کے حصّے جُدا ہیں۔ قرآن میں جہاں جہاں خدا نے مُحسن کا ذکر فرمایا ہے وہاں کوئی شرط نہیں لگائی کہ وہ مُسلمان ہو اور مُوحّد ہو اور فلاں سلسلہ کا ہو بلکہ عام طور پر مُحسن کی نسبت فرمایا خواہ وہ کوئی مذہب رکھتا ہو۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ (الرحمان : ۶۱) کہ کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی ہو سکتا ہے۔

سکھوں کا زمانہ ایک آتشی تنور تھا

اب ہم اپنی جماعت کو اور تمام سُننے والوں کو بڑی صفائی اور وضاحت سے سُناتے ہیں کہ سلطنتِ انگریزی ہماری مُحسن ہے۔ اُس نے ہم پر بڑے بڑے احسان کیے ہیں۔ جس کی عمر ۶۰ یا ۷۰ برس کی ہوگی وہ خوب جانتا ہوگا کہ ہم پر سکھوں کا ایک زمانہ گذرا ہے اس

وقت مسلمانوں پر جس قدر آفتیں تھیں وُہ پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان کو یاد کر کے بدن پر لرزہ پڑتا ہے اور دل کانپ اُٹھتا ہے۔ اس وقت مُسلمانوں کو عبادات اور فرائضِ مذہبی کی بجاآوری سے جو اُن کو جان سے عزیز تر ہیں، روکا گیا تھا۔ بانگِ نماز جو نماز کا مقدمہ ہے اس کو بآوازِ بلند پکارنے سے روکا گیا تھا۔ اگر کبھی موذن کے مُنہ سے بہؤا اللہ اکبر بآوازِ بلند نکل جاتا تو اس کو مار دیا جاتا تھا۔ اسی طرح پر مُسلمانوں کے حلال و حرام کے معاملہ میں بے جا تصرّف کیا گیا تھا۔ ایک گائے کے مقدمہ میں ایک دفعہ پانچ ہزار غریب مُسلمان قتل کیے گئے۔ بٹالہ کا واقعہ ہے کہ ایک سید وہیں کا رہنے والا باہر سے دروازہ پر آیا۔ وہاں گائیوں کا ہجوم تھا۔ اس نے تلوار کی نوک سے ذرا ہٹایا اور ایک گائے کے چمڑے کو خفیف سی خراش پہنچ گئی۔ وہ بے چارہ پکڑ لیا گیا۔ اور اس امر پر زور دیا گیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ آخر بڑی سفارشوں کے بعد اُس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ مگر اب دیکھو کہ ہر قوم و مذہب کو کیسی آزادی ہے۔ ہم صرف مُسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ فرائضِ مذہبی اور عبادات کے بجالانے میں سلطنت نے پوری آزادی دے رکھی ہے اور کسی کے مال و جان و آبرو سے کوئی ناحق تعرّض نہیں۔ برخلاف اُس پُرفتن وقت کے کہ ہر ایک شخص کیسا ہی اُس کا حساب پاک ہو، اپنی جان و مال پر لرزتا رہتا تھا۔ اب اگر کوئی خود اپنا چلن خراب کرے اور اپنی بے اندامی اور ارتکابِ جرائم سے خود مستوجبِ عقوبت ٹھہر جائے، تو اور بات ہے۔ یا خود ہی سُوءِ اعتقاد اور غفلت کی وجہ سے عبادت میں کوتاہی کرے تو جُدا امر ہے لیکن گورنمنٹ کی طرف سے ہر طرح کی پُوری آزادی ہے۔ اِس وقت جس قدر عابد بننا چاہو تو کوئی روک نہیں۔ گورنمنٹ خود معابدِ مذہبی کی حُرمت کرتی ہے اور اُن کی مرمّت وغیرہ پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتی ہے۔ سکھوں کے زمانہ میں اس کے خلاف یہ حال تھا کہ مسجدوں میں بھنگ گھٹتی تھی اور گھوڑے بندھتے تھے جس کا نمونہ خود یہاں قادیان میں موجود ہے اور پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں اس کے نمونے ملیں گے۔ لاہور میں آج تک کئی ایک مسجدیں سکھوں کے قبضہ میں ہیں۔ آج اس کے مقابل میں گورنمنٹ انگلشیہ ان بزرگ مکانوں کی ہر قسم کی واجب عزّت کرتی ہے اور مذہبی مکانات کی تکریم اپنے فرائض میں سے سمجھتی ہے جیسا کہ انہی دنوں حضور وائسرائے لارڈ کرزن صاحب بہادر بالقابہ نے دہلی کی جامع مسجد میں جُوتا پہن کر جانے کی مخالفت اپنی عملی حالت سے ثابت کر دی اور قابلِ اقتدا نمونہ بادشاہانہ اخلاقِ فاضلہ کا دیا اور اُن کی ان تقریروں سے جو وقتاً فوقتاً اُنھوں نے مختلف موقعوں پر کی ہیں، صاف معلوم ہو گیا ہے کہ وہ مذہبی مکانات کی کیسی عزّت کرتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ گورنمنٹ نے کہیں منادات نہیں کی کہ کوئی بآوازِ بلند بانگ نہ دے یا روزہ نہ رکھے۔ بلکہ اُنھوں نے ہر قسم کی تغذیہ کے سامان مہیا کیے ہیں جس کا سکھوں کے ذلیل زمانہ میں نام و نشان تک نہ تھا۔ برف، سوڈا واٹر اور بسکٹ ڈبل روٹی وغیرہ ہر قسم کی غذائیں بہم پہنچائیں اور ہر قسم کی سہولت دی ہے۔ یہ ایک ضمنی امداد ہے جو ان لوگوں سے ہمارے شعائرِ اسلام کو پہنچی ہے۔ اب اگر کوئی خود روزہ نہ رکھے تو یہ اور بات ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ مسلمان خود شریعت کی توہین کرتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو۔ جنھوں نے اِن دِنوں روزے رکھے ہیں، وُہ کچھ دُبلے نہیں ہو گئے اور جنھوں نے استخفاف کے ساتھ اس

مہینہ کو گذارہ ہے، وہ کچھ موٹے نہیں ہوگئے۔ اُن کا بھی وقت گذر گیا۔ اِن کا بھی زمانہ گذر گیا۔ جاڑے کے روزے تھے۔ صرف غذا کے اوقات کی ایک تبدیلی تھی۔ سات آٹھ بجے نہ کھائی چار پانچ بجے کھالی۔ باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی بہتوں نے شعائر اللہ کی عظمت نہیں کی اور خدا تعالیٰ کے اس واجب التکریم مہمان ماہِ رمضان کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ اِس قدر آسانی کے مہینوں میں رمضان کا آنا ایک قسم کا معیار تھا اور مطیع و عاصی میں فرق کرنے کے لیے یہ روزے میزان کا حکم رکھتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے آسانی تھی۔ سلطنت نے ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے۔ طرح طرح کے پھل اور غذائیں میسر آتی ہیں۔ کوئی آسائش و آرام کا سامان نہیں، جو آج مہیا نہ ہو سکتا ہو۔ بایں ہمہ جو پرواہ نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلوں میں خدا پر ایمان نہیں رہا۔ افسوس خدا کا ایک ادنیٰ بھنگی کے برابر بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ گویا یہ خیال ہے کہ خدا سے کبھی واسطہ ہی نہ ہوگا اور نہ اس سے کبھی پالا پڑے گا اور اُس کی عدالت کے سامنے جانا ہی نہیں۔ کاش مُنکِر غور کریں اور سوچیں کہ کروڑوں سورجوں کی روشنی سے بھی بڑھ کر خدا تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت ہیں۔ افسوس کی جگہ ہے کہ ایک جُوتے کو دیکھ کر یقینی طور پر سمجھ لیا جاتا ہے کہ اُس کا کوئی بنانے والا ہے، مگر یہ کس قدر بدبختی ہے کہ خدا تعالیٰ کی بے انتہا مخلوق کو دیکھ کر بھی اُس پر ایمان نہ ہو۔ یا ایسا ایمان ہو جو نہ ہونے میں داخل ہے۔ خدا تعالیٰ کی ہم پر بہت رحمتیں ہیں۔ ازاں جُملہ ایک یہ ہے کہ اس نے ہمیں جلتے ہوئے تنور سے نکالا۔ سکھوں کا زمانہ ایک آتشی تنور تھا اور انگریزوں کا قدم رحمت و برکت کا قدم ہے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ جب اوّل ہی اوّل انگریز آئے تو ہوشیار پور میں کسی مؤذن نے اونچی اذان کہی؛ چونکہ ابھی ابتدا تھی اور ہندوؤں اور سکھوں کا خیال تھا کہ یہ بھی اُونچی اذان کہنے پر روکیں گے۔ یا اُن کی طرح اگر گائے کو کسی سے زخم لگ جاوے، تو اُس کا ہاتھ کاٹیں گے۔ اس اُونچی اذان کہنے والے مؤذن کو پکڑ لیا۔ ایک بڑا ہجوم ہوگیا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے وُہ لایا گیا۔ بڑے بڑے رئیس مہاجن جمع ہوئے اور کہا حضور! ہمارے آٹے بھرشٹ ہوگئے۔ ہمارے برتن ناپاک ہوگئے۔ جب یہ باتیں اُس انگریز کو سُنائی گئیں تو اسے بڑا تعجب ہوا کہ کیا بانگ میں ایسی خاصیت ہے کہ کھانے کی چیزیں ناپاک ہو جاتی ہیں۔ اس نے سررشتہ دار سے کہا کہ جب تک تجربہ نہ کر لیا جاوے اس مقدمہ کو نہ کرنا چاہیئے؛ چنانچہ اُس مؤذن کو حکم دیا کہ تُو پھر اُسی طرح بانگ دے وُہ ڈرا کہ شاید دُوسرا جُرم نہ ہو، مگر جب اُس کو تسلی دی گئی اُس نے اسی قدر زور سے بانگ دی۔ صاحب بہادر نے کہا کہ ہم کو تو اِس سے کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ سررشتہ دار سے پُوچھا کہ تم کو کوئی ضرر پہنچا۔ اُس نے بھی کہا کہ حقیقتاً کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ آخر اُس کو چھوڑ دیا گیا اور کہا گیا۔ جاؤ جس طرح چاہو بانگ دو۔ اللہ اکبر یہ کس قدر آزادی ہے اور کس قدر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ پھر ایسے احسان پر اور ایسے انعام صریح پر بھی اگر کوئی دل گورنمنٹ انگریزی کا احسان محسوس نہیں کرتا۔ وہ دل بڑا کافرِ نعمت اور نمک حرام اور سینہ سے چیر کر نکال ڈالنے کے لائق ہے۔

مذہبی آزادی

خود ہمارے اس گاؤں میں جہاں ہماری مسجد ہے۔ کارداروں کی جگہ تھی۔ ہمارے بچپن کا زمانہ تھا، لیکن مَیں نے معتبر آدمیوں سے سُنا ہے کہ جب انگریزی دخل ہوگیا تو چند روز تک

بُری قانون رہا۔ ایک کاردار آیا ہوا تھا اس کے پاس ایک مسلمان سپاہی تھا وُہ مسجد میں آیا اور مؤذن کو کہا کہ بانگ دے۔ اس نے وہی گُنگنا کر اذان دی۔ سپاہی نے کہا کہ کیا تم اسی طرح پر بانگ دیتے ہو۔ مؤذن نے کہا ہاں! اسی طرح دیتے ہیں۔ سپاہی نے کہا کہ نہیں کوٹھے پر چڑھ کر اُونچی آواز سے اذان دے اور جس قدر زور سے ممکن ہے وُہ دے۔ وُہ ڈرا، آخر اس نے زور سے بانگ دی۔ تمام ہندو اکٹھے ہو گئے اور ملّاں کو پکڑ لیا۔ وہ بے چارہ بہت ڈرا اور گھبرایا کہ کاردار مجھے پھانسی دے دے گا۔ سپاہی نے کہا کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ آخر سنگدل چھُری مار برہمن اس کو پکڑ کر کاردار کے پاس لے گئے اور کہا۔ مہاراج! اس نے ہم کو بھرشٹ کر دیا۔ کاردار جانتا تھا کہ سلطنت تبدیل ہو گئی ہے اور اب وُہ سکھا شاہی نہیں رہی، مگر ذرا دبی زبان سے پُوچھا کہ تُو نے اُونچی آواز سے بانگ کیوں دی؟ سپاہی نے آگے بڑھ کر کہا کہ اُس نے نہیں میں نے بانگ دی۔ کاردار نے کہا۔ کم بختو! کیوں شور ڈالتے ہو۔ لاہور میں تو اب کھُلے طور پر گائے ذبح ہوتی ہے۔ تم ایک اذان کو روتے ہو۔ جاؤ چپکے ہو کر بیٹھ رہو۔ الغرض یہ واقعی اور سچی بات ہے جو ہمارے دل سے نکلتی ہے۔ جس قوم نے ہم کو تحت الثریٰ سے نکالا ہے۔ اس کا احسان ہم نہ مانیں یہ کس قدر ناشکری اور نمک حرامی ہے۔

پریس کی سہولت

اس کے علاوہ بڑی جہالت پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بڈھے کٹّے شاہ نے بیان کیا کہ میں نے اپنے اُستاد کو دیکھا ہے کہ وہ بڑے تضرّع سے دُعا کرتے تھے کہ صحیح بخاری کی ایک دفعہ زیارت ہو جائے اور بعض اوقات اس خیال سے کہ کہاں ممکن ہے دُعا کرتے کرتے اُن کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ اب وُہی بخاری دو چار روپیہ میں امرتسر اور لاہور سے ملتی ہے۔ ایک مولوی شیر محمد صاحب تھے کہیں دو چار ورق احیاء العلوم کے اُن کو مل گئے۔ کتنی مدت تک ہر نماز کے بعد نمازیوں کو بڑی خوشی اور فخر سے دکھایا کرتے تھے کہ یہ احیاء العلوم ہے اور تڑپتے تھے کہ پوری کتاب کہیں سے مل جائے۔ اب جابجا احیاء العلوم مطبوعہ موجود ہے۔ غرض انگریزی قدم کی برکت سے لوگوں کی دینی آنکھ بھی کھُل گئی ہے اور خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اس سلطنت کے ذریعہ دین کی کس قدر اعانت ہوئی ہے کہ کسی سلطنت میں ممکن ہی نہیں۔ پریس کی برکت اور قسم قسم کے کاغذ کی ایجاد سے ہر قسم کی کتابیں تھوڑی قیمت پر میسّر آسکتی ہیں اور پھر ڈاک خانہ کے طفیل سے کہیں سے کہیں گھر بیٹھے بٹھلائے پہنچ جاتی ہیں اور یُوں دین کی صداقتوں کی تبلیغ کی راہ کس قدر سہل اور صاف ہو گئی ہے۔

مذہبی آزادی کے فوائد

پھر منجملہ اور برکات کے جو تائیدِ دین میں اس گورنمنٹ کے عہد میں ملی ہیں۔ ایک یہ بھی ہے کہ عقلی قویٰ اور ذہنی طاقتوں میں بڑی ترقی ہوئی ہے اور چونکہ گورنمنٹ نے ہر ایک مذہب والے کو اس کے مذہب کی اشاعت کی آزادی دی ہے۔ اس طرح پر لوگوں کو ہر ایک مذہب کے اصُول اور دلائل پر کھنے اور اُن پر غور کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اسلام پر جب مختلف مذہب والوں نے حملے کئے، تو اہلِ اسلام کو اپنے مذہب کی تائید اور صداقت کے لیے اپنی مذہبی کتابوں پر غور کرنے کا موقع ملا اور اُن کی عقلی قوتوں میں ترقی ہوئی۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جیسے جسمانی قویٰ ریاضت کرنے سے بڑھتے ہیں۔ ایسے ہی رُوحانی قویٰ بھی ریاضت سے نشوونما پاتے ہیں۔ جیسے گھوڑا چابک سوار کے نیچے آکر دُرست ہوتا ہے۔ اسی طرح سے انگریزوں کے آنے سے مذہب کے اصولوں پر غور کرنے کا موقع ملا اور تدبر کرنے والوں کو استقامت اور استحکام مذہب حق میں زیادہ مِل گیا اور جس جس موقع پر قرآن کریم کے مخالفوں نے انگشت رکھی، وہیں سے غور کرنے والوں کو ایک گنج معارف کا ملا اور اس آزادی کی وجہ سے علم کلام نے مُعتد بہ ترقی کی اور وُہ مخصوصاً اِسی جگہ ہوئی ہے۔ اب اگر رومؔ یا شام کا رہنے والا خواہ وُہ کیسا ہی عالِم وفاضل کیوں نہ ہو، آجاوے تو وُہ عیسائیوں کے یا آریوں کے اعتراضات کا کافی جواب نہ دے سکے گا۔ کیونکہ اُس کو ایسی آزادی اور وسعت کے ساتھ مختلف مذاہب کے اصُولوں کے موازنہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ غرض جیسے جسمانی طور پر گورنمنٹ انگلشیہ سے مُلک میں اَمن ہوا۔ ایسے ہی رُوحانی اَمن بھی پُوری طرح پھیلا۔ چونکہ ہمارا تعلق دینی اور رُوحانی باتوں سے ہے اس لیے ہم تو زیادہ تر ان اُمور کا ذکر کریں گے جو فرائضِ مذہب کے ادا کرنے میں گورنمنٹ کی طرف سے ہم کو بطور احسان ملے ہیں۔

عبادات بجالانے کی شرائط

پس یاد رکھنا چاہیے کہ انسان پُوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ عبادات کو تب ہی بجالاسکتا ہے کہ اس میں چار شرطیں موجود ہوں :

اوّل صحت۔ اگر کوئی شخص ایسا ضعیف ہو کہ چارپائی سے اُٹھ نہ سکے وہ صَوم وصلوٰۃ کا کیا پابند ہوسکتا ہے۔ اسی طرح پر حج زکوٰۃ وغیرہ بہت سے ضروری اُمور کی بجاآوری سے قاصر رہے گا۔ اب دیکھنا چاہیے کہ گورنمنٹ کے طفیل سے ہم کو صحتِ جسمانی کے بحال رکھنے کے لیے کس قدر سامان ملے ہیں۔ ہر بڑے شہر اور قصبہ میں کوئی نہ کوئی ہسپتال ضرور ہے جہاں مریضوں کا علاج نہایت دل سوزی اور ہمدردی سے کیا جاتا ہے اور دَوا غذا وغیرہ مُفت دی جاتی ہے۔ بعض بیماروں کو ہسپتال میں رکھ کر ایسے طور پر اُن کی نگہداشت وغور وپرداخت کی جاتی ہے کہ کوئی اپنے گھر میں بھی ایسی آسانی اور سہُولت اور آرام کے ساتھ علاج نہیں کرسکتا۔ حفظانِ صحت کا ایک الگ محکمہ بنا رکھا ہے، جس پر کروڑ ہا روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ قصبات اور شہروں کی صفائی کے بڑے بڑے سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ گندے پانی اور مواد ردّیہ مضرِ صحت کے دفع کرنے کے لیے الگ انتظام ہیں۔ پھر ہر قسم کی سریع الاثر ادویہ تیار کر کے بہت کم قیمت پر مہیا کی جاتی ہیں یہانتک کہ ہر ایک آدمی چند دوائیں اپنے گھر میں رکھ کر بوقتِ ضرورت علاج کرسکتا ہے۔ بڑے بڑے میڈیکل کالج جاری کر کے طبّی تعلیم کو کثرت سے پھیلایا۔ یہانتک کہ دیہات میں بھی ڈاکٹر ملتے ہیں۔ بعض خطرناک امراض چیچک، ہیضہ، طاعُون وغیرہ کے دفعیہ کے لیے الگ محکمے ہیں۔ جو ابھی طاعُون کے متعلق جس قدر کارروائی گورنمنٹ کی طرف سے عمل میں آئی ہے وہ بہت ہی کچھ شکر گذاری کے قابل ہے۔ غرض صحت کے لحاظ سے گورنمنٹ نے ہر قسم کی ضروری امداد دی ہے اور اس طرح پر عبادت کے لیے پہلی اور ضروری شرط کے پُورا کرنے کے واسطے بہت بڑی مدد دی ہے۔

دوسری شرط ایمان ہے۔ اگر خدا تعالیٰ اور اُس کے احکام پر ایمان ہی نہ رہا ہو اور اندر ہی اندر بے دینی اور الحاد

کا جذام لگ گیا ہو۔ پھر بھی تعمیلِ احکامِ الٰہی نہیں ہوتی۔ جیسے بہت لوگ کہتے ہیں "ایہہ جگ مٹھا تے اگلا کن ڈٹھا"۔ افسوس ہے۔ دو آدمیوں کی شہادت پر ایک مجرم کو پھانسی مل سکتی ہے، بلکہ باوجودیکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور بے انتہا ولیوں کی شہادت موجود ہے، لیکن ابھی تک اس قسم کا الحاد ان لوگوں کے دلوں سے نہیں گیا۔ ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ اپنے مقتدر نشانوں اور معجزات سے اَنَا الْمَوْجُوْد کہتا ہے۔ مگر یہ کمبخت کان رکھتے ہوئے بھی نہیں سُنتے۔ غرض یہ شرط بھی بہت بڑی ضروری شرط ہے۔ اس لیے بھی ہمیں گورنمنٹ انگلشیہ کا شکرگذار ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایمان اور اعتقاد پختہ کرنے کے لیے عام تعلیم مذہبی کی ضرورت بھی اور مذہبی تعلیم کا انحصار مذہبی کتابوں کی اشاعت سے وابستہ تھا۔ پریس، ڈاک خانہ کی برکت سے ہر قسم کی مذہبی کتابیں مل سکتی ہیں اور اخبارات کے ذریعہ تبادلۂ خیالات کا موقع مِلتا ہے۔ سعید الفطرت لوگوں کے لیے بڑا بھاری موقعہ حاصل ہے کہ ایمان و اعتقاد میں رسُوخ حاصل کریں۔ ان باتوں کے علاوہ جو ضروری اور اشد ضروری بات ایمان کے رسُوخ کے لیے ہے۔ وُہ خدا تعالیٰ کے نشانات ہیں جو اس شخص کے ہاتھ پر سرزد ہوتے ہیں جو خدا کی طرف سے مامُور ہو کر آتا ہے اور اپنے طرزِ عمل سے گمشدہ صداقتوں اور معرفتوں کو زندہ کرتا ہے۔ سو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اِس زمانہ میں جس کو پھر ایمان زندہ کرنے کے لیے مامُور کیا اور اس لیے بھیجا کہ تا لوگ قوتِ یقین میں ترقی کریں، وہ بھی اسی مبارک گورنمنٹ کے عہد میں آیا۔ وُہ کون؟ وُہی جو تم میں کھڑا بول رہا ہے۔ چونکہ یہ مسلّم بات ہے کہ جب تک پُورے طور پر ایمان نہ ہو نیکی کے اعمال علی الوجہ الاتم بجا نہیں لا سکتا۔ جس قدر کوئی پہلو یا کنگرہ ایمان کا گرا ہوا ہے اسی قدر عمل انسان میں سُست اور کمزور ہوگا۔ اس بنا پر ولی وہ کہلاتا ہے جس کا ہر پہلو سالم ہو اور وہ کسی پہلو سے کمزور نہ ہو۔ اس کی عبادات اکمل اَتم طور پر صادر ہوتی ہوں۔ غرض دُوسری شرط ایمان کی سلامتی ہے۔

تیسری شرط انسان کے لیے طاقتِ مالی ہے۔ مساجد کی تعمیر اور امُورِ متعلقۂ اسلام کی بجاآوری مالی طاقت پر منحصر ہے۔ اس کے سوا تمدنی زندگی اور تمام اُمور کا اور خصوصًا مساجد کا انتظام بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ اب اِس پہلو کے لحاظ سے گورنمنٹ انگلشیہ کو دیکھو۔ گورنمنٹ نے ہر قسم کی تجارت کو ترقی دی۔ تعلیم پھیلا کر ملک کے باشندوں کو نوکریاں دیں اور بڑے بڑے عُہدے دیئے۔ سفر کے وسائل بہم پہنچا کر دُوسرے ملکوں میں جا کر روپیہ کما لانے میں مدد دی، چنانچہ ڈاکٹر، پلیڈر، عدالتوں کے عُہدہ دار، سررشتہ تعلیم وغیرہ بہت سے ذریعوں سے لوگ معقول روپیہ کماتے ہیں اور تجارت کرنے والے سوداگر قسم قسم کے تجارتی مال سے ولایت اور دُور دراز مُلکوں افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں جا کر مالامال ہو کر آتے ہیں۔ غرض روزگار عام کر دیا اور روپیہ کمانے کے بہت سے ذریعے پیدا کر دیئے۔

چوتھی شرط امن ہے۔ یہ اَمن کی شرط انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے اس کا انحصار علی الخصُوص سلطنت پر رکھا گیا ہے۔ جس قدر سلطنت نیک نیّت اور اس کا دل کھوٹ سے پاک ہوگا اسی قدر یہ شرط زیادہ صفائی سے پُوری ہوگی۔ اب اس زمانہ میں اَمن کی شرط اعلیٰ درجہ پر پُوری ہو رہی ہے۔ میں خُوب

یقین رکھتا ہوں کہ سکھوں کے زمانہ کے دن انگریزوں کے زمانہ کی راتوں سے بھی کم درجہ پر تھے۔ یہاں سے قریب ہی بوتھ ایک گاؤں ہے۔ وہاں اگر کوئی عورت جایا کرتی تھی، تو رو رو کر جایا کرتی تھی کہ خدا جانے پھر واپس آتا ہوگا یا نہیں۔[1] اب یہ حالت ہے کہ زمین کی انتہا تک چلا جاوے، کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ سفر کے وسائل ایسے آسان کر دیئے ہیں کہ ہر ایک قسم کا آرام حاصل ہے۔ گویا گھر کی طرح ریل میں بیٹھا ہوا یا سویا ہوا جہاں چاہے چلا جاوے۔ مال و جان کی حفاظت کے لیے پولیس کا وسیع محکمہ موجود ہے۔ حقوق کی حفاظت کے لیے عدالتیں کھلی ہیں۔ جہاں تک چاہے چلا جاوے۔ یہ کس قدر احسان ہیں جو ہماری عملی آزادی کا موجب ہوتے ہیں۔ پس اگر ایسی حالت میں جبکہ جسم و روح پر بے انتہا احسان ہوتے ہیں۔ ہم میں صُلح کاری اور شکر گذاری کا مادہ پیدا نہیں ہوتا، تو تعجب کی بات ہے۔ جو مخلوق کا شکر نہیں کرتا۔ وہ خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتا۔ وجہ کیا ہے؟ اِس لیے کہ وُہ مخلوق بھی تو خدا ہی کا فرستادہ ہوتا ہے اور خدا ہی کے ارادہ کے تحت میں چلتا ہے۔ الغرض یہ سب اُمور جو مَیں نے بیان کیے ہیں ایک نیک دل انسان کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ایسے محسن کا شکر گذار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بار بار اپنی تصنیفات میں اور اپنی تقریروں میں گورنمنٹ انگلشیہ کے احسانوں کا ذکر کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا دل واقعی اُس کے احسانات کی لذت سے بھرا ہوا ہے۔ احسان فراموش نادان اپنی منافقانہ فطرتوں پر قیاس کر کے ہمارے اس طریق عمل کو جو صدقِ اخلاق سے پیدا ہوتا ہے، جُھوٹی خوشامد پر عمل کرتا ہے۔

سچی توحید

اب مَیں پھر اُس اصل بات کی طرف عود کر کے بتلانا چاہتا ہوں کہ پہلے اس صُورت میں خدا تعالیٰ نے رب النّاس فرمایا پھر ملک النّاس آخر میں اِلٰہ النّاس فرمایا۔ جو اصلی مقصُود اور مطلُوب انسان کا ہے۔ اِلٰہ کہتے ہیں مقصود، معبود، مطلوب کو لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کے معنی یہی ہیں کہ لَا مَعْبُوْدَ لِیْ وَلَا مَقْصُوْدَ لِیْ وَلَا مَطْلُوْبَ لِیْ اِلَّا اللّٰہُ۔ یہی سچی توحید ہے کہ ہر مدح و ستائش کا مستحق اللہ تعالیٰ کو ہی ٹھہرایا جاوے۔

خنّاس کون ہے؟

پھر فرمایا مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (النّاس: ۵)۔ یعنی وسوسہ ڈالنے والے خنّاس کے شر سے پناہ مانگو۔ خنّاس عربی میں سانپ کو کہتے ہیں جسے عبرانی میں نحاش کہتے ہیں، اس لیے کہ اُس نے پہلے بھی بدی کی تھی یہاں ابلیس یا شیطان نہیں فرمایا۔ تاکہ انسان کو اپنی ابتدا کی ابتلا یاد آوے کہ کس طرح شیطان نے ان کے اَبَوَیْن کو دھوکا دیا تھا۔ اُس وقت اُس کا نام خنّاس ہی رکھا گیا تھا۔ یہ ترتیب خدا نے اس لیے اختیار فرمائی ہے تاکہ انسان کو پہلے واقعات پر آگاہ کرے کہ جس طرح

---

[1] سکھوں کے جور و ظلم کی یہ نشانی اب تک قائم ہے کہ باوجودیکہ اب راستے صاف اور امن سے پُر ہیں، لیکن پھر بھی اکثر جب کوئی سفر کو جاتا ہے تو رو رو کر بھیجتا ہے۔ (ایڈیٹر)

شیطان نے خدا کی اطاعت سے انسان کو فریب دے کر رُوگرداں کیا، ویسے ہی وہ کسی وقت مِلکِ وقت کی اطاعت سے بھی عاصی اور رُوگرداں نہ کرا دے۔ یُوں انسان ہر وقت اپنے نفس کے اِرادوں اور منصوبوں کی جانچ پڑتال کرتا رہے کہ مجھ میں مِلکِ وقت کی اطاعت کس قدر ہے اور کوشش کرتا رہے اور خدا تعالیٰ سے دُعا مانگتا رہے کہ کسی مُدخل سے شیطان اُس میں داخل نہ ہو جائے۔ اب اِس سُورۃ میں جو اطاعت کا حکم ہے، وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہے، کیونکہ اصلی اطاعت اُسی کی ہے، مگر والدین، مُرشد و ہادی اور بادشاہِ وقت کی اطاعت کا بھی حکم ہے، کیونکہ اُن کی اطاعت کا حکم خدا ہی نے دیا ہے اور اطاعت کا فائدہ یہ ہوگا کہ خنّاس کے قابُو سے بچ جاؤ گے۔ پس پناہ مانگو کہ خنّاس کی وسوسہ اندازی کے شر سے محفوظ رہو، کیونکہ مومن ایک ہی سُوراخ سے دو مرتبہ نہیں کاٹا جاتا۔ ایک بار جس راہ سے مصیبت آئے دوبارہ اُس میں نہ پھنسو۔ پس اس سُورۃ میں صریح اشارہ ہے کہ بادشاہِ وقت کی اطاعت کرو۔ خنّاس میں خواص اسی طرح ودیعت رکھے گئے ہیں۔ جیسے خدا تعالےٰ نے درخت، پانی، آگ وغیرہ چیزوں اور عناصر میں خواص رکھے ہیں۔ عنصر کا لفظ اصل میں عَنْ سِرٍّ ہے۔ عربی میں ص اور س کا بدل ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ چیز اسرارِ الٰہی میں سے ہے۔ درحقیقت یہاں آکر انسان کی تحقیقات رُک جاتی ہے۔ غرض ہر ایک چیز خدا ہی کی طرف سے ہے۔ خواہ وہ بسائط کی قسم سے ہو خواہ مرکبات کی قسم سے۔ جبکہ یہ بات ہے کہ ایسے بادشاہوں کو بھیج کر اُس نے ہزار ہا مشکلات سے ہم کو چھڑایا اور ایسی تبدیلی بخشی کہ ایک آتشی تنور سے نکال کر ایسے باغ میں پہنچا دیا۔ جہاں فرحت افزا پودے ہیں اور ہر طرف ندیاں جاری ہیں اور ٹھنڈی خوش گوار ہوائیں چل رہی ہیں۔ پھر کس قدر ناشکری ہوگی اگر کوئی اُس کے احسانات کو فراموش کر دے۔ خاص کر ہماری جماعت کو جس کو خدا نے بصیرت دی ہے اور اُن میں نفاق نہیں ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے جس سے تعلق پیدا کیا ہے اُس میں نفاق نہیں ہے شکر گذاری کا بڑا عمدہ نمونہ بننا چاہیے۔

جماعتِ احمدیہ کی ایمانی فراست

مجھے کامل یقین ہے کہ میری جماعت میں نفاق نہیں ہے اور میرے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں اُن کی فراست نے غلطی نہیں کی، اس لیے کہ مَیں درحقیقت وُہی ہوں جس کے آنے کو ایمانی فراست نے سلنے پر متوجہ کیا ہے اور خدا تعالیٰ گواہ اور آگاہ ہے کہ مَیں وہی صادق اور امین اور موعود ہوں جس کا وعدہ لوگوں کو ہمارے سیّد و مولیٰ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دیا گیا تھا، مگر جنھوں نے مجھ سے تعلق پیدا نہیں کیا وُہ اس نعمت سے محرُوم ہیں۔ فراست گویا ایک کرامت ہے۔ یہ لفظ فراست بِفتحِ الفا بھی ہے اور بِکسرِ الفا بھی۔ زبر کے ساتھ اس کے معنی ہیں، گھوڑے پر چڑھنا۔ مومن فراست کے ساتھ اپنے نفس کا چابک سوار ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے اس کو نُور ملتا ہے، جس سے وُہ راہ پاتا ہے۔ اسی لیے رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ۔ یعنی مومن کی فراست سے ڈرو، کیونکہ وُہ نُور اللہ سے دیکھتا ہے۔ غرض ہماری جماعت کی فراستِ حقہ کا بڑا ثبوت یہ ہے

کہ انھوں نے خدا کے نور کو شناخت کیا۔

نیکی کرنیوالوں کے ساتھ نیکی کرو

اسی طرح میں امید رکھتا ہوں کہ ہماری جماعت عملی حالت میں ترقی کرے گی، کیونکہ وہ منافق نہیں اور وہ ہمارے مخالفوں کے اِس طرزِ عمل سے بالکل پاک ہے کہ جب حکام سے ملتے ہیں تو اُن کی تعریفیں کرتے ہیں اور جب گھر میں آتے ہیں تو کافر بتلاتے ہیں۔ سُنو اور یاد رکھو کہ خدا اس طرزِ عمل کو پسند نہیں فرماتا۔ تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو اور محض خدا کے لیے رکھتے ہو۔ نیکی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرو اور بدی کرنے والوں کو معاف کرو۔ کوئی شخص صدیق نہیں ہو سکتا، جبتک کہ وہ یکرنگ نہ ہو۔ جو منافقانہ چال چلتا ہے اور دورنگی اختیار کرتا ہے، وُہ آخر پکڑا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ اس وقت میں ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں اور وُہ یہ ہے کہ سلاطین کو اکثر مہمیں پیش آتی ہیں اور وہ بھی رعایا کے ہی بچاؤ اور حفاظت کے لیے ہوتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہے کہ ہماری گورنمنٹ کو سرحد پر کئی بار جنگ کرنی پڑی ہے۔ گو سرحدی لوگ مُسلمان ہیں، مگر ہمارے نزدیک وہ حق پر نہیں ہیں۔ اُن کا انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنا کسی مذہبی حیثیت اور پہلو سے دُرست نہیں ہے اور نہ وہ حقیقتاً مذہبی پہلو سے لڑتے ہیں۔ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ گورنمنٹ نے مُسلمانوں کو آزادی نہیں دے رکھی۔ بیشک دے رکھی ہے اور ایسی آزادی دے رکھی ہے، جس کی نظیر کابل اور نواحِ کابل میں رہ کر بھی نہیں مل سکتی۔ امیر کے حالات اچھے سُننے میں نہیں آتے۔ ان سرحدی مجنونوں کے لڑنے کی کوئی وجہ بجز پیٹ کے نہیں ہے۔ دس بیس روپے مل جاویں تو وہ غازی پن غرق ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ظالم طبع ہیں جو اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔

بادشاہ اور محسن کے حقوق

اِسلام بادشاہِ وقت اور محسن کے حقوق قائم کرتا ہے۔ یہ دنی الطبع لوگ اپنے پیٹ کی خاطر حدُود اللہ کو توڑتے ہیں اور ان کی رذالت اور سفاہت اور سفاکی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک روٹی کے لیے بآسانی ایک انسان کا خُون کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی آجکل ہماری گورنمنٹ کو ٹرانسوال کی ایک چھوٹی سی جمہوری سلطنت کے ساتھ مقابلہ ہے۔ وہ سلطنت پنجاب سے بڑی نہیں ہے اور یہ سراسر اُس کی حماقت ہے کہ اس قدر بڑی سلطنت کے ساتھ مقابلہ شروع کیا ہے لیکن اس وقت جبکہ مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ ہر ایک مُسلمان کا حق ہے کہ انگریزوں کی کامیابی کے لیے دُعا کرے۔ ہم کو ٹرانسوال سے کیا غرض جس کے ہم پر ہزاروں احسان ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اُس کی خیر خواہی کریں۔ ایک ہمسایہ کے اتنے حقوق ہیں کہ اُس کی تکلیف سُن کر اس کا پتہ پانی ہو جاتا ہے، تو کیا اب ہمارے دلوں کو سرکار انگلشیہ کے وفادار سپاہیوں کے مصائب پڑھ کر صدمہ نہیں پہنچتا۔ میرے نزدیک وہ بڑا سیاہ دل ہے جسے گورنمنٹ کے دُکھ اپنے دُکھ معلوم نہیں ہوتے۔ یاد رکھو۔ جذام کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جذام جسم کو لگ جاتا ہے، جس کو کوڑھ کہتے ہیں۔ اور ایک جذام روح کو لگ جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک شخص بازار میں رہا کرتا تھا۔ اگر کوئی مقدمہ کسی پر ہو جاتا، تو پُوچھا کرتا تھا کہ مقدمہ کی کیا صورت ہے؟ اگر کسی نے کہدیا

کہ وُہ بُری ہوگیا یا اچھی صورت ہے، تو اس پر آفت آجاتی اور چُپ ہو جاتا۔ اگر کوئی کہہ دیتا کہ فردِ قرار دادِ جُرم لگ گئی، تو بہت خوش ہوتا اور اُس کو پاس بٹھا کر سارا قصہ سُنتا۔ غرض بعض آدمیوں کی فطرت میں بداندیشی کا مادہ ہوتا ہے کہ وہ بُری خبریں سُننا چاہتے ہیں اور کسی کی بُرائی پر خوش ہوتے ہیں۔ چونکہ شیطان کی سیرت اُن کے اندر ہوتی ہے۔ پس بدخواہی کسی انسان کی بھی اچھی نہیں۔ چہ جائیکہ محسن کی ہو، لہٰذا میں اپنی جماعت کو کہتا ہوں کہ وہ ایسے لوگوں کا نمونہ اختیار نہ کریں، بلکہ پوری ہمدردی اور سچی خیر خواہی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی کامیابی کے لیے دُعا کریں اور عملی طور پر بھی وفاداری کے نمونے دکھائیں۔

محسن کا شکر کرو

ہم یہ باتیں کسی صِلہ یا انعام کی خاطر نہیں کرتے۔ ہم کو صِلہ اور انعامات اور دُنیاوی خطابات سے کیا غرض۔ ہماری نیّات کو علیم خدا خوب جانتا ہے کہ ہمارا کام محض اُس کے لیے اور اُسی کے امر سے ہے۔ اُس نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ محسن کا شکر کرو۔ ہم اس شکر گذاری میں اپنے مولا کریم کی اطاعت کرتے ہیں اور اسی سے انعام کی امید رکھتے ہیں۔ سو تم جو میری جماعت ہو۔ اپنی محسن گورنمنٹ کی خوب قدر کرو۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ٹرانسوال کی جنگ کے لیے ہم دُعا کریں۔

[اس کے بعد حضرت اقدسؑ نے نہایت جوش اور خلوص کے ساتھ دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور سب حاضرین نے جن کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز تھی۔ دُعا کی۔[1]]

۱۱؍اپریل ۱۹۰۰ء

یوم العرفات کو دُعا

[یوم العرفات کو علی الصُبح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بذریعہ ایک خط کے حضرت مولانا نورالدین صاحب کو اطلاع دی]

"مَیں آج کا دن اور رات کا کچھ قدر حصّہ اپنے اور اپنے دوستوں کے لیے دُعا میں گذارنا چاہتا ہوں، اس لیے وہ دوست جو یہاں موجود ہیں۔ اپنا نام معہ جائے سکونت لکھ کر میرے پاس بھیج دیں، تاکہ دُعا کرتے وقت مجھے یاد رہے"

[اس پر تعمیلِ ارشاد میں ایک فہرست احباب کی ترتیب دے کر حضورؑ کی خدمت میں بھیج دی گئی۔ اس کے بعد اور احباب باہر سے آگئے۔ جنھوں نے زیارت و دُعا کے لیے بے قراری ظاہر کی اور رقعے بھیجنے شروع کر دیئے۔ حضورؑ نے دوبارہ اطلاع بھیجی کہ :

"میرے پاس اب کوئی رقعہ وغیرہ نہ بھیجے۔ اس طرح سخت ہرج ہوتا ہے"

مغرب و عشاء میں حضورؑ تشریف لائے جو جمع کر کے پڑھی گئیں۔ بعد فراغت فرمایا :

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۵ صفحہ ۳ تا ۱۰ مورخہ ۱۰؍فروری ۱۹۰۰ء

"چونکہ مَیں خدا تعالیٰ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ آج کا دن اور رات کا حصّہ دُعاؤں میں گذاروں۔ اس لیے مَیں جاتا ہوں تاکہ تخلّفِ وعدہ نہ ہو۔"

یہ فرما کر حضورؑ تشریف لے گئے اور دُعاؤں میں مشغول ہو گئے۔ دُوسری صُبح عید کے دن مولوی عبدالکریم صاحب نے اندر جا کر تقریر کرنے کے لیے خصُوصیّت سے عرض کی۔ اس پر حضورؑ نے فرمایا: "خدا نے ہی حکم دیا ہے۔" اور پھر فرمایا کہ:

"رات الہام ہوا ہے کہ مجمع میں کچھ عربی فقرے پڑھو۔ مَیں کوئی اور مجمع سمجھتا تھا۔ شاید یہی مجمع ہو۔"

خُطبہ الہامیہ کا نشان

یہ خُطبہ جو اللہ تعالیٰ کے القاء و ایماء کے موافق حضورؑ نے عربی زبان میں پڑھا۔ یہ خُطبہ آیات اللہ میں سے ایک زبردست آیت اور لانظیر نشان ہے جو ایک عظیم الشان گروہ کے سامنے پُورا ہوا۔ اور "خُطبہ الہامیہ" کے نام سے شائع فرما دیا گیا۔

جب حضرت اقدسؑ عربی خُطبہ پڑھنے کے لیے تیار ہوئے، تو حضرت مولوی عبدالکریم صاحب اور حضرت مولوی نورالدین صاحب کو حکم دیا کہ وُہ قریب تر ہو کر اس خُطبہ کو لکھیں۔ جب حضرات مولوی صاحبان تیار ہو گئے، تو حضورؑ نے یَا عِبَادَ اللّٰہِ کے فقرہ سے عربی خطبہ شروع فرمایا۔ اثنائے خُطبہ میں حضرت اقدسؑ نے یہ بھی فرمایا:

"اب لکھ لو پھر یہ لفظ جاتے ہیں۔"

جب حضرت اقدسؑ خُطبہ پڑھ کر بیٹھ گئے، تو اکثر احباب کی درخواست پر مولانا مولوی عبدالکریم صاحب اُس کا ترجمہ سُنانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اس سے پیشتر کہ مولانا موصوف ترجمہ سُنائیں، حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ

"اس خُطبہ کو کل عرفہ کے دن اور عید کی رات میں جو مَیں نے دُعائیں کی ہیں۔ ان کی قبولیت کے لیے نشان رکھا گیا تھا کہ اگر مَیں یہ خُطبہ عربی زبان میں ارتجالاً پڑھ گیا، تو وہ ساری دُعائیں قبول سمجھی جائیں گی۔ الحمدللہ کہ وُہ ساری دُعائیں بھی خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق قبول ہو گئیں۔"

سجدۂ شُکر اور اس کی قبولیت

ابھی مولانا عبدالکریم صاحب ترجمہ سُنا ہی رہے تھے کہ حضرت اقدسؑ فرطِ جوش کے ساتھ سجدۂ شکر میں جا پڑے۔ حضورؑ کے ساتھ تمام حاضرین نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ سجدہ سے سر اُٹھا کر حضرتِ اقدسؑ نے فرمایا:

"ابھی مَیں نے سُرخ الفاظ میں لکھا دیکھا ہے کہ "مُبارک" یہ گویا قبولیت کا نشان ہے۔"[1]

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۱۶۔ صفحہ ۵، ۶ پرچہ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۰ء

۱۲ر اپریل ۱۹۰۰ء

حضرت اقدسؑ کی دلی آرزو

حضرت اقدس امام ہمام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دلی آرزو اور تمنا رہتی ہے کہ ہمارے احباب کو یہاں دارالامان میں بار بار آنے کا موقع ملے اور اس طرح پر یہاں رہ کر ہر ایک شخص کو اپنے تزکیہ نفس اور تصفیۂ باطنی اور تجلیۂ رُوح کے لیے عملی ہدایتیں مل سکیں۔ اس غرض کے پورا کرنے کے لیے آپؑ نے سال میں تین جلسے مقرر کر رکھے ہیں۔ عیدین اور بڑے دن کی تعطیلوں میں۔ روئداد جلسہ عیدالاضحیہ درج ذیل ہے:

آنحضرتؐ اور مسیح موعودؑ کی عیدالاضحیہ سے مناسبت

فرمایا:

"آج عید الضحیٰ کا دن ہے اور یہ عید ایک ایسے مہینے میں آتی ہے، جس پر اسلامی مہینوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یعنی پھر محرم سے نیا سال شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک بہتر کی بات ہے کہ ایسے مہینہ میں عید کی گئی ہے۔ جس پر اسلامی مہینہ کا یا زمانہ کا خاتمہ ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آنے والے مسیحؑ سے بہت مناسبت ہے۔ وہ مناسبت کیا ہے؟ ایک یہ کہ ہمارے نبی کریم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم آخر زمانہ کے نبی تھے اور آپؐ کا وجود باجود اور وقت بعینہٖ گویا عید اضحٰے کا وقت تھا؛ چنانچہ یہ امر مسلمانوں کا بچہ بچہ بھی جانتا ہے کہ آپؐ نبی آخر الزمان تھے اور یہ مہینہ بھی آخر الشہور ہے اس لیے اس مہینہ کو آپؐ کی زندگی اور زمانہ سے مناسبت ہے۔

دُوسری مناسبت۔ چونکہ یہ مہینہ قربانی کا مہینہ کہلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حقیقی قربانیوں کا کامل نمونہ دکھانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ جیسے آپ لوگ بکری، اُونٹ، گائے، دُنبہ ذبح کرتے ہو ایسا ہی وُہ زمانہ گذرا ہے، جب آج سے تیرہ سو سال پیشتر خدا تعالیٰ کی راہ میں انسان ذبح ہوتے۔ حقیقی طور پر عید اضحیٰ وُہی تھی اور اُسی میں ضحیٰ کی روشنی تھی۔

قربانی کی حقیقت

یہ قربانیاں اِس کا لُب نہیں۔ پُوست ہیں۔ رُوح نہیں جسم ہیں۔ اس سہولت اور آرام کے زمانے میں ہنسی خوشی سے عید ہوتی ہے اور عید کی انتہا ہنسی خوشی اور قسم قسم کے تعیشات قرار دیئے گئے ہیں۔ عورتیں اسی روز تمام زیورات پہنتی ہیں۔ عُمدہ سے عُمدہ کپڑے زیبِ تن کرتی ہیں۔ مرد عُمدہ پوشاکیں پہنتے ہیں اور عُمدہ سے عُمدہ کھانے بہم پہنچاتے ہیں اور یہ ایسا مسرت اور راحت کا دن سمجھا جاتا ہے کہ بخیل سے بخیل انسان بھی آج گوشت کھاتا ہے۔ خصوصاً کشمیریوں کے پیٹ تو بکروں کے مدفن ہو جاتے ہیں۔ گو اور لوگ بھی کمی نہیں کرتے۔ الغرض ہر قسم کے کھیل کُود، لہو و لعب کا نام عید سمجھا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ

حقیقت کی طرف مُطلق توجہ نہیں کی جاتی۔

عیدالاضحیہ کی حقیقت

درحقیقت اس دن میں بڑا بھید یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس قربانی کا بیج بویا تھا اور مخفی طور پر بویا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُس کے لہلہاتے کھیت دکھاتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے ذبح کرنے میں خدا تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں دریغ نہ کیا۔ اس میں مخفی طور پر یہی اشارہ تھا کہ انسان ہمہ تن خدا کا ہو جائے اور خدا کے حکم کے سامنے اُس کی اپنی جان، اپنی اولاد، اپنے اقربا و اعزّا کا خون بھی خفیف نظر آوے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں جو ہر ایک پاک ہدایت کا کامل نمونہ تھے کیسی قربانی ہوئی۔ خونوں سے جنگل بھر گئے۔ گویا خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ باپوں نے اپنے بچوں کو، بیٹوں نے اپنے باپوں کو قتل کیا۔ اور وُہ خوش ہوتے تھے کہ اسلام اور خدا کی راہ میں قیمہ قیمہ اور ٹکڑے ٹکڑے بھی کیے جاویں، تو اُن کی راحت ہے۔ مگر آج غور کر کے دیکھو کہ بجز ہنسی اور خوشی اور لہو ولعب کے رُوحانیت کا کونسا حصّہ باقی ہے۔ یہ عیدالاضحیہ پہلی عید سے بڑھ کر ہے اور عام لوگ بھی اس کو بڑی عید تو کہتے ہیں، مگر سوچ کر بتلاؤ کہ عید کی وجہ سے کس قدر ہیں۔ جو اپنے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور رُوحانیت سے حصّہ لیتے ہیں اور اُس روشنی اور نور کو لینے کی کوشش کرتے ہیں جو اس میں رکھا گیا ہے۔ عید رمضان اصل میں ایک مجاہدہ ہے اور ذاتی مجاہدہ ہے اور اس کا نام بذل الروح ہے۔ مگر یہ عید جس کو بڑی عید کہتے ہیں، ایک عظیم الشان حقیقت اپنے اندر رکھتی ہے اور جس پر افسوس ! کہ توجہ نہیں کی گئی۔ خدا تعالیٰ نے جس کے رحم کا ظہور کئی طرح پر ہوتا ہے۔ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایک یہ بڑا بھاری رحم کیا ہے کہ اور اُمتوں میں جس قدر باتیں پوست اور قشر کے رنگ میں تھیں، اُن کی حقیقت اس اُمتِ مرحومہ نے دکھلائی ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں جو خدا تعالیٰ کی یہ چار صفات بیان ہوئی ہیں کہ رَبّ العالمین، رحمٰن، رحیم، مٰلک یوم الدین اگرچہ عام طور پر یہ صفات اس عالم پر تجلّی کرتی ہیں لیکن اُن کے اندر حقیقت میں پیشگوئیاں ہیں جن پر کہ لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ

صفاتِ الٰہیہ کے حقیقی مظہر صرف آنحضرتؐ تھے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان چاروں صفتوں کا نمونہ دکھایا۔ کیونکہ کوئی حقیقت بغیر نمونہ کے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ربّ العالمین کی صفت نے کس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم میں نمونہ دکھایا؟ آپؐ نے عین ضعف میں پرورش پائی۔ کوئی موقع مدرسہ مکتب کا نہ تھا، جہاں آپؐ اپنے رُوحانی اور دینی قویٰ کو نشوونما دے سکتے۔ کبھی کسی تعلیم یافتہ قوم سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا۔ نہ کسی موٹی سوٹی تعلیم کا ہی موقع پایا اور نہ فلسفہ کے باریک اور دقیق علوم کے حاصل کرنے کی فرصت ملی۔ پھر دیکھو کہ باوجود ایسے مواقع کے نہ ملنے کے قرآن شریف ایک ایسی نعمت آپؐ کو دی گئی، جس کے علوم عالیہ اور حقّہ کے سامنے کسی اور علم کی ہستی ہی کچھ نہیں۔ جو انسان ذرا سی سمجھ اور فکر کے ساتھ قرآن کریم کو پڑھے گا،

اس کو معلوم ہو جاوے گا کہ دُنیا کے تمام فلسفے اور علوم اُس کے سامنے ہیچ ہیں اور سب حکیم اور فلاسفر اس سے بہت پیچھے رہ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر دو عظیم الشان نبی گذرے ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دُوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ مگر ان دونوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اُن میں کسی کی نسبت نبیِ اُمّی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ یہ تحدّی اور دعویٰ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہوا؛ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ (الشوریٰ: ۵۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو گویا شاہزادوں کی طرح تعلیم پائی تھی اور فرعون کی گود میں شاہانہ نشوونما پایا۔ اُن کے لیے اتالیق مقرر کیے گئے۔ کیونکہ اس زمانہ میں بھی اتالیق مقرر ہوتے تھے اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فقرنہ ملتا، تو گویا فرعون کے بعد گدی نشین آپؑ ہی تھے اور اگر خدا کا فضل نہ ہوتا، تو نعوذ باللہ آپؑ کو فرعون بھی بننا تھا۔

یاد رہے کہ فرعون کا لفظ بُرا نہیں۔ اصل میں شاہانِ مصر کا یہ لقب تھا۔ جس طرح پر قیصر و کسریٰ شاہانِ رُوم و ایران کا لقب تھا اور جس طرح پر آج زار روس اور سلطانِ رُوم کا لقب ہے۔ میرا مطلب اس بیان سے صرف یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ یہ دُوسرا سلسلہ نہ شروع کر دیتا، تو ضرور تھا کہ وہی تخت نشین ہوتے اور یہ بھی سچی بات ہے کہ گو موسیٰؑ کی ماں کو بھی ایک درد اور دُکھ پہنچا تھا کہ جیتی جان کو دریا میں ڈالا۔ لیکن اُس کی راحت اور مسرت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے۔ جب کہ خود خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ کی واپسی کا اس کو وعدہ دیا تھا۔ الغرض موسیٰؑ کی تعلیم تو یُوں شاہانہ رنگ میں ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم بھی باقاعدہ ہوئی۔ میرے پاس ایک یہودی مصنف کی کتاب ہے۔ اُس نے صاف اور واضح طور پر لکھا ہے، بلکہ مسیح کے اُستاد کا نام تک بتایا ہے اور پھر زِد بھی کی ہے کہ اسی وقت سے توریت اور صحفِ انبیاء کے مضامین انکو پسند آتے تھے اور جو کچھ انجیل میں ہے وہ صحفِ انبیاء سے زائد نہیں۔ اس نے بتلایا ہے کہ ایک مدت دراز تک وہ یہود کے شاگرد رہے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کسی یہودی، نصاریٰ ہندی سے پُوچھو کہ آپؐ نے بھی کہیں تعلیم پائی تھی، تو وہ صاف کہے گا کہ ہرگز نہیں!!! کتنی بڑی ربُوبیت کا مظہر ہے۔ انسان جب بچپن کی حالت سے آگے نکلتا ہے جو بلوغ سے پہلے ہے تو عام طور پر مکتب میں بٹھا دیا جاتا ہے یہ پہلا قدم ہوتا ہے، مگر آپؐ کی زندگی کا پہلا قدم ہی گویا اعجاز تھا، چونکہ آپؐ کو خاتم الانبیاء ٹھہرایا تھا۔ اس لیے آپؐ کے وجود میں حرکات و سکنات میں بھی اعجاز رکھ دیئے تھے۔ آپؐ کی طرزِ زندگی کہ الف۔ بے تک نہیں پڑھا اور قرآن جیسی بےنظیر نعمت لائے اور ایسا عظیم الشان معجزہ اُمّت کو دیا۔ پہلے نبی آتے اور ایک خاص وقت تک دُنیا میں رہ کر چل دیئے اور دین ان کا لعدم ہو گیا۔ اور خدا کو ان کا محو کرنا ہی منظور تھا، مگر اس دین کے اظلال و آثار کا قیام منظور تھا اور چونکہ کوئی دین معجزات کے بدُوں رہ نہیں سکتا؛ ورنہ چند روز تک سماعی باتوں پر یقین رہتا ہے۔ پھر کہہ دیتے ہیں کہ ایسا

جہاں مٹھا تے اگلا کن ڈھٹا۔" اس لیے خدا نے چاہا کہ اسلام کے ساتھ زندہ معجزہ ہو۔

صداقتِ اسلام کا نشان

کس قوت اور تحدّی اور تعیین سے بتایا گیا تھا اور اس ذریعہ سے اسلام کا نور اُبد تک درخشاں ہے؛ چنانچہ اس زندہ نور کی تصدیق کے لیے اس زمانہ میں ہی دیکھو کہ لیکھرام کے قتل ہونے سے پیشتر کہ وہ چھ سال کے اندر ہلاک ہو جاوے گا۔ غور کرو کہ وقت، مدّت، صورتِ موت کا بتا دینا کیا انسان کے اپنے اختیار میں ہے اور پھر وہ اسی طرح مارا گیا جیسا کہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ جب یہ پیش گوئی کی گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کروڑہا انسانوں میں مشہور ہو گئی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، بلکہ ہر قوم وملت کے لوگ اس سے واقف ہو گئے۔ یہانتک کہ عام بازاری لوگوں سے لے کر گورنمنٹ تک کو اطلاع ہو گئی اور خود آریوں نے بڑے زور وشور کے ساتھ مشتہر کیا اور جہاں لیکھرام خود جاتا اس پیشگوئی کا ذکر کرتا اور شہرت دیتا اور جب پیشگوئی پوری ہوئی تو ایک عام شور برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہماری بھی خانہ تلاشی ہوئی۔ تاکہ اس کی صداقت اور شہرت اس خاص ذریعہ سے اور بھی ہو اور یہ نشان ہمیشہ صفحۂ دہر پر ثبت رہے۔ پھر مقدمات کے دوران میں سرکاری کاغذات اور مثلوں میں اس پیشگوئی کے متعلق بیانات اور کاغذات درج اور شامل ہوئے۔ الغرض یہ ایسا عظیم الشان نشان ہے جس کی نظیر کوئی قوم دکھلا نہیں سکتی۔ کیا کسی انسانی طاقت اور فراست کا کام ہے کہ وہ کسی کی نسبت چار دن کی خبر بھی دے کہ فلاں وقت پر فلاں موت سے مر جاوے گا۔ مگر یہاں چھ سال پہلے وقت، صورتِ موت وغیرہ سے اطلاع دی گئی؛ حالانکہ وہ تیس برس کا ایک مضبوط جوان آدمی تھا اور اس نے بھی تو میری نسبت کہا کہ میں تین سال کے اندر ہیضہ سے مر جاؤں گا اور میں اُس کی نسبت عمر میں بہت بڑا اور ضعیف اور قریباً دائم المریض تھا، مگر خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ کی چمکار دکھلائی اور اس کو ہلاک کر کے اپنے سچے دین کی صداقت پر مُہر کر دی۔

آریوں میں خداشناسی نہیں

اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو آریہ کہلاتے ہیں۔ اصلاً خدا کو پہچانتے ہی نہیں۔ پھر اُن میں خداشناسی اور خدا بینی اور خدا نمائی کی قوت کیونکر پیدا ہو۔ اُن کا تو پہلا قدم ہی غلط ہے۔ اُن کے نزدیک تو مرنا جینا، عورت یا مرد ہونا، بکری یا بیل بننا یہ سب کچھ شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے۔ جبکہ یہ جسم اور اشیاء اعمال ہی کا نتیجہ ہیں تو پھر خدا کیا اور اس کے وجود کے اثبات کے لیے نئے نئے نشان اور معجزات کیا اور اُن کی ضرورت ہی کیا رہی۔ ان کا مذہب ہے کہ خدا پیدا کرنے والا نہیں۔ بلکہ صرف جوڑنے جاڑنے والا ہے۔ جیسے معمار یا کمہار ہوتے ہیں۔ مادہ موجود تھا۔ ارواح بھی اتفاق سے موجود تھیں۔ پرمیشر نے جھٹ جوڑ جاڑ کر مخلوق بنالی۔ نعوذ باللہ۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ جبکہ ارواح اور ذرات قدیم سے موجود ہیں تو اس پر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جوڑنا جاڑنا پرمیشر کے بدوں نہ ہو، بلکہ طبعی طور پر دلیل تو یہ ملتی ہے کہ اشیاء کو طبعی طور پر تجاذب کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اگر یہ تجاذب اور کشش نہ ہو۔ تو نہ اینٹ بن سکے اور نہ مکان رہ سکے اور نہ کوئی

اور چیز دُنیا میں موجود بوجود رہ سکے پس جبکہ آریہ لوگوں کے عقیدہ کے موافق رُوح اور مادہ قدیم سے ہیں اور طبیعات سے دلیل ملتی ہے کہ یہ تجاذب کا خاصہ ہے تو آریوں کو پرمیشر سے تو فراغت اور فرصت ہوگئی۔ اب آریہ کے پاس پرمیشر کے ہونے کا کیا ثبوت اور نشان ہے۔

ایک طرف تو یہ ناپاکی ہے کہ خدا ہی کا پتہ نہیں۔ چہ جائیکہ خدا شناسی اور خدا نمائی کی راہیں بیان کر سکیں۔ پھر یہ ظلم عظیم کہ ہر قسم کی چیزوں میں رُدمیں اعمال کا بدلہ پانے کے لیے آتی ہیں کبھی سوٗر بنتے ہیں کبھی کتا، کبھی بلی وغیرہ۔

تناسخ اس پر سوال ہوتا ہے کہ اگر کسی کی ماں مرجائے جبکہ وہ ابھی بچہ ہی تھا۔ اور اس نے دُوسری کسی جگہ پر جنم لیا اور جب دونوں بلوغ کو پہنچے اور باہم رشتہ ناطہ ہو کر بیاہ ہو گیا اور ہم بستری ہو کر اولاد کا سلسلہ چلا۔ اس سے تو بڑی بے شرمی اور پرلے درجہ کی بے حیائی کی بنیاد پڑی اور نہایت قابلِ شرم مذہب یہ مذہب ٹھہر گیا۔ پرمیشر نے کوئی فہرست تو دی نہیں کہ اس قسم کے نشان سے ماں بہن شناخت ہو جائے گی اور حق تو یہ تھا کہ وید کے ذمّہ یہ فرض تھا کہ جہاں اُس نے یہ پاکیزگی اور اخلاق کی جڑھ کاٹنے والا مسئلہ ایجاد کیا تھا۔ اگر اُسے کوئی سوجھ اور سوچ بچار کی طاقت ہوتی تو ساتھ ہی علامات بھی بیان کر دیتا۔ جس سے ایسے رشتوں سے اجتناب کرنے کی کلید ہاتھ میں آریوں کے آجاتی، مگر ضروری تھا کہ وید کی تعلیم کی پیشانی پر نقص کا داغ لگا رہتا تا کہ ہر زمانہ میں تدبّر کرنے والے اس کے بطلان میں پہچانے جا سکیں۔ ایک طرف تو یہ حال ہے کہ نانی اور نانی کی بھی پڑنانی تک کے رشتہ میں ناطہ نہیں کرتے۔ اور ہم لوگوں میں جو چچا یا ماموں کی بیٹی سے رشتہ کرتے ہیں۔ اس پر اعتراض کرتے ہیں، مگر دُوسری طرف آپ ماں بہن کے بیاہ لانے پر کوئی دلیل نہیں دیتے۔ یا تو ہزاروں کوس چلے گئے۔ یا ماں بہن بیاہ لائے۔ کسی قوم میں ایسا اندھیر نہیں۔ افسوس ان کے پرمیشر نے اُن کو ناپاکی میں تو ڈال دیا اور پھر کوئی فہرست بھی نہ دی اور نہ بتلایا کہ فلاں گدھے یا بیل سے کام نہ لینا۔ یہ تیرے فلاں رشتہ دار ہیں۔ اور فلاں فلاں علامت والی عورت سے رشتہ نہ کرنا کہ وہ تیری حقیقی ماں یا دادی یا خالہ یا بہن یا بھتیجی جنم لے کر دوبارہ آئی ہے۔ اصل میں یہ لوگ تو معذور ہیں۔ یہ سارا ظلم پرمیشر کی گردن پر ہے جس نے فہرست نہ دی۔

نیوگ پھر تیسری ناپاکی جو ویدوں کی تعلیم کا عرق اور گلِ سرسبد بتائی گئی ہے۔ نیوگ ہے۔ جس کی تفسیر یہ ہے کہ ایک عورت جیتے جاگتے خاوند کے رُوبرو گیارہ آدمیوں سے ہمبستر ہو سکتی ہے۔ اگر مرد عورت جوان ہوں اور چند سال شادی پر گذر جائیں اور اولاد نہ ہو، تو دُوسرے کا نُطفہ لینے کے لیے عورت اُس سے ہمبستر ہو۔ اس لیے کہ بدُوں اولاد کے سُرگ کا ملنا محال ہے۔ اور دیوث شوہر کو لازم ہے کہ بیرج داتا کے لیے عمدہ معجونات اور لطیف مقویات تیار کرلے تاکہ وُہ تھک نہ جائے اور کوئی ضعف اُسے لاحق نہ ہو جائے اور وید کی رُو سے بستر، رضائی اور چارپائی سب اُسی کی ہو۔ اور غذا بھی اُسی کی کھا دے اور نصف بچے بھی لے لے۔ سوچو!

یہ کیسا خاوند ہے کہ ایک کوٹھڑی میں آپ دیّوث ہے اور دُوسری کوٹھڑی میں اس کی بیاہتا بیوی غیر مرد سے مُنہ کالا کرا رہی ہے اور آریہ ان کی حرکات کی آوازیں سُنتا ہے اور دل میں خوش ہو رہا ہے کہ اب اِس پانی سے اُس کی امید کا کھیت ہرا بھرا ہو جائے گا۔ حیف ایسے مذہب پر! خدا پر یہ ظلم!! عزّت و آبرو پر یہ ظلم!!! وید ایسے کاموں کی اجازت دیتا ہے کہ ناپاک سے ناپاک آدمی بھی اُن کے ارتکاب سے شرم کرتے ہیں۔ دیانند نے لکھا ہے کہ یہ شُبھ کرم یعنی مبارک کام بیچ میں ترک ہو گیا تھا۔ اب آریہ ورت کے آریہ جاری کریں کہ اس میں ثواب ملتا ہے۔ ہم کو ضرورت نہیں کہ اس کو طول دیں۔ آریوں کی کتبِ مذہبی اور معتقدات کو کوئی دیکھے اور خود انہی بزرگوں سے پُوچھ دیکھے۔ امید ہے کہ بڑے فخر سے اس فعلِ عجیب کی خُوبیاں بیان کریں گے۔

اسلام کی پاکیزہ تعلیم

اِن تمام مذاہب کو سامنے رکھ کر اور ان کی تعلیمات اور عقائد کی خُوب چھان بین کر کے اسلام کی ضرورت اور عزّت محسوس ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کے عظیم فضل کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ اُس نے اسلام کو ایسے ناپاک عقیدوں سے پاک رکھا اور اُس کی تعلیم کے ہر شعبہ میں کمال اور اعجاز کا جلوہ دکھایا؛ چنانچہ موسیٰ علیہ السّلام کی تعلیم میں قصاص پر بڑا زور تھا کہ دانت کے بدلے دانت، کان کے بدلے کان۔ آنکھ کے بدلے آنکھ ہو اور مسیح علیہ السّلام کی تعلیم میں اس بات پر زور تھا کہ بدی کا مقابلہ نہ کیا جاوے۔ اگر کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دُوسری بھی پھیر دے۔ کوئی ایک کوس بیگار میں لے جائے، تو دو کوس چلا جاوے۔ کُرتہ مانگے تو چادر بھی دے دے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب ہم کو دکھلاؤ کہ کیا کوئی پادری اِس پر عمل بھی کرتا ہے۔ کوئی کسی پادری کے مُنہ پر طمانچہ مار کر دیکھ لے۔ یقیناً دوسرا گال پھیرنے کی بجائے کچہری میں گھسیٹ کرلے جائے گا اور ہر قسم کے جھُوٹ اور فریب سے سزا دلانے کی فکر کریگا، مگر اسلام نے یہ تعلیم نہیں دی بلکہ وہ پاک تعلیم دی جو دنیا کی جان ہے اور انسان فِطرتاً اس پر عمل کرتا ہے اور وہ یہ ہے:

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ: ۴۱)

یعنی بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے، لیکن اگر کوئی عفو کرے، مگر وہ عفو بے محل نہ ہو، بلکہ اس عفو سے اصلاح مقصود ہو، تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ مثلاً اگر چور کو چھوڑ دیا جاتے تو وہ دلیر ہو کر ڈاکہ زنی کریگا۔ اس کو سزا ہی دینی چاہیے۔ لیکن اگر دو نوکر ہوں اور ایک اُن میں سے ایسا ہو کہ ذرا سی چشم نمائی ہی اُس کو شرمندہ کر دیتی اور اس کی اصلاح کا موجب ہوتی ہو، تو اُس کو سخت سزا مناسب نہیں۔ مگر دُوسرا عمداً شرارت کرتا ہے، اس کو عفو کریں تو بگڑتا ہے۔ اُس کو سزا ہی دی جاوے۔ تو بتاؤ مناسب حکم وُہ ہے جو قرآن کریم نے دیا ہے یا وہ جو انجیل پیش کرتی ہے؟ قانونِ قدرت کیا چاہتا ہے؟ وہ تقسیم و رؤیت محل چاہتا ہے۔ یہ تعلیم کہ عفو سے اصلاح مدِنظر ہو، ایسی تعلیم ہے جس کی نظیر نہیں اور اسی پر آخر متمدّن انسان کو چلنا پڑتا ہے اور یہی تعلیم ہے جس پر عمل کرنے سے انسان میں قوّتِ اجتہاد اور تدبّر

اور فراست بڑھتی ہے۔ گویا یُوں کہا گیا ہے کہ ہر طرح کی شہادت سے دیکھو اور فراست سے غور کرو۔ اگر عفو سے فائدہ ہو تو معاف کرو، لیکن اگر خبیث اور شریر ہے تو پھر جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا پر عمل کرو۔ اسی طرح پر اسلام کی دُوسری پاک تعلیمات ہیں جو ہر زمانہ میں روزِ روشن کی طرح ہیں۔ آفتاب پر بھی کسی وقت بادل آجاتا ہے اور بظاہر ایک قسم کا دُھندلا سا نظر آتا ہے، لیکن اسلام کا چہرہ اس سے بھی مصفّا ہے۔ عدمِ معرفت نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے اور بُغض کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے ہوتیا بند کی حالت سے بھی گئے گزرے ہیں۔ پھر کیا فیصلہ کریں۔

عیسائیت کے عقائد

جس قدر مذہب دُنیا میں موجود ہیں۔ سب کے سب بے برکت اور بے نُور اور مُردہ ہیں اور پاک تعلیم سے بے بہرہ محض ہیں۔ ہندوؤں نے مذہب کا وہ نمونہ دکھایا۔ عیسائیوں نے یہ نمونہ دکھایا کہ ایک عاجز بندہ کو خدا بنا دیا۔ جس نے یہودیوں جیسی تباہ حال قوم سے جو ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ (البقرہ : ۶۲) کی مصداق تھی۔ ماریں کھائیں اور آخر صلیب پر لٹکایا گیا اور اُن کے عقیدہ کے موافق ملعون ہو کر اِیْلِیْ اِیْلِیْ لِمَا سَبَقْتَنِیْ کہتے ہوئے جان دے دی۔ غور تو کرو کیا ایسی صفات والا کبھی خدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو خدا پرست بھی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وہ خود خدا ہو۔ عیسائی دکھاتے ہیں کہ اُس کی وہ ساری رات کی پُرسوز دُعا محض بے اثر گئی۔ اس سے زیادہ بے برکتی کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے اور اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ دُوسروں کے لیے شفیع ہو سکتا ہے۔ ہم کو یاد نہیں کہ دو گھنٹے بھی دُعا کے لیے ہوں اور وُہ دُعا قبول نہ ہوئی ہو۔ ابن اللہ بلکہ خود خدا کا معاذاللہ یہ حال ہے کہ ساری رات رو رو کر چلا چلا کر خود بھی دُعا کرتا رہا اور دُوسروں سے بھی دُعا کراتا رہا اور کہتا رہا کہ اے خدا تیرے آگے کوئی چیز اَنہونی نہیں۔ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ ٹل جاتے۔ مگر وُہ دُعا قبول ہی نہیں ہوئی۔ اگر کوئی کہے کہ وُہ کفّارہ ہونے کے واسطے آئے تھے، اس لیے یہ دُعا قبول نہیں ہوئی ہے ہم کہتے ہیں کہ جب اُن کو معلوم تھا کہ وُہ کفّارہ کے لیے آئے ہیں۔ پھر اس قدر بُزدلی کے کیا معنی ہیں۔ اگر ایک افسر طاعُون کی ڈیوٹی پر بھیجا جائے اور وہ کہدے کہ یہاں خطرے کا محل ہے۔ مجھے فلاں جگہ بھیج دو تو کیا وہ احمق نہ سمجھا جائے گا۔ جبکہ مسیح کو معلوم تھا کہ وہ صرف کفّارہ ہی ہونے کو بھیجے گئے ہیں۔ تو اس قدر لمبی دعاؤں کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی کیا کفّارہ زیرِ تجویز امر تھا یا ایک مقرر شدہ امر تھا۔ غرض ایک داغ ہو۔ دو داغ ہوں جس پر بے شمار داغ ہوں، کیا وُہ خدا ہو سکتا ہے؟ خدا تو کیا وُہ عظیم الشان انسان بھی نہیں ہو سکتا۔

یہودیت

یہودی بے چارے خود ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ کے مصداق۔ اُن کی وُہ حالت تھی کہ صورت ہیں حالش مپرس۔ دُنیا پرستی کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ ہمارے یہاں ایک اسرائیلی محمد سلطان مسلمان ہوا ہے اُس سے پُوچھو۔ یہودیوں نے کھانے پینے کے سوا اور کوئی مقصود ہی نہیں رکھا۔ خدا کی قدرت ہے جب ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ کی حالت آئی تو وہ افعال بھی آگئے جو ذلّت کے جالب اور ذلّت کے نتائج تھے۔ اگر وُہ

تائب ہو جاتے تو پھر ضُرِبَتْ کیونکر صادق آتا۔ اس پیشگوئی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شامت اعمال اُن کے گلے کا ہار ہی رہے گی۔ مرد صالح کے ساتھ ذلّت اور بے رزقی نہیں ہوتی۔ خدا کا نام عزیز ہے۔ خدا میں ہو کر زندگی بسر کرنیوالا ذلیل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہودیوں کی زندگی اگر ناپاکیوں کا مجموعہ نہ تھی تو پھر ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کی مار اُن پر کیونکر پڑتی؟ اس پر خوب غور کرو۔ اس کے اندر یہ مخفی اسرار ہیں اور پتہ ملتا ہے کہ یہودی قوم کے اطوار بگڑ جائیں گے۔

اب ان مذاہب پر نظر ڈال کر صدقِ دل سے بتاؤ کہ کیا اسلام کے سوا کوئی اور طریق ہے جس سے تمہارے دل ٹھنڈے ہو سکتے ہیں۔ کیا ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کے مصداق یہودیوں سے کوئی روشنی اور نُور پا سکتے ہو؟ کیا ایسے عیسائی جو ایک عاجز، کمزور ناتواں نامُراد انسان کو خدا بناتے ہیں، کوئی کامیابی کسی کو دے سکتے ہیں جس کی اپنی ساری رات کی دُعائیں اکارت اور بیہودہ گئی ہیں، وُہ دوسروں کی دعاؤں پر کون سے ثمرات مُرتّب کر سکتا ہے؟ جو خود اِيْلِيْ اِيْلِيْ لِمَا سَبَقْتَنِيْ کہہ کر اقرار کرتا ہے کہ خدا نے اُسے چھوڑ دیا، وُہ دوسروں کو کب خدا سے ملا سکتا ہے؟

زندہ برکات صرف اسلام میں ہیں

دیکھو اور غور سے سُنو! یہ صرف اسلام ہی ہے جو اپنے اندر برکات رکھتا ہے اور انسان کو مایُوس اور نامُراد ہونے نہیں دیتا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اُس کے برکات اور زندگی اور صداقت کے لیے نمونہ کے طور پر کھڑا ہوں۔ کوئی عیسائی نہیں جو یہ دکھا سکے کہ اسکا کوئی تعلق آسمان سے ہے۔ وہ نشانات جو ایمان کے نشان ہیں اور مومن عیسائی کے لیے مقرر ہیں۔ کہ اگر پہاڑ کو کہیں تو جگہ سے ٹل جاوے۔ اب پہاڑ تو پہاڑ۔ کوئی عیسائی نہیں جو ایک اُلٹی ہوئی جُوتی کو سیدھا کر دکھاوے۔ مگر میں نے اپنے پُرزور نشانوں سے دکھایا ہے اور صاف صاف دکھایا ہے کہ زندہ برکات اور زندہ نشانات صرف اسلام کے لیے ہیں۔ میں نے بیشمار اشتہار دیئے ہیں اور ایک مرتبہ سولہ ہزار ۱۶۰۰۰ اشتہار شائع کیے اب ان لوگوں کے ہاتھ میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جھوٹے مقدمات کیے اور قتل کے الزام دیئے۔ اور اپنی طرف سے ہمارے ذلیل کرنے کے منصوبے گانٹھے، مگر عزیز خدا کا بندہ ذلیل کیونکر ہو سکتا ہے۔ جس میں ان لوگوں نے ہماری ذلّت چاہی۔ اُسی ذلّت سے ہمارے لیے عزّت نکلی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الجمعہ: ۵) دیکھو۔ اگر کلارک کا مقدمہ نہ ہوتا تو ابراء کا الہام کیونکر پُورا ہوتا۔ جو مقدمہ سے بھی پہلے سینکڑوں انسانوں میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ اسلام ہی ہے جس کے ساتھ معجزات اور ثبوت ہیں۔ اسلام دُوسرے چراغ کا محتاج نہیں، بلکہ خود ہی چراغ ہے اور اس کے ثبوت ایسے اجلیٰ بدیہیات ہیں کہ اُن کا نمونہ کسی مذہب میں نہیں۔ غرض اسلام کی کوئی تعلیم ایسی نہ ہو گی جس کا نمُونہ موجُود نہ ہو۔

آنحضرتؐ صفاتِ الٰہی کا مظہر ہیں

میں نے سُورۃ الفاتحہ (جس کو اُمّ الکتاب اور مثانی بھی کہتے ہیں اور قرآن شریف کی عکسی تصویر اور خلاصہ ہے) کے صفاتِ اربعہ

میں دکھانا چاہا ہے کہ وُہ چاروں نمونے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں اور خدا تعالیٰ نے رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں اُن صفاتِ اربعہ کا نمونہ دکھایا۔ گویا وہ صفات دعویٰ تھیں اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود بطور دلیل کے ہے ؛ چنانچہ ربُوبیّت کا آپؐ کے وجود میں کیسا ثبوت دیا کہ مکّہ کے جنگلوں کا سرگردان اور دس برس تک حیران پھرنے والا جس کے لیے کوئی راہ کھُلی نظر نہ آتی تھی۔ اُس کی تربیت کا کس کو خیال تھا کہ اسلام رُوئے زمین پر پھیل جائے گا اور اُس کے ماننے والے ۹ کروڑ تک پہنچیں گے۔ مگر آج دیکھو کہ دُنیا کا کوئی آباد قطعہ ایسا نہیں جہاں مسُلمان نہیں۔ پھر الرّحمٰن کی صِفت کو دیکھو جس کا منشا یہ ہے کہ عمل کے بدُوں کامیابی اور ضروریات کے سامان بہم پہنچائے کیسی رحمانیت تھی کہ آپؐ کے آنے سے پیشتر ہی استعدادیں پیدا کر دیں۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بچوں کی طرح کھیلتا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ جو کافروں کے گھر میں پیدا ہوا تھا اور ایسا ہی اور بہت سے صحابہ آپؐ کے ساتھ ہو گئے۔ گویا اُن کو آپؐ کے لیے رحمانیتِ الٰہی نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا اور اس قدر امُور رحمانیت کے اسلام کے ساتھ ہیں کہ ہم اُن کو مفصّل بیان بھی نہیں کر سکتے۔ اُمیّت رحمانیت کو چاہتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا (الجمعۃ: ۳) رحمانیت کا منشا اس ضرب المثل سے خُوب ظاہر ہے:

”کر دے کرا دے اور اُٹھانے والا ساتھ دے“

اور یہ ظہورِ اسلام کے ساتھ ہوا۔ اسلام گویا خدا کی گود میں بچہ ہے۔ اُس کا سارا کام کاج سنوارنے والا اور اُس کے سارے لوازم بہم پہنچانے والا خود خدا ہے۔ کسی مخلوق کا بارِ احسان اُس کی گردن پر نہیں۔ اسی طرح رحیم جو محنتوں کو ضائع نہ کرے۔ اُس کے خلاف یہ ہے کہ محنت کرتا رہے اور ناکام رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رحیمیّت کا اظہار دیکھو۔ کیسے واضح طور پر ہوا۔ کوئی ایسی لڑائی نہیں جس میں فتح نہ پائی ہو۔ تھوڑا کام کر کے بہت اجر پایا۔ بجلی کے کوندنے کی طرح فتوحات چمکیں۔ فتوحات الشّام، فتوحات المِصر ہی دیکھو۔ صفحۂ تاریخ میں کوئی ایسا انسان نہیں جس نے صحیح معنوں میں کامیابی پائی ہو۔ جیسے کامیابیاں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملیں۔

صحابہؓ نے دنیا میں کامیابی حاصل کی

پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جزا سزا کا مالِک، اچھے کام کرنے والوں کو جزا دی جادے ؛ اگرچہ کامل طور پر یہ آخرت کے لیے ہے اور سب قومیں جزا و سزا کو آخرت ہی پر ڈالتی ہیں، مگر خدا تعالیٰ نے اس کا نمونہ اسلام کے لیے اس دُنیا میں رکھا۔ ابوبکرؓ جو دوپہر کی دُھوپ میں گھربار مال و متاع چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور جس نے ساری جائداد کو دیکھ کر کہدیا۔ برباد شُد، برباد باشد۔ سب سے انقطاع کر کے ساتھ ہی ہو لیا تھا۔ اُس نے یہ مزہ پایا کہ آپؐ کے بعد سب سے پہلا خلیفہ بلا فصل یہی ہوا۔ حضرت عمرؓ جو صدق اخلاص سے بھر گئے تھے اُنھوں نے یہ مزہ پایا کہ اُن کے بعد خلیفہ ثانی ہوئے۔ غرض اس طرح پر ہر ایک صحابی نے پُوری عزت پائی۔ قیصر و کسریٰ کے اموال اور شاہزادیاں

اُن کے ہاتھ آئیں۔ لکھا ہے کہ ایک صحابی کسریٰ کے دربار میں گیا۔ ملازمانِ کسریٰ نے سونے چاندی کی کرسیاں بچھوا دیں اور اپنی شان و شوکت دکھائی۔ اُس نے کہا کہ ہم اس مال کے ساتھ فریفتہ نہیں ہوتے۔ ہم کو تو وعدہ دیا گیا ہے کہ کسریٰ کے کڑے بھی ہمارے ہاتھ آجائیں گے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وُہ کڑے ایک صحابی کو پہنا دیئے تاکہ وُہ پیشگوئی پوری ہو۔

اِسلام کا جادۂ اعتدال

مذہبِ اسلام چونکہ اعتدال پر واقع ہوا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیم یہی دی ہے اور مغضوب اور ضالین سے بچنے کی ہدایت فرمائی۔ ایک سچا مُسلمان نہ مغضوب ہوسکتا ہے نہ ضالین کے زُمرہ میں شامل ہوسکتا ہے۔ مغضُوب وُہ قوم ہے جس پر خدا تعالیٰ کا غضب بھڑکا۔ چونکہ وہ خود غضب کرنے والے تھے، اس لیے خدا کے غضب کو کھینچ لائے اور وُہ یہودی ہیں اور ضال سے مُراد عیسائی ہیں۔

غضب کی کیفیت قوتِ سبعی سے پیدا ہوتی ہے اور ضلالت وہمی قوت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہمی قوت حد سے زیادہ محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ بیجا محبت والا انسان بہک جاتا ہے حُبُّكَ الشَّيْئَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ اِس کا مبدء اور منشا قوتِ وہمی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ چادر کو بیل سمجھتا ہے اور رسّی کو سانپ بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شاعر نے اپنا معشوق ایسا قرار نہیں دیا، جو دُوسروں سے بڑھ کر نہ ہو۔ ہر ایک کے واہمہ نے نئی تصویر ایجاد کی۔

قوتِ بہیمی میں جوش ہو کر انسان جادۂ اعتدال سے نکل جاتا ہے، چنانچہ غضب کی حالت میں درندہ کا جوش بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً کُتا پہلے آہستہ آہستہ بھونکتا ہے پھر کو ٹھا سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ آخر کار درندے طیش میں آکر نوچتے اور پھاڑ کھاتے ہیں۔ یہود نے بھی اسی طرح ظُلم و تعدّی کی بُری عادتیں اختیار کیں اور غضب کو حد تک پہنچا دیا۔ آخر خود مغضُوب ہوگئے۔ قوتِ وہمی کو جب استیلاء ہوتا ہے، تو انسان رسّی کو سانپ بناتا اور درخت کو ہاتھی بتلاتا ہے۔ اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ قوت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی واسطے عیسائی مذہب اور بُت پرستی کا بڑا سہارا عورتیں ہیں۔ غرض اسلام نے جادۂ اعتدال پر رہنے کی تعلیم دی، جس کا نام اَلصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ ہے۔

مَیں اب چند فقرے عربی میں سُناؤں گا۔ کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مجمع میں کچھ عربی فقرے بولنے کا حکم دیا تھا۔ پہلے مَیں نے خیال کیا کہ شاید کوئی اور مجمع ہوگا۔ جس میں یہ خدا کی بات پُوری ہو، مگر خدا تعالیٰ مولوی عبدالکریم صاحب کو جزائے خیر دے کہ اُنھوں نے تحریک کی اور اس تحریک سے زبردست قوت دل میں پیدا ہوئی۔ اور اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور نشان آج پورا ہو۔[1]"

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۱۴ صفحہ ۲-۸ مورخہ ۱۷ر اپریل ۱۹۰۰ء

[مولانا عبدالکریم صاحب نے عرض کیا کہ حضور! کچھ جماعت کے باہمی اتفاق و محبت پر بھی فرمایا جاوے۔ اس پر حضرت اقدسؑ نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی:

باہم اتفاق و محبت

"جماعت کے باہم اتفاق و محبت پر مَیں پہلے بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ تم باہم اتفاق رکھو اور اجتماع کرو۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہی تعلیم دی تھی کہ تم وجودِ واحد رکھو؛ ورنہ ہوا نکل جائے گی۔ نماز میں ایک دُوسرے کے ساتھ جُڑ کر کھڑے ہونے کا حکم اسی لیے ہے کہ باہم اتحاد ہو۔ برقی طاقت کی طرح ایک کی خیر دُوسرے میں سرایت کرے گی۔ اگر اختلاف ہو، اتحاد نہ ہو۔ تو پھر بے نصیب رہوگے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپس میں محبت کرو اور ایک دُوسرے کے لیے غائبانہ دُعا کرو۔ اگر ایک شخص غائبانہ دعا کرے تو فرشتہ کہتا ہے کہ تیرے لیے بھی ایسا ہو۔ کیسی اعلیٰ درجہ کی بات ہے۔ اگر انسان کی دُعا منظور نہ ہو، تو فرشتہ کی تو منظور ہی ہوتی ہے۔ مَیں نصیحت کرتا ہوں اور کہنا چاہتا ہوں کہ آپس میں اختلاف نہ ہو۔

مَیں دو ہی مسئلے لے کر آیا ہوں۔ اوّل خدا کی توحید اختیار کرو۔ دُوسرے آپس میں محبت اور ہمدردی ظاہر کرو۔ وُہ نمونہ دکھلاؤ کہ غیروں کے لیے کرامت ہو۔ یہی دلیل تھی جو صحابہؓ میں پیدا ہوئی تھی۔ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (آل عمران: ۱۰۴) یاد رکھو! تالیف ایک اعجاز ہے۔ یاد رکھو! جبتک تم میں ہر ایک ایسا نہ ہو کہ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وُہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرے، وُہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ وُہ مصیبت اور بلا میں ہے۔ اُس کا انجام اچھا نہیں۔ مَیں ایک کتاب بنانے والا ہوں۔ اس میں ایسے تمام لوگ الگ کر دیئے جائیں گے جو اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ کسی بازیگر نے دس گز کی چھلانگ ماری ہے۔ دُوسرا اُس پر بحث کرنے بیٹھتا ہے اور اس طرح پر کینہ کا وجود پیدا ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو بغض کا جُدا ہونا مہدی کی علامت ہے اور کیا وہ علامت پُوری نہ ہوگی۔ وُہ ضرور ہوگی۔ تم کیوں صبر نہیں کرتے۔ جیسے طبی مسئلہ ہے کہ جبتک بعض امراض میں قلع قمع نہ کیا جاوے، مرض دفع نہیں ہوتا۔ میرے وجُود سے انشاء اللہ ایک صالح جماعت پیدا ہوگی۔ باہمی عداوت کا سبب کیا ہے۔ بخل ہے، رعونت ہے، خود پسندی ہے اور جذبات ہیں۔ مَیں نے بتلایا ہے کہ مَیں عنقریب ایک کتاب لکھوں گا اور ایسے تمام لوگوں کو جماعت سے الگ کر دُوں گا۔ جو اپنے جذبات پر قابُو نہیں پا سکتے اور باہم محبت اور اخوت سے نہیں رہ سکتے۔ جو ایسے ہیں وُہ یاد رکھیں کہ وہ چند روزہ مہمان ہیں۔ جبتک کہ عمدہ نمُونہ نہ دکھائیں۔ مَیں کسی کے سبب سے اپنے اُوپر اعتراض لینا نہیں چاہتا۔ ایسا شخص جو میری جماعت میں ہو کر میرے منشاء کے موافق نہ ہو، وُہ خشک ٹہنی ہے۔ اُس کو اگر باغبان کاٹے نہیں تو کیا کرے۔ خشک ٹہنی دُوسری سبز شاخ کے ساتھ رہ کر پانی تو چُوستی ہے، مگر وُہ اُس کو سرسبز نہیں کر سکتا، بلکہ وُہ شاخ دُوسری کو بھی لے بیٹھتی ہے۔ پس ڈرو میرے ساتھ وہ نہ رہے گا جو اپنا علاج نہ کرے گا۔ چونکہ یہ سب باتیں مَیں کتاب میں مفصل

لکھوں گا۔ اس لیے اب مَیں چند عربی فقرے کہہ کر فرض ادا کرتا ہوں[1]۔

دو انگریزوں کا قتل[2]

علاقہ پشاور میں اِن دنوں کسی سفاک پٹھان نے دو بے گناہ انگریزوں کو قتل کر دیا۔ اس پر ایک مجمع میں حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"یہ جو دو انگریزوں کو مار دیا ہے۔ یہ کیا جہاد کیا ہے؟ ایسے نابکار لوگوں نے اسلام کو بدنام کر رکھا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان لوگوں کی ایسی خدمت کرتا اور ایسے عمدہ طور پر ان سے برتاؤ کرتا کہ وُہ اُس کے اخلاق اور حسنِ سلوک کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتے۔ مومن کا کام تو یہ ہے کہ اپنی نفسانیت کو کچل ڈالے۔ لکھا ہے کہ حضرت علیؓ ایک کافر سے لڑے۔ حضرت علیؓ نے اُس کو نیچے گرا لیا اور اُس کا پیٹ چاک کرنے کو تھے کہ اُس نے حضرت علیؓ پر تھوکا۔ حضرت علیؓ یہ دیکھ کر اُس کے سینے پر سے اُتر آئے۔ وُہ کافر حیران ہوا اور پُوچھا کہ اے علیؓ! یہ کیا بات ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ میرا جنگ تیرے ساتھ خدا کے واسطے تھا، لیکن جب تُو نے میرے مُنہ پر تھوکا، تو میرے نفس کا بھی کچھ حصّہ مِل گیا۔ اس پر مَیں نے تجھے چھوڑ دیا۔ حضرت علیؓ کے اس فعل کا اُس پر بڑا اثر ہوا۔

مَیں جب کبھی اِن لوگوں کی بابت ایسی خبریں سُنتا ہوں تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کریم سے بہت دُور جا پڑے ہیں اور بے گناہ انسانوں کا قتل ثواب کا موجب سمجھتے ہیں۔

بعض مولوی مجھے اس لیے دجال کہتے ہیں کہ مَیں انگریزوں کے ساتھ محاربہ جائز نہیں رکھتا مگر مجھے سخت افسوس ہے کہ یہ لوگ مولوی کہلا کر اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ کوئی ان سے پُوچھے کہ انگریزوں نے تمہارے ساتھ کیا بُرائی کی ہے۔ اور کیا دُکھ دیا ہے۔ شرم کی بات ہے کہ وُہ قوم جس کے آنے سے ہم کو ہر قسم کی راحت اور آرام ملا۔ جس نے آکر ہم کو سِکھوں کے خونخوار پنجہ سے نجات دی اور ہمارے مذہب کی اشاعت کے لیے ہر قسم کے مواقع اور سہولتیں دیں۔ اُن کے احسان کا یہ شکر ہے کہ بے گناہ انگریزی افسروں کو قتل کر دیا جائے؟ مَیں تو صاف طور پر کہتا ہوں کہ وہ لوگ جو خونِ ناحق سے نہیں ڈرتے اور محسن کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ وہ خدا تعالیٰ کے حضور سخت جوابدہ ہیں۔ اِن مولویوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وُہ اپنے جمہوری اتفاق سے اس مسئلہ کو اچھی طرح شائع کریں اور ناواقف اور جاہل لوگوں کو فہمائش کریں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے زیرِ سایہ وُہ امن اور آزادی سے زندگی بسر کرتے ہیں اور اُس کے عطیات سے ممنونِ منّت اور مرہونِ احسان ہیں اور یہ مبارک سلطنت نیکی اور ہدایت پھیلانے میں کامل مددگار ہے۔ پس اُس کے خلاف محاربہ کے خیالات رکھنے سخت بغاوت ہے اور یہ قطعی حرام ہے۔ وُہ اپنے قلم اور زبان سے جاہلوں کو سمجھائیں اور اپنے دین کو بدنام کر کے دُنیا کو ناحق کا ضرر نہ پہنچائیں۔ ہم تو گورنمنٹ برطانیہ کو آسمانی برکت سمجھتے

---

[2] الحکم جلد ۴ نمبر ۱۴ صفحہ ۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء

ہیں اور اُس کی قدر کرنا اپنا فرض۔

افسوس ہے مولویوں نے خود تو اس کام کو کیا نہیں اور ہم نے جب ان جاہلانہ خیالات کو دلوں سے مٹانا چاہا، تو ہم کو دجال کہا۔ صرف اس واسطے کہ ہم محسن گورنمنٹ کے شکرگذار ہیں۔ مگر اُن کی مخالفت ہمارا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ ہم نے بیسیوں رسالے اس مضمون کے عربی، فارسی، اُردو، انگریزی میں شائع کیے اور ہزاروں اشتہار مختلف بلاد وامصار میں تقسیم کر دیئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ گورنمنٹ سے ہم کوئی عزت چاہتے ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ہم اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور اگر ہم کو اس خدمت کے بجالانے میں تکلیف بھی ہو تو ہم پروا نہیں کرتے، کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ احسان کی جزا احسان ہے۔ پس پوری اطاعت اور وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کی مسلمانوں کا فرض ہے۔[1]"

مئی ۱۹۰۱ء

انبیاء میں ہمدردی کا جوش

نبی کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ قوتِ قدسی ہوتی ہے اور اُن کے دل میں لوگوں کی ہمدردی، نفع رسانی اور عام خیرخواہی کا بیتاب کر دینے والا جوش ہوتا ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (الشعراء: ۴) یعنی کیا تُو اپنی جان کو ہلاک کر دیگا اس خیال سے کہ وُہ مومن نہیں ہوتے؟ اس کے دو پہلو ہیں ایک کافروں کی نسبت کہ وُہ مسلمان کیوں نہیں ہوتے۔ دُوسرا مسلمانوں کی نسبت کہ اُن میں وہ اعلیٰ درجہ کی رُوحانی قوت کیوں پیدا نہیں ہوتی۔ جو آپؐ چاہتے ہیں؛ چونکہ ترقی تدریجاً ہوتی ہے۔ اس لیے صحابہ کی ترقیاں بھی تدریجی طور پر ہوئی تھیں، مگر انبیاء کے دل کی بناوٹ بالکل ہمدردی ہی ہوتی ہے اور پھر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو جامع جمیع کمالاتِ نبوت تھے۔ آپؐ میں یہ ہمدردی کمال درجہ پر تھی۔ آپؐ صحابہ کو دیکھ کر چاہتے تھے۔ کہ پوری ترقیات پر پہنچیں۔ لیکن یہ عروج ایک وقت پر مقدر تھا۔ آخر صحابہ نے وہ پایا جو دُنیا نے کبھی نہ پایا تھا۔ اور وہ دیکھا جو کسی نے نہ دیکھا تھا۔

سارا مدار مجاہدہ پر ہے

سارا مدار مجاہدہ پر ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۷۰) جو لوگ ہم میں ہو کر کوشش کرتے ہیں۔ ہم اُن کے لیے اپنی تمام راہیں کھول دیتے ہیں۔ مجاہدہ کے بدُوں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظر میں چور کو قطب بنا دیا۔ دھوکے میں پڑے ہوتے ہیں اور ایسی ہی باتوں نے لوگوں کو

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۰-۱۱ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء

ہلاک کر دیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی کی جھاڑ پھونک سے کوئی بزرگ بن جاتا ہے۔

جو لوگ خدا کے ساتھ جلدی کرتے ہیں، وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ دُنیا میں ہر چیز کی ترقی تدریجی ہے۔ رُوحانی ترقی بھی اسی طرح ہوتی ہے اور بدُوں مجاہدہ کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور مجاہدہ بھی وہ ہو جو خدا تعالیٰ میں ہو۔ یہ نہیں کہ قرآن کریم کے خلاف خود ہی بے فائدہ ریاضتیں اور مجاہدہ جوگیوں کی طرح تجویز کر بیٹھے۔ یہی کام ہے، جس کے لیے خدا نے مجھے مامور کیا ہے تاکہ میں دُنیا کو دکھلاؤں کہ کس طرح پر انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ نہ سب محروم رہتے ہیں اور نہ سب ہدایت پاتے ہیں۔[1]"

۱۴ر مئی ۱۹۰۰ء

صُحبتِ صالحین کی غرض

بات یہ ہے کہ مُردوں سے مدد مانگنے کے طریق کو ہم نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ ضعیف الایمان لوگوں کا کام ہے کہ مُردوں کی طرف رجُوع کرتے ہیں اور زندوں سے دُور بھاگتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں لوگ اُن کی نبوت کا اِنکار کرتے رہے اور جس روز انتقال کر گئے تو کہا کہ آج نبوت ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی مُردوں کے پاس جانے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ بلکہ كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ : ۱۱۹) کا حکم دے کر زندوں کی صُحبت میں رہنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو بار بار یہاں آنے اور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اور ہم جو کسی دوست کو یہاں رہنے کے واسطے کہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ محض اس کی حالت پر رحم کر کے ہمدردی اور خیر خواہی سے کہتے ہیں۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ ایمان دُرست نہیں ہوتا جب تک انسان صاحبِ ایمان کی صُحبت میں نہ رہے اور یہ اس لیے کہ چونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک ہی وقت میں ہر قسم کی طبیعت کے موافقِ حال تقریر ناصح کے مُنہ سے نہیں نکلا کرتی۔ کوئی وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس کی سمجھ اور فہم کے مطابق اُس کے مذاق پر گفتگو ہو جاتی ہے۔ جس سے اُس کو فائدہ پہنچ جاتا ہے اور اگر آدمی بار بار نہ آئے اور زیادہ دِنوں تک نہ رہے، تو ممکن ہے کہ ایک وقت ایسی تقریر ہو جو اُس کے مذاق کے موافق نہیں ہے۔ اور اُس سے اُس میں بدُدلی پیدا ہو اور وُہ حسنِ ظن کی راہ سے دُور جا پڑے اور ہلاک ہو جاوے۔

غرض قرآن کریم کے منشاء کے موافق تو زندوں ہی کی صُحبت میں رہنا ثابت ہوتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۱۶ صفحہ ۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۰ء

مدد خدا تعالیٰ سے ہی مانگنی چاہیئے

اور استعانت کے متعلق یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل استمداد کا حق اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اور اسی پر قرآن کریم نے زور دیا ہے، چنانچہ فرمایا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (الفاتحہ: ۵) پہلے صفات الٰہی ربّ، رحمٰن، رحیم، مالکِ یوم الدین کا اظہار فرمایا۔ پھر سکھایا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ یعنی عبادت بھی تیری کرتے ہیں اور استمداد بھی تجھ سے ہی چاہتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اصل حق استمداد کا اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ کسی انسان، حیوان، چرند پرند غرضیکہ کسی مخلوق کے لیے، نہ آسمان پر نہ زمین پر، یہ حق نہیں ہے، مگر ہاں دُوسرے درجہ پر ظلّی طور سے یہ حق اہل اللہ اور مردانِ خدا کو دیا گیا ہے۔ ہم کو نہیں چاہیے کہ کوئی بات اپنی طرف سے بنالیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمُودہ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کے اندر اندر رہنا چاہیے۔ اسی کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ اور یہ امر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے بھی بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کے پہلے حصّے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا محبوب و معبُود اور مطلُوب اللہ تعالیٰ ہی ہونا چاہیے۔

رسالتِ محمّدیہ کی حقیقت

دُوسرے حصّے سے رسالتِ محمّدیہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حقیقت کا اظہار ہو۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسالت میں ایک امر ظاہر ہوتا ہے اور ایک مخفی ہوتا ہے مثلاً لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ایک کلمہ ہے جسے رسالت مآب نے بایں الفاظ لوگوں کو پہنچایا ہے۔ لوگ مانیں یا نہ مانیں۔ یعنی رسالت کا کام صرف پہنچا دینا تھا۔ مگر رسالت کے یہ ظاہری معنی ہیں۔ ہم جب اور زیادہ غور کرکے بطُون کی طرف جاتے ہیں، تو اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ بطور ایک جزوِ غیر منفک کے شامل ہوتی ہے۔ یہ صُورت ابلاغ تک ہی محدود نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی قوّتِ قدسیّہ کے زور سے اس تبلیغ کو باثر بنانے میں لانظیر نمونہ دکھایا ہے۔

نبی کی مادرانہ عطوفت

اور قرآن کریم سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ آپؐ کو کس قدر سوزش اور گدازش لگی ہوتی تھی، چنانچہ فرمایا۔ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (الشعراء: ۴) یعنی کیا تُو اپنی جان کو ہلاک کردے گا اِس فکر میں کہ یہ مومن کیوں نہیں بنتے۔ یہ سچّی بات ہے کہ ہر نبی صرف لفظاً کرنہیں آتا، بلکہ اپنے اندر وُہ ایک دَرد اور سوز و گداز بھی رکھتا ہے، جو اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ہوتا ہے۔ اور یہ دَرد اور اضطراب کبھی بناوٹ سے نہیں ہوتا، بلکہ فطرتاً اضطراری طور پر اس سے صادر ہوتا ہے، جیسے ایک ماں اپنے بچے کی پرورش میں مصروف ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے اُس کو حکم بھی دیا جاوے کہ اگر وُہ اپنے بچّے کو دُودھ نہ بھی دے اور اس طرح پر اُس کے ایک دو بچّے مر بھی جاویں تو اس کو معاف ہیں اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ تو کیا بادشاہ کے ایسے حکم پر کوئی ماں خوش ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ بادشاہ کو گالیاں دے

گی اور دُودھ دینے سے رُک سکتی ہی نہیں۔ یہ بات اس کی طبیعت میں طبعًا موجود ہے اور دُودھ دینے میں اس کو کبھی بھی بہشت میں جانا یا اُس کا معاوضہ پانا مرکوز اور ملحوظ نہیں ہوتا اور یہ جوش طبعی ہے جو اُس کو فطرت نے دیا ہے۔ ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی، تو چاہیے تھا کہ جانوروں کی مائیں بکری، بھینس یا گائے یا پرندوں کی مائیں اپنے بچّوں کی پرورش سے علیحدہ ہو جاتیں۔ ایک فطرت ہوتی ہے، ایک عقل ہوتی ہے اور ایک جوش ہوتا ہے۔ ماؤں کا اپنے بچّوں کی پرورش میں مصروف ہونا یہ فطرت ہے۔ اسی طرح پر ماموریں جو آتے ہیں اُن کی فطرت میں بھی ایک بات ہوتی ہے۔ وُہ کیا؟ مخلوق کے لیے دلسوزی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے لیے ایک گداز شں۔ وہ طبعی طور پر چاہتے ہیں کہ لوگ ہدایت پا جاویں اور خدا تعالیٰ میں زندگی حاصل کریں۔

پس یہ وُہ سِر ہے جو لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے دُوسرے حصّہ میں یعنی اظہار رسالت محمدیہ میں رکھا ہوا ہے۔ جیسے پیغام پہنچانے والے عام طور پر پیغام پہنچا دیتے ہیں اور اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اس پر عمل ہو یا نہ ہو۔ گویا وُہ تبلیغ صرف کان ہی تک محدود ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ماموریِن الٰہی کان تک بھی پہنچاتے ہیں اور اپنی قُدسی قوت کے زور اور ذریعہ سے دل تک بھی پہنچاتے ہیں اور یہ بات کہ جذب اور عقدِ ہمت ایک انسان کو اس وقت دیا جاتا ہے جبکہ وہ خدا تعالیٰ کی چادر کے نیچے آجاتا ہے اور ظلُّ اللہ بنتا ہے۔ پھر وہ مخلوق کی ہمدردی اور بہتری کے لیے اپنے اندر ایک اضطراب پاتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مرتبہ میں کُل انبیاء علیہم السلام سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے آپؐ مخلوق کی تکلیف دیکھ نہیں سکتے تھے؛ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (التوبہ: ۱۲۸) یعنی یہ رسُول تمہاری تکالیف کو دیکھ نہیں سکتا۔ وہ اس پر سخت گراں ہیں اور اُسے ہر وقت اس بات کی تڑپ لگی رہتی ہے کہ تم کو بڑے بڑے منافع پہنچیں۔ ان ساری باتوں کو یکجائی طور پر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اوّل خدا تعالیٰ مدد دیتا ہے۔ پھر دُوسرے درجہ پر ماموُرمن اللہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں جوش ڈالا ہے اور وہ اِسی جوش اور تقاضائے فطرت کے ساتھ مخلوق کی بہتری میں ہر ایک قسم کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے ماں اپنے بچّے کو دُودھ دیتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اس لیے کہ والدہ کا نفس مزکّی نہیں ہے اور یہ مزکّی النفس لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں کو صادقین اس آیت كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ میں فرمایا گیا ہے۔

منعم علیہ گروہ

اب مَیں سُورۃ فاتحہ کی طرف رُجوع کرکے کہتا ہوں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ: ۶) میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی راہ طلب کی گئی ہے اور مَیں نے کئی مرتبہ یہ بات بیان کی ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں چاروں گروہوں کا ذکر ہے۔ نبی۔ صدیق، شہید، صلحاء۔ پس جبکہ ایک مومن یہ دُعا مانگتا ہے، تو ان کے اخلاق اور عادات اور علُوم کی درخواست کرتا ہے۔ اس پر اگر ان

چارگروہوں کے اخلاق حاصل نہیں کرتا، تو یہ دُعا اُس کے حق میں بے ثمر ہوگی اور وُہ بے جان لفظ بولنے والا حیوان ہے۔
یہ چار طبقے ان لوگوں کے ہیں، جنہوں نے خدا تعالیٰ سے علومِ عالیہ اور مراتبِ عظیمہ حاصل کئے ہیں۔ نبی وہ ہوتے ہیں جن کا تبتّل اِلی اللہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وُہ خدا سے کلام کرتے اور وحی پاتے ہیں اور صدیق وہ ہوتے ہیں جو صدق سے پیار کرتے ہیں۔ سب سے بڑا صدق لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور پھر دُوسرا صدق مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ وُہ صدق کی تمام راہوں سے پیار کرتے ہیں اور صدق ہی چاہتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو شہید کہلاتے ہیں۔ وُہ گویا خدا تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ شہید وُہی نہیں ہوتا جو قتل ہو جائے۔ کسی لڑائی یا وبائی امراض میں مارا جائے، بلکہ شہید ایسا قوی الایمان انسان ہوتا ہے، جس کو خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہ ہو۔ صالحین وہ ہوتے ہیں جن کے اندر سے ہر قسم کا فساد جاتا رہتا ہے۔ جیسے تندرست آدمی جب ہوتا ہے، تو اُس کی زبان کا مزہ بھی دُرست ہوتا ہے۔ پُورے اعتدال کی حالت میں تندرست کہلاتا ہے۔ کسی قسم کا فساد اندر نہیں رہتا۔ اسی طرح پر صالحین کے اندر کسی قسم کی رُوحانی مرض نہیں ہوتی اور کوئی مادہ فساد کا نہیں ہوتا۔ اُس کا کمال اپنے نفس میں نفی کے وقت ہے اور شہید، صدیق، نبی کا کمال ثبوتی ہے۔ شہید ایمان کو ایسا قوی کرتا ہے۔ گویا خدا کو دیکھتا ہے۔ صدیق عملی طور پر صدق سے پیار کرتا اور کذب سے پرہیز کرتا ہے اور نبی کا کمال یہ ہے کہ وہ رداتے الٰہی کے نیچے آجاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کمال کسی دُوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے اور مولوی یا علماء کہتے ہیں کہ بس ظاہری طور پر کلمہ پڑھ لے اور نماز روزہ کے احکام کا پابند ہو جاوے۔ اس سے زیادہ ان احکام کے ثمرات اور نتائج کچھ نہیں اور نہ ان میں کچھ حقیقت ہے۔ یہ بڑی بھاری غلطی ہے اور ایمانی کمزوری ہے۔ اُنھوں نے رسالت کے مدعا کو نہیں سمجھا۔

مامُورین کی غرض

اللہ تعالیٰ جو مامُوروں اور مُرسلوں کو خلق اللہ کی ہدایت کے واسطے بھیجتا ہے۔ کیا اس لیے بھیجتا ہے کہ لوگ اُن کی پرستش کریں۔ نہیں۔ بلکہ اُن کو نمونہ بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بادشاہ اپنے مُلک کے کارگروں کو کوئی تلوار دے تو اس کی مُراد یہی ہے کہ وُہ بھی ویسی تلوار بنانے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو مامُور اور مُرسل ہوتے ہیں۔ اخلاقِ فاضلہ اور اوصافِ حمیدہ سے متصف بناتا ہے۔ اور دُنیا کی طرف مامُور کرتا ہے، تا لوگ اُن کے اخلاق اور کمالات سے حصہ لیں اور اسی طرز و روش پر چلیں۔ کیونکہ یہ لوگ اُس وقت تک فائدہ پہنچاتے ہیں، جب تک زندہ ہوں۔ گذرنے کے بعد تبتّل ہو جاتا ہے۔ اس واسطے صُوفی لوگ کہتے ہیں کہ زندہ بلی مُردہ شیر سے بہتر ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے: آلٓـرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ (ھود: ۲) الف سے مراد اللہ اور لٓ سے مراد جبرائیل اور رٓ سے مُراد رُسل ہیں۔

چونکہ اس میں یہی قصہ ہے کہ کونسی چیزیں انسانوں کو ضروری ہیں، اس لیے فرمایا کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ یہ کتاب ایسی ہے کہ اُس کی آیات پکی اور استوار ہیں۔

اِستحکام کتاب اللہ

قرآن کریم کی تعلیموں کو اللہ تعالیٰ نے کئی طرح پر مستحکم کیا ہے تاکہ کسی قسم کا شک نہ ہے۔ اور اسی لیے شروع میں فرمایا لَا رَیْبَ فِیْہِ (البقرہ ۳:) یہ استحکام کئی طور پر کیا گیا ہے۔

اوّلاً۔ قانونِ قدرت سے استواری اور استحکام قرآنی تعلیموں کا کیا گیا۔ جو کچھ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے، قانونِ قدرت اُس کو پوری مدد دیتا ہے۔ گویا جو قرآن میں ہے وُہی کتاب مکنون میں ہے۔ اِس کا راز انبیاء علیہم السّلام کی پیروی کے بدوں سمجھ میں نہیں آسکتا اور یہی وُہ سِر ہے جو لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ (الواقعہ ۸۰:) میں دکھا گیا ہے۔ غرض پہلے قرآنی تعلیم کو قانونِ قدرت سے مستحکم کیا ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفت وحدہٗ لاشریک بتلائی۔ جب ہم قانونِ قدرت میں نظر کرتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ ضرور ایک ہی خالق و مالک ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ دل بھی اسے ہی مانتا ہے اور دلائلِ قدرت سے بھی اسی کا پتہ لگتا ہے، کیونکہ ہر ایک چیز جو دُنیا میں موجود ہے وہ اپنے اندر کرُویت رکھتی ہے۔ جیسے پانی کا قطرہ اگر ہاتھ سے چھوڑیں، تو وہ کرُوی شکل کا ہوگا اور کرُوی شکل توحید کو مُستلزم ہے اور یہی وجہ ہے کہ پادریوں کو بھی ماننا پڑا کہ جہاں تثلیث کی تعلیم نہیں پہنچی وہاں کے رہنے والوں سے توحید کی پرسش ہوگی۔ چنانچہ پادری فنڈر نے اپنی تصنیفات میں اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دُنیا میں نہ بھی ہوتا، تب بھی ایک ہی خدا کی پرستش ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم کا بیان صحیح ہے، کیونکہ اُس کا نقش انسانی فطرت اور دل میں موجود ہے اور دلائلِ قدرت سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ برخلاف اس کے انجیلی تثلیث کا نقش نہ دل میں ہے نہ قانونِ قدرت اس کا مؤیّد ہے۔

یہی معنے ہیں کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ کے۔ یعنی قانونِ قدرت سے اُس کی تعلیموں کو ایسا مستحکم اور استوار کیا گیا ہے کہ مُشرک وعیسائی کو بھی ماننا پڑا کہ انسان کے مادۂ فطرت سے توحید کی بازپرس ہوگی۔

دوسری وجہ استحکام کی خدا تعالیٰ کے نشانات ہیں، کوئی نبی، کوئی مامور دُنیا میں ایسا نہیں آتا جس کے ساتھ تائیداتِ الٰہی شامل نہ ہوں اور یہ تائیدات اور نشانات ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ بہت پُرشوکت اور پُرقوّت تھے۔ آپؐ کے حرکات سکنات میں، کلام میں نشانات تھے۔ گویا آپؐ کا وجُود از سرتاپا نشاناتِ الٰہی کا پُتلا تھا۔

تیسرا استحکام نبی کا پاک چال چلن اور راستبازی ہے یہ منجملہ ان باتوں کے ہے جو عقلمندوں کے نزدیک امین ہونا بھی ایک دلیل ہے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس سے دلیل پکڑی۔

چوتھا احکام جو ایک زبردست درجہ استواری اور استحکام کی ہے۔ نبی کی قوتِ قدسیہ ہے۔ جس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ جیسے طبیب خواہ کتنا ہی دعویٰ کرے کہ میں ایسا ہوں اور ویسا ہوں اور اس کو سندیں خواہ نوکِ زبان ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر لوگوں کو اُس سے فائدہ نہ پہنچے تو یہی کہیں گے کہ اُس کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ اسی طرح پر نبی کی قوتِ قدسی جس قدر زبردست ہو۔ اُسی قدر اُس کی شان اعلیٰ اور بلند ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے استحکام کے لیے یہ پشتیبان بھی سب سے بڑا پشتیبان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی اس درجہ پر پہنچی ہے کہ اگر تمام انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں دیکھیں، تو معلوم ہوگا کہ کسی نے آپؐ کے مقابلہ میں کچھ نہیں کیا۔ یہودی دُنیا کے کُتّے ہیں۔ عیسائیوں کو دیکھو تو وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے چشمے سے دُور جا پڑے۔ کوئی حضرت مریمؑ کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی مسیحؑ کو خدا جانتا ہے اور دُنیا پرستی ہی شب و روز کا شغل اور کام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کردہ جماعت کو اگر دیکھا جاوے، تو وہ ہمہ تن خدا ہی کے لیے نظر آتے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں کوئی نظیر نہیں رکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُبارک اور کامیاب زندگی کی تصویر یہ ہے کہ آپؐ ایک کام کے لیے آئے اور اُسے پُورا کر کے اس وقت دُنیا سے رُخصت ہوئے جس طرح بندوبست والے پُورے کاغذات پانچ برس میں مرتب کر کے آخری رپورٹ کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ اُس دن سے لے کر جب قُمْ فَاَنْذِرْ (المدثر: ۳) کی آواز آئی پھر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ (النصر: ۲) اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ: ۴) کے دن تک نظر کریں، تو آپؐ کی لانظیر کامیابی کا پتہ ملتا ہے۔ اِن آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ خاص طور پر مامور تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو اپنی زندگی میں وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی جو اُن کی رسالت کا منتہا تھی۔ وہ ارضِ مقدس اور مُوعود سرزمین کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکے، بلکہ راہ ہی میں فوت ہو گئے۔ کافر کب مان سکتا ہے۔ اور ایک بے ایمان آدمی راہ میں فوت ہو جانے اور وعدہ کی زمین میں نہ پہنچ سکنے کی وُجوہات کب سننے لگا۔ وُہ تو یہی کہے گا کہ اگر مامُور تھے، تو وہ وعدے زندگی میں کیوں پُورے نہ ہوئے۔ سچی بات یہی ہے کہ سب نبیوں کی نبوّت کی پردہ پوشی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی۔

تصویر یسُوع

ایسا ہی مسیح علیہ السلام کی زندگی پر نظر کرو۔ ساری رات خود دُعا کرتے رہے۔ دوستوں سے کراتے رہے۔ آخر شکوہ پر اُتر آئے اور اِيْلِي اِيْلِي لِمَا سَبَقْتَنِي بھی کہہ دیا۔ یعنی اے میرے خدا! تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ اب ایسی حسرت بھری حالت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مامُور من اللہ ہے۔ جو نقشہ پادریوں نے مسیح کی آخری حالت کا جما کر دکھایا ہے، وُہ تو بالکل مایُوسی بخشتا ہے۔

لافیں تو اتنی تھیں کہ خدا کی پناہ اور کام کچھ بھی نہ کیا۔ ساری عمر میں کُل ایک سَو بیس آدمی تیار کیے اور وہ بھی ایسے پست خیال اور کم فہم جو خدا کی بادشاہت کی باتوں کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے اور سب سے بڑا مصاحب جس کی بابت یہ فتویٰ تھا کہ جو زمین پر کرے، آسمان پر ہوتا ہے اور بہشت کی کُنجیاں جس کے ہاتھ میں تھیں، اُسی نے سب سے پہلے لعنت کی۔ اور وہ جو امین اور خزانچی بنایا ہوا تھا جس کو چھاتی پر لٹاتے تھے، اُسی نے تیس درم لے کر پکڑوا دیا۔ اب ایسی حالت میں کب کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسیحؑ نے واقعی ماموریت کا حق ادا کیا۔

اور اس کے مقابل ہمارے نبی کریمؐ کا کیسا پکا کام ہے اس وقت سے جب سے کہا کہ میں ایک کام کرنے کے لیے آیا ہوں جبتک یہ نہ سُن لیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (المائدہ: ۴) آپؐ دُنیا سے نہ اُٹھے۔ جیسے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (الاعراف: ۱۵۹) اس دعوے کے مناسبِ حال یہ ضروری تھا کہ کُل دُنیا کے مکر و مکاید متفق طور پر آپؐ کی مخالفت میں کیے جاتے۔ آپؐ نے کس حوصلہ اور دلیری کے ساتھ مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا کہ فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا (ہود: ۵۶) یعنی کوئی دقیقہ مکر کا باقی نہ رکھو۔ سارے فریب مکر استعمال کرو۔ قتل کے منصوبے کرو۔ اِخراج اور قید کی تدبیریں کرو، مگر یاد رکھو سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ (القمر: ۴۶) آخر فتح میری ہے۔ تمھارے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ تمھاری ساری جماعتیں منتشر اور پراگندہ ہو جاویں گی اور پیٹھ دے کر بھاگیں گی۔ جیسے وہ عظیم الشان دعویٰ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا کسی نے نہیں کیا اور جیسے فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ یہ بھی کسی کے مُنہ سے نہ نکلا سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ یہ الفاظ اسی کے مُنہ سے نکلے جو خدا تعالیٰ کے سائے کے نیچے الوہیت کی چادر میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔

غرض ان وجوہات پر ایک اجنبی آدمی بھی نظر ڈالے تو اُس کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے صاف اور واضح طور پر کتاب اللہ کو مضبوط و مستحکم فرمایا ہے۔ اگر کوئی قانونِ قدرت پر نظر کرتا ہے، تو قول اور فعل کو باہم مطابق پاتا ہے۔ پھر اگر خوارق پر نظر کرتا ہے تو اِس قدر کثرت سے ہیں کہ حدِ شمار سے باہر ہیں۔ یہانتک کہ آپؐ کا قول و فعل اور حرکات و سکنات سب خوارق ہیں۔ قوّتِ قُدسیہ کو دیکھتا ہے تو صحابہ کرامؓ کی پاک تبدیلی حیرت میں ڈالتی ہے۔ پھر کامیابی کو دیکھتا ہے تو دُنیا بھر کے ماموروں اور مُرسلوں سے بڑھ کر تھے۔

اِن وجوہاتِ احکامِ آیات کے علاوہ میرے نزدیک اور بھی بہت سے وجوہات ہیں۔ منجملہ ان کے ایک آلرٰ کے لفظ رٰ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ لفظ مجدّدوں اور مُرسلوں کے سلسلۂ جاریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو قیامت تک جاری ہے۔ اب اس سلسلہ میں آنیوالے مجدّدوں کے خوارق ان کی کامیابیوں، ان کی پاک تاثیروں وغیرہ وجوہات احکامِ آیات کو گن بھی نہیں سکتے۔

متبعین کی کامیابیاں متبوع کی ہی کامیابیاں ہوتی ہیں

اور یہ سب خوارق اور کامیابیاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے متبعین مجددوں کے ذریعہ سے ہوئیں اور قیامت تک ہوں گی، درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی کامیابیاں ہیں۔ غرض ہر صدی کے سر پر مجدد کا آنا صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ مُردوں سے استمداد خدا تعالیٰ کی منشاء کے موافق نہیں۔ اگر مُردوں سے مدد کی ضرورت ہوتی، تو پھر زندوں کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہزاروں ہزار جو اولیاء اللہ پیدا ہوئے ہیں اس کا کیا مطلب تھا؟ مجددین کا سلسلہ کیوں جاری کیا جاتا؟ اگر اسلام مُردوں کے حوالے کیا جاتا تو یقیناً سمجھو کہ اس کا نام و نشان مِٹ گیا ہوتا۔ یہودیوں کا مذہب مُردوں کے حوالے کیا گیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ عیسائیوں نے مُردہ پرستی سے بتلاؤ کیا پایا؟ مُردوں کو پُوجتے پُوجتے خود مُردہ ہو گئے۔ نہ مذہب میں زندگی کی رُوح رہی نہ ماننے والوں میں زندگی کے آثار باقی رہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک مُردوں ہی کا مجمع ہو گیا۔

اسلام کا حیّ و قیّوم خدا

اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اسلام کا خدا حیّ و قیّوم خدا ہے۔ پھر وُہ مُردوں سے پیار کیوں کرنے لگا۔ وہ حیّ و قیّوم خدا تو بار بار مُردوں کو جِلاتا ہے۔ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الحدید: ۱۸) تو کیا مُردوں کے ساتھ تعلق پیدا کر کر جِلاتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اسلام کی حفاظت کا ذمہ اسی حیّ و قیّوم خدا نے إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر: ۱۰) کہہ کر اُٹھایا ہوا ہے۔ پس ہر زمانہ میں یہ دین زندوں سے زندگی پاتا ہے اور مُردوں کو جِلاتا ہے۔ یاد رکھو اس میں قدم قدم پر زندے آتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی تفصیل

پھر فرمایا ثُمَّ فُصِّلَتْ۔ ایک تو وُہ تفصیل ہے، جو قرآنِ کریم میں ہے۔ دُوسری یہ کہ قرآنِ کریم کے معارف و حقائق کے اظہار کا سلسلہ قیامت تک دراز کیا گیا ہے۔ ہر زمانے میں نئے معارف اور اسرار ظاہر ہوتے ہیں فلسفی اپنے رنگ میں، طبیب اپنے مذاق پر، صُوفی اپنے طرزِ بیان کرتے ہیں اور پھر یہ تفصیل بھی حکیم و خبیر خدا نے رکھی ہے۔ حکیم اس کو کہتے ہیں کہ جن چیزوں کا علم مطلوب ہو وہ کامل طور پر ہو اور پھر عمل بھی کامل ہو۔ ایسا کہ ہر ایک چیز کو اپنے اپنے محل و موقع پر رکھ سکے۔ حکمت کے معنی وَضْعُ الشَّيْءِ فِي مَحَلِّهِ اور خبیر مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی ایسا وسیع علم کہ کوئی چیز اس کی خبر سے باہر نہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مجید کو خاتم الکتب ٹھہرایا تھا اور اس کا زمانہ قیامت تک دراز تھا۔ وُہ خُوب جانتا تھا کہ کس طرح پر یہ تعلیمیں ذہن نشین کرنی چاہئیں، چنانچہ اسی کے مطابق تفاصیل کی ہیں۔ پھر اس کا سلسلہ جاری رکھا کہ جو مجدد و مصلح احیاءِ دین کے لیے آتے ہیں، وُہ خود مفصّل آتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا خلاصہ اور مغز

اس کے بعد ایک عجیب بات سوال مقدّر کے جواب کے طور پر بیان کی ہے یعنی اس قدر تفاصیل جو بیان کی جاتی ہیں۔ ان کا خلاصہ اور

مقرر کیا ہے اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (ہود: ۳) خدا تعالیٰ کے سوا ہرگز ہرگز کسی کی پرستش نہ کرو۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کی علتِ غائی یہی عبادت ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت: ۵۷)۔

عبادت کی حقیقت

عبادت اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ انسان ہر قسم کی قساوت، کجی کو دُور کرکے دل کی زمین کو ایسا صاف بنادے، جیسے زمیندار زمین کو صاف کرتا ہے۔ عرب کہتے ہیں مَوْرٌ مُعَبَّدٌ جیسے سُرمہ کو باریک کرکے آنکھوں میں ڈالنے کے قابل بنالیتے ہیں۔ اسی طرح جب دل کی زمین میں کوئی کنکر، پتھر، ناہمواری نہ رہے اور ایسی صاف ہو کہ گویا رُوح ہی رُوح ہو۔ اس کا نام عبادت ہے؛ چنانچہ اگر یہ دُرستی اور صفائی آئینہ کی کی جاوے، تو اس میں شکل نظر آجاتی ہے اور اگر زمین کی کی جاوے، تو اس میں انواع واقسام کے پھل پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس انسان جو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر دل صاف کرے اور اس میں کسی قسم کی کجی اور ناہمواری، کنکر، پتھر نہ رہنے دے، تو اس میں خدا نظر آئے گا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے درخت اُس میں پیدا ہو کر نشوونما پائیں گے اور وہ اثمارِ شیریں و طیب ان میں لگیں گے۔ جو اُكُلُهَا دَآئِمٌ (الرعد: ۳۶) کے مصداق ہوں گے۔ یاد رکھو کہ یہ وہی مقام ہے، جہاں صُوفیوں کے سلوک کا خاتمہ ہے۔ جب سالک یہاں پہنچتا ہے، تو خدا ہی خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس کا دل عرشِ الٰہی بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس پر نزول فرماتا ہے۔ سلوک کی تمام منزلیں یہاں آکر ختم ہو جاتی ہیں کہ انسان کی حالتِ تعبد دُرست ہو، جس میں رُوحانی باغ لگ جاتے ہیں اور آئینہ کی طرح خدا نظر آتا ہے۔ اسی مقام پر پہنچ کر انسان دُنیا میں جنت کا نمونہ پاتا ہے اور یہاں ہی هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرہ: ۲۶) کہنے کا حظ اور لُطف اُٹھاتا ہے۔

غرض حالتِ تعبد کی دُرستی کا نام عبادت ہے۔ پھر فرمایا: اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (ھود: ۳) چونکہ یہ تعبدِ تام کا عظیم الشان کام انسان بدُوں کسی اُسوۂ حسنہ اور نمونۂ کاملہ کے اور کسی قوتِ قدسی کے کامل اثر کے بغیر نہیں کر سکتا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اسی خدا کی طرف سے نذیر اور بشیر ہو کر آیا ہوں۔ اگر میری اطاعت کروگے اور مجھے قبول کروگے تو تمہارے لیے بڑی بڑی بشارتیں ہیں۔ کیونکہ میں بشیر ہوں اور اگر رَدّ کرتے ہو تو یاد رکھو کہ میں نذیر ہو کر آیا ہوں۔ پھر تم کو بڑی بڑی عقوبتوں اور دُکھوں کا سامنا ہوگا۔

بہشت اور جہنم

اصل بات یہ ہے کہ بہشتی زندگی اسی دُنیا سے شروع ہو جاتی ہے اور اسی طرح پر کورانہ زیست جو خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے بالکل الگ ہو کر بسر کی جاتی ہے جہنمی زندگی کا نمونہ ہے اور وہ بہشت جو مرنے کے بعد ملے گا، اسی بہشت کا اصل ہے۔ اور اسی لیے تو بہشتی لوگ نعماءِ جنت کا حظ اٹھاتے وقت کہیں گے۔ هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرہ: ۲۶) دُنیا میں انسان کو جو بہشت

حاصل ہوتا ہے۔ وَقَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا (الشمس : ۱۰) پر عمل کرنے سے مِلتا ہے۔ جب انسان عبادت کا اصل مفہوم اور مغز حاصل کر لیتا ہے، تو خدا تعالیٰ کے انعام و اکرام کا پاک سِلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور جو نعمتیں آئندہ بعد مُردن ظاہری، مرئی اور محسوس طور پر ملیں گی وُہ اب رُوحانی طور پر پاتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ جبتک بہشتی زندگی اِسی جہان سے شروع نہ ہو۔ اور اِس عالم میں اُس کا حظّ نہ اُٹھاؤ۔ اُس وقت تک سیر نہ ہو اور تسلّی نہ پکڑو، کیونکہ وُہ جو اس دُنیا میں کچھ نہیں پاتا اور آئندہ جنّت کی امید کرتا ہے وہ طمعِ خام کرتا ہے۔ اصل میں وُہ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل : ۷۳) کا مصداق ہے۔ اس لیے جبتک ماسوی اللہ کے کنکر اور سنگریزے زمینِ دل سے دُور نہ کر لو اور اُسے آئینہ کی طرح مُصفّا اور سُرمہ کی طرح باریک نہ بنا لو۔ صبر نہ کرو۔

مُرشدِ کامل کی ضرورت

ہاں یہ سچ ہے کہ انسان کسی مُزکّی النفس کی امداد کے بغیر اس سلوک کی منزل کو طے نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اس کے انتظام و انصرام کے لیے اللہ تعالیٰ نے کامل نمونہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بھیجا اور پھر ہمیشہ کے لیے آپ کے سچّے جانشینوں کا سِلسلہ جاری فرمایا، تاکہ ناعاقبت اندیش بر ہموؤں کا رَدّ ہو۔ جیسے یہ امر ایک ثابت شدہ صداقت ہے کہ جو کسان کا بچہّ نہیں ہے۔ نلائی (گوڈی دینے) کے وقت اصل درخت کو کاٹ دے گا۔ اسی طرح پر یہ زمینداری جو رُوحانی زمینداری ہے۔ کامل طور پر کوئی نہیں کر سکتا، جب تک کسی کامل انسان کے ماتحت نہ ہو۔ جو تخم ریزی، آبپاشی، نلائی کے تمام مرحلے طے کر چکا ہو۔ اسی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ مُرشدِ کامل کی ضرورت انسان کو ہے۔ مُرشدِ کامل کے بغیر انسان کا عبادت کرنا اِسی رنگ کا ہے، جیسے ایک نادان و ناواقف بچہّ ایک کھیت میں بیٹھا ہوا اصل پودوں کو کاٹ رہا ہے اور اپنے خیال میں سمجھتا ہے کہ وُہ گوڈی کر رہا ہے۔ یہ گمان ہرگز نہ کرو کہ عبادت خود ہی آجاتے گی نہیں جبتک رسُول نہ سِکھلائے۔ انقطاع اِلی اللہ اور تبتّلِ تام کی راہیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

اِستغفار اور توبہ

پھر طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مشکل کام کیونکر حل ہو۔ اس کا علاج خود ہی بتلایا وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ۔ (ھود : ۴) یاد رکھو کہ یہ دو چیزیں اس اُمّت کو عطا فرمائی گئی ہیں۔ ایک قوّت حاصل کرنے کے واسطے، دوسری حاصل کردہ قوّت کو عملی طور پر دِکھلانے کے لیے۔ قوّت حاصل کرنے کے واسطے استغفار ہے جس کو دُوسرے لفظوں میں استمداد اور استعانت بھی کہتے ہیں۔ صُوفیوں نے لکھا ہے کہ جیسے وَرزش کرنے سے مثلاً مگدروں اور موگریوں کو اُٹھانے اور پھیرنے سے جسمانی قوّت اور طاقت بڑھتی ہے۔ اسی طرح پر رُوحانی مگدر استغفار ہے۔ اس کے ساتھ رُوح کو ایک قوّت مِلتی ہے اور دل میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔ جسے قوّت لینی مطلوب ہو وہ استغفار کرے۔ غَفر ڈھانکنے اور دبانے کو کہتے ہیں۔ استغفار سے انسان اُن جذبات اور خیالات کو ڈھانپنے اور دبانے کی کوشش کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ سے روکتے ہیں۔ پس استغفار کے یہی معنے ہیں کہ زہریلے مواد جو حملہ کر کے انسان کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اُن پر غالب آوے اور خدا تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کی راہ کی روکوں سے بچ کر انہیں عملی رنگ میں دکھائے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قسم کے مادے رکھے ہیں۔ ایک سمّی مادہ ہے۔ جس کا موکل شیطان ہے اور دُوسرا تریاقی مادہ ہے۔ جب انسان تکبّر کرتا ہے اور اپنے تئیں کچھ سمجھتا ہے اور تریاقی چشمہ سے مدد نہیں لیتا۔ تو سمّی قوت غالب آجاتی ہے۔ لیکن جب اپنے تئیں ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اور اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت محسُوس کرتا ہے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک چشمہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے اس کی رُوح گداز ہو کر بہہ نکلتی ہے اور یہی استغفار کے معنی ہیں یعنی یہ کہ اس قوت کو پاکر زہریلے مواد پر غالب آجاوے۔

غرض اِس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت پر یُوں قائم رہو۔ اوّل۔ رسُول کی اطاعت کرو۔ دُوسرے ہر وقت خدا سے مدد چاہو۔ ہاں پہلے اپنے رب سے مدد چاہو۔ جب قوت مِل گئی تو تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یعنی خدا کی طرف رجُوع کرو۔

اِستغفار کو توبہ پر تقدّم حاصل ہے

اِستغفار اور توبہ دو چیزیں ہیں۔ ایک وجہ سے استغفار کو توبہ پر تقدّم ہے، کیونکہ استغفار مدد اور قوت ہے جو خُدا سے حاصل کی جاتی ہے اور توبہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہے۔ عادۃُ اللہ یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے گا، تو خدا تعالیٰ ایک قوت دے دیگا اور پھر اس قوّت کے بعد انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاوے گا اور نیکیوں کے کرنے کے لیے اُس میں ایک قوت پیدا ہو جاوے گی جس کا نام تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ ہے۔ اس لیے طبعی طور پر بھی یہی ترتیب ہے۔ غرض اس میں ایک طریق ہے جو سالکوں کے لیے رکھا ہے کہ سالک ہر حالت میں خدا سے اِستمداد چاہے۔ سالک جبتک اللہ تعالیٰ سے قوت نہ پائے گا، کیا کر سکے گا۔ توبہ کی توفیق استغفار کے بعد ملتی ہے۔ اگر استغفار نہ ہو، تو یقیناً یاد رکھو کہ توبہ کی قوت مر جاتی ہے۔ پھر اگر اس طرح پر استغفار کروگے اور پھر توبہ کروگے، تو نتیجہ یہ ہوگا۔ یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (ھود: ۴) سُنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ اگر استغفار اور توبہ کروگے تو اپنے مراتب پالوگے۔ ہر ایک شخص کے لیے ایک دائرہ ہے۔ جس میں وہ مدارجِ ترقی کو حاصل کرتا ہے۔ ہر ایک آدمی نبیؔ، رسُول صدیقؔ شہید نہیں ہو سکتا۔

غرض اس میں شک نہیں کہ تفاضلِ درجات امرِ حق ہے۔ اس کے آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان اُمور پر مواظبت کرنے سے ہر ایک سالک اپنی اپنی استعداد کے موافق دَرجات اور مراتب کو پالے گا۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا وَیُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ (ھود: ۴) لیکن اگر زیادت لیکر آیا ہے، تو خدا تعالیٰ اس مجاہدہ میں اس کو زیادت دے دے گا اور اپنے فضل کو پالے گا، جو طبعی طور پر اُس کا حق ہے۔ ذی الفضل کی اضافت ملکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ محروم نہ رکھے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میاں ہم نے کوئی ولی بننا ہے؟ جو ایسا کہتے ہیں وُہ دنی الطبع کافر ہیں۔ انسان کو مناسب ہے کہ قانونِ قدرت کو ہاتھ میں لے کر کام کرے۔

مُردہ سے مدد مانگنا جائز نہیں

اب ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ مُردوں سے مدد مانگنے کا خدا نے کہیں ذکر نہیں کیا، بلکہ زندوں ہی کا ذکر فرمایا۔ خدا تعالیٰ نے بڑا فضل کیا جو اسلام کو زندوں کے سپرد کیا۔ اگر اسلام کو مُردوں پر ڈالتا تو نہیں معلوم کیا آفت آتی۔ مُردوں کی قبریں کہاں کم ہیں۔ کیا ملتان میں تھوڑی قبریں ہیں؟ "گرد و گرما گدا و گورستان" اُس کی نسبت مشہور ہے۔ مَیں بھی ایک بار ملتان گیا۔ جہاں کسی قبر پر جاؤ مجاور کپڑے اُتارنے کو گرد ہو جاتے ہیں۔ پاک پٹن میں مُردوں کے فیضان سے دیکھ لو کیا ہو رہا ہے؟ اجمیر میں جا کر دیکھو۔ بدعات اور محدثات کا بازار کیسا گرم ہے۔ غرض جب مُردوں کو دیکھو گے اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ اُن کے مشاہدہ میں سوا بدعات اور اِرتکابِ مناہی کے کچھ نہیں۔ خدا تعالیٰ نے جو صراطِ مستقیم فرمایا ہے وُہ زندوں کی راہ ہے، مُردوں کی راہ نہیں پس جو چاہتا ہے کہ خدا کو پائے اور حیّ و قیّوم خدا کو ملے، تو وُہ زندوں کو تلاش کرے، کیونکہ ہمارا خدا زندہ خدا ہے نہ مُردہ۔ جن کا خدا مُردہ، جن کی کتاب مُردہ۔ وُہ مُردوں سے برکت چاہیں، تو کیا تعجب ہے۔ لیکن اگر سچا مُسلمان جس کا خدا زندہ خدا، جس کا نبی زندہ نبی، جس کی کتاب زندہ کتاب ہے اور جس دین میں ہمیشہ زندوں کا سلسلہ جاری ہو اور ہر زمانہ میں ایک زندہ انسان خدا تعالیٰ کی ہستی پر زندہ ایمان پیدا کرنے والا آتا ہو، وہ اگر اُس زندہ کو چھوڑ کر بوسیدہ ہڈیوں اور قبروں کی تلاش میں سرگردان ہو تو البتہ تعجب اور حیرت کی بات ہے!!!

زندوں کی صُحبت تلاش کرو

پس تم کو چاہیے کہ تم زندوں کی صُحبت تلاش کرو اور بار بار اُس کے پاس آ کر بیٹھو۔ ہاں ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک دو مرتبہ میں تاثیر نہیں ہوتی۔ سنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ ترقی تدریجاً ہوتی ہے۔ جیسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سلسلہ میں تدریجی ترقی ہوئی۔ جو سلسلہ منہاج نبوۃ پر قائم ہوگا۔ اس میں بھی تدریجی ترقی کا قانون کام کرتا ہوگا۔ پس چاہیے کہ صحابہؓ کی طرح اپنے کاروبار چھوڑ کر یہاں آ کر بار بار اور عرصہ تک صُحبت میں رہو تا کہ تم دیکھو جو صحابہؓ نے دیکھا اور پاؤ جو ابو بکرؓ اور عمرؓ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے پایا۔ کسی نے کیا سچ کہا ہے؛

یا توں لوڑ مقدمی یا توں اللہ نوں لوڑ

تم دیکھتے ہو کہ میں بیعت میں یہ اقرار لیتا ہوں کہ دین کو دُنیا پر مقدّم رکھوں گا۔ یہ اس لیے تا کہ میں دیکھوں کہ بیعت کنندہ اس پر کیا عمل کرتا ہے؟ ذرہ سی نئی زمین کسی کو مل جاوے تو وُہ گھر بار چھوڑ کر وہاں جا بیٹھتا ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ وہ وہاں رہے تا وہ زمین آباد ہو۔ محمد حسین جیسے کو بھی بار میں جا کر ٹھہرنے کی ضرورت آ پڑی۔

پھر ہم جو ایک نئی زمین اور ایسی زمین دیتے ہیں جس میں اگر صفائی اور محنت سے کاشت کی جاوے، تو اَبدی پھل لگ سکتے ہیں۔ کیوں یہاں آکر لوگ گھر نہیں بناتے اور اگر اس بے احتیاطی کے ساتھ اس زمین کو کوئی لیتا ہے کہ بیعت کے بعد یہاں آنا اور چند روز ٹھہرنا بھی دو بھر اور مشکل معلوم دیتا ہے تو پھر اُس کی فصل کے پکنے اور بار آور ہونے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے قلب کا نام بھی زمین رکھا ہے۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الحدید: ۱۸) زمیندار کو کس قدر تردّد کرنا پڑتا ہے۔ بیل خریدتا ہے۔ ہل چلاتا ہے۔ تخم ریزی کرتا ہے۔ آبپاشی کرتا ہے۔ غرضیکہ بہت بڑی محنت کرتا ہے اور جب تک خود دخل نہ دے کچھ بھی نہیں بنتا۔ لکھا ہے کہ ایک شخص نے پتھر پر لکھا دیکھا۔ "زرع زر ہی زر ہے" کھیتی تو کرنے لگا، مگر نوکروں کے سپرد کر دی لیکن جب حساب لیا۔ کچھ وصول ہونا تو درکنار کچھ واجب الادا ہی نکلا۔ پھر اُس کو اس موقعہ پر شک پیدا ہوا تو کسی دانشمند نے سمجھایا کہ نصیحت تو سچی ہے، لیکن تمہاری بے وقوفی ہے۔ خود مہتمم ہو، تب فائدہ ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح پر ارضِ دل کی خاصیت ہے جو اُس کو بے عزّتی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کو خدا تعالیٰ کا فضل اور برکت نہیں ملتی۔ یاد رکھو، مَیں جو اصلاحِ خلق کے لیے آیا ہوں جو میرے پاس آتا ہے وہ اپنی استعداد کے موافق ایک فضل کا وارث بنتا ہے، لیکن مَیں صاف طور پر کہتا ہوں کہ وہ جو سرسری طور پر بیعت کر کے چلا جاتا ہے اور پھر اُس کا پتہ بھی نہیں ملتا کہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ اُس کے لیے کچھ نہیں ہے وہ جیسا تہی دست آیا تھا۔ تہی دست جاتا ہے۔

یہ فضل اور برکت صحبت میں رہنے سے ملتی ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صحابہؓ بیٹھے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِیْ اَصْحَابِیْ۔ گویا صحابہؓ خدا کا رُوپ ہو گئے۔ یہ درجہ ممکن نہ تھا کہ اُن کو ملتا۔ اگر دُور ہی بیٹھے رہتے۔ یہ بہت ضروری مسئلہ ہے۔ خدا کا قُرب، بندگانِ خدا کا قرب ہے اور خدا تعالیٰ کا ارشاد کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبۃ: ۱۱۹) اس پر شاہد ہے۔ یہ ایک سِرّ ہے جس کو تھوڑے ہیں جو سمجھتے ہیں۔ ماموَر من اللہ ایک ہی وقت میں ساری باتیں کبھی بیان نہیں کر سکتا، بلکہ وُہ اپنے دوستوں کے امراض کی تشخیص کر کے حسبِ موقع اُن کی اصلاح بذریعہ وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً وہ اُن کے امراض کا ازالہ کرتا رہتا ہے۔ اب جیسے آج میں ساری باتیں بیان نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض آدمی ایسے ہوں، جو آج ہی تقریر سُن کر چلے جاویں اور بعض باتیں اس میں اُن کے مذاق اور مرضی کے خلاف ہوں، تو وُہ محروم گئے، لیکن جو متواتر یہاں رہتا ہے۔ وُہ ساتھ ساتھ ایک تبدیلی کرتا جاتا ہے اور آخر اپنے مقصد کو پا لیتا ہے۔ ہر ایک آدمی سچی تبدیلی کا محتاج ہے۔ جس میں تبدیلی نہیں ہے، وُہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى کا مصداق ہے۔

جماعت میں ایک پاک تبدیلی پیدا ہو

مجھے بہت سوز و گداز رہتا ہے کہ جماعت میں ایک پاک تبدیلی ہو۔ جو نقشہ اپنی جماعت کی تبدیلی کا میرے دل

میں ہے وُہ ابھی پیدا نہیں ہوا اور اس حالت کو دیکھ کر میری وہی حالت ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ (الشعراء : ۴) مَیں نہیں چاہتا کہ چند الفاظ طوطے کی طرح بیعت کے وقت رَٹ لیے جاویں۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ تزکیہ نفس کا علم حاصل کرو کہ ضرورت اسی کی ہے۔ ہماری یہ غرض ہرگز نہیں کہ مسیح کی وفات حیات پر جھگڑے اور مباحثہ کرتے پھرو۔ یہ ایک ادنیٰ سی بات ہے۔ اسی پر بس نہیں ہے۔ یہ تو ایک غلطی تھی، جس کی ہم نے اصلاح کر دی، لیکن ہمارا کام اور ہماری غرض ابھی اس سے بہت دُور ہے اور وُہ یہ ہے کہ تم اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا کرو اور بالکل ایک نئے اِنسان بن جاؤ، اس لیے ہر ایک کو تم میں سے ضروری ہے کہ وُہ اس راز کو سمجھے اور ایسی تبدیلی کرے کہ وہ کہہ سکے کہ مَیں اور ہوں۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یقیناً یقیناً جبتک ایک مدت تک ہماری صُحبت میں رہ کر یہ نہ سمجھے کہ مَیں اور ہو گیا ہوں، اُسے فائدہ نہیں پہنچا۔

فِطرت اور عقلی حالت اور جذبات کی حالت میں اعلیٰ درجہ کی صفائی حاصل ہو جاوے، تو کچھ بات ہے؛ ورنہ کچھ بھی نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ دُنیا کے اشغال چھوڑ دو۔ خدا تعالیٰ نے دُنیا کے شغلوں کو جائز رکھا ہے، کیونکہ اس راہ سے بھی ابتلا آتا ہے اور اسی ابتلا کی وجہ سے انسان چور، قمار باز، ٹھگ، ڈکیت بن جاتا ہے اور کیا کیا بُری عادتیں اختیار کر لیتا ہے، مگر ہر ایک چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ دینوی شغلوں کو اس حد تک اختیار کرو کہ وہ دین کی راہ میں تمھارے لیے مدد کا سامان پیدا کر سکیں اور مقصُود بالذّات اس میں دین ہی ہو۔ پس ہم دینوی شغلوں سے بھی منع نہیں کرتے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ دن رات دُنیا کے دھندوں اور بکھیڑوں میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کا خانہ بھی دُنیا ہی سے بھر دو۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ محرومی کے اسباب بہم پہنچاتا ہے اور اس کی زبان پر نِرا دعویٰ ہی رہ جاتا ہے۔ الغرض زندوں کی صُحبت میں رہو تاکہ زندہ خدا کا جلوہ تم کو نظر آوے۔[1]

۹ر جولائی سنہ ۱۹۰۱ء

دُعا بہترین ہمدردی ہے

یاد رکھو۔ ہمدردی تین قسم کی ہے۔ اوّل جسمانی، دوم مالی، تیسری قسم ہمدردی کی دُعا ہے۔ جس میں نہ صَرفِ زر ہوتا ہے اور نہ زور لگانا پڑتا ہے اور اس کا فیض بہت ہی وسیع ہے، کیونکہ جسمانی ہمدردی تو اس صورت میں ہی انسان کر سکتا ہے۔ جبکہ اس میں طاقت بھی ہو۔ مثلاً ایک ناتواں مجروح مسکین اگر کہیں پڑا تڑپتا ہو، تو کوئی شخص جس میں خود طاقت اور توانائی نہیں ہے، کب اُس کو اٹھا کر مدد دے سکتا ہے۔ اسی طرح پر اگر کوئی بیکس دبے بس، بے سرو سامان انسان بھوک

---

[1] (الحکم جلد نمبر ۶ نمبر ۲۶ صفحہ ۵ - ۱۲ مورخہ ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۰۲ء)

سے پریشان ہو تو جبتک مال نہ ہو۔ اس کی ہمدردی کیونکر ہوگی۔ مگر دعا کے ساتھ ہمدردی ایک ایسی ہمدردی ہے کہ نہ اس کے واسطے کسی مال کی ضرورت ہے اور نہ کسی طاقت کی حاجت بلکہ جبتک انسان انسان ہے، وہ دُوسرے کے لیے دُعا کر سکتا ہے اور اس کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس ہمدردی کا فیض بہت وسیع ہے اور اگر اس ہمدردی سے انسان کام نہ لے، تو سمجھو بہت ہی بڑا بدنصیب ہے۔

مَیں نے کہا ہے کہ مالی اور جسمانی ہمدردی میں انسان مجبور ہوتا ہے، مگر دُعا کے ساتھ ہمدردی میں مجبُور نہیں ہوتا۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ دُعا میں دشمنوں کو بھی باہر نہ رکھے۔ جس قدر دُعا وسیع ہوگی اسی قدر فائدہ دُعا کرنے والے کو ہوگا اور دُعا میں جس قدر بخل کرے گا۔ اسی قدر اللہ تعالیٰ کے قرب سے دُور ہوتا جاوے گا اور اصل تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے عطیہ کو جو بہت وسیع ہے جو شخص محدود کرتا ہے اس کا ایمان بھی کمزور ہے۔

لمبی عمر پانے کا نسخہ

دُوسروں کے لیے دُعا کرنے میں ایک عظیم الشان فائدہ یہ بھی ہے کہ عمر دراز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ دُوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں اور مفید وجُود ہوتے ہیں، اُن کی عمر دراز ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد: ۱۸) اور دُوسری قسم کی ہمدردیاں چونکہ محدُود ہیں اس لیے خصوصیت کے ساتھ جو خیر جاری قرار دی جا سکتی ہے۔ وُہ یہی دُعا کی خیر جاری ہے۔ جبکہ خیر کا نفع کثرت سے ہے تو اس آیت کا فائدہ ہم سب سے زیادہ دُعا کے ساتھ اُٹھا سکتے ہیں اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ جو دُنیا میں خیر کا مُوجب ہوتا ہے، اس کی عُمر دراز ہوتی ہے اور جو شر کا موجب ہوتا ہے۔ وُہ جلدی اُٹھا لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں شیر سنگھ چڑیوں کو زندہ پکڑ کر آگ پر رکھا کرتا تھا۔ وہ دو برس کے اندر ہی مارا گیا۔ پس انسان کو لازم ہے کہ وُہ خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ بننے کے واسطے سوچتا رہے اور مطالعہ کرتا رہے۔ جیسے طبابت میں حیلہ کام آتا ہے۔ اسی طرح نفع رسانی اور خیر میں بھی حیلہ ہی کام دیتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ انسان ہر وقت اس تاک اور فکر میں لگا رہے کہ کس راہ سے دُوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

سائل کو جھڑکنا نہیں چاہیئے

بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ سائل کو دیکھ کر چڑ جاتے ہیں اور کچھ مولویت کی رگ ہو، تو اس کو بجائے کچھ دینے کے سوال کے مسائل سمجھانا شروع کر دیتے ہیں اور اس پر اپنی مولویت کا رُعب بٹھا کر بعض اوقات سخت سُست بھی کہہ بیٹھتے ہیں۔ افسوس ان لوگوں کو عقل نہیں اور سوچنے کا مادہ نہیں رکھتے، جو ایک نیک دل اور سلیم الفطرت انسان کو ملتا ہے۔ اِتنا نہیں سوچتے کہ سائل اگر باوجُود صحت کے سوال کرتا ہے، تو وُہ خود گناہ کرتا ہے۔ اس کو کچھ دینے میں تو گناہ لازم نہیں آتا، بلکہ حدیث شریف میں وَلَوْ اَتَاكَ رَاكِبًا کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی خواہ سائل سوار ہو کر بھی آوے تو بھی کچھ دے دینا چاہیے اور قرآن شریف میں وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الضحیٰ: ۱۱) کا ارشاد آیا ہے۔

کہ سائل کو مت جھڑک۔ اس میں یہ کوئی صراحت نہیں کی گئی کہ فلاں قسم کے سائل کو مت جھڑک اور فلاں قسم کے سائل کو جھڑک۔ پس یاد رکھو کہ سائل کو نہ جھڑکو، کیونکہ اس سے ایک قسم کی بداخلاقی کا بیج بویا جاتا ہے۔ اخلاق یہی چاہتا ہے کہ سائل پر جلدی ناراض نہ ہو۔ یہ شیطان کی خواہش ہے کہ وہ اس طریق سے تم کو نیکی سے محروم رکھے اور بدی کا وارث بنا دے۔

ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا ہوتی ہے

غور کرو کہ ایک نیکی کرنے سے دوسری نیکی پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح پر ایک بدی دُوسری بدی کا موجب ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک چیز دوسری کو جذب کرتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے یہ تجاذب کا مسئلہ ہر فعل میں رکھا ہوا ہے۔ پس جب سائل سے نرمی کے ساتھ پیش آئے گا اور اس طرح پر اخلاقی صدقہ دے دے گا، تو قبض دُور ہو کر دُوسری نیکی بھی کرے گا اور اُس کو کچھ دے بھی دے گا۔

اخلاق نیکیوں کی کلید ہے

اخلاق دوسری نیکیوں کی کلید ہے۔ جو لوگ اخلاق کی اصلاح نہیں کرتے وُہ رفتہ رفتہ بے خیر ہو جاتے ہیں۔ میرا تو یہ مذہب کہ دُنیا میں ہر ایک چیز کام آتی ہے۔ زہر اور نجاست بھی کام آتی ہے۔ اسٹرکنیا بھی کام آتا ہے۔ اعصاب پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ مگر انسان جو اخلاقِ فاضلہ کو حاصل کر کے نفع رساں ہستی نہیں بنتا۔ ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بھی کام نہیں آسکتا۔ مُردار حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی تو کھال اور ہڈیاں بھی کام آجاتی ہیں۔ اُس کی تو کھال بھی کام نہیں آتی۔ اور یہی وہ مقام ہوتا ہے۔ جہاں انسان بَلْ ھُمْ اَضَلُّ کا مصداق ہو جاتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ اخلاق کی دُرستی بہت ضروری چیز ہے، کیونکہ نیکیوں کی ماں اخلاق ہی ہے۔

خیر کا پہلا درجہ جہاں سے انسان قوت پاتا ہے۔ اخلاق ہے۔ دو لفظ ہیں۔ ایک خَلق اور دُوسرا خُلق۔ خَلق ظاہری پیدائش کا نام ہے اور خُلق باطنی پیدائش کا۔ جیسے ظاہر میں کوئی خُوب صُورت ہوتا ہے اور کوئی بہت ہی بدصُورت۔ اسی طرح پر کوئی اندرونی پیدائش میں نہایت حسین اور دِلرُبا ہوتا ہے اور کوئی اندر سے مجذُوم اور مبرُوص کی طرح مکرُوہ۔ لیکن ظاہری صُورت چونکہ نظر آتی ہے، اس لیے ہر شخص دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ بدصُورت اور بدوضع ہو، مگر چونکہ اس کو دیکھتا ہے اس لیے اُس کو پسند کرتا ہے اور خُلق کو چونکہ دیکھا نہیں، اس لیے اُس کی خوبی سے ناآشنا ہو کر اُس کو نہیں چاہتا۔ ایک اندھے کے لیے خوبصورتی اور بدصُورتی دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح پردہ انسان

جس کی نظر اندرونہ تک نہیں پہنچتی، اس اندھے ہی کی مانند ہے۔ خَلق تو ایک بدیہی بات ہے۔ مگر خُلق ایک نظری مسئلہ ہے۔ اگر اخلاقی بدیاں اور ان کی لعنت معلوم ہو۔ تو حقیقت کھلے۔ غرض اخلاقی خوب صورتی ایک ایسی خوب صورتی ہے، جس کو حقیقی خوب صورتی کہنا چاہیے بہت تھوڑے ہیں جو اس کو پہچانتے ہیں۔ اخلاق نیکیوں کی کلید ہے۔ جیسے باغ کے دروازے پر قفل ہو۔ دُور سے پھل پھول نظر آتے ہیں، مگر اندر نہیں جا سکتے۔ لیکن اگر قفل کھول دیا جاوے، تو اندر جا کر پُوری حقیقت معلوم ہوتی ہے اور دل و دماغ میں ایک سرور اور تازگی آتی ہے۔ اخلاق کو حاصل کرنا گویا اس قفل کو کھول کر اندر داخل ہونا ہے۔

ترکِ اخلاق ہی بدی اور گناہ ہے

کسی کو اخلاق کی کوئی قوت نہیں دی گئی، مگر اس کو بہت سی نیکیوں کی توفیق ملی۔ ترکِ اخلاق ہی بدی اور گناہ ہے۔ ایک شخص جو مثلاً زنا کرتا ہے۔ اُس کو خبر نہیں کہ اُس عورت کے خاوند کو کس قدر صدمہ عظیم پہنچتا ہے۔ اب اگر یہ اُس تکلیف اور صدمہ کو محسوس کر سکتا اور اس کو اخلاقی حصہ حاصل ہوتا، تو ایسے فعلِ شنیع کا مُرتکب نہ ہوتا۔ اگر ایسے نابکار انسان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس فعلِ بد کے ارتکاب سے نوعِ انسان کے لیے کیسے کیسے خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں تو ہٹ جاتا۔ ایک شخص جو چوری کرتا ہے۔ کمبخت ظالم اتنا بھی تو نہیں کرتا کہ رات کے کھانے کے واسطے ہی چھوڑ جائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک غریب کی کئی سالوں کی محنت کو ملیا میٹ کر دیتا ہے اور جو کچھ گھر میں پاتا ہے۔ سب کا سب لے جاتا ہے۔ ایسی قبیح بدی کی اصل جڑ کیا ہے؟ اخلاقی قوت کا نہ ہونا۔ اگر رحم ہوتا اور وہ یہ سمجھ سکتا کہ بچے بھوک سے بلبلائیں گے۔ جن کی چیخوں سے دشمن کا بھی کلیجہ لرزتا ہے اور یہ معلوم کر کے کہ رات سے بھوکے ہیں اور کھانے کو ایک سُوکھا ٹکڑا بھی نہیں ملا، تو پتّا پانی ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان حالتوں کو محسوس کرتا اور اخلاقی حالت سے اندھا نہ ہوتا، تو کیوں چوری کرتا۔ آئے دن اخبارات میں دردناک موتوں کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں کہ فلاں بچہ زیور کے لالچ سے مارا گیا۔ فلاں جگہ کسی عورت کو قتل کر ڈالا۔ میں خود ایک مرتبہ اسیسر ہو کر گیا تھا۔ ایک شخص نے بارہ آنے یا ۱؍۱ (سوا روپیہ) میں ایک بچہ کا خُون کیا تھا۔ اب سوچ کر دیکھو کہ اگر اخلاقی حالت دُرست ہو تو ایسی مصیبتیں کیوں آئیں؟ ممکن ہے کہ اپنے جیسے انسان پر مصیبت آئے

اور یہ محسوس نہ کرے۔

چارپایوں جیسے خصائل

يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (محمد : ۱۳)

چارپایوں کی طرح کھاتے ہیں۔ اس کے کئی پہلو ہیں :

اوّل چارپایہ کیفیت اور کمیت میں فرق نہیں کرسکتا اور جو کچھ آگے آتا ہے اور جس قدر آتا ہے، کھاتا ہے۔ جیسے کُتّا اس قدر کھاتا ہے کہ آخر قے کرتا ہے۔

دُوسرا یہ کہ انعام حلال اور حرام میں تمیز نہیں کرتے۔ ایک بیل بھی یہ تمیز نہیں کرتا کہ یہ ہمسایہ کا کھیت ہے۔ اس میں نہ جاؤں۔ ایسا ہی ہر ایک امر جو کھانے کے لحاظ سے ہو نہیں کرتا۔ کُتّے کو ناپاکی پاکی کے متعلق کوئی لحاظ نہیں اور پھر چارپایہ کو اعتدال نہیں۔

یہ لوگ جو اخلاقی اصُولوں کو توڑتے ہیں اور پروا نہیں کرتے کہ گویا انسان نہیں۔ پاک پلید کا تو یہ حال، عرب میں مُردے کُتّے کھا لیتے تھے۔ ابتک اکثر ممالک میں یہ حال ہے کہ چُوہوں اور کُتّوں اور بلیوں کو بڑے لذیذ کھانے سمجھ کر کھایا جاتا ہے۔ چُوہڑے چمار مُردار خور قومیں یہاں بھی موجود ہیں۔

پھر یتیموں کا مال کھانے میں کوئی تردد و تامّل نہیں۔ جیسے یتیم کا گھاس گائے کے سامنے رکھ دیا جاوے۔ بلا تردد کھاجاوے گی۔ ایسا ہی ان لوگوں کا حال ہے یہی معنے ہیں وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد:۱۳) ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ غرض یاد رکھو کہ دو پہلُو ہیں۔ ایک عظمتِ الٰہی کا جو اُس کے خلاف ہے، وُہ بھی اخلاق کے خلاف ہے اور دُوسرا شفقت علیٰ خلق اللہ کا۔ پس جو نوعِ انسان کے خلاف ہو۔ وُہ بھی اخلاق کے برخلاف ہے۔ آہ! بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان باتوں پر جو انسان کی زندگی کا اصل مقصد اور غرض ہیں۔ غور کرتے ہیں۔

خود ساختہ وظائف و اذکار

بڑے بڑے صوفیوں، سجادہ نشینوں نے اپنا کمال اس میں سمجھ رکھا ہے کہ بڑے لمبے چوڑے وظائف اور اذکار و اشغال خود ہی تجویز کر لیے ہیں۔ اور اُن میں پڑکر اصل کو بھی کھو بیٹھے ہیں۔ پھر بڑے سے بڑا کام کیا تو یہ کر لیا کہ چلّہ کرتے ہیں۔ کچھ جَو ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک آدمی مقرر کر لیتے ہیں جو دُودھ یا کوئی اور چیز پہنچا آتا ہے۔ ایک تنگ و تاریک گندی سی کوٹھڑی یا غار ہوتی ہے اور اس میں پڑے رہتے ہیں۔ خدا جانے وہ اس میں کس طرح رہتے ہیں۔ پھر بُری بُری حالتوں میں باہر نکلتے ہیں۔ یہ اسلام رہ گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان چلّہ کشیوں سے اسلام اور مُسلمانوں یا عام لوگوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے اور اس میں اخلاق میں کیا ترقی ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علوِّ شان

سب عزّتوں سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزّت ہے۔ جس کا کُل اسلامی دُنیا پر اثر ہے۔

آپؐ ہی کی غیرت نے پھر دُنیا کو زندہ کیا۔ عرب جن میں زنا، شراب اور جنگ جوئی کے سوا کچھ رہا نہ تھا اور حقوق العباد کا خُون ہو چکا تھا۔ ہمدردی اور خیر خواہیٔ نوعِ انسان کا نام ونشان تک مِٹ چکا تھا اور نہ صرف حقوق العباد ہی تباہ ہو چکے تھے بلکہ حقوق اللہ پر اس سے بھی زیادہ تاریکی چھا گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی صفات پتھروں، بوٹیوں اور ستاروں کو دی گئی تھیں۔ قسم قسم کا شرک پھیلا ہوا تھا۔ عاجز انسان اور انسان کی شرمگاہوں تک کی پُوجا دُنیا میں ہو رہی تھی۔ ایسی حالتِ مکرُوہ کا نقشہ اگر ذرا دیر کے لیے ایک سلیم الفطرت انسان کے سامنے آجاوے، تو وہ ایک خطرناک ظلمت اور ظلم وجور کے بھیانک اور خوفناک نظارہ کو دیکھے گا۔ فالج ایک طرف گرتا ہے، مگر یہ فالج ایسا فالج تھا کہ دونوں طرف گرا تھا۔ فسادِ کامل دُنیا میں برپا ہو چکا تھا۔ نہ بحر میں امن وسلامتی تھی اور نہ بَر پر سکون وراحت۔ اب اس تاریکی اور ہلاکت کے زمانہ میں ہم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھتے ہیں۔ آپؐ نے آکر کیسے کامل طور پر اس میزان کے دونوں پہلو درست فرمائے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اپنے اصلی مرکز پر قائم کر دکھایا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی طاقت کا کمال اس وقت ذہن میں آسکتا ہے۔ جبکہ اُس زمانہ کی حالت پر نگاہ کی جاتے۔ مخالفوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے متبعین کو جس قدر تکالیف پہنچائیں اور اس کے بالمقابل آپؐ نے ایسی حالت میں جب کہ آپؐ کو پورا اقتدار اور اختیار حاصل تھا۔ ان سے جو کچھ سلوک کیا، وہ آپؐ کی علوِّشان کو ظاہر کرتا ہے۔

ابوجہل اور اس کے دُوسرے رفیقوں نے کونسی تکلیف تھی، جو آپؐ کو اور آپؐ کے جاں نثار خادموں کو نہیں دی۔ غریب مسلمان عورتوں کو اُونٹوں سے باندھ کر مخالف جہات میں دوڑایا اور وُہ چیری جاتی تھیں محض اس گناہ پر کہ وُہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کی کیوں قائل ہوئیں۔ مگر آپؐ نے اس کے مقابل صبر وبرداشت سے کام لیا۔ اور جبکہ مکہ فتح ہوا، تو لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (یوسف ۹۳) کہہ کر معاف فرمایا۔ یہ کس قدر اخلاقی کمال ہے۔ جو کسی دُوسرے نبی میں نہیں پایا جاتا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔

غرض بات یہ ہے کہ اخلاقِ فاضلہ حاصل کرو کہ نیکیوں کی کلید اخلاق ہی ہیں۔[1]

۱۶؍جولائی ۱۹۰۰ء

دو لطیف شعر

ہر کہ روشن شُد دل وجان و دروں از حضرتش
کیمیا باشد بسر بردن دمے در صُحبتش
چیست دُنیا چوں شبِ تار و زماں ابرِ سیاہ
آفتابی رہنمایک ساعتے در خدمتش

[1] (الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ صفحہ ۱-۵ مورخہ ۹؍جولائی ۱۹۰۰ء)

عُزیر نبی کی دوبارہ زندگی کا راز اور مسئلہ وفات و حیاتِ مسیحؑ

مسیح علیہ السلام کی وفات کے منکر اپنے دلائل میں حضرت عُزیرؑ کی زندگی کا سوال پیش کرتے ہیں کہ وہ سو برس مرکر پھر زندہ ہوا۔

مگر یاد رہے کہ یہ احیاء بعد الاماتت ہے اور احیاء کی کئی قسمیں ہیں۔ اوّل یہ کہ کوئی آدمی مرنے کے بعد ایسے طور پر زندہ ہو جاوے کہ قبر پھٹ جاوے اور وہ اپنا بوریا بدھنا بستر اُٹھا کر دُنیا میں آجاوے۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایک نئی زندگی بخشے۔ جیسے اہل اللہ کو ایک دُوسری زندگی دی جاتی ہے۔ جس طرح پر ایک شخص نے خدا سے ڈر کر کہا تھا کہ میری راکھ اُڑا دی جاوے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے اُس کو زندہ کیا۔ یہ راکھ کا اکٹھا کرنا بھی ایک جسمانی زندگی تھی۔ مرنے کے بعد جو زندگی ملتی ہے۔ وہاں تو راکھ کا اکٹھا کرنا نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ سب کچھ ہوا، مگر اپنے گھر تو نہ آیا۔ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ تسلّی کے لیے ایک بات باقی ہے کہ ہم تجھ کو لوگوں کے لیے نشان بنا دیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ لوگوں کے سمجھے ہوئے کے موافق نشان ہو اور ایسا ہو کہ قبر پھٹ جاوے اور مُردہ نکل آوے۔ یہ غلط بات ہے۔

بعض آدمی حُجّۃ اللہ آیات اللہ کہلاتے ہیں بعض وجُود ہی نشان ہوتے ہیں بعض کے مرنے کے بعد نشان قائم رہتے ہیں۔ یہ بیان کرنا ضروری تھا کہ اس اعتراض کا منشاء کیا ہے۔ جس راہ کو ہم نے اختیار کیا ہے، اس کے خلاف ہے۔ ہمارے مخالفوں کا مسیح کی نسبت تو یہ اعتقاد ہے کہ وہ زندہ ہی آسمان پر گئے اور زندہ ہی واپس آئیں گے۔ عزیر کے قصّہ سے اس کو کیا تعلق اور کیا مشابہت ہے؟

یہ مشابہت تو تب ہوتی کہ اگر معترض کا یہ مذہب ہوتا کہ مسیح علیہ السلام قبر پھٹ کر نکلیں گے۔ جبکہ ان کا یہ مذہب ہی نہیں تو پھر تعجب کی بات ہے کہ اس قصّہ کو جو قیاس مع الفارق ہے، کیوں پیش کرتے ہیں؟

اُن کے معتقدات میں تو یہ ہے کہ کوئی اور شخص مسیح کا ہم شکل بن کر پھانسی ملا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ ہی اسی جسم سمیت اور اسی لباس میں آسمان پر اُٹھائے گئے اور پھر یہ بھی تو نہیں بتلاتے کہ وہ آسمان پر بیٹھے کرتے کیا ہیں؟ بہشت میں نجّاری کا کام ہی کرتے اور بہشتیوں کے لیے تخت بناتے۔ خیر ہم کو اس سے بحث نہیں ہے، مگر جو نقشہ پیش کرتے ہیں اس کو عزیر کے قصّہ سے کیا تعلق اور نسبت ہے؟

غرض اس سلسلہ میں یعنی مسیحؑ کے قصّہ میں عُزیر کا قصّہ داخل کرنا خلطِ مبحث ہے۔ ہمارا یہ مذہب ہے کہ عزیر کے قصّہ کو مسیح کے آنے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ہاں اگر رنگِ سوال اور ہو تو اور بات ہے یعنی عزیر کیوں زندہ ہوا؟ ہم اس قِسم کی حیات کے مُنکر ہیں اور سارا قرآن اوّل سے آخر تک مُنکر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو تجویز بندوں کے لیے رکھی ہے کہ خدا تعالیٰ، اُس کے فرشتوں اُس کی کتابوں وغیرہ پر ایمان رکھ

کر خاتمہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ فرشتہ ملک الموت آکر قبضِ رُوح کر لیتا ہے اور پھر اور واقعات پیش آتے ہیں منکر نکیر آتے ہیں۔ اعمال آتے ہیں۔ پھر کھڑکی نکالی جاتی ہے۔ پھر قرآن کریم کہتا ہے کہ مُوتیٰ قیامت ہی کو اٹھیں گے۔ ... یَبْعَثُ اللّٰہُ الْمَوْتٰی معالم میں لکھا ہے کہ رجوعِ مُوتیٰ نہیں ہوتا۔

ایک اہم نکتہ

قرآن کریم کے دو حصے ہیں۔ کوئی بات قصہ کے رنگ میں ہوتی ہے۔ اور بعض احکام ہدایت کے رنگ میں ہوتے ہیں۔

بہ حیثیت ہدایت جو پیش کرتا ہے اس کا منشاء ہے کہ مان لو جیسے اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ (البقرہ: ۱۸۵) اب صوم شتر مرغ کی بیٹ کو کہتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں۔ احکام میں صفائی ہوتی ہے جبکہ اس ہدایت کے سلسلہ میں یہ فرمایا کہ ملک الموت آتا ہے اور پھر رفع ہوتا ہے اور حدیث میں اس کی تائید آئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے: فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ (الزمر: ۴۳) یعنی جس نفس پر موت کا حکم دے دیتا ہے۔ اُس کو واپس آنے نہیں دیتا۔ دیکھو۔ یہ خدا کا کلام ہے۔ قصہ کے رنگ میں نہیں بلکہ ہدایت کے رنگ میں ہے۔

جو لوگ قصص اور ہدایت میں تمیز نہیں کرتے، اُن کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قرآن کریم میں اختلاف ثابت کرنے کے مُوجب ہوتے ہیں اور گویا اپنی عملی صورت میں قرآن کریم کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف کی نسبت تو خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (النساء: ۸۳) اور عدمِ اختلاف اُس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ٹھہرائی گئی ہے، لیکن یہ ناعاقبت اندیش قصص اور ہدایات میں تمیز نہ کرنے کی وجہ سے اختلاف پیدا کر کے اس کو مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہ ٹھہراتے ہیں۔ افسوس ان کی دانش پر!!!

ان لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ مقدم ہدایات ہیں یا قصص؟ اور اگر دونوں میں تناقض پیدا ہو تو مقدم کس کو رکھو گے؟ اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ جو مَر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے اور ترمذی میں حدیث موجود ہے کہ ایک صحابی شہید ہوئے۔ اُنھوں نے عرض کی کہ یا الٰہی مجھے دنیا میں پھر بھیجو، تو خدا تعالیٰ نے جواب یہی دیا۔ قَدْ سَبَقَ الْقَوْلُ مِنِّیْ (الحدیث) حَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (الانبیاء: ۹۶)۔

اب قرآن کریم موجود ہے۔ اُس کی شرح حدیث شریف میں صاف الفاظ میں موجود ہے۔ اُس کے مقابلہ میں ایک خیالی اور فرضی کہانی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

ہم پُوچھتے ہیں کہ اس کے بعد کیا چاہتے ہو۔ ہم قرآن اور حدیث پیش کرتے ہیں۔ پھر عقلِ سلیم اور تجربہ بھی اس کا شاہد ہے۔ ہماری طرف سے خود ساختہ بات ہوتی تو تم قصہ پیش کر دیتے، مگر یہاں تو ہدایت اور اس کی تائید میں حدیث پیش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اور کیا چاہیے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ۔ (یونس: ۳۳)

قصّوں کے حقائق بنانے خدا تعالیٰ کو منظور نہیں، اُن پر ایمان لاؤ اور اُن کی تفاسیر حوالہ بخدا کرو۔

قوم کے لیے تو اعرابی بھی پُوچھتے تھے۔ ہر آیت میں حق ظاہر ہوتا ہے۔

قصّوں میں یہ بات ضرور نہیں۔ مثلاً اب یہ ضرور نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالف بُت پرستوں کا حُلیہ بھی بتا دیا جاوے۔ اس قسم کے خیالات سُوءِ ادبی پر مبنی ہوتے ہیں۔ غرض یاد رکھو کہ قصصِ قرآنی میں بیہُودہ چھیڑ چھاڑ دُرست نہیں ہے۔ انسان پابند ہدایت نہیں ہوسکتا۔ جبتک کہ تصریح نہ ہو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ہدایتوں کو آسان کر دیا۔ اسی طرز پر اللہ تعالیٰ نے یہ صراحت کی ہے کہ مُردے واپس نہیں آتے۔

ہمارے مخالفوں میں اگر دیانت اور خدا ترسی ہو، تو عزیر کا قصہ بیان کرتے وقت ضرور ہے کہ وہ ان آیات کو بھی ساتھ رکھیں۔ جس میں لکھا ہے کہ مُردے واپس نہیں آتے۔ پھر ہم بطریق تنزّل ایک اور جواب دیتے ہیں۔

اس بات کو ہم نے بیان کر دیا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ قصّوں کے لیے اجمالی ایمان کافی ہے۔ ہدایات میں چونکہ عملی رنگ لانا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے اُس کا سمجھنا ضروری ہے۔ ماسوا اس کے یہ جو لکھا ہے کہ سو برس تک مُردہ رہے اَمَاتَ کے معنے اَنَامَ بھی آئے ہیں اور قوتِ نامیہ اور حسیہ کے زوال پر بھی موت کا لفظ قرآن کریم میں بولا گیا ہے۔ بہرحال ہم سونے کے معنے بھی اصحابِ کہف کے قصہ کی طرح کر سکتے ہیں۔ اصحابِ کہف اور عزیر کے قصہ میں فرق اتنا ہے کہ اصحابِ کہف کے قِصّہ میں ایک کتا ہے اور یہاں گدھا ہے اور نفس کُتے اور گدھے دونوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ خدا نے یہودیوں کو گدھا بنایا ہے اور کُتّے کو بلعم کے قصہ میں بیان فرمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نفس پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جو بیہوش ہوتا ہے اُس کے ساتھ کُتا ہوگا یا گدھا۔

غرض دُوسرے طریق پر جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اَمَاتَ کے معنی اَنَامَ کرتے ہیں اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ سَو برس چھوڑ کر کوئی دو لاکھ برس تک سویا رہے، ہماری بحث یہ ہے کہ رُوح ملک الموت لے جاوے پھر واپس دُنیا میں نہیں آتی۔ سونے میں بھی قبضِ رُوح تو ہوتا ہے، مگر اس کو ملک الموت نہیں لے جاتا۔

اور عرصہ دراز تک سوتے رہنا ایک ایسا امر ہے کہ اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہندوؤں کی کتابوں میں دَم سادھنے (حبسِ دم کرنے) کی ترکیبیں لکھی ہوتی ہیں اور جوگ ابھیاس کی منزلوں میں دَم سادھنا بھی ہے۔ ابھی تھوڑا عرصہ گذرا ہے کہ اخبارات میں لکھا تھا کہ ریل کی سڑک تیار ہوتی تھی کہ ایک سادھو کی کٹیا نکلی ایسا ہی اخبارات میں ایک لڑکے کی بیس سال تک سوتے رہنے کی خبر گشت کر رہی تھی۔ غرض یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک آدمی سو سال تک سویا رہے۔

لَمْ يَتَسَنَّهْ کی حقیقت

پھر یہ لفظ لَمْ يَتَسَنَّهْ قابلِ غور ہے اور موجودہ زمانہ کے تجربہ پر لحاظ کرنے کے بعد لَمْ يَتَسَنَّهْ کی حقیقت سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

ایک ثقہ آدمی لکھتا ہے کہ مَیں نے گوشت کھایا ہے جو میری پیدائش سے ۴۰ برس پہلے کا پکا ہوا تھا۔ ہُوا نکال

کر بند کر لیا گیا تھا۔

اب ولایت یورپ اور امریکہ سے ہر روز ہزاروں لاکھوں بوتلوں میں لَمْ یَتَسَنَّہْ کھانے پکے پکائے چلے آتے ہیں۔ لَمْ یَتَسَنَّہْ کا اثر تو ہندوؤں کے جوگ پر پڑتا ہے اور آج کل کی علمی بلند پروازیوں کی حقیقت کھولتا ہے کہ قرآن کریم میں پہلے سے درج ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جیسے ہوا کے ایک خاص اثر سے کھانا مرجاتا ہے۔ اسی طرح انسان پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ اب اگر خاص ترکیب سے کھانے کو اس ہوا کے اثر سے محفوظ رکھ کر زندہ رکھا جاتا ہے، تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔

ممکن ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں یہ حقیقت بھی کُھل جائے کہ انسان پر کھانے کی طرح عمل ہو سکتا ہے۔ یہ علوم ہیں۔ اُن کے ماننے سے کوئی حرج لازم نہیں آتا۔

آجکل کی تحقیقات اور علمی تجربوں نے ایسے موزے بنالیے ہیں کہ انسان اُن کو پہن کر دریا پر چل سکتا ہے اور ایسے کوٹ ایجاد ہو گئے ہیں کہ آگ یا بندوق کی گولی اُن پر اپنا اثر نہیں کر سکتی۔ اسی طرح سے لَمْ یَتَسَنَّہْ کی حقیقت جو قرآن کریم کے اندر مرکوز ہے، علمی طور پر بھی ثابت ہو جائے، تو کیا تعجب ہے؟ ہوا کا اثر کھانے کو تباہ کرتا ہے اور انسان کے لیے بھی ہوا کا بڑا تعلق ہے۔ ہوا کے دو حصے ہیں۔ ایک قسم کی ہَوا اندر جاتی ہے، تو اندر تازگی پیدا ہوتی ہے۔ دُوسری دم کے ساتھ باہر آتی ہے۔ جو جلی ہوئی متعفن ہوا ہوتی ہے۔ غرض اگر لَمْ یَتَسَنَّہْ والی بات نکل آوے۔ تو ہمارا تو کچھ بھی حرج نہیں۔ بلکہ جسقدر علوم طبعی پھیلتے جاتے ہیں اور پھیلیں گے اسی قدر قرآن کریم کی عظمت اور خوبی ظاہر ہوگی۔

ہم تو آئے دن دیکھتے ہیں کہ ولایت کے پکے ہوتے شوربے اور گوشت ہندوستان میں آتے ہیں اور بگڑتے نہیں۔ ولائتی ادویات ہزاروں میل سے آتی ہیں اور مہینوں برسوں پڑی رہتی ہیں، خراب نہیں ہوتی ہیں۔ مجھے ایک شخص نے بتلایا کہ اگر انڈے کو سرسوں کے تیل میں رکھ چھوڑیں، تو نہیں بگڑتا۔

اس طرح پر ممکن ہے کہ انسان کے شباب اور طاقتوں پر بھی اثر پڑے بعض مسلمانوں نے بھی دم سادھنے کی کوشش کی ہے۔ خود میرے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ مَیں دن میں دو بار سانس لیتا ہوں۔ یہ عملی شہادت ہے کہ ہوا کو سڑنے میں دخل ہے اس قسم کی ہوا سے جب بچایا جاوے تو انسان کی عمر بڑھ جاوے، تو حرج کیا ہے اور عمر کا بڑھنا مان لیں تو کیا حرج ہے۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر حکمتیں ایجاد ہوتی ہیں یا تو طبعی طور پر خدا نے قاعدہ رکھا ہوا ہے یا عناصر کے نظام میں بات رکھی ہوتی ہے۔ کوئی محقق دیکھ کر بات نکال لیتا ہے۔ ہم کو اس پر کوئی بحث نہیں ہے۔

ہمارا تو مذہب یہ ہے کہ علومِ طبعی جس قدر ترقی کریں گے اور عملی رنگ اختیار کریں گے۔ قرآن کریم کی عظمت دُنیا میں قائم ہوگی۔[1]

۱۷ راگست ۱۹۰۰ء

مولانا عبدالکریمؓ کا خُطبہ اور حضرت اقدسؑ کی تعریف

مولانا عبدالکریمؓ صاحب نے جو خطبہ ۱۷ راگست ۱۹۰۰ء کو پڑھا۔ حضرت اقدسؑ نے اُس کی تعریف فرمائی۔ مولانا نے دوبارہ اس خُطبہ کو اپنے قلم سے لکھا ہے اور کہا کہ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میری یہ دل کی باتیں قبول کا شرف پائیں گی۔ کل صُبح کی اذان سے قبل مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے داہنے کان کے ساتھ بہت سے ٹیلیفون لگے ہیں۔ اور مختلف شہروں سے مختلف دوستوں کی طرف سے آوازیں آرہی ہیں کہ "جو کچھ آپ ہمارے مسیح موعودؑ کی نسبت کہتے ہیں۔ ہم اُس کو خُوب سمجھتے ہیں۔" مجھے خیال پڑتا ہے کہ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ "ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔" تحدیث بالنعمت کے طور پر مَیں یہ بھی لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعد نماز جمعہ حضرت اقدسؑ سے کچھ عرض کرنے کے لیے اندر گیا۔ بعد اِدھر اُدھر کے ذکر کے مَیں نے خُطبہ کی نسبت حضورؑ سے پُوچھا۔ فرمایا:

"یہ بالکل میرا مذہب ہے جو آپ نے بیان کیا۔" اور فرمایا

"یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ آپ معارفِ الٰہیہ کے بیان میں بلند چٹان پر قائم ہوگئے۔"[2]

۲۵-۲۶ راگست ۱۹۰۰ء کی درمیانی شب

کسی زبردست نشان کا پیش خیمہ

جمعہ کے دن لاہور اسٹیشن پر سب مختلف المشارب لوگ جو ہمارے بغض میں ایک گھاٹ پانی پینے لگ گئے ہیں۔ یُوں جمع ہوگئے اور پیر صاحب گولڑوی کو سوار کرا کر شہر کے اندر سے اس طرح پر تبرّا کرتے گزرے جیسے روافض سینہ پیٹتے اور قدوسیوں کو کوستے جاتے ہیں۔ بطلان نے اسی طرح رونق پیدا کرلی جیسے اُس دن جبکہ

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۲۶ صفحہ ۱-۴ مورخہ ۱۶ رجولائی ۱۹۰۰ء

[2] الحکم جلد ۴ نمبر ۳۰ صفحہ ۱۲ مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۰۰ء

دو جہاں کے سردار کو مکّہ سے نکالا گیا تھا اور کفارِ قریش نے چند روز کے لیے چراغاں کر کے جھوٹی خوشی منائی تھی۔
آج حق کو جھوٹا کہا جا رہا ہے اور راستی پاؤں تلے کچلی جا رہی ہے اور بہت سے شقی چاروں طرف سے اُٹھے ہیں۔
آج وُہ الہام پُورا ہوا، جو کچھ مدّت ہوئی شائع کیا تھا۔

"وُہ بیت الصّدق کو بیت التزویر بنانا چاہتے ہیں۔"

رات حضرت مرسل اللہ علیہ السلام اس امر پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ فرمایا :

"ان شوروں سے ہم پر کیا رُعب پڑ سکتا ہے۔ ہمیں تو یہ سارے شور ایک تمہید معلوم ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی اُس نصرت کی آمد کے لیے جو دیر سے معرضِ التوا میں ہے۔ عادت اللہ ہمیشہ یُوں ہی ہے کہ جب تکذیب شدّت سے ہوتی ہے، تو غیرتِ الٰہی اسی قدر نصرت کے لیے جوش مارتی ہے۔ آتھم کے شور پر جو ہماری تکذیب اور اہانت ہوئی۔ خدا تعالیٰ کی غیرت نے بہت جلد لیکھرام کا نشان ظاہر کیا۔ اسی طرح ہم قوی اُمید رکھتے ہیں کہ یہ شورِ تکذیب پیش خیمہ ہے کسی زبردست نشان کا۔ ممکن ہے کہ کوئی بدقسمت اس شور کے رُعب میں آ کر کٹ جائے۔ اُس کا علاج ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ سنّت اللہ یہی ہے[1]"

اگست ۱۹۰۰ء

حقیقی نفع رساں اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے

دُنیا میں لوگ حکّام یا دُوسرے لوگوں سے کسی قسم کا کوئی نفع اُٹھانے کی ایک خیالی امید پر اُن کو خوش کرنے کے واسطے کس کس قسم کی خوشامد کرتے ہیں۔ یہانتک کہ ادنیٰ ادنیٰ درجہ کے اردلیوں اور خدمتگاروں تک کو خوش کرنا پڑتا ہے؛ حالانکہ اگر وُہ حاکم راضی اور خوش بھی ہو جاوے، تو اس سے صرف چند روز تک یا کسی موقعِ مخصوص پر نفع پہنچنے کی اُمید ہو سکتی ہے۔ اس خیالی امید پر انسان اُس کے خدمتگاروں کی ایسی خوشامدیں کرتا ہے کہ مَیں تو ایسی خوشامدوں کے تصوّر سے بھی کانپ اُٹھتا ہوں اور میرا دل ایک رنج سے بھر جاتا ہے کہ نادان انسان اپنے جیسے انسان کی ایک وہمی اور خیالی امید پر اس قدر خوشامد کرتا ہے۔ مگر اُس مُعطیِ حقیقی کی جس نے بدُوں کسی معاوضہ کے اور التجا کے اس پر بے انتہا فضل کئے ہیں۔ ذرا بھی پروا نہیں کرتا؛ حالانکہ اگر وہ انسان اُس کو نفع پہنچانا بھی چاہے تو کیا؟ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ کوئی نفع خدا تعالیٰ کے بدُوں پہنچ ہی نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ اس سے پیشتر کہ وہ نفع اُٹھائے، نفع پہنچانے والا یا خود یہ اس دنیا سے اُٹھ جائے یا کسی ایسی خطرناک مرض میں

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۵ صفحہ ۸ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۶ء (مکتوبات کریمیہ پہلا خط)

مبتلا ہو جائے کہ کوئی حظ اور فائدہ ذاتی اس سے اُٹھا نہ سکے۔ غرض اصل بات یہی ہے کہ جبتک اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم انسان کے شاملِ حال نہ ہو۔ انسان کسی سے کوئی فائدہ اٹھا ہی نہیں سکتا۔ پھر جبکہ حقیقی نفع رساں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ پھر کس قدر بے حیائی ہے کہ انسان غیروں کے دروازے پر ناک رگڑتا پھرے۔ ایک خداترس مومن کی غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ وُہ اپنے جیسے انسان کی ایسی خوشامد کرے جو اُس کا حق نہیں ہے۔ متقی کے لیے خود اللہ تعالیٰ ہر ایک قسم کی راہیں نکال دیتا ہے اُس کو ایسی جگہ سے رزق ملتا ہے کہ کسی دُوسرے کو علم بھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ خود اُس کا ولی اور مربّی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بندے جو دین کو دُنیا پر مقدم کر لیتے ہیں۔ اُن کے ساتھ وہ رأفت اور محبّت کرتا ہے؛ چنانچہ خود فرماتا ہے۔ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ (بقرہ: ۲۰۸)

خدا تعالیٰ کے بندے کون ہیں ؟

یہ وُہی لوگ ہیں جو اپنی زندگی کو جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی راہ میں وقف کر دیتے ہیں اور اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا، اپنے مال کو اُس کی راہ میں صرف کرنا اُس کا فضل اور اپنی سعادت سمجھتے ہیں، مگر جو لوگ دُنیا کی املاک و جائداد کو اپنا مقصود بالذّات بنا لیتے ہیں، وہ ایک خوابیدہ نظر سے دین کو دیکھتے ہیں، مگر حقیقی مومن اور صادق مُسلمان کا یہ کام نہیں ہے۔ سچّا اسلام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی ساری طاقتوں اور قوّتوں کو مادام الحیات وقف کر دے، تاکہ وہ حیاتِ طیّبہ کا وارث ہو؛ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ اس الٰہی وقف کی طرف ایماء کر کے فرماتا ہے۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ: ۱۱۳) اس جگہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کے معنی یہی ہیں کہ ایک نیستی اور تذلّل کا لباس پہن کر آستانۂ الوہیت پر گرے اور اپنی جان، مال، آبرو غرض جو کچھ اس کے پاس ہے۔ خدا ہی کے لیے وقف کرے اور دُنیا اور اُس کی ساری چیزیں دین کی خادم بنا دے۔

حصُولِ دُنیا میں مقصود بالذّات دین ہو

کوئی یہ نہ سمجھ لیوے کہ انسان دُنیا سے کچھ غرض اور واسطہ ہی نہ رکھے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ دُنیا کے حصول سے منع کرتا ہے، بلکہ اسلام نے رہبانیّت کو منع فرمایا ہے۔ یہ بُزدلوں کا کام ہے۔ مومن کے تعلقات دُنیا کے ساتھ جس قدر وسیع ہوں وُہ اس کے مراتبِ عالیہ کا موجب ہوتے ہیں، کیونکہ اُس کا نصب العین دین ہوتا ہے اور دُنیا، اُس کا مال و جاہ دین کا خادم ہوتا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ دُنیا مقصود بالذّات نہ ہو۔ بلکہ حصُولِ دُنیا میں اصل غرض دین ہو اور ایسے طور پر دُنیا کو حاصل کیا جاوے کہ وُہ دین کی خادم ہو۔ جیسے انسان کسی جگہ سے دُوسری جگہ جانے کے واسطے سفر کے لیے سواری اور زادِ راہ کو ساتھ لیتا ہے تو اس کی اصل غرض منزلِ مقصود پر پہنچنا ہوتا ہے نہ خود سواری اور راستہ کی ضروریات۔ اس طرح پر انسان دُنیا کو حاصل

کرے، مگر دین کا خادم سمجھ کر۔

اللہ تعالیٰ نے جو یہ دُعا تعلیم فرمائی ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (البقرۃ: ۲۰۲) اس میں بھی دُنیا کو مقدّم کیا ہے، لیکن کس دُنیا کو؟ حسنۃ الدّنیا کو جو آخرت میں حسنات کا مُوجب ہو جاتے۔ اس دُعا کی تعلیم سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ مومن کو دُنیا کے حصُول میں حسنات الآخرۃ کا خیال رکھنا چاہیے اور ساتھ ہی حَسَنَۃ الدنیا کے لفظ میں ان تمام بہترین ذرائع حصولِ دُنیا کا ذکر آگیا ہے جو ایک مومن مُسلمان کو حصُولِ دُنیا کے لیے اختیار کرنے چاہئیں۔ دُنیا کو ہر ایسے طریق سے حاصل کرو جس کے اختیار کرنے سے بھلائی اور خُوبی ہی ہو۔ نہ وُہ طریق جو کسی دوسرے بنی نوع انسان کی تکلیف رسانی کا موجب ہو۔ نہ ہم جنسوں میں کسی عار و شرم کا باعث۔ ایسی دنیا بے شک حسنۃ الآخرۃ کا مُوجب ہوگی۔

سُست نہ بنو

پس یاد رکھو کہ جو شخص خدا کے لیے زندگی وقف کر دیتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وُہ بے دست و پا ہو جاتا ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ دین اور للّٰہی وقف انسان کو ہوشیار اور چابکدست بنا دیتا ہے سُستی اور کسل اُس کے پاس نہیں آتا۔ حدیث میں عمارۃ بن خزیمہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے میرے باپ کو فرمایا کہ تجھے کس چیز نے اپنی زمین میں درخت لگانے سے منع کیا ہے تو میرے باپ نے جواب دیا کہ میں بڈھا ہوں۔ کل مر جاؤں گا۔ پس اُس کو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تجھ پر ضرور ہے کہ درخت لگائے۔ پھر میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ خود میرے باپ کے ساتھ مِل کر ہماری زمین میں درخت لگاتے تھے اور ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہمیشہ عجز اور کسل سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ سُست نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ حصولِ دنیا سے منع نہیں کرتا، بلکہ حَسَنَۃ الدنیا کی دُعا تعلیم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ انسان بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہے بلکہ اُس نے صاف فرمایا ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم: ۴۰) اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ جدّ و جُہد سے کام کرے، لیکن جس قدر مرتبہ مجُھ سے ممکن ہے یہی کہوں گا کہ دُنیا کو مقصُود بالذات نہ بناؤ۔ دین کو مقصُود بالذات ٹھہراؤ اور دُنیا اس کے لیے بطور خادم اور مرکب کے ہو۔ دولت مندوں سے بسا اوقات ایسے کام ہوتے ہیں کہ غریبوں اور مُفلسوں کو وہ موقع نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وقت میں خلیفہ اوّل نے جو بڑے ملک التجار تھے مُسلمان ہو کر لانظیر مدد کی اور آپ کو یہ مرتبہ مِلا کہ صدیق کہلائے اور پہلے رفیق اور خلیفۂ اوّل ہوئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان

لکھا ہے کہ جب آپ تجارت سے واپس آئے تھے اور ابھی مکّہ میں نہ پہنچے تھے کہ راستہ میں ہی ایک شخص ملا۔ اس سے پوچھا کہ کوئی تازہ خبر سناؤ۔ اس نے کہا کہ اور تو کوئی تازہ خبر نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ تمہارے دوست نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔ ابوبکرؓ نے وہیں کھڑے ہو کر کہا کہ اگر اُس نے یہ دعویٰ کیا ہے تو سچا ہے! چنانچہ

جب مکے میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپؐ سے دریافت کیا کہ کیا آپؐ نے واقعی پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں اور اُسی وقت مشرف باسلام ہو گئے۔" حضرت ابوبکر صدیقؓ کو قبولِ اسلام کے لیے کسی اعجاز کی ضرورت نہ پڑی۔ اعجاز بینی کے خواہشمند وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کو تعارفِ ذاتی نہیں ہوتا، لیکن جس کو تعارفِ ذاتی ہو جاوے، اُسے اعجاز کی ضرورت اور خواہش ہوتی ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے معجزہ نہیں مانگا کیونکہ وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے واقف تھے اور خوب جانتے تھے کہ وہ راستباز اور امین ہے جھوٹا اور مفتری نہیں، جبکہ کسی انسان پر کبھی افترا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا۔

پس یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نشان صرف اس لیے مانگا جاتا ہے کہ اس بات کے امکان کا اندیشہ گزرتا ہو کہ شاید جھوٹ ہی بولا ہو، مگر جب یہ بات اچھی طرح معلوم ہو کہ مدّعی صادق اور امین ہے۔ پھر نشان بینی کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ بھی یاد رہے کہ جو لوگ نشان دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ راسخ الایمان نہیں ہو سکتے بلکہ ہر وقت خطرہ کے محل میں رہتے ہیں۔ ایمان بالغیب کے ثمرات اُن کو نہیں ملتے۔ کیونکہ ایمان بالغیب کے اندر ایک فعل نیکی کا حُسنِ ظنّ بھی ہے۔ جس سے وہ جلد باز بے نصیب رہ جاتا ہے جو نشان دیکھنے کے لیے جلدی کرتا اور زور دیتا ہے۔ مسیح علیہ السّلام کے حواریوں نے نزُولِ مائدہ کے لیے زور دیا تو خدا تعالیٰ نے ان کو زجر بھی کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہم تو مائدہ نازل کریں گے، لیکن بعد نزُولِ مائدہ جو انکار کرے گا، اس پر سخت عذاب نازل ہو گا۔ قرآن شریف میں اس قصّہ کے ذکر سے یہ فائدہ ہے کہ تا بتلایا جاوے کہ بہترین ایمان کونسا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشانات یُوں تو اجلیٰ بدیہیات سے ہوتے ہیں، لیکن اُن کے ساتھ ایک طرف اتمامِ حجت منظور ہوتا ہے اور دُوسری طرف ابتلائے اُمت۔ اس لیے بعض امُور ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ ایک ابتلا رکھتے ہیں اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ نشان مانگنے والے لوگ مستعجل اور حسنِ ظن سے حصّہ نہ رکھنے والے ہوتے ہیں اور اُن کی طبیعت میں ایک احتمال اور شک پیدا کرنے کا مادہ ہوتا ہے۔ تب ہی تو وہ نشان مانگتے ہیں۔ اس لیے جب نشان دیکھتے ہیں، تو پھر بیہودہ طور پر اس کی تاویلیں کرنی شروع کر دیتے ہیں اور اس کو کبھی سحر کہتے ہیں، کبھی کچھ نام رکھتے ہیں۔ غرض وہ وہم پیدا کرنے والی طبیعت اُن کو امرِ حق سے دُور لے جاتی ہے۔ اس لیے مَیں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم وُہ ایمان پیدا کرو جو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صحابہ کا ایمان تھا۔ رضی اللہ عنہم۔ کیونکہ اس میں حُسنِ ظنّ اور صبر ہے اور وہ بہت سے برکات اور ثمرات کا منبع ہے۔ اور نشان دیکھ کر ماننا

لہ الحکم جلد ۴ نمبر ۲۹ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۱۶؍ اگست ۱۹۰۰ء

اور ایمان لانا اپنے ایمان کو مشروط بنانا ہے۔ یہ کمزور ہوتا ہے اور عموماً بارور نہیں ہوتا۔ ہاں جب انسان حُسنِ ظن کے ساتھ ایمان لاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے مومن کو وُہ نشان دکھاتا ہے جو اُس کے ازدیادِ ایمان کا موجب اور انشراحِ صدر کا باعث ہوتا ہے، خود اُن کو نشان اور آیت اللہ بنا دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقتراحی نشان کسی نبی نے نہیں دکھلائے مومن صادق کو چاہیے کہ کبھی اپنے ایمان کو نشان بینی پر مبنی نہ کرے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت

مَیں پھر اصل بات کی طرف رجُوع کر کے کہتا ہوں کہ دولتمند اور متموّل لوگ دین کی خدمت اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (البقرہ: ۴) متقیوں کی صفت کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ یہاں مال کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ مقصُود اس سے یہ ہے کہ انسان اپنے بنی نوع کا ہمدرد اور خادم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت کا انحصار دو ہی باتوں پر ہے۔ تعظیم لامر اللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ۔ پس مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ میں شفقت علیٰ خلق اللہ کی تعلیم ہے۔

ایک دفعہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے روپیہ کی ضرورت بتلائی، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر کا کُل اثاث البیت لے کر حاضر ہوگئے۔ آپؐ نے پُوچھا ابوبکر! گھر میں کیا چھوڑ آئے۔ تو جواب میں کہا۔ اللہ اور رسُول کا نام چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نصف لے آئے۔ آپؐ، صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ عمرؓ! گھر میں کیا چھوڑ آئے۔ تو جواب دیا کہ نصف۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کے فعلوں میں جو فرق ہے، وُہی اُن کے مراتب میں فرق ہے۔

دُنیا میں انسان مال سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی واسطے علم تعبیر الرؤیا میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دیکھے کہ اس نے جگر نکال کر کسی کو دیا ہے تو اس سے مُراد مال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی اتقاء اور ایمان کے حصُول کے لیے فرمایا: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آلِ عمران: ۹۳) حقیقی نیکی کو ہرگز نہ پاؤ گے جب تک تم عزیز ترین چیز نہ خرچ کرو گے، کیونکہ مخلوقِ الٰہی کے ساتھ ہمدردی اور سلوک کا ایک بڑا حِصّہ مال کے خرچ کرنے کی ضرورت بتلاتا ہے اور ابنائے جنس اور مخلوقِ خدا کی ہمدردی ایک ایسی شے ہے جو ایمان کا دُوسرا جزو ہے جس کے بدُوں ایمان کامل اور راسخ نہیں ہوتا۔ جب تک انسان ایثار نہ کرے۔ دُوسرے کو نفع کیونکر پہنچا سکتا ہے۔ دُوسرے کی نفع رسانی اور ہمدردی کے لیے ایثار ضروری شے ہے اور اس آیت میں لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں اسی ایثار کی تعلیم اور ہدایت فرمائی گئی ہے۔

پس مال کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا بھی انسان کی سعادت اور تقویٰ شعاری کا معیار اور محک ہے۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کی زندگی میں للّٰہی وقف کا معیار اور محک وہ تھا جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضرورت بیان کی اور وہ کل اثاث البیت لے کر حاضر ہوگئے۔

انبیاء علیہم السلام کو ضرورتیں کیوں لاحق ہوتی ہیں

مَیں یہاں ایک ضروری امر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو ضرورتیں کیوں لاحق ہوتی ہیں؟ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اُن کو کوئی ضرورت پیش نہ آوے۔ مگر یہ ضرورتیں اس لیے لاحق ہوتی ہیں تاکہ للّٰہی وقف کے نمونے مثال کے طور پر قائم ہوں اور ابوبکرؓ کی زندگی کا وقف ثابت ہو اور دُنیا میں خدائے مُقتدر کی ہستی پر ایمان پیدا ہو اور ایسے للّٰہی وقف کرنے والے دُنیا کے لیے بطور آیت اللہ کے ٹھہریں اور اس مخفی لذّت اور محبت پر دُنیا کو اطلاع ملے، جس کے سامنے مال و دولت جیسی محبُوب اور مرغوب شئے بھی آسانی اور خوشی کے ساتھ قربان ہو سکتی ہے اور پھر مال و دولت کے خرچ کے بعد للّٰہی وقف کو مکمل کرنے کے واسطے وہ قوت اور شجاعت، ملے کہ انسان جان جیسی شئے کو بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں دینے سے دریغ نہ کرے۔

غرض انبیاء علیہم السلام کی ضرورتوں کی اصل غرض دُنیا کی جھوٹی محبتوں اور فانی چیزوں سے مُنہ موڑنے کی تعلیم دینے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر لذیذ ایمان پیدا کرنے اور ابنائے جنس کی بہتری اور خیرخواہی کے لیے ایثار کی قوت پیدا کرنے کے واسطے ہوتی ہے؛ ورنہ یہ پاک گروہ خزائن السمٰوات والارض کے مالک کی نظر میں چلتا ہے۔ ان کو کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے؟ وُہ ضرورتیں تعلیم کو کامل کرنے اور انسان کے اخلاق اور ایمان کے رسُوخ کے لیے پیش آتی ہیں[1]۔

یقین کا کامل مرتبہ

مفسّر کہتے ہیں کہ یقین سے مُراد موت ہے، مگر موت رُوحانی مراد ہے اور یہ ظاہری بات ہے کہ اس کا مقصُود بالذات کیا ہو۔ جس کی تلاش کرنے کے لیے یہاں ایماء اور اشارہ ہے۔

مگر مَیں کہتا ہوں کہ وُہ روحانی موت ہو یا روحانی زندگی تمہاری زندگی خدا ہی کی راہ میں وقف ہو۔ مومن کو لازم ہے کہ اس وقت تک عبادت سے نہ تھکے اور سُست نہ ہو۔ جب تک یہ جھُوٹی زندگی بھسم نہ ہو جاوے اور اس کی جگہ نئی زندگی جو اَبدی اور راحت بخش زندگی ہے، اُس کا سلسلہ شروع نہ ہو جاوے اور جب تک اس عارضی حیات دنیا کی سوزش اور جلن دُور ہو کر ایمان میں ایک لذّت اور رُوح میں ایک سکینت اور استراحت پیدا نہ ہو۔ یقیناً سمجھو کہ جب تک انسان اس حالت تک نہ پہنچے۔ ایمان کامل اور ٹھیک نہیں ہوتا۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ تو عبادت

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۳۰ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۲۴؍اگست ۱۹۰۰ء

کرتا رہ جب تک کہ تجھے یقینِ کامل کا مرتبہ حاصل نہ ہو اور تمام حجاب اور ظلماتی پردے دُور ہو کر یہ سمجھ میں نہ آجائے کہ اب مَیں وُہ نہیں ہوں جو پہلے تھا، بلکہ اب تو نیا ملک، نئی زمین، نیا آسمان ہے اور مَیں بھی کوئی نئی مخلوق ہوں۔ یہ حیاتِ ثانی وہی ہے جس کو صوفی بقاء کے نام سے موسُوم کرتے ہیں۔ جب انسان اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی رُوح کا نفخ اُس میں ہوتا ہے۔ ملائکہ کا اُس پر نزول ہوتا ہے۔ یہی وُہ راز ہے جس پر پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت فرمایا کہ اگر کوئی چاہے کہ مُردہ اور میت کو زمین پر چلتا ہوا دیکھے تو وہ ابوبکرؓ کو دیکھے۔ اور ابو بکرؓ کا درجہ اُس کے ظاہری اعمال سے ہی نہیں بلکہ اس بات سے ہے جو اُس کے دل میں ہے۔

ایمان ایک راز ہے

مگر یاد رکھو۔ ایمان ایک راز ہوتا ہے جو مومن اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے اور جس کو مخلوق میں سے اس مومن کے سوا دُوسرا نہیں جان سکتا اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ کی حقیقت یہی ہے۔ بعض اوقات وُہ لوگ جو علومِ حقہ اور معارفِ الٰہیہ سے بہرہ وَر نہیں ہوتے۔ کسی مومن کے ان تعلقات کے عدمِ علم کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کو ہوتے ہیں۔ اُس کی بعض حالتوں مثلاً معاملاتِ رزق و معاش پر حیرت اور تعجب ظاہر کرتے ہیں اور کبھی یہ تعجب اُن کو بدظنی اور گمراہی تک لے جاتا ہے، اس لیے اُن کی نظر اپنے ہی محدود اسباب پر ہوتی ہے۔ اور وہ اس راز اور سِرّ سے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ رکھتا ہے۔ ناواقف ہوتے ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ہمارے دوست اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس راز کو ایسا بنائیں جو صحابہ کرامؓ کا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کریں

غرض یہ ہے کہ انسان کو ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی زندگی کو وقف کرے۔ مَیں نے بعض اخبارات میں پڑھا ہے کہ فلاں آریہ نے اپنی زندگی آریہ سماج کے لیے وقف کر دی اور فلاں پادری نے اپنی عمر مشن کو دے دی۔ مجھے حیرت آتی ہے کہ کیوں مسلمان اسلام کی خدمت کے لیے اور خدا کی راہ میں اپنی زندگی کو وقف نہیں کر دیتے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ پر نظر کر کے دیکھیں، تو اُن کو معلوم ہو کہ کس طرح اسلام کی زندگی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی جاتی تھیں۔

یاد رکھو کہ یہ خسارہ کا سودا نہیں ہے، بلکہ بے قیاس نفع کا سودا ہے۔ کاش مسلمانوں کو معلوم ہوتا اور اس تجارت کے مفاد اور منافع پر اُن کو اطلاع ملتی جو خدا کے لیے اس کے دین کی خاطر اپنی زندگی وقف کرتا ہے۔ کیا وُہ اپنی زندگی کھوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ: ۱۱۳) اس للّٰہی وقف کا اجر اُن کا رَبّ دینے والا ہے۔ یہ وقف ہر قسم کے ہموم و غموم سے نجات اور رہائی بخشنے والا ہے۔

مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ جبکہ ہر ایک انسان بالطبع راحت اور آسائش چاہتا ہے اور ہموم و غموم اور کرب و افکار

سے خواستگارِ نجات ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کو ایک مجرب نسخہ اس مرض کا پیش کیا جاوے تو اس پر توجہ ہی نہ کرے۔ کیا الٰہی وقف کا نسخہ ۱۳۰۰ برس سے مجرب ثابت نہیں ہوا؟ کیا صحابہ کرامؓ اسی وقف کی وجہ سے حیاتِ طیبہ کے وارث اور اَبدی زندگی کے مستحق نہیں ٹھہرے؟ پھر اب کونسی وجہ ہے کہ اس نسخہ کی تاثیر سے فائدہ اٹھانے میں دریغ کیا جاوے۔

بات یہی ہے کہ لوگ اس حقیقت سے ناآشنا اور اس لذت سے جو اس وقف کے بعد ملتی ہے، ناواقفِ محض ہیں؛ ورنہ اگر ایک شمہ بھی اس لذت اور سُرور سے اُن کو مِل جاوے، تو بے انتہا تمناؤں کے ساتھ وہ اس میدان میں آئیں۔

اپنا ذاتی تجربہ اور وصیّت

میں خود جو اس راہ کا پورا تجربہ کار ہوں اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور فیض سے مَیں نے اس راحت اور لذت سے حظ اٹھایا ہے۔ یہی آرزو رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کے لیے اگر مَر کے پھر زندہ ہوں اور پھر مروں اور زندہ ہوں تو ہر بار میرا شوق ایک لذت کے ساتھ بڑھتا ہی جاوے۔

پس میں چونکہ خود تجربہ کار ہوں اور تجربہ کر چکا ہوں اور اس وقف کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ جوش عطا فرمایا ہے کہ اگر مجھے یہ بھی کہہ دیا جاوے کہ اس وقف میں کوئی ثواب اور فائدہ نہیں ہے، بلکہ تکلیف اور دُکھ ہوگا۔ تب بھی مَیں اسلام کی خدمت سے رُک نہیں سکتا، اس لیے مَیں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنی جماعت کو وصیّت کروں اور یہ بات پہنچا دُوں آئندہ ہر ایک کا اختیار ہے کہ وُہ اُسے سُنے یا نہ سُنے! اگر کوئی نجات چاہتا ہے اور حیاتِ طیبہ یا اَبدی زندگی کا طلبگار ہے، تو وُہ اللہ کے لیے اپنی زندگی وقف کرے اور ہر ایک اس کوشش اور فکر میں لگ جاوے کہ وُہ اس درجہ اور مرتبہ کو حاصل کرے کہ کہہ سکے کہ میری زندگی، میری موت، میری قربانیاں، میری نمازیں اللہ ہی کے لیے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح اُس کی رُوح بول اُٹھے۔ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ (البقرہ: ۱۳۲) جب تک انسان خدا میں کھویا نہیں جاتا، خدا میں ہو کر نہیں مرتا وُہ نئی زندگی پا نہیں سکتا۔

پس تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ خدا کے لیے زندگی کا وقف میں اپنی زندگی کی اصل غرض سمجھتا ہوں۔ پھر تم اپنے اندر دیکھو کہ تم میں سے کتنے ہیں جو میرے اِس فعل کو اپنے لیے پسند کرتے اور خدا کے لیے زندگی وقف کرنے کو عزیز رکھتے ہیں[1]

انسان اگر اللہ تعالیٰ کے لیے زندگی وقف نہیں کرتا۔ تو وُہ یاد رکھے کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہنّم

---

[1] الحکم نمبر ۳۱ جلد ۴ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۰ء

کو پیدا کیا ہے۔ اس آیت سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ بعض خام خیال کوتاہ فہم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہر ایک آدمی کو جہنّم میں ضرور جانا ہوگا۔ یہ غلط ہے۔ یہ غلط ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ تھوڑے ہیں جو جہنّم کی سزا سے بالکل محفوظ ہیں اور یہ تعجب کی بات نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ (سبا : ۱۴)

جہنّم کی حقیقت

اب سمجھنا چاہیے کہ جہنّم کیا چیز ہے؟ ایک جہنّم تو وُہ ہے۔ جس کا مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ہے اور دُوسرے یہ زندگی بھی اگر خدا تعالیٰ کے لیے نہ ہو، تو جہنّم ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے انسان کا تکلیف سے بچانے اور آرام دینے کے لیے متولی نہیں ہوتا۔ یہ خیال مت کرو کہ کوئی ظاہر دولت یا حکومت، مال و عزّت، اولاد کی کثرت کسی شخص کے لیے کوئی راحت یا اطمینان، سکینت کا موجب ہو جاتی ہے۔ اور وُہ دمِ نقد بہشت ہی ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ اطمینان اور وُہ تسلّی اور وہ تسکین جو بہشت کے انعامات میں سے ہے، ان باتوں سے نہیں ملتی وُہ خدا ہی میں زندہ رہنے اور مرنے سے مِل سکتی ہے۔ جس کے لیے انبیاء علیہم السّلام خصوصاً ابراہیم اور یعقوب علیہما السّلام کی یہی وصیّت تھی کہ لَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (البقرہ : ۱۳۳) لذاتِ دُنیا تو ایک قسم کی ناپاک حرص پیدا کر کے طلب اور پیاس کو بڑھا دیتی ہیں۔ استسقاء کے مریض کی طرح پیاس نہیں بجھتی۔ یہاں تک کہ وُہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ پس یہ بے جا آرزوؤں اور حسرتوں کی آگ بھی منجملہ اسی جہنّم کی آگ کے ہے جو انسان کے دل کو راحت اور قرار نہیں لینے دیتی، بلکہ اُس کو ایک تذبذب اور اضطراب میں غلطاں و پیچاں رکھتی ہے۔ اس لیے میرے دوستوں کی نظر سے یہ امر ہرگز پوشیدہ نہ رہے کہ انسان مال و دولت یا زن و فرزند کی محبت کے جوش اور نشے میں ایسا دیوانہ اور از خود رفتہ نہ ہو جاوے کہ اُس میں اور خدا میں ایک حجاب پیدا ہو جاوے۔ مال اور اولاد اسی لیے تو فِتنہ کہلاتی ہے۔ اُن سے بھی انسان کے لیے ایک دوزخ تیار ہوتا ہے اور جب وُہ اُن سے الگ کیا جاتا ہے تو سخت بے چینی اور گھبراہٹ ظاہر کرتا ہے اور اس طرح پر یہ بات کہ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ (الھمزۃ : ۷،۸) منقولی رنگ میں نہیں رہتا بلکہ معقولی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پس یہ آگ جو انسانی دل کو جلا کر کباب کر دیتی ہے اور ایک جلے ہوئے کوئلے سے بھی سیاہ اور تاریک بنا دیتی ہے۔ یہ وُہی غیر اللہ کی محبت ہے۔

دو چیزوں کے باہم تعلق اور رگڑ سے ایک حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح پر انسان کی محبت اور دُنیا اور دُنیا کی چیزوں کی محبت کی رگڑ سے الٰہی محبت جل جاتی ہے اور دل تاریک ہو کر خدا سے دُور ہو جاتا اور ہر قسم کی بے قراری کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن جبکہ دُنیا کی چیزوں سے جو تعلق ہو وُہ خدا میں ہو کر ایک تعلق ہو اور اُن کی محبت خدا کی محبت میں ہو کر ہو۔ اُس وقت باہمی رگڑ سے غیر اللہ کی محبت جل جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک روشنی اور نُور بھر دیا جاتا ہے پھر خُدا کی رضا اُس کی رضا اور اس کی رضا خدا کی رضا کا منشاء ہو جاتا ہے۔ اس حالت پر پہنچ کر خدا کی محبت

اس کے لیے بمنزلہ جان ہوتی ہے اور جس طرح زندگی کے واسطے لوازم زندگی ہیں۔ اُس کی زندگی کے واسطے خدا اور صرف خدا ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی خوشی اور راحت خدا ہی میں ہوتی ہے۔ پھر دُنیاداروں کے نزدیک اگر اسے کوئی رنج اور کرب پہنچے تو پہنچے لیکن اصل یہی بات ہے کہ اس ہمّ وغم میں بھی وہ اطمینان اور سکینت سے الٰہی لذّت لیتا ہے جو کسی دُنیادار کی نظر میں بڑے سے بڑے فارغ البال کو بھی نصیب نہیں۔

برخلاف اس کے جو کچھ حالت انسان کی ہے، وہ جہنّم ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کے سوا زندگی بسر کرنا یہ بھی جہنّم ہے۔

پھر حدیث شریف سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ تپ بھی حرارتِ جہنّم ہی ہے۔ امراض اور مصائب جو مختلف قسم کے انسان کو لاحق حال ہوتے ہیں۔ یہ بھی جہنّم ہی کا نمونہ ہے اور یہ اس لیے کہ تا دُوسرے عالم پر گواہ ہوں اور جزا و سزا کے مسئلہ کی حقیقت پر دلیل ہوں اور کفّارہ جیسے لغو مسئلہ کی تردید کریں۔ مثلاً جذام ہی کو دیکھو کہ اعضاء گر گئے ہیں اور رقیق مادّہ اعضاء سے جاری ہے۔ آواز بیٹھ گئی ہے۔ ایک تو یہ بجائے خود جہنّم ہے۔ پھر لوگ نفرت کرتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں۔ عزیز سے عزیز بیوی، فرزند، ماں باپ تک کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بعض اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں۔ بعض اور خطرناک امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پتھریاں ہو جاتی ہیں اور پیٹ میں رسولیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ ساری بلائیں اس لیے انسان پر آتی ہیں کہ وہ خدا سے دُور ہو کر زندگی بسر کرتا ہے اور اُس کے حضور شوخی اور گستاخی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی باتوں کی عزّت اور پرواہ نہیں کرتا ہے۔ اُس وقت ایک جہنّم پیدا ہو جاتا ہے۔

اب پھر میں اصل مطلب کی طرف رجُوع کر کے کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے جہنّم کے لیے اکثر انسانوں جنّوں کو پیدا کیا ہے اور پھر فرمایا کہ وہ جہنّم اُنھوں نے خود ہی بنا لیا ہے۔ اُن کو جنّت کی طرف بُلایا جاتا ہے۔ پاک دل پاکیزگی سے باتیں سُنتا ہے اور ناپاک خیال انسان اپنی کورانہ عقل پر عمل کر لیتا ہے۔ پس آخرت کا جہنّم بھی ہوگا اور دُنیا کے جہنّم سے بھی مخلصی اور رہائی نہ ہوگی، کیونکہ دُنیا کا جہنّم تو اس جہنّم کے لیے بطور دلیل اور ثبوت کے ہے[۱]۔

وَعظ کا منصب

نااہل پلید لوگ سچّی اور حق و حکمت کی بات سُن ہی نہیں سکتے اور جب کبھی کوئی بات معرفت اور حکمت کی اُن کے سامنے پیش کی جائے تو وہ اس پہ توجہ نہیں کرتے بلکہ لاپرواہی سے ٹال دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وُہ لوگ جو حق کہیں وہ بھی تھوڑے ہیں۔ محض اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کو حق کہنے والے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ گویا ہے ہی نہیں۔ علی العموم واعظ وعظ کہتے ہیں، لیکن اُن کی اصل غرض اور مقصود

۱؎ الحکم جلد ۴ نمبر ۳۳ صفحہ ۶ و ۷ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۰ء

صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے کچھ وصول کریں اور دُنیا کما دیں۔ یہ غرض جب اُس کی باتوں کے ساتھ ملتی ہے تو حقانیت اور للہیت کو اپنی تاریکی میں چھپا لیتی ہے اور وہ لذت اور معرفت کی خوشبو جو کلامِ الٰہی کے سُننے سے دل و دماغ میں پہنچتی اور رُوح کو معطر کر دیتی ہے وُہ خود غرضی اور دُنیا پرستی کے تعفن میں دَب کر رہ جاتی ہے اور اسی مجلس میں لوگ کہہ اُٹھتے ہیں۔ میاں یہ ساری باتیں ٹکڑا کمانے کی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اکثر لوگوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ذریعۂ معاش قرار دے لیا ہے، لیکن ہر ایک ایسا نہیں ہے۔

ایسے پاک دل انسان بھی ہوتے ہیں جو صرف اس لیے خدا اور اُس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لوگوں تک پہنچاتے ہیں کہ امر بالمعرُوف اور نہی عن المنکر کے لیے وُہ مامور ہیں اور اُس کو فرض سمجھتے ہیں اور وُہ چاہتے ہیں کہ اس طرح پر اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کریں۔ وعظ کا منصب ایک اعلیٰ درجہ کا منصب ہے اور وہ گویا شانِ نبوت اپنے اندر رکھتا ہے، بشرطیکہ خدا ترسی کو کام میں لایا جاوے۔

وعظ کہنے والا اپنے اندر خاص قسم کی اصلاح کا موقعہ پالیتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کے سامنے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم اپنے عمل سے بھی ان باتوں کو کرکے دکھا دے جو وہ کہتا ہے۔

بہرحال اگر ایک آدمی اپنی ہی غرض و منشاء کے لیے کوئی بھلی بات کہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس سے اس لیے اعراض کیا جائے کہ وہ اپنی کسی ذاتی غرض کی بنا پر کہہ رہا ہے۔ وہ بات جو کہتا ہے وہ تو بجائے خود ایک عُمدہ بات ہے۔ نیک دل انسان کو لازم ہے کہ وُہ اس بات پر غور کرے جو وُہ کہہ رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان اغراض و مقاصد پر بحث کرتا رہے جن کو ملحُوظ رکھ وعظ کہہ رہا ہے۔ سعدیؒ نے کیا خوُب کہا ہے ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
گر نوشت است پند بر دیوار

قائل کی بجائے قول کی طرف دیکھو

یہ بالکل سچی بات ہے کہ قول کی طرف دیکھو۔ قائل کی طرف خیال مت کرو۔ اس طرح پر انسان سچائی کے لینے سے محرُوم رہ سکتا ہے اور اندر ہی اندر ایک عجُب و نخوت کا بیج پرورش پا جاتا ہے، کیونکہ یہ اگر صرف سچائی اور صداقت کا طالب ہے تو پھر دُوسروں کی عیب شماری سے اس کو کیا غرض۔

واعظ اپنے لیے کوئی ایک بات نکال لے، مگر تم کو اس سے کیا غرض۔ تمہارا مقصودِ اصلی تو طلبِ حق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ بے موقع، بے محل، بے ربط بات شروع کر دیتے ہیں اور پند و نصیحت کرتے وقت اُمورِ مقتضائے وقت کا ذکر نہیں کرتے اور نہ ان امراض کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جن میں مخاطب مبتلا ہوتے ہیں بلکہ اپنے

سوال کو ہی مختلف پیرایوں میں بیان کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ بیان

رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ بیان کو اگر غور سے دیکھتے، تو اُن کو وعظ کہنے کا بھی ڈھنگ آجاتا۔ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ سب سے بہتر نیکی کونسی ہے۔آپؐ اُس کو جواب دیتے ہیں کہ سخاوت۔ دُوسرا آکر یہی سوال کرتا ہے، تو اُس کو جواب ملتا ہے۔ماں باپ کی خدمت۔ تیسرا آتا ہے۔اُس کو جواب کچھ اور ملتا ہے۔سوال ایک ہی ہوتا ہے۔جواب مختلف۔اکثر لوگوں نے یہاں پہنچ کر ٹھوکر کھائی ہے اور عیسائیوں نے بھی ایسی حدیثوں پر بڑے بڑے اعتراض کئے ہیں، مگر احمقوں نے رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مفید اور مُبارک طرزِ جواب پر غور نہیں کی۔

اس میں سِرّ یہی تھا کہ رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جس قسم کا مریض آتا تھا۔اُس کے حسبِ حال نسخۂ شفا بتلا دیتے تھے جس میں مثلاً بخل کی عادت تھی اس کے لیے بہترین نیکی یہی ہوسکتی تھی کہ اُس کو ترک کرے۔جو ماں باپ کی خدمت نہیں کرتا تھا، بلکہ اُن کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آتا تھا۔اُس کو اسی قسم کی تعلیم کی ضرورت تھی کہ وہ ماں باپ کی خدمت کرے۔

جماعت کو نصیحت

طبیب کے لیے جیسا ضروری ہے کہ تشخیص عمدہ طور پر کرے۔اسی طرح پر واعظ کے منصب کا یہ فرض ہے کہ وعظ و پند سے پہلے اُن لوگوں کے امراض کو مدِ نظر رکھے جن میں وہ مبتلا ہیں۔مگر مشکل تو یہی ہے کہ یہ فراست اور یہ معرفت حقانی واعظ کے سوا دُوسرے کو ملتی ہی کم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملک میں باوصفیکہ سینکڑوں ہزاروں واعظ پھرتے ہیں لیکن عملی حالت ملک کی دن بدن پستی کی طرف جا رہی ہے۔ہر قسم کی اعتقادی، ایمانی، اخلاقی غلطیاں اور کمزوریاں اپنا اثر کرتی جاتی ہیں۔یہ اس لیے کہ وعظوں میں حقانیت نہیں رُوح نہیں۔یہ سب کچھ ہے، مگر مَیں اس وقت اپنے دوستوں کو پھر یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ چونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنے دلوں میں طلبِ حق کی پیاس کو محسوس کیا ہے۔ وہ راستی اور صداقت کے لینے میں مضائقہ نہ کریں۔گو واعظ مختلف رنگوں اور پیرایوں میں اپنا سوال ہی پیش کرے، مگر تم کو نہیں چاہیے۔کہ صرف اس ایک وجہ سے اصل حکمت کو چھوڑ دو، کیونکہ وُہ جو ان کے سوال کو سُن کر ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وُہ بھی تو غلطی پر ہے۔کیا کسی لعل اور گوہرِ نایاب کو محض اس لیے پھینک دیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی بدبُودار اور میلی کچیلی ٹلی (دھجی کپڑے کی) میں بندھا ہوا ہے ؟ ہرگز نہیں۔اِس کے سوا اگر واعظ سوال کرتا ہے۔تو کیا تمھیں خبر نہیں کہ تمہیں تو یہ حکم دیا گیا ہے۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ (الضحیٰ : ۴) اور سائل خواہ گھوڑے پر ہی سوار ہو کر آیا ہو، پھر بھی واجب نہیں کہ اُس کو رَدّ کیا جاوے۔تیرے لیے یہ حکم ہے کہ تو اس کو جھڑک نہیں۔ہاں خدا تعالیٰ نے اُس کو

بھی حکم دیا ہے کہ وُہ سوال نہ کرے۔ وُہ اپنی خلاف ورزیوں کی خود سزا پاوے گا۔ لیکن تمہیں یہ مناسب نہیں کہ تم خداتعالیٰ کے ایک واجب العزت حکم کی نافرمانی کرو۔ غرض اُس کو کچھ دے دینا چاہیئے۔ اگر پاس ہو اور اگر پاس کچھ نہ ہو تو نرم الفاظ سے اُس کو سمجھا دو۔[1]"

بدظنی

فساد اس سے شروع ہوتا ہے کہ انسان ظنونِ فاسدہ اور شکوک سے کام لینا شروع کرے۔ اگر نیک ظن کرے تو پھر کچھ دینے کی توفیق بھی مِل جاتی ہے۔ جب پہلی ہی منزل پر خطا کی تو پھر منزلِ مقصود پر پہنچنا مشکل ہے۔ بدظنی بہت بُری چیز ہے۔ انسان کو بہت سی نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ انسان خدا پر بدظنی شروع کر دیتا ہے۔

اگر بدظنی کا مرض نہ بڑھ گیا ہوتا، تو بتلاؤ اُن مولویوں کو جنھوں نے میری تکفیر اور ایذادہی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ کونسی وجُوہ کفر کی اور میری تکذیب کی نظر آئی تھیں۔ مَیں نے پکار پکار کر اور خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ مَیں مُسلمان ہوں۔ قرآن کریم کو خاتم الکتُب اور رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء مانتا ہوں اور اسلام کو ایک زندہ مذہب اور حقیقی نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہوں۔ خداتعالیٰ کی مقادیر اور قیامت کے دن پر ایمان لاتا ہوں۔ اسی قبلہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتا ہوں۔ اتنی ہی نمازیں پڑھتا ہوں۔ رمضان کے پورے روزے رکھتا ہوں۔ پھر وُہ کون سی نرالی بات تھی جو اُنھوں نے میرے کفر کے لیے ضروری سمجھی۔ صریح ظُلم ہے۔ وُہ اپنے گندے اعمال اور زندگی کو نہیں دیکھتے۔ وُہ زمین اور آسمان پر غور اور تدبر کر کے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان مصنُوعات کا خالق ہے۔ لیکھرام کے نشان سے مولویوں نے کیا فائدہ اُٹھایا؟

آتھم کا نشان

پھر آتھم کی پیشگوئی سے کیا فائدہ حاصل کیا۔ اللہ اللہ کیسی صاف نکلی بلکہ اُس کو مشکوک کرنے کی سعی کی، حالانکہ اُس میں اگر کوئی الزام باقی ہے تو آتھم پر جس نے اپنی خاموشی اور ہمارے مُطالبات کے جواب نہ دینے سے اُس کی سچّائی پر مُہر کر دی۔ جبکہ اس میں صریح شرط موجود تھی۔ پھر ایک قانونی طبیعت کا آدمی بھی اُس کے دو ہی معنی کرے گا۔ ایک یہ کہ اگر شرط کی رعایت کرے تو بچ رہے۔ وَرنہ مر جاوے۔

پھر بچ جانے کی صُورت میں مومن کو چاہیے تھا کہ وہ اِس امر کو تنقیح طلب قرار دیتا کہ آیا اُس نے رعایت کی یا نہیں؟

یاد رکھو۔ یہاں تو صریح اور صاف شرط موجود تھی کہ بشرطیکہ حق کی طرف رجُوع نہ کرے، لیکن بعض انذاری پیشگوئیاں

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۳۴ صفحہ ۴-۵ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۰ء

ایسی بھی ہوتی ہیں کہ بظاہر اُن میں کوئی شرط نہیں ہوتی اور حقیقت میں وُہ مشروط ہوتی ہیں۔ یونسؑ نبی کا قصہ صاف موجود ہے۔ تفسیروں میں دیکھو تو کیا لکھا ہوا ہے؟ باوصفیکہ ایک ایسی نظیر قرآن شریف اور کتب سابقہ میں موجود ہے۔ لیکن ہمارے معاملہ میں اسی بدظنی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ایک مقررہ قانون کی بھی پروا نہیں کرتے؛ حالانکہ اُس میں صریح شرط موجود ہے اور اُس کا زندہ رہنا اور بچ جانا اس اَمر کی دلیل ہے کہ اُس نے اس شرط سے فائدہ اٹھایا مگر اس شرط سے فائدہ اٹھانے کے ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر دلائل ہیں جو ایک موٹی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ ہماری طرف سے متواتر اشتہار پر اشتہار جاری ہوئے اور اس کی دعوت کی گئی کہ تم قسم کھاؤ اور اگر جھوٹی قسم کی پاداش میں ایک سال کے اندر ہلاک نہ ہوجاؤ، تو میں اپنے آپ کو جھوٹا قرار دُوں گا اور اس قسم کے لیے چار ہزار روپے تک کا انعام بھی دینا چاہا اور یہ بھی ثابت کرکے دکھلایا کہ بائبل سے ایسی قسم کا کھانا گناہ نہیں بلکہ انکار کرنا گناہ ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ اگر ہم جھوٹے ہیں، تو ہم پر نالش کرو۔ پادریوں نے بھی اُس کو اکسایا اور ترغیب دی کہ تم نالش کرو، لیکن اِس قدر کوششوں پر بھی وُہ میدان میں نہ آیا اور اپنی خاموشی اور اسلام پر نکتہ چینی اور اس کے خلاف تحریروں کی اشاعت سے رُک کر اُس نے بتلا دیا کہ حقیقت میں پیشگوئی کے موافق اُس نے شرط سے فائدہ اٹھایا۔

پیشگوئی میں شرط کا موجود ہونا خود ایک پیشگوئی ہے۔ اگر اُس نے شرط سے فائدہ نہیں اُٹھانا تھا تو اس کو مشروط کرنے کے معنی ہی کیا ہوئے۔

اب ایک متدیّن اور خدا ترس کو چاہیے کہ سوچے کہ آیا آتھم نے رجُوع الی الحق کی شرط سے فائدہ اٹھایا ہے یا نہیں اور قسم کھانا خلافِ شرع تھا تو کلارک اور پریم داس وغیرہ عیسائیوں نے قسم کھائی تھی یا نہیں۔ علاوہ ازیں ہم نے تو ثابت کرکے دکھا دیا تھا کہ فیصلہ صحیحہ کے لیے قسم کھانا عیسائی پر واجب ہے۔

غرض یہ پیشگوئی مشروط تھی۔ وہ سراسیمہ رہا۔ شہر بہ شہر پھرتا رہا۔ اگر اس کو خداوند مسیح پر پورا یقین اور بھروسہ ہوتا تو پھر اس قدر گھبراہٹ کے کیا معنی؟ لیکن ساتھ ہی جب اس نے اخفاء حق کیا اور ایک دنیا کو گمراہ کرنا چاہا، کیونکہ اخفاءِ حق بعض ناواقفوں کی راہ میں ٹھوکر کا پتھر ہوسکتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے صادق وعدہ کے موافق ہمارے آخری اشتہار سے سات مہینے کے اندر اس کو دُنیا سے اُٹھا لیا اور جس موت سے وہ ڈرتا اور بھاگتا پھرتا تھا اُس نے اُس کو آلیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آتھم کے معاملہ میں لوگوں کو کیا مشکل پیش آسکتی ہے۔ اس قدر قوی قرائن موجود ہیں۔ اور پھر انکار!!! قرائنِ قویہ سے تو عدالتیں مجرموں کو پھانسی دے دیتی ہیں۔ غرض یہ آتھم کا ایک بڑا نشان تھا اور براہینِ احمدیہ میں اس فتنہ کی طرف صاف اور واضح لفظوں میں الہام درج ہوچکا ہے۔

نشان نہوتسو

پھر جلسہ مذاہب کا نشان ایک بڑا نشان ہے۔ خواجہ کمال الدین صاحب اور بہت سے دوست اِس بات کے گواہ ہیں اور وہ قسم کھا کر بتلا سکتے ہیں کہ قبل از وقت

ان کو بتلا دیا گیا تھا اور اشتہار چھاپ کر شائع کر دیا گیا تھا کہ ہمارا مضمون بالا رہا اور ٹھیک اسی الہام کے موافق یہ نشان ہزار ہا انسانوں کے رُوبرو پُورا ہوا اور اُردو انگریزی اخبارات نے متفق اللفظ ہو کر اقرار کیا کہ ہمارا مضمون سب سے بڑھ کر رہا۔

بریّت کا نشان

پھر جو مقدمہ ہم پر اقدامِ قتلِ عمد کا قائم ہوا جس میں ڈاکٹر کلارک جیسے لوگ شامل تھے اور مولوی محمد حسین نے بھی جا کر گواہی دی اور رام بھجدت وکیل مشہور آریہ بھی پیروی مقدمہ کے لیے آیا۔ کئی سَو آدمی اس امر کے گواہ موجود ہیں کہ کس طرح پر قبل از وقت اس مقدمہ کی ساری کیفیت اور صورت سے اطلاع دی گئی اور آخر بریّت کی بھی اطلاع دے دی جو اللہ تعالیٰ نے اِبْرَاء (بے قصور ٹھہرانا) کے الہام سے خبر دی تھی۔

یہ خدا کے غیب کی باتیں ہیں۔ کیا انسانی طاقت میں ہے کہ اس طرح پر پیشگوئی کر سکے اور ایسے وقت میں کہ ابھی مقدمہ کا نام و نشان بھی نہیں۔ اُس کا سارا نقشہ کھینچ کر دکھلایا جاوے۔

لیکھرام کا نشان

پھر لیکھرام کا نشان ایک شمشیرِ برہنہ کی طرح تھا۔ پانچ سال پیشتر بذریعہ اشتہارات فریقین کی طرف سے یہ پیشگوئی شائع کی گئی اور خود لیکھرام جہاں جاتا، اس پیشگوئی کو سُناتا اس میں کوئی شرط نہ تھی اور وُہ صاف تھی۔ اگر وُہ زندہ رہتا تو بے شک قیامت برپا ہو جاتی لیکن یہ تب ہوتا۔ اگر خدا تعالیٰ کی باتیں نہ ہوتیں۔ بے شک پھر انجام رسوائی کے ساتھ ہوتا۔ کیا محمد حسین چُپ رہتا؟ اب بھی جبکہ یہ نشان پُورا ہو گیا اور لاکھوں انسانوں نے اس پیشگوئی کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔ وہ کہتا ہے کہ جماعت کے کسی آدمی نے قتل کر دیا ہو گا۔ افسوس یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ وُہ مُرید کیسا خوش اعتقاد ہو گا، جو ایسے پیر پر بھی اعتقاد رکھ سکتا ہے جو اسے قتل کی ترغیب دے اور اپنی پیشگوئیوں کو اپنی صداقت کا معیار قائم کرے اور پھر اُن کے پورا کرنے کے لیے مُریدوں کو ناجائز وسائل اختیار کرنے کی تعلیم دے؟ شرم ہے ایسے خیالات پر۔

جو لوگ اس قسم کا خیال رکھتے ہیں وہ گویا ہماری نیک نہاد، انصاف پرور اور ہوشیار گورنمنٹ کو بھی بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ گورنمنٹ نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکھرام کے قتل کے متعلق اُس نے پُوری سرگرمی سے تحقیقات کی۔ لیکن ہمارا اور ہماری جماعت کا دامن اُس خون سے بالکل پاک صاف ثابت ہوا۔

افسوس یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ کیا لیکھرام نے میرے کسی باپ اور دادا کو قتل کر دیا تھا؟ اس نے میری ذات کو کسی قسم کی تکلیف اور ایذا نہیں دی۔ ہاں اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر وہ گستاخانہ حملے کیے اور وہ بے ادبیاں کیں کہ میرا دل کانپ اُٹھا اور میرا جگر پارہ پارہ ہو گیا۔ مَیں نے اُس کی بے ادبیوں اور شوخیوں کو ٹکڑے ہوئے ہوئے دل کے ساتھ خدا کے حضور پیش کیا۔ اس نے اِن شوخیوں اور گستاخیوں کے

عوض میں اس کی نسبت مجھے یہ پیشگوئی عطا فرمائی۔ پھر اس پیشگوئی میں اُس کی موت، وقت، صورتِ موت وغیرہ اُمور کو بخوبی بتلایا گیا تھا۔ ہاتھ کا نشان بنایا جانا اور "بترس از تیغ بُرّانِ محمدؐ" کہنا یہ سب اُمور واضح طور پر درج ہیں اب کوئی بتلائے کہ کیا اس وقت کہ جبکہ وہ ابھی چوبیس پچیس برس کا نوجوان تھا، پانچ سال پیشتر اس وقت کی اطلاع دینا انسانی منصوبہ کا دخل ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا فعل ہے۔ انسانی طاقت، انسانی فہم و فراست سے بالاتر اور بالاتر ہے[1]۔

نشانات کی ضرورت

اب بتلاؤ کہ کیا یہ نشانات اپنی صداقت اور ثبوت میں کسی اور خارجی دلیل کے محتاج ہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کہا کہ معجزات میں سے ایک ہی کافی ہے؛ چنانچہ جب اُن سے معجزہ مانگا گیا، تو یہی کہتے رہے کہ یونسؑ نبی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہ دیا جاوے گا۔

مَیں نے پہلے بتلا دیا ہے کہ جو لوگ اندرونی حالات سے واقف ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے نشانات کی کچھ بڑی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ صرف رحم کر کے اُن کے مزید اطمینان اور اپنی ہستی منوانے کے لیے نشانات ظاہر فرماتا ہے۔ مجھ کو تعجب پر تعجب اور حیرت پر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ اولیاء اللہ کے معجزات کے قائل ہیں اور ایسے خوارق ان کے بیان کرتے ہیں۔ جن کے لیے نہ کوئی دلیل ہے نہ عقلی یا نقلی ثبوت ہے اور وہ بطور کتھا اور کہانی کے اُن کے زمانہ کے بہت عرصہ بعد لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں۔

شیعہ ہی سے اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معجزات مانگو، تو وہ اِس قدر بیان کریں گے کہ گنتے گنتے تھک جائیں، مگر ثبوت جب مانگیں تو کچھ بھی نہیں۔ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے خوارق بکثرت بیان کیے جاتے ہیں، مگر ان کی کسی کتاب میں منقول نہیں ہیں۔ اب لوگ خدا سے ڈریں اور سوچ کر جواب دیں کہ جو باتیں صدہا سال بعد لکھی گئی ہیں، اُن کی تو تصدیق کی جاتی ہے لیکن جو آنکھوں سے دیکھے گئے ہیں، اُن کی تکذیب کی جاتی ہے۔ افسوس یہ لوگ اتنا بھی تو نہیں سوچتے کہ خبر معائنہ کے برابر نہیں ہوتی۔ سُنی ہوئی بات کسی واقعہ صحیحہ کی برابری نہیں کر سکتی۔ اب میرے نشانات دیکھ کر جو ان نشانوں کی تکذیب کی جاتی ہے۔ یہ میری تکذیب نہیں یہ واقعاتِ صحیحہ کی تکذیب ہے۔ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تکذیب ہے۔

یہ یاد رکھو کہ یہ مصیبت اس لیے آئی ہے کہ تقویٰ اور طہارت اُٹھ گیا اور قانونِ الٰہی یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا خوف اور خشیت اُٹھ جاتی ہے اور دلوں میں رقت اور رُوح میں گدازش نہیں رہتی۔ اس وقت مُنذر نشان

---

[1] الحکم نمبر ۳۵ جلد ۴ صفحہ ۳-۲ مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۰۰ء

پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مقام توڑنے کا تھا۔ مگر افسوس ان لوگوں نے اندھے اور بہرے ہو کر ان نشاناتِ الٰہیہ کو (جو تفرّع اور ابتہال پیدا کر سکتے تھے۔ ایمان میں ایک نئی زندگی بخش سکتے تھے) چھوڑ دیا اور صُمٌّ بُکْمٌ ہو کر گزر گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فتویٰ لگ چکا ہے۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (البقرة:۱۹)

ہماری جماعت کا فرض

مگر ہماری جماعت جس نے مجھے پہچانا ہے کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان نشانات کو باسی نہ ہونے دیں۔ اس سے قوتِ یقین پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ہماری جماعت کو چاہیے کہ وہ ان نشانات کو پوشیدہ نہ رکھے اور جس نے دیکھے ہیں وہ اُن کو بتلا دے جو غائب ہیں، تاکہ برائیوں سے بچیں اور خدا پر تازہ ایمان پیدا کریں اور ان نشانات کو عمدہ براہین سے سجا سجا کر پیش کریں۔ یاد رکھو! خدا کے دلائل اور براہین کو جو غور سے نہیں دیکھتے، وہ اندھے ہوتے ہیں اور حق کو دیکھ نہیں سکتے اور اُن کے سننے کے کان نہیں ہوتے۔ یہ لوگ چارپائے بلکہ اُن سے بھی بدتر ہوتے ہیں اور خدا اُن کی زندگی کا متکفل نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ مومن اور متقی کی زندگی کا ذمہ دار ہے۔ هُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف: ۱۹۷) اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے دُور اور چارپایوں کے مشابہ ہیں اُن کی زندگی کا کفیل نہیں۔ بھلا بتاؤ تو سہی کہ کوئی آدمی ذبح ہوتے ہوتے بکروں کے سر پر بھی بیٹھ کر روتا ہے؟ پھر جو لوگ بکروں سے بھی گئے گذرے ہیں، ان کی زندگی کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟

جانوروں کی زندگی دیکھ لو کہ منتیں اُن سے لی جاتی ہیں اور ان کو ذبح کیا جاتا ہے۔ پس جو انسان خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کرتا ہے۔ اس کی زندگی کی ضمانت نہیں رہتی؛ چنانچہ فرمایا قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان: ۷۸) یعنی اگر تم اللہ کو نہ پکارو، تو میرا رب تمھاری پروا ہی کیا رکھتا ہے۔

"یاد رکھو جو دنیا کے لیے خدا کی عبادت کرتے ہیں یا اس سے تعلق نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کچھ پروا نہیں کرتا۔"[۱]

یکم ستمبر ۱۹۰۰ء

خدا کی صفتِ غناء کا تقاضا

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کے غناءِ ذاتی پر بہت مؤثر اور ڈرا دلانے والی تقریر فرمائی۔ فرمایا:

"اگرچہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے اِنَّهٗ اٰوَى الْقَرْيَةَ۔ مگر خدا تعالیٰ کسی کا محکوم رہنا نہیں چاہتا۔ اس کی صفتِ غناء ہر دم تقاضا کرتی ہے کہ انسان کبھی ایمن اور مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہے۔ اس کا منشا ہے کہ انسان

---

[۱] الحکم جلد ۴ نمبر ۳۶ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۰ء

خوف وہراس میں اوقات بسر کرے تاکہ ذلّ عبودیت کی حالت قائم رہے۔"

فرمایا: "ہیضہ خدا تعالیٰ کی تلوار ہے۔ بہت بہت دعائیں مانگو کہ اللہ تعالیٰ اس سے اس گاؤں کو محفوظ رکھے۔ اس لیے کہ مخالفوں کے نزدیک اور جگہوں کے لوگ تو شہید ہوتے ہیں۔ مگر خدا نہ کرے جو یہاں پڑے تو یہی کہیں گے کہ ان پر غضبِ الٰہی پڑا۔"[1]

۳؍ستمبر ۱۹۰۰ء

تحفہ گولڑویہ کے متعلق الہامی بشارت

تحفہ گولڑویہ میں بڑے بڑے دقائق معارف بیان ہوتے ہیں۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک الہام ہوا ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ رسالہ بڑا بابرکت ہوگا، اسے پورا کرو۔ اور پھر الہام ہوا۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔

چونکہ مضامین کی آمد بہت ہے اور وہ چاہتی ہے کہ درمیانی سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے، اس لیے کہ ٹوٹنے میں بسا اوقات پیش آمدہ مضمون فوت ہو جاتا ہے۔ مناسب ہے کہ جمعرات تک پھر نمازیں ظہر و عصر جمع کر کے پڑھی جائیں۔"

چنانچہ رسولِ کریمؐ کی وہ پیشگوئی تُجْمَعُ لَهُ الصَّلٰوةُ یوں ثابت اور پوری ہوگئی۔[2]

۴؍ستمبر ۱۹۰۰ء

بڑا ثواب

حضرتؑ نے ایک دن مولانا عبدالکریم صاحب کو مخاطب ہو کر فرمایا: کہ

"اب تو آپ بھی ہمارے ساتھ گالیوں میں شامل ہو گئے۔ بڑا ثواب ہے۔"[3]

۷؍ستمبر ۱۹۰۰ء

ایک الہام

حضرتؑ کو کل دردِ سر کے وقت بار بار یہ الہام ہوا:

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ صفحہ ۹ مورخہ ۱۰ ؍اکتوبر ۱۹۰۶ء (از مکتوبات کریمیہ نمبر ۳)

[2] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ صفحہ ۹ مورخہ ۱۰ ؍اکتوبر ۱۹۰۶ء (مکتوبات کریمیہ نمبر ۳)

[3] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۵ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۰ ؍اکتوبر ۱۹۰۶ء

"اِنِّیْ مَعَ الْاُمَرَاءِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً"
یعنی میں امیروں کے ساتھ تیری طرف اچانک آؤں گا
(اس الہام سے بشارت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اب امیروں کو اس آسمانی سلسلہ کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہے۔)

۸؍ستمبر ۱۹۰۰ء

کلامِ الٰہی کے تین طریقے

رات مولانا نورالدین صاحب نے اس آیت کے معنے پُوچھے ۔ وَمَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا۔ (الشوریٰ : ۵۲) مولوی صاحب نے عرض کی کہ اس آیت پر بہت سا جھگڑا ہوا۔ حضرتِ اقدسؑ نے فرمایا:

"قبل اس کے کہ اس آیت کے حل کی طرف ہم متوجہ ہوں۔ ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ تین ہی طریقے ہیں خدا تعالیٰ کے کلام کرنے کے۔ چوتھا کوئی نہیں (۱) رؤیا (۲) مکاشفہ (۳) وحی۔" پھر نمازِ عشاء کا سلام پھیرنے کے بعد فرمایا:

"مولوی صاحب! اس آیت کے معنی خوب کھل گئے۔ مِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ سے مُراد رؤیا کا ذریعہ ہے۔ مِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ کے معنی یہ ہیں کہ اس پر استعارے غالب رہتے ہیں۔ جو حجاب کا رنگ رکھتے ہیں۔ اور یہی رؤیا کی ہیئت ہے۔

یُرْسِلَ رَسُوْلًا سے مراد مکاشفہ ہے۔ رسول کا تمثّل بھی مکاشفہ میں ہی ہوتا ہے اور مکاشفہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ تمثّلات ہی کا سلسلہ ہوتا ہے۔"

اس کے بعد بڑے جوش اور خوشی سے فرمایا:

"قرآنِ کریم کیسے کیسے حقیق اور عظیم علوم بیان فرماتا ہے۔ اس آیت کے ہم رنگ انجیل و توریت میں تو ڈھونڈ کر بتاؤ۔"

مولوی صاحب نے پوچھا تھا۔ اس تفسیر سے پہلے کہ مِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ سے یہ مطلب ہو کہ خدا تعالیٰ کا نظر آنا کوئی ضروری نہیں۔ فرمایا:

"یہ مطلب نہیں۔ یہ معنی ہی رؤیا کے ہیں اور لفظ مِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ نے تو حقیقت رؤیا کے فلسفہ کی بیان کی ہے۔"

ا؎ الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۵ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۶ء مکتوبات کریمیہ نمبر ۵

۸؍ستمبر ۱۹۰۰ء

ابتلاء موجبِ رحمت ہوتے ہیں

شیخ رحمت اللہ صاحب کا خط دربارہ کسی ابتلاء کے حضرت اقدسؑ کی خدمت میں پہنچا جس پر حضورؑ نے فرمایا:

"میں اس ابتلا میں اُن کے لیے بہت دُعا کرتا ہوں۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ درحقیقت ابتلاء بڑی رحمت کا موجب ہوتے ہیں کہ ایک طرف عبُودیّت مُضطر ہوکر اور چاروں طرف سے کٹ کر اُسی اکیلے سبب ساز کی طرف متوجّہ ہوجاتی ہے اور اُدھر سے اُلوہیت اپنے فضلوں کے لشکر لے کر اُس کی تسلّی کے لیے قدم بڑھاتی ہے۔ مَیں ہمیشہ یہ سنّتِ انبیاء علیہم السّلام اور سنّت اللہ میں دیکھتا ہوں کہ جس قدر اس گرامی جماعت کی رأفت و رحمت ابتلاء کے وقت اپنے خدام کی نسبت جوش مارتی ہے۔ آرام و عافیت کے وقت وُہ حالت نہیں ہوتی۔"[1]

۹؍ستمبر ۱۹۰۰ء

صبر کی تلقین

حضرتِ اقدسؑ نے قبل از نمازِ ظہر بڑی لطیف تقریر فرمائی اور مولانا عبدالکریم صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ:

"جو کچھ ہو رہا ہے۔ ارادۂ الٰہی کے موافق ہو رہا ہے۔ ضروری تھا کہ یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے ان آثار کی صداقت پر مُہر لگا دیتے — جن میں لکھا ہے کہ مہدیِ موعود کے وقت بڑا شور برپا ہوگا اور اس کو سلف و خلف کے عقائد کے خلاف باتیں بنانے والا کہہ کر کافر ٹھہرایا جائے گا۔ اس وقت ہمارے احباب کو ایسا ہی صبر کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے اصحابؓ نے مکّہ معظّمہ میں کیا۔ کوئی حرکت اُن سے ایسی سرزد نہ ہوئی جو انھیں حُکّام تک پہنچاتی۔ اس وقت کسی پر بھروسہ نہ کریں۔ کہ فلاں شخص ہماری مدد کریگا۔ یاد رکھیں۔ اس وقت خداوند جلّ وعلا کے سوا کوئی ولی و نصیر نہیں۔"[2]

اولیاء اللہ سے جنگ کا نتیجہ

ایک شخص کسی شیخ عبدالرحمٰن کشمیری بازار کا شائع کیا ہوا لمبا چوڑا اشتہار لے کر حضرتِ اقدسؑ کی خدمت میں پہنچا حضرتِ اقدسؑ نے اس پر فرمایا:

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۵ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۶ء ۔ مکتوباتِ کریمیہ نمبر ۵

[2] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۶ء مکتوباتِ کریمیہ نمبر ۱۴

"اب ہماری باتیں اِن لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتیں اور درحقیقت جبتک آسمان سے نُور نازل ہوکر قلوب کو بافہم نہ بنائے. کوئی نہ سمجھا سکتا ہے، اور نہ کوئی سمجھ ہی سکتا ہے. یہ ایّام ابتلا کے ایّام ہیں" پھر فرمایا :

"کیا یہی سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اولیاء سے جنگ کرنے کے سبب سے نہ صرف ایمان ہی سلب ہو جاتا ہے بلکہ عقلیں بھی سلب ہو جاتی ہیں. اِس وقت جو بولتا ہے یہی بولتا ہے اور بیسیوں خط اطراف سے اس مضمون کے آتے ہیں کہ مہر علی شاہ نے مرزا صاحب کی ساری شرطیں منظور کر لیں. پھر وہ مقابلہ کے لیے کیوں نہ آئے. اللہ اللہ. ایک طُوفانِ بے تمیزی برپا ہے. کوئی غور کرتا ہی نہیں کہ اصل بات کیا ہے"[1]

۱۵ر ستمبر ۱۹۰۰ء

کلام الٰہی کے اقسام

مطابق بستم جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ بعد اداءِ نمازِ مغرب شرفِ دیدارِ مبارک حضرت اقدس حاصل گردید. فرمودند :

"کلامِ الٰہی بر سہ قسم است وحی، رؤیا، کشف. وحی آنکہ بلا واسطۂ شخصے بر قلبِ مُطہرۂ نبوی فرود آمد و آں کلام اجلیٰ و روشن مے باشد. نظیرش بیان فرمودند کہ مثلاً حافظ صاحب نابینا کہ پیشِ ما نشستہ اند. در سماعِ کلامِ ما ہرگز غلطی نے خورند و نے دانند کہ آواز مسموع کلام غیرِ ما باشد. اگرچہ از چشم ظاہر ما را نے بینند. دیگر رُؤیا و منام ست. کہ آں کلام رنگین و لطیف و کنایہ دارد و ذوی الوجوہ است. چُون دیدنِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوارین در دستِ مبارکِ خویش یا معائنہ فرمودن یکے زوجہ مطہرہ خود را اطولُ یدین و دیدنِ بقرہ وغیرہ ایں چنیں کلامِ الٰہی تعبیر طلب است. سوم کشف است و آں تمثّل است خواہ بصُورتِ جبرائیل باشد یا فرشتہ یا دیگر اشیاء. پس آیت شریفہ خوانند اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا (الشوریٰ: ۵۲) ارشاد شد کہ سوائے امُورِ ثلاثہ مذکورہ کلام الٰہی را طریقے نیست"[2]

۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۰ء

بیماری میں الٰہی مصالح

عصر کے وقت فرمایا :

"طبیعت بہت علیل ہے. دُعا کرنی چاہیئے"

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۳۸ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۰ء مکتوبات کریمیہ نمبر ۴.

[2] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۰۱ء. مکتوبہ مولوی محمد سعید حیدر آبادی.

اس پر مولانا عبد الکریم صاحب نے عرض کیا کہ آپ وُہ ہیں، جن کی نسبت خدا تعالیٰ کہہ چکا ہے اَنْتَ الْمَسِیْحُ الَّذِیْ لَا یُضَاعُ وَقْتُہٗ ۔ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کو آپ کے درجات کی ترقی بہت ہی منظور ہے کہ ایک طرف تو آپ کے سپرد اس کثرت سے کام کر دیئے ہیں کہ ان کے تصوّر سے قوی سے قوی زہرہ آدمی کی پیٹھ ٹوٹ جاتی ہے اور اُس پر اس قدر بیماریوں کا ہجوم۔ مُسکرا کر فرمایا:

"ہاں یہ تو ہمیں یقین ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے مصالح ملحوظ ہیں۔"

احمد بیگ کے متعلق پیشگوئی

احمد بیگ والی پیشگوئی پر اعتراض کے متعلق فرمایا:

"اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کے خوف سے غور کرے کہ چار شخصوں کی موت کی نسبت ہماری پیشگوئی تھی۔ جن میں سے تین ہلاک ہو چکے ہیں اور ایک (داماد) باقی ہے، تو اُس کی رُوح کانپ جائے گی کہ کس دلیری سے اور کیوں وہ اعتراض کر سکتا ہے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کے مصالح اس میں ہیں۔ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ راستبازوں کے مخالفوں کی عمریں بھی اُن کے کارخانہ کی رونق کے لیے لمبی کر دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ قادر تھا کہ ابوجہل اور اس کے امثال پر مکہ معظمہ میں یک جا اور ناگہاں بجلی پڑ جاتی اور بہت بڑی ایذا پہنچانے سے قبل اُن کا استیصال ہو جاتا، مگر اُن کا تار و پود درہم برہم نہ ہوا۔ جب تک بدر کا یوم نہ آیا۔ اگر ایسی ایسی کارروائیاں جلد جلد پوری ہو جائیں، تو نبی بہت جلد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاوے اور وہ گرمیٔ ہنگامہ کیونکر رنگ آرائے چہرۂ ہستی ہو، جس کے قیام کے بغیر طرح طرح کے علوم اور حکمتیں بروئے کار نہیں آسکتیں۔ خدا تعالیٰ صادق کو نہیں اُٹھاتا، جبتک اُس کا صادق ہونا آشکار نہ کر دے اور اُن الزاموں سے اُس کی تطہیر نہ کر دے، جو ناعاقبت اندیش اُس پر لگاتے ہیں۔"

بعد نماز عشا فرمایا:

مہدی اور دجّال کے متعلق احادیث

مَیں آج کنز العمال کو دیکھ رہا تھا۔ مہدی اور دجّال کی نسبت ۸۵ حدیثیں اُس میں جمع کی گئی ہیں۔ سب حدیثوں میں یہی ہے کہ وُہ آتے ہی یُوں خونریزی کرے گا اور یُوں خلقِ خدا کے خُون سے رُوئے زمین کو رنگین کرے گا۔ خدا جانے اِن لوگوں کو جو ان احادیث کے وضّاع تھے۔ سفاکی کی کس قدر پیاس اور خلقِ خدا کی جان لینے کی کتنی بُھوک تھی اور اس وقت عقلیں کس قدر موٹی اور سطحی ہو گئی تھیں۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی کہ اصُولِ تبلیغ اور ماموریّت کے قطعاً خلاف ہے کہ کوئی ماموُر آتے ہی بلا اتمامِ حجّت کے تیغ زنی شروع کر دے۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو آخری زمانہ کو حضرت خیر الانام رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ سے اتنا دُور قرار دیا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جتنا بُعد زمانہ نبوت سے ہوگا۔ اتنی ہی غفلت اور کسل اور اعراض عن اللہ کا مرض شدید ہوگا۔ بایں ہمہ آخری زمانہ کا مُصلح اور مامُور ایسا شخص قرار دیا ہے، جو آتے ہی تلوار سے کام لے اور اتمام حجّت کا ایک لفظ بھی مُنہ پر نہ لائے۔ وُہ مصلح ہی کیا ہوا۔ وہ خونریز مُفسد ہوا۔

افسوس آتا ہے کہ اس قدر تناقضات کا مجموعہ وُہ حدیثیں ہیں کہ اس سے زیادہ ہفوات اور لغویات میں بھی تناقض ممکن نہیں، مگر ان لوگوں کی دانشیں اُن کی بیہودگی کی تہ تک نہ جا سکیں۔

فرمایا: مَیں ان حدیثوں کو پڑھ کر کانپ اُٹھا اور دل میں گزرا اور بڑے درد کے ساتھ گزرا کہ اگر اب خدا تعالیٰ خبر نہ لیتا اور یہ سلسلہ قائم نہ کرتا۔ جس نے اصل حقیقت سے خبر دینے کا ذمہ اٹھایا ہے، تو یہ مجموعہ حدیثوں کا اور تھوڑے عرصہ کے بعد بے شمار مخلوق کو مُرتد کر دیتا۔ ان حدیثوں نے تو اسلام کی بیخکنی اور خطرناک ارتداد کی بنیاد رکھ دی ہوئی ہے۔ جبکہ حدیثیں یونہی نامُراد رہتیں اور اُن کی بے بنیاد پیشگوئیاں جو محض دروغِ بے فروغ اور باطل افسانے ہیں اور کچھ مدت کے بعد آنے والی نسلوں کے سامنے اسی طرح نامُراد پیش ہوتیں۔ تو صاف شک پڑ جاتا کہ اسلام بھی اور جھوٹے مہابھارتی مذہبوں کی طرح بزاکھتوں پر مبنی اور بے سروپا مذہب ہے۔

اور آئندہ نسلیں سخت ہنسی اور استہزاء سے اِس بات کے کہنے کا بڑی دلیری سے موقع پاتیں کہ دجّال کو خدا بنانے والا! اور خُدا کی صفات کاملہ متجمعہ سے پُورا حصّہ دینے والا مذہب بھی کبھی مذہبِ حق اور مذہبِ توحید کہلانے کا استحقاق رکھ سکتا ہے۔[1]"

اشاعتِ ہدایت کی تکمیل مسیح موعودؑ کے ذریعہ مقدّر ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کی اصلاح ہے۔ حالت تو یہ ہے کہ بُعدِ زمانہ ہی بجائے خود بہت کچھ قابلِ رحم حالت ہوتی ہے اور اُس پر تو اس وقت ہزاروں اور فتنے اور آفتیں بھی ہوں گی پھر قتال سے کیا فائدہ؟

اخیر میں یہ بھی لکھ دیا ہے لَا مَھْدِیَّ اِلَّا عِیْسٰی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات قرآن ہی سے ہے۔ جب ہم اس ترتیب کو دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے دو ہی مقصد بیان فرمائے ہیں۔ یعنی تکمیلِ ہدایت اور تکمیلِ اشاعتِ ہدایت۔ اوّل الذکر کی تکمیل چھٹے دن یعنی جمعہ کے دن ہوئی۔ جبکہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ (المائدہ: ۴) نازل ہوئی اور دُوسری تکمیل کے لیے بالاتفاق مانا گیا ہے کہ وُہ مسیح ابنِ مریم یعنی مسیح موعودؑ کے زمانہ میں ہوگی۔ سب مفسّرین نے بالاتفاق لکھ دیا ہے کہ آیت ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۳۷ صفحہ ۱-۳ مورخہ ۱۷ راکتوبر ۱۹۰۰ء خط مولانا عبدالکریم صاحب

بِالْہُدٰی (الصّف : ۱۰) کی تکمیل مسیح موعودؑ کے زمانہ میں ہوگی اور جبکہ ہدایت کی تکمیل چھٹے دن ہوئی تو اشاعتِ ہدایت کی تکمیل بھی چھٹے دن ہی ہونی چاہیے تھی اور قرآنی دن ایک ہزار برس کا ہوتا ہے۔ گویا مسیح موعود چھٹے ہزار میں ظاہر ہوگا۔

مہدی کی حدیثوں کی نسبت فرمایا کہ سلطنت کے خیال سے وضع کی گئی تھیں۔

قرآن ہی پڑھنے کے قابل ہے۔ کیونکہ قرآن کے معنی ہی یہ ہیں۔ آریوں نے قرآن کریم کے الفاظ نہ سمجھنے ہی کی وجہ سے خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ الفاظ پر اعتراض کئے ہیں؛ حالانکہ خود وید میں اِندر کو بڑا مکار لکھا ہے[۱]۔

قرآن کے نام میں پیشگوئی

اگر ہمارے پاس قرآن نہ ہوتا اور حدیثوں کے یہ مجموعے ہی مایۂ نازِ ایمان واعتقاد ہوتے، تو ہم قوموں کو شرمساری سے مُنہ بھی نہ دکھا سکتے۔ میں نے قرآن کے لفظ میں غور کی۔ تب مجھ پر کھُلا کہ اس مُبارک لفظ میں ایک زبردست پیشگوئی ہے۔ وُہ یہ ہے کہ یہی قرآن یعنی پڑھنے کے لائق کتاب ہے اور ایک زمانہ میں تو اور بھی زیادہ یہی پڑھنے کے لائق کتاب ہوگی۔ جبکہ اور کتابیں بھی پڑھنے میں اُس کے ساتھ شریک کی جائیں گی۔ اس وقت اسلام کی عزت بچانے کے لیے اور بُطلان کا استیصال کرنے کے لیے یہی ایک کتاب پڑھنے کے قابل ہوگی اور دیگر کتابیں قطعاً چھوڑ دینے کے لائق ہوں گی۔ فُرْقَان کے بھی یہی معنے ہیں۔ یعنی یہی ایک کتاب حق و باطل میں فرق کرنے والی ٹھہرے گی اور کوئی حدیث کی یا اور کوئی کتاب اِس حیثیت اور پایہ کی نہ ہوگی۔ اس لیے اب سب کتابیں چھوڑ دو اور رات دن کتاب اللہ ہی کو پڑھو۔ بڑا بے ایمان ہے وہ شخص جو قرآن کریم کی طرف التفات نہ کرے اور دُوسری کتابوں پر ہی رات دن جُھکا رہے۔ ہماری جماعت کو چاہیے کہ قرآن کریم کے شغل اور تدبّر میں جان ودل سے مصروف ہو جائیں اور حدیثوں کے شغل کو ترک کریں۔ بڑے تاسف کا مقام ہے کہ قرآن کریم کا وہ اعتناء اور تدارس نہیں کیا جاتا جو احادیث کا کیا جاتا ہے۔ اس وقت قرآن کریم کا حربہ ہاتھ میں لو تو تمہاری فتح ہے۔ اس نور کے آگے کوئی ظلمت ٹھہر نہ سکے گی[۲]۔"

۱۴؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

خلقِ آدمؑ اور زُحل کی تاثیرات

صُبح کی سیر کے وقت حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

---

[۱] الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ مورخہ ۲۶؍جولائی ۱۹۰۸ء

[۲] الحکم جلد ۴ نمبر ۳۷ صفحہ ۵ مورخہ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۰۰ء (خط مولانا عبدالکریم صاحب)

آدم علیہ السلام عصر کے وقت چھٹے دن پیدا ہوا تھا۔ اُس وقت مُشتری کا دَورہ ختم ہو کر زُحل کا شروع ہونے والا تھا۔ چونکہ زُحل کی تاثیرات خونریزی اور سفاکی ہیں، اس لیے ملائکہ نے اس خیال سے کہ یہ زُحل کی تاثیرات کے اندر پیدا ہوگا۔ یہ کہا۔ اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا (البقرۃ : ۳۱) اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس طرح انسان ارضی تاثیرات اور بُوٹیوں کے خواص سے واقف ہوتا ہے۔ اسی طرح پر آسمانی مخلوق آسمانی تاثیرات سے باخبر ہوتی ہے۔

بہترین دُعا

پھر فرمایا : اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں جہاں اَلرَّبّ - اَلرَّحۡمٰن - اَلرَّحِیۡم - مَالِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ (الفاتحۃ ۲، ۳، ۴) کے حسن و احسان کی طرف تحریک ہوتی ہے۔ وہاں انسان کی عاجزی اور بے کسی بھی ساتھ ہی محرّک ہوتی ہے۔ اور وہ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہہ اُٹھتا ہے۔ بہترین دُعا وہ ہوتی ہے جو تمام خیروں کی جامع ہو اور مانع ہو تمام مضرات کی۔ اس لیے اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کی دُعا میں حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک کے کُل مُنعَم علیہم لوگوں کے انعامات کے حصُول کی دُعا ہے۔ اور غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ میں ہر قسم کی مضرتوں سے بچنے کی دُعا ہے۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا

اسلام کی نسبت جو کہتے ہیں کہ تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اسلام نے تلوار اس وقت تک نہیں اُٹھائی جبتک کہ سامنے تلوار نہیں دیکھی۔ قرآن شریف میں صاف طور پر لکھا ہے کہ جس قسم کے ہتھیاروں سے دشمن اسلام پر حملہ کرے، اسی قسم کے ہتھیار استعمال کرو۔ مہدی کے بارہ میں کہتے ہیں کہ آ کر تلوار سے کام لے گا۔ یہ صحیح نہیں۔ اب تلوار کہاں ہے جو تلوار نکالی جاوے۔ پھر افسوس تو یہ ہے کہ باوجودیکہ مسیح ان لوگوں کے مسلّمات کو تسلیم کرے گا اور فرشتوں کے ساتھ آسمان سے اُترے گا، مگر پھر بھی اس پر کُفر کا فتویٰ دیا جائے گا۔ جیسا کہ کتابوں سے ثابت ہے بلکہ ایک شخص اُٹھ کر کہہ دیگا۔ ..... اِنَّ هٰذَا الرَّجُلُ غَیَّرَ دِیۡنَنَا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری جماعت کے لوگ ان دلائل سے باخبر ہوں، تاکہ کسی محفل میں اُن کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ میر محمد سعید صاحب حیدرآبادی اور یعقوب علی صاحب اور چند دوست ایسی کتابیں سوال و جواب کے طور پر تالیف کریں جو ہمارے مقاصد کو لیے ہوئے ہوں اور مدرسہ میں رائج کی جاویں۔"[1]

---

[1] الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء

۱۷؍اکتوبر ۱۹۰۲ء کی صبح کو حضرت اقدس علیہ السلام حسبِ معمول سیر کو تشریف لے گئے اور فرمایا :

کشف اور الہام کی درمیانی حالت

" بہت دفعہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات بتلاتے ہیں۔ میں اس کو سنتا ہوں، مگر آپ کی صورت نہیں دیکھتا ہوں۔ غرض یہ ایک حالت ہوتی ہے جو بین الکشف و الالہام ہوتی ہے۔"

مسیح موعودؑ کے دو نشان

رات کو آپؑ نے مسیح موعودؑ کے متعلق یہ فرمایا ہے :

" یَضَعُ الْحَرْبَ وَ یُصَالِحُ النَّاسَ۔ یعنی ایک طرف تو جنگ و جدال اور حرب کو اُٹھا دے گا۔ دوسری طرف اندرونی طور پر مصالحت کرا دے گا۔ گویا مسیح موعودؑ کے لیے دو نشان ہوں گے۔ اوّل بیرونی نشان کہ حرب نہ ہوگی۔ دوسرا۔ اندرونی نشان کہ باہم مصالحت ہو جاوے گی۔ پھر اس کے بعد فرمایا : سَلْمَانُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْتِ سلمان یعنی دو صلحیں اور پھر فرمایا عَلٰی مَشْرَبِ الْحَسَنِ۔ یعنی حضرت حسنؓ میں بھی دو ہی صلحیں تھیں۔ ایک صلح تو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ کرلی۔ دوسری صحابہؓ کی باہم صلح کرا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسیح موعود حسنی المشرب ہے۔ حجج الکرامہ میں نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ مہدی حسنی ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا۔ حسنؓ کا دودھ پیئے گا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مہدی آپؐ کی آل میں سے ہوگا۔ یہ مسئلہ اس الہام سے حل ہوگیا اور مسیح موعود کا جو مہدی بھی ہے کام بھی معلوم ہوگیا۔ پس وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ آتے ہی تلوار چلائے گا اور کافروں کو قتل کریگا، جھوٹے ہیں۔ اصل بات یہی ہے جو اس الہام میں بتلائی گئی ہے کہ وہ دو صلحوں کا وارث ہوگا۔ یعنی بیرونی طور پر بھی صلح کرے گا اور اندرونی طور پر بھی مصالحت ہی کرا دے گا اور آل کا لفظ اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آل چونکہ وارث ہوتی ہے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کے وارث یا آل وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اُن کے علوم کے رُوحانی وارث ہوں۔ اسی واسطے کہا گیا ہے کہ کُلُّ تَقِیٍّ وَّ نَقِیٍّ آلِیْ۔

آیت مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ کی تفسیر

مولوی جمال دین صاحب ساکن سید والہ نے قرآن کی اس آیت کی تفسیر پوچھی مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ (البقرۃ: ۱۰۳) فرمایا :

بعض نابکار قومیں حضرت سلیمان علیہ السلام کو بُت پرست کہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اُن کی تردید کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف واقعات پر بحث کرتا ہے اور قرآن کل دُنیا کی صداقتوں کا مجموعہ ہے اور سب دین کی کتابوں کا فخر ہے۔ جیسے فرمایا ہے۔ فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ اور یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً (البیّنۃ ۳،۴)

پس قرآن کریم کے معنی کرتے وقت خارجی قصّوں کو نہ لیں، بلکہ واقعات کو مدِّنظر رکھنا چاہیے۔ مثلاً قرآنِ کریم نے

جو سُورۃ فاتحہ کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ۔ الرَّحِیْمِ۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اسماء سے شروع کیا ہے، تو اُس میں کیا راز تھا۔ چونکہ بعض قومیں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر اُس کی صفات رَبّ، رحیم، رحمٰن، مالکِ یوم الدّین سے منکر تھیں، اس لیے اس طرز کو لیا۔ یہ یاد رکھو کہ جس نے قرآن کریم کے الفاظ اور فقرات کو جو قانونی ہیں، ہاتھ میں نہیں لیا۔ اُس نے قرآن کا قدر نہیں سمجھا۔

اب دیکھو یہاں خَالِقُ الْعَالَمِیْنَ نہیں فرمایا۔ بلکہ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ فرمایا۔ اور ربّ العالمین اس لیے بھی فرمایا تاکہ یہ ثابت کرے کہ وہ بسائط اور عالمِ امر کا بھی رَبّ ہے۔ کیونکہ بسیط چیزیں امر سے ہیں اور مرکّب خلق سے۔ اس لیے کہ بعض قومیں رُبوبیت کی منکر ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم کو جو کچھ ملتا ہے۔ مثلاً اگر دُودھ ملتا ہے، تو اگر ہم کوئی گناہ کر کے گائے یا بھینس وغیرہ کی جُون میں نہ جاتے، تو دُودھ ہی نہ ہوتا اور خلق چونکہ قطع و بُرید کرنے کا نام ہے۔ اس لیے اس موقعہ پر رَبّ العَالَمِیْن کو جو اُس سے افضل تر ہے۔ بیان فرمایا۔ اسی طرح پر رحمانیت۔ رحیمیت کے منکر دُنیا میں موجود ہیں۔

غرض قرآن کریم مذاہبِ باطلہ کے عقائدِ فاسدہ کو مدِّ نظر رکھ کر ایک سلسلہ شروع فرماتا ہے۔ اسی طرح پر اس قصہ میں حضرت سلیمٰن علیہ السلام کی بریّت منظور ہے اور اُن کو اس ناپاک الزام سے بَری کرنا مقصُود ہے جو اُن پر لگایا جاتا ہے کہ وُہ بُت پرست تھے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ۔ سلیمان نے کفر نہیں کیا۔[1]

۲۰؍ اکتوبر ۱۹۰۰ء

دو قسم کی مخلوق مولوی جمال الدین صاحب سیّد والہ نے اپنے واقعات سنائے جس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:

"آج میں اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ: ۸۸) کی بحث لکھتا تھا جس میں مَیں نے بتایا ہے کہ مسیح کی کوئی خصُوصیت نہیں۔ رُوح القدس کے فرزند وہ تمام سعادت مند اور راستباز لوگ ہیں جن کی نسبت قرآن شریف میں اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ (الحجر: ۴۳) وارد ہے اور قرآن کریم سے دو قسم کی مخلوق ثابت ہوتی ہے۔ اوّل وُہ جو رُوح القدس کے فرزند ہیں اور بن باپ پیدا ہونا کوئی خصوصیت نہیں۔ دوم شیطان کے فرزند۔"[2]

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۴ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۰ء

[2] الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ صفحہ ۳ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء

۲۱؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

ایک اہم پیشگوئی صبح کی سیر میں علماء سُوء کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ

"کوئی ایسا آدمی ہو جو اُن کو جا کر سمجھا دے اور کہے کہ تم کوئی نشان لے کر صدقِ دل سے دیکھو" پھر فرمایا "یہ لوگ کم ہی امید ہے کہ رجوع کریں، مگر جو آئندہ ذرّیت ہوگی، وہ ہماری ہی ہوگی"[1]

۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

دوزخ عارضی ہے اور بہشت دائمی صُبح کی سیر میں بہشت و دوزخ کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: کہ

قرآن شریف میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے بہشت کا ذکر فرمایا ہے، وہاں بہشت کے انعامات کی نسبت عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (ہود: ۱۰۹) فرمایا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو امید نہ رہتی اور مایُوسی پیدا ہوتی۔ اس لیے کہ بہشت کے دوامی انعاموں کو دیکھ کر مسرّت بڑھتی ہے اور دوزخ کے ایک معیّن عرصہ تک ہونے سے امید پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ایک شاعر نے اس کو یُوں بیان کیا ہے ؎

گویند کہ بحشر جستجو خواہد بود
واں یارِ عزیز تُند خو خواہد بود
از خیرِ محض شرّے نیاید ہرگز
خوش باش کہ انجام نکو خواہد بود

ہمارا ایمان یہی ہے کہ دوزخ میں انسان ایک عرصہ تک رہیں گے، پھر نکل آئیں گے۔ گویا جن کی اصلاح نبوّت سے نہیں ہو سکی، اُن کی اصلاح دوزخ کرے گا۔ حدیث میں آیا ہے۔ يَاْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ۔ یعنی جہنّم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں کوئی متنفّس نہیں ہوگا اور نسیم صبا اُس کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی[2]

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ صفحہ ۳ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۰ء

[2] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۱ء

معجزات کے اقسام معجزاتِ مسیحؑ پر گفتگو کے سلسلہ میں فرمایا: کہ

"معجزات تین قسم کے ہوتے ہیں۔ دعائیہ، اِرہاصیہ اور قوتِ قدسیہ کے معجزات اِرہاصیہ میں دُعا کو دخل نہیں ہوتا۔ قوتِ قدسیہ کے مُعجزات ایسے ہوتے ہیں، جیسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے پانی میں اُنگلیاں رکھ دی تھیں اور لوگ پانی پیتے چلے گئے یا کنویں میں لعابِ مبارک گرا دیا اور اس کا پانی میٹھا ہوگیا۔ مسیحؑ کے مُعجزات اس قسم کے بھی تھے۔ خود ہم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ" بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے"۔[1]

۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

علمِ توجّہ اور توجّہِ انبیاءؑ میں فرق توجّہ اور انبیاء علیہم السلام کی دُعا میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ وہ توجّہ جو مسمریزم والے کرتے ہیں، وہ ایک کسب ہے اور وہ توجّہ جو دُعا سے پیدا ہوتی ہے ایک موہبتِ الٰہی ہے۔ نبی جبکہ بنی نوع کی ہمدردی سے متاثر ہو جاتا ہے، تو خدا تعالیٰ اُس کی فطرت کو ہمہ توجّہ بنا دیتا ہے اور اُس میں قبولیت کا نفخ رکھ دیتا ہے"۔[2]

مقربانِ الٰہی کی علامت

آں خدائے کہ ازو اہلِ جہاں بے خبر اند
بر من اُو جلوہ نمودست گر اہلی بپذیر
(مسیح موعودؑ)

"یہ تو ہر ایک قوم کا دعویٰ ہے کہ بہتیرے ہم میں سے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں، مگر ثبوت طلب یہ بات ہے کہ خدا تعالیٰ اُن سے محبت رکھتا ہے یا نہیں؟ اور خدا تعالیٰ کی محبت یہ ہے کہ پہلے تو اُن دلوں سے پردہ اُٹھا دے، جس پردہ کی وجہ سے اچھی طرح انسان خدا تعالیٰ کے وجُود پر یقین نہیں رکھتا اور ایک دُھندلی سی اور تاریک معرفت کے ساتھ اس کے وجود کا قائل ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات امتحان کے وقت اُس کے وجُود سے ہی انکار کر بیٹھتا ہے اور یہ پردہ اُٹھایا جانا بجز مکالمۂ الٰہیّہ کے اور کسی صورت میں میسّر نہیں آسکتا۔ پس

---

[1] الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ صفحہ ۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء

[2] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ صفحہ ۴ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۱ء

انسان حقیقی معرفت کے چشمہ میں اُس دن غوطہ مارتا ہے جس دن خدا تعالیٰ اُس کو مخاطب کرکے اَنَا الْمَوْجُوْد کی اس کو خود بشارت دیتا ہے۔ تب انسان کی معرفت صرف اپنے قیاسی ڈھکوسلہ یا محض منقولی خیالات تک محدود نہیں رہتی، بلکہ خدا تعالیٰ سے ایسا قریب ہو جاتا ہے کہ گویا اُس کو دیکھتا ہے اور یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ خدا تعالیٰ پر کامل ایمان اُسی دن اُس کو نصیب ہوتا ہے کہ جب اللہ جلّ شانہٗ اپنے وجود سے آپ خبر دیتا ہے اور پھر دوسری علامت خدا تعالیٰ کی محبت کی یہ ہے کہ اپنے پیارے بندوں کو صرف اپنے وجود کی خبر ہی نہیں، بلکہ اپنی رحمت اور فضل کے آثار بھی خاص طور پر اُن پر ظاہر کرتا ہے اور وُہ اس طرح پر کہ اُن کی دُعائیں جو ظاہری امیدوں سے بڑھ کر ہوں، قبول فرما کر اپنے الہام اور کلام کے ذریعہ سے اُن کو اطلاع دیتا ہے۔ تب اُن کے دل تسلّی پکڑ جاتے ہیں کہ یہ ہمارا قادر خدا ہے جو ہماری دُعائیں سُنتا ہے اور ہم کو اطلاع دیتا اور مشکلات سے ہمیں نجات دیتا ہے۔ اسی روز سے نجات کا مسئلہ بھی سمجھ میں آتا ہے اور خدا تعالیٰ کے وجود کا بھی پتہ لگتا ہے؛ اگرچہ جگانے اور متنبّہ کرنے کے لیے کبھی کبھی غیروں کو بھی سچّی خواب آسکتی ہے۔ مگر اس طریق کا مرتبہ اور شان اور رنگ اور ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا مکالمہ ہے جو خاص مقرّبوں ہی سے ہوتا ہے اور جب مقرّب انسان دُعا کرتا ہے، تو خدا تعالیٰ اپنی خدائی کے جلال کے ساتھ اس پر تجلّی فرماتا ہے اور اپنی رُوح اُس پر نازل کرتا ہے اور اپنی محبت سے بھرے ہوئے لفظوں کے ساتھ اس کو قبولِ دُعا کی بشارت دیتا ہے اور جس کسی سے یہ مکالمہ کثرت سے وقُوع میں آتا ہے اس کو نبی یا مُحدّث کہتے ہیں۔

سچّے مذہب کی علامت

اور سچّے مذہب کی یہی نشانی ہے کہ اس مذہب کی تعلیم سے ایسے راستباز پیدا ہوتے ہیں جو محدّث کے درجہ تک پہنچ جائیں جن سے خدا تعالیٰ آمنے سامنے کلام کرے اور اسلام کی حقیقت اور حقانیت کی اوّل نشانی یہی ہے کہ اس میں ہمیشہ ایسے راستباز جن سے خدا تعالیٰ ہم کلام ہو پیدا ہوتے ہیں تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (حٰمٓ السجدہ : ۳۱) سو یہی معیارِ حقیقی سچّے اور زندہ اور مقبول مذہب کا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ نُور صرف اسلام میں ہے۔ دُوسرے مذاہب اس روشنی سے بے نصیب ہیں اور ان مذاہب کے بُطلان کے لیے یہی دلیل ہزار دلائل سے بڑھ کر ہے کہ مُردہ ہرگز زندہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ اندھا سوجاکھے کے ساتھ پُورا اتر سکتا ہے۔ (ونعم ماقیل)

کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے
یہ ثمر باغِ محمّد سے ہی کھایا ہم نے

"یہ عاجز تو محض اس غرض کے لیے بھیجا گیا ہے کہ تا یہ پیغام خلق اللہ کو پہنچا دے کہ تمام مذاہب موجودہ میں سے وُہ مذہب حق پر اور خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے جو قرآن کریم لایا ہے اور دارالنّجاۃ میں داخل ہونے

کے لیے دروازہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہو جاؤ

"میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے یہ ثابت ہے کہ انسان اِن صفات کو اپنے اندر لے یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ساری صفتیں سزاوار ہیں، جو ربّ العالمین ہے۔ یعنی ہر عالَم میں. نُطفہ میں مُضغہ وغیرہ سارے عالموں میں۔ غرض ہر عالَم میں۔ پھر رحمٰن ہے پھر رحیم ہے اور مالک یوم الدین ہے۔ اب اِیَّاکَ نَعْبُدُ جو کہتا ہے، تو گویا اس عبادت میں وہی رُبُوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت صفات کا پَرتو انسان کو اپنے اندر لینا چاہیے۔ کمالِ عبدانسان کا یہی ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہو جاوے اور جب تک اس مرتبہ تک نہ پہنچ جاوے نہ تھکے نہ ہارے۔ اس کے بعد خود ایک کشش اور جذب پیدا ہو جاتا ہے جو عبادتِ الٰہی کی طرف اُسے لے جاتا ہے اور وُہ حالت اُس پر وارد ہو جاتی ہے جو یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (النحل: ۵۱) کی ہوتی ہے۔"[2]

۳۰؍اکتوبر ۱۹۰۰ء حسبِ معمول حضرت اقدس امام ہمام علیہ السّلام سیر کو تشریف لے گئے، راستہ میں فرمایا:

نبوّت اور قرآن شریف کی کلید

میرے دعویٰ کا فہم کلید ہے نبوّت اور قرآن شریف کی. جو شخص میرے دعویٰ کو سمجھ لے گا، نبوّت کی حقیقت اور قرآن شریف کے فہم پر اُس کو اطلاع دی جائے گی اور جو میرے دعویٰ کو نہیں سمجھتا۔ اُس کو قرآن شریف پر اور رسالت پر پورا یقین نہیں ہو سکتا۔

اِتّباعِ امام

قرآن شریف میں جو یہ آیت آئی ہے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (الغاشیہ:۱۸) یہ آیت نبوّت اور امامت کے مسئلہ کو حل کرنے کے واسطے بڑی مُعاون ہے۔ اُونٹ کے عربی زبان میں ہزار کے قریب نام ہیں اور پھر ان ناموں میں سے اِبِل کے لفظ کو جو لیا گیا ہے۔ اس میں کیا سِرّ ہے؟ کیوں اِلَی الْجَمَلِ بھی تو ہو سکتا تھا؟

اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جَمَل ایک اُونٹ کو کہتے ہیں اور اِبِل اسمِ جمع ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کو چونکہ تمدّنی اور اجماعی حالت کا دکھانا مقصود تھا اور جَمَل میں جو ایک اونٹ پر بولا جاتا ہے۔ یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ صفحہ ۴ مورخہ ۲۴؍مئی ۱۹۰۱ء

[2] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ صفحہ ۴ مورخہ ۲۴؍مئی ۱۹۰۱ء

تھا، اس لیے اِبل کے لفظ کو پسند فرمایا۔ اُونٹوں میں ایک دُوسرے کی پیروی اور اطاعت کی قوت رکھی ہے۔ دیکھو اُونٹوں کی ایک لمبی قطار ہوتی ہے اور وہ کس طرح پر اُس اُونٹ کے پیچھے ایک خاص انداز اور رفتار سے چلتے ہیں اور وہ اُونٹ جو سب سے پہلے بطور امام اور پیشرو کے ہوتا ہے۔ وُہ ہوتا ہے جو بڑا تجربہ کار اور راستہ سے واقف ہو۔ پھر سب اُونٹ ایک دُوسرے کے پیچھے برابر رفتار سے چلتے ہیں اور اُن میں سے کسی کے دل میں برابر چلنے کی ہوس پیدا نہیں ہوتی جو دُوسرے جانوروں میں ہے۔ جیسے گھوڑے وغیرہ میں۔ گویا اُونٹ کی سرشت میں اتباعِ امام کا مسئلہ ایک مانا ہوا مسئلہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کہہ کر اس مجموعی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ اُونٹ ایک قطار میں جا رہے ہوں۔ اسی طرح پر ضروری ہے کہ تمدنی اور اتحادی حالت کو قائم رکھنے کے واسطے ایک امام ہو۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ قطار سفر کے وقت ہوتی ہے پس دُنیا کے سفر کو قطع کرنے کے واسطے جب تک ایک امام نہ ہو انسان بھٹک بھٹک کر ہلاک ہو جاوے۔

پھر اونٹ زیادہ بارکش اور زیادہ چلنے والا ہے۔ اس سے صبر و برداشت کا سبق ملتا ہے۔

پھر اُونٹ کا خاصّہ ہے کہ وہ لمبے سفروں میں کئی کئی دنوں کا پانی جمع رکھتا ہے۔ غافل نہیں ہوتا۔ پس مومن کو بھی ہر وقت اپنے سفر کے لیے تیار اور محتاط رہنا چاہیے اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (البقرہ : ۱۹۸)۔

اُنْظُرُ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھنا بچوں کی طرح دیکھنا نہیں ہے، بلکہ اس سے اِتباع کا سبق ملتا ہے کہ جس طرح پر اُونٹ میں تمدنی اور اتحادی حالت کو دکھایا گیا ہے۔ اور ان میں اِتباعِ امام کی قوت ہے۔ اسی طرح پر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اِتباعِ امام کو اپنا شعار بنا دے، کیونکہ اُونٹ جو اس کے خادم ہیں اُن میں بھی یہ مادہ موجود ہے۔

"کَیْفَ خُلِقَتْ" میں ان فوائدِ جامع کی طرف اشارہ ہے جو اِبل کی مجموعی حالت سے پہنچتے ہیں۔"[1]

تناسخ

"تناسخ کا مسئلہ اللہ تعالیٰ کی سخت توہین کا باعث ہے اور اخلاقی قوتوں کو خاک میں ملا دینے والا ہے، کیونکہ جب یہ مان لیا گیا کہ دُنیا میں جو کچھ ملتا ہے، وہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے تو پھر یہ بھی ساتھ ہی ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ خدا بالکل معطّل پڑا ہوا ہے۔ کیونکہ خالق کے متعلق یہ مان لیا گیا ہے کہ وُہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا اور ایک ذرّہ کا بھی خالق نہیں اور اُدھر یہ مانا گیا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ملتا ہے وُہ

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۴۲ صفحہ ۴-۵ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۰۰ء

اپنے عملوں ہی سے ملتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایسے بُرے عمل نہ کرے کہ وہ گائے یا بھینس کی جُون میں جاوے یا بھیڑ بکری بنے تو پھر دُودھ ہی نہ ملے اور اسی طرح پر کچھ بھی نہیں مِل سکتا۔ پھر ایسا خدا جو نہ کچھ پیدا کرتا ہے اور نہ کسی کو کچھ دیتا ہے۔ وہ ایک معطّل خدا نہ ہوا تو اور کیا ہوا؟ پھر اس تناسخ کے مسئلہ سے اخلاقی قوتوں پر یہ بڑی زد پڑتی ہے کہ انسان میں جو غیرت کی قوت رکھی گئی ہے اس کا ستیاناس ہوتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی ایسی فہرست وید نے نہیں دی کہ فلاں شخص فلاں جُون میں چلا گیا ہے۔ تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ ایک آدمی کسی وقت اور کسی جُون میں اپنی ماں بہن سے بھی شادی کر کے بچے پیدا کرے یا باپ گھوڑا بن جاوے اور بیٹا اس پر سوار ہو کر چابکوں سے اُس کی خبر لے۔ بغرض کہ یہ مسئلہ بہت ہی بُرے اور ناپاک نتیجوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ تناسخ ہی کیا کم تھا جو آریوں نے نیوگ بھی ویدوں میں سے نکال لیا۔"

۳ر نومبر ۱۹۰۰ء

نکاتِ عشرہ

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مظہرِ رحمانیت و رحیمیت

رحمانیت کا مظہر تام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ کیونکہ محمدؐ کے معنے ہیں بہت تعریف کیا گیا۔ اور رحمان کے معنی ہیں بلا مُزد و بن مانگے بلا تفریق مومن و کافر کو دینے والا اور یہ صاف بات ہے کہ جو بن مانگے دے گا۔ اُس کی تعریف ضرور کی جائے گی۔ پس محمدؐ میں رحمانیت کی تجلّی تھی اور اسمِ احمدؐ میں رحیمیت کا ظہور تھا۔ کیونکہ رحیم کے معنے ہیں۔ محنتوں اور کوششوں کو ضائع نہ کرنے والا اور احمدؐ کے معنے ہیں تعریف کرنے والا اور یہ بھی عام بات ہے کہ وہ شخص جو کسی کا عمدہ کام کرتا ہے، وُہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اس کی محنت پر ایک بدلہ دیتا ہے اور اُس کی تعریف کرتا ہے۔ اِس لحاظ سے احمدؐ میں رحیمیت کا ظہور ہے۔ پس اللہ محمد (رحمٰن) احمد (رحیم) ہے۔ گویا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ان دو عظیم الشّان صفات رحمانیت و رحیمیت کے مظہر تھے۔"

۲۔ دُنیا ایک ریل گاڑی

"دُنیا ایک ریل گاڑی ہے اور ہم سب کو عُمر کے ٹکٹ دیئے گئے ہیں۔ جہاں جہاں کسی کا سٹیشن آ جاتا ہے اس کو اُتار دیا جاتا ہے یعنی وہ مرجاتا

لہ الحکم جلد ۴ نمبر ۴۲ صفحہ ۵ مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۰۰ء

ہے۔ پھر انسان کس زندگی پر خیالی پلاؤ پکاتا اور لمبی اُمیدیں باندھتا ہے۔"

۳۔ معراج کا سِرّ

"معراج انقطاعِ تام تھا اور سِر اس میں یہ تھا کہ تا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقطۂ نفسی کو ظاہر کیا جاوے۔ آسمان پر ہر ایک رُوح کے لیے ایک نقطہ ہوتا ہے۔ اس سے آگے وُہ نہیں جاتی۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نقطۂ نفسی عرش تھا اور رفیقِ اعلےٰ کے معنے بھی خدا ہی کے ہیں پس رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر اور کوئی معزّز و مکرّم نہیں ہے۔"

۴۔ نماز تعویذ ہے

"نماز انسان کا تعویذ ہے۔ پانچ وقت دُعا کا موقعہ ملتا ہے۔ کوئی دُعا تو سُنی جائے گی۔ اس لیے نماز کو بہت سنوار کر پڑھنا چاہیے اور مجھے یہی بہت عزیز ہے۔"

۵۔ فاتحہ کی سات آیات کی حکمت

"سورۃ فاتحہ کی سات آیتیں اسی واسطے رکھی ہیں کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں۔ پس ہر ایک آیت گویا ایک دروازہ سے بچاتی ہے۔"

۶۔ اصل جنّت

"اعلیٰ درجے کی خوشی خُدا میں ملتی ہے۔ جس سے پَرے کوئی خوشی نہیں ہے۔ جنّت پوشیدہ کو کہتے ہیں اور جنّت کو جنّت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ نعمتوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اصل جنّت خدا ہے جس کی طرف تردّد منسُوب ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے بہشت کے اعظم ترین انعامات میں رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (التوبہ : ۷۲) ہی رکھا ہے۔ انسان انسان کی حیثیت سے کسی نہ کسی دُکھ اور تردّد میں ہوتا ہے، مگر جس قدر قُربِ الٰہی حاصل کرتا جاتا ہے اور تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ سے رنگین ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اصل سُکھ اور آرام پاتا ہے، جس قدر قربِ الٰہی ہوگا۔ لازمی طور پر اُسی قدر خدا کی نعمتوں سے حصّہ لے گا اور رَفع کے معنے اسی پر دلالت کرتے ہیں۔

نجاتِ کامل خدا ہی کی طرف مرفُوع ہو کر ہوتی ہے اور جس کا رفع نہ ہو وہ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (الاعراف: ۱۷۷) ہو جاتا ہے۔ پس رفعِ مسیحؑ سے مراد اُن کے نجات یافتہ ہونے کی طرف ایما ہے اور یہ رُوحانی مراتب ہیں جن کو ہر ایک آنکھ دیکھ نہیں سکتی کہ کیونکر ایک انسان آسمان کی طرف اُٹھایا جاتا ہے۔"

۷۔ نزُول سے مُراد

"نزُول سے مُراد عزّت و جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ پس ہمارا نزُول بھی یہی شان رکھتا ہے۔ پھر نزُول سے پہلے منارہ کا وجود تو خود ہی ہو جائے گا۔ نزول سے مُراد محض لعنت نہیں ہوتی۔"

۸۔ سورۃ فاتحہ کی جامع تفسیر

الحمدللہ سے قرآن شریف اسی لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نام کی طرف ایما ہو اِهْدِنَا

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے پایا جاتا ہے کہ جب انسانی کوششیں تھک کر رہ جاتی ہیں، تو آخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجُوع کرنا پڑتا ہے۔

دُعا کامل تب ہوتی ہے کہ ہر قسم کی خیر کی جامع ہو اور ہر شر سے بچاوے۔ پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں سارے خیر جمع ہیں۔ اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں سب شرّوں حتّٰی کہ دجّالی فتنہ سے بچنے کی دُعا ہے۔ مَغْضُوْب سے بالاتفاق یہُودی اور اَلضَّآلِّیْنَ سے نصاریٰ مراد ہیں۔ اب اگر اس میں کوئی رمز اور حقیقت نہ تھی، تو اس دُعا کی تعلیم سے کیا غرض تھی؟ اور پھر ایسی تاکید کہ اس دُعا کے بدُوں نماز ہی نہیں ہوتی اور ہر رکعت میں اُس کا پڑھا جانا ضروری قرار دیا۔ بھید اس میں یہی تھا کہ یہ ہمارے زمانہ کی طرف ایماء ہے۔ اس وقت صراطِ مستقیم یہی ہے جو ہماری راہ ہے۔"

۹۔ مسیح کی شبیہہ کا افسانہ

"کہتے ہیں کہ مسیح کی شبیہہ کو سُولی دی گئی۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ اس میں حصرِ عقلی یہی بتاتا ہے کہ وُہ شخص جو مسیح کی شبیہہ بنایا گیا، یا دُشمن ہو گا یا دوست۔ اگر وُہ دشمن تھا تو ضرور تھا کہ وُہ شور مچاتا کہ مَیں مسیح نہیں ہوں اور میرے فلاں رشتہ دار موجود ہیں۔ میرا اپنی بیوی کے ساتھ فلاں راز ہے۔ مسیح کو مَیں ایسا سمجھتا ہوں۔ غرض وُہ شور مچا کر اپنی صفائی اور بریّت کرتا؛ حالانکہ کسی تاریخِ صحیح سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ جو شخص صلیب پر لٹکایا گیا تھا، اُس نے شور مچا کر رہائی حاصل کر لی تھی۔

اور اگر وُہ مسیح کا دوست اور حواری ہی تھا۔ پھر صاف بات ہے کہ وہ مومن باللہ تھا اور وُہ صلیب پر مرنے کی وجہ سے بلا وجہ ملعُون ہوا اور خدا نے اُس کو ملعُون بنایا۔ رہی یہ بات کہ مصلُوب ملعُون کیوں ہوتا ہے؟ یہ عام بات ہے کہ جو چیز کسی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے، وہ اُس کے ساتھ منسوب ہو جاتی ہے۔ سُولی کو مجرموں کے ساتھ تعلق ہے جو گویا کاٹ دینے کے قابل ہوتے ہیں اور خدا کا تعلق مجرم کے ساتھ کبھی نہیں ہوتا یہی لعنت ہے۔ اس وجہ سے وُہ لعنتی ہوتا ہے۔

اس لیے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک مومنِ ناکردہ گناہ ملعُون قرار دیا جاوے۔ پس یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اصل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر ظاہر کی کہ مسیح کی حالت غشی وغیرہ سے ایسی ہو گئی جیسے مُردہ ہوتے ہیں۔

۱۰۔ انبیاء خبیث امراض سے محفوظ رکھے جاتے ہیں

"انبیاء علیہم السّلام اور اللہ تعالیٰ کے مامُور خبیث اور ذلیل بیماریوں سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً آتشک ہو، جذام ہو یا اور کوئی ایسی ذلیل مرض۔ یہ بیماریاں خبیث لوگوں ہی کو ہوتی ہیں اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ (النور: ۲۷) اس میں عام لفظ رکھا ہے اور نکات بھی عام ہیں۔ اس لیے ہر خبیث

مرض سے اپنے ماموروں اور برگزیدوں کو بچا لیتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مومن پر جھوٹا الزام لگایا جاوے اور وہ بری نہ کیا جاوے۔ خصوصاً مُصلح اور مامور اور یہی وجہ ہے کہ مُصلح یا مامور حسب نسب کے لحاظ سے بھی ایک اعلیٰ درجہ رکھتا ہے؛ اگرچہ ہمارا مذہب یہی ہے اور یہی سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک تکریم اور تعظیم کا معیار صرف تقویٰ ہی ہے اور ہم یہ مانتے ہیں کہ چوہڑا بھی مسلمان ہو کر اعلیٰ درجہ کا قرب اور درجہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہاں کسی خاص قوم یا ذات کے لیے فضل مخصوص نہیں ہے، مگر سنت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ وہ جس کو مامور یا مُصلح مقرر فرماتا ہے، اس کو ایک اعلیٰ خاندان میں ہونے کا شرف دیتا ہے اور یہ اس لیے کہ لوگوں پر اس کا اثر پڑے اور کوئی طعنہ نہ دے سکے۔[1]"

۱۵ر نومبر ۱۹۰۰ء

نبی اور ولی کی عبادات میں فرق

خیانت اور ریاکاری دو ایسی چیزیں ہیں کہ اُن کی رفتار بہت ہی سُست اور دھیمی ہے۔ اگر کسی زاہد کو فاسق کہہ دیا جاوے تو اُسے ایک لذت آجائے گی اس واسطے کہ وہ راز جو اُس کے اور اُس کے محبوب و مولیٰ کے درمیان ہے وہ مخفی معلوم دے گا۔ صُوفی کہتے ہیں کہ خالص مومن جبکہ عین عبادت میں مصروف ہو اور وہ اپنے آپ کو پوشیدہ کرکے کسی حجرہ یا کوٹھڑی کے دروازے بند کرکے بیٹھا ہو۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص اس پر چلا جاوے تو وہ ایسی طرح شرمندہ ہو جائے گا، جیسے ایک بدکار اپنی بدکاری کو چھپاتا ہے۔ جیسے کہ اس قسم کے مومن کو کسی کے فاسق کہنے سے ایک لذت آتی ہے۔ اسی طرح دیانت دار کو کسی کے بددیانت کہنے سے جوش میں نہیں آنا چاہیے۔

ہاں! انبیاء میں ایک قسم کا استثنا ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ اپنی عبادت اور افعال کو چھپائیں، تو دُنیا ہلاک ہو جاوے۔ مثلاً اگر نبی نے نماز پڑھ لی ہو اور کوئی کہے کہ دیکھو۔ اس نے نماز نہیں پڑھی، تو اُس کو چُپ رہنا مناسب نہیں ہوتا اور اس کو بتلانا پڑتا ہے کہ تم غلط کہتے ہو۔ میں نے نماز پڑھ لی ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ نہ کہے، دُوسرے لوگ دھوکہ میں پڑ کر ہلاک ہو سکتے ہیں۔ پس نبیوں کو ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنی عبادات کا ایک حصّہ ظاہر طور پر کریں۔ اور لوگوں کو دکھانا مقصود ہوتا ہے تاکہ ان کو سکھا دیں۔ یہ ریا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کہے کہ خضر نے ایسے کام کیوں کئے۔ جن میں شریعت کی خلاف ورزی کا مظنّہ تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خضر صاحبِ شریعت نہ تھا، ولی تھا۔

---

[1] بروایت صاحبزادہ میاں محمود احمد صاحب در مجمع
تشحیذ الاذہان مندرجہ الحکم جلد ۵ نمبر ۶ صفحہ ۶، ۷ مورخہ ۱۷ر فروری ۱۹۰۱ء

انبیاء علیہم السلام کے لیے دونوں حصّے ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کو سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً نیکی کرنے کا حکم ہوتا ہے۔"

میرے پاس آؤ اور میری سُنو!

"میری حیثیت ایک معمولی مولوی کی حیثیت نہیں ہے بلکہ میری حیثیت سُنَنِ انبیاء کی سی حیثیت ہے۔ مجھے ایک سماوی آدمی مانو۔ پھر یہ سارے جھگڑے اور تمام نزاعیں جو مسلمانوں میں پڑی ہوئی ہیں، ایک دم میں طے ہو سکتی ہیں جو خدا کی طرف سے مامور ہو کر حَکَم بن کر آیا ہے۔ جو معنے قرآن شریف کے وُہ کرے گا، وہی صحیح ہوں گے اور جس حدیث کو وُہ صحیح قرار دے گا، وُہی حدیث صحیح ہوگی۔

ورنہ شیعہ سنّی کے جھگڑے آج تک دیکھو کب طے ہونے میں آئے ہیں۔ شیعہ اگر تبرّا کرتے ہیں، تو بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت کہتے ہیں۔

بر خلافت دلش بسے مائل
لیک بوبکر شُد دراں حائل

مگر میں کہتا ہوں کہ جب تک یہ اپنا طریق چھوڑ کر مجھ میں ہو کر نہیں دیکھتے۔ یہ حق پر ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ان لوگوں کو اور یقین نہیں تو اتنا تو ہونا چاہیے کہ آخر مرنا ہے اور مرنے کے بعد گند سے تو کبھی نجات نہیں ہو سکتی۔ سبّ و شتم جب ایک شریف آدمی کے نزدیک پسندیدہ چیز نہیں ہے، تو پھر خدائے قدوس کے حضور عبادت کب ہو سکتی ہے؟

اسی لیے تو مَیں کہتا ہوں کہ "میرے پاس آؤ، میری سُنو تاکہ تمھیں حق نظر آوے۔" مَیں تو سارا ہی چولہ اُتارنا چاہتا ہوں۔ سچّی توبہ کر کے مومن بن جاؤ۔ پھر جس امام کے تم منتظر ہو، مَیں کہتا ہوں کہ وُہ مَیں ہوں۔ اس کا ثبوت مجھ سے لو۔ اس لیے مَیں نے اس خلیفہ بلافصل کے سوال کو عزّت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مَیں ایسے گندے سوال کو کیا کروں — انہیں گندوں کو نکالنے کے واسطے تو خدا نے مجھے بھیجا ہے۔

دیکھو! سُنّی اُن کی حدیثوں کو لغو ٹھہراتے ہیں۔ یہ اپنی حدیثوں کو مرفوع متصل اور ائمہ سے مروی قرار دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ سب جھگڑے فضول ہیں۔ اب مُردہ باتوں کو چھوڑ دو اور ایک زندہ امام کو شناخت کرو کہ تمہیں زندگی کی رُوح ملے۔ اگر تمہیں خدا کی تلاش ہے، تو اُس کو ڈھونڈو جو خدا کی طرف سے مامور ہو کر آیا ہے۔ اگر کوئی شخص خُبث کو نہیں چھوڑتا، تو کیا ہم اندھے ہیں؟ منافق کے دل کی بَدبُو نہیں سونگھتے۔ ہم انسان کو فوراً تاڑ جاتے ہیں۔ کہ اس کی بات اِس بنا پر ہے۔ پس یاد رکھو۔ خدا نے یہی راہ پسند کی ہے جو مَیں بتاتا ہوں اور یہ اقرب راہ اُسی نے نکالی ہے۔ دیکھو جو ریل جیسی آرام دہ سواری کو چھوڑ کر ایک لنگڑے مریل ٹٹو پر سوار ہوتا ہے، وہ منزل پر پہنچ نہیں سکتا۔ افسوس! یہ لوگ خدا کی باتوں کو چھوڑ کر زیدؔ بکرؔ کی باتوں پر مرتے ہیں۔ اُن سے پوچھو کہ وہ حدیثیں کس نے دی ہیں؟

مَیں تو بار بار یہی کہتا ہوں کہ ہمارا طریق تو یہ ہے کہ نئے سرے سے مُسلمان بنو۔ پھر اللہ تعالیٰ اصل حقیقت خود کھول دے گا۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اگر وُہ امام جن کے ساتھ یہ اس قدر محبّت کا غُلو کرتے ہیں زندہ ہوں، تو اُن سے سخت بیزاری ظاہر کریں۔

جب ہم ایسے لوگوں سے اعراض کرتے ہیں تو پھر کہتے ہیں کہ ہم نے ایسا اعتراض کیا، جس کا جواب نہ آیا اور پھر بعض اوقات اشتہار دیتے پھرتے ہیں۔ مگر ہم ایسی باتوں کی کیا پرواہ کر سکتے ہیں۔ ہم کو تو وہ کرنا ہے، جو ہمارا کام ہے۔

اس لیے یاد رکھو کہ پُرانی خلافت کا جھگڑا چھوڑو۔ اب نئی خلافت لو۔ ایک زندہ علی تم میں موجود ہے اُس کو چھوڑتے ہو اور مُردہ علی کی تلاش کرتے ہو[1]"

۸ر دسمبر ۱۹۰۰ء

ایک الہام اور اپنی وحی پر یقین

فرمایا: "کل رات میری اُنگلی کے پوٹے میں دَرد تھا اور اِس شدّت کے ساتھ دَرد تھا کہ مجھے خیال آیا تھا کہ رات کیونکر بسر ہوگی۔ آخر ذرا سی غنودگی ہوئی اور الہام ہوا۔ كُوْنِي بَرْدًا وَّسَلَامًا۔ اور سَلَامًا کا لفظ ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ معًا دَرد جاتا رہا ایسا کہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا"

نیز فرمایا کہ:

"ہم کو تو خدا تعالیٰ کے اس کلام پر جو ہم پر وحی کے ذریعہ نازل ہوتا ہے۔ اس قدر یقین اور علیٰ وجہ البصیرۃ یقین ہے کہ بیت اللہ میں کھڑا کر کے جس قسم کی چاہو قسم دے دو۔ بلکہ میرا تو یقین یہاں تک ہے کہ اگر مَیں اس بات کا انکار کروں، یا وہم بھی کروں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں تو معًا کافر ہو جاؤں[2]"

۱۳ر دسمبر ۱۹۰۰ء

نصرتِ الٰہی فیصلہ کُن قاضی ہے

الٰہی بخش لاہوری مخالف کی کتاب "عصائے موسیٰ" تمام وکمال پڑھ کر حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کی فضولیات کو چھوڑ کر چند گھنٹوں کا کام ہے اس کا جواب دے دینا لیکن مَیں

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۴۱ صفحہ ۲-۱ مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۰ء

[2] الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ صفحہ ۶ مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۰ء

محض ترحم سے کچھ مدت تک اس کو چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ لوگ بھی خوش ہو لیں۔ آخر پُرانے رفیق تھے۔ سچے جھوٹے میں نصرتِ الٰہی فرق کرتی ہے۔

نیز اس اثنا میں بہت سے لوگوں کے فہم اور عقلیں اور ایمان ہمیں معلوم ہو جائیں گے کہ کون کون اس پر ریویو کرتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ اور کون کون اس کے وسوسوں سے متاثر ہوتا ہے۔ بہر حال مصلحت یہی ہے کہ ایک وقت تک اس سے اغماض کیا جاوے۔

یہ مت سمجھو کہ ہمارے حق میں یہ کتاب شر ہے یقیناً یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ نے اس سے ہماری بڑی خیر کا ارادہ فرمایا ہے۔ آخری فیصلہ کی راہ خدا تعالیٰ کی نصرتوں اور تائیدوں کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟ جو اعتراض اُس نے ہم پر کئے ہیں، وُہی نصاریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتیات پر کرتے ہیں۔ آخر اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح : ۲، ۳) نے فیصلہ کر دیا کہ سارے جُزوی اعتراض باطل تھے۔ حضرت موسیٰ پر آریوں نے کیا کیا اعتراض کیے کہ فرعونیوں کا مال اُنھوں نے غبن کیا اور بچے مارے اور یہ کیا اور وُہ کیا۔ مگر نصرتِ الٰہی نے غرقِ فرعون اور آپ کی نجات سے فیصلہ کر دیا کہ حق کس طرف تھا۔ غرض نصرتِ الٰہی آخرکار بڑا فیصلہ کُن قاضی ہوتی ہے۔

ہمارے اور اُن کے درمیان بھی نصرتِ الٰہی اور تائیداتِ سماوی فیصلہ کُن ہوں گی۔[1]

۲۲ر دسمبر ۱۹۰۰ء

وقت کی قدر کرو ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا :

"ڈاکٹر صاحب! ہمارے دوست دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کے ساتھ ہم کو کوئی حجاب نہیں اور دُوسرے وُہ جن کو ہم سے حجاب ہے، اس لیے اُن کے دل کا اثر ہم پر پڑتا ہے اور ہم کو بھی ان سے حجاب رہتا ہے۔ جن لوگوں سے ہم کو کوئی حجاب نہیں ہے۔ اُن میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے وُہ دوست جن کو ہم سے کچھ حجاب نہیں رہا، وُہ ہمارے پاس رہیں کیونکہ موت کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ ہم سب کے سب عمر کی ایک تیز رفتار گاڑی پر سوار ہیں اور مختلف مقامات کے ٹکٹ ہمارے پاس ہیں۔ کوئی دس برس کی منزل پر اُتر جاتا ہے۔ کوئی بیس۔ کوئی تیس۔ اور بہت ہی کم ۸۰ برس کی منزل پر۔ جبکہ یہ حال ہے تو پھر کیا بدنصیب وہ انسان ہے کہ وہ اُس وقت

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۴۵ صفحہ ۲ مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۰۰ء از خط مولانا عبدالکریم صاحب۔

کی جو اُس کو دیا گیا ہے۔ کچھ قدر نہ کرے اور اُس کو ضائع کر دے۔

نماز میں دُعا اور تضرّع

"انسان کی زاہدانہ زندگی کا بڑا بھاری معیار نماز ہے۔ وہ شخص جو خدا کے حضور نماز میں گِریاں رہتا ہے، امن میں رہتا ہے۔ جیسے ایک بچہ اپنی ماں کی گود میں چیخ چیخ کر روتا ہے اور اپنی ماں کی محبت اور شفقت کو محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح پر نماز میں تضرّع اور ابتہال کے ساتھ خدا کے حضور گڑگڑانے والا اپنے آپ کو ربُوبیت کی عطُوفت کی گود میں ڈال دیتا ہے۔ یاد رکھو اُس نے ایمان کا حظ نہیں اُٹھایا جس نے نماز میں لذّت نہیں پائی۔ نماز صرف ٹکروں کا نام نہیں ہے۔ بعض لوگ نماز کو تو دو چار چونچیں لگا کر جیسے مُرغی ٹھونگیں مارتی ہے، ختم کرتے ہیں اور پھر لمبی چوڑی دُعا شروع کرتے ہیں، حالانکہ وُہ وقت جو اللہ تعالیٰ کے حضوُر عرض کرنے کے لیے مِلا تھا۔ اُس کو صرف ایک رسم اور عادت کے طور پر جلد جلد کرنے میں گزار دیتے ہیں اور حضوُرِ الٰہی سے نکل کر دُعا مانگتے ہیں۔ نماز میں دُعا مانگو۔ نماز کو دُعا کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھو۔

فاتحہ۔ فتح کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ مومن کو مومن اور کافر کو کافر بنا دیتی ہے یعنی دونوں میں ایک امتیاز پیدا کر دیتی ہے اور دل کو کھولتی، سینہ میں ایک انشراح پیدا کرتی ہے، اس لیے سورۃ فاتحہ کو بہت پڑھنا چاہیے اور اس دُعا پر خوب غور کرنا ضروری ہے۔ انسان کو واجب ہے کہ وُہ ایک سائل کامل اور محتاجِ مطلق کی صورت بنا دے اور جیسے ایک فقیر اور سائل نہایت عاجزی سے کبھی اپنی شکل سے اور کبھی آواز سے دُوسرے کو رحم دلاتا ہے۔ اسی طرح سے چاہیے کہ پُوری تضرّع اور ابتہال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضوُر عرض حال کرے۔

پس جب تک نماز میں تضرّع سے کام نہ لے اور دُعا کے لیے نماز کو ذریعہ قرار نہ دے ـــــ نماز میں لذّت کہاں"؟

اپنی زبان میں دُعا

"یہ ضروری بات نہیں ہے کہ دعائیں عربی زبان میں کی جاویں؛ چونکہ اصل غرض نماز کی تضرّع اور ابتہال ہے، اس لیے چاہیے کہ اپنی مادری زبان میں ہی کرے۔ انسان کو اپنی مادری زبان سے ایک خاص اُنس ہوتا ہے اور پھر وُہ اس پر قادر ہوتا ہے۔ دُوسری زبان سے خواہ اس میں کس قدر بھی دخل اور مہارتِ کامل ہو، ایک قسم کی اجنبیت باقی رہتی ہے۔ اس لیے چاہیے کہ اپنی مادری زبان ہی میں دُعائیں مانگے"۔

موت سے بے فکر نہ ہوں

کسی کو کیا معلوم ہے کہ ظہر کے بعد عصر کے وقت تک زندہ رہے۔ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ یکدفعہ ہی دورانِ خوُن بند ہو کر جان نکل جاتی ہے۔ بعض دفعہ چنگے بھلے آدمی مرجاتے ہیں۔ وزیر محمد حسن خاں صاحب ہوا خوری کر کے آئے تھے اور خوشی خوشی زینے پر چڑھنے لگے۔ ایک دو زینے چڑھے ہوں گے کہ چکر آیا، بیٹھ گئے۔ نوکر نے کہا کہ مَیں سہارا دُوں۔ کہا نہیں۔

پھر دو تین زینے چڑھے پھر چکر آیا اور اسی چکر کے ساتھ جان نکل گئی۔ ایسا ہی غلام محی الدین کونسلی کشمیر کا ممبر یکدفعہ ہی مرگیا۔ غرض موت کے آجانے کا ہم کو کوئی وقت معلوم نہیں کہ کس وقت آجاوے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ اس سے بے فکر نہ ہوں۔ پس دین کی غمخواری ایک بڑی چیز ہے جو سکرات الموت میں سرخرو رکھتی ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ (الحج :۲) ساعت سے مراد قیامت بھی ہوگی۔ ہم کو اس سے انکار نہیں، مگر اس میں سکرات الموت ہی مراد ہے، کیونکہ انقطاع تام کا وقت ہوتا ہے۔ انسان اپنے محبوبات اور مرغوبات سے یکدفعہ الگ ہوتا ہے اور ایک عجب قسم کا زلزلہ اُس پر طاری ہوتا ہے۔ گویا اندر ہی اندر وہ ایک شکنجہ میں ہوتا ہے، اس لیے انسان کی تمام تر سعادت یہی ہے کہ وہ موت کا خیال رکھے اور دُنیا اور اُس کی چیزیں اس کی ایسی محبُوبات نہ ہوں جو اس آخری ساعت میں علیحدگی کے وقت اُس کی تکالیف کا مُوجب ہوں۔ دنیا اور اس کی چیزوں کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے ؎

این ہمہ را بہ کُشتنت آہنگ
گاہ بصلح کُشند و گاہ بجنگ

قرآنِ کریم نے اس مضمون کو اس آیت میں ادا کردیا ہے اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ (الانفال:۲۹) اَموالکُم میں عورتیں داخل ہیں۔ عورت چونکہ پَردہ میں رہتی ہے، اس لیے اس کا نام بھی پردہ ہی میں رکھا ہے اور اس لیے بھی کہ عورتوں کو انسان مال خرچ کرکے لاتا ہے۔ مال کا لفظ مائل سے لیا گیا ہے۔ یعنی جس کی طرف طبعًا توجہ اور رغبت کرتا ہے۔ عورت کی طرف بھی چونکہ طبعًا توجہ کرتا ہے، اس لیے اس کو مال میں داخل فرمایا ہے۔ مال کا لفظ اس لیے رکھا تاکہ عام محبُوبات پر حاوی نہ ہو؛ ورنہ اگر صرف نِساء کا لفظ ہوتا، تو اولاد اور عورت دو چیزیں قرار دی جاتیں۔ اور اگر محبُوبات کی تفصیل کی جاتی، تو پھر دس جزو میں بھی ختم نہ ہوتا۔ غرض مال سے مُراد کُلُّ مَا یَمِیْلُ اِلَیْہِ الْقَلْبُ ہے۔ اولاد کا ذکر اس لیے کیا کہ انسان اولاد کو جگر کا ٹکڑا اور اپنا وارث سمجھتا ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے محبُوبات میں ضد ہے۔ دونوں باتیں ایک جا جمع نہیں ہوسکتیں۔

بیوی سے حُسنِ سلوک

اس سے یہ مت سمجھو کہ پھر عورتیں ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو بہت ذلیل اور حقیر قرار دیا جاوے۔ نہیں نہیں۔ ہمارے ہادی کامل رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے، جس کا اپنے اہل کے ساتھ عمدہ سلوک ہو۔ بیوی کے ساتھ جس کا عمدہ چال چلن اور معاشرت اچھی نہیں۔ وہ نیک کہاں۔ دوسروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی تب کرسکتا ہے، جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا ہو۔ اور عمدہ معاشرت رکھتا ہو۔ نہ یہ کہ ہر ادنیٰ بات پر زدوکوب کرے۔ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک غصہ سے بھرا ہوا انسان بیوی سے ادنیٰ سی

بات پر ناراض ہو کر اس کو مارتا ہے اور کسی نازک مقام پر چوٹ لگی ہے اور بیوی مرگئی ہے، اس لیے اُن کے واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (النساء : ۲۰) ہاں اگر وہ بے جا کام کرے، تو تنبیہہ ضروری چیز ہے۔

انسان کو چاہیے کہ عورتوں کے دل میں یہ بات جمادے کہ وہ کوئی ایسا کام جو دین کے خلاف ہو کبھی بھی پسند نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی وہ ایسا جابر اور ستم شعار نہیں کہ اس کی کسی غلطی پر بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

خاوند عورت کے لیے اللہ تعالیٰ کا مظہر ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا، تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ پس مرد میں جلالی اور جمالی رنگ دونوں موجود ہونے چاہئیں۔ اگر خاوند عورت کو کہے کہ تُو اینٹوں کا ڈھیر ایک جگہ سے اُٹھا کر دُوسری جگہ رکھ دے۔ تو اس کا حق نہیں ہے کہ اعتراض کرے۔

مُرشد اور مرید کا تعلق

ایسا ہی قرآن کریم اور حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ مرشد کے ساتھ مُرید کا تعلق ایسا ہونا چاہیے۔ جیسا عورت کا تعلق مرد سے ہو۔ مُرشد کے کسی حکم کا انکار نہ کرے اور اُس کی دلیل نہ پوچھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ : ۶، ۷) فرمایا ہے کہ منعم علیہ کی راہ کے مقید رہیں۔ انسان چونکہ طبعاً آزادی کو چاہتا ہے پس حکم کر دیا کہ اس راہ کو اختیار کرے۔ تجربہ کار ڈاکٹر اگر غلطی بھی کرے، تو جاہل کے علاج سے بہتر ہے۔

ایک جاہل کے پاس اگر اعلیٰ درجہ کے تیز اَوزار ہیں، لیکن ہاتھ حاذق ڈاکٹر کا نہ ہو تو وُہ اَوزار کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے ؎

اگر دستِ سلیمانی نہ باشد
چہ خاصیت دہد نقشِ سلیماں

پس قرآن کریم ایک تیز ہتھیار ہے، لیکن اس کے استعمال کے لیے اعلیٰ درجہ کے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی تائیدات سے فیض یافتہ ہو۔

یہ ضروری بات ہے کہ دل پاک ہو، لیکن ہر جگہ یہ دولت میسر نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو پیدا کیا، مگر ہر شخص نبی نہیں ہوتا اور وہ تعداد کم ہے۔

آدم کہلانے کی حقیقت

آدم ہی ایک ہے جو نُطفہ کے بغیر پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح میرا یہ الہام ہے۔ اَرَدْتُ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ۔

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس کو کسی کی بیعت اور مُریدی کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ جیسے آدم کو خدا نے اپنے

جمالی اور جلالی ہاتھ سے پیدا کیا ہے۔ یہ خلیفۃ اللہ بھی اسی کے ہاتھ کا تربیت یافتہ اور اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان سلسلوں سے الگ رکھا جو منہاج نبوت کے خلاف ہیں۔ اب جبکہ یہ حال ہے کہ دل کی پاکیزگی کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور یہ حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک منہاج نبوت پر آتے ہوتے پاک انسان کی صحبت میں نہ بیٹھے۔ اس کی صحبت کی توفیق نہیں مل سکتی جب تک اوّلاً انسان یہ یقین نہ کرے کہ وہ ایک مرنے والی ہستی ہے۔ یہی ایک بات ہے جو اس کو صادق کی صحبت کی توفیق عطا فرما دے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے لیے نیکی کا ارادہ کرتا ہے، تو اُس کے دل میں ایک واعظ پیدا کر دیتا ہے۔ سب سے بڑھ کر واعظ یہ ہے کہ وہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ: ۱۱۹) کی حقیقت کو سمجھ لے۔

صحابہ کرامؓ کا رنگ پیدا کریں

صحابہ کرامؓ کی حالت کو دیکھو کہ اُنھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ جو کچھ اُنھوں نے کیا۔ اسی طرح پر ہماری جماعت کو لازم ہے کہ وہی رنگ اپنے اندر پیدا کریں۔ بدُوں اس کے وہ اس اصلی مطلب کو جس کے لیے میں بھیجا گیا ہوں۔ پا نہیں سکتے۔ کیا ہماری جماعت کو زیادہ حاجتیں اور ضرورتیں لگی ہوئی ہیں جو صحابہؓ کو نہ تھیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وُہ رسُول اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے اور آپؐ کی باتیں سُننے کے واسطے کیسے حریص تھے اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو جو مسیح موعودؑ کے ساتھ ہے یہ درجہ عطا فرمایا ہے کہ وُہ صحابہؓ کی جماعت سے ملنے والی ہے۔ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعة: ۴) مفسّروں نے مان لیا ہے کہ یہ مسیح موعودؑ والی جماعت ہے۔ اور یہ گویا صحابہؓ کی ہی جماعت ہوگی اور وہ مسیح موعودؑ کے ساتھ نہیں۔ درحقیقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی ہیں، کیونکہ مسیح موعودؑ آپؐ ہی کے ایک جمال میں آئے گا اور تکمیلِ تبلیغ اشاعت کے کام کے لیے وہ مامُور ہوگا۔ اس لیے ہمیشہ دل غم میں ڈُوبتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو بھی صحابہؓ کے انعامات سے بہرہ ور کرے۔ ان میں وُہ صدق و وفا، وُہ اخلاص اور اطاعت پیدا ہو۔ جو صحابہؓ میں تھی۔ یہ خدا کے سوا کسی سے ڈرنے والے نہ ہوں۔ متقی ہوں، کیونکہ خدا کی محبت متقی کے ساتھ ہوتی ہے اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ[1] (البقرہ: ۱۹۵)

۲۶ر دسمبر ۱۹۰۰ء

ایمان بالغیب

نواب عماد الملک فتح نواز جنگ سید مہدی حسین صاحب بار ایٹ لا، جو کہ علیگڈھ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ بڑے شوق اور اخلاص سے حضرت اقدسؑ کی خدمت

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۴۶ صفحہ ۱-۳ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۰ء

میں حاضر ہوئے۔ حضورؑ نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی :

" ہر ایک قدم جو صدق اور تلاشِ حق کے لیے اٹھایا جاوے، اس کے لیے بہت بڑا ثواب اور اجر ملتا ہے، مگر عالمِ ثواب مخفی عالم ہے جس کو دُنیا دار کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔

بات یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ باوجود آشکارا ہونے کے مخفی اور نہاں در نہاں ہے اور اس لیے الغیب بھی اس کا نام ہے۔ اسی طرح پر ایمان بالغیب بھی ایک چیز ہے جو گو مخفی ہوتا ہے، مگر عامل کی عملی حالت سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ایمان بالغیب بہت کمزور حالت میں ہے۔ اگر خدا پر ایمان ہو، تو پھر کیا وجہ ہے کہ لوگوں میں وہ صدق وحق کی تلاش اور پیاس نہیں پائی جاتی جو ایمان کا خاصہ ہے۔

ایمان کی قوّت

خدا کی راہ میں سختی کا برداشت کرنا مصائب اور مشکلات کے جھیلنے کے لیے ہمہ تن تیار ہو جانا ایمانی تحریک ہی سے ہوتا ہے۔ ایمان ایک قوت ہے جو سچی شجاعت اور ہمت انسان کو عطا کرتا ہے۔ اس کا نمونہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ جب وُہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ہوئے، تو وُہ کونسی بات تھی کہ اس طرح پر ایک بیکس ناتواں انسان کے ساتھ ہو جانے سے ہم کو کوئی ثواب ملے گا۔ ظاہری آنکھ تو اِس کے سوا کچھ نہ دکھاتی تھی کہ اس ایک کے ساتھ ہونے سے ساری قوموں کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔ جس کا نتیجہ صریح یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصائب اور مشکلات کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑے گا اور وُہ چکنا چُور کر ڈالے گا، اسی طرح پر ہم ضائع ہو جائیں گے، مگر کوئی اور آنکھ بھی تھی جس نے اِن مصائب اور مشکلات کو ہیچ سمجھا تھا اور اس راہ میں مَر جانا اس کی نگاہ میں ایک راحت اور سرور کا موجب تھا۔ اُس نے وُہ کچھ دیکھا تھا جو ان ظاہر بین آنکھوں کے نظارہ سے نہاں در نہاں اور بہت ہی دُور تھا۔ وہ ایمانی آنکھ تھی اور ایمانی قوت تھی جو ان ساری تکلیفوں اور دُکھوں کو بالکل ہیچ دکھاتی تھی۔ آخر ایمان ہی غالب آیا اور ایمان نے وہ کرشمہ دکھایا کہ جس پر ہنستے تھے۔ جس کو ناتواں اور بیکس کہتے تھے۔ اس نے اس ایمان کے ذریعہ اُن کو کہاں پہنچا دیا۔ وہ ثواب اور اُجر جو پہلے مخفی تھا، پھر ایسا آشکارا ہوا کہ اس کو دُنیا نے دیکھا اور محسوس کیا کہ ہاں یہ اسی کا مزہ ہے۔ ایمان کی بدولت وُہ جماعت صحابہؓ کی نہ تھکی اور نہ ماندہ ہوئی۔ بلکہ قوتِ ایمانی کی تحریک سے بڑے بڑے عظیم الشان کام کر دکھائے۔ اور پھر بھی کہا تو یہی کہا کہ جو حق کرنے کا تھا، نہیں کیا۔ ایمان نے اُن کو وہ قوت عطا کی کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سر کا دینا اور جانوں کا قربان کر دینا ایک ادنیٰ سی بات تھی اور اہل اسلام میں جبکہ ابھی کوئی بیّن نتائج نظر نہ آتے تھے۔ دیکھو! کس قدر مسلمانوں نے دشمنوں کے ہاتھوں سے کیسی کیسی تکلیفیں اور مصیبتیں محض لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے کے بدلے برداشت کیں۔ ایک وُہ زمانہ تھا کہ سر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی اور یا ایک یہ زمانہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مخالف اس قسم کی اذیتیں نہیں دیتے۔ ایک عادل گورنمنٹ کے سائے میں رہتے ہیں سلطنت

کسی قسم کا تعرّض نہیں کرتی۔ علومِ دین حاصل کرنے کے پورے سامان میسّر ہیں۔ ارکانِ مذہبی ادا کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ایک سجدہ کا کرنا بارِگراں معلوم ہوتا ہے۔ غور تو کرو، کہاں سر اور کہاں صرف ایک سجدہ! اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آج ایمان کیسا انحطاط کی حالت میں ہے۔

وضُو اور نماز

اور پھر ایسی حالت میں کہ نماز کا پڑھنا اور وضُو کا کرنا طبّی فوائد بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ اگر کوئی ہر روز مُنہ نہ دھوئے تو آنکھ آجاتی ہے اور یہ نزُول الما کا مقدّمہ ہے اور بہت سی بیماریاں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بتلاؤ کہ وُضو کرتے ہوئے کیوں موت آتی ہے۔ بظاہر کیسی عمدہ بات ہے۔ مُنہ میں پانی ڈال کر کلّی کرنا ہوتا ہے۔ مسواک کرنے سے مُنہ کی بدبُو دُور ہوتی ہے۔ دانت مضبوط ہو جاتے اور دانتوں کی مضبوطی غذا کے عمدہ طور پر چبانے اور جلد ہضم ہو جانے کا باعث ہوتی ہے۔ پھر ناک صاف کرنا ہوتا ہے۔ ناک میں کوئی بدبُو داخل ہو، تو دماغ کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ اب بتلاؤ کہ اس میں برائی کیا ہے۔ اس کے بعد وُہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی حاجات لے جاتا ہے اور اس کو اپنے مطالب عرض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دُعا کرنے کے لیے فرصت ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ نماز میں ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے؛ اگرچہ بعض نمازیں تو پندرہ منٹ سے بھی کم میں ادا ہو جاتی ہیں۔ پھر بڑی حیرانی کی بات ہے کہ نماز کے وقت کو تضیعِ اوقات سمجھا جاتا ہے۔ جس میں اِس قدر بھلائیاں اور فائدے ہیں اور اگر سارا دن اور ساری رات لغو اور فضُول باتوں یا کھیل اور تماشوں میں ضائع کر دیں تو اس کا نام مصرُوفیت رکھا جاتا ہے۔ اگر قوی ایمان ہوتا، قوی تو ایک طرف اگر ایمان ہی ہوتا، تو یہ حالت کیوں ہوتی اور یہاں تک نوبت کیوں پہنچتی۔

ناصح سے تنفّر

باوجود اس کے کہ اس قدر ایمانی حالت گر گئی ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی اس کمزوری کو محسوس کر کے اس کا علاج کرنا چاہے اور وہ راہ بتائے جس پر چل کر انسان خدا سے ایک قوّت اور شجاعت پاتا ہے، تو اس کو کافر اور دجّال کہا جاتا ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ایمان کا ایک نتیجہ یقین نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم فرض ہی کر لیں۔ فرض پر بھی تو بڑے بڑے نتائج مرتّب ہو جاتے ہیں۔ دیکھو۔ اقلیدس کا سارا مدار فرض ہی پر ہے، اس سے بھی کس قدر فوائد پہنچتے ہیں۔ بڑے بڑے علُوم کی بناء اوّلاً فرض پر ہی ہوتی ہے پس اگر ایمان کو بھی فرض کر کے ہی اختیار کر لیتے۔ تب بھی یقین ہے کہ وہ خالی ہاتھ نہ رہتے، مگر یہاں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ سرے ہی سے اس کو ایک بے معنی شئے سمجھتے ہیں۔

صحابہؓ کا ایمان

مَیں پھر صحابہؓ کی حالت کو نظیر کے طور پر پیش کر کے کہتا ہوں کہ اُنھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لا کر اپنی عملی حالت میں دکھایا کہ وہ خدا جو غیب الغیب ہستی ہے اور جو باطل پرست مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ اور نہاں ہے۔ اُنھوں نے اپنی آنکھ سے ہاں آنکھ سے

ہاں آنکھ سے دیکھ لیا ہے ؛ ورنہ بتاؤ تو سہی کہ وہ کیا بات تھی ، جس نے ان کو ذرا بھی پرُوا نہیں ہونے دی کہ قوم چھوڑی ، مُلک چھوڑا ، جائیدادیں چھوڑیں ۔ احباب اور رشتہ داروں سے قطع تعلق کیا ۔ وہ صرف خدا ہی پر بھروسہ تھا ۔ اور ایک خدا پر بھروسہ کرکے اُنھوں نے وُہ کرکے دکھایا کہ اگر تاریخ کی وَرق گردانی کریں ، تو انسان حیرت اور تعجب سے بھر جاتا ہے ۔ ایمان تھا اور صرف ایمان تھا ۔ اور کچھ نہ تھا ؛ ورنہ بالمقابل دُنیاداروں کے منصوبے اور تدابیر اور پوری کوششیں اور سرگرمیاں تھیں پر وُہ کامیاب نہ ہوسکے ۔ ان کی تعداد ، جماعت ، دولت سب کچھ زیادہ تھا ، مگر ایمان نہ تھا اور صرف ایمان ہی کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہلاک ہوئے اور کامیابی کی صورت نہ دیکھ سکے ۔ مگر صحابہؓ نے ایمانی قوت سے سب کو جیت لیا ۔ اُنھوں نے جب ایک شخص کی آواز سُنی جس نے باوصفیکہ اُمّی ہونے کی حالت میں پرورشس پائی تھی ، مگر اپنے صدق اور امانت اور راستبازی میں شہرت یافتہ تھا جب اُس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوں ۔ یہ سُنتے ہی ساتھ ہوگئے اور پھر دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے چلے ۔ میں پھر کہتا ہوں کہ وہ صرف ایک ہی بات تھی ، جس نے اُن کی یہ حالت بنادی اور وہ ایمان تھا ۔ یاد رکھو ! خدا پر ایمان بڑی چیز ہے ۔

خدا تعالیٰ کی ہستی

انگریزی اور مغربی قومیں دُنیا کی تلاش اور خواہش میں لگی ہوئی ہیں ۔ ابتدا میں ایک موہوم اور خیالی امید پر کام شروع کرتے ہیں ۔ سینکڑوں جانیں ضائع ہوتی ہیں ۔ ہزاروں لاکھوں روپے برباد ہوتے ہیں ۔ آخر ایک بات پا ہی لیتے ہیں ۔ پھر کس قدر افسوس اور تعجب اُن پر ہے ، جو کہتے ہیں ۔ خدا نہیں مل سکتا ۔ کس نے مجاہدہ اور سعی کی اور پھر خدا کو نہیں پایا ؟ خدا تو ملتا ہے اور بہت جلد ملتا ہے ۔ لیکن اُس کے پانے والے کہاں ؟ ؟ ؟

اگر کوئی یہ شُبہ پیش کرے کہ خدا نہیں ہے ، تو یہ بڑی بیہودہ بات ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی نادانی اور بیوقوفی نہیں ہے ، جو خدا کا انکار کیا جاوے ۔ دنیا میں دو گواہوں کے کہنے سے عدالت ڈگری دے دیتی ہے ۔ چند گواہوں کے بیان پر جان جیسی عزیز چیز کے خلاف عدالت فتویٰ دے دیتی ہے اور پھانسی پر لٹکا دیتی ہے ۔ حالانکہ شہادتوں میں جعل اور سازش کا اندیشہ ہی نہیں یقین ہوتا ہے ۔ لیکن خدا کے متعلق ہزاروں لاکھوں انسانوں نے جو اپنی قوم اور مُلک میں مسلّم راستباز نیک چلن تھے ۔ شہادت دی ہو ، اسے کافی نہ سمجھا جاوے ۔ اس سے بڑھ کر حماقت اور ہٹ دھرمی کیا ہوگی کہ لاکھوں مقدّسوں کی شہادت موجود ہے اور پھر اُنھوں نے اپنی عملی حالت سے بتا دیا ہے اور خونِ دل سے یہ شہادت لکھ دی ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے ۔ اس پر بھی اگر کوئی اِنکار کرتا ہے ، تو وُہ بیوقوف ہے اور پھر عجیب تو یہ بات ہے کہ کسی معاملہ میں رائے دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا علم ہو ۔ جس شخص کو علم ہی نہیں ، وہ رائے دینے کا کوئی حق نہیں رکھتا ۔ رائے زنی کرے تو کیا وہ احمق اور بیوقوف نہ کہلائے گا ضرور کہلائے گا ، بلکہ دُوسرے دانشمند اس کو شرمندہ کریں گے کہ احمق جبکہ تجھے واقفیت ہی نہیں ، تو

پھر تُو رائے کس طرح دیتا ہے۔ اس طرح پر جو خدا کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ نہیں ہے۔ ان کا کیا حق ہے کہ وہ رائے دیں جبکہ الٰہیات کا علم ہی ان کو نہیں ہے اور انھوں نے کبھی مجاہدہ ہی نہیں کیا ہے۔

ہاں اُن کو یہ کہنے کا حق ہو سکتا تھا۔ اگر وہ ایک خدا پرست کے کہنے کے موافق تلاشِ حق میں قدم اٹھاتے اور خدا کو ڈھونڈتے۔ پھر اگر ان کو خدا نہ ملتا تو بے شک کہہ دیتے کہ خدا نہیں ہے لیکن جب کہ انہوں نے کوئی کوشش اور مجاہدہ نہیں کیا ہے، تو ان کو انکار کرنے کا حق نہیں ہے۔ غرض خدا کا وجود ہے اور وہ ایک ایسی شئے ہے کہ جس قدر اس پر ایمان بڑھتا جاوے۔ اسی قدر قوّت ملتی جاتی ہے اور وُہ نہاں در نہاں ہستی نظر آنے لگتی ہے یہاں تک کہ کُھلے کُھلے طور پر اس کو دیکھ لیتا ہے اور پھر یہ قوّت دن بدن زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہی ایک بات ہے جس کی تلاش دنیا کو ہونی چاہیے۔ مگر آج یہ قوتیں دُنیا میں نہیں رہی ہیں۔

اسلام کی ترقی یورپ کی اتباع میں نہیں

اسلام جو یہ ایمانی قوت لے کر آیا تھا، بہت ضعیف ہو گیا ہے اور عام طور پر مسلمانوں نے محسوس کر لیا ہے کہ وہ کمزور ہیں؛ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آئے دن جلسے اور مجلسیں ہوتی رہتی ہیں اور نت نئی انجمنیں بنتی جاتی ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وُہ اسلام کی حمایت اور امداد کے لیے کام کرتی ہیں مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ان مجلسوں میں قوم قوم تو پکارتے ہیں۔ قومی ترقی قومی ترقی کے گیت تو گاتے ہیں، لیکن کوئی مجھ کو یہ بتائے کہ کیا پہلے زمانے میں جب قوم بنی تھی۔ وُہ یُورپ کے اتباع سے بنی تھی؟ کیا مغربی قوموں کے نقشِ قدم پر چل کر اُنھوں نے ساری ترقیاں کی تھیں۔ اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ ہاں اسی طرح ترقی کی تھی۔ تو بیشک گناہ ہوگا اگر ہم اہلِ یُورپ کے نقشِ قدم پر نہ چلیں۔

لیکن اگر ثابت نہ ہو اور ہرگز ثابت نہ ہوگا۔ پھر کس قدر ظلم ہے کہ اسلام کے اصُولوں کو چھوڑ کر، قرآن کو چھوڑ کر جس نے ایک وحشی دُنیا کو انسان اور انسان سے باخدا انسان بنایا۔ ایک دنیا پرست قوم کی پیروی کی جائے۔ جو لوگ اسلام کی بہتری اور زندگی مغربی دنیا کو قبلہ بنا کر چاہتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو قرآن کریم کے ماتحت چلتے ہیں۔

قرآن کو چھوڑ کر کامیابی ایک ناممکن اور محال امر ہے اور ایسی کامیابی ایک خیالی امر ہے، جس کی تلاش میں یہ لوگ لگے ہوئے ہیں۔ صحابہ کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھو۔ دیکھو انھوں نے جب پیغمبرِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی کی اور دین کو دُنیا پر مقدّم کیا۔ تو وہ سب وعدے جو اللہ تعالیٰ نے اُن سے کئے تھے۔ پُورے ہو گئے۔ ابتدا میں مخالف ہنسی کرتے تھے کہ باہر آزادی سے نکل نہیں سکتے۔ اور بادشاہی کے دعوے کرتے ہیں۔ لیکن رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں گُم ہو کر وہ پایا جو صدیوں سے ان کے حِصّے میں نہ آیا تھا۔ وُہ

قرآن کریم اور رسُول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبت کرتے ۔ اور اُن ہی کی اطاعت اور پیروی میں دن رات کوشاں تھے۔ اُن لوگوں کی پیروی کسی رسم و رواج تک میں بھی نہ کرتے تھے، جن کو کفار کہتے تھے۔ جبتک اسلام اس حالت میں رہا وہ زمانہ اقبال اور عروج کا رہا۔ اس میں سِتر یہ تھا۔ ع

خدا داری چہ غم داری

مُسلمانوں کی فتوحات اور کامیابیوں کی کلید بھی ایمان تھا۔ صلاح الدین کے مقابلہ پر کس قدر ہجوم ہوا تھا۔ لیکن آخر اس پر کوئی قابُو نہ پا سکا۔ اس کی نیّت اسلام کی خدمت تھی۔ غرض ایک مدت تک ایسا ہی رہا۔ جب بادشاہوں نے فسق و فجور اختیار کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا غضب ٹوٹ پڑا اور رفتہ رفتہ ایسا زوال آیا جس کو اب تم دیکھ رہے ہو۔ اب اس مرض کی جو تشخیص کی جاتی ہے، ہم اس کے مخالف ہیں۔ ہمارے نزدیک اس تشخیص پر جو علاج کیا جاوے گا، وہ زیادہ خطرناک اور مُضر ثابت ہوگا۔ جبتک مُسلمانوں کا رجُوع قرآن شریف کی طرف نہ ہوگا، اُن میں وہ ایمان پیدا نہ ہوگا۔ یہ تندرُست نہ ہوں گے۔ عزّت اور عروج اُسی راہ سے آئے گا جس راہ سے پہلے آیا۔

دین کو دُنیا پر مقدم رکھیں

میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مُسلمان سُست ہو جاویں۔ اسلام کسی کو سُست نہیں بناتا۔ اپنی تجارتوں اور ملازمتوں میں بھی مصروف ہوں، مگر میں یہ نہیں پسند کرتا کہ خدا کے لیے ان کا کوئی وقت بھی خالی نہ ہو۔ ہاں تجارت کے وقت پر تجارت کریں اور اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت کو اُس وقت بھی مدِّنظر رکھیں تاکہ وہ تجارت بھی ان کی عبادت کا رنگ اختیار کرلے۔ نمازوں کے وقت پر نمازوں کو نہ چھوڑیں۔ ہر معاملہ میں کوئی ہو دین کو مقدّم کریں۔ دُنیا مقصُود بالذّات نہ ہو۔ اصل مقصود دین ہو۔ پھر دُنیا کے کام بھی دین ہی کے ہوں گے۔ صحابہ کرامؓ کو دیکھو کہ اُنھوں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی خدا کو نہیں چھوڑا۔ لڑائی اور تلوار کا وقت ایسا خطرناک ہوتا ہے کہ محض اس کے تصوّر سے ہی انسان گھبرا اٹھتا ہے۔ وہ وقت جبکہ جوش اور غضب کا وقت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں بھی وہ خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ نمازوں کو نہیں چھوڑا۔ دُعاؤں سے کام لیا۔ اب یہ بدقسمتی ہے کہ یُوں تو ہر طرح سے زور لگاتے ہیں۔ بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں۔ جلسے کرتے ہیں کہ مُسلمان ترقی کریں۔ مگر خدا سے ایسے غافل ہوتے ہیں کہ بھول کر بھی اس کی طرف توجّہ نہیں کرتے۔ پھر ایسی حالت میں کیا اُمید ہوسکتی ہے کہ ان کی کوششیں نتیجہ خیز ہوں جبکہ وہ سب کی سب دُنیا ہی کے لیے ہیں۔ یاد رکھو جب تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ دل و جگر میں سرایت نہ کرے اور وجود کے ذرّہ ذرّہ پر اسلام کی روشنی اور حکومت نہ ہو کبھی ترقی نہ ہوگی۔ اگر تم مغربی قوموں کا نمونہ پیش کرو کہ وہ ترقیاں کر رہے ہیں۔ اُن کے لیے اور معاملہ ہے۔ تم کو کتاب دی گئی ہے۔ تم پر حجت پوری ہو چکی ہے۔ اُن کے لیے الگ معاملہ اور مؤاخذہ کا دن ہے۔ تم اگر کتاب اللہ کو چھوڑ دو گے، تو

تمھارے لیے اسی دُنیا میں جہنّم موجود ہے۔

ایسی حالت میں قریبًا ہر شہر میں مُسلمانوں کی بہتری کے لیے انجمنیں اور کانفرنسیں ہوتی ہیں، لیکن کسی ہمدردِ اسلام کے مُنہ سے یہ نہیں نکلتا کہ قرآن کو اپنا امام بناؤ۔ اس پر عمل کرو۔ اگر کہتے ہیں تو بس یہی کہ انگریزی پڑھو، کالج بناؤ، بیرسٹر بنو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پر ایمان نہیں رہا۔ حاذق طبیب بھی دس دن کے بعد اگر دوا فائدہ نہ کرے تو اپنے علاج سے رجُوع کر لیتے ہیں۔ یہاں ناکامی پر ناکامی ہوتی جاتی ہے اور اس سے رجُوع نہیں کرتے۔ اگر خدا نہیں ہے تو اس کو چھوڑ کر بے شک ترقی کریں گے۔ لیکن جبکہ خدا ہے اور ضرور ہے۔ پھر اس کو چھوڑ کر کبھی ترقی نہیں کر سکتے اس کی بے عزّتی کرکے اس کی کتاب کی بے اَدبی کرکے چاہتے ہیں کہ کامیاب ہوں اور قوم بن جاوے کبھی نہیں۔

ہماری رائے تو یہی ہے جس کو آنکھیں دیکھتی ہیں۔ ترقی کی ایک ہی راہ ہے کہ خدا کو پہچانیں اور اس پر زندہ ایمان پیدا کریں۔ اگر ہم ان باتوں کو ان دُنیا پرستوں کی مجلس میں بیان کریں، تو وُہ ہنسی میں اڑا دیں۔ مگر ہم کو رحم آتا ہے کہ افسوس یہ لوگ اُس کو نہیں دیکھ سکتے جو ہم دیکھتے ہیں۔ آپ کو چونکہ خدا تعالیٰ نے موقعہ دیا ہے کہ اس قدر دُور دراز کا سفر اختیار کرکے اور راستہ کی تکلیف اُٹھا کر آئے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں اگر ایمانی قوّت کی تحریک نہ ہوتی تو اس قدر تکلیف برداشت نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے اور اس قوّت کو ترقی دے تاکہ آپ کو وہ آنکھ عطا ہو کہ آپ اس روشنی اور نُور کو دیکھ سکیں جو اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دُنیا پر نازل کیا ہے۔

بعض اوقات انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ کہیں جاتا ہے اور پھر جلد چلا آتا ہے۔ مگر اس کے بعد اس کی رُوح میں دُوسرے وقت اضطراب ہوتا ہے کہ کیوں چلا آیا۔ ہمارے دوست آتے ہیں اور اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے جلد چلے جاتے ہیں، لیکن پیچھے ان کو حسرت ہوتی ہے کہ کیوں جلد واپس آئے۔

(یہاں مولوی سیّد مہدی حسین صاحب نے کہا کہ میرا بھی یقینًا یہی حال ہوگا۔ اگر مَیں نواب محسن الملک صاحب اور دُوسرے دوستوں کو تار نہ دے چکا ہوتا۔ تو مَیں اور ٹھہرتا)

بہرحال مَیں نہیں چاہتا کہ آپ تخلّفِ وعدہ کریں اور جبکہ اُن کو اطلاع دے چکے ہیں، تو ضرور جانا چاہیے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ آپ پھر آئیں گے۔ مَیں محض للہ اور نصیحتًا کہتا ہوں کہ آپ ایک دو ہفتہ تک کم از کم کسی دُوسرے موقعہ پر یہاں رہ جائیں تو آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ آپ وہ باتیں سُنیں گے۔ جن کے سُنانے کے لیے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس وقت کافر یہی رائے لگاتے تھے۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ۔ (صٓ : ۷) میاں یہ تو دوکانداری ہے۔ مخالف جس کو صحبت نصیب نہیں ہوتی۔ اس کو صحیح رائے نہیں ملتی اور دُور سے رائے لگانا صحیح نہیں، کیونکہ جب تک وہ پاس نہیں آتا اور حالات پر اطلاع نہیں پاتا، کیونکر صحیح رائے حاصل کر سکتا ہے۔

یہ سلسلہ منہاجِ نبوت پر قائم ہوا ہے

مَیں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو بنیاد اس وقت ایک سلسلہ آسمانی کی رکھی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ سلسلہ بالکل منہاجِ نبوت پر قائم ہوا ہے۔ اس کا پتہ اس طرز پر لگ سکتا ہے، جس طرح پر انبیاء علیہم السلام کے سلسلوں کی حقانیت معلوم ہوتی۔ اور وُہ راہ ہے صحبت میں صبر اور حُسن ظن سے رہنے کی۔ مخالفوں کو چونکہ اسباب نہیں ملتے اس لیے وہ صحیح رائے اور یقینی نتیجہ پر پہنچ نہیں سکتے۔ انسان جبتک ان طرح طرح کے خیالات اور راؤں کے پردوں کو چیر کر نہیں نکل آتا، اسکو سچی معرفت قوت اور مردانگی نہیں مِل سکتی۔ خوش قسمت وہی انسان ہے جو ایسے مردانِ خدا کے پاس رہ کر (جن کو اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر بھیجتا ہے) اس غرض اور مقصد کو حاصل کرے جس کے لیے وہ آتے ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ تھوڑے ہوتے ہیں، لیکن ہوتے ضرور ہیں۔ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سبا: ۱۴) اگر تھوڑے نہ ہوتے تو پھر بے قدری ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ سونا چاندی لوہے اور ٹین کی طرح عام نہیں ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ مخالف بھی ہوں کیونکہ سنّت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر شخص جو خدا کی طرف قدم اٹھاتا ہے، اس کے لیے امتحان ضروری رکھا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت: ۳) امتحان خدا کی عادت ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ عالم الغیب خدا کو امتحان کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اپنی سمجھ کی غلطی ہے اللہ تعالیٰ امتحان کا محتاج نہیں ہے۔ انسان خود محتاج ہے تاکہ اس کو اپنے حالات کی اطلاع ہو اور اپنے ایمان کی حقیقت کھلے۔ مخالفانہ رائے سُن کر اگر مغلوب ہو جاوے تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ قوت نہیں ہے۔ جس قدر علوم و فنون دُنیا میں ہیں بدوں امتحان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ خدا کا امتحان یہی ہے کہ انسان سمجھ جاوے کہ میری حالت کیسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماُمور من اللہ کے دشمن ضرور ہوتے ہیں جو ان کو تکلیفیں اور اذیتیں دیتے ہیں۔ توہین کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں سعید الفطرت اپنی روشن ضمیری سے اُن کی صداقت کو پا لیتے ہیں۔ پس ماُموروں کے مخالفوں کا وجود بھی اس لیے ضروری ہے۔ جیسے پھولوں کے ساتھ کانٹے کا وجود ہے۔ تریاق بھی ہیں، تو زہریں بھی ہیں۔ کوئی ہم کو کسی نبی کے زمانہ کا پتہ دے۔ جس کے مخالف نہ ہوتے ہوں اور جنھوں نے اُس کو دوکاندار، ٹھگ، جھوٹا مُفتری نہ کہا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام پر بھی افترا کر دیا۔ یہانتک کہ ایک پلید نے تو زنا کا اتہام لگا دیا اور ایک عورت کو پیش کر دیا۔ غرض اُن پر ہر قسم کے افترا کیے جاتے ہیں تا لوگ آزمائے جاویں۔ (اور یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ خدا کے لگائے ہوئے پودے ان نابکاروں کی پھُونکوں سے معدوم کیے جاویں) یہی ایک نشان اور تمیز ہوتی ہے اُن کے خدا کی طرف سے ہونے کی کہ مخالف کوشش کرتے ہیں کہ وُہ نابُود ہو جاویں اور وہ بڑھتے اور پھولتے ہیں۔ ہاں جو خدا کی طرف سے نہ ہو۔ وہ آخر معدُوم اور نیست و نابُود ہو جاتا ہے۔ لیکن جس کو خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے، وہ کسی کی کوشش سے نابُود نہیں ہو سکتا۔ وہ کاٹنا چاہتے ہیں اور یہ بڑھتا ہے۔ اس سے صاف

معلوم ہوسکتا ہے کہ خدا کا ہاتھ ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر عظیم الشان معجزہ ہے کہ ہر طرف سے مخالفت ہوتی تھی، مگر آپؐ ہر میدان میں کامیاب ہی ہوتے تھے۔ صحابہؓ کے لیے یہ کیسی دل خوش کرنے والی دلیل تھی، جب وہ اس نظارے کو دیکھتے تھے۔

اسلام کیا ہے؟ بہت سی جانوں کا چندہ ہے۔ ہمارے آباء و اجداد چندہ ہی ہیں آئے۔ اب اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ وہ اسلام کو کُل ملتوں پر غالب کرے۔ اُس نے مجھے اسی مطلب کے لیے بھیجا ہے اور اسی طرح بھیجا ہے، جس طرح پہلے مامور آتے رہے۔ پس آپ میری مخالفت میں بھی بہت سی باتیں سُنیں گے اور بہت قسم کے منصوبے پائیں گے، لیکن مَیں آپ کو نصیحتاً للہ کہتا ہوں کہ آپ سوچیں اور غور کریں کہ یہ مخالفتیں مجھے تھکا سکتی ہیں۔ یا اُن کا کچھ بھی اثر مجھ پر ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ خدا تعالیٰ کا پوشیدہ ہاتھ ہے جو میرے ساتھ کام کرتا ہے؛ ورنہ مَیں کیا اور میری ہستی کیا؟ مجھے شہرت طلب کہا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس فرض کے ادا کرنے میں مجھے کس قدر گالیاں سُننی پڑی ہیں۔ مگر ان گالیوں کو جو دیتے ہیں اور اُن تکلیفوں کو جو پہنچاتے ہیں۔ ایک لحظہ کے لیے بھی پرواہ یا خیال نہیں کرتا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہوتا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے اور اگر مَیں خدا کی طرف سے آیا نہ ہوتا۔ تو میری یہ مخالفت بھی ہرگز نہ ہوتی۔ آپ کا اس قدر دُور دراز کا سفر اختیار کر کے پھر تکالیفِ راہ برداشت کر کے آنا اللہ تعالیٰ کے حضور ایک اجر رکھتا ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور توفیق دے کہ آپ اس سلسلہ کی طرف توجہ کر سکیں جو خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ آمین۔"[1]

۲۸؍دسمبر ۱۹۰۰ء

سعید اور شقی

بعد نمازِ جمعہ عام مجمع میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مفصلہ ذیل تقریر فرمائی:

"دیکھو، مَیں محض للہ مختصر طور پر چند باتیں سناتا ہوں۔ میری طبیعت اچھی نہیں اور زیادہ باتوں کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے نیک اور پاک فطرت عطا فرمائی ہے اور جن کی استعدادیں عمدہ ہیں۔ وہ بہت باتوں کے محتاج نہیں ہوتے اور ایک اشارہ ہی سے اصل مقصد اور مطلب کو سمجھ لیتے اور بات کو پا لیتے ہیں۔ ہاں جو لوگ اچھی فطرت اور عمدہ استعداد نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور قدرت پر اعتقاد نہیں ہے، وہ تو اپنی اغراض کی پیروی کرتے ہیں۔ وُہ ایسی پستی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں کہ اگر سب انبیاء علیہم السلام اکٹھے ہو کر ایک ہی وعظ

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴ صفحہ ۲-۶ مورخہ ۳۱؍جنوری ۱۹۰۱ء

کے منبر پر چڑھ کر نصیحت کریں، انھیں تب بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

یہی وہ سِتر ہے کہ ہر نبی اور مامُور کے وقت دو فرقے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا نام سعید رکھا ہے اور دُوسرا وُہ جو شقی کہلاتا ہے۔ دونوں فرقے وعظ و نصیحت کے لحاظ سے یکساں طور پر انبیاء علیہم السّلام کے سامنے تھے اور اس پاک گروہ نے کبھی کسی سے بُخل نہیں کیا۔ پورے طور پر حقِ نصیحت ادا کیا۔ جیسے سعیدوں کے لیے ویسے اشقیاء کے لیے۔ مگر سعید قوم کان رکھتی تھی جس سے اس نے سُنا۔ آنکھیں رکھتی تھی جس سے دیکھا۔ دل رکھتی تھی جس سے سمجھا۔ مگر اشقیاء کا گروہ ایک ایسی قوم تھی جس کے کان نہ تھے جو سُنتی اور آنکھیں نہ تھیں، جس سے دیکھتی۔ نہ دل تھے جس سے سمجھتی اسی لیے وُہ محروم رہی۔

مکّہ کی مٹی ایک ہی تھی جس سے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوجہل پیدا ہوئے۔ مکّہ وہی مکّہ ہے جہاں اب کروڑوں انسان ہر طبقہ اور درجہ کے دُنیا کے ہر حصّہ سے جمع ہوتے ہیں۔ اسی سرزمین سے یہ دونوں انسان پیدا ہوئے۔ جن میں سے اوّل الذکر اپنی سعادت اور رُشد کی وجہ سے ہدایت پاکر صدیقوں کا کمال پا گیا اور دُوسرا شرارت، جہالت، بیجا عداوت اور حق کی مخالفت میں شہرت یافتہ ہے۔

یاد رکھو۔ کمال دو ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک رحمانی، دُوسرا شیطانی۔ رحمانی کمال کے آدمی آسمان پر ایک شہرت اور عزّت پاتے ہیں۔ اسی طرح شیطانی کمال کے آدمی شیاطین کی ذرّیت میں شہرت رکھتے ہیں۔

غرض ایک ہی جگہ دونوں تھے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ فرق نہیں کیا۔ جو کچھ حکم اللہ تعالیٰ نے دیا۔ وُہ سب کا سب یکساں طور پر سب کو پہنچا دیا۔ مگر بدنصیب بدقسمت محروم رہ گئے اور سعید ہدایت پاکر کامل ہو گئے۔ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے بیسیوں نشان دیکھے۔ انوار و برکاتِ الٰہیہ کو مشاہدہ کیا، مگر اُن کو کچھ بھی فائدہ نہ ہوا۔

اب ڈرنے کا مقام ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ابوجہل کو محروم رکھا۔ اس نے ایک عظیم الشان نبی کا زمانہ پایا جس کے لیے نبی ترستے گئے تھے۔ حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر آخر تک ہر ایک کی تمنا تھی، مگر انھیں وہ زمانہ نہ ملا۔ اس بدبخت نے وُہ زمانہ پایا۔ جو تمام زمانوں سے مُبارک تھا، مگر کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے اور خوف کا مقام ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والی آنکھ نہ ہو۔ اس کی سُننے والا کان نہ ہو اور اُس کے سمجھنے والا دل نہ ہو۔ کوئی شخص کسی نبی اور مامُور کی باتوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اصل یہی ہے کہ سرشت میں دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کے قویٰ عمدہ ہیں اور وہ سعادت اور رُشد کے پا جانے کے لیے استعدادوں سے یُوں بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جیسے ایک عطر کا شیشہ لبریز ہوتا ہے۔ تیل اور بتی سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ صرف ایک ذرا سی آگ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایک ادنیٰ سی تحریک اور رگڑ سے روشن ہو اٹھتی ہے۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ تھا جس کی فطرت میں سعادت کا تیل اور بتی پہلے سے موجود تھے۔ اس لیے رُسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم نے اس کو فی الفور متاثر کر کے روشن کر دیا۔ اُس نے آپؐ سے کوئی بحث نہیں کی۔ کوئی نشان اور معجزہ نہ مانگا۔ معاً سُن کر صرف اتنا ہی پُوچھا کہ کیا آپؐ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جب رُسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں۔ تو بول اُٹھے کہ آپؐ گواہ رہیں۔ مَیں سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں۔

حُسنِ ظن اور صبر

یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ سوال کرنے والے بہت کم ہدایت پاتے ہیں۔ ہاں حُسنِ ظن اور صبر سے کام لینے والے ہدایت سے پُورے طور پر حصہ لیتے ہیں۔ اس کا نمونہ ابوبکرؓ اور ابوجہل دونوں موجود ہیں۔ ابوبکرؓ نے جھگڑا نہ کیا اور نشان نہ مانگے، مگر اس کو وہ دیا گیا جو نشان مانگنے والوں کو نہ ملا۔ اس نے نشان پر نشان دیکھے اور خود ایک عظیم الشان نشان بنا۔ ابوجہل نے حجت کی اور مخالفت اور جہالت سے باز نہ آیا۔ اس نے نشان پر نشان دیکھے، مگر دیکھ نہ سکا۔ آخر خود دُوسروں کے لیے نشان ہو کر مخالفت ہی میں ہلاک ہوا۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ جس کی فطرت میں نُورِ ایمان ہے۔ انہیں زیادہ گوئی کی ضرورت نہیں۔ وُہ ایک ہی بات سے مطلب پر پہنچ جاتے ہیں۔ اُن کے دل میں ایک روشنی ہوتی ہے۔ وُہ معاً آواز کے سنتے ہی منوّر ہو جاتے ہیں اور وُہ الہٰی قوت جو اُن کے اندر ہوتی ہے، اس آواز کو سُن کر جوش میں آ جاتی ہے اور نشو و نما پاتی ہے۔ جن میں یہ قوت نہیں رہتی۔ وُہ محروم رہ کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہی طریق شروع سے چلا آیا ہے۔ اب ہر شخص کو خوف کرنا چاہیے کہ اگر کسی زمانہ میں اصلاح کے لیے مامُور پیدا ہوتا ہے تو جو لوگ اپنے اندر اس مامُور کے لیے قبولیت اور ایمان کا رنگ پاتے ہیں، وُہ مبارک ہیں۔ لیکن جو اپنے دل میں قبض پاتا ہے اور دل ماننے کی طرف رجُوع نہیں کرتا۔ اس کو ڈرنا چاہیے کہ یہ انجامِ بد کے آثار ہیں اور محرومی کے اسباب۔

یقیناً سمجھو۔ اور یہ ایک راز کی بات ہے کہ جو حق کے قرائن اور دلائل دیکھ کر نہیں مانتا اور حُسنِ ظن اور صبر سے کام نہیں لیتا اور تلاشِ رَدّ میں رہتا ہے۔ عمدہ سے عمدہ نشان اور قوی سے قوی دلائل اس کے پاس آتے ہیں مگر وُہ ان کو دیکھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ رد کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ تو اس کو ڈرنا چاہیے کہ یہ اشقیاء والی عادت ہے۔ امر بالمعرُوف اور نہی عن المنکر سے اس جماعت نے کبھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام سُنا اور مامور من اللہ کی آواز ان کے کان میں پہنچی۔ وہ مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور فکرِ معکوس اور بخل اور بے جا عداوت کی وجہ سے اس کی تردید کی فکر میں لگ گئے۔ پھر اسی پر بس نہیں کی۔ انسان چونکہ ترقی کرتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی۔ آخر بڑے بڑے مقابلوں اور ناپاک منصوبوں تک نوبت پہنچ کر ہلاکت کی گھڑی آ جاتی ہے۔

ایسا ہی حال پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا۔ ایک گروہ نے ایمان میں وہ ترقی کی کہ بکریوں کی

طرح خدا کے حکم پاکر ذبح ہو گئے اور کچھ پروا نہیں کی کہ بیوی بچوں کا کیا حال ہوگا۔ ان کو کچھ ایسی شراب محبت پلائی کہ لاپرواہ ہو کر جانیں دے دیں۔ یہ تصرف اس نظارہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح پر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔

بیعت کے مغز کو اختیار کرو

یہ مت خیال کرو کہ صرف بیعت کر لینے سے ہی خدا راضی ہو جاتا ہے۔ یہ تو صرف پوست ہے۔ مغز تو اس کے اندر ہے۔ اکثر قانونِ قدرت یہی ہے کہ ایک چھلکا ہوتا ہے اور مغز اس کے اندر ہوتا ہے۔ چھلکا کوئی کام کی چیز نہیں ہے۔ مغز ہی لیا جاتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں مغز رہتا ہی نہیں اور مرغی کے ہوائی انڈوں کی طرح جن میں نہ زردی ہوتی ہے نہ سفیدی جو کسی کام نہیں آسکتے اور ردّی کی طرح پھینک دیئے جاتے ہیں۔ ہاں ایک دو منٹ تک کسی بچے کے کھیل کا ذریعہ ہو تو ہو۔ اسی طرح پر وہ انسان جو بیعت اور ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اگر وہ ان دونوں باتوں کا مغز اپنے اندر نہیں رکھتا، تو اُسے ڈرنا چاہیے کہ ایک وقت آتا ہے کہ وُہ اُس ہوائی انڈے کی طرح ذرا سی چوٹ سے چکنا چور ہو کر پھینک دیا جائے گا۔

اسی طرح جو بیعت اور ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اس کو ٹٹولنا چاہیے کہ کیا میں چھلکا ہی ہوں یا مغز؟ جبتک مغز پیدا نہ ہو۔ ایمان، محبت، اطاعت، بیعت، اعتقاد، مریدی اور اسلام کا مدعی سچا مدعی نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ یہ سچی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور مغز کے سوا چھلکے کی کچھ بھی قیمت نہیں۔ خوب یاد رکھو کہ معلوم نہیں، موت کس وقت آجاوے، لیکن یہ یقینی امر ہے کہ موت مقدر ہے۔ پس نِرے دعویٰ پر ہرگز کفایت نہ کرو اور خوش نہ ہو جاؤ۔ وہ ہرگز ہرگز فائدہ رساں چیز نہیں۔ جبتک انسان اپنے آپ پر بہت سی موتیں وارد نہ کرے اور بہت سی تبدیلیوں اور انقلابات میں سے ہو کر نہ نکلے۔ وُہ انسانیت کے اصل مقصد کو نہیں پا سکتا۔

انسان کی حقیقت

انسان اصل میں اُنسان سے لیا گیا ہے یعنی جس میں دو حقیقی اُنس ہوں۔ ایک اللہ تعالیٰ سے اور دُوسرا بنی نوع کی ہمدردی سے۔ جب یہ دونوں اُنس اس میں پیدا ہو جاویں۔ اس وقت انسان کہلاتا ہے اور یہی وہ بات ہے جو انسان کا مغز کہلاتی ہے اور اسی مقام پر انسان اولوالالباب کہلاتا ہے۔ جبتک یہ نہیں کچھ بھی نہیں۔ ہزار دعویٰ کر دکھاؤ، مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک، اس کے نبی اور اس کے فرشتوں کے نزدیک ہیچ ہے۔

اسوۂ انبیاء علیہم السلام

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تمام انسان نمونہ کے محتاج ہیں اور وہ نمونہ انبیاء علیہم السلام کا وجود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ درختوں پر کلامِ الٰہی لکھا آتا، مگر اس نے جو پیغمبروں کو بھیجا اور ان کی معرفت کلامِ الٰہی نازل فرمایا۔ اس میں سِر یہ تھا کہ تا انسان جلوۂ الوہیت کو دیکھے، جو پیغمبروں میں ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔

پیغمبر الوہیت کے مظہر اور خدا نما ہوتے ہیں۔ پھر سچا مسلمان اور معتقد وہ ہوتا ہے۔ جو پیغمبروں کا مظہر بنے۔ صحابہ کرامؓ نے اس راز کو خوب سمجھ لیا تھا اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ایسے گم ہوتے اور کھوئے گئے کہ ان کے وجود میں اور کچھ باقی رہا ہی نہیں تھا۔ جو کوئی ان کو دیکھتا تھا اُن کو محویت کے عالم میں پاتا تھا پس یاد رکھو کہ اس زمانہ میں بھی جب تک وہ محویت اور وہ اطاعت میں گم شدگی پیدا نہ ہوگی جو صحابہ کرامؓ میں پیدا ہوئی تھی مُریدوں معتقدوں میں داخل ہونے کا دعویٰ تب ہی سچا اور بجا ہوگا۔ یہ بات اچھی طرح پر اپنے ذہن نشین کر لو کہ جب تک یہ نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم میں سکونت کرے اور خدا تعالیٰ کے آثار تم میں ظاہر ہوں۔ اس وقت تک شیطانی حکومت کا عمل و دخل موجود ہے۔

شیطان، جھوٹ، ظلم، جذبات، خون، طولِ اَمل، ریا اور تکبر کی طرف بلاتا ہے اور دعوت کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل اخلاقِ فاضلہ، صبر، محویت، فنافی اللہ، اخلاص، ایمان، فلاح یہ اللہ تعالیٰ کی دعوتیں ہیں۔ انسان ان دونوں تجاذب میں پڑا ہوا ہے۔ پھر جس کی فطرت نیک ہے اور سعادت کا مادہ اس میں رکھا ہوا ہے۔ وہ شیطان کی ہزاروں دعوتوں اور جذبات کے ہوتے ہوئے بھی اس فطرتِ رشید سعادت اور سلامت روی کے مادہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑتا ہے اور خدا ہی میں اپنی راحت تسلی اور اطمینان کو پاتا ہے۔

ایمان کے نشانات

مگر ہر چیز کے لیے نشان ضرور ہوتے ہیں۔ جتنک اُس میں وہ نشان نہ پائے جاویں، وہ معتبر نہیں ہو سکتی۔ دیکھو دواؤں کی طبیب شناخت کر لیتا ہے۔ بنفشہ، خیار شنبر تُربد میں اگر وہ صفات نہ پائے جائیں جو ایک بڑے تجربہ کے بعد ان میں متحقق ہوئے ہیں، تو طبیب ان کو ردّی کی طرح پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے نشانات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا بار بار اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ یہ سچی بات ہے کہ جب ایمان انسان کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی عظمت یعنی جلال تقدس کبریائی قدرت اور سب سے بڑھ کر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا حقیقی مفہوم داخل ہو جاتا ہے۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ اُس کے اندر سکونت اختیار کرتا ہے اور شیطانی زندگی پر ایک موت وارد ہو جاتی ہے اور گناہ کی فطرت مر جاتی ہے۔ اس وقت ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور وہ روحانی زندگی ہوتی ہے یا یہ کہو کہ آسمانی پیدائش کا پہلا دن وہ ہوتا ہے۔ جب شیطانی زندگی پر موت وارد ہوتی ہے اور روحانی زندگی کا تولّد ہوتا ہے، جیسے بچہ کا تولّد ہوتا ہے۔

اسلام کا کامل خدا

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفاتحہ میں اسی تولّد کی طرف ایما فرمایا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ (الفاتحہ ۲ تا ۴) یہ چاروں صفات اللہ تعالیٰ کی بیان کی گئی ہیں۔ یعنی وہ خدا جس میں تمام محامد پائے جاتے ہیں۔ کوئی خوبی

خیال اور سوچ میں نہیں آسکتی، جو اللہ تعالیٰ میں نہ پائی جاتی ہو بلکہ انسان کبھی بھی ان محامد اور خوبیوں کو جو اللہ کریم میں پائی جاتی ہیں، کبھی بھی شمار نہیں کر سکتا۔ جس خدا نے اسلام دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وہی کامل اور سچا خدا ہے اور اس لیے قرآن کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع فرمایا ہے۔ دُوسری قوموں اور کتابوں نے جس خدا کی طرف دُنیا کو دعوت کی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی عیب اپنے اندر رکھتا ہے۔ کسی کے ہاتھ نہیں، کسی کے کان نہیں، کوئی گونگا ہے کوئی کچھ۔ غرض کوئی نہ کوئی عیب اور روگ موجود ہے۔ مثلاً عیسائیوں نے جس کو خدا بنا رکھا ہے، سوچنے والا انسان سوچ سکتا ہے کہ اگر یہ ۱۹۰۰ برس کی مدت ان کے اس خیالی ڈھکوسلہ پر نہ گذر گئی ہوتی، تو کچھ بھی ان کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اب صرف ایک بیہودہ بات کی کہ ۱۹۰۰ برس سے یہ مذہب چلا آتا ہے۔ کوئی دلیل مسیح کی خدائی کی نہیں ہے۔ مسیح کو خدا بنانے والوں کو باوجود اس فلسفہ دانی کے شرم آجاتی۔ اگر سوچتے کہ کیا کبھی عورت کے پیٹ سے معمولی طور پر پیشاب کی راہ پیدا ہونے والا ضعیف وناتواں بچہ جو کھانے پینے کا محتاج۔ پاخانہ اور پیشاب کی حاجتوں کا پابند، تمام انسانی حوائج کا اسیر اور محتاج ہو خدا ہو سکتا ہے؟ صرف اتنی ہی بات ہے کہ پُرانی بات ہو کر اُنھوں نے قائم مقام دلیل کے بنالی ہے۔ جیسے ہندوؤں کے خیال میں گنگا کے پانی میں ست اور برکت خیالی طور پر رکھی ہوئی ہے، حالانکہ وہ ایک معمولی دریا ہے۔ جس میں مینڈک، کچھوے اسی طرح موجود ہیں، جیسے اور دریاؤں میں۔ اور اس میں مُردوں کی ہڈیاں ڈالی جاتی ہیں۔ اب اگر ایک ہندو سے اس کی دلیل پُوچھیں، تو وُہ یہی کہے گا کہ میرے دل میں دلیل ہے۔ بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی نادان آریوں نے جو پرمیشر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وُہ ایک مستری اور کاریگر سے بڑھ کر نہیں۔ کیونکہ بجز جوڑنے جاڑنے کے خالقیت کے اعلیٰ جوہر سے وہ بے بہرہ ہے۔ رُوح اور ذرّاتِ عالم پر اُس کا کوئی تصرّف نہیں۔ کیونکہ اس نے اُن کو پیدا ہی نہیں کیا۔ وُہ کبھی اپنے بندوں کو نجات نہیں دے سکتا۔ کیونکہ پھر سارا کارخانہ ہی بگڑتا ہے اور ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ وُہ اپنے کسی مخلص بندے کی دُعا ہی نہیں سُن سکتا اور نہ کسی کو وہ اپنے فضل سے کچھ دے سکتا ہے کیونکہ جو کچھ وہ کسی کو دیتا ہے، وُہ اُس کے ہی کرموں کا پھل ہوتا ہے۔ غرض ہر قوم نے اور کتاب نے جو خدا پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر شرم آجاتی ہے۔ یہ فضیلت اور فخر اسلام کو ہی ہے۔ کہ اس کو ماننے والا کبھی شرمندہ نہیں ہو سکتا اُس نے کامل خدا کا پلّہ پکڑا ہے اور کامل ہی کے حضور جائے گا۔[1]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل ہے۔ پھر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے عظیم الشان احسان فرمایا۔ اگر آپؐ کا وجود باجود دُنیا

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱ صفحہ ۲، ۴ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء

میں نہ آتا۔ تو رام رام کہنے والوں کی طرح بہت سے جھوٹے اور بیہودہ اینٹ پتھر وغیرہ کے معبود بنائے جاتے۔ اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم آیا اور بُت پرستوں سے اُس نے نجات دی۔ یہی وہ راز ہے کہ یہ درجہ صرف اور صرف رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن احسانوں کے معاوضہ میں ملا کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (الاحزاب : ۵۷)۔

اِدھر ہندوؤں نے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کو خدا بنا رکھا تھا۔ اُس وقت کی حالت سے کوئی نہیں بتلا سکتا کہ موحّد فرقہ کہاں رہتا تھا۔ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے تقاضے کا پتہ لگتا ہے کہ کیونکر تاریکی کے وقت اُس کی غیرت ہدایت کا تقاضا کرتی ہے۔ ہنُود رام رام اور عیسائی رَبُّنَا الْيَسُوْع رَبُّنَا الْيَسُوْع پکارتے تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو خدا کا نام لیتا۔ کروڑوں پردوں میں اللہ تعالیٰ کا جلالی اسم مخفی تھا۔ اللہ جلّ شانہٗ نے جب احسان کرنا چاہا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا۔ آپ کا نام محمدؐ تھا جس کے معنی ہیں نہایت ہی تعریف کیا گیا۔ جو باب تفعیل سے آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی اسی قدر قابلِ تعریف ٹھہرتا ہے۔ جس قدر کام کرتا ہے۔ پہلے نبی خاص قوموں کے لیے آتے تھے اور ایک نقص یہ تھا کہ ایک عظیم الشان اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام جب آئے، تو وہ صرف بنی اسرائیل ہی کی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کرنے کے واسطے آئے اور یہودیوں کے پاس اس وقت توریت موجود تھی۔ وہی تورات کی تعلیمات عملدرآمد کے لیے کافی سمجھی گئی تھیں اور یہودی تورات کے احکام اور تعلیمات کے قائل اور ان پر قائم تھے۔ ہاں بعض اخلاقی کمزوریاں تھیں۔ جو اُن میں پیدا ہوگئی تھیں۔

اور یہ صاف بات ہے کہ صرف اخلاقی کمزوریوں کو دُور کرنا۔ اُن کے نقصانات کو بتلا دینا یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایک معمولی درجہ کا آدمی بھی ایسا کرسکتا ہے اور اخلاقی واعظ ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحؑ کا نام محمدؐ نہ رکھا گیا۔ کیوں؟ کہ ان کی خدمات ایسی اعلیٰ درجہ کی نہ تھیں اور اسی طرح پر موسیٰ علیہ السلام جب آئے گو وہ ایک شریعت لے کر آئے مگر ان کا بڑا کام بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانا ہی تھا؛ حالانکہ وہ قوم چارسو برس کی تلخیوں اور مصیبتوں کی وجہ سے بجائے خود اس بات پر آمادہ اور تیار تھی کہ کوئی ایسی تحریک ہو تو وہاں سے نکل کھڑے ہوں۔ مادّہ تیار تھا۔ صرف تحریک اور محرک کی ضرورت تھی۔ انسان جب کسی بیگار یا بے جا مشقت میں پکڑا جاوے، تو وُہ خود اس سے نجات پانی چاہتا ہے اور نکلنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں پریشان ہو رہے تھے اور اندر ہی اندر وہ اس سے رہائی پانے کی فکر میں تھے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامُور ہو کر جب انہیں کہا کہ مَیں تم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلاؤں گا تو وُہ سب تیار ہوگئے۔ بنی اسرائیل کے حالات اور واقعات کو بہ نظرِ غور دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کی اصل غرض موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی کیا تھی؟ بڑی بھاری غرض یہی تھی کہ وہ فرعون کی غلامی سے نکلیں؛ چنانچہ

رُوحانی اُمور اور خدا پرستی کے متعلق وہ ہمیشہ ٹھوکر کھاتے رہے اور بے جا گستاخیوں اور شوخیوں سے کام لیتے رہے۔ یہاں تک کہ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً (البقرہ : ۵۶) اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ (المائدہ : ۲۵) جیسے کلمات کہنے اور ذرا سی غیر حاضری میں گوسالہ پرستی کرنے سے باز نہ آئے اور بات بات میں ضد اور اعتراض سے کام لیتے۔ اُن کے حالات پر پوری نظر کے بعد صاف معلوم دیتا ہے کہ وہ صرف اور صرف فرعون کی غلامی سے ہی آزاد ہونا چاہتے تھے۔ خود اپنے آپ میں رہبری اور سرداری کی قوت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام کی بات سُنتے ہی تیار ہوگئے۔ چونکہ بہت تنگ آچکے تھے اور مرتا کیا نہ کرتا اپنی سرخروئی اُنھوں نے اسی میں سمجھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکل پڑے، لیکن آخر موسیٰؑ کی کامیابیوں کی راہ میں ٹھوکر کا پتھر بنے۔ غرض حضرت موسیٰؑ کو بہت محنت اور مشقت کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ قوم زندانِ غلامی میں گرفتار تھی اور تیار تھی کہ کوئی آئے، تو اسے قبول کرلیں۔ ایسی حالت میں کئی لاکھ آدمیوں نے ایک دن میں قبول کرلیا اور اُنھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ وہ کیسی قوم ہے اور موسیٰؑ کی تعلیم سے اُنھوں نے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔ پس یہانتک کہ اُن کو مصر سے نکال لینا کوئی بڑا کام نہ تھا۔ اصلاح کا زمانہ جب آیا اور موسیٰؑ نے جب چاہا کہ ان کو خدا پرست قوم بناکر وعدہ کی سرزمین میں داخل کریں۔ وُہ اُن کی شوخیوں اور گستاخیوں اور اندرونی بداعمالیوں میں گزرا۔ یہانتک کہ خود حضرت موسیٰؑ بھی اس سرزمین میں داخل نہ ہوسکے اس لیے ان کا نام بھی مُحمّد نہ ہو سکا۔

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی فضیلت

غرض جہانتک غور کرتے جاؤ۔ یہ پتہ لگے گا کہ کوئی نبی اس مبارک نام کا مستحق نہ تھا۔ یہانتک کہ ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا زمانہ آگیا اور وہ ایک خارستان تھا، جس میں نبی کریم نے قدم رکھا اور ظلمت کی انتہا ہو چکی تھی۔ میرا مذہب یہ ہے کہ اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو الگ کیا جاتا اور کُل نبی جو اس وقت تک گزر چکے تھے۔ سب کے سب اکٹھے ہوکر وہ کام اور وہ اصلاح کرنا چاہتے۔ جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کی ہرگز نہ کرسکتے۔ اُن میں وہ دل اور وُہ قوت نہ تھی جو ہمارے نبیؐ کو ملی تھی۔ اگر کوئی کہے کہ یہ نبیوں کی معاذ اللہ سُوءِ ادبی ہے تو وُہ نادان مجھ پر افترا کرے گا۔ مَیں نبیوں کی عزّت اور حرمت کرنا اپنے ایمان کا جزو سمجھتا ہوں، لیکن نبی کریم کی فضیلت کُل انبیاء پر میرے ایمان کا جُزوِ اعظم ہے اور میرے رگ و ریشہ میں ملی ہوئی بات ہے۔ یہ میرے اختیار میں نہیں کہ اس کو نکال دُوں۔ بدنصیب اور آنکھ نہ رکھنے والا مخالف جو چاہے سو کہے۔ ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے وہ کام کیا ہے، جو نہ الگ الگ اور نہ مل مل کر کسی سے ہوسکتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ذالك فضل اللّٰه یؤتیه من یشاء۔

سراپا محمدؐ

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پیش آمدہ کی اگر معرفت ہو اور اس بات پر پوری اطلاع ملے کہ اُس وقت دُنیا کی کیا حالت تھی اور آپؐ نے آکر کیا کیا ؟ تو انسان وجد میں آکر اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہہ اٹھتا ہے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں۔ یہ خیالی اور فرضی بات نہیں ہے قرآن شریف اور دُنیا کی تاریخ اِس امر کی پوری شہادت دیتی ہے کہ نبی کریمؐ نے کیا کیا۔ ورنہ وہ کیا بات تھی جو آپؐ کے لیے مخصوصًا فرمایا گیا اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب : ۵۷) کسی دُوسرے نبی کے لیے یہ صدا نہیں آئی۔ پُوری کامیابی پُوری تعریف کے ساتھ ہی ایک انسان دُنیا میں آیا جو مُحَمَّدؐ کہلایا صلی اللہ علیہ وسلم۔

عادت اللہ اسی طرح پر ہے۔ زمانہ ترقی کرتا ہے۔ آخر وہ زمانہ آگیا جو خاتم النبیین کا زمانہ تھا جو ایک ہی شخص تھا جس نے یہ کہا۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف : ۱۵۹) کہنے کو تو یہ چند لفظ ہیں۔ اور ایک اندھا کہہ سکتا ہے کہ معمولی بات ہے۔ مگر جو دل رکھتا ہے وہ سمجھتا ہے اور جو کان رکھتا ہے، وہ سُنتا ہے۔ جو آنکھیں رکھتا ہے وُہ دیکھتا ہے کہ یہ الفاظ معمولی الفاظ نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ معمولی لفظ تھے، تو بتلاؤ کہ موسیٰ علیہ السلام کو یا مسیح علیہ السلام یا کسی نبی کو بھی یہ طاقت کیوں نہ ہوئی کہ وُہ یہ لفظ کہہ دیتا۔ اصل یہی ہے جس کو یہ قوت یہ منصب نہیں ملا وہ کیونکر کہہ سکتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کسی نبی کو یہ شوکت یہ جلال نہ ملا جو ہمارے نبی کریمؐ کو ملا۔ بکری کو اگر ہر روز گوشت کھلاؤ، تو وُہ گوشت کھانے سے شیر نہ بن سکے گی۔ شیر کا بچہ ہی شیر ہوگا۔ پس یاد رکھو۔ یہی بات سچ ہے کہ اس نام کا مستحق اور واقعی حقدار ایک تھا۔ جو محمدؐ کہلایا۔ یہ دادِ الٰہی ہے۔ جس کے دل دماغ میں چاہے۔ یہ قوتیں رکھ دیتی ہے اور خدا خوب جانتا ہے کہ ان قوتوں کا محل اور موقعہ کونسا ہے۔ ہر ایک کا کام نہیں کہ اِس راز کو سمجھ سکے اور ہر ایک کے مُنہ میں وُہ زبان نہیں جو یہ کہہ سکے کہ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ جبتک رُوح القُدس کی خاص تائیدنہ ہو۔ یہ کام نہیں نکل سکتا۔

رسُول اللہؐ میں وُہ ساری قوتیں اور طاقتیں رکھی گئی ہیں جو محمدؐ بنا دیتی ہیں تاکہ بالقوۃ باتیں بالفعل میں بھی آجاویں، اس لیے آپؐ نے یہ دعویٰ کیا کہ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ ایک قوم کے ساتھ جو مشقت کرنی پڑتی ہے۔ تو کس قدر مشکلات پیش آتی ہیں۔ ایک خدمت گار شریر ہو تو اس کا دُرست کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ آخر تنگ اور عاجز آکر اس کو بھی نکال دیتا ہے۔ لیکن وہ کس قدر قابلِ تعریف ہوگا جو اسے دُرست کرے اور پھر وہ تو بڑا ہی مردِ میدان ہے جو اپنی قوم کو دُرست کرسکے ؛ حالانکہ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں، مگر وہ جو مختلف قوموں کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا۔ سوچو تو سہی کسقدر کامل اور زبردست قویٰ کا مالک ہوگا۔ مختلف طبیعت کے لوگ، مختلف عمروں، مختلف ملکوں، مختلف خیال، مختلف قویٰ کی مخلوق کو ایک ہی تعلیم کے نیچے رکھنا اور پھر ان سب

کی تربیت کرکے دکھا دینا اور وہ تربیت بھی کوئی جسمانی نہیں بلکہ رُوحانی تربیت، خداشناسی اور معرفت کی باریک سے باریک باتوں اور اسرار سے پُورا واقف بنا دینا اور نِری تعلیم ہی نہیں بلکہ عامل بھی بنا دینا یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ دُنیا کے لیے اجتماع بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اُن میں ذاتی مفاد اور دُنیوی لالچ کی ایک تحریک ہوتی ہے مگر کوئی یہ بتلائے کہ محض اللہ کے لیے پھر ایسے وقت میں کہ اس جُلالی نام سے کلُ دُنیا ناواقف ہو اور پھر ایسی حالت میں اس کا اقرار کرنا کہ دُنیا کی تمام مصیبتوں کو اپنے سر پر اُٹھا لینا ہو۔ کون کسی کے پاس آ سکتا ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف بُلانے والے کی عظیم الشان قوت جذب کی نہ ہو کہ بے اختیار ہو ہو کر دل اُس کی طرف کھنچ آویں اور وہ تمام تکلیفیں اور بلائیں ان کے لیے محسوس اللذّات اور مُدرک الحلاوت ہو جاویں۔

اب رسُول اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی جماعت کی طرف غور کرو تو پھر کیسا روشن طور پر معلوم ہو گا کہ آپؐ ہی اس قابل تھے کہ محمدؐ نام سے موسوم ہوتے اور اس دعویٰ کو جیسا کہ زبان سے کیا گیا تھا۔ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ اپنے عمل سے بھی کر دکھاتے؛ چنانچہ وُہ وقت آ گیا کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (النصر ۲،۳) اس میں اس امر کی طرف صریح اشارہ ہے کہ آپؐ اس وقت دُنیا میں آئے جب دین اللہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور عالمگیر تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور گئے اُس وقت کہ جبکہ اس نظارہ کو دیکھ لیا کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔

جب تک اس کو پُورا نہ کر لیا۔ نہ تھکے نہ ماندہ ہوئے۔ مخالفوں کی مخالفتیں، اعداء کی سازشیں اور منصوبے، قتل کرنے کے مشورے، قوم کی تکلیفیں آپؐ کے حوصلہ اور ہمت کے سامنے سب ہیچ اور بیکار تھیں اور کوئی چیز ایسی نہ تھی جو آپؐ کو اپنے کام سے ایک لمحہ کیلئے بھی روک سکتی! اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس وقت تک زندہ رکھا۔ جب تک کہ آپؐ نے وُہ کام نہ کر لیا۔ جس کے واسطے آئے تھے۔ یہ بھی ایک سِرّ ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والے جھوٹوں کی طرح نہیں آتے۔

اسی طرح پر آپ کے صدقِ نبوت پر آپؐ کی زندگی سب سے بڑا نشان ہے۔ کوئی ہے جو اس پر نظر کرے؟ آپؐ کو دُنیا میں ایسے وقت پر بھیجا کہ دُنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اُس وقت تک زندہ رکھا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (المائدہ ۴:) کی آواز آپؐ کو نہ آ گئی اور فوجوں کی فوجیں اِسلام میں داخل ہوتی ہوئیں آپؐ نے نہ دیکھ لیں۔ غرض اِس قسم کی بہت سی وجوہ ہیں، جن سے آپؐ کا نام محمدؐ رکھا گیا۔

احمد مجتبیٰ صلّی اللہ علیہ وسلم

پھر آپؐ کا ایک اور نام بھی رکھا گیا۔ وُہ احمدؐ ہے؛ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اسی نام کی پیشگوئی کی تھی۔ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی

اِسْمُہٗٓ اَحْمَدُ ؕ (الصف : ۷) یعنی میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کی مَیں بشارت دیتا ہوں اور اس کا نام احمدؐ ہوگا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جو اللہ تعالیٰ کی حد سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ اس لفظ سے صاف پایا جاتا ہے اور سچی بات بھی یہی ہے کہ کوئی اُسی کی تعریف کرتا ہے جس سے کچھ لیتا ہے اور جس قدر زیادہ لیتا ہے اسی قدر زیادہ تعریف کرتا ہے۔ اگر کسی کو ایک روپیہ دیا جاوے، تو وُہ اسی قدر تعریف کرے گا اور جس کو ہزار روپیہ دیا جائے وہ اسی اندازہ سے کرے گا۔ غرض اس سے واضح طور پر پایا جاتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ خدا کا فضل پایا ہے۔ در اصل اس نام میں ایک پیشگوئی ہے کہ یہ بہت ہی بڑے فضلوں کا وارث اور مالک ہوگا۔

محمّد و احمد

پھر آپؐ کے مبارک ناموں میں ایک سِر یہ ہے کہ محمدؐ اور احمدؐ جو دو نام ہیں۔ ان میں دو جُدا جُدا کمال ہیں۔ محمدؐ کا نام جلال اور کبریائی کو چاہتا ہے۔ جو نہایت درجہ تعریف کیا گیا ہے اور اس میں ایک معشوقانہ رنگ ہے۔ کیونکہ معشوق کی تعریف کی جاتی ہے۔ پس اس میں جلالی رنگ ہونا ضروری ہے۔ مگر احمدؐ کا نام اپنے اندر عاشقانہ رنگ رکھتا ہے۔ کیونکہ تعریف کرنا عاشق کا کام ہے۔ وُہ اپنے محبُوب اور معشوق کی تعریف کرتا رہتا ہے۔ اس لیے جیسے محمدؐ محبوبانہ شان میں جلال اور کبریائی کو چاہتا ہے، اسی طرح احمدؐ عاشقانہ شان میں ہو کر غُربت اور انکساری کو چاہتا ہے۔ اس میں ایک سِر یہ تھا کہ آپؐ کی زندگی کی تقسیم دو حصّوں پر کر دی گئی۔ ایک تو مکّی زندگی جو ۱۳ برس کے زمانہ کی ہے اور دُوسری وہ زندگی جو مدنی زندگی ہے اور وُہ ۱۰ برس کی ہے۔ مکّہ کی زندگی میں اسمِ احمدؐ کی تجلّی تھی۔ اس وقت آپؐ کی دن رات خدا تعالیٰ کے حضور گریہ وُبکا اور طلبِ استعانت اور دُعا میں گزرتی تھی۔ اگر کوئی شخص آپؐ کی اس زندگی کے بسر اوقات پر پُوری اطلاع رکھتا ہو، تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ جو تضرّع اور زاری آپؐ نے اس مکّی زندگی میں کی ہے۔ وہ کبھی کسی عاشق نے اپنے محبُوب و معشوق کی تلاش میں کبھی نہیں کی اور نہ کر سکے گا۔ پھر آپؐ کی تضرّع اپنے لیے نہ تھی۔ بلکہ یہ تضرّع دُنیا کی حالت کی پوری واقفیت کی وجہ سے تھی۔ خدا پرستی کا نام ونشان چونکہ مِٹ چکا تھا اور آپؐ کی روح اور خمیر میں اللہ تعالیٰ میں ایمان رکھ کر ایک لذّت اور سُرور آچکا تھا اور فطرتًا دُنیا کو اس لذّت اور محبّت سے سرشار کرنا چاہتے تھے۔ اِدھر دُنیا کی حالت کو دیکھتے تھے، تو اُن کی استعدادیں اور فطرتیں عجیب طرز پر واقع ہو چکی تھیں اور بڑے مشکلات اور مصائب کا سامنا تھا۔ غرض دُنیا کی اس حالت پر آپؐ گریہ وزاری کرتے تھے اور یہاں تک کرتے تھے کہ قریب تھا کہ جان نکل جاتی۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء : ۴) یہ آپؐ کی متضرّعانہ زندگی تھی اور اسمِ احمدؐ کا ظہور تھا۔ اس وقت آپؐ ایک عظیم الشان توجہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اِس توجہ کا ظہور مدنی زندگی اور اسمِ محمدؐ کی تجلّی کے وقت ہوا۔ جیسا کہ اس آیت سے پتہ لگتا ہے۔ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۔ (ابراہیم : ۱۶)۔

مامورین پر ابتلاء یہ سُنّت اللہ ہے کہ مامورین اللہ ستائے جاتے ہیں۔ دُکھ دیئے جاتے ہیں۔ مشکل پر مشکل اُن کے سامنے آتی ہے نہ اس لیے کہ وہ ہلاک ہو جائیں بلکہ اس لیے کہ نصرتِ الٰہی کو جذب کریں۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کی مکی زندگی کا زمانہ مدنی زندگی کے بالمقابل دراز ہے۔ چنانچہ مکہ میں ۱۳ برس گذرے اور مدینہ میں دس برس۔ جیسا کہ اس آیت سے پایا جاتا ہے۔ ہر نبی اور مامورمن اللہ کے ساتھ یہی حال ہوا ہے کہ اوّل میں دُکھ دیا گیا۔ مکّار، فریبی، دوکاندار اور کیا کیا کہا گیا ہے۔ کوئی بُرا نام نہیں ہوتا جو اُن کا نہیں رکھا جاتا۔ وُہ نبی اور مامور ہر ایک بات کی برداشت کرتے اور ہر دُکھ کو سہہ لیتے ہیں۔ لیکن جب انتہا ہو جاتی ہے تو پھر بنی نوع انسان کی ہمدردی کے لیے دُوسری قوت ظہور پکڑتی ہے۔ اسی طرح پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہر قسم کا دُکھ دیا گیا ہے اور ہر قسم کا بُرا نام آپؐ کا رکھا گیا ہے۔ آخر آپؐ کی توجہ نے زور مارا اور وُہ انتہا تک پہنچی جیسا اِسْتَفْتَحُوْا سے پایا جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوا۔ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ تمام شریروں اور شرارتوں کے منصوبے کرنے والوں کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ توجہ مخالفوں کی شرارتوں کے انتہا پر ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر اوّل ہی ہو تو پھر خاتمہ ہو جاتا ہے!! مکہ کی زندگی میں حضرتِ احدیت کے حضور گرنا اور چلّانا تھا اور وہ اس حالت تک پہنچ چکا تھا کہ دیکھنے والوں اور سُننے والوں کے بدن پر لرزہ پڑ جاتا ہے۔ مگر آخر مدنی زندگی کے جلال کو دیکھو کہ وہ جو شرارتوں میں سرگرم اور قتل اور اخراج کے منصُوبوں میں مصروف رہتے تھے۔ سب کے سب ہلاک ہوتے اور باقیوں کو اس کے حضور عاجزی اور منت کے ساتھ اپنی خطاؤں کا اقرار کر کے معافی مانگنی پڑی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دیکھو کس قدر فائدہ پہنچا۔ ایک زمانہ میں یہ ایمان نہ لاتے تھے اور چار برس کا توقف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ خُوب مصلحت سمجھتا ہے کہ اس میں کیا سِرّ ہے۔ ابوجہل نے کوشش کی کہ کوئی ایسا شخص تلاش کیا جاوے جو رسول اللہؐ کو قتل کر دے۔ اس وقت حضرت عمرؓ بڑے بہادر اور دلیر مشہور تھے اور شوکت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے آپس میں مشورہ کر کے رسُول اللہ کے قتل کا بیڑا اٹھایا اور معاہدہ پر حضرت عمرؓ اور ابوجہل کے دستخط ہو گئے اور قرار پایا کہ اگر عمر قتل کر آویں تو اس قدر روپیہ دیا جاوے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ایک وقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو شہید کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ دُوسرے وقت وہی عمرؓ اسلام میں ہو کر خود شہید ہوتے ہیں۔ وہ کیا عجیب زمانہ تھا۔ غرض اس وقت یہ معاہدہ ہوا کہ مَیں قتل کرتا ہوں۔ اس تحریر کے بعد آپؐ کی تلاش اور تجسّس میں لگے راتوں کو پھرتے تھے کہ کہیں تنہا مِل جاویں تو قتل کر دوں۔ لوگوں سے دریافت کیا کہ آپؐ تنہا کہاں ہوتے ہیں۔ لوگوں نے کہا

نصف رات گزرنے کے بعد خانہ کعبہ میں جا کر نماز پڑھا کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ یہ سُنکر بہت ہی خوش ہوئے چنانچہ خانہ کعبہ میں آکر چھُپ رہے۔ جب تھوڑی دیر گذری تو جنگل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی آواز آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی آواز تھی۔ اس آواز کو سُن کر اور یہ معلوم کر کے کہ وہ ادھر ہی کو آرہی ہے۔ حضرت عمرؓ اور بھی احتیاط کر کے چھُپے اور یہ ارادہ کر لیا کہ جب سجدہ میں جائیں گے، تو تلوار مار کر سر مبارک تن سے جُدا کر دوں گا۔ آپؐ نے آتے ہی نماز شروع کر دی۔ پھر اس کے آگے کے واقعات خود حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ میں اس قدر رو رو کر دُعائیں کیں کہ مجھ پر لرزہ پڑنے لگا۔ یہانتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی کہا سَجَدَ لَکَ رُوْحِیْ وَجَنَانِیْ یعنی اے میرے مولیٰ میری رُوح اور میرے دل نے بھی تجھے سجدہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان دُعاؤں کو سُن کر جگر پاش پاش ہوتا تھا۔ آخر میرے ہاتھ سے ہیبتِ حق کی وجہ سے تلوار گر پڑی۔ مَیں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت سے سمجھ لیا کہ یہ سچا ہے اور ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ مگر نفسِ امارہ بُرا ہوتا ہے۔ جب آپؐ نماز پڑھ کر نکلے۔ مَیں پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پاؤں کی آہٹ جو آپؐ کو معلوم ہوئی۔ رات اندھیری تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پُوچھا۔ کون ہے؟ مَیں نے کہا۔ عمرؓ۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے عمرؓ۔ نہ تو رات کو پیچھا چھوڑتا ہے اور نہ دن کو۔ اس وقت مجھے رسُول اللہؐ کی رُوح کی خوشبو آئی اور میری رُوح نے محسوس کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بددُعا کریں گے۔ مَیں نے عرض کیا۔ یا حضرت! بددُعا نہ کریں۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ وُہ وقت اور وُہ گھڑی میرے اسلام کی تھی۔ یہانتک کہ خدا نے مجھے توفیق دی کہ مَیں مُسلمان ہو گیا۔

اب سوچو کہ اس تضرع اور بُکا میں کیسی تلوار مخفی تھی کہ جس نے عمرؓ جیسے انسان کو جو قتل کے لیے معاہدہ کر کے آتا ہے۔ اپنی ادا کا شہید کر لیا۔ اس توجہ اور زاری میں ایسی تلوار ہوتی ہے۔ جو سیف و سنان سے بڑھ کر کام کرتی ہے۔ غرض وُہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا اسمِ احمدؐ کے ظہور کا زمانہ تھا، اس لیے مکہ میں عاشقانہ رنگ کا جلوہ دکھایا۔ اپنے آپ کو خاک میں ملا دیا اور ہزاروں موتیں اپنے آپ پر وارد کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس جوش، وفا، تضرع اور دُعا و بُکا کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ ان موتوں کے بعد وہ قوت وہ زندگی آپؐ کو ملی کہ ہزاروں لاکھوں مُردوں کے زندہ کرنے والے ٹھہرے اور حاشر النّاس کہلائے اور ابتک اپنی قوتِ قدسی کے زور سے کروڑہا مُردوں کو زندہ کر رہے ہیں اور قیامت تک کرتے رہیں گے۔

پس اس مکی زندگی اور عاشقانہ ظہور کے بعد جو اسم احمدؐ کی تجلّی تھی۔ دُوسرا دَور آپؐ کی جلالی زندگی اسم محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا معشوقانہ شان میں ہوا جبکہ مکہ والوں کی دشمنی کی انتہا ہو چکی اور دُعاؤں اور

توجہ کی حد ہوگئی۔ نابکار مخالفوں کی عداوت حد سے بڑھ کر بیت اللہ سے نکال دینے کا باعث ہوئی اور اس پر بھی بس نہ کی بلکہ تعاقب کیا اور اپنی طرف سے کوئی دقیقہ تکلیف دہی اور ایذا رسانی کا باقی نہ رکھا، تو آپؐ مدینہ تشریف لائے اور پھر حکم ہوا کہ مداخلت کی جاوے۔ اللہ تعالیٰ کی غیرت نے جوش مارا اور جلالِ الٰہی نے اسم محمدؐ کا جلوہ دکھانے کا ارادہ فرمایا، جس کا ظہور مدنی زندگی میں ہوا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دُنیا میں آنے کی غرض وغایت تو صرف یہ تھی کہ دُنیا پر اس خدا کا جلال ظاہر کریں، جو مخلوق کی نظروں اور دلوں سے پوشیدہ ہو چکا تھا اور اس کی جگہ باطل اور بیہودہ معبودوں، بتوں اور پتھروں نے لے لی تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمالی اور جلالی زندگی میں جلوہ گری فرماتا اور اپنے دستِ قدرت کا کرشمہ دکھاتا۔

محبُوبِ الٰہی بننے کے لیے واحد راہ اطاعتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پس رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کامل نمونہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے اور محبُوبِ الٰہی بننے کا ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں فرما دیا کہ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران : ۳۲)

یعنی ان کو کہہ دو کہ تم اگر چاہتے ہو کہ محبُوبِ الٰہی بن جاؤ اور تمہارے گناہ بخش دیئے جاویں، تو اس کی ایک ہی راہ ہے کہ میری اطاعت کرو۔

کیا مطلب کہ میری پیروی ایک ایسی شے ہے جو رحمتِ الٰہی سے ناامید ہونے نہیں دیتی۔ گناہوں کی مغفرت کا باعث ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا محبُوب بنا دیتی ہے اور تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اسی صُورت میں سچا اور صحیح ثابت ہوگا کہ تم میری پیروی کرو۔

اِس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی خود تراشیدہ طرزِ ریاضت و مشقت اور جپ تپ سے اللہ تعالیٰ کا محبُوب اور قُربِ الٰہی کا حقدار نہیں بن سکتا۔ انوار و برکاتِ الٰہیہ کسی پر نازل نہیں ہوسکتیں۔ جبتک وُہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کھویا نہ جاوے۔

اور جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں گم ہو جاوے اور آپؐ کی اطاعت اور پیروی میں ہر قسم کی موت اپنی جان پر وارد کرے۔ اس کو وُہ نُورِ ایمان، محبت اور عشق دیا جاتا ہے جو غیر اللہ سے رہائی دلا دیتا ہے۔ اور گناہوں سے رُستگاری اور نجات کا موجب ہوتا ہے۔ اسی دُنیا میں وہ ایک پاک زندگی پاتا ہے۔ اور نفسانی جوش و جذبات کی تنگ و تاریک قبروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ اِسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔ اَنَا الْحَاشِرُ الَّذِیْ یُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰی قَدَمِیْ۔ یعنی میں وُہ مُردوں کو اٹھانے والا ہوں جس کے قدموں پر

لوگ اُٹھائے جاتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ وہ علوم جو مدارِ نجات ہیں یقینی اور قطعی طور پر بجز اس حیات کے حاصل نہیں ہو سکتے، جو بتوسّط روح القدس انسان کو ملتی ہے اور قرآن شریف کی یہ آیت صاف طور پر اور پکار کر یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ حیاتِ روحانی صرف رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے ملتی ہے اور وہ تمام لوگ جو بخل اور عناد کی وجہ سے نبی کریمؐ کی متابعت سے سرکش ہیں، وُہ شیطان کے سائے کے نیچے ہیں۔ اس میں اس پاک زندگی کی رُوح نہیں ہے جو بظاہر زندہ کہلاتا ہے لیکن مُردہ ہے جبکہ شیطان اُس کے دل پر سوار ہے۔

موت کو یاد رکھیں

افسوس اُس کو موت یاد نہیں ہے۔ موت کیا دُور ہے؟ جس کی پچاس برس کی عمر ہو چکی ہے۔ اگر وہ زندگی پائے گا تو دو چار برس اور پائے گا یا زیادہ سے زیادہ دس برس۔ اور آخر مرنا ہو گا۔ موت ایک یقینی شے ہے جس سے ہرگز ہرگز کوئی بچ نہیں سکتا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگ روپیہ پیسہ کے حساب میں ایسے غلطاں پیچاں رہتے ہیں کہ کچھ حد نہیں، مگر عمر کا حساب کبھی بھی نہیں کرتے۔ بدبخت ہے وُہ انسان جس کو عُمر کے حساب کی طرف توجہ نہ ہو۔ سب سے ضروری اور حساب کے لائق جو شے ہے وہ عمر ہی تو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ موت آجائے اور یہ حسرت لے کر دُنیا سے کُوچ کرے۔ قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسے بہشتی زندگی اسی دُنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ جہنم کی زندگی بھی یہاں ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ جب انسان حسرت کے ساتھ مرتا ہے، تو بہت بڑے جہنم میں ہوتا ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ اب چلا۔ ہیضہ، طاعُون، محرقہ، خفقان یا کسی اور شدید مرض میں مبتلا ہوتا ہے، تو موت سے پہلے ایک موت وارد ہو جاتی ہے۔ جو دل اور رُوح کو فرسُودہ کر دیتی ہے۔ اور وُہ بھی حسرت ہوتی ہے۔ بعض امراض ایسے ہیں کہ دو منٹ میں دَم لینے نہیں دیتے اور جھٹ پٹ کام تمام کر دیتے ہیں جس نے ایک دن بھی مطالعہ کیا کہ مَیں مرنے والا جانور ہوں وہ اس عذاب سے بچنے کی فکر میں ہوا جو انسان کو حسرت کے رنگ میں کھا جاتا ہے۔

ہمارے عزیزوں میں سے ایک کو قولنج ہوئی۔ آخر پیشاب بند ہو کر سیاہ رنگ کی ایک قَے ہوئی اور اس کے ساتھ ہی گردن لٹک گئی۔ اس وقت کہا کہ اب معلوم ہوا کہ دُنیا کچھ چیز نہیں۔ یقیناً یاد رکھو کہ دُنیا کوئی چیز نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہم سب جو اس وقت یہاں موجود ہیں، سالِ آئندہ میں بھی ضرور ہوں گے۔ بہت سے ہمارے دوست جو پچھلے سال موجود تھے، آج نہیں ہیں۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ اگلے سال ہم نہ ہوں گے۔ اسی طرح اب کون کہہ سکتا ہے کہ ہم ضرور ہوں گے اور کس کو معلوم ہے کہ مرنے والوں کی فہرست میں کس کس کا نام ہے۔ پس بڑا ہی مُورکھ اور نادان ہے وہ شخص جو مرنے سے پہلے خدا سے صُلح نہیں کرتا اور جھُوٹی برادری کو نہیں چھوڑتا۔

بدصحبت

انسان کو ہلاک کرنے والی چیزوں میں سے ایک بدصحبت بھی ہے۔ دیکھو ابوجہل خود تو ہلاک ہوا، مگر اور بھی بہت سے لوگوں کو لے مرا۔ جو اس کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔

اس کی صحبت اور مجلس میں بجز استہزا اور ہنسی ٹھٹھے کے اور کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ یہی کہتے تھے اِنَّ ھٰذَا الشَّیْءٌ یُّرَادُ۔ (صٓ : ۷) میاں یہ دوکانداری ہے۔

اب دیکھو اور بتلاؤ کہ جس کو دوکاندار اور ٹھگ کہا جاتا تھا، ساری دُنیا میں اسی کا نُور ہے یا کسی اور کا بھی۔ ابوجہل مرگیا اور اس پر لعنت کے سوا کچھ نہ رہا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بلند کو دیکھو کہ شب و روز بلکہ ہر وقت درود پڑھا جاتا ہے اور ۹۹ کروڑ مسلمان اس کے خادم موجود ہیں۔ اگر اب ابوجہل پھر آتا، تو آکر دیکھتا کہ جسے اکیلا مکہ کی گلیوں میں پھرتا دیکھتا تھا، جس کی ایذا ہی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ جب ۹۹ کروڑ انسانوں کے مجمع کو دیکھتا حیران رہ جاتا اور یہ نظارہ ہی اس کو ہلاک کر دیتا۔ یہ ہے ثبوت آپؐ کی رسالت کی سچائی کا۔ اگر اللہ تعالیٰ ساتھ نہ ہوتا، تو یہ کامیابی نہ ہوتی۔ کس قدر کوششیں اور منصوبے آپؐ کی عداوت اور مخالفت کے کئے، مگر آخر ناکام اور نامُراد ہونا پڑا۔ اس ابتدائی حالت میں جب چند آدمی آپؐ کے ساتھ تھے کون دیکھ سکتا تھا کہ یہ عظیم الشان انسان دُنیا میں ہوگا اور ان مخالفوں کی سازشوں سے صحیح اور سلامت بچ کر کامیاب ہو جائے گا۔ مگر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اسی طرح پر ہے کہ انجام خدا کے بندوں کا ہی ہوتا ہے۔ قتل کی سازشیں، کفر کے فتوے، مختلف قسم کی ایذائیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سچ فرمایا ہے۔ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (الصّف : ۹) یہ شریر کافر اپنے مُنہ کی پھونکوں سے نُورِ اللہ کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اللہ اپنے نُور کو کامل کرنے والا ہے۔ کافر بُرا مناتے رہیں۔

مُنہ کی پھونکیں کیا ہوتی ہیں۔ یہی کسی نے ٹھگ کہہ دیا۔ کسی نے دوکاندار اور کافر و بے دین کہہ دیا۔ غرض یہ لوگ ایسی باتوں سے چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نُور کو بجھا دیں، مگر وُہ کامیاب نہیں ہو سکتے، نُورِ اللہ کو بجھاتے بجھاتے خود ہی جل کر ذلیل ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے لوگوں کے لشکر آسمان پر ہوتے ہیں۔ منکر اور زمینی لوگ اُن کو دیکھ نہیں سکتے۔ اگر ان کو معلوم ہو جاوے اور وہ ذرا سا بھی دیکھ پائیں تو ہیبت سے ہلاک ہو جائیں، مگر یہ لشکر نظر نہیں آ سکتے۔ جب تک انسان اللہ تعالیٰ کی چادر کے نیچے نہ آئے۔

سعادتِ عظمیٰ کے حصول کی راہ

مَیں پھر اصل مطلب کی طرف رجُوع کر کے کہتا ہوں کہ سعادتِ عظمیٰ کے حصُول کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راہ رکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جاوے جیسا کہ اس آیت میں صاف فرمادیا ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (آل عمران : ۳۲) یعنی آؤ میری پیروی کرو، تاکہ اللہ بھی تم کو دوست رکھے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رسمی طور پر عبادت کرو۔ اگر حقیقتِ مذہب یہی ہے، تو پھر نماز کیا چیز ہے اور روزہ کیا چیز؟

خود ہی ایک بات سے رُکے اور خود ہی کرے۔ اسلام محض اس کا نام نہیں ہے۔ اسلام تو یہ ہے کہ بکرے کی طرح سر رکھ دے۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا مرنا، میرا جینا، میری نماز، میری قربانیاں اللہ ہی کے لیے ہیں اور سب سے پہلے مَیں اپنی گردن رکھتا ہوں۔ یہ فخر اسلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اوّلیت کا ہے۔ نہ ابراہیمؑ کو نہ کسی اور کو۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ۔ اگرچہ آپؐ سب نبیوں کے بعد آئے، مگر یہ صدا کہ میرا مرنا اور میرا جینا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ دُوسرے کے مُنہ سے نہیں نکلی۔

مُسلمان کی حقیقت

اب دُنیا کی حالت کو دیکھو کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے عمل سے یہ دکھایا کہ میرا مرنا اور جینا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور یا اب دُنیا میں مسلمان موجود ہیں۔ کسی سے کہا جاوے کہ کیا تو مُسلمان ہے؟ تو کہتا ہے۔ الحمدللہ۔ جس کا کلمہ پڑھتا ہے، اس کی زندگی کا اصُول تو خدا کے لیے تھا، مگر یہ دُنیا کے لیے جیتا اور دُنیا ہی کے لیے مرتا ہے اس وقت تک کہ غرغرہ شروع ہو جاوے، دُنیا ہی اس کی مقصود، محبوب اور مطلوب رہتی ہے پھر کیونکر کہہ سکتا ہے کہ مَیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہوں۔

یہ بڑی غورطلب بات ہے اس کو سَرسَری نہ سمجھو۔ مُسلمان بننا آسان نہیں ہے۔ رُسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت اور اسلام کا نمونہ جبتک اپنے اندر پیدا نہ کرلو مطمئن نہ ہو۔

یہ صرف چھلکا ہی چھلکا ہے۔ اگر بدُوں اتباع مُسلمان کہلاتے ہو۔ نام اور چھلکے پر خوش ہوجانا دانشمند کا کام نہیں ہے۔ لکھا ہے۔ کسی یہودی کو ایک مُسلمان نے کہا کہ تو مُسلمان ہوجا۔ اس نے کہا تو صرف نام پر ہی خوش نہ ہوجا۔ مَیں نے اپنے لڑکے کا نام خالد رکھا تھا اور شام سے پہلے ہی اُسے دفن کر آیا۔ پس حقیقت کو طلب کرو۔ نرے ناموں پر راضی نہ ہوجاؤ۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ انسان عظیم الشان نبیؐ کا امتّی کہلاکر کافروں کی سی زندگی بسر کرے۔ تم اپنی زندگی میں محمدؐ رسُول اللہ علیہ وسلّم کا نمونہ دکھاؤ، وہی حالت پیدا کرو اور دیکھو اگر وہی حالت نہیں ہے، تو تم طاغوت کے پیرو ہو۔

غرض یہ بات اب بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبُوب ہونا انسان کی زندگی کی غرض وغایت ہونی چاہیے، کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ کا محبُوب نہ ہو اور خدا کی محبّت نہ ملے، کامیابی کی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اور یہ امر پیدا نہیں ہوتا، جبتک رسُول اللہؐ کی سچّی اطاعت اور متابعت نہ کرو اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے عمل سے دکھا دیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ پس تم وُہ اسلام اپنے اندر پیدا کرو، تاکہ تم خدا کے محبُوب بنو۔

اب مَیں پھر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حمد ہی سے محمدؐ اور احمدؐ نکلا ہے۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور یہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دو نام تھے۔ گویا حمد کے دُو مظہر ہوئے اور پھر الحمدللہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی چار

صفتیں رَبُّ الْعَالَمِیْن۔ اَلرَّحْمٰن۔ اَلرَّحِیْم۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْن بیان کی ہیں۔

الحمد للہ کا مظہر

مَیں نے ابھی بیان کیا ہے کہ الحمد للہ کا مظہر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ظہوروں محمدؐ اور احمدؐ میں ہوا۔ اب نبیؐ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفاتِ اربعہ کو بیان کر کے صحابہ کرامؓ کی تعریف میں پورا بھی کر دیا۔ گویا اللہ تعالیٰ ظلّی طور پر اپنی صفات دینا چاہتا ہے اس لیے فنافی اللہ کے یہی معنے ہیں کہ انسان الٰہی صفات کے اندر آجاوے۔

مظہرِ صفاتِ باریؐ صلی اللہ علیہ وسلم

اب دیکھو کہ ان صفاتِ اربعہ کا عملی نمونہ صحابہ میں کیسا دکھایا۔ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، تو مکّہ کے لوگ ایسے تھے، جیسے بچّہ دُودھ پینے کا محتاج ہوتا ہے۔ گویا رُبوبیت کے محتاج تھے۔ وحشی اور درندوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کی طرح دُودھ پلا کر اُن کی پرورش کی۔ پھر رحمانیت کا پرتو کیا۔ وُہ سامان دیئے کہ جن میں کوشش کو کوئی دخل نہ تھا۔ قرآن کریم جیسی نعمت اور رسول کریمؐ جیسا نمونہ عطا فرمایا۔ پھر رحیمیت کا ظہور بھی دکھلایا کہ جو کوششیں کیں ان پر نتیجے مرتب کیے۔ اُن کے ایمانوں کو قبول فرمایا اور نصاریٰ کی طرح ضلالت میں نہ پڑنے دیا، بلکہ ثابت قدمی اور استقلال عطا فرمایا۔ کوشش میں یہ برکت ہوتی ہے کہ خدا ثابت قدم کر دیتا ہے۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں کوئی مُرتد نہ ہوا۔ دُوسرے نبیوں کے احباب میں ہزاروں ہوتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کے تو ایک ہی دن میں پانسو مُرتد ہو گئے۔ اور جن پر بڑا اعتبار اور وثوق تھا، اُن میں سے ایک نے تو تیس درہم لے کر پکڑوا دیا اور دُوسرے نے تین بار لعنت کی۔

بات دراصل یہ ہے کہ مُربّی کے قویٰ کا اثر ہوتا ہے۔ جس قدر مُربّی قویّ التاثیر اور کامل ہوگا، ویسی ہی اس کی تربیت کا اثر مستحکم اور مضبُوط ہوگا۔

نبی کریمؐ کی قوّتِ قُدسی کا ثبوت

یہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوّتِ قدسی کے کامل اور سب سے بڑھ کر ہونے کا ایک اور ثبوت ہے کہ آپؐ کے تربیت یافتہ گروہ میں وُہ استقلال اور رسُوخ تھا کہ وُہ آپؐ کے لیے اپنی جان مال تک دینے سے دریغ نہ کرنے والے میدان میں ثابت ہوتے۔ اور مسیحؑ کے نقص کا یہ بدیہی ثبوت ہے کہ جو جماعت تیار کی، وہی گرفتار کرانے اور جان سے مروانے اور لعنت کرنے والے ثابت ہوتے۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحیمیت کا اثر تھا کہ صحابہؓ میں ثباتِ قدم اور استقلال تھا۔ پھر مالکِ یوم الدین کا عملی ظہور صحابہؓ کی زندگی میں یہ ہوا کہ خدا نے اُن میں اور اُن کے غیروں میں فرقان رکھ دیا۔ جو معرفت اور خدا کی محبت دُنیا میں اُن کو دی گئی، یہ اُن کی دُنیا میں جزا تھی۔ اب قصّہ کوتاہ کرتا ہوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان صفاتِ اربعہ کی تجلّی چمکی۔

مسیح موعودؑ کے زمانہ کی جماعت بھی صحابہ ہی ہوگی

لیکن بات بڑی غور طلب ہے کہ صحابہؓ کی جماعت اتنی ہی نہ سمجھو، جو پہلے گزر چکے بلکہ ایک اور گروہ بھی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ذکر کیا ہے۔ وُہ بھی صحابہؓ ہی میں داخل ہے جو احمدؐ کے بروز کے ساتھ ہوں گے؛ چنانچہ فرمایا۔ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعۃ : ۴) یعنی صحابہؓ کی جماعت کو اسی قدر نہ سمجھو، بلکہ مسیح موعودؑ کے زمانہ کی جماعت بھی صحابہؓ ہی ہوگی۔

اس آیت کے متعلق مفسروں نے مان لیا ہے کہ یہ مسیح موعودؑ کی جماعت ہے مِنْهُمْ کے لفظ سے پایا جاتا ہے کہ باطنی توجہ اور استفاضہ صحابہؓ ہی کی طرح ہوگا۔ صحابہؓ کی تربیت ظاہری طور پر ہوئی تھی، مگر اُن کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ وُہ بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نیچے ہوں گے۔ اس لیے سب علماء نے اس گروہ کا نام صحابہ ہی رکھا ہے۔ جیسے ان صفاتِ اربعہ کا ظہور اُن صحابہؓ میں ہوا تھا، ویسے ہی ضروری ہے کہ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کی مصداق جماعتِ صحابہ میں بھی ہو۔

اب دیکھو کہ صحابہ کو بدر میں نصرت دی گئی اور فرمایا گیا کہ یہ نصرت ایسے وقت میں دی گئی جبکہ تم تھوڑے تھے۔ اس بدر میں کفر کا خاتمہ ہوگیا۔

واقعۂ بدر میں مسیح موعودؑ کے زمانہ کی پیشگوئی

بدر پر ایسے عظیم الشان نشان کے اظہار میں آئندہ کی بھی ایک خبر رکھی گئی تھی۔ اور وہ یہ کہ بدر چودھویں کے چاند کو بھی کہتے ہیں۔ اس سے چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کے اظہار کی طرف بھی ایماء ہے اور یہ چودھویں صدی وہی صدی ہے جس کے لیے عورتیں تک کہتی تھیں کہ چودھویں صدی خیروبرکت کی آئے گی۔ خدا کی باتیں پوری ہوئیں اور چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ کے منشاء کے موافق اسمِ احمدؐ کا بروز ہوا اور وُہ میں ہوں۔ جس کی طرف اس واقعۂ بدر میں پیشگوئی تھی۔ جس کے لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کہا۔ مگر افسوس کہ جب وہ دن آیا اور چودھویں کا چاند نکلا تو دوکاندار، خودغرض کہا گیا۔ افسوس اُن پر جنھوں نے دیکھا اور نہ دیکھا۔ وقت پایا اور نہ پہچانا۔ وہ مر گئے جو منبروں پر چڑھ چڑھ کر رویا کرتے تھے کہ چودھویں صدی میں یہ ہوگا اور وہ رہ گئے جو اب منبروں پر چڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ جو آیا ہے وہ کاذب ہے!!! ان کو کیا ہوگیا۔ یہ کیوں نہیں دیکھتے اور کیوں نہیں سوچتے۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے بدر ہی میں مدد کی تھی اور وُہ مدد اَذِلَّةٌ کی مدد تھی جس وقت تین سو تیرہ آدمی صرف میدان میں آئے تھے اور کُل دو تین لکڑی کی تلواریں تھیں۔ اور ان تین سو تیرہ میں زیادہ تر چھوٹے بچے تھے۔ اس سے زیادہ کمزوری کی حالت کیا ہوگی اور دوسری طرف ایک بڑی بھاری جمعیت تھی اور وہ سب کے سب چیدہ چیدہ جنگ آزمودہ اور بڑے بڑے جوان تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف ظاہری سامان کچھ نہ تھا۔ اس وقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ دُعا کی اَللّٰھُمَّ اِنْ اَھْلَکْتَ ھٰذِہٖ الْعِصَابَۃَ لَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ اَبَدًا۔ یعنی اے اللہ! اگر آج تُو نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر کوئی تیری عبادت کرنے والا نہ رہے گا۔

آج وہی بدر والا معاملہ ہے

سُنو! مَیں بھی یقیناً اسی طرح کہتا ہوں کہ آج وہی بدر والا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ایک جماعت تیار کر رہا ہے۔ وہی بدر اور اَذِلَّۃٌ کا لفظ موجود ہے۔ کیا یہ جھُوٹ ہے کہ اسلام پر ذلّت نہیں آئی؟ نہ سلطنتِ ظاہری میں شوکت ہے۔ ایک یُورپ کی سلطنت مُنہ دکھاتی ہے، تو بھاگ جاتے ہیں اور کیا مجال ہے جو سَر اُٹھائیں۔ اِس مُلک کا حال کیا ہے؟ کیا اَذِلَّۃٌ نہیں ہیں۔ ہندو بھی اپنی طاقت میں مُسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک ذلت ہے جس میں ان کا نمبر بڑھا ہوا نہیں ہے۔ جس قدر ذلیل سے ذلیل پیشے ہیں، وہ اُن میں پاؤ گے۔ ٹکر گدا مسلمانوں ہی میں ملیں گے۔ جیل خانوں میں جاؤ، تو جرائم پیشہ گرفتار مسلمان ہی پاؤ گے۔ شراب خانوں میں جاؤ، کثرت سے مسلمان۔ اب بھی کہتے ہیں۔ ذلّت نہیں ہوئی؟ کروڑ ہا ناپاک اور گندی کتابیں اسلام کے ردّ میں تالیف کی گئیں۔ ہماری قوم میں مغل سیّد کہلانے والے اور شریف کہلانے والے عیسائی ہو کر اسی زبان سے سیّد المعصُومین خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کو کوسنے لگے۔ صفدر علی اور عماد الدین وغیرہ کون تھے؟ امہات المومنین کا مصنّف کون ہے؟ جس پر اس قدر واویلا اور شور مچایا گیا اور آخر کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس پر بھی کہتے ہیں کہ ذلّت نہیں ہوئی۔ کیا تم تب خوش ہوتے کہ اسلام کا رہا سہا نام بھی باقی نہ رہتا، تب محسوس کرتے کہ ہاں اب ذلّت ہوئی ہے!!!

آہ! مَیں تم کو کیونکر دکھاؤں جو اسلام کی حالت ہو رہی ہے۔ دیکھو! مَیں پھر کھول کر کہتا ہوں کہ یہی بدر کا زمانہ ہے۔ اسلام پر ذلّت کا وقت آچکا ہے، مگر اب خدا نے چاہا ہے کہ اس کی نصرت کرے؛ چنانچہ اس نے مجھے بھیجا ہے کہ مَیں اسلام کو براہین اور حجج ساطعہ کے ساتھ تمام مِلّتوں اور مذہبوں پر غالب کر کے دکھاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مُبارک زمانہ میں چاہا ہے کہ اس کا جلال ظاہر ہو۔ اب کوئی نہیں جو اس کو روک سکے۔ جس طرح پہلے صحابہؓ کے زمانہ میں چاروں صفات کی ایک خاص تجلّی ظاہر ہوئی تھی۔ اب پھر وہی زمانہ ہے اور ربُوبیّت کا وقت آیا ہے۔ نادان مخالف چاہتے ہیں کہ بچّہ کو الگ کر دیں، مگر خدا کی ربُوبیّت نہیں چاہتی۔ بارش کی طرح اس کی رحمت برس رہی ہے۔ یہ مولوی حامئ دین کہلانے والے مخالفت کر کے چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نُور کو بُجھا دیں۔ مگر یہ نُور پورا ہو کر رہے گا۔ اسی طرح پر جس طرح پر اللہ نے چاہا ہے۔ یہ خوش ہوتے ہیں اور تسلیم کر لیتے ہیں۔ جب پادری اُٹھ اُٹھ کر کہتے ہیں کہ تمھارا نبی مر گیا اور زندہ نبی مسیح ہی ہے اور مسِ شیطان سے مسیح ہی بچا ہوا ہے۔ اور مسیح نے مُردوں کو زندہ کیا۔ یہ بھی تائید کر کے کہہ دیتے ہیں کہ ہاں چڑیاں بھی بنایا کرتے تھے۔ ایک شخص

موقعہ میرے پاس آیا۔ مَیں نے اُس سے پُوچھا کہ مسیح جو چڑیاں بنایا کرتے تھے۔ اب تو وہ بہت ہوگئی ہوں گی۔ کیا فرق کر سکتے ہو؟ اس نے کہا۔ ہاں مِل جُل گئی ہیں۔ اس طرح پر ان لوگوں نے مسیح کو نصف خدائی کا دعویدار بنادیا ہے۔ ایسا ہی اُنھوں نے دجّال کی نسبت مان رکھا ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کرے گا۔ اور یہ کرے گا اور وہ کرے گا۔ افسوس قرآن تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تلوار سے تمام ان باطل معبُودوں کو قتل کرتا ہے، جن میں خدائی صفات مانی جائیں پھر یہ دجّال کہاں سے نِکل آیا۔ سورۂ فاتحہ میں یہودی اور عیسائی بننے سے بچنے کی دُعا تو سکھلائی۔ کیا دجّال کا ذکر خدا کو یاد نہ رہا تھا۔ جو اتنا بڑا فتنہ تھا؟ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کی عقل ماری گئی اور یہ اس کے مصداق ہیں۔ یکے برسرِ شاخ و بُن مے برید۔

یہ لوگ جب اس طرح سے اسلام کو ذلیل کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے موافق کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) قرآن شریف کی عظمت کو قائم کرنے کے لیے چودھویں صدی کے سر پر مجھے بھیجا۔

کیا نہیں دیکھتے کہ کس طرح پر اس کے نشانات ظاہر ہو رہے ہیں۔ خسُوف وکسُوف رمضان میں ہوگیا۔ کیا ہو سکتا ہے کہ مہدی موجود نہ ہو اور یہ مہدی کا نشان پورا ہو جاوے۔ کیا خدا کو دھوکا لگا ہے؟ پھر اُونٹ بیکار ہونے پر بھی مسیح نہ آیا۔ آسمان اور زمین کے نشان پُورے ہو گئے۔ زمانہ کی حالت خود تقاضا کرتی ہے کہ آنے والا آوے۔ اگر یہ تکذیب ہی کرتے ہیں۔ آنے والا آ گیا۔ اُن کی تکذیب اور شور و بکا سے کچھ نہ بگڑے گا۔ ان لوگوں کی ہمیشہ سے اسی طرح کی عادت رہی ہے۔ خدا کی باتیں سچّی ہیں اور وُہ پُوری ہو کر رہتی ہیں۔

پس تم ان بدصُحبتوں سے بچتے رہو اور دُعاؤں میں لگے رہو اور اسلام کی حقیقت اپنے اندر پیدا کرو۔[1]

دسمبر ۱۹۰۰ء

حوّا کی پیدائش

فرمایا: "حوّا پسلی ہی سے بنائی گئی ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان لاتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی کہے کہ پھر ہماری پسلی نہ ہوتی۔ تو مَیں کہتا ہوں کہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے اُوپر قیاس نہ کرو۔ مَیں اگر خدا تعالیٰ کو قادر اور عظیم الشان نہ دیکھتا تو یہ دُعاؤں کی قبولیت کے نمونے جو دیکھتا ہوں، نظر نہ آتے۔ دیکھو کپتان ڈگلس کے سامنے جو مقدمہ تھا اس میں کس کا

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳ صفحہ ۱-۵ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء

تصرف تھا۔ڈاکٹر کلارک جیسا آدمی جو مذہبی حیثیت سے ایک اثر ڈالنے والا آدمی تھا۔پھر اُس کے ساتھ آریوں کی طرف سے پنڈت رام بھجدت وکیل شریک ہوا اور مولوی محمد حسین جیسا دشمن بطور گواہ پیش ہوا۔اور خود عبدالحمید کا یہ بیان کہ مجھے قتل کے لیے ضرور بھیجا تھا اور پھر اس کا یہ بیان اُمرت سر میں ہوا۔ڈپٹی کمشنر کے سامنے بھی اس نے یہی کہا۔ اب یہ کس کا کام تھا کہ اس نے کپتان ڈگلس کے دل میں ڈالا کہ عبدالحمید کے بیان پر شبہ کرے اور اصل حقیقت کے معلوم کرنے کے واسطے اسے دوبارہ پولیس کے سپرد کرے۔غرض جو کچھ اس مقدمہ میں ہوا،اس سے صاف طور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے تصرّف کا پتہ لگتا ہے۔میرا مطلب اس مقدمہ کے بیان سے صرف یہ ہے کہ یہ بڑی نادانی اور گُناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اسی پیمانہ سے ناپیں۔جس سے ایک عاجز انسان زید بکر کو ناپا جائے۔

پس یہ کہنا کہ آدمؑ کی پسلی نکال لی تھی اور حوّا اس پسلی سے بنی تو پھر پسلی کہاں سے آگئی۔سخت بے وقوفی اور اللہ تعالیٰ کے حضور سُوء ادبی ہے۔

یاد رکھو۔یُورپی فلسفہ ضلالت سے بھرا ہوا ہے۔یہ انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ایسا ہی یہ کہنا کہ انسان پر کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ اُسے مٹی سے پیدا کیا ہو دُرست نہیں ہے۔نوعی قدم کا میں ہرگز ہرگز قائل نہیں ہوں۔ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے۔کئی بار دُنیا معدوم ہوئی اور پھر از سرِ نو پیدا کر دی۔یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جبکہ ایک مرجاتا ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ ایک وقت آوے کہ سب مرجاویں۔قیامتِ کبریٰ کے تو ہندو اور یونانی بھی قائل ہیں۔جو لوگ اللہ تعالیٰ کو محدود القویٰ ہستی سمجھتے ہیں۔وہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (الحج: ۷۵) میں داخل ہیں جو ایک حد تک ہی خدا کو مانتے ہیں۔یہ نیچریّت کا شعبہ ہے۔

قرآن کریم تو صاف بتلاتا ہے اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (هود: ۱۰۸) اور اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (يٰسٓ: ۸۳) اللہ تعالیٰ کی ان ہی قدرتوں اور فوق الفوق طاقتوں نے میرے دل میں دُعا کے لیے ایک جوش ڈال رکھا ہے۔

قبولیتِ دُعا کا فلسفہ

دُعا بڑی چیز ہے! افسوس! لوگ نہیں سمجھتے کہ وُہ کیا ہے۔بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر دُعا جس طرز اور حالت پر مانگی جاوے،ضرور قبول ہو جانی چاہیے۔اس لیے جب وُہ کوئی دُعا مانگتے ہیں اور پھر وُہ اپنے دل میں جمائی ہوئی صُورت کے مطابق اس کو پُورا ہوتا نہیں دیکھتے،تو مایُوس اور نا امید ہو کر اللہ تعالیٰ پر بدظن ہو جاتے ہیں،حالانکہ مومن کی یہ شان ہونی چاہیے کہ اگر بظاہر اسے اپنی دُعا میں مُراد حاصل نہ ہو،تب بھی نا امید نہ ہو۔کیونکہ رحمتِ الٰہی نے اس دُعا کو اس کے حق میں مفید نہیں قرار دیا۔دیکھو بچہ اگر ایک آگ کے انگارے کو پکڑنا چاہے تو ماں دوڑ کر اس کو پکڑے گی۔بلکہ اگر بچّہ کی اس نادانی پر ایک تھپّڑ بھی لگا دے،تو کوئی تعجّب نہیں۔اسی طرح مجھے تو ایک لذّت اور سرُور آجاتا

ہے۔ جب مَیں اس فلسفۂ دُعا پر غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ علیم و خبیر خدا جانتا ہے کہ کونسی دُعا مفید ہے۔

آدابِ دُعا

مجھے بارہا افسوس آتا ہے۔ جب لوگ دُعا کے لیے خطوط بھیجتے ہیں اور ساتھ ہی لکھ دیتے ہیں کہ اگر ہمارے لیے یہ دُعا قبول نہ ہوئی تو ہم جھوٹا سمجھ لیں گے۔ آہ! یہ لوگ آدابِ دُعا سے کیسے بے خبر ہیں۔ نہیں جانتے کہ دُعا کرنے والے اور کرانے والے کے لیے کیسی شرائط ہیں۔ اس سے پہلے کہ دعا کی جائے یہ بدظنی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے ماننے کا احسان جتانا چاہتے ہیں اور نہ ماننے اور تکذیب کی دھمکی دیتے ہیں۔ ایسا خط پڑھ کر مجھے بدبُو آجاتی ہے اور مجھے خیال آجاتا ہے کہ اس سے بہتر تھا کہ یہ دُعا کے لیے خط ہی نہ لکھتا۔

مَیں نے کئی بار اس مسئلہ کو بیان کیا ہے اور پھر مختصر طور پر سمجھاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے دوستانہ معاملہ کرنا چاہتا ہے۔ دوستوں میں ایک سلسلہ تبادلہ کا رہتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں میں بھی اسی رنگ کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبادلہ یہ ہے کہ جیسے وُہ اپنے بندے کی ہزارہا دُعاؤں کو سُنتا اور مانتا ہے۔ اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ باوجودیکہ وُہ ایک ذلیل سے ذلیل ہستی ہے لیکن اس پر فضل و رحم کرتا ہے۔ اسی طرح اُس کا حق ہے کہ یہ خدا کی بھی مان لے یعنی اگر کسی دُعا میں اپنے منشاء اور مُراد کے موافق ناکام رہے، تو خدا پر بدظن نہ ہو، بلکہ اپنی اس نامرادی کو کسی غلطی کا نتیجہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی رضا پر انشراحِ صدر کے ساتھ راضی ہو جاوے اور سمجھ لے کہ میرا مولیٰ یہی چاہتا ہے۔

مومنوں کی آزمائش

اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ۔۔۔

(البقرہ: ۱۵۶) خوف سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈر ہی ڈر ہے۔ انجام اچھا ہے۔ اسی سے گناہوں کا کفّارہ ہو جاتا ہے۔

پھر اَلْجُوْع فقر و فاقہ تنگ کرتا ہے۔ بعض وقت ایک کُرتا پھٹ جاوے، تو دُوسرے کی توفیق نہیں ملتی۔ جُوع کا لفظ رکھ کر عَطَش کا لفظ چھوڑ دیا ہے، کیونکہ یہ جوع میں داخل ہے۔

نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ چور لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں چھوڑتے کہ صُبح کی روٹی کھا سکیں۔ سوچو! کس قدر تکلیف اور آفت کا سامنا ہوتا ہے۔

پھر جانوں کا نقصان ہے۔ بچے مرنے لگ جاتے ہیں۔ یہانتک کہ ایک بھی نہیں رہتا۔ جانوں کے نقصان میں یہ بات داخل ہے کہ خود تو زندہ رہے اور عزیز و متعلقین مرتے جاویں، کس قدر صدمہ ایسے وقت پر ہوتا ہے ہمارا تعلق دوستوں سے اس قدر ہے کہ جس قدر دوست ہیں اور ان کے اہل و عیال ہیں۔ گویا ہمارے ہی ہیں۔

کسی عزیز کے جُدا ہونے سے اس قدر رنج ہوتا ہے کہ جیسا کسی کو اپنی عزیز سے عزیز اولاد کے مرجانے کا ہوتا ہے۔

ثمرات میں اولاد بھی داخل ہے اور محنتوں کے بعد آخر کی کامیابیاں بھی مُراد ہیں۔ اُن کے ضائع ہونے سے بھی سخت صدمہ ہوتا ہے۔ امتحان دینے والے اگر کبھی فیل ہوجاتے ہیں تو بارہا دیکھا گیا ہے کہ وہ خودکشیاں کرلیتے ہیں۔ ایّوب بیگ کی بیماری کی ترقی امتحان میں فیل ہوجانے سے ہی ہوئی۔ پہلے تو اچھا خاصا تندرست تھا۔

غرض اس قسم کے ابتلا جن پر آئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اُن کو بشارت دیتا ہے۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ یعنی ایسے موقع پر جہد کے ساتھ برداشت کرنے والوں کو خوشخبری اور بشارت ہے۔ کہ جب ان کو کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یاد رکھو کہ خدا کا خاص بندہ اور مقرّب تب ہی ہوتا ہے کہ ہر مصیبت پر خدا ہی کو مقدم رکھے۔ غرض ایک وہ حصّہ ہوتا ہے جس میں خدا اپنی منوانا چاہتا ہے۔ دُعا کے معنی تو یہی ہیں کہ انسان خواہش ظاہر کرتا ہے کہ یُوں ہو۔ پس کبھی مولیٰ کریم کی خواہش مقدم ہونی چاہیے اور کبھی اللہ کریم اپنے بندہ کی خواہش کو پورا کرتا ہے۔

دُوسرا محل معارضہ کا یہ ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) اس میں تناقض نہیں ہے۔ جب جہات مختلف ہوں، تو تناقض نہیں رہا کرتا۔ اس محل پر اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مانتا ہے۔

قبولیتِ دُعا کی شرط

یہ خوب یاد رکھو کہ انسان کی دُعا اس وقت قبول ہوتی ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے غفلت فسق و فجور کو چھوڑ دے۔ جس قدر قربِ الٰہی انسان حاصل کریگا اسی قدر قبولیتِ دُعا کے ثمرات سے حصّہ لے گا۔ اسی لیے فرمایا: وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۸۷) اور دُوسری جگہ فرمایا ہے: وَاَنّٰی لَھُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ (سبا: ۵۳) یعنی جو مجھ سے دُور ہو۔ اس کی دُعا کیونکر سُنوں۔ یہ گویا عام قانونِ قدرت کے نظارہ سے ایک سبق دیا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا سُن نہیں سکتا۔ وُہ تو دل کے مخفی در مخفی ارادوں اور اُن ارادوں سے بھی واقف ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوتے، مگر یہاں انسان کو قُربِ الٰہی کی طرف توجّہ دلائی ہے کہ جیسے دُور کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اسی طرح پر جو شخص غفلت اور فسق و فجور میں مبتلا رہ کر مجھ سے دُور ہوتا جاتا ہے۔ جس قدر وُہ دُور ہوتا ہے اسی قدر حجاب اور فاصلہ اس کی دُعاؤں کی قبولیت میں ہوتا جاتا ہے کیا سچ کہا ہے ؎

پیدا است ندا را کہ بلند ہست جنابت

جیسے مَیں نے ابھی کہا گو خدا عالم الغیب ہے، لیکن یہ قانونِ قدرت ہے کہ تقویٰ کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔

نوافل کی حقیقت

نادان انسان بعض وقت عدمِ قبولِ دُعا سے مُرتد ہو جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے کہ نوافل سے مومن میرا مقرب ہو جاتا ہے۔

ایک فرائض ہوتے ہیں، دُوسرے نوافل۔ یعنی ایک تو وہ احکام ہیں جو بطورِ حقِ واجب کے ہیں اور نوافل وہ ہیں جو زائد از فرائض ہیں اور وہ اس لیے ہیں کہ تا فرائض میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو، تو نوافل سے پوری ہو جاوے۔ لوگوں نے نوافل صرف نماز ہی کے نوافل سمجھے ہوئے ہیں۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ہر فعل کے ساتھ نوافل ہوتے ہیں۔

انسان زکوٰۃ دیتا ہے تو کبھی زکوٰۃ کے سوا بھی دے۔ رمضان میں روزے رکھتا ہے کبھی اس کے سوا بھی رکھے۔ قرض لے تو کچھ ساتھ زائد دے۔ کیونکہ اس نے مروت کی ہے۔

نوافل متمّمِ فرائض ہوتے ہیں۔ نفل کے وقت دل میں ایک خشوع اور خوف ہوتا ہے کہ فرائض میں جو قصور ہوا ہے وُہ اب پُورا ہو جائے۔ یہی وُہ راز ہے جو نوافل کو قربِ الٰہی کے ساتھ بہت بڑا تعلق ہے گویا خشوع اور تذلّل اور انقطاع کی حالت اس میں پیدا ہوتی ہے اور اسی لیے تقرّب کی وجہ میں ایامِ بیض کے روزے۔ شوال کے چھ روزے یہ سب نوافل ہیں۔

پس یاد رکھو کہ خدا سے محبتِ تام نفل ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرماتا ہے کہ پھر مَیں ایسے مقرب اور مومن بندوں کی نظر ہو جاتا ہوں، یعنی جہاں میرا منشاء ہوتا ہے۔ وہیں اُن کی نظر پڑتی ہے۔

صادق موت کا بھروسہ نہیں رکھتا اور خدا سے غافل نہیں ہوتا۔ اُن کے کان ہو جاتا ہوں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں اللہ کی یا اس کے رسُولؐ کی یا اس کی کتاب کی تحقیر اور ذلت ہوتی ہے، وہاں سے بیزار اور ناراض ہو کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وُہ سُن نہیں سکتے اور کوئی ایسی بات جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور حُکم کے خلاف ہو نہیں سُنتے اور ایسی مجلسوں میں نہیں بیٹھتے ایسا ہی فسق و فجور کی باتوں اور سماع کے ناپاک نظاروں اور آوازوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ نامحرم کی آواز سُن کر بُرے خیالات کا پیدا ہونا زناء الاذن ہے۔ اسی لیے اسلام نے پردہ کی رسم رکھی ہے۔

مسیحؑ کا یہ کہنا کہ زنا کی نظر سے نہ دیکھ۔ کوئی کامل تعلیم نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں کامل تعلیم یہ ہے جو مبادیٔ گناہ سے بچاتی ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النّور : ۳۱) یعنی کسی نظر سے بھی نہ دیکھیں کیونکہ دل اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ کیسی کامل تعلیم ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ کہ ہو جاتا ہوں اُس کے ہاتھ۔ بعض وقت انسان ہاتھوں سے بہت بے رحمی کرتا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔ کہ مومن کے ہاتھ بے جا طور پر اعتدال سے نہیں بڑھتے۔ وُہ نامحرم کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ پھر فرماتا ہے کہ اُس

کی زبان ہو جاتا ہوں۔ اسی پر اشارہ ہے مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی (النجم : ۴) اسی لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا، وُہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تھا اور آپ کے ہاتھ کے لیے فرمایا مَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ (الانفال : ۱۸) غرض نفل کے ذریعہ انسان بہت بڑا درجہ اور قُرب حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وُہ اولیاء اللہ کے زُمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر من عادیٰ ولیًّا فقد بارزتہ بالحرب۔ جو میرے ولی کا دشمن ہو، مَیں اس کو کہتا ہوں کہ اب میری لڑائی کے لیے تیار ہو جا۔ حدیث میں آیا ہے کہ خدا شیرنی کی طرح جس کا کوئی بچہ اُٹھائے جاوے۔ اس پر جھپٹتا ہے۔

غرض انسان کو چاہیے کہ وُہ اس مقام کے حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ سعی کرتا رہے۔ موت کا کوئی وقت معلوم نہیں ہے کہ کب آجاوے۔ مومن کو مناسب ہے کہ وہ کبھی غافل نہ ہو اور خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔[1]"

۱۹۰۰ئہ

کامل یقین والوں کو شیطان چھُو نہیں سکتا

قاضی محمد عالم صاحب سکنہ قاضی کوٹ نے اپنی بیماری کے ایام میں قاضی ضیاء الدین صاحب سکنہ قاضی کوٹ کو جو قادیان میں تھے حضرت اقدسؑ کی خدمت میں دُعا کے لیے عرض کرنے کو لکھا۔ جس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا :

"مَیں ضرور دُعا کروں گا۔ آپ محمد عالم کو تسلی دیں۔ احمد شاہ کی طرف وہم کے طور پر بھی خیال نہ لے جاویں۔ واقعی وہ کچھ بھی نہیں۔ یہ وسوسہ شرک سمجھیں۔ عوام کا بہکانا، طعن و تشنیع جتنا اثر کرے گا۔ اُسی قدر اپنے راستہ کو خالی تصور کریں۔ کامل یقین والوں کو شیطان چھُو بھی نہیں سکتا۔ میرا تو یقین ہے کہ حضرت آدمؑ کی استعداد میں کسی قدر تساہل تھا۔ تب ہی تو شیطان کو وسوسہ کا قابُو مل گیا۔ واللہ اگر اس جگہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سا جوہر قابل کھڑا کیا جاتا تو شیطان کا کچھ بھی پیش نہ جاتا۔"

زندگانی کی خواہش گُناہ کی جڑ ہے

"زندگانی کی زیادہ خواہش اکثر گناہوں کی اور کمزوریوں کی جڑھ ہے۔ ہمارے دوستوں کو لازم ہے کہ مالکِ حقیقی کی رضا میں اوقاتِ عزیز بسر کرنے کی ہر وقت کوشش کریں۔ حاصل یہی ہے؛ ورنہ آج چل دینے اور مثلاً پچاس سال کے بعد کوچ کرنے میں کیا فرق ہے۔ جو آج چاند و سُورج ہے وُہی اس دن ہوگا۔ جو انسان نافع اور اس کے

---

[1] الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴۔ صفحہ ۲-۴ مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۰ئہ

دین کا خادم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بخود اُس کی عمر اور صحت میں برکت ڈال دیتا ہے اور شر الناس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ سو آپ سب کام ہر حال خدا میں ہو کر کریں۔ خود اللہ تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے گا۔

تیس سال سے زیادہ عرصہ گزرتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ تیری عمر اسّی برس یا دو چار اُوپر یا نیچے ہوگی۔ اِس میں بھی بھید ہے کہ جو کام مجھے سپرد ہے۔ اس قدر مدت میں تمام کرنا منظور ہوگا، لہٰذا مجھے اپنی بیماری میں کبھی موت کا غم نہیں ہوا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جن درختوں کے نیچے میں چھ سات سالہ عُمر میں کھیلا کرتا تھا۔ آج بعینہٖ بعض درخت اسی طرح ہرے بھرے سرسبز کھڑے ہیں، لیکن میں اپنے حال کو کچھ اور کا اور ہی دیکھتا ہوں۔ تم بھی اس کو تصوّر کر سکتے ہو۔

یہ طعن وتشنیع معصروں کی غنیمت سمجھیں۔ اس میں اصلاحِ نفس متصوّر ہے۔ جب یہ نہ ہوں گے تو پھر خدمتِ مولیٰ کریم اور ہدیّہ قابلِ حضرتِ عزّت کیا ہوگا ؟ آپ بیماری کا فکر کرتے ہیں۔ تمھارے پہلے بھائی یعنی صحابہؓ تو بعیت ہی جان قربان کرنے کی کرتے تھے اور ہر حال منتظر رہتے تھے کہ کب وُہ وقت آتا ہے کہ اپنے مالکِ حقیقی کے راستہ میں فدا ہوں۔ غرض ہر حال کیا صحت اور کیا بیماری۔ آپ مولیٰ کریم سے معاملہ ٹھیک رکھیں۔ سب کام اچھے ہو جائیں گے[۱]

۴؍جنوری ۱۹۰۱ء

ایک الہام کا پورا ہونا حضرت امّاں جان رضی اللہ عنہا کی طبیعت ۴؍جنوری ۱۹۰۱ء کو کسی قدر ناساز ہوگئی تھی۔ اس کے متعلق حضرت اقدسؑ نے سیر کے وقت فرمایا کہ

"چند روز ہوئے میں نے اپنے گھر میں کہا کہ میں نے کشف میں دیکھا ہے کہ کوئی عورت آئی ہے اور اس نے آکر کہا ہے کہ تمھیں (حضرت امّاں جان مراد ہیں) کچھ ہوگیا ہے اور پھر الہام ہوا۔ اَصِمْ زَوْجَتِیْ چنانچہ کل ۴؍جنوری ۱۹۰۱ء کو یہ کشف اور الہام پُورا ہوگیا۔ یکایک بے ہوشی ہوگئی اور جس طرح پر مجھے دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح ایک عورت نے آکر بتا دیا۔"

صوم رمضان فرمایا: رمضان کا مہینہ مبارک مہینہ ہے۔ دُعاؤں کا مہینہ ہے۔

"نیز فرمایا " میری تو یہ حالت ہے کہ مرنے کے قریب ہو جاؤں، تب روزہ چھوڑتا ہوں۔ طبیعت روزہ چھوڑنے

---

[۱] بدر جلد ۱۲ نمبر ۲ مورخہ ۱۱؍جولائی ۱۹۱۲ء

کونہیں چاہتی۔ یہ مبارک دن ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے نزول کے دن ہیں۔"

سادگی "یاد رکھو بچوں جیسی سادگی جبتک نہ ہو، اسوقت تک انسان نبیوں کا مذہب اختیار نہیں کر سکتا ہے۔"[1]

۱۱ر جنوری ۱۹۰۱ء

زندگی کا ستون حضرت مسیح موعودؑ کی طبیعت کچھ علیل تھی۔ فرمایا:

"ہر چیز کا ستون ہوتا ہے۔ زندگی اور صحت کا ستون خدا تعالیٰ کا فضل ہے۔"[2]

۱۲ر جنوری ۱۹۰۱ء

ایک شخص نے سُنایا کہ دُور دُور سے آپ کی کتابوں کی مانگ آتی ہے۔ فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے جو ہوا چلائی ہے۔ اپنی اپنی جگہ تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔"

علمی معجزات فرمایا: "معجزہ تو علم کا ہی بڑا ہوتا ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن شریف ہی تھا جو اب تک قائم ہے۔" یہ ذکر تفسیر الفاتحہ کے لکھنے پر ہوا جو کہ حضرت صاحب (پیر مہر علیشاہ) گولڑوی وغیرہ علماء کے مقابلہ میں اشتہار دے کر لکھ رہے ہیں۔ فرمایا:

"عالم علم سے پہچانا جاتا ہے۔ ہمارے مخالفین میں دراصل کوئی عالم نہیں ہے۔ ایک بھی نہیں ہے، ورنہ کیوں مقابلہ میں عربی فصیح بلیغ تفسیر لکھ کر اپنا عالم ہونا ثابت نہیں کرتے۔ ایک آنکھوں والے کو اگر الزام دیا جاوے کہ تُو نابینا ہے تو وہ غصہ کرتا ہے۔ غیرت کھاتا ہے اور صبر نہیں کرتا۔ جبتک اپنے بینا ہونے کا ثبوت نہ دے۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ اپنا عالم ہونا اپنا علم دکھا کر ثابت کریں۔"

فرمایا: "یہ جو کہا جاتا ہے کہ بہت سے عالموں نے اس سلسلہ کی مخالفت کی ہے۔ یہ غلط ہے۔ خدا نے اپنی تحدیوں

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳ صفحہ ۵ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۱ء

[2] الحکم نمبر ۳ جلد ۵ صفحہ ۱۰ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۱ء

اور دعووں کے ساتھ علمی معجزات ہماری تائید میں دکھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ مخالفوں میں کوئی عالم نہیں ہے اور یہ بات غلط ہے کہ عالموں نے ہماری مخالفت کی۔"

۱۵؍جنوری سنہ ۱۹۰۱ء

ایک عظیم معجزہ فرمایا:

"آج رات کو الہام ہوا مَنَعَہٗ مَانِعٌ مِّنَ السَّمَآءِ - یعنی اس تفسیر نویسی میں کوئی تیرا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ خدا نے مخالفین سے سلبِ طاقت اور سلبِ علم کر لیا ہے؛ اگرچہ ضمیر واحد مذکر غائب ایک شخص مہر شاہ کی طرف ہے، لیکن خدا نے ہمیں سمجھایا ہے کہ اس شخص کے وجود میں تمام مخالفین کا وجود شامل کر کے ایک ہی کا حکم رکھا ہے۔ تاکہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور اعظم سے اعظم معجزہ ثابت ہو کہ تمام مخالفین ایک وجود یا کئی جان ایک قالب بن کر اس تفسیر کے مقابلہ میں لکھنا چاہیں تو ہرگز نہ لکھ سکیں گے۔"

فرمایا: "انسان کا کام انسان کر سکتا ہے۔ ہمارے مخالف انسان ہیں اور عالم اور مولوی کہلاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو کام ہم نے کیا، وہ نہیں کر سکتے۔ یہی ایک معجزہ ہے۔ نبی اگر ایک سونٹا پھینک دے اور کہے کہ میرے سوا کوئی اس کو اُٹھا نہ سکے گا۔ تو یہ بھی ایک معجزہ ہے؛ چہ جائیکہ تفسیر نویسی تو ایک علمی معجزہ ہے۔"

فرمایا: "یہ تفسیر رمضان شریف میں شروع ہوئی جیسا کہ قرآن شریف رمضان میں شروع ہوا تھا اور امید ہے کہ دو عیدوں کے درمیان ختم ہوگی۔ جیسا کہ شیخ سعدی نے کسی کے متعلق کہا ہے ؎

بروزِ ہمایون و سالِ سعید   بتاریخِ فرخ میانِ دو عید

فرمایا: "قرآن شریف کے معجزہ فصاحت و بلاغت کے جواب میں ایک دفعہ پادری فنڈر نے حریری اور ابوالفضل اور بعض انگریزی کتابوں کو پیش کیا تھا۔ مدّت کی بات ہے۔ ہم نے اس وقت بھی یہی سوچا تھا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو ان مصنّفین کو کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوا کہ ان کا کلام بے مثل ہے، بلکہ وہ خود اپنی کم مائیگی کا ہمیشہ اقرار کرتے رہے ہیں اور قرآن شریف کی تعریف کرتے ہیں۔ دوسرا ان لوگوں کی کتابوں میں معنیٰ الفاظ کے تابع ہو کر چلتا ہے۔ صرف الفاظ جوڑے ہوتے ہوتے ہیں۔ قافیہ کے واسطے ایک لفظ کے مقابل دُوسرا لفظ تلاش کیا جاتا ہے اور کلام میں حکمت اور معارف کا لحاظ نہیں ہوتا اور قرآن شریف میں التزام ہے حق اور حکمت کا۔ اصل میں اس بات کا نباہنا کہ حق اور حکمت کے کلمات کے ساتھ قافیہ بھی دُرست ہو۔ یہ بات تائیدِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے؛ ورنہ انسانوں کے کلام ایسے ہوتے ہیں جیسا کہ حریری وغیرہ۔"

۱۹؍جنوری ۱۹۰۱ء

استغفار کلیدِ ترقیات ہے

ایک شخص نے اپنے قرض کے متعلق دُعا کے واسطے عرض کی۔ فرمایا :

"استغفار بہت پڑھا کرو۔ انسان کے واسطے غموں سے سُبک ہونے کے واسطے یہ طریق ہے نیز استغفار کلیدِ ترقیات ہے۔"

۲۰؍جنوری ۱۹۰۱ء

قرآن شریف میں مسیح موعود اور اُس کی جماعت کا ذکر

فرمایا :"قرآن شریف میں چار سُورتیں ہیں، جو بہت پڑھی جاتی ہیں۔ اُن میں مسیح موعودؑ اور اس کی جماعت کا ذکر ہے (۱) سُورۃ فاتحہ جو ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ اس میں ہمارے دعوے کا ثبوت ہے۔ جیسا کہ اس تفسیر میں ثابت کیا جائے گا۔ (۲) سُورۃ جمعہ جس میں اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ (الجمعۃ : ۴) مسیح موعودؑ کی جماعت کے متعلق ہے۔ یہ ہر جمعہ میں پڑھی جاتی ہے (۳) سُورۃ کہف جس کے پڑھنے کے واسطے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے۔ اس کی پہلی اور پچھلی دس آیتوں میں دجال کا ذکر ہے۔ (۴) آخری سُورۃ قرآن کی جس میں دجال کا نام خنّاس رکھا گیا ہے۔ یہ وُہی لفظ ہے جو عبرانی توریت میں دجال کے واسطے آیا ہے۔ یعنی نحاش נחש۔ ایسا ہی قرآن شریف کے اور مقامات میں بھی بہت ذکر ہے۔"[1]

تفسیر سُورہ فاتحہ

تفسیر سُورۃ فاتحہ ابھی تک لکھنی شروع نہیں ہوئی اور دن تھوڑے سے رہ گئے ہیں۔ اس پر فرمایا :

"ابتک ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا لکھیں۔ تَوَکُّلًا علی اللہ اس کام کو شروع کیا گیا ہے۔ ہم موجودہ مواد پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ صرف خدا پر بھروسہ ہے کہ کوئی بات دل میں ڈالی جاتی ہے۔ یہ بات میرے اختیار میں نہیں۔ جب وُہ مواد اور حقائق جن کی تلاش میں مَیں ہوں، مجھے مِل گئے تو پھر اُن کو فصیح و بلیغ عربی میں لکھا جائے گا۔ چونکہ انسانوں کو ثواب حاصل کرنے کے واسطے فکر اُٹھانا چاہیے۔ اس واسطے ہم فکر کرتے ہیں۔ آگے جب کوئی بات خدا تعالیٰ القاء

[1] الحکم نمبر ۳ جلد ۵ صفحہ ۱۰-۱۱ مورخہ ۲۴؍جنوری ۱۹۰۱ء

کرے۔ خدا سے دُعا مانگی جاتی ہے اور میرا تجربہ ہے کہ جب خدا سے مدد مانگی جاتی ہے، تو وہ مدد دیتا ہے۔

[تفسیر سے پہلے جو تمہید حضرت مسیح موعودؑ نے لکھی ہے اس کے متعلق حضرت مولوی سیّد محمد احسن صاحب نے عرض کی کہ پیر گولڑوی تفسیر نویسی سے پہلے ایک تقریر اور مباحثہ چاہتا تھا۔ سو اس تمہید میں یہ بھی ہو گیا۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور مولوی محمد اسمٰعیلؒ شہیدؒ کا ذکر درمیان میں آیا۔]

فرمایا:

"اِن لوگوں کی نیتیں نیک تھیں، وہ چاہتے تھے کہ مُلک میں نماز اور اذان اور قربانی کی رکاوٹ جو کہ سکھوں نے کر رکھی تھی دُور ہو جائے۔ خدا نے اُن کی دُعا کو قبول کیا اور اس کی قبولیت کو سکھوں کے دفعیہ اور انگریزوں کو اس مُلک میں لانے سے کیا۔ یہ اُن کی دانائی تھی کہ اُنھوں نے انگریزوں کے ساتھ لڑائی نہیں کی، بلکہ سکھوں کو اس قابل سمجھا کہ اُن کے ساتھ جہاد کیا جاوے مگر چونکہ وہ زمانہ قریب تھا کہ مہدی موعود کے آنے سے جہاد بالکل بند ہو جائے۔ اس واسطے جہاد میں اُن کو کامیابی نہ ہوئی۔ ہاں بسبب نیک نیّت ہونے کے اُن کی خواہش اذانوں اور نمازوں کے متعلق اس طرح پُوری ہو گئی کہ اس مُلک میں انگریز آ گئے۔"

پھر فرمایا:

مسیح موعود اور مہدی کے آنے کا وقت

"وقت دو ہوتے ہیں۔ ایک خارجی اور ایک اندرونی یعنی رُوحانی۔ خارجی وقت یہ ہے کہ حضرت رسول کریمؐ اور ولیوں اور بزرگوں کے کشوف نے مسیح موعود اور مہدی کا وقت چودھویں صدی بتلایا اور اندرونی یعنی رُوحانی وقت یہ ہے کہ زمانہ کی حالت یہ بتلا رہی ہے کہ اس وقت مسیح آنا چاہیے۔ دونوں وقت اس جگہ آکر مِل گئے ہیں۔"

۲۲ر جنوری ۱۹۰۱ء

جماعتِ احمدیہ کی وجہ تسمیہ

[اس جماعت کا نام احمدی رکھا جانے پر کسی نے سُنایا کہ کوئی اعتراض کرتا تھا کہ یہ نیا نام ہے۔ اس پر کچھ گفتگو ہوئی۔] فرمایا:

"لوگوں نے جو اپنے نام حنفی شافعی وغیرہ رکھے ہیں۔ یہ سب بدعت ہیں۔ حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ہی نام تھے۔ محمدؐ اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آنحضرتؐ کا اسمِ اعظم محمدؐ ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم اللہ ہے۔ اسم اللہ دیگر کُل اسماء مثلاً حیّ، قیّوم، رحمٰن، رحیم وغیرہ کا موصوف ہے حضرت رسول کریمؐ

کا نام احمدؐ وہ ہے۔ جس کا ذکر حضرت مسیحؑ نے کیا یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ (الصّف: ۷) ۔ مِنْۢ بَعْدِی کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ وُہ نبی میرے بعد بلا فصل آئے گا۔ یعنی میرے اور اس کے درمیان اور کوئی نبی نہ ہوگا۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ الفاظ نہیں کہے، بلکہ اُنھوں نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ (سورۃ الفتح : ۳۰) میں حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب بہت سے مومنین کی معیت ہوئی جنھوں نے کفّار کے ساتھ جنگ کیے۔ حضرت موسیٰؑ نے آنحضرتؐ کا نام محمدؐ بتلایا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ خود بھی جلالی رنگ میں تھے۔ اور حضرت عیسیٰؑ نے آپؐ کا نام احمدؐ بتلایا۔ کیونکہ وہ خود بھی ہمیشہ جمالی رنگ میں تھے۔ اب چونکہ ہمارا سلسلہ بھی جمالی رنگ میں ہے۔ اس واسطے اس کا نام احمدی ہوا۔

" جمعہ حضرت آدم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے پیدا ہونے کا دن تھا اور یہی متبرک دن تھا۔ مگر پہلی اُمتوں نے غلطی کھائی۔ کسی نے شنبہ کے دن کو اختیار کیا۔ کسی نے یکشنبہ کے دن کو۔ حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل دن کو اختیار کیا۔ ایسا ہی اِسلامی فرقوں نے غلطی کھائی۔ کسی نے اپنے آپ کو حنفی کہا، کسی نے مالکی اور کسی نے شیعہ اور کسی نے سُنّی۔ مگر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف دو ہی نام تھے۔ محمدؐ اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور مسلمانوں کے دو ہی فرقے ہو سکتے ہیں۔ محمدی یا احمدی۔ محمدی اس وقت جب جلال کا اظہار ہو۔ احمدی اس وقت جب جمال کا اظہار ہو۔"[1]

استغفار اور یقین

ایک شخص نے عرض کی کہ حضور میرے لیے دُعا کریں کہ میرے اولاد ہو جاوے۔ آپؐ نے فرمایا :

"اِستغفار بہت کرو۔ اس سے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اولاد بھی دے دیتا ہے۔ یاد رکھو یقین بڑی چیز ہے۔ جو شخص یقین میں کامل ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ خود اس کی دستگیری کرتا ہے۔"

۱۲ر فروری ۱۹۰۱ء

خدا تعالیٰ پر بھروسہ

شام کے بعد فرمایا :

" ہم کو تو خدا پر اتنا بھروسہ ہے کہ ہم تو اپنے لیے دُعا بھی نہیں کرتے، کیونکہ وہ ہمارے حال کو خوب جانتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب کفّار نے آگ میں ڈالا تو فرشتوں نے آکر حضرت ابراہیمؑ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴ صفحہ ۱۱ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء

سے پُوچھا کہ آپ کو کوئی حاجت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا بَلٰی وَلٰکِنْ اِلَیْکُمْ لَا ہاں حاجت تو ہے، مگر تمہارے آگے پیش کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ فرشتوں نے کہا اچھا خدا تعالیٰ کے ہی آگے دُعا کرو، تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ عِلْمُہٗ مِنْ حَالِیْ حَسْبِیْ مِنْ سُوَالِیْ۔ وُہ میرے حال سے ایسا واقف ہے کہ مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں[1]۔"

۱۴ر فروری ۱۹۰۱ء

ابتلاء اس بات پر ذکر کرتے ہوئے کہ مومنین پر تکالیف اور ابتلا آیا کرتے ہیں۔ فرمایا ہے:

ایک شخص حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اپنی لڑکی کا آنحضرت کے ساتھ نکاح کے واسطے عرض کیا اور منجملہ اس لڑکی کی تعریف کے ایک یہ بات بھی عرض کی کہ وُہ اتنی عمر کی ہوئی ہے، مگر آجتک اِس پر کوئی بیماری وارد نہیں ہوئی۔ آنحضرت علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ جو لوگ خدا کے پیارے ہوتے ہیں۔ ان پر خدا کی طرف سے ضرور تکالیف اور ابتلاء آیا کرتے ہیں۔"

[احباب میں سے ایک کو مخالفین کی طرف سے بہت تکالیف پہنچی ہیں۔ اس نے اپنا حال عرض کیا۔ فرمایا:]

"آپ نے بہت تکالیف اُٹھائی ہیں۔ یہ بات آپ میں قابلِ تعریف ہے جس قدر ابتلاء ہوا ہے، اسی قدر انعام بھی ہوگا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔" (الم نشرح: ۷)

مخالفین سے برتاؤ بعض مخالفین جو ہمارے دوستوں کے ساتھ سختی کرتے ہیں اور ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اس کے ذکر میں اپنے دوستوں کو نرمی اور درگذر اور شرارت سے بچنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"مخالفوں کے مقابلہ میں جوش نہیں دکھانا چاہیے۔ خصوصاً جو جوان ہیں، ان کو مَیں یہ نصیحت کرتا ہوں۔ ضروری ہے کہ تم جلدی جلدی میرے پاس آؤ۔ معلوم نہیں کہ تم کتنا زمانہ میرے بعد بسر کرو گے۔ پاس رہنے میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔ انسان اگر رُو بخدا ہو، تو وُہ تفسیرِ مجسّم ہوتا ہے اور پاس رہنے میں انسان بہت سی باتیں دیکھ لیتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۶ صفحہ ۱۲ پرچہ ۱۷ر فروری ۱۹۰۱ء

اور سیکھ لیتا ہے۔

سفر کی تعریف ایک شخص کا تحریری سوال پیش ہوا کہ مجھے دس پندرہ کوس تک اِدھر اُدھر جانا پڑتا ہے۔ مَیں کس کو سفر سمجھوں اور نمازوں میں قصر کے متعلق کس بات پر عمل کروں۔ مَیں کتابوں کے مسائل نہیں پوچھتا ہوں۔ حضرت امام صادقؑ کا حکم دریافت کرتا ہوں۔ حضرت اقدس نے فرمایا :

"میرا مذہب یہ ہے کہ انسان بہت دِقتیں اپنے اُوپر نہ ڈال لے۔ عُرف میں جس کو سفر کہتے ہیں، خواہ وُہ تین کوس ہی ہو۔ اس میں قصر و سفر کے مسائل پر عمل کرے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ بعض دفعہ ہم دُو دُو تین تین میل اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، مگر کسی کے دل میں خیال نہیں آتا کہ ہم سفر میں ہیں لیکن جب انسان اپنی گٹھری اٹھا کر سفر کی نیت سے چل پڑتا ہے تو وہ مسافر ہوتا ہے۔ شریعت کی بِنا دقّت پر نہیں ہے جس کو تم عُرف میں سفر سمجھو، وُہی سفر ہے۔"

مسیح موعودؑ کی خاطر نمازیں جمع کیے جانے کی پیشگوئی اور جیسا کہ خدا کے فرائض پر عمل کیا جاتا ہے۔ ویسا ہی اُس کی رُخصتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ فرض بھی خدا کی طرف سے ہیں اور رُخصت بھی خدا کی طرف سے۔

دیکھو۔ ہم بھی رُخصتوں پر عمل کرتے ہیں۔ نمازوں کو جمع کرتے ہوئے کوئی دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ بسبب بیماری کے اور تفسیر سورۃ فاتحہ کے لکھنے میں بہت مصروفیت کے ایسا ہو رہا ہے اور ان نمازوں کے جمع کرنے میں تُجْمَعُ لَہُ الصَّلٰوۃُ کی حدیث بھی پُوری ہو رہی ہے کہ مسیح کی خاطر نمازیں جمع کی جائیں گی۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح موعود نماز کے وقت پیش امام نہ ہوگا، بلکہ کوئی اور ہوگا اور وہ پیش امام مسیح کی خاطر نمازیں جمع کرائے گا۔ سو اب ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس دن ہم زیادہ بیماری کی وجہ سے بالکل نہیں آ سکتے۔ اس دن نمازیں جمع نہیں ہوتیں اور اس حدیث کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیار کے طریق سے یہ فرمایا ہے کہ اُس کی خاطر ایسا ہوگا۔ چاہیے کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کی عزت و تکریم کریں اور ان سے بے پرواہ نہ ہو دیں ؛ ورنہ یہ ایک گناہِ کبیرہ ہوگا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کو خفّت کی نگاہ سے دیکھیں۔ خدا تعالیٰ نے ایسے ہی اسباب پیدا کر دیئے کہ اتنے عرصے نمازیں جمع ہو رہی ہیں ؛ ورنہ ایک دو دن کے لیے یہ بات ہوتی، تو کوئی نشان نہ ہوتا۔ ہم حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لفظ لفظ اور حرف حرف کی تعظیم کرتے ہیں۔"

تفسیر سورۃ فاتحہ میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلّم کے فضائل و محامد تفسیر سُورۃ فاتحہ کے ذکر میں فرمایا :

"کہ اس کتاب میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور محامد اس قدر بیان ہونے شروع ہوگئے ہیں کہ ختم کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اگر دن پورے نہ ہوتے۔ تو میں چاہتا نہ تھا کہ بند کروں۔"

ترقیات غیر متناہی ہیں

فرمایا: "بہشت میں بھی مومنوں کے لیے ترقیات ہوتی ہیں اور ترقیات انبیاء کے لیے بھی ہیں؛ ورنہ دُرود شریف کیوں پڑھا جاتا ہے۔ ہمارا مذہب ہے کہ ترقیات غیر متناہی ہیں۔"

صفاتِ جمالیہ

فرمایا: "سارے قرآن شریف کا خلاصہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے اور اللہ تعالیٰ کی اصل صفات بھی جمالی ہیں اور اصل نام خدا بھی جمالی ہے۔ یہ تو کفار لوگ اپنی ہی کرتوتوں سے ایسے سامان بہم پہنچاتے ہیں کہ بعض وقت جلالی رنگ دکھانا پڑتا ہے۔ اس وقت چونکہ اس کی ضرورت نہیں اس واسطے ہم جمالی رنگ میں آئے ہیں۔"

ملکہ معظمہ کے متعلق یادگاروں کے قائم کرنے کا ذکر درمیان آیا۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا: کہ

"ہماری رائے میں ایک بڑا بھاری کالج یا شفاخانہ بننا چاہیے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم کارنامہ

فرمایا: "مسیحؑ کو تو لوگ اتنی لمبی عمر دینے کے واسطے بے فائدہ سعی کرتے ہیں۔ اُن کی تھوڑی سی عمر نے کیا نتیجہ پیدا کیا ہے، جو بڑی عمر کی خواہش کی جاوے۔ دُنیا صلیب پرستی سے بھر گئی ہے اور جابجا شرک پھیل گیا ہے۔ ہاں اگر اتنی عمر کا پانا کسی کے واسطے ممکن ہوتا، تو حضرت رسول کریمؐ اس کے مستحق تھے۔ جنھوں نے تھوڑی سی عمر میں ایک دُنیا موحدین سے بھر دی اور اُن کے دل میں خدا کی محبت کا سچا جوش بھر دیا۔"[1]

۱۵؍ فروری ۱۹۰۱ء

کرکٹ جو قیامت تک کھیلی جائے گی

قادیان کے مدرسہ تعلیم الاسلام کے لڑکوں کا گیند بلا کھیلنے میں میچ تھا۔ بعض بزرگ بھی بچوں کی خوشی بڑھانے

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۶ صفحہ ۱۳-۱۴ پرچہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء

کے واسطے فیلڈ میں تشریف لے گئے۔ حضرت اقدسؑ کے ایک صاحبزادہ نے بچپن کی سادگی میں آپؑ کو کہا کہ ابا تم کیوں کرکٹ پر نہیں گئے۔ آپؑ اس وقت تفسیرِ فاتحہ لکھنے میں مصروف تھے۔ فرمایا:

"وُہ تو کھیل کر واپس آجائیں گے، مگر مَیں وُہ کرکٹ کھیل رہا ہوں جو قیامت تک قائم رہے گا۔"[1]

۱۶؍فروری ۱۹۰۱ء

فاتحہ خلف الامام

اس بات کا ذکر آیا کہ جو شخص جماعت کے اندر رکوع میں آکر شامل ہو اس کی رکعت ہوتی ہے یا نہیں۔ حضرت اقدسؑ نے دُوسرے مولویوں کی رائے دریافت کی۔ مختلف اسلامی فرقوں کے مذاہب اس امر کے متعلق بیان کیے گئے۔ آخر حضرتؑ نے فیصلہ دیا اور فرمایا:

"ہمارا مذہب تو یہی ہے کہ لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ۔ آدمی امام کے پیچھے ہو یا منفرد ہو۔ ہر حالت میں اس کو چاہیے کہ سُورۃ فاتحہ پڑھے، مگر امام کو نہ چاہیے کہ جلدی جلدی سُورۃ فاتحہ پڑھے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھے تاکہ مقتدی سُن بھی لے اور اپنا پڑھ بھی لے۔ یا ہر آیت کے بعد امام اتنا ٹھہر جائے کہ مقتدی بھی اس آیت کو پڑھ لے۔ بہر حال مقتدی کو یہ موقعہ دینا چاہیے کہ وہ سُن بھی لے اور اپنا پڑھ بھی لے۔ سُورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے، کیونکہ وُہ اُمّ الکتاب ہے، لیکن جو شخص باوجود اپنی کوشش کے جو وہ نماز میں ملنے کے لیے کرتا ہے آخر رکُوع میں ہی آ کر ملا ہے اور اس سے پہلے نہیں مل سکا، تو اس کی رکعت ہوگئی؛ اگرچہ اس نے سُورۃ فاتحہ اس میں نہیں پڑھی۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس نے رکُوع کو پالیا، اس کی رکعت ہوگئی۔ مسائل دو طبقات کے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ تو حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور تاکید کی۔ نماز میں سُورۃ فاتحہ ضرور پڑھیں۔ وُہ اُمّ الکتاب ہے۔ اور اصل نماز وہی ہے، مگر جو شخص باوجود اپنی کوشش کے اور اپنی طرف سے جلدی کرنے کے رکُوع میں ہی آکر ملا ہے، تو چونکہ دین کی بناء آسانی اور نرمی پر ہے اس واسطے حضرت رسُول کریمؐ نے فرمایا کہ اس کی رکعت ہوگئی۔ وُہ سُورۃ فاتحہ کا منکر نہیں ہے بلکہ دیر میں پہنچنے کے سبب رُخصت پر عمل کرتا ہے۔ میرا دل خدا نے ایسا بنایا ہے کہ ناجائز کام میں مجھے قبض ہو جاتی ہے اور میرا جی نہیں چاہتا کہ مَیں اُسے کروں اور یہ صاف ہے کہ جب نماز میں ایک آدمی نے تین حصّوں کو پُورا پالیا اور ایک حصّہ میں بہ سبب کسی مجبوری کے دیر میں مل سکا ہے، تو کیا حرج ہے۔ انسان کو چاہیے کہ رُخصت پر عمل کرے۔ ہاں جو شخص عمداً سُستی کرتا ہے اور جماعت میں شامل

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۷ صفحہ ۱۰ پرچہ ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء

ہونے میں دیر کرتا ہے، تو اُس کی نماز ہی فاسد ہے۔[1]

۲۰؍فروری ۱۹۰۱ء

استغفار ایک شخص نے قرض کے واسطے دُعا کے لیے عرض کی۔ فرمایا :

" استغفار بہت پڑھا کرو "

عربی تفسیر کے لیے غیبی قوت تفسیر کے لکھنے کے متعلق فرمایا :

" دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اب تو ہم اس طرح جلدی جلدی لکھتے ہیں، جیسے اُردو لکھی جاتی ہے۔ بلکہ کئی دفعہ تو قلم برابر چلتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ کیا لکھ رہے ہیں۔"[2]

غیروں کے پیچھے نماز کسی نے سوال کیا کہ جو لوگ آپؑ کے مُرید نہیں، ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے آپؑ نے اپنے مُریدوں کو کیوں منع فرمایا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا :

" جن لوگوں نے جلد بازی کے ساتھ بدظنی کر کے اس سلسلہ کو جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے، ردّ کر دیا ہے اور اس قدر نشانوں کی پروا نہیں کی اور اسلام پر جو مصائب ہیں، اس سے لاپروا پڑے ہیں۔ ان لوگوں نے تقویٰ سے کام نہیں لیا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ (المائدۃ:۲۸) خدا صرف متقی لوگوں کی نماز قبول کرتا ہے۔ اس واسطے کہا گیا ہے کہ ایسے آدمی کے پیچھے نماز نہ پڑھو جس کی نماز خود قبولیت کے درجہ تک پہنچنے والی نہیں۔"

مسیح موعود کو نہ ماننے کا نتیجہ " قدیم سے بزرگانِ دین کا یہی مذہب ہے کہ جو شخص حق کی مخالفت کرتا ہے اس کا سلبِ ایمان ہو جاتا ہے۔ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے وُہ کافر ہے، مگر جو مہدی اور مسیح کو نہ مانے اس کا بھی سلبِ ایمان ہو جائے گا۔ انجام ایک ہی ہے۔ پہلے تخالف ہوتا ہے پھر اجنبیت پھر عداوت پھر غلوّ اور آخر کار سلبِ ایمان ہو جاتا ہے۔"

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر۷ صفحہ ۹ - ۱۰ پرچہ ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء

[2] الحکم جلد ۵ نمبر۷ صفحہ ۱۰ پرچہ ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء

اخیار میں خونی دشمنی کبھی نہیں ہوتی

سوال ہوا کہ ابتدا میں بھی مسلمانوں کے درمیان آپس میں عداوت اور دشمنیاں ہوتی رہی ہیں اور اختلاف رائے بھی ہوتا رہا ہے، مگر باوجود اس کے ہم کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"یہ تو شیعوں کا مذہب ہے کہ صحابہؓ کے درمیان آپس میں ایسی سخت دشمنی تھی، یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اس کی تردید فرماتا ہے کہ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ (الحجر: ۴۸) برادریوں کے درمیان آپس میں دشمنیاں ہوا کرتی ہیں۔ مگر شادی، مرگ کے وقت وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اخیار میں خونی دشمنی کبھی نہیں ہوتی۔"

منعم علیہ کون ہیں

سوال ہوا کہ جو لوگ آپ کو کافر نہیں کہتے، مگر آپ کے مُرید بھی نہیں ہیں۔ اُن کا کیا حال ہے؟ حضرت صاحب نے فرمایا:

"وہ لوگ راہ و رسم اور تعلقات کس کے ساتھ رکھتے ہیں۔ آخر ایک گروہ میں اُن کو ملنا پڑے گا جس کے ساتھ انسان اپنا تعلق رکھتا ہے اُسی میں سے وہ ہوتا ہے۔"

سوال ہوا کہ جو لوگ آپ کو نہیں مانتے وہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے نیچے ہیں یا کہ نہیں؟

حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے فرمایا کہ:

"اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں تو مَیں اپنی جماعت کو بھی شامل نہیں کر سکتا۔ جبتک کہ خدا کسی کو نہ کرے جو کلمہ گو سچے دل سے قرآن پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو بشرطیکہ سمجھایا جاوے وہ اپنا اُجر پائے گا۔ جس قدر کوئی مانے گا۔ اسی قدر ثواب پائے گا۔ جتنا اِنکار کرے گا۔ اتنی ہی تکلیف اٹھائے گا۔

مَیں قسمًا کہتا ہوں کہ مجھے لوگوں کے ساتھ کوئی عداوت نہیں جو ہمیں کافر نہیں کہتے۔ اُن کے دلوں کا خدا مالک ہے، مگر حضرت مسیحؑ کا خالق اور حیّ ماننا بھی تو ایک شرک ہے۔ اگر وہ کہیں کہ خدا کے اِذن سے کرتا تھا، تو ہم کہتے ہیں کو وُہ اِذن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہ دیا گیا۔ جو خُدا کے ولی کے ساتھ دشمنی کرتا ہے خدا اس کے ساتھ جنگ کرتا ہے جس کے ساتھ خدا جنگ کرے اس کا ایمان کہاں رہا[1]۔"

ایک الہام

۲۳ر فروری ۱۹۰۱ء ۔ حضرت اقدسؑ کو الہام ہوا۔ کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ۔

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ صفحہ ۸ پرچہ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۱ء

تفسیر اعجاز المسیح کی اعجازی شان

تفسیر اعجاز المسیح کے متعلق یہ ذکر تھا کہ مخالفین میں سے کسی کو خدا نے یہ طاقت نہیں دی کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ اس پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا :

" قرآن شریف کے ایک معجزہ ہونے کے متعلق دو مذہب ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ نے مخالفین سے صَرفِ ہمت کر دیا۔ یعنی اُن لوگوں کو توفیق نہ ہوئی کہ اس وقت مقابلہ میں کچھ کر کے دکھلاتے اور دُوسرا مذہب جو کہ صحیح اور سچا اور پکا مذہب ہے اور ہمارا بھی وہی مذہب ہے۔ وہ یہ ہے کہ مخالف خود اس بات میں عاجز تھے کہ مقابلہ کر سکتے۔ اصل میں ان کے علم اور عقل چھینے گئے تھے۔ قرآن شریف کا معجزہ ہماری تفسیر القرآن کے معاملہ سے خوب سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ہزاروں مخالف موجود ہیں جو عالم فاضل کہلاتے ہیں۔ کئی غیرت دلانے والے الفاظ بھی اشتہار میں لکھے گئے، مگر کوئی ایسا نہ کر سکا کہ اس نشان کا مقابلہ کرتا۔"[1]

۲۴ر فروری ۱۹۰۱ء

صحیح بخاری اور مُسلم کی عظمت

صحیح بخاری کے متعلق فرمایا :

" یہی ایک کتاب ہے جو دُنیا کی تمام کتابوں میں سے قرآن شریف کے بہت مطابق اور سب سے افضل اور صحیح ہے۔ اُس کی دُوسری بہن گویا مُسلم ہے۔"

مسیح موعودؑ کی ایک جُزئی فضیلت

آیت کریمہ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ : ۵۱) پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا :

" اس عطا میں زیادہ تر دُو قسم کے آدمی ہیں۔ ایک بادشاہ، دُوسرے مامُور من اللہ۔ یعنی پہلے خدا نے ان کو مامُور بنایا ثُمَّ هَدٰی یعنی پھر تبلیغ کے تمام سامان اُن کے لیے مہیا کر دیتے، جیسا کہ خدا نے ریل، تار، ڈاک، مطبع وغیرہ تمام اسباب ہمارے واسطے مہیا کر دیتے جو پہلے انبیاء علیہم السلام کو حاصل نہ تھے۔ ہمارے واسطے یہ ایک جُزئی فضیلت ہے اور خدا کا فضل ہے اور جُزئی فضیلت سے کسر شان کسی نبی کی لازم نہیں آتی۔"

اہل اللہ کا حال

فرمایا :

" تفسیر کا کام تو ختم ہو گیا اور ہم چاہتے تھے کہ دُوسرے ضروری کاموں کے شروع

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۸ صفحہ ۱۲ پرچہ ۳ر مارچ ۱۹۰۱ء

کرنے سے پہلے دو تین دن آرام کر لیتے، مگر جی نہیں چاہتا کہ خالی بیٹھے رہیں۔ مثنوی مولانا رُوم میں لکھا ہے کہ ایک بیماری ہوتی ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ اس کو ہر وقت کوئی مُکیاں مارتا رہے۔ ایسا ہی اہل اللہ کا حال ہوتا ہے کہ وُہ آرام نہیں کر سکتے۔ کبھی خدا ان پر محنت نازل کرتا ہے اور کبھی وُہ آپ کوئی ایسا کام چھیڑ بیٹھتے ہیں جس سے ان پر محنت نازل ہو۔

نہایت درجہ برکت کی بات یہ ہے کہ انسان خدا کے واسطے کسی کام میں لگا ہے جو دن بغیر کسی کام کے گزر جاتے وُہ گویا غم میں گزرتا ہے۔ اس سے زیادہ دُنیا میں کچھ حاصل نہیں کہ انسان خدا کے واسطے کام کرے اور خدا اس کے واسطے راستہ کھول دے اور اُسے مدد عطا فرمائے۔ مگر بغیر اخلاص کے تمام محنت بے فائدہ ہے۔ خالصۃً للہ کام کرنا چاہیے۔ کوئی اور غرض درمیان میں نہ آوے[1]۔"

۲۵؍فروری ۱۹۰۱ء

جماعت کو اہم نصیحت اپنی جماعت کے لوگوں کو باہم محبت کرنے اور رُوحانی کمزوریوں کے سامنے نرمی کا برتاؤ کرنے کا حکم کرتے ہوئے اور اُس دردِ دل کا اظہار کرتے ہوئے جو کہ آپ کو اپنی جماعت کی بہتری کے واسطے ہے فرمایا:

"مَیں اپنی جماعت کے لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وُہ اپنے میں سے کمزور اور "کچے" لوگوں پر رحم کریں۔ اُن کی کمزوری کو دُور کرنے کی کوشش کریں۔ اُن پر سختی نہ کریں اور کسی کے ساتھ بداخلاقی سے پیش نہ آئیں، بلکہ اُن کو سمجھائیں۔ دیکھو صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی بعض منافق آکر مل جاتے تھے۔ پر حضرت رسُول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے، چنانچہ عبداللہ ابنِ اُبی جس نے کہا تھا کہ غالب لوگ ذلیل لوگوں کو یہاں سے نکال دیں گے؛ چنانچہ سورۃ منافقون میں درج ہے اور اس سے مُراد اس کی یہ تھی کہ کفّار مُسلمانوں کو نکال دیں گے۔ اس کے مرنے پر حضرت رسُول کریمؐ نے اپنا کُرتہ اس کے لیے دیا تھا۔

مَیں نے یہ عہد کیا ہوا ہے کہ مَیں دُعا کے ساتھ اپنی جماعت کی مدد کروں۔ دُعا کے بغیر کام نہیں چلتا۔ دیکھو صحابہؓ کے درمیان بھی جو لوگ دُعا کے زمانہ کے تھے، یعنی مکّی زندگی کے۔ جیسی اُن کی شان تھی ویسی دُوسروں کی نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ جب ایمان لائے تھے، تو اُنھوں نے کیا دیکھا تھا۔ اُنھوں نے کوئی نشان نہ دیکھا تھا، لیکن وُہ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۸ صفحہ ۱۲ پرچہ ۳ مارچ ۱۹۰۱ء

حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور اندرونی حالات کے واقف تھے۔ اس واسطے نبوت کا دعویٰ سُنتے ہی ایمان لے آئے۔ اسی طرح میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے دوست اکثر یہاں آیا کریں اور رہا کریں۔ گہرا دوست اور پُورا واقف بن جانے سے انسان بہت فائدہ اُٹھاتا ہے۔ معجزات اور نشانات سے ایسا فائدہ نہیں ہوتا۔ معجزات سے فرعون کو کیا فائدہ ہوا۔ معجزات کے ہزاروں مُنکر ہوتے ہیں۔ اخلاق کا کوئی منکر نہیں۔ طالب ہو کر اصلی اور جگری حالات کو دریافت کرنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ

آریہ لوگوں نے حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قدر اعتراض کیے ہیں، لیکن ان لوگوں کو آپؐ کے اصلی حالات اور اخلاقِ کریمہ کے صحیح جُزو مِل جاتے تو یہ کبھی ایسی جرأت نہ کرتے۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کے دو پہلو دکھلائے۔ ایک مکّی زندگی میں جبکہ آپؐ کے ساتھ صرف چند آدمی تھے اور کچھ قوت نہ تھی۔ دُوسرا مدنی زندگی میں جبکہ آپؐ فاتح ہوئے اور وہی کفّار جو آپؐ کو تکلیف دیتے تھے اور آپؐ اُن کی ایذا دہی پر صبر کرتے تھے۔ اب آپؐ کے قابُو میں آگئے ایسا کہ جو چاہتے آپؐ ان کو سزا دے سکتے تھے، مگر آپؐ نے لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کہہ کر اُن کو چھوڑ دیا اور کچھ سزا نہ دی ہمیں حضرت مسیحؑ پر ایمان ہے اور ان کے ساتھ محبت ہے۔ مگر یہ کہنے میں ہم لاچار ہیں کہ اُن کو اپنے مخالفین پر قدرت اور طاقت نہیں ہوئی۔ اور ان کو یہ موقع نہیں مِلا کہ دشمن پر قابُو پاکر پھر اپنے اخلاق کا اظہار کریں۔ اور اگر ان کو یہ موقع مِلتا، تو معلوم نہیں وُہ کیا کرتے۔ سچّا مُسلمان وُہ ہے کہ دُوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آوے۔

مَیں دو باتوں کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ ایک یہ کہ اپنی جماعت کے واسطے دُعا کروں۔ دُعا تو ہمیشہ کی جاتی ہے، مگر ایک نہایت جوش کی دُعا جس کا موقعہ کبھی مجھے مِل جائے۔ اور دوم یہ کہ قرآن شریف کا ایک خلاصہ ان کو لکھ دُوں۔

قرآن کریم کا اعجاز

قرآن شریف میں سب کچھ ہے، مگر جب تک بصیرت نہ ہو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن شریف کو پڑھنے والا جب ایک سال سے دُوسرے سال میں ترقی کرتا ہے، تو وُہ اپنے گذشتہ سال کو ایسا معلوم کرتا ہے کہ گویا وہ تب ایک طفلِ مکتب تھا کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں ترقی بھی ایسی ہے۔ جن لوگوں نے قرآن شریف کو ذوالوجوہ کہا ہے۔ مَیں اُن کو پسند نہیں کرتا۔ اُنھوں نے قرآن شریف کی عزت نہیں کی۔

قرآن شریف کو ذوالمعارف کہنا چاہیے۔ ہر مقام میں سے کئی معارف نکلتے ہیں۔ اور ایک نکتہ دُوسرے نکتہ کا نقیض نہیں ہوتا، مگر زُود رنج، کینہ پرور اور غصّہ والی طبائع کے ساتھ قرآن شریف کی مناسبت

نہیں ہے اور نہ ایسوں پر قرآن شریف کھلتا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس قسم کی تفسیر بنا دوں۔ نرا فہم اور اعتقاد نجات کے واسطے کافی نہیں۔ جب تک کہ وہ عملی طور پر ظہور میں نہ آوے۔ عمل کے سوا کوئی قول جان نہیں رکھتا۔ قرآن شریف پر ایسا ایمان ہونا چاہیے کہ یہ درحقیقت معجزہ ہے اور خدا کے ساتھ ایسا تعلق ہو کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے۔ جب تک لوگوں میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے، گویا جماعت نہیں بنی۔ اگر کسی سے ایسی غلطی ہو کہ وہ صرف ایک غلط خیال کی وجہ سے ایک امر میں ہماری مخالفت کرتا ہے، تو ہم ایسے نہیں ہیں کہ ہم اس پر ناراض ہو جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کمزوروں پر رحم کرنا چاہیے۔ ایک بچہ اگر بستر پر پاخانہ پھر دے اور ماں غصہ میں آکر اس کو پھینک دے، تو وہ خون کرتی ہے۔ ماں اگر بچہ کے ساتھ ناراض ہونے لگے اور ہر روز اس سے روٹھنے لگے۔ تو کام کب بنے۔ وہ جانتی ہے کہ یہ ہنوز نادان ہے۔ رفتہ رفتہ خدا اس کو عقل دے گا اور کوئی وقت آتا ہے کہ یہ سمجھ لے گا کہ ایسا کرنا نامناسب ہے۔ سو ہم ناراض کیوں ہوں۔ اگر ہم کذب پر ہیں، تو خود ہمارا کذب ہمیں ہلاک کرنے کے واسطے کافی ہے۔ ہم اس راہ پر قدم مارنے والے سب سے پہلے نہیں ہیں، جو ہم گھبرا جائیں کہ شاید حق والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سنت اللہ کیا ہے۔ سرورِ انبیاء پر کروڑوں اعتراض ہوئے۔ ہم پر تو اتنے ابھی نہیں ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ جنگِ اُحد میں آپ کو ۷۰ تلواریں لگی تھیں۔ صدق کا بیج ضائع نہیں ہوتا۔ ابوبکری طبیعت تو کوئی ہوتی ہے کہ فوراً مان لے۔ طبائع مختلف ہوتی ہیں، مگر نشان کے ساتھ کوئی ہدایت نہیں پا سکتا۔ سکینتِ باطنی آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ تصرفاتِ باطنی یک دفعہ تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر انسان ہدایت پاتا ہے۔ ہدایت اَمرِ ربّی ہے۔ اِس میں کسی کو دخل نہیں۔ میرے قابو میں ہو تو میں سب کو قطب اور ابدال بنا دوں۔ مگر یہ اَمر محض خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ہاں دُعا کی جاتی ہے۔

صُلح کی دعوت

ہم تیار ہیں کہ ہمارے مخالف ہمارے ساتھ صُلح کر لیں۔ میرے پاس ایک تھیلا اُن گالیوں سے بھرے ہوئے کاغذات کا پڑا ہے۔ ایک نیا کاغذ آیا تھا۔ وُہ بھی آج میں نے اس میں داخل کر دیا ہے۔ مگر ان سب کو ہم جانے دیتے ہیں۔ اپنی جماعت کے ساتھ اگرچہ میری ہمدردی خاص ہے۔ مگر میں سب کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں اور مخالفین کے ساتھ بھی میری ہمدردی ہے۔ جیسا کہ ایک حکیم تریاق کا پیالہ مریض کو دیتا ہے کہ وہ شفا پاوے، اگر مریض غصہ میں آکر اس پیالہ کو توڑ دیتا ہے۔ تو حکیم اس پر افسوس کرتا ہے اور رحم کرتا ہے۔ ہمارے قلم سے مخالف کے حق میں جو کچھ الفاظ سخت نکلتے ہیں۔ وہ محض نیک نیتی سے نکلتے ہیں۔ جیسے ماں بچہ کو کبھی سخت الفاظ بولتی ہے، مگر اس کا دِل دَرد سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ صادق اور کاذب کا معاملہ خدا کے نزدیک ایک نہیں ہوتا۔ خدا جس کو محبت کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس کے ساتھ اور دُوسروں کے ساتھ اس کا ایک سلوک نہیں ہوتا۔ کیا سب کے ساتھ اس کا معاملہ ایک ہی

رنگ کا ہے۔

مخالفین ہم سے صُلح کرلیں۔ ملنا جلنا شروع کر دیں۔ بے شک اپنے اعتقاد پر رہیں۔ ملاقات سے اصل حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ امرتسر کے بعض مخالف سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کے منکر ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ ایسی بدظنی کا سبب یہی ہے کہ وہ ہم سے بالکل الگ ہوگئے ہیں۔ اس قسم کا انقطاع تو کمزور لوگ کرتے ہیں کہ بالکل الگ ہو جائیں۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی۔ تم ہم سے ڈرتے کیوں ہو۔ اگر ہم حقیر ہیں تو تم ہم پر غالب آ جاؤ گے۔ اگر صُلح بھی نہیں کرتے، تو پھر مقابلہ میں آنا چاہیے۔ مقابلہ کے وقت خدا صادق کی مدد کرتا ہے۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ۔ (مجادلہ : ۲۲)

۲۶؍فروری ۱۹۰۱ء — امام مہدی کی شان

اُمتِ محمدیہ میں پیغمبروں کا ظلّی سلسلہ

فرمایا:" اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دُعا سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ظلّی سلسلہ پیغمبروں کا اس اُمت میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ مگر جیسا کہ قرآن کریم میں سارے انبیاء کا ذکر نہیں اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کثرت سے ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اُمت میں بھی مثیلِ موسیٰؑ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مثیلِ عیسیٰ یعنی امام مہدی سب سے عظیم الشان اور خاص ذکر کے قابل ہیں۔"[1]

۲۸؍فروری ۱۹۰۱ء

انبیاء سے اجتہادی غلطی کا صدور

فرمایا:

"اجتہادی غلطی سب نبیوں سے ہوا کرتی ہے اور اس میں سب ہمارے شریک ہیں اور یہ ضرور ہے کہ ایسا ہوتا تاکہ بشر خدا نہ ہو جائے۔ دیکھو حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بھی یہ اعتراض بڑے زور شور سے یہود نے کیا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ مَیں بادشاہت لے کر آیا ہوں اور وہ بات غلط نکلی۔ ممکن ہے کہ حضرت مسیح کو یہ خیال آیا ہو کہ ہم بادشاہ بن جائیں گے (چنانچہ تلواریں بھی خرید رکھی ہوئی تھیں، مگر یہ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۹ صفحہ ۸ تا ۱۰ پرچہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۱ء

اُن کی اجتہادی غلطی تھی۔ بعد اس کے خدا نے مطلع کر دیا اور اُنھوں نے اقرار کیا کہ میری بادشاہت رُوحانی ہے۔ سادگی انسان کا فخر ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے جو کہا سو سادگی سے کہا۔ اس سے ان کی خِفّت اور بے عزّتی نہیں ہوتی۔ ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے یہ سمجھا تھا۔ کہ ہجرت یمامہ کی طرف ہوگی۔ مگر ہجرت مدینہ طیبہ کی طرف ہوتی اور انگوروں کے متعلق آپؐ نے یہ سمجھا تھا کہ ابوجہل کے واسطے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عکرمہ کے واسطے ہیں۔ انبیاءؑ کے علم میں بھی تدریجاً ترقی ہوتی ہے۔ اس واسطے قرآن شریف میں آیا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ:۱۱۵) یہ آپؐ کا کمال اور قلب کی طہارت تھی جو آپؐ اپنی غلطی کا اقرار کرتے تھے۔ اس میں انبیاءؑ کی خِفّت کچھ نہیں۔ ایک حکیم ہزاروں بیماروں کا علاج کرتا ہے۔ اگر ایک اُن میں سے مر جائے تو کیا حرج ہے اس سے اُس کی حکمت میں کچھ داغ نہیں آجاتا۔ کبھی حافظِ قرآن کو پیچھے سے لُقمہ دیا جاتا ہے، تو اس سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اب وُہ حافظ نہیں رہا۔ جو باتیں متواترات اور کثرت سے ہوتی ہیں اُن پر حکم لگایا جاتا ہے۔“

اخلاص والے کو خدا ضائع نہیں کرتا

فرمایا:

” اخلاص والے کو خدا ضائع نہیں کرتا۔ ہمارے حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس جنگل میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر خدا نے کیا کیا سامان بنا دیئے۔ ایک آدمی کا قابو کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کتنے آدمی آپؐ کے ساتھ ہوگئے تھے۔ ہمارے متعلق اللہ تعالیٰ کی وحی ہے۔ ”بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔“ آخر مُرید ہی ہوں گے تو ایسا کریں گے۔ اس زمانہ میں دیکھو لوگ کیسی بے عزّتی کرتے ہیں، مگر اس زمانہ میں جو ثواب ہے وُہ پھر نہ ہوگا۔“

یکم مارچ ۱۹۰۱ء

نماز کا اخلاص سے تعلق

فرمایا:

” نماز دُعا اور اخلاص کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ مومن کے ساتھ کینہ جمع نہیں ہوتا۔ متقی کے سِوا دُوسرے کے پیچھے نماز کو خراب نہیں کرنا چاہیئے۔“

۳؍ مارچ ۱۹۰۱ء

کمال ختم نہیں ہوتا

فرمایا:

” ختمِ ایمان یا ختمِ کمال نہیں ہوجاتا۔ خدا کی جناب میں بُخل نہیں۔ جو رنگ

ایک پر چڑھتا ہے وُہ دُوسرے پر چڑھ سکتا ہے۔ اگر نبی کی بات دوسرے میں نہ آسکے، تو اس کا وجُود بے فائدہ ہو۔ ایک صُوفی ابن حزم نے لکھا ہے کہ مَیں نے حضرت رُسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معانقہ کیا۔ یہاں تک کہ مَیں خود رُسول اللہ ہو گیا۔[1]"

مارچ سنہ ۱۹۰۱ء

ایک متلاشی حق کا حضرت اقدسؑ کی خدمت میں آنا

چند روز سے حضرت مسیح موعودؑ کی خدمت میں ایک حق جُو ضلع گجرات سے آیا ہوا ہے۔ اس نے عرض کی کہ مجھے ابتدا ہی سے دھرم بھاؤ اپنے اندر محسوس ہوتا تھا اور اُس کے موافق میں اپنے خیال میں بعض نیکیاں بھی کرتا رہا ہوں، مگر مجھے دُنیا اور اس کے طلبگاروں کو اپنے اردگرد دیکھ کر بہت بڑی تکلیف محسُوس ہوتی ہے اور اپنے اندر بھی ایک کشمکش پاتا ہوں۔ مَیں ایک بار دریائے جہلم کے کنارے کنارے پھر رہا تھا کہ مجھے ایک عجیب نظارہ پریم (محبت) کا دکھایا گیا تھا۔ جس سے مجھے ایک لذّت اور سُرور محسُوس ہوتا تھا جس طرف نظر اٹھاتا تھا آنند ہی آنند ملتا تھا۔ کھانے میں، پینے میں، چلنے میں، پھرنے میں، غرض ہر ایک حرکت میں ہر ادا میں پریم ہی پریم معلوم ہوتا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد یہ نظارہ تو جاتا رہا، مگر اس کا بقیہ ضرور دو ماہ تک رہا یعنی اس نظارہ سے کم درجہ کا سُرور دینے والا نظارہ۔ اس وقت مَیں عجیب گھبراہٹ میں ہوں۔ مَیں نے بہت کوشش کی کہ مَیں اس کو پھر پاؤں، مگر نہیں ملا۔ اسی کی طلب اور تلاش میں مَیں لاہور بابو اَبناش چندر فورمین صاحب کے پاس آیا۔ جو برہمو سماج کے سرگرم ممبر ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وُہ مجھ سے بجُز چند منٹ کے اور وُہ بھی اپنے دفتر میں ہی نہ مِل سکے۔ پھر مَیں پنڈت شِونرائن ستیانند اگنی ہوتری کے پاس گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ وُہ لوگ کسی قدر رُوحانیت کو محسوس کرتے ہیں۔ آخر مَیں کوئی دو مہینے تک ان کے ہائی سکول ہوگا میں بطور تھرڈ ماسٹر کام کرتا رہا اور اپنی اِصلاح میں لگا رہا۔ وہاں جانا میرا صرف اس مطلب کے لیے تھا کہ مَیں اپنی لائف کو بناؤں۔ اس عرصہ میں کچھ مختصر سا نظارہ نظر آنے لگا، مگر میری تسلّی اور اطمینان نہیں ہوا جس شانتی اور پریم کا مَیں خواہش مند اور جویا تھا وہ مجھے نہ ملا؛ اگرچہ مَیں صبر کے ساتھ وہاں رہنا چاہتا تھا، مگر بیمار ہو کر مجھے آنا پڑا۔ مَیں نے اپنے شہر میں شیخ مولا بخش صاحب کو ایک مرتبہ جلسۂ اعظم مذاہب والا آپ کا مضمون پڑھتے ہوئے سُنا۔ مَیں اپنے خیال میں مست اور متفکر جا رہا تھا کہ اُن

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ صفحہ ۹ پرچہ ۱۷ رمارچ سنہ ۱۹۰۱ء

کی آواز میرے کان میں پڑی۔ میری رُوح نے غیر معمولی طور پر محسوس کیا کہ اس کلام میں لائٹ (نُور) ہے اور یہ کہنے والا اپنے اندر روشنی ضرور رکھتا ہے۔ میں نے اس مضمون کو کئی مرتبہ پڑھا اور میرے دل میں قادیان آنے کی خواہش پیدا ہوئی، مگر لیکھرام کے قتل کے تازہ وقوعہ کے باعث لاہور میں میں اگر کسی مسلمان سے پتہ پُوچھتا تھا، تو وُہ پتہ نہ بتاتا تھا۔ غالباً اس کو یہ وہم ہوتا ہوگا کہ شاید یہ مرزا صاحب کے قتل کو جاتا ہے۔ بہر حال میرے دل میں ایک کشمکش پیدا ہو رہی تھی۔ اب وہ میری آرزو پُوری ہوئی ہے اور میں اپنی زندگی کو بنانا چاہتا ہوں۔ اسی غرض کے واسطے حضوُر کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اس پر حضرت اقدس امام ہمام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یُوں ارشاد فرمایا:

اسلام کی حقیقت

"حقیقت یہی ہے کہ انسان کو پوست اور چھلکے پر ٹھہرنا نہیں چاہیے اور نہ انسان پسند کرتا ہے کہ وُہ صرف پوست پر قناعت کرے، بلکہ وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اور اسلام انسان کو اسی مغز اور رُوح پر پہنچانا چاہتا ہے جس کا وہ فطرتاً طلبگار ہے۔ یہ نام ہی ایسا نام ہے کہ اس کو سُن کر رُوح میں ایک لذّت آتی ہے اور کسی مذہب کے نام سے کوئی تسلی رُوح میں پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً آریہ کے نام سے کون سی رُوحانیت نکالیں۔ اسلام سکینت، شانتی، تسلّی کے لیے بنایا گیا ہے جس کے واسطے انسان کی رُوح بھُوکی پیاسی ہوتی ہے تاکہ اس کا نام سُننے والا سمجھ لے کہ اس مذہب کا سچے دل سے ماننے والا اور اس پر عمل کرنے والا خدا کا عارف ہے، مگر بات یہ ہے کہ اگر انسان چاہے کہ ایک دم میں سب کچھ ہو جائے اور معرفتِ الٰہی کے اعلیٰ مراتب پر یکدفعہ پہنچ جاتے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا۔ دنیا میں ہر ایک کام تدریج سے ہوتا ہے۔ دیکھو کوئی علم اور فن ایسا نہیں جس کو انسان تامل اور توقف سے نہ سیکھتا ہو۔ ضروری ہے کہ سلسلہ وار مراتب کو طے کرے۔ دیکھو! زمیندار کو زمین میں بیج بو کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اوّل وہ اپنی عزیز شَے اناج کو زمین میں ڈال دیتا ہے۔ جس کو فوراً جانور چُگ جائیں یا مٹی کھا لے یا کسی اور طرح ضائع ہو جائے مگر تجربہ اس کو تسلی دیتا ہے۔ کہ نہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ یہ دانے جو اس طرح پر زمین کے سپرد کیے گئے ہیں۔ باروَر ہوں گے اور یہ کھیت سرسبز لہلہاتا ہوا نظر آئے گا اور یہ خاک آمیختہ بیج رزق بن جائیں گے۔

اصلاح کے لیے صبر شرط ہے

اب آپ غور کریں کہ دنیاوی اور جسمانی رزق کے لیے جس کے بغیر کچھ دن آدمی زندہ بھی رہ سکتا ہے چھ مہینے درکار ہیں۔ حالانکہ وہ زندگی جس کا مدار جسمانی رزق پر ہے اَبدی نہیں، بلکہ فنا ہو جانے والی ہے۔ پھر رُوحانی رزق جو رُوحانی زندگی کی غذا ہے جس کو کبھی فنا نہیں اور وُہ ابدالآباد کے لیے رہنے والی ہے۔ دو چار دن میں کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ اگرچہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ایک دم میں جو چاہے کر دے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کے نزدیک کوئی چیز انہونی نہیں۔ اسلام نے ایسا خدا پیش ہی نہیں کیا جو مثلاً آریوں کے پیش کردہ پرمیشر

کی طرح نہ کسی رُوح (جیو) کو پیدا کر سکے، نہ مادہ کو اور نہ اپنے طلبگاروں کو اور صادقوں کو سچی شانتی اور اَبدی مکتی دے سکے۔ نہیں بلکہ اسلام نے وُہ خدا پیش کیا ہے۔ جو اپنی قدرتوں اور طاقتوں میں بے نظیر اور لاشریک خدا ہے۔ مگر ہاں اس کا قانون یہی ہے کہ ہر ایک کام ایک ترتیب اور تدریج سے ہوتا ہے۔ اس لیے صبر اور حُسنِ ظن سے اگر کام نہ لیا جائے، تو کامیابی مشکل ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ پہلے بزرگ پھونک مار کر آسمان پر پہنچا دیتے تھے۔ مَیں نے کہا کہ تم غلطی کرتے ہو۔ خدا تعالیٰ کا یہ قانون نہیں ہے۔ اگر ایک مکان میں فرش کرنے لگو، تو پہلے ضروری ہوگا کہ اس میں کوئی حِصّہ قابلِ مرمّت ہو تو اس کی مرمّت کی جائے۔ اور جہاں جہاں گندگی اور ناپاکی پڑی ہوئی ہو اُسے کو فینائل وغیرہ سے صاف کیا جائے۔ غرض بہت سی تدبیروں اور حیلوں کے بعد وہ اس قابل ہوگا کہ اس میں فرش بچھایا جائے۔ اسی طرح پر انسان کا دل اس سے پیشتر کہ خدا تعالیٰ کے رہنے کے قابل ہو۔ وہ شیطان کا تخت ہے اور سلطنتِ شیطان میں ہے۔ اب دُوسری سلطنت کے لیے اس شیطانی سلطنت کا قلع قمع ضروری ہے۔

نہایت ہی بدقسمت ہے وہ انسان جو حق کی طلب میں نکلے اور پھر حُسنِ ظن سے کام نہ لے۔ ایک کُل گو ہی کو دیکھو کہ اس کو مٹی کا برتن بنانے میں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ دھوبی ہی کو دیکھو کہ وُہ ایک ناپاک اور میلے کچیلے کپڑے جب صاف کرنے لگتا ہے، تو کس قدر کام اس کو کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی کپڑے کو بھٹی پر چڑھاتا ہے کبھی اس کو صابن لگاتا ہے۔ پھر اس کی میل کچیل کو مختلف تدبیروں سے نکالتا ہے۔ آخر وہ صاف ہو کر سفید نکل آتا ہے اور جس قدر میل اس کے اندر ہوتی ہے، سب نکل جاتی ہے۔ جب ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے لیے اس قدر صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ تو پھر کس قدر نادان ہے وہ شخص جو اپنی زندگی کی اصلاح کے واسطے اور دل کی غلاظتوں اور گندگیوں کو دُور کرنے کے لیے یہ خواہش کرے کہ یہ پھونک مارنے سے نکل جائیں اور قلب صاف ہو جائے۔

یاد رکھو۔ اصلاح کے لیے صبر شرط ہے۔ پھر دُوسری بات یہ ہے کہ تزکیہ اخلاق اور نفس کا نہیں ہو سکتا، جبتک کہ کسی مزکّی نفس انسان کی صحبت میں نہ رہے۔ اوّل دروازہ جو کُھلتا ہے، وُہ گندگی دُور ہونے سے کُھلتا ہے۔ جن پلید چیزوں کو مناسبت ہوتی ہے وہ اندر رہتی ہیں۔ لیکن جب کوئی تریاقی صُحبت مِل جاتی ہے، تو اندرونی پلیدی رفتہ رفتہ دُور ہونی شروع ہوتی ہے کیونکہ پاکیزہ رُوح کے ساتھ جس کو قرآن کریم کی اصطلاح میں رُوح القدس کہتے ہیں تعلق نہیں ہو سکتا جبتک کہ مناسبت نہ ہو۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تعلق کب تک پیدا ہو جاتا ہے۔ ہاں "خاک شو پیش ازانکہ خاک شوی" پر عمل ہونا چاہیے۔ اپنے آپ کو اس راہ میں خاک کر دے اور پورے صبر اور استقلال کے ساتھ اس راہ میں چلے۔ آخر اللہ تعالیٰ اس کی سچی محنت کو ضائع نہیں کرے گا۔ اور اس کو وُہ نُور اور روشنی عطا کرے گا، جس کا وہ جویا ہوتا ہے۔ مَیں تو حیران ہو جاتا ہوں اور کچھ سمجھ میں نہیں

آتا کہ انسان کیوں دلیری کرتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ خدا ہے۔

مجاہدہ میں نے جس شخص کا ذکر کیا ہے کہ اس نے مجھ سے کہا کہ پہلے بزرگ پھونک مار کر غوث قطب بنادیتے تھے۔ میں نے اس کو یہی کہا کہ یہ دُرست نہیں ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا قانون نہیں ہے۔ تم مجاہدہ کرو۔ تب اللہ تعالیٰ اپنی راہیں تم پر کھولے گا۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی اور چلا گیا۔ ایک مدّت کے بعد وہ پھر میرے پاس آیا، تو اس کو اس پہلی حالت سے بھی اَبتر پایا۔ غرض انسان کی بدقسمتی یہی ہے کہ وُہ جلدی کا قانون تجویز کرلیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ جلدی کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں تو تدریج اور ترتیب ہے، تو گھبرا اٹھتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دہریہ ہو جاتا ہے۔ دہریّت کا پہلا زینہ یہی ہے۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ یا تو بڑے بڑے دعوے اور خواہشیں پیش کرتے ہیں کہ یہ ہو جائیں اور وہ بن جائیں اور یا پھر آخر اَرذَل زندگی کو قبول کرلیتے ہیں۔ ایک شخص میرے پاس کچھ مانگنے آیا۔ جوگی تھا۔ اس نے کہا کہ میں فلاں جگہ گیا، فلاں مرد کے پاس گیا۔ آخر اس کی حالت اور اندازِ گفتگو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ مانگ کر گذارہ کرلینا چاہیے۔ اصل اور سچی بات یہی ہے کہ صبر سے کام لیا جائے۔ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گر نباشد بہ دوست راہ بُردن
شرطِ عشق است در طلب مُردن

اللہ تعالیٰ تو اخیر حد تک دیکھتا ہے۔ جس کو کچا اور غدار دیکھتا ہے۔ وہ اس کی جناب میں راہ نہیں پاسکتا۔ ؏

طلب گار باید صبور و حمول
کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

کیمیا گر باوجود دیکھ جاتا ہے کہ اب تک کچھ بھی نہیں ہوا، لیکن پھر بھی صبر کے ساتھ اس پھونکا پھانکی میں لگا ہی رہتا ہے۔ میرا مطلب اس سے یہی ہے کہ اوّل صبر کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ اگر رُشد کا مادہ ہے تو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا۔ اصل غرض تو یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے محبت پیدا ہو۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ محبت تو ایک دُوسرا درجہ ہے یا نتیجہ ہے۔ سب سے اوّل تو ضروری یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجُود پر یقین پیدا ہو۔ اس کے بعد رُوح میں خود ایک جذب پیدا ہو جاتا ہے۔ جو خود بخود اللہ تعالیٰ کی طرف کھچی چلی آتی ہے۔ جس جس قدر معرفت اور بصیرت بڑھے گی۔ اسی قدر لذت اور سرُور بڑھتا جائے گا۔ معرفت کے بغیر تو کبھی لذت پیدا نہیں ہوسکتی۔ ذوق شوق کا اصل مبداء، تو معرفت ہی ہے۔

معرفت معرفت ہی ایک شے ہے جس سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ معرفت اور محبت کے اجتماع سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے، وُہ سرُور ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ کسی خوبصورتی کا محض دیکھ لینا

ہی تو محبت پیدا نہیں کر سکتا، جبتک اس کے متعلق معرفت نہ ہو۔ یقیناً سمجھو کہ محبت بدوں معرفت کے محال ہے۔ جو محبوب ہے اس کی معرفت کے بغیر محبت کیا؟ یہ ایک خیالی بات ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو ایک عاجز انسان کو خدا سمجھ لیتے ہیں۔ بھلا وہ خدا میں کیا لذت پا سکتے ہیں۔ جیسے عیسائی ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو خدا بنا رہے ہیں۔ اور اس پر خدا محبت ہے۔ خدا محبت ہے پکارتے پھرتے ہیں۔ اُن کی محبت حقیقی محبت نہیں ہو سکتی۔ ایک ادعائی اور خیالی محبت ہے جبکہ خدا تعالیٰ کی بابت ان کو سچی معرفت ہی نصیب نہیں ہوئی۔

محبت الٰہی کے ذرائع

عقیدہ کی تصحیح ۔ نیک صحبت ۔ معرفت ۔ صبر و حسنِ ظن ۔ دُعا

پس سب سے پہلے پھر یہ ضروری ہے کہ اوّل تصحیح عقیدہ کرے۔ ہندو کچھ اور پیش کرتے ہیں۔ عیسائی کچھ اور ہی دکھاتے ہیں چینی کسی اور کو خدا پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا وہی خدا ہے جس کو انھوں نے قرآن کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ جبتک اس کو شناخت نہ کیا جائے، خدا کے ساتھ کوئی تعلق اور محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ نرے دعوے سے کچھ نہیں بنتا۔ پس جب عقیدہ کی تصحیح ہو جاوے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ نیک صحبت میں رہ کر اس معرفت کو ترقی دی جاوے اور دُعا کے ذریعہ بصیرت مانگی جاوے۔ جس جس قدر معرفت اور بصیرت بڑھتی جاوے گی، اسی قدر محبت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ محبت بدوں معرفت کے ترقی پذیر نہیں ہو سکتی۔ دیکھو انسان ٹین یا لوہے کے ساتھ اس قدر محبت نہیں کرتا جس قدر تانبے کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر تانبے کو اس قدر عزیز نہیں رکھتا جتنا چاندی کو رکھتا ہے اور سونے کو اس سے بھی زیادہ محبوب رکھتا ہے اور ہیرے اور دیگر جواہرات کو اور بھی عزیز رکھتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ اس کو ایک معرفت ان دھاتوں کی بابت ملتی ہے۔ جو اس کی محبت کو بڑھاتی ہے۔ پس اصل بات یہی ہے کہ محبت میں ترقی اور قدر و قیمت میں زیادتی کی وجہ معرفت ہی ہے۔ اس سے پیشتر کہ انسان سرور اور لذت کا خواہشمند ہو اس کو ضروری ہے کہ وہ معرفت حاصل کرے، لیکن سب سے ضروری امر جس پر ان سب باتوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ وہ صبر اور حسنِ ظن ہے۔ جبتک ایک حیران کر دینے والا صبر نہ ہو۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب انسان محض حق جوئی کے لیے تھکا نہ دینے والے صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سعی اور مجاہدہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے وعدہ کے موافق اس پر ہدایت کی راہ کھول دیتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۷۰) یعنی جو لوگ ہم میں ہو کر سعی اور مجاہدہ کرتے ہیں۔ آخر ہم ان کی اپنی راہوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ اُن پر دروازے کھولے جاتے ہیں۔ یہ سچی بات ہے

کہ جو ڈھونڈتے ہیں وہ پاتے ہیں۔کسی نے خوب کہا۔ ع

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

خدا جوئی کے آداب

ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جو شخص ہمارے پاس آتا ہے اور کھڑا کھڑا بات کر کے چل دیتا ہے، وہ گویا خدا سے ہنسی کرتا ہے۔ یہ خدا جوئی کا طریق نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا قانون مقرر کیا ہے۔ پس اوّل شرط خدا جوئی کے لیے سچّی طلب ہے۔ دُوسری صبر کے ساتھ اس طلب میں لگے رہنا۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے، اسی قدر تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ پھر معرفت کے لیے زیادہ دیر تک صُحبت میں رہنا ضروری ہوا یا نہیں؟ مَیں نے بہت سے آدمی دیکھے ہیں۔ جو اپنی اوائلِ عمر میں دُنیا کو ترک کرتے اور چیختے اور چلّاتے ہیں۔ آخر اُن کا انجام یہ دیکھا گیا کہ وہ دُنیا میں منہمک پائے گئے اور دُنیا کے کیڑے بن گئے۔ دیکھو بعض درختوں کو سینہ و پھل لگا کرتے ہیں۔ جیسے شہتوت کے درخت کو عارضی طور پر ایک پھل لگتا ہے۔ آخر وہ سارے کا سارا گِر جاتا ہے۔ اس کے بعد اصل پھل آتا ہے۔ اسی طرح پر خدا جوئی بھی عارضی طور پر اندر پیدا ہوتی ہے۔ اگر صبر اور حُسنِ ظنّ کے ساتھ صدقِ قدم نہ دکھایا جاوے، تو وہ عارضی جوش ایک وقت میں آکر یہی نہیں کہ فرو ہو جاتا ہے، بلکہ ہمیشہ کے لیے دل سے محو ہو جاتا ہے اور دُنیا کا کیڑا بنا دیتا ہے، لیکن اگر صدق و ثبات سے کام لیا جاوے تو اس عارضی جوش اور حق جوئی کی پیاس کے بعد واقعی اور حقیقی طور پر ایک طلب اور خواہش پیدا ہوتی ہے جو دن بدن ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی راہ میں اگر مشکلات اور مصائب کا پہاڑ بھی آجائے تو وہ کچھ بھی پروا نہیں کرتا اور قدم آگے ہی بڑھاتا جاتا ہے۔ پس وہ انسان جو اس جوش اور خواہش کے وقت صبر سے کام لے اور سمجھے کہ اس کو آخر عمر تک نبھانا ہے۔ وہ بہت ہی خوش طالع ہوتا ہے اور جو چند تجربے کر کے رہ جاتا ہے اور تھک کر بیٹھ رہتا ہے تو اس کے ہاتھ میں صرف اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ وُہ کہتا پھرتا ہے کہ مَیں نے بہت سے باٹونی دیکھے اور دوکاندار پائے ایک بھی حق نُما اور خدا نُما نہ ملا۔

پس میری تو یہ نصیحت ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ ہر ایک جو میرے پاس آتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا کے لیے آیا ہے اور خدا کو پانا چاہتا ہے، اُس کا کیا حال ہے۔ اس کی نیت کیسی ہے۔ مگر مَیں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ کی تلاش میں قدم اُٹھاوے۔ سب سے اوّل اس کو لازم ہے کہ تصحیح عقائد کرے۔ یہ معلوم کرے کہ کس خدا کو وہ پانا چاہتا ہے۔ آیا اس خدا کی تلاش میں وہ ہے جو واقعی دُنیا کا خالق اور مالک خدا ہے اور جو تمام صفاتِ کاملہ سے موصوف اور تمام بدیوں اور نقائص سے مبرّا ہے۔ یا کسی عورت کے پیچھے خدا کی تلاش میں ہے یا اور ایسے ہی کمزور اور ناتواں ۳۳ کروڑ خداؤں کا جویا ہے، کیونکہ اگر اصلی محبوب اور مقصود کنارے پر ہی پڑا

رہے، تو سمندر میں غوطہ زنی سے کیا حاصل؟

مَیں مثال کے طور پر کہتا ہوں مثلاً عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح ابنِ مریم جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا اسی طرح پر جس طرح عام انسان پیدا ہوتے ہیں اور کھاتا پیتا ہگتا موتتا رہا ـــ وہ خدا ہے۔ اب یہ تو ممکن ہے کہ ایک شخص کو اس سے محبت ہو، لیکن انسانی دانش یہ کبھی تجویز نہیں کرتی کہ ایسا کمزور اور ناتواں انسان خدا بھی ہوتا ہے۔ یا یہ کہ عورتوں کے پیٹ سے بھی خدا پیدا ہوا کرتے ہیں۔ جبکہ پہلا ہی قدم باطل پر پڑا ہے، تو دُوسرے قدم کی حق پر پڑنے کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ جو شعاعیں زندہ خدا، کامل صفات سے موصوف خدا کو مان کر دل پر پڑتی ہیں۔ وُہ ایک مرنے والی ہستی، ضُعف و ناتوانی کی تصویر پرستی سے کہاں ؟؟؟

اَلطَّالِبُ لَا مَذْھَبَ لَہٗ طالب کو تو سارے تعصب اور عقیدے چھوڑ دینے چاہئیں۔ پھر وہ سچّے عقائد کی طلب میں لگے۔ تب بہتری کی اُمید ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے بنیادی اینٹ خدا ہونی چاہیے۔ تب آخری اینٹ بھی خدا ہی ہوگی۔ جلد بازی اچھی چیز نہیں ہے۔ یہ عموماً بدقسمت انسان کی محرومی کا موجب ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آپ ہماری صحبت میں نہ رہیں اور چلے جائیں اور دو چار باتیں بھی کہدیں کہ وہاں کیا تھا، کچھ نہ ملا۔ تو بتایئے ہمارا اس میں کیا نقصان ہوگا۔ دُنیا میں اس قسم کی باتیں کرنے والے بہت ہیں، لیکن محروم و بدقسمت۔ دیکھو اقلیدس کی چند اشکال اگر ایک بچے کے سامنے رکھ دیں۔ ممکن ہے وہ بعض اشکال کو پسند کرے، لیکن اُن اشکال کی پسندیدگی ایسی نفع بخش تو نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ وہ ان کے نتائج سے بے خبر ہے اور نہیں جانتا کہ اُن سے کیا کیا فوائد پہنچ سکتے ہیں۔

مَیں نے اسلام پر اعتراض کرنے والے دیکھے بھی ہیں اور ان اعتراضوں کو جمع بھی کیا ہے جو اسلام پر کیے جاتے ہیں۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ جہاں ان ناواقفوں نے اعتراض کیا ہے وہیں حکمت کا خزانہ اور بیش بہا معارف اور حقائق کا دفینہ ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھ میں بجز نادانی اور کورچشمی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اعتراض کرکے اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ تاریک دماغ کے انسان ہیں اور کجرو طبیعت رکھتے ہیں؛ ورنہ وہ معارف اور حقائق کی معدن پر اعتراض نہ کرتے، اس لیے مَیں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ نرمی اور تحمل کے ساتھ اصل حقیقت کی طلب میں لگیں۔

آپ خدا جوئی کے طالب ہیں۔ آپ کے لیے عُمدہ طریق یہی ہے کہ آپ پہلے تصحیح عقائد کریں۔ جس سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ وُہ خدا جس کی تلاش اور جستجو آپ کو ہے۔ ہے کیا چیز؟ اس سے آپ کی معرفت کو ترقی ملے گی اور معرفت میں جو قوّتِ جذب محبّت کی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک محبّت پیدا کرنے کا موجب ہو گی۔ بدُوں اس کے محبّت کا دعوےٰ سینیر و پھل کی طرح ہے جو چند روز کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔

یہ آپ یاد رکھیں اور ہمارا مذہب یہی ہے کہ کسی شخص پر خدا کا نور نہیں چمک سکتا، جبتک آسمان سے وہ نُور نازل نہ ہو۔ یہ سچی بات ہے کہ فضل آسمان سے آتا ہے۔ جب تک خود خدا اپنی روشنی اپنے طلبگار پر ظاہر نہ کرے۔ اس کی رفتار ایک کیڑے کی مانند ہوتی ہے اور ہونی چاہیے، کیونکہ وُہ قسم قسم کی ظلمتوں اور تاریکیوں اور راستہ کی مشکلات میں پھنسا ہوا ہوتا ہے، لیکن جب اس کی روشنی اس پر چمکتی ہے، تو اس کا دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے اور وُہ نُور سے معمور ہو کر برق کی رفتار سے خدا کی طرف چلتا ہے۔

حق جُو : حضور! میں مذہب کا پابند نہیں ہوں۔

حضرت اقدسؑ : اگر کوئی اپنی جگہ یہ فیصلہ کر کے آوے کہ میں نے کچھ ماننا ہی نہیں تو اس کو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور کہیں بھی کیا۔ لیکن اگر کوئی عقل رکھتا ہے تو اضطراراً اس کو ایک راہ پیدا کرنی پڑتی ہے۔

مذہب کیا ہے؟

مذہب کیا ہے؟ وہی راہ ہے جس کو وہ اپنے لیے اختیار کرتا ہے۔ مذہب تو ہر شخص کو رکھنا پڑتا ہے اور وُہ لامذہب انسان جو خدا کو نہیں مانتا اس کو بھی ایک راہ اختیار کرنی لازمی ہے اور وہی مذہب ہے۔ مگر ہاں امرِ غور طلب یہ ہونا چاہیے کہ جس راہ کو اختیار کیا ہے، کیا وُہ راہ وہی ہے جس پر چل کر اس کو سچی استقامت اور دائمی راحت اور خوشی اور ختم نہ ہونے والا اطمینان مل سکتا ہے۔؟

دیکھو! مذہب تو ایک عام لفظ ہے۔ اس کے معنے چلنے کی جگہ یعنی راہ کے ہیں اور یہ دین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہر قسم کے علُوم و فنون طبقات الارض، طبعی، طبابت، ہیئت وغیرہ میں بھی ان علُوم کے ماہرین کا ایک مذہب ہوتا ہے۔ اس سے کسی کو چارہ ہو سکتا ہی نہیں۔ یہ تو انسان کے لیے لازمی امر ہے۔ اس سے باہر ہو نہیں سکتا۔ پس جیسے انسان کی رُوح جسم کو چاہتی ہے۔ معانی الفاظ اور پیرایہ کو چاہتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو مذہب کی ضرورت ہے۔ ہماری یہ غرض نہیں ہے اور نہ ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ کوئی اللہ کہے یا گاڈ کہے یا پرمیشر ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جس کو وُہ پکارتا ہے۔ اس نے اس کو سمجھا کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ کوئی نام لو، مگر یہ بتاؤ کہ تم اسے کہتے کیا ہو؟ اس کے صفات تم نے کیا قائم کئے ہیں؟ صفاتِ الٰہی کا مسئلہ ہی تو بڑا مسئلہ ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔

حق جو : میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذہب کا کام فطرت کو دُرست کرنا ہے۔

حضرت اقدسؑ : اس وقت کوئی بادشاہ ہے مثلاً شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم ہے۔ اب اگر کسی اور کو کہیں بھی تو تکلفات سے کہیں گے، مگر ہو نہیں سکتا۔ ہم یہی تو چاہتے ہیں کہ اس حقیقی خدا کو شناخت کیا جاوے اور باقی سب تکلفات چھوڑ دیئے جائیں اس کا نام فطرت کی درستی ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے

اِسلام ہے کیا؟ اسلام کا تو نام ہی اللہ تعالیٰ نے فطرت اللہ رکھا ہے۔ فطرتی مذہب اسلام ہی ہے، مگر ان باتوں کی حقیقت کب کھلتی ہے۔ جب انسان صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ کسی پاک صحبت میں رہے۔ ثابت قدمی میں بڑی برکتیں ہوتی ہیں۔ شہد ہی کی مکھی کو دیکھو کہ جب وہ ثابت قدمی اور محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگتی ہے تو شہد جیسی نفیس اور کارآمد شے تیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح پر جو خدا کی تلاش میں استقلال سے لگتا ہے وہ اُسکو پالیتا ہے نہ صرف پالیتا ہے، بلکہ میرا تو یہ ایمان ہے کہ وُہ اُس کو دیکھ لیتا ہے۔ ارضی علوم کی تحصیل میں کس قدر وقت اور روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ علوم روحانی علوم کی تحصیل کے قواعد کو صاف طور پر بتا رہے ہیں۔ ہمارا مذہب جو روحانی علوم کے مبتدی کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ ہے کہ وُہ پہلے خدا کی ہستی، پھر اس کی صفات کی واقفیت پیدا کرے ایسی واقفیت جو یقین کے درجہ تک پہنچ جاوے۔ تب اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کی صفاتِ کاملہ پر اس کو اطلاع مل جاوے گی اور اس کی رُوح اندر سے بول اُٹھے گی کہ پُورے اطمینان کے ساتھ اُس نے خدا کو پالیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایسا ایمان پیدا ہو جائے کہ وُہ یقین کے درجہ تک پہنچ جاوے اور انسان محسوس کرے کہ اس نے گویا خدا کو دیکھ لیا ہے اور اس کی صفات سے واقفیت حاصل ہو جاوے، تو گناہ سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور طبیعت جو پہلے گناہ کی طرف جھکتی تھی اب ادھر سے ہٹتی اور نفرت کرتی ہے اور یہی توبہ ہے۔

اور یہ بات کہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان کے بعد طبیعت گناہ سے متنفر ہو جاتی ہے۔ یہ بات آسانی اور صفائی سے سمجھ میں آسکتی ہے دیکھو سنکھیا ہے یا اور زہریں ہیں یا بعض زہریلے جانور ہیں۔ انسان اُن سے کیوں ڈرتا ہے؟ صرف اس لیئے کہ تجربہ نے بتا دیا ہے کہ اس درجہ پر یہ زہر ہلاک کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو زہر کھا کر ہلاک ہوتے دیکھا ہے، اسی لئے طبیعت اس طرف نہیں جا سکتی، بلکہ ڈرتی ہے۔ جبکہ یہ بات ہے پھر کیا وجہ ہے کہ قسم قسم کے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ یہانتک کہ اگر راستہ میں ایک پیسہ پڑا ہوا ہو تو جھک کر اس کو اٹھائے گا؛ حالانکہ تھوڑے سے اعلان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ پیسہ کس کا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بارہ بارہ آنے پر معصوم بچوں کی جانیں لی جاتی ہیں۔ عدالتوں میں جا کر دیکھو۔ کس قدر خوفناک اور تاریک نظارہ نظر آئے گا۔ تھوڑی تھوڑی بات پر جھوٹ بولا جاتا ہے۔ فسق و فجور کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ خدا پر ایمان نہیں ہے۔ سانپوں اور زہروں سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے کہ اُن کو مُہلک مانتے ہیں اور اُن کے خطرناک ہونے پر ایمان ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ کیوں گناہ سے نفرت پیدا نہ ہو۔

نیکی کے دو پہلو

انسان کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ بدی سے بچے اور نیکی کی طرف دوڑے۔ اور نیکی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ترکِ شر دوسرا افاضۂ خیر۔ ترکِ شر سے انسان کامل نہیں بن سکتا جبتک اس کے ساتھ افاضۂ خیر نہ ہو۔ یعنی دُوسروں کو نفع بھی پہنچائے اس سے پتہ لگتا ہے کہ کس قدر تبدیلی کی ہے اور یہ مدارج تب حاصل ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات پر ایمان ہو اور اُن کا علم ہو۔ جب تک یہ بات نہ ہو۔ انسان بدیوں سے بھی بچ نہیں سکتا۔ دُوسروں کو نفع پہنچانا تو بڑی بات ہے۔ بادشاہوں کے رُعب اور تعزیراتِ ہند سے بھی تو ایک حد تک ڈرتے ہیں اور بہت سے لوگ ہیں جو قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے پھر کیوں احکم الحاکمین کے قوانین کی خلاف ورزی میں دلیری پیدا ہوتی ہے۔ کیا اس کی کوئی اور وجہ ہے بجز اس کے کہ اُس پر ایمان نہیں ہے؟ یہی ایک باعث ہے۔

الغرض بدیوں سے بچنے کا مرحلہ تب طے ہوتا ہے۔ جب خدا پر ایمان ہو پھر دوسرا مرحلہ یہ ہونا چاہیئے کہ اُن راہوں کی تلاش کرے جو خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں نے اختیار کیں۔ وہ ایک ہی راہ ہے۔ جس پر جس قدر راستباز اور برگزیدہ انسان دنیا میں چل کر خدا تعالیٰ کے فیض سے فیضیاب ہوئے۔ اس راہ کا پتہ یوں لگتا ہے کہ انسان معلوم کرے کہ خدا تعالیٰ نے اُن کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ پہلا مرحلہ بدیوں سے بچنے کا تو خدا تعالیٰ کی جلالی صفات کی تجلّی سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ بدکاروں کا دشمن ہے۔

اور دوسرا مرتبہ خدا تعالیٰ کی جمالی تجلّی سے ملتا ہے اور آخر یہی ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوّت اور طاقت نہ ملے جس کو اسلامی اصطلاح کے موافق رُوح القدس کہتے ہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک قوّت ہوتی ہے، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ اُس کے نزول کے ساتھ ہی دل میں ایک سکینت آتی ہے اور طبیعت میں نیکی کے ساتھ ایک محبّت اور پیار پیدا ہو جاتا ہے۔

جس نیکی کو دُوسرے لوگ بڑی مشقّت اور بوجھ سمجھ کر کرتے ہیں۔ یہ ایک لذّت اور سرُور کے ساتھ اس کو کرنے کی طرف دوڑتا ہے۔ جیسے لذیذ چیز بچہ بھی شوق سے کھالیتا ہے۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جاتا ہے اور اس کی پاک رُوح اس پر اُترتی ہے۔ پھر نیکیاں ایک لذیذ اور خوشبودار شربت کی طرح ہوتی ہیں۔ وُہ خوبصورتی جو نیکیوں کے اندر موجود ہے اس کو نظر آنے لگتی ہے اور بے اختیار ہو ہو کر ان کی طرف دوڑتا ہے۔ بدی کے تصوّر سے بھی اُس کی رُوح کانپ جاتی ہے۔

یہ اُمور اس قسم کے ہیں کہ ہم اُن کو الفاظ کے پیرایہ میں پورے طور سے ادا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ قلب کی حالتیں ہوتی ہیں۔ محسوس کرنے سے ہی اُن کا ٹھیک پتہ لگتا ہے۔ اس وقت تازہ بتازہ اَنوار اس کو ملتے ہیں۔

رقتِ قلب

انسان صرف اس بات پر ہی ناز نہ کرے اور اپنی ترقی کی انتہا اسی کو نہ سمجھ لے کہ کبھی کبھی اس کے اندر رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رقت عارضی ہوتی ہے۔ انسان اکثر دفعہ ناول پڑھتا ہے اور اس کے درد انگیز حصّہ پر پہنچ کر بے اختیار رو پڑتا ہے؛ حالانکہ وہ صاف جانتا ہے کہ یہ ایک جھوٹی اور فرضی کہانی ہے۔ پس اگر محض رو پڑنا یا رقت کا پیدا ہو جانا ہی حقیقی سُرور اور لذت کی جڑ ہوتی ہے۔ تو آج یورپ سے بڑھ کر کوئی بھی رُوحانی لذت حاصل کرنے والا نہ ہوتا۔ کیونکہ ہزار ہا ناول شائع ہوتے اور لاکھوں کروڑوں انسان پڑھ کر روتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک بات موجُود ہے کہ ہنسی کے مقام پر ہنس پڑتا ہے اور رونے کے مقام پر رو بھی پڑتا ہے اور اُن سے مناسب موقع پر ایک لذت بھی اُٹھاتا ہے، مگر یہ لذت کوئی روحانی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ کوئی کسی عورت پر عاشق ہو جاتا ہے اور اپنے فسق ہی میں اُس کے ہجر کے شعر بنا بنا کر خوش ہوتا ہے اور روتا ہے۔ انسان کے اندر ایک طاقت ہے خواہ اُس کو محل پر استعمال کرے یا بے محل۔ پس اس طاقت پر ہی بھروسہ کر کے نہ بیٹھ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت اس لئے رکھی ہے کہ سچے سائل محروم نہ ہوں اور جب یہ برمحل استعمال ہو، تو ان کے لئے آنے والے رُوحانی مدارج کا ایک مقدمہ ہو اور یہ قویٰ کا کام دے۔

غرض یہ اُمور کہ کبھی رو پڑنا اور کبھی دُنیا کی دُوسری چیزوں اور تعلقات سے انقطاع کرنا یہ عارضی ہوتے ہیں۔ اُن پر اعتبار کر کے بے دست و پا نہ بنئے۔

سچّی معرفت کی بنیاد

وُہ امور جن پر سچّی معرفت کی بنا ہے، یہ ہیں کہ وہ خدا کی راہ میں اگر بار بار آزمایا جائے اور مصائب اور مشکلات کے دریا میں ڈالا جائے۔ تب بھی ہرگز نہ گھبرائے اور قدم آگے ہی بڑھائے۔ اس کے بعد اُس کی معرفت کا انکشاف ہوتا ہے اور یہی سچّی نعمت حقیقی راحت ہوتی ہے۔ اس وقت دل میں رقت پیدا ہوتی ہے، مگر یہ رقت عارضی نہیں ہوتی، بلکہ سُرور اور لذت سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ رُوح پانی کے ایک مصفّٰی چشمہ کی طرح خدا کی طرف بہتی ہے۔ مُدعا یہ ہے کہ سمندر کے پہلے ایک سراب آتا ہے، وہ بھی سمندر ہی نظر آتا ہے۔ جو سراب کو دھوکا سمجھ کر آگے چلنے سے رہ جاتا اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے وہ ناکام اور نامراد رہتا ہے، لیکن جو ہمت نہیں ہارتا اور قدم آگے بڑھاتا ہے، وُہ منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مختلف کیفیتیں انسانی رُوح کے اندر رکھی ہوئی ہیں۔ اُن میں سے اس رقت کی بھی ایک کیفیت ہے۔ کوئی فقط شعر خوانی یا خوش الحانی ہی سے متاثر ہو جاتا ہے۔ کوئی آگے چلتا ہے اور ان پر قانع نہ ہو کر صبر کے ساتھ اصل مرحلہ تک پہنچتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ سچائی کے طالب کے واسطے یہ شرط

ہے کہ جہاں سے اسے سچائی ملے لے لے۔ یہ ایک نُور ہے جو اس کی رہبری کرتا ہے۔ اس وقت دُنیا میں ایک کشاکش شروع ہے۔ آریہ اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ برہمو الگ بُلاتے ہیں۔ دیو سماج والے اپنی ہی طرف دعوت کرتے ہیں۔ عیسائی ہیں وہ عیسائیت ہی کو پیش کرتے ہیں۔ غرض ہر قوم اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اُن کے درمیان اختلاف کا دائرہ بہت ہی وسیع ہوتا جاتا ہے۔

ہماری دعوت۔ خدا کی تلاش

مگر ہم جس بات کی دعوت کرتے ہیں اور جو کسی سچائی کے طلبگار کو بتلا سکتے ہیں وُہ یہ ہے کہ وُہ خدا کی تلاش کرے۔ مثلاً آریہ ہیں وہ تمام قدوسوں اور راستبازوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک پکے سے پکا پریمی اور بھگت بھی کبھی نجات نہیں پا سکتا۔ ان کے اصُول کے موافق خدا نے ایک ذرّہ بھی پیدا نہیں کیا۔ اب بتاؤ کہ ایسے پرمیشر پر جو وُہ پیش کرتے ہیں۔ کسی سچے طالب کی امید کیونکر وسیع ہوسکتی ہے اور کیونکر خدا کا جلال اور شوکت اُس کی رُوح پر ایک رقت پیدا کر کے گناہ کی طرف جانے سے بچا سکتی ہے۔ جب وہ خیال کرتا ہے کہ اس نے تو میرے وجود کا ایک ذرّہ بھی پیدا نہیں کیا۔ پھر جب یہ مانا گیا کہ وید کے سوا خدا نے کسی اور ملک کو اپنے کلام سے فیض ہی نہیں بخشا، تو کس قدر مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ الغرض ہماری نصیحت تو یہی ہے کہ جو سچائی کی تلاش میں قدم رکھتا ہے اس کی غرض اور غایت خدا کی تلاش ہو۔ پھر معارف اور حقائق کا دریا بہہ نکلتا ہے۔ جب اس کو سچے خدا پر جو ایک ہی خدا ہے سچا ایمان پیدا ہو جائے۔

حقائق اور معارف کا تعلق علُوم سے ہے

یاد رکھو حقائق اور معارف کا تعلق علُوم سے ہے جس قدر معرفت وسیع ہوگی، حقائق کھلتے جائیں گے۔ پس تحقیقات کرتے وقت دل کو بالکل پاک اور صاف کر کے کرے۔ جس قدر دل تعصب اور خود غرضی سے پاک ہو گا، اسی قدر جلد اصل مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔ نُور اور ظلمت میں جو فرق ہے اسے ایک جاہل سے جاہل انسان بھی جانتا ہے۔ سچی اور صحیح بات ایک ہی ہوتی ہے پس دو لفظوں میں میری ساری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا خط دو نقطوں میں ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ امُور ہیں جو قابلِ غور ہیں۔ آپ یہاں رہیں اور صبر و استقلال سے ٹھہریں۔ خدا کے فضل سے کچھ بعید نہیں ہے کہ آپ کو اس راہ کا پتہ ملے جو کروڑہا مقدس انسانوں کا تجربہ شدہ ہے اور اب بھی جس کے تجربہ کار موجُود ہیں۔“

حق جُو کا حضرت اقدسؑ سے خلوص و عقیدت کا اظہار

حضرتِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اس تقریر کو یہاں ختم کیا۔ حق جُو

صاحب کچھ عرصہ تک قادیان میں رہے۔ انھوں نے حضرت اقدسؑ کی صحبت میں رہ کر جو فائدہ اٹھایا۔ اُس کے اظہار کے لیے ہم اُن کے ایک خط کو جو اُنھوں نے لاہور سے ہمارے نام بھیجا ہے یہاں درج کرتے ہیں :

مکرمی جناب شیخ صاحب تسلیم۔

میری بے اَدبی مُعاف فرماویں۔ مَیں قادیان سے اچانک کچھ وجوہات رکھنے پر چلا آیا۔ مَیں اب یہاں سوچوں گا کہ مجھے اپنی زندگی پرلوک کے لیے کس پہلو میں گذارنی ہے۔ مَیں آپ کی جماعت کی جُدائی سے تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔

(۲) مَیں حضرت جی کے اخلاص کا حد درجہ مشکور ہوں اور جو کچھ رُوحانی دان مجھے نصیب ہوا اور جو کچھ مجھ پر ظاہر ہوا۔ اُس کے لیے نہایت ہی مشکور ہو رہا ہوں۔ مگر افسوس ہے دنیا میں سخت اندھکار ہے اور مَیں ایک ایک قدم پر گِر رہا ہوں۔ سوائے صحبت کے اس حالت کو قائم رکھنا میرے لیے کٹھن و دشوار ہے۔

(۳) اس بات پر میرا یقین ہے کہ بے شک حضرت صاحب رُوحانی بھلائی کے طالبوں کے لیے اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان کی صحبت میں مستقل طور پر رہنا بڑا ضروری ہے۔ دُنیا کی حالت ایسی ہے کہ موتیوں کو کیچڑ میں پھینکتے ہیں اور کوڑیاں جمع کرتے ہیں اور جو شخص موتی سنبھالنے لگے اس کے سر پر مٹی پھینک دیتے ہیں۔ ہائے افسوس کہ وہ کوڑیوں کو بھی موتی سمجھے بیٹھے ہیں۔ مَیں سخت گھبرایا ہوا ہوں۔ ہاں میں کیا کروں اور کِدھر جاؤں۔ میری حالت بہت بُری ہے۔ تمام جماعت کی خدمت میں آداب۔ خصوصاً حضرت صاحب کی خدمت میں مؤدّبانہ آداب عرض فرماویں اور میرے لیے حضرت صاحب اور تمام جماعت سے دُعا کراویں۔

آپ کا نیاز مند

وزیر سنگھ

یہ خط حضرتِ اقدسؑ کے حضور پڑھ کر سنایا گیا۔ حضُور علیہ السلام نے ایڈیٹر الحکم کو مندرجہ ذیل جواب لکھ دینے کا حکم دیا :

" صبر اور استقلال کے ساتھ جبتک کوئی ہماری صحبت میں نہ رہے، وُہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ ان کو چاہیے کہ وُہ یہاں آجائیں اور ایک عرصہ تک ہمارے پاس رہیں "[1]

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ صفحہ ۹ تا ۱۱ پرچہ ۲۴ / مارچ ۱۹۰۱ء

" " ۵ " ۱۲ " ۸ تا ۹ " ۳۱ / مارچ ۱۹۰۱ء

" " ۵ " ۱۳ " ۵ تا ۶ " ۱۰ / اپریل ۱۹۰۱ء

" " ۵ " ۱۴ " ۱۱ تا ۱۲ " ۱۷ / اپریل ۱۹۰۱ء

۷ر مارچ ۱۹۰۱ء

الہامات اور حدیث النفس میں امتیاز

الہامات کے متعلق ذکر تھا کہ اس میں بہت مشکلات پڑتے ہیں۔ فرمایا:

"بعض لوگ حدیث النفس اور شیطان کے القاء کو الہام الٰہی سے تمیز نہیں کر سکتے اور دھوکا کھا جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے جو بات آتی ہے وُہ پُر شوکت اور لذیذ ہوتی ہے۔ دل پر ایک ٹھوکر مارنے والی ہوتی ہے۔ وُہ خدا کی انگلیوں سے نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا ہم وزن کوئی نہیں وہ فولاد کی طرح گرنے والی ہوتی ہے۔ جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡكَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا۔ ثقیل کے یہی معنی ہیں، مگر شیطان اور نفس کا القا ایسا نہیں ہوتا۔ حدیث النفس اور شیطان گویا ایک ہی ہیں۔ انسان کے ساتھ دُو قوتیں ہمیشہ لگی ہوئی ہیں۔ ایک فرشتے اور دُوسرے شیطان۔ گویا اس کی ٹانگوں میں دُو رستے پڑے ہوئے ہیں۔ فرشتہ نیکی میں ترغیب اور مدد دیتا ہے۔ جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے اَیَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ اور شیطان بدی کی طرف ترغیب دیتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے یُوَسۡوِسُ۔ ان دونوں کا انکار نہیں ہوسکتا۔ ظلمت اور نُور ہر دو ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ عدم علم سے عدم شئے ثابت نہیں ہوسکتا۔ ماسوائے اس عالم کے اور ہزاروں عجائبات ہیں۔ گو لَایُدرَکْ ہوں۔ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ میں شیطان کے ان وساوس کا ذکر ہے جو کہ وہ لوگوں کے درمیان اِن دنوں ڈال رہا ہے۔ بڑا وسوسہ یہ ہے کہ رُبوبیّت کے متعلق غلطیاں ڈالی جائیں۔ جیساکہ امیر لوگوں کے پاس بہت مال و دولت دیکھ کر انسان کہے کہ یہی پرورش کرنے والے ہیں۔

شیطانی وساوس کا علاج

اس واسطے حقیقی ربّ النّاس کی پناہ چاہنے کے واسطے فرمایا۔ پھر دُنیوی بادشاہوں اور حاکموں کو انسان مختارِ مطلق کہنے لگ جاتا ہے۔ اس پر فرمایا کہ مالک النّاس اللہ ہی ہے۔ پھر لوگوں کے وساوس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مخلوق کو خدا کے برابر ماننے لگ پڑتے ہیں اور ان سے خوف و رجا رکھتے ہیں۔ اس واسطے اِلٰہ النّاس فرمایا۔ یہ تین وساوس ہیں۔ ان کے دُور کرنے کے واسطے یہ تین تعویذ ہیں اور ان وساوس کے ڈالنے والا وہی خنّاس ہے، جس کا نام توریت میں زبانِ عبرانی کے اندر ناحاش آیا ہے۔ جو حوّا کے پاس آیا تھا چھُپ کر حملہ کرنے والا۔ اس سورۃ میں اُسی کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دجّال بھی جبر نہیں کرے گا بلکہ چھپ کر حملہ کرے گا تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ جیساکہ پادریوں کا حملہ ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ شیطان خود حوّا کے پاس گیا ہو۔ بلکہ جیساکہ اب چھُپ کر آتا ہے ویسا ہی تب بھی چھُپ کر گیا تھا۔ کسی آدمی کے اندر وُہ اپنا خیال بھر دیتا ہے اور وُہ اُس کا قائم مقام ہوجاتا ہے۔ کسی ایسے

مخالفِ دین کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈال دی تھی اور وُہ بہشت جس میں حضرت آدمؑ رہتے تھے، وہ بھی زمین پر ہی تھا۔ کسی بدنے ان کے دل میں وسوسہ ڈال دیا۔ قرآن شریف کی پہلی ہی سُورت میں جو اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے کہ مغضوب علیہم اور ضالین لوگوں میں سے نہ بننا یعنی اے مسلمانو! تم یہوؔ اور نصاریٰ کے خصائل کو اختیار نہ کرنا۔ اس میں سے بھی ایک پیشگوئی نکلتی ہے کہ بعض مُسلمان ایسا کریں گے یعنی ایک زمانہ آوے گا کہ ان میں سے بعض یہود اور نصاریٰ کے خصائل اختیار کریں گے۔ کیونکہ حکم ہمیشہ ایسے امر کے متعلق دیا جاتا ہے جس کی خلاف ورزی کرنے والے بعض لوگ ہوتے ہیں۔"

قرآن خاص وحی ہے

فرمایا:

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا کلام وحی ہوتا تھا مگر قرآن شریف ایک خاص وحی ہوتا۔ وُہ ایک نُور ہوتا۱ؔ"

۱۰ر مارچ ۱۹۰۱ء

مشکلات کا واحد حل

ایک شخص نے اپنی بعض مشکلات کے حل کے واسطے دُعا کے لیے عرض کی۔ فرمایا:

"دُعا کریں گے۔"

وُہ شخص اپنے کاموں میں شاید کسی اور پر بھروسہ رکھتا تھا۔ اس پر فرمایا: "انسان پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔" صرف خدا پر بھروسہ کرو ۔۔۔ جب انسان پر بھروسہ کروگے۔ تب ہی خالی رہوگے۔ اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسلام یہی ہے کہ صرف خدا کے لیے ہو جاؤ۔ پھر سارے مشکلات حل ہو جاتے ہیں۔" فرمایا:

"خدا تعالیٰ کا جلال اسی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ دُنیا سے شرک کو دُور کیا جائے، کیونکہ شرک ایسا گناہ ہے جس کی نسبت خدا نے کہا ہے کہ یہ بخشا نہیں جائے گا۔ اس وقت بڑا شرک یہی ہے کہ مسیحؑ کو خدا بنایا جاتا ہے۔"

فرمایا:

سُورۃ اخلاص میں فِتنۂ نصاریٰ کا رَدّ

"چونکہ نصاریٰ کا فتنہ سب سے بڑا ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے ایک سُورۃ قرآن شریف کی تو ساری کی ساری صرف ان کے متعلق خاص کر دی ہے یعنی سُورۃ اخلاص اور کوئی سُورۃ ساری کی ساری کسی قوم کے واسطے

۱؎ الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ صفحہ ۹-۱۰ پرچہ ۳۱ر مارچ ۱۹۰۱ء

خاص نہیں ہے۔ اَحَدٌ خدا کا اسم ہے اور احد کا مفہوم واحد سے بڑھ کر ہے۔ صَمَد کے معنی ہیں ازل سے غنی بالذات جو بالکل محتاج نہ ہو۔ اقنومِ ثلثہ کے ماننے سے وُہ محتاج پڑتا ہے[1]۔"

۱۱ر مارچ ۱۹۰۱ء

فرمایا:

"ساری خوشیاں ایمان کے ساتھ ہیں[2]۔"

۲۱ر مارچ ۱۹۰۱ء

وجد و سُرور کا رُوحانیت سے تعلق نہیں

فرمایا:

"بعض انسانوں کو دیکھو گے کہ کافیاں اور شعر سُن کر وجد وطرب میں آجاتے ہیں، مگر جب مثلاً ان کو کسی شہادت کے لیے بُلایا جاتے، تو عذر کریں گے کہ ہمیں معاف رکھو۔ ہمیں تو فریقین سے تعلق ہے۔ ہمیں اس معاملہ میں داخل نہ کرو۔ پس سچائی کا اظہار نہ کریں گے۔ ایسے لوگوں کے وجد و سُرور سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ جب کسی ابتلاء میں آجاتے ہیں، تو اپنی صداقت کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ اُن کا وجد و سُرور قابلِ تعریف نہیں۔ یہ وجد و سُرور ایک عارضی چیز اور طبعی امر ہے۔ بعض مُنکرینِ اسلام جن کو تمام پاکبازوں سے دلی عداوت ہے۔ وُہ بھی اس سُرور سے حصّہ لیتے ہیں۔ ایک متعصب ہندو مثنوی مولوی رُومی رحمۃ اللہ علیہ پڑھ کر سُرور حاصل کرتا تھا؛ حالانکہ وُہ دشمنِ اسلام تھا۔ کیا تم سانپ کو پاکباز مانو گے، جو بانسری سُن کر سُرور میں آجاتا ہے یا اُونٹ کو خدا رسیدہ قرار دو گے جو خوش الحانی سے نشہ میں آجاتا ہے۔ سچائی کا کمال جس سے خدا خوش ہوتا ہے وُہ یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنی وفاداری دکھائے۔ ایسے انسان کا تھوڑا عمل بھی دوسرے کے بہت عمل سے بہتر ہے۔ مثلاً ایک شخص کے دو نوکر ہیں۔ ایک نوکر دن میں کئی دفعہ اپنے مالک کی خدمت میں آکر سلام کرتا ہے اور ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ صفحہ ۹ پرچہ ۳۱ر مارچ ۱۹۰۱ء

[2] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ صفحہ ۱۰ پرچہ ۳۱ر مارچ ۱۹۰۱ء

دوسرا اس کے پاس بہت کم آتا ہے، مگر مالک پہلے کو بہت **قلیل تنخواہ** دیتا ہے اور دُوسرے کو بہت زیادہ۔ اس لیے کہ وُہ جانتا ہے کہ دُوسرا ضرورت کے وقت اُس پر جان بھی دینے کے لیے تیار ہے اور وفادار ہے اور پہلا کسی کے بہکانے سے مجھے قتل کرنے پر بھی آمادہ ہو جائے گا۔ یا کم از کم مجھے چھوڑ کر کسی دُوسرے کی ملازمت اختیار کرے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ سے وفاداری کا تعلق نہیں رکھتا، مگر پنج وقتہ نماز ادا کرتا ہے اور اشراق تک بھی پڑھتا ہے بلکہ کئی ایک اَوراد بھی تجویز کئے ہوئے ہیں، تو وُہ خدا تعالیٰ کی نظر میں ایک وفادار انسان سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، کیونکہ خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ ابتلاء کے وقت وفاداری نہیں دکھلائے گا۔ جب انسان وفاداری اختیار کرے گا، تو سُرور لازمی طور پر اس کو حاصل ہو جائے گا۔ جیساکہ کھانا آتا ہے، تو دسترخوان بھی ساتھ آجاتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ کاملوں پر بھی بعض قبض کے وقت آجاتے ہیں، کیونکہ قبض کے وقت انسان کو سُرور کی قدر زیادہ ہوتی ہے اور اس کو زیادہ لذّت حاصل ہوتی ہے۔" فرمایا :

دوسرے کے متعلق رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کی جائے

"انسان دُوسرے شخص کی دل کی ماہیّت معلوم نہیں کرسکتا اور اس کے قلب کے مخفی گوشوں تک اس کی نظر نہیں پہنچ سکتی، اس لیے دُوسرے شخص کی نسبت جلدی سے کوئی رائے نہ لگائے، بلکہ صبر سے انتظار کرے۔ ایک شخص کا ذکر ہے کہ اس نے خدا تعالیٰ سے عہد کیا کہ مَیں سب کو اپنے سے بہتر سمجھوں گا اور کسی کو اپنے سے کمتر خیال نہیں کروں گا۔ اپنے محبُوب کو راضی کرنے کے لیے انسان ایسی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ ایک دن اس نے ایک دریا کے پُل کے پاس جہاں سے بہت آدمی گذر رہے تھے ایک شخص بیٹھا ہوا دیکھا اور اس کے پہلو میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بوتل اس شخص کے ہاتھ میں تھی۔ آپ پیتا تھا اور اُس عورت کو بھی پلاتا تھا۔ اُس نے اس پر بدظنی کی اور خیال کیا کہ مَیں اس بے حیا سے تو ضرور بہتر ہوں۔ اتنے میں ایک کشتی آئی اور معہ سواریوں کے ڈوب گئی۔ وہی شخص جو عورت کے پاس بیٹھا تھا، دریا میں سے سوائے ایک کے سب کو نکال لایا اور اس بدظن سے کہا کہ تُو مجھ پر بدظنی کرتا تھا۔ سب کو مَیں نکال لایا ہوں، ایک کو تُو نکال لا۔ خدا نے مجھے تیرے امتحان کے لیے بھیجا تھا اور تیرے دل کے ارادہ سے مجھے اطلاع دی۔ یہ عورت میری والدہ ہے اور بوتل میں شراب نہیں دریا کا پانی ہے۔ غرض انسان دُوسرے کی نسبت جلد رائے نہ لگائے۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۴-۱۵ پرچہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء

۳۱ / مارچ ۱۹۰۱ئہ

تقریر حضرت اقدسؑ



بعثتِ مُرسلین کے متعلق خدا تعالیٰ کی ازلی سُنّت

"سب صاحب اس بات کو سُن لیں کہ چونکہ ہماری یہ سب کارروائی خدا ہی کے لیے ہے۔ وہ اس غفلت کے زمانہ میں اپنی حجّت پوری کرنا چاہتا ہے جیسے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں ہوتا رہا ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ زمین پر تاریکی پھیل گئی ہے تو وہ تقاضا کرتا ہے کہ لوگوں کو سمجھا دے اور قانون کے موافق حجّت پوری کرے۔ اس لیے زمانہ میں جب حالات بدل جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں رہتا۔ سمجھ کم ہو جاتی ہے۔ اس وقت خدا تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو مامور کر دیتا ہے تاکہ غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو سمجھائے اور یہی بڑا نشان اس کے مامور ہونے پر ہوتا ہے کہ وہ لغو طور پر نہیں آتا ہے۔ بلکہ تمام ضرورتیں اس کے وجود پر شہادت دیتی ہیں۔ جیسے ہمارے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا اعتقادی اور عملی حالت بالکل خراب ہو گئی تھی اور نہ صرف عرب کی بلکہ کُل دنیا کی حالت بگڑ چکی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم : ۴۲) اس فسادِ عظیم کے وقت خدا تعالیٰ نے اپنے کامل اور پاک بندہ کو مامور کرکے بھیجا جس کے سبب سے تھوڑی ہی مدت میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہو گئی۔ مخلوق پرستی کی بجائے خدا تعالیٰ پُوجا گیا۔ بداعمالیوں کی بجائے اعمالِ صالحہ نظر آنے لگے۔ ایسا ہی اس زمانہ میں بھی دُنیا کی اعتقادی اور عملی حالت بگڑ گئی ہے اور اندرونی اور بیرونی حالت انتہا تک خطرناک ہو گئی ہے۔ اندرونی حالت ایسی خراب ہو گئی ہے کہ قرآن تو پڑھتے ہیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ کیا پڑھتے ہیں۔ اعتقاد بھی کتاب اللہ کے برخلاف ہو گئے ہیں اور اعمال بھی۔ مولوی بھی قرآن کو پڑھتے ہیں اور عوام بھی، مگر تدبّر نہ کرنے میں دونوں برابر ہیں۔ اگر غور کرتے تو بات کیسی صاف تھی۔ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مثیلِ موسیٰؑ پیدا کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک سلسلہ پیدا کرتا ہے۔ پھر جب اس سلسلہ پر ایک دراز عرصہ گذرنے کے بعد ایک قسم کا پردہ سا چھا جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کے بدلے میں اور سلسلہ اسی رنگ میں قائم کرتا ہے۔

قرآن شریف سے دوؔ سلسلوں کا پتہ لگتا ہے۔ اوّل بنی اسرائیل کا سلسلہ جو موسیٰؑ سے شروع ہوا اور حضرت

عیسٰی علیہ السلام پر ختم ہو گیا؛ چونکہ یہود کی بداعمالیاں آخری حد تک پہنچ گئی تھیں اور اُن میں یہانتک شقاوت اور سنگدلی پیدا ہو گئی تھی کہ وُہ انبیاءؑ کے قتل تک مستعد ہوتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے غضب کی راہ سے اِس سلسلہ کو جس میں مُلوک اور انبیاءؑ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ پر ختم کر دیا۔

مسیح کی بے باپ ولادت نشان ہے

مَیں ہمیشہ سے اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ بے باپ پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کا بے باپ پیدا ہونا ایک نشان تھا اس بات پر کہ اب بنی اسرائیل کے خاندان میں نبوّت کا خاتمہ ہوتا ہے، کیونکہ ان کے ساتھ وعدہ تھا کہ بشرطِ تقویٰ نبوت بنی اسرائیل کے گھرانے سے ہوگی، لیکن جب تقویٰ نہ رہا تو یہ نشان دیا گیا تاکہ دانشمند سمجھ لیں کہ اب آئندہ اس سلسلہ کا انقطاع ہو گا۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کی نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ پہلی کتابوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ بنی اسماعیل میں بھی ایک سلسلہ اسی سلسلہ کا ہمرنگ پیدا ہو گا اور اس کے امام و پیشوا اور سردار محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہوں گے۔ توریت میں بھی یہ خبر دی گئی تھی۔ قرآن شریف نے بھی فرمایا۔ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل: ۱۶) جیسے توریت میں مانند کا لفظ تھا۔ قرآن شریف میں کَمَا کا لفظ موجود ہے۔

آں حضرتؐ مثیلِ موسیٰؑ ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم بالاتفاق مثیلِ موسیٰؑ ہیں۔ سُورۃ نُور میں بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ سلسلۂ محمدیہ موسویہ سلسلہ کا مثیل ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے درمیانی انبیاء کا ذکر قرآن شریف نے نہیں کیا۔ لَمْ نَقْصُصْ (المومن: ۷۹) کہہ دیا۔ یہاں بھی سلسلۂ محمدیّہ میں درمیانی خلفاء کا نام نہیں لیا۔ جیسے وہاں ابتدا اور انتہاء بتائی، یہاں بھی یہ بتا دیا کہ ابتدا مثیلِ موسیٰؑ سے ہو گی اور انتہا مثیلِ عیسیٰؑ پر۔ گویا خاتم الخلفاء وہی ہے جس کو دُوسرے لفظوں میں مسیح موعود کہتے ہیں۔ مَوْعُود اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

آیت استخلاف میں مسیح موعود کی پیشگوئی

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (النور: ۵۶) میں خلفاء کے تقرر کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا، اسی وعدہ میں وُہ خاتم الخلفاء بھی شامل ہے اور نصِ قرانی سے ثابت ہوا کہ وہ مَوعُود ہے۔ جو خط ایک نقطہ سے شروع ہو گا وُہ ختم بھی نقطہ پر ہی ہو گا۔ پس جیسے وہاں خاتم مسیح ہے، یہاں بھی خاتم الخلفاء ہے۔ اس لیے یہ اعتقاد اسی قسم کا ہے کہ اگر کوئی انکار کرے کہ اس اُمّت میں مسیح موعود نہ ہو گا وہ قرآن سے انکار کرتا ہے اور اس کا ایمان جاتا رہے گا۔ اور یہ بالکل واضح بات ہے۔ اس میں تکلّف اور تصنّع اور بناوٹ کا نام نہیں ہے۔ پھر جو شک وشُبہ کرے وہ قرآنِ شریف کو چھوڑتا ہے۔

سورۃ فاتحہ میں منعمین کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے اس کو کئی سورتوں میں بیان کر دیا ہے۔ اوّل تو یہی سُورۃ نور۔ دُوسری سورۃ فاتحہ جس کو ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں۔ اس سُورۃ میں تین گذشتہ فرقے پیش کیے ہیں۔ ایک وہ جو اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ کے مصداق ہیں۔ دُوسرے مَغۡضُوۡب، تیسرے ضَآلِّیۡن۔ مغضوب سے یہ مخصوصًا مراد نہیں کہ قیامت میں ہی غضب ہوگا۔ کیونکہ جو کتاب اللہ کو چھوڑتا اور احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتا ہے ان سب پر غضب ہوگا۔ مغضوب سے مراد بالاتفاق یہود مراد ہیں اور اَلضَّآلِّیۡن سے نصاریٰ۔ اب اس دُعا سے معلوم ہوتا ہے کہ منعم علیہ فرقہ میں داخل ہونے اور باقی دو سے بچنے کے لیے دُعا ہے اور یہ سنّت اللہ ٹھہری ہوئی ہے۔ جب سے نبوّت کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ قانون مقرر کر رکھا ہے کہ جب وہ کسی قوم کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے، تو بعض اس کی تعمیل کرنے اور بعض خلاف ورزی کرنے والے ضرور ہوتے ہیں۔ پس بعض منعم علیہ بعض مغضوب اور بعض ضالّین ضرور ہوں گے۔

اب زمانہ بآوازِ بلند کہتا ہے کہ اس سُورۃ شریف کے موافق ترتیب آخر سے شروع ہوگئی ہے۔ آخری فرقہ نصاریٰ کا رکھا ہے۔ اب دیکھو کہ اس میں کس قدر لوگ داخل ہوگئے ہیں۔ ایک بشپ نے اپنی تقریر میں ذکر کیا ہے کہ بیس[2] لاکھ مُسلمان مُرتد ہو چکے ہیں اور یہ قوم جس زور شور کے ساتھ نکلی ہے اور جو جو طریق اُس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے اختیار کیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی عظیم الشان فتنہ نہیں ہے۔ اب دیکھو کہ تین باتوں میں سے ایک تو ظاہر ہوگئی۔ پھر دُوسری قوم مغضوب ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا وقت بھی آگیا اور وُہ بھی پُورا ہو رہا ہے۔ یہودیوں پر غضبِ الٰہی اس دُنیا میں بھی بھڑکا اور طاعُون نے اُن کو تباہ کیا۔ اب اپنی بدکاریوں اور فسق وفجور کی وجہ سے طاعُون بکثرت پھیل رہی ہے۔ کتمانِ حق سے وہ لوگ جو عالم کہلاتے ہیں۔ نہیں ڈرتے۔ اب ان دونوں کے پورا ہونے سے تیسرے کا پتہ صاف ملتا ہے۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ جب چار میں سے تین معلوم ہوں، تو چوتھی شے معلوم کرلیتا ہے اور اس پر اس کو اُمید ہو جاتی ہے۔ نصاریٰ میں لاکھوں داخل ہوگئے۔ مغضُوب میں داخل ہوتے جاتے ہیں منعم علیہ کا نمونہ بھی اب خدا دکھانا چاہتا ہے، جبکہ سورۃ فاتحہ میں دُعا تھی اور سُورۃ نور میں وعدہ کیا گیا ہے۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سُورۃ نور میں دُعا قبول ہوگئی ہے۔ غرض اب تیسرا حصّہ منعم علیہ کا ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس کو روشن طور پر ظاہر کردے گا اور یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے، جو ہو کر رہے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ انسان کو ثواب میں داخل کرنا چاہتا ہے تاکہ وُہ استحقاق جنّت کا ثابت کریں۔ جیسا پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں ہوا۔ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ وُہ صحابہ کے بدُوں ہی پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہر قسم کی فتوحات عطا فرماتا، مگر

نہیں۔ خدا نے صحابہ کو شامل کر لیا تاکہ وہ مقبول ٹھہریں۔ اس سنّت کے موافق یہ بات ہماری جماعت کو پیش آگئی ہے کہ بار بار تکلیف دی جاتی ہے اور چندے مانگے جاتے ہیں۔

ہمارے دو ضروری کام

اس وقت ہمارے دو بڑے ضروری کام ہیں۔ ایک یہ کہ عرب میں اشاعت ہو، دُوسرے یُورپ پر اتمامِ حجت کریں۔ عرب پر اس لیے کہ اندرونی طور پر وہ حق رکھتے ہیں۔ ایک بہت بڑا حصّہ ایسا ہوگا کہ اُن کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ خدا نے کوئی سلسلہ قائم کیا ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ اُن کو پہنچائیں۔ اگر نہ پہنچائیں تو معصیت ہوگی۔ ایسا ہی یُورپ والے حق رکھتے ہیں کہ اُن کی غلطیاں ظاہر کی جاویں کہ وہ ایک بندہ کو خدا بنا کر خُدا سے دُور جا پڑے ہیں — یُورپ کا تو یہ حال ہوگیا ہے کہ واقعی اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ کا مصداق ہوگیا ہے۔ طرح طرح کی ایجادیں صنعتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے تعجب مت کرو کہ یُورپ ارضی علُوم و فنون میں ترقی کر رہا ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب آسمانی علُوم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، تو پھر زمین ہی کی باتیں سُوجھا کرتی ہیں۔ یہ کبھی ثابت نہیں ہوا کہ نبی کلیں بھی بنایا کرتے تھے یا اُن کی ساری کوششیں اور ہمتیں ارضی ایجادات کی انتہا ہوتی تھیں۔

ایک قرآنی پیشگوئی کا ظہور

آج جو اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کا زمانہ ہے۔ یہ مسیح موعُود ہی کے وقت کے لیے مخصوص تھا؛ چنانچہ اب دیکھو کہ کس قدر ایجادیں اور نئی کانیں نکل رہی ہیں۔ ان کی نظیر پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی ہے۔ میرے نزدیک طاعُون بھی اسی میں داخل ہے۔ اس کی جڑ زمین میں ہے۔ پہلا اثر چُوہوں پر ہوتا ہے۔ غرض اس وقت زمینی علوم کمال تک پہنچ رہے ہیں۔ توہینِ اسلام کی حد ہو چکی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس پچاس ساٹھ سال میں جس قدر کتابیں، اخبار، رسالے توہینِ اسلام میں شائع ہوئے ہیں، کبھی ہوئے تھے؟ پس جب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے، تو کوئی مومن نہیں بنتا۔ جب تک کہ اس کے دل میں غیرت نہ ہو۔ بے غیرت آدمی دیوث ہوتا ہے۔

عبادت محبّت ہی کا دُوسرا نام ہے

اگر اسلام کی عزّت کے لیے دل میں محبّت نہیں ہے، تو عبادت بھی بے سُود ہے، کیونکہ عبادت محبّت ہی کا دوسرا نام ہے۔ وہ تمام لوگ جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ایسی چیز کی عبادت کرتے ہیں جس پر کوئی سلطان نازل نہیں ہوا، وہ سب مشرک ہیں۔ سلطان تسلّط سے لیا گیا ہے جو دل پر تسلّط کرے اس لیے یہاں دلیل کا لفظ نہیں لکھا ہے۔

عبادت کیا ہے۔ جب انتہا درجہ کی محبّت کرتا ہے۔ جب انتہا درجہ کی اُمید ہو۔ انتہا درجہ کا خوف ہو۔

یہ سب عبادت میں داخل ہے۔ غیر اللہ کی عبادت کا اتنا ہی مفہوم نہیں ہے کہ سجدہ نہ کیا جاوے۔ نہیں۔ بلکہ اُس کے مختلف مدارج ہیں۔ اگر کوئی مال سے انتہاء درجہ کی محبت کرتا ہے، تو وہ اُس کا بندہ ہوتا ہے۔ خدا کا بندہ وُہ ہے جو خدا کے سوا اور چیزوں کی حدِ اعتدال تک رعایت کرتا ہے۔ اسلام میں محبت و امید منع نہیں ہے، مگر ایک حد تک۔

اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمادیا ہے کہ جو خدا سے محبت کرتے ہیں اُسی سے ڈرتے اسی سے امید رکھتے ہیں۔ وُہ ایک سُلطان رکھتے ہیں، لیکن جو نفس کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی سُلطان نہیں ہے جو محکم طور پر دل کو پکڑے۔ غرض انسان کا کوئی فعل اور قول ہو جبتک وُہ خدائی سُلطان کا پیرو نہ ہو۔ شرک کرتا ہے۔ پس ہم جو اپنی کارروائی کی دو طور پر اشاعت چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی شاہد نہیں ہوسکتا کہ کس قدر سچے جوش اور خالصتہً ﷲ اس کو پیش کرتے ہیں۔ ہمیں اتفاق نہیں ہوا کہ انگریزی میں لکھ پڑھ سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم کبھی بھی اپنے دوستوں کو تکلیف نہ دیتے، مگر اس میں مصلحت یہ تھی کہ تا دُوسروں کو ثواب کے لیے بلائیں، ورنہ میری طبیعت تو ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو کام مَیں خود کر سکتا ہوں۔ اُس کے لیے کسی دُوسرے کو کبھی کہتا ہی نہیں۔ اگر آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور چار برس زندگی پاتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہٗ فوت ہو جاتے۔ دراصل آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم وہ فتح عظیم جس کا آپؐ کے ساتھ وعدہ تھا، حاصل کر چکے تھے۔ رَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر : ۳) دیکھ چکے تھے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ (المائدہ : ۴) ہو چکا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے نہ چاہا کہ اُن کو محروم رکھے، بلکہ یہی چاہا کہ اُن کو بھی ثواب میں داخل کر دے۔ اسی طرح پر اگر اللہ تعالیٰ چاہتا، تو ہم کو اس قدر خزانے دے دیتا کہ ہم کو پرواہی نہ رہتی۔ مگر خدا ثواب میں داخل کرتا ہے، جس کو وہ چاہتا ہے۔ یہ سب جو بیٹھے ہیں یہ قبریں ہی سمجھو، کیونکہ آخر مرنا ہے۔ پس ثواب حاصل کرنے کا وقت ہے۔ مَیں ان باتوں کو جو خدا نے میرے دل پر ڈالی ہیں۔ سادہ اور صاف الفاظ میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ثواب کے لیے مستعد ہو جاؤ اور یہ بھی مت سمجھو کہ اگر اس راہ میں خرچ کریں گے، تو کچھ کم ہو جاوے گا۔ خدا تعالیٰ کی بارش کی طرح سب کمیاں پُوری ہو جائیں گی۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال : ۸)۔

یاد رکھو۔ خدا کی توفیق کے بغیر دین کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ جو شخص دین کی خدمت کے واسطے شرحِ صدر سے اُٹھتا ہے۔ خدا اُس کو ضائع نہیں کرتا۔ غرض خلاصہ یہ ہے کہ ایک پہلو تو مَیں کر رہا ہوں، دُوسرے پہلو کو ہماری انگریزی خواں جماعت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اُنھوں نے یہ تجویز کی ہے کہ تجارت کے طریق پر یہ کام جاری ہو جائے۔ دین کی اشاعت ہو جائے گی اور اُن کا کوئی حرج نہ ہو گا۔ امید ہے کہ خدا

اس کا اجر دے گا۔

مَیں یہ صرف اپنی جماعت کے اِرادوں کا ترجمہ کرتا ہوں۔ میرا منشا تو اسی حد تک ہے کہ کسی طرح عرب اور دُوسرے ملکوں میں تبلیغ ہو جائے۔ یہ اُنھوں نے اپنی دانست میں سہل طریق مقرر کیا ہے جس کو تجارتی طریق پر سمجھ لیا جائے۔ تجارت کے اُمُور ظنِ غالب ہی پر چلتے ہیں۔ بہرحال یہ اُن کا ارادہ ہے۔ میرے نزدیک جہاں تک یہ امر مذہب سے تعلق رکھتا ہے، تو مَیں اس کی حمایت کرتا ہوں۔ اگر یہ تجویز عمل میں نہ بھی آئے تب بھی یہ کام تو ہو جائے گا۔ بہرحال آپ غور کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہتر معلوم ہے۔[1]"

یکم اپریل ۱۹۰۱ء

معرفت اور بصیرت

"اکثر لوگوں کے خطوط آتے ہیں کہ فلاں شخص نے ہم سے یہ سوال کیا اور ہم اس کا جواب نہ دے سکے۔ ایسی حالت میں انسان کچھ مذبذب اور کمزور ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو۔ آئے دن وساوس میں پڑنا ناقص معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ معرفت اور بصیرت تو ایسی شے ہے کہ انسان فرشتوں سے مصافحہ کر لیتا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ معرفت جیسی کوئی طاقت نہیں ہے۔ پرندے کہاں تک اُڑ کر جاتے ہیں، لیکن معرفت والا انسان اُن سے بھی آگے نکل جاتا ہے اور بہت دُور پہنچ جاتا ہے۔ پس اصل مدعا یہی ہے کہ ہمیں وہ یقین حاصل کرنا چاہیے جو اطمینان کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ بدُوں اس کے انسان بالکل اُدھورا اور ناقص ہے اور اس کی ترقی کے دروازے بند ہیں۔

مامور من اللہ کی صحبت ضروری ہے

ہماری جماعت کے لیے یہ امر ضروری پڑا ہوا ہے کہ وُہ اپنے وقتوں میں کچھ وقت نکال کر آئیں اور یہاں صحبت میں رہ کر اس غفلت کی تلافی کریں جو غیبوبیت کے زمانہ میں پیدا ہوئی ہے اور اُن شبہات کو دُور کریں جو اس غفلت کا باعث ہوتے ہیں۔ اُن کا حق ہے کہ وُہ ان کو پیش کریں اور اُن کا جواب ہم سے سنیں۔ بھلا اگر کمزور بچہ جو ابھی دُودھ پینے اور ماں کے کنارِ عاطفت کا محتاج ہے۔ اس سے الگ کر دیا جائے تو تم اُمید کر سکتے ہو کہ وُہ بچ رہے گا۔ کبھی نہیں۔ اسی طرح بلوغ سے پیشتر کے کمال اور معرفت کا حال ہے۔ انسان کمزور بچہ کی طرح ہوتا ہے۔ مامور من اللہ کی صحبت اس کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اگر وُہ اس سے الگ ہو جائے، تو

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ صفحہ ۵ تا ۸ پرچہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء

اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔

مرکز میں بار بار آنے کی ضرورت

درحقیقت یہ ایک بہت ہی ضروری امر ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کسی کو توفیق دے اور وہ اس کو سمجھ لے کہ بار بار آنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ اس سے یہی نہ ہوگا کہ وہ اپنے نفس کو فائدہ پہنچائے گا، بلکہ بہتوں کو فائدہ پہنچا سکے گا، کیونکہ جبتک خود ایک معرفت اور بصیرت پیدا نہ ہو وُہ دُوسروں کو کیا راہ بتلائے گا۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ بعض شریرالطبع لوگ ایسے آدمیوں کو جن کو بار بار آنے کی عادت نہیں کوئی سوال کرتے ہیں؛ چونکہ اُنھوں نے جوابات سُنے ہوئے نہیں ہوتے اور ساکت ہوکر نہ صرف خود خفت اُٹھاتے ہیں، بلکہ دُوسروں کے لیے جو دیکھنے سُننے والے ہوتے ہیں ٹھوکر کا موجب ہو جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس خفت اور سکوت سے ایمان پر ایک زد پڑتی ہے اور اس میں کمزوری شروع ہوجاتی ہے، کیونکہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان مغلوب ہوجاتا ہے، تو وُہ غالب کے اثر سے بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات اُس کے دل کو وُہ اثر سیاہ کر دیتا ہے اور پھر قاعدہ کے موافق وہ تاریکی بڑھنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُسی میں اُس کو موت آجائے، تو وُہ جہنّم میں داخل ہوا۔ اِن ساری باتوں پر غور کرکے ایک دانشمند اس نتیجہ پر ضرور پہنچے گا کہ اس بات کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ ان زہروں کے دُور کرنے کے واسطے جو رُوح کو تباہ کرتی ہیں کسی تریاقی صحبت کی ضرورت ہے۔ جہاں رہ کر انسان مُہلکات کا علم بھی حاصل کرتا ہے اور نجات دینے والی چیزوں کی معرفت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی واسطے ایک عرصہ سے میرے دل میں یہ بات ہے اور مَیں سوچتا ہوں کہ اپنی جماعت کا امتحان سوالات کے ذریعہ سے لُوں؛ چنانچہ مَیں نے اس تجویز کا کئی بار ذکر بھی کیا ہے؛ اگرچہ ابھی مجھے موقعہ نہیں ملا، لیکن یہ بات میرے دل میں ہمیشہ رہتی ہے کہ ایک بار سوالات کے ذریعہ آزماکر دیکھوں کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس کے متعلق ان کو کہاں تک علم ہے اور اُنھوں نے ہمارے مقاصد اور اغراض کو کہاں تک سمجھا ہے۔ اور جو اعتراض اندرونی یا بیرونی طور پر کیے جاتے ہیں اُن کی مدافعت کہاں تک کر سکتے ہیں۔ اگر چالیس آدمی بھی ایسے نکل آویں جن کے نفس منوّر ہو جاویں اور پُوری بصیرت اور معرفت کی روشنی انہیں مِل جاتے تو وُہ بہت کچھ فائدہ پہنچا سکیں۔

یہ سلسلہ منہاجِ نبوّت پر قائم ہے

مَیں سولہ سترہ برس کی عُمر سے عیسائیوں کی کتابیں پڑھتا ہوں اور اُن کے اعتراضوں پر غور کرتا رہا ہوں۔ مَیں نے اپنی جگہ اُن اعتراضوں کو جمع کیا ہے، جو عیسائی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر کرتے ہیں اُن کی تعداد تین ہزار کے قریب پہنچی ہوئی ہے۔ لیکن جب مَیں ان لوگوں کے اعتراضوں کو پڑھتا ہوں جو میری ذات

کی نسبت کرتے ہیں، تو مَیں ہمیشہ یہی کہا کرتا ہوں کہ ابھی ان اعتراضوں میں پُورا کمال نہیں ہوا، کیونکہ خاتم النبیین کی پاک ذات پر جب اِس قدر اعتراض کیے گئے ہیں تو ہم مخالفوں کا مُنہ کیونکر بند کر سکتے ہیں۔ پھر مَیں یہ بھی کہتا ہوں کہ میری نسبت جس قدر اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک بھی ایسا اعتراض نہیں ہے جو اولوالعزم انبیاءؑ پر نہ کیا گیا ہو۔ اگر کسی کو اس میں شک ہو تو وہ میری ذات پر کوئی اعتراض کر کے دکھائے جو کسی پہلے نبی پر نہ کیا گیا ہو، مگر ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ جس قسم کا اعتراض مجھ پر کیا جائے گا یا جواب تک ہوئے ہیں۔ اسی قسم کے اعتراض اُن پر ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ منہاجِ نبوت پر قائم ہوا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ کی سچائی کے لیے وہی معیار ہے جو انبیاء علیہم السّلام کی صداقت کے لیے ہوتا ہے۔

کامل مومن

اللہ تعالیٰ گواہ ہے اور اس سے بڑھ کر ہم کس کو شہادت میں پیش کر سکتے ہیں۔ کہ جیسا کہ مَیں نے ابھی کہا ہے۔ سولہ یا سترہ برس کی عُمر سے عیسائیوں کی کتابیں پڑھتا رہا ہوں، مگر ایک طرفۃ العین کے لیے بھی اُن اعتراضوں نے میرے دل کو مذبذب یا متاثر نہیں کیا اور یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل ہے۔ مَیں جُوں جُوں ان کے اعتراضوں کو پڑھتا جاتا ہوں اسی قدر اُن اعتراضوں کی ذلت میرے دل میں سماتی جاتی ہے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور محبت سے دل عطر کے شیشہ کی طرح نظر آتا ہے۔ مَیں نے یہ بھی غور کیا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس پاک فعل پر یا قرآن شریف کی جس آیت پر مخالفوں نے اعتراض کیا ہے، وہاں ہی حقائق اور حکمؔ کا ایک خزانہ نظر آیا ہے جو کہ ان بدباطن اور خبیث طینت مخالفوں کو عیب نظر آیا ہے۔

سُنو! انسان کامل اس وقت تک نہیں ہوتا، جبتک کفار کی باتوں سے متاثر نہ ہونے والی فطرت حاصل نہ کرے۔ اور یہ فطرت نہیں ملتی جب تک اُس شخص کی صحبت میں نہ رہے جو گمشدہ متاع کو واپس دلانے کے واسطے آیا ہے۔ پس جب تک کہ وُہ اُس متاع کو نہ لے اور اس قابل نہ ہو جائے کہ مخالف باتوں کا اُس پر کچھ بھی اثر نہ ہو، اُس وقت تک اُس پر حرام ہے کہ اس کی صحبت سے الگ ہو، کیونکہ وُہ اس بچّہ کی مانند ہے جو ابھی ماں کی گود میں ہے اور صرف دُودھ ہی پر اُس کی پرورش کا انحصار ہے۔ پس اگر وہ بچّہ ماں سے الگ ہو جاوے، تو فی الفور اُس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح اگر وہ صحبت سے علیحدہ ہوتا ہے تو خطرناک حالت میں جا پڑتا ہے۔ پس بجائے اس کے کہ دُوسروں کو درست کرنے کے لیے کوشش کر سکتا ہو۔ خود اُلٹا متاثر ہو جاتا ہے اور اَوروں کے لیے ٹھوکر کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے ہم کو دن رات جلن اور افسوس یہی ہے کہ لوگ بار بار یہاں آئیں اور دیر تک صحبت میں رہیں۔ انسان کامل ہونے کی حالت میں اگر ملاقات کم کر دے اور تجربہ سے دیکھ لے کہ قوی ہو گیا ہوں تو اس وقت اُسے جائز ہو سکتا ہے کہ ملاقات کم کر دے

کیونکہ بعید ہو کر بھی قریب ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب تک کمزوری ہے وہ خطرناک حالت میں ہے۔ دیکھو اس قدر لوگ عیسائی ہوگئے ہیں جن کی تعداد بیس لاکھ تک پہنچتی ہے۔ میں نے ایک بشپ کے لیکچر کا خلاصہ پڑھا تھا۔ اس نے بیان کیا ہے کہ ہم بیس لاکھ عیسائی کر چکے ہیں، تو یہ لوگ اس قسم کے تھے جو دُوسروں کے اعتراضات سے متاثر ہوگئے اور ایمان کمزور ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے مذہب کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اور عیسائیت کو قبول کر لیا۔ سراج الدین عیسائی بھی ایسے ہی آدمیوں میں سے تھا۔ یہ لوگ کسی صادق کی صحبت میں کامل زمانہ نہیں گزارتے اور طرح طرح کی خواہشوں کے اسیر اور پابند ہو کر اپنے مذہب اور ایمان جیسی قیمتی چیز کے بدلے عیسائیت خرید لیتے ہیں۔

غرض میرے دشمنوں اور مخالفوں کی تعداد ابھی ایسی خطرناک پیدا نہیں ہوئی جس قدر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اسلام میں سے نکل کر پیدا ہوگئے ہیں۔ صفدر علی اور عماد الدین وغیرہ نے کونسی کسر باقی رکھی ہے اور میں تو سچ کہتا ہوں اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ مجھے اپنی دشمنی اور اپنی توہین یا عزت اور تعظیم کا تو کچھ بھی خیال نہیں ہے۔ میرے لیے جو امر سخت ناگوار ہے اور ملالِ خاطر کا موجب ہمیشہ رہا ہے وہ یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل اور پاک انسان کی توہین کی جاتی ہے۔ اس صادقوں کے سردار سراسر صدق کو کاذب کہا جاتا ہے۔ یہ امر ہے جو میرے لیے ہمیشہ غم کا باعث رہا ہے۔ اس لیے میں اسی فکر میں رہتا ہوں کہ اس مُردہ پرست قوم کے دجل اور مکر کو کھول کر ایسا دکھا دیا جائے کہ سب کھلا کھلا دیکھ لیں۔ کل مجھے خیال آیا کہ مسیح موعود کے کام میں یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ تو آیا ہے پر یَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ کیوں آیا ہے۔ تو یہی سمجھ میں آیا کہ یہ تفنّنِ عبارت کے طور پر آیا ہے۔ وُہ لوگ جو مُرتد ہوتے ہیں۔ ان کے مادے چونکہ خراب تھے۔ اس لیے ایسے بد اتفاق بھی ان کو پیش آتے گئے۔ یہاں تک کہ آخر مُرتد ہوگئے اور صرف اپنے نفس کے غلام ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔

تریاقی صحبت

وُہ آدمی جو کسی تریاقی صحبت میں رہے اور اس طرح رہے جو رہنے کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اُس کو ایسے زہروں سے بچا لیتا ہے اور یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام کی یا آسمانی کتابوں کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ بہت صاف امر ہے۔ دیکھو۔ آنکھ میں بھی ایک روشنی اور نور ہے، لیکن وُہ سورج کی روشنی کے بغیر دیکھ نہیں سکتی۔ آنکھ خدا نے دی ہے ساتھ ہی دوسری روشنی بھی پیدا کر دی ہے، کیونکہ یہ نور دُوسرے نور کا محتاج ہے۔ اسی طرح اپنی عقل جب تک آسمانی نور اور بصیرت اُس کے ساتھ نہ ہو کچھ کام نہیں دے سکتی۔ نادان ہے وہ شخص جو کہتا ہے کہ ہم مجرد عقل سے بھی کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا نے جو طریق مقرر کیا ہے۔ اس کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو بہت سے اسرار اور اُمور ہیں جو مجھ پر کھولے گئے ہیں۔ اگر میں اُن کو بیان کروں تو خاص آدمیوں کے سوا جو صحبت

میں رہتے ہیں باقی حیران رہ جائیں۔

پس ان لوگوں کو دیکھ کر حیرت اور رونا آتا ہے جو کسی صادق کی پاک صحبت میں نہیں رہے ان لوگوں کو جو ذاتیات پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ وہ کوئی ایک اعتراض تو دکھائیں جو پہلے کسی نبی پر نہ کیا گیا ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو اعتراض آریوں نے کیے ہیں، کیا وُہ ان اعتراضوں سے جو مجھ پر ہوتے بڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ حضرت مسیحؑ پر یہودیوں نے جس قدر اعتراض کیے ہیں یا آریوں نے کئے ہیں۔ وہ دیکھو۔ کس قدر ہیں۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر جس قدر الزام لگائے جاتے ہیں، اُن کا تو شمار کرو۔

منہاجِ نبوت پر قائم سلسلہ کی مخالفت

ہاں منہاجِ نبوت پر جو سلسلہ قائم ہوگا۔ ضرور ہے کہ اس پر ایسے الزام لگائے جائیں۔ مگر آخر خدا تعالیٰ اپنے مامُور مقبول اور مطہّر کی تطہیر کر دیتا ہے اور دکھا دیتا ہے کہ وُہ ان الزاموں سے بالکل پاک ہے۔ مُعترض کی آنکھ اور دل نے دھوکا کھایا ہے۔ یہ لوگ جو اصل مقصد کو چھوڑ کر ذاتیات پر اعتراض کرنے لگے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ خدا کا فرستادہ اپنے ساتھ دلائل اور براہینِ پُرزور رکھتا ہے اس کی ہر ایک بات پکّی اور مُحکم ہوتی ہے اور ایسے تائیدی نشان اُس کے لیے ظاہر ہوتے ہیں کہ دُوسرے اُن سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ اس لیے مخالف جب کوئی راہِ گُریز نہیں پاتے، تو رکیک عذر کرنے لگتے ہیں اور بیہُودہ نکتہ چینیاں شروع کرتے ہیں۔ جن میں سے اکثر تو افترا ہوتے ہیں۔ اور بعض ایسے امُور اور معاملات ہوتے ہیں جو کہ ان کے قصورِ فہم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر جب ہمارے مخالفوں نے دیکھا کہ جو بات ہے، وُہ معقول ہے اور دلائل اور براہین کے ساتھ موکّد کی جاتی ہے۔ پھر قرآن شریف ہمارے ساتھ ہے۔ احادیث ہمارے ساتھ ہیں۔ عقل اور قانونِ قدرت ہماری تائید کرتے ہیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر ہزاروں آسمانی نشان ہماری تائید میں ظاہر ہوئے۔ وہ نشانات بھی جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشگوئی بیان فرمائے تھے، پُورے ہوئے اور اُن کے علاوہ اور صدہا نشانات خود ہمارے ہاتھ پر پُورے ہوئے۔

اب جبکہ یہ چاروں طرف سے گھِر گئے یعنی زمانہ شہادت دے اُٹھا کہ اس وقت مامُور من اللہ کی ضرورت ہے اور ضرورتِ وقت اور واقعاتِ پیش آمدہ نے بتا دیا کہ یہ زمانہ مسیح موعود ہی کا ہے۔ اس کی تائید بزرگانِ مِلّت کے کشوف، رویا اور الہامات سے بھی ہوگئی اور قرآن شریف ہماری ہی تائید میں ثابت ہوا اور دن بدن اِس سِلسلہ کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ تب ان مخالفوں نے یہ چال بدلی کہ اور تو

کہیں ہاتھ پڑنے کی جگہ باقی نہیں ہے ذاتیات پر ہی گفتگو شروع کر دی اس خیال سے کہ انسان جلد تر اس طرز سے متاثر ہو جاتا ہے، مگر کیا ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ عیسائی بھی ایسے ہی اعتراض کرتے ہیں۔ آریوں کی ایک چھوٹی سی کتاب میں نے دیکھی جو حضرت موسیٰؑ کے متعلق اُنھوں نے لکھی ہے۔ اُنھوں نے اس میں بہت سے اعتراض کئے ہیں کہ بہت سے بچے انھوں نے قتل کرا دیئے۔ مصریوں کا مال لے گئے۔ وعدہ خلافی کی۔ جھوٹ بولا معاذ اللہ غرض کوئی بڑے سے بڑا گناہ نہیں، جو اُن کے ذمّہ نہ لگایا گیا ہو۔ گویا وُہ اُن کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔

مَیں کہہ چکا ہوں کہ جب یہ لوگ نبوّت کے طریق پر کامیاب نہیں ہوتے اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تو یہ ایسے ہی اعتراض کر دیا کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السّلام کے متعلق جو کتاب پڑھی گئی تھی، اُس نے کیا کسر باقی رکھی ہے اور ایسا ہی وہ اخبار جو آزاد خیال لوگوں کا یہاں آتا ہے۔ وہ کس قدر ہنسی اُڑاتا ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ صدق اور سچائی کے شعلے دم لینے نہیں دیتے، تو موٹی عقل والوں کو یہ لوگ دھوکا دینے لگتے ہیں اور اپنے خیال میں ایک حد تک یہ لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جس قدر عیسائی ہوتے ہیں۔ اس کا یہی باعث ہے۔ جب تک انسان کو ان علوم پر اطلاع نہ ہو۔ جو تسلّی اور اطمینان کا موجب ہوتے ہیں اور انسان کو یقین کی حد تک پہنچاتے ہیں۔ ایسے خطرات اور توہمات کے پیش آنے کا اندیشہ ہی اندیشہ ہے۔

رُوحانی تعلق کا کمال

دُنیا میں دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی تعلقات۔ جیسے ماں باپ بھائی بہن وغیرہ کے تعلقات۔ دُوسرے رُوحانی اور دینی تعلقات۔ یہ دُوسری قسم کے تعلقات اگر کامل ہو جائیں، تو سب قسم کے تعلقات سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اور یہ اپنے کمال کو تب پہنچتے ہیں۔ جب ایک عرصہ تک صحبت میں رہے۔ دیکھو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ جو جماعت صحابہؓ کی تھی، اُس کے یہ تعلقات ہی کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ جو اُنھوں نے نہ وطن کی پروا کی اور نہ اپنے مال و املاک کی اور نہ عزیز و اقارب کی۔ یہاں تک کہ اگر ضرورت پڑی، تو انھوں نے بھیڑ بکری کی طرح اپنے سر خدا کی راہ میں رکھ دیتے۔ وُہ شدائد و مصائب جو اُن کو پہنچ رہے تھے۔ اُن کے برداشت کرنے کی قوّت اور طاقت اُن کو کیونکر ملی۔ اس میں یہی سِرّ تھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا، جو آپؐ لے کر آئے تھے اور پھر دُنیا اور اُس کی ہر ایک چیز اُن کی نگاہ میں خدا تعالیٰ کے لقاء کے مقابلہ میں کچھ ہستی رکھتی ہی نہیں تھی۔

یاد رکھو جب سچائی پورے طور پر اپنا اثر پیدا کر لیتی ہے، تو وُہ ایک نُور ہو جاتی ہے جو ہر ایک تاریکی میں اُس کے اختیار کرنے والے کے لیے رہنما ہوتا ہے اور ہر مشکل میں بچاتا ہے۔

ذاتی حملے عجز کا ثبوت ہیں

ذاتی حملوں کا جو بُغض اور حسد کی بناپر کئے جاتے ہیں اور سچائی کے مقابلہ سے عاجز آکر کمینہ اور سفیہ لوگ کرتے ہیں، اُن پر یہی اثر ہوتا ہے جنھوں نے سچائی کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہوتا اور سچائی نے اُن کے دل کو منوّر نہیں کیا ہوتا۔

یہ بالکل سچی بات ہے کہ انسان اس حد تک پژمُردہ ہوتا ہے جبتک سچائی کو سمجھا ہوا نہیں۔ جُوں جُوں وُہ اُسے سمجھتا جاتا ہے اس میں ایک تازگی اور شگفتگی آتی جاتی ہے اور روشنی کی طرف آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بالکل سمجھ لیتا ہے پھر تاریکی اس کے پاس نہیں آتی ہے۔ تاریکی تاریکی کو پیدا کرتی ہے۔ اندرونی روشنی اَور روشنی کو لاتی ہے۔ اسی واسطے تاریکی کو شیطان سے تشبیہ دی ہے اور روشنی رُوح القدس سے مشابہ ہے۔ اسی طرح معرفت اور یقین کی روشنی جہاں قائم ہو جاتی ہے، وہاں تاریکی نہیں رہتی۔

استغفار اور دعاؤں میں لگ جاؤ

اس لیے مَیں کہتا ہُوں کہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر بھی یہاں آؤ۔ مُلک کی حالت خطرناک ہو رہی ہے۔ طاعُون بڑے زور کے ساتھ پھیلتی جاتی ہے اور اُس کے دورے بعض اوقات ساٹھ ساٹھ، ستّر ستّر برس تک ہوتے رہتے ہیں اور شہروں کے شہر تباہ کر دیتی ہے۔ مولوی صاحب کے پاس ہی ایک خط آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گاؤں بالکل خالی ہو گئے ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ ایک دو سال میں رُخصت ہو جاتے گی۔ یہ اپنا اثر کرکے جاتی ہے۔ پھر ہمارے تو مُلک سے دُور نہیں اس وقت پانچ ضلعے مبتلا ہو رہے ہیں۔

پس بے خوف ہو کر مت رہو۔ استغفار اور دُعاؤں میں لگ جاؤ اور ایک پاک تبدیلی پیدا کرو۔ اب غفلت کا وقت نہیں رہا۔ انسان کو نفس جھوٹی تسلّی دیتا ہے کہ تیری عُمر لمبی ہوگی۔ موت کو قریب سمجھو۔ خدا کا وجود برحق ہے۔ جو ظُلم کی راہ سے خدا کے حقوق دُوسروں کو دیتا ہے، وُہ ذلّت کی موت دیکھے گا۔ اب جیسا کہ سورۃ فاتحہ میں تین گروہ کا ذکر ہے۔ ان تین کا ہی مزہ چکھا دے گا۔ اس میں جو آخر تھے، وہ مقدّم ہو گئے۔ یعنی ضالّین۔ اسلام وہ تھا کہ ایک شخص مُرتد ہو جاتا، تو قیامت برپا ہو جاتی تھی، مگر اب بیس لاکھ عیسائی ہو چکے ہیں اور خود ناپاک ہو کر پاک وجُود کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ پھر مغضوب کا نمونہ طاعُون سے دکھایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کا گروہ ہوگا۔

یہ قاعدہ کی بات ہے اور خدا کی قدیم سے سُنّت چلی آتی ہے کہ جب وُہ کسی قوم کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ یہ کام نہ کرنا، تو اس قوم میں سے ایک گروہ ضرور خدا کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ کوئی قوم ایسی دکھاؤ کہ جس کو کہا گیا کہ تم یہ کام نہ کرنا اور اس نے نہ کیا ہو۔ خدا نے یہودیوں کو کہا کہ تحریف نہ کرو۔ اُنھوں نے تحریف کی۔ قرآن شریف کی نسبت یہ نہیں کہا بلکہ یہ کہا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر:۱۰)

غرض دعاؤں میں لگے رہو کہ خدا تعالیٰ انعمت علیہم کے گروہ میں داخل کرے۔[1]

اپریل ۱۹۰۱ء

کشف و الہام کی حقیقت

منشی الٰہی بخش صاحب وغیرہ لوگوں کی اپنی بعض حالتوں سے دھوکا کھا جانے کی نسبت گفتگو تھی۔ اس پر حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا:

" عام طور پر رؤیا اور کشوف اور الہام ابتدائی حالت میں ہر ایک کو ہوتے ہیں، مگر اس سے انسان کو یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ وہ منزلِ مقصود کو پہنچ گیا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ فطرتِ انسانی میں یہ قوت رکھی گئی ہے کہ ہر ایک شخص کو کوئی خواب یا کشف یا الہام ہو سکے؛ چنانچہ دیکھا گیا کہ بعض دفعہ کفار، ہنود اور بعض فاسق فاجر لوگوں کو بھی خوابیں آتی ہیں اور بعض دفعہ سچی بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے خود ان لوگوں کے درمیان اس حالت کا کچھ نمونہ رکھ دیا ہے جو کہ اولیاء اللہ اور انبیاء اللہ میں کامل طور پر ہوتا ہے؛ تاکہ یہ لوگ انبیاء کا صاف انکار نہ کر بیٹھیں کہ ہم اس علم سے بے خبر ہیں۔ اتمامِ حجت کے طور پر یہ بات ان لوگوں کو دی گئی ہے، تاکہ انبیاء کے دعاوی کو سُن کر حریف اقرار کرے کہ ایسا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کیونکہ جس بات سے انسان بالکل ناآشنا ہوتا ہے اس کا وہ جلدی انکار کر دیتا ہے۔ مثنوی رُومی میں ایک اندھے کا ذکر ہے کہ اُس نے یہ کہنا شروع کیا کہ آفتاب دراصل کوئی شے نہیں لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر آفتاب ہوتا تو کبھی مَیں بھی دیکھتا۔ آفتاب بولا کہ اے اندھے! تو میرے وجود کا ثبوت مانگتا ہے۔ تُو پہلے خدا سے دُعا کر کہ وُہ تجھے آنکھیں بخشے۔ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے۔ اگر وہ انسان کی فِطرت میں یہ بات نہ رکھ دیتا تو نبوت کا مسئلہ لوگوں کو کیونکر سمجھ میں آتا۔ ابتدائی رؤیا یا الہام کے ذریعہ سے خدا بندہ کو بُلانا چاہتا ہے، مگر وہ اس کے واسطے کوئی حالت قابلِ تشفّی نہیں ہوتی؛ چنانچہ بلعم کو الہامات ہوتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے کہ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا رفع نہیں ہوا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور میں وُہ کوئی برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ابھی تک نہیں بنا تھا۔ یہاں تک کہ وُہ گر گیا ان الہامات وغیرہ سے انسان کچھ بن نہیں سکتا۔ انسان خدا کا بن نہیں سکتا جب تک کہ ہزاروں موتیں اُس پر نہ آویں اور بیضۂ بشریت سے وہ نکل نہ آئے۔

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۶ صفحہ ۱ تا ۵ پرچہ ۳۰ را پریل ۱۹۰۱ء

اس راہ میں قدم مارنے والے انسان تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو دین العجائز رکھتے ہیں یعنی بڑھیا عورتوں کا سا مذہب نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں۔ قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں اور توبہ استغفار کر لیتے ہیں۔ انھوں نے تقلیدی امر کو مضبوطی سے پکڑا ہے اور اس پر قائم ہیں۔ دُوسرے وہ لوگ ہیں جو اس سے آگے بڑھ کر معرفت کو چاہتے ہیں اور ہر طرح کوشش کرتے ہیں اور وفاداری اور ثابت قدمی دکھاتے ہیں اور اپنی معرفت میں انتہائی درجہ کو پہنچ جاتے ہیں اور کامیاب اور بامُراد ہو جاتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے دین العجائز کی حالت میں رہنا پسند نہ کیا اور اس سے آگے بڑھے اور معرفت میں قدم رکھا مگر اس منزل کو نباہ نہ سکے اور راہ ہی میں ٹھوکر کھا کر گر گئے۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے۔ ان لوگوں کی مثال اُس آدمی کی طرح ہے جس کو پیاس لگی ہوئی تھی اور اس کے پاس کچھ پانی تھا، پر وہ پانی بھی گدلا تھا تاہم وُہ پی لیتا تو مرنے سے بچ جاتا۔ کسی نے اُس کو خبر دی کہ پانچ سات کوس کے فاصلہ پر ایک چشمہ صاف ہے۔ پس اُس نے وُہ پانی جو اُس کے پاس تھا پھینک دیا اور وہ صاف چشمہ کے واسطے آگے بڑھا۔ پر اپنی بے صبری اور بدبختی اور ضلالت کے سبب وہاں نہ پہنچ سکا۔ دیکھو اُس کا کیا حال ہوا، وہ ہلاک ہو گیا اور اُس کی ہلاکت نہایت ہولناک ہوئی یا ان حالتوں کی مثال اِس طرح ہے کہ ایک کنوآں کھودا جا رہا ہے۔ پہلے تو وہ صرف ایک گڑھا ہے جس سے کچھ فائدہ نہیں بلکہ آنے جانے والوں کے واسطے اس میں گِر کر تکلیف اُٹھانے کا خطرہ ہے۔ پھر وہ اور کھودا گیا یہاں تک کہ کیچڑ اور خراب پانی تک وہ پہنچا۔ پر وہ کچھ فائدہ مند نہیں۔ پھر جب وہ کامل ہوا اور اُس کا پانی مصفّا ہو گیا، تو وہ ہزاروں کے واسطے زندگی کا مُوجب ہو گیا۔ یہ جو فقیر اور گدّی نشین بنے بیٹھے ہیں۔ یہ سب لوگ ناقص حالت میں ہیں۔ انبیاء مصفّا پانی کے مالک ہو کر آتے ہیں۔ جبتک خدا کی طرف سے کوئی کچھ لے کر نہ آوے، تب تک بے سُود ہے۔ الٰہی بخش صاحب اگر مُوسیٰ بنتے ہیں، تو ان سے پُوچھنا چاہیے کہ ان کے مُوسیٰ بننے کی علّتِ غائی کیا ہے۔ جو لوگ خدا کی طرف سے آتے ہیں، وہ مزدور کی طرح ہوتے ہیں اور لوگوں کو نفع پہنچانے کے لیے قدم آگے بڑھاتے ہیں اور علوم پھیلاتے ہیں اور کبھی تنگی محسوس نہیں کرتے اور سُست اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھتے۔[1]

۱۹ر اپریل ۱۹۰۱ء

۱۹ر اپریل ۱۹۰۱ء کو لاہور سے فورمن کالج اور امریکن مشن کے دو پادری مع ایک دیسی عیسائی کے قادیان

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۳-۱۴ پرچہ ۳۰ر اپریل ۱۹۰۱ء

آئے تھے۔ وہ حضرت مسیح موعودؑ سے بھی ملے اور اُنھوں نے کچھ سوالات حضورؑ سے کیے جن کا جواب حضرت اقدسؑ دیتے رہے۔ ہم چونکہ بعد میں پہنچے تھے۔ اس لیے ابتدائی سوال اور اس کا جواب نہ لکھ سکے۔ ہمارے ایک بھائی نے اُسے لکھا تھا، مگر افسوس ہے کہ وُہ اُس کو محفوظ نہ رکھ سکے اور وُہ کاغذان سے گم ہوگیا۔ اگر بعد میں مل گیا، تو ہم اُسے بھی درج کر دیں گے۔ سرِدست ہم اس مقام سے دَرج کرتے ہیں، جہاں سے ہم نے سُننا قلمبند کیا۔ (ایڈیٹر)

مامورِ الٰہی خود نشان ہوتا ہے

نبیوں سے بہت نشانات مانگنے والوں نے نشان مانگے اُنھوں نے اُن کے جواب میں یہی کہا کہ عقلمند ایسے سوال نہیں کرتے بلکہ مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں تو ایسے موقع پر جیسا انجیل سے پتہ لگتا ہے، بہت سختی پائی جاتی ہے۔ یہ سچی بات ہے کہ جو شخص خدا کی طرف سے آتا ہے، وُہ نشانات لے کر آتا ہے۔ مَیں تو یہی کہتا ہوں کہ وہ خود ایک نشان ہوتا ہے، لیکن تھوڑے ہوتے ہیں جو ان نشانات سے فائدہ اُٹھاتے اور اُن کو شناخت کرتے ہیں مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد دُنیا دیکھ لیتی ہے کہ وُہ کیسے عظیم الشان نشانات کے ساتھ آیا ہے۔ یقیناً سمجھ لیں کہ وُہ نہیں مرتا۔ جبتک دُنیا پر ثابت نہ کردے کہ وہ صاحبِ نشان ہے۔

مامُورین کی دو قسمیں

سوال :۔ آپ کی سمجھ میں خدا کا کلام کیا ہے۔ یعنی کیا آپ بھی کچھ نوِشتے چھوڑ جائیں گے۔ جیسے انجیل یا توریت ہے ؟

جواب حضرت اقدسؑ :۔ "بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو لوگ مامور ہو کر دُنیا کی اصلاح کے واسطے آتے ہیں وہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صاحبِ شریعت ہوتے ہیں اور ایک نئی شریعت قائم کرتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ وُہ خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے تھے اور مامور ہو کر آئے تھے، مگر اُن کو ایک شریعت دی گئی جس کو آپ توراۃ کہتے ہیں اور مانتے ہیں کہ شریعت موسیٰؑ کی معرفت دی گئی۔

مگر ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ سے ہمکلام تو ہوتے ہیں اور ان صاحبِ شریعت نبیوں کی طرح وُہ بھی اصلاحِ خلق کے لیے آتے ہیں۔ اور اپنے وقت پر ضرورتِ حقّہ کے ساتھ آتے ہیں، مگر وُہ صاحبِ شریعت نہیں ہوتے۔ جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام کہ وُہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ اسی موسوی شریعت کے پابند تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کوئی لغو کام نہیں کرتا۔ جب اُس کا زندہ کلام موجود ہو اور ایک مستقل شریعت وقت کی ضرورت کے موافق موجود ہو تو دُوسری کوئی شریعت نہیں دی جاتی، لیکن

ہاں اس وقت تو ایسا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ جب اہلِ دُنیا کے دلوں سے خدا کی محبت سرد ہو جاتے اور اعمالِ صالحہ کی بجائے چند رسمیں رہ جاویں۔ تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ نہ رہیں۔ اس وقت خدا تعالیٰ ایک شخص کو مبعوث کرتا ہے۔ جو اسی شریعت پر عملدرآمد کی ہدایت کرتا ہے اور اپنے عملی نمونہ سے اس شریعتِ حقہ کی کھوئی ہوئی عظمت اور بزرگی کو پھر لوگوں کے دلوں میں قائم کرتا ہے۔ اس کے مناسبِ حال اس میں سب باتیں موجود ہوتی ہیں وہ خدا تعالیٰ سے ہمکلامی کا شرف رکھتا ہے۔ کلامِ الٰہی کا مغز اُسے عطا ہوتا ہے اور شریعت کے اَسرار پر اُسے اطلاع دی جاتی ہے۔ وُہ بہت سے خوارق اور نشان لے کر آتا ہے۔ غرض ہر طرح سے معزز اور مکرّم ہوتا ہے، مگر دُنیا اُس کو نہیں پہچانتی۔ جیسے جیسے کسی کو آنکھیں ملتی جاتی ہیں وُہ اُس کو اسی حد تک شناخت کرتا جاتا ہے۔

مامورین کی مخالفت

یہ امر انسانی عادت میں داخل ہے کہ جب کوئی نیا انسان اُس کے سامنے آتا ہے، تو آنکھیں اُس کو تاڑتی ہیں کہ یہ اُس کا قد ہے۔ یہ رنگ ہے، آنکھیں ایسی ہیں۔ صُورت شکل ایسی ہے۔ غرض سر سے لے کر پَیر تک اس کو تاڑتا ہے۔ یہاں تک کہ نظر میں محدُود ہو کر آخر کار اس کا رُعب کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نبیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب وُہ آتے ہیں تو وہ معمولی انسان ہوتے ہیں۔ تمام حوائج بشری اور ضروریات اُن کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ وُہ فوق الفوق باتیں بتاتے ہیں دُنیا کی نظر میں وہ اچنبھا ہوتی ہیں۔ اس لیے انکار کیا جاتا ہے۔ ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اُن سے ہنسی کی جاتی، ہر قسم کی تکالیف اور ایذا رسانی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کی ہی بڑی عزت کیوں نہ ہو، لیکن جس جگہ مَیں بیٹھا ہوں اگر آج اسی جگہ حضرت موسیٰؑ یا حضرت مسیحؑ ہوتے، تو وُہ بھی اسی نظر سے دیکھے جاتے جس نظر سے مَیں دیکھا جاتا ہوں۔ یہی بھید ہے کہ ہر نبی کو دُکھ دیا گیا اور ضروری امر ہے کہ ہر ایک جو خدا کی طرف سے مامُور اور مُرسَل ہو کر آوے وُہ اپنی قوم میں کیسا ہی معزز اور امین اور صادق ہو، لیکن اُس کے دعوے کے ساتھ ہی اُس کی تکذیب شروع ہو جاتی اور اُس کی تذلیل اور ہلاکت کے منصوبے ہونے لگتے ہیں۔ مگر ہاں جیسے یہ لازمی اَمر ہے کہ اُن کی تکذیب کی جاتی، اُن کو دُکھ دیا جاتا ہے۔

یہ بھی سچی اور یقینی بات ہے کہ ایک وقت آجاتا ہے کہ ان کی جماعتیں مستحکم ہو جاتی ہیں۔ وُہ دنیا میں صداقت کو قائم کر دیتے ہیں اور راستبازی کو پھیلا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بعد ایک زمانہ آتا ہے کہ ایک دُنیا اُن کی طرف ٹوٹ پڑتی اور اُن تعلیمات کو قبول کر لیتی ہے، جو وہ لے کر آتے ہیں۔ گو اپنے زمانہ میں ان کو دُکھ دینے میں کوئی کسر نہ رکھی گئی ہو۔ اور نہیں رکھی جاتی۔ ہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ جنھوں

نے رَدّ کر دیا۔ وُہ دانشمند تھے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ صرف زمانہ کی خاصیت ہے کہ اُن کو دانشمند کہا جاتا ہے۔ ورنہ ان سے بڑھ کر بے وقوف اور سطحی خیال کے اور کون لوگ ہوں گے جو حق کو جھٹلا کر دانشمند بنتے ہیں۔ یہ ایک فطرت کی کجی ہوتی ہے۔ جو کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح اُن کو ذلیل کیا جاوے۔ اسی طرح خیالی طور پر اس قسم کے مجمع کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہم جیت گئے اور خدا کے راستبازوں کے مقابلہ میں ہم کامیاب ہوگئے، حالانکہ وہی ذلیل نامُراد اور مغلوب ہوتے ہیں۔ آخر انجام دکھا دیتا ہے اور ایک روشن فیصلہ نمودار ہو جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ راستباز کی کامیابی مخالفوں کی سفاہت اور جہالت پر مُہر کر دیتی ہے کہ وہ جس قدر اعتراض کرتے تھے اپنی نادانی سے کرتے تھے۔

مَیں یہ بار بار لکھ چکا ہوں کہ جو خدا کی طرف سے مامُور ہو کر آتے ہیں۔ دُنیا اُن کو کم پہچانتی ہے۔ بجُز ان لوگوں کے جو دیکھنے کی آنکھیں رکھتے ہیں۔ ان کو دُوسرے دیکھ ہی نہیں سکتے، کیونکہ وُہ تو اُن ہی میں سے کھاتے پیتے حوائج بشری کے رکھنے والے انسان ہوتے ہیں۔

مَیں کوئی جدید شریعت لے کر نہیں آیا

اور یہ بات کہ میرے نوشتے باقی رہیں گے۔ مَیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خدا کی طرف سے مامُور ہو کر آنے والے لوگوں کے دو طبقہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صاحبِ شریعت ہوتے ہیں جیسے موسیٰ علیہ السلام اور ایک وہ جو احیائے شریعت کے لیے آتے ہیں۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اسی طرح پر ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل شریعت لے کر آئے۔ جو نبوت کے خاتم تھے۔ اس لیے زمانہ کی استعدادوں اور قابلیتوں نے ختمِ نبوت کر دیا تھا۔ پس حضور علیہ السلام کے بعد ہم کسی دُوسری شریعت کے آنے کے قائل ہرگز نہیں۔ ہاں جیسے ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ تھے۔ اسی طرح آپؐ کے سلسلہ کا خاتم جو خاتم الخلفاء یعنی مسیح موعود ہے۔ ضروری تھا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح آتا۔ پس مَیں وہی خاتم الخلفاء اور مسیح موعود ہوں۔ جیسے مسیح کوئی شریعت لے کر نہ آئے تھے، بلکہ موسوی شریعت کے احیاء کے لیے آئے تھے۔ مَیں کوئی جدید شریعت لے کر نہیں آیا اور میرا دل ہرگز نہیں مان سکتا کہ قرآن شریف کے بعد اب کوئی اور شریعت آسکتی ہے، کیونکہ وُہ کامل شریعت اور خاتم الکتب ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے مجھے شریعتِ محمدیؐ کے احیاء کے لیے اس صدی میں خاتم الخلفاء کے نام سے مبعوث فرمایا ہے۔ میرے الہامات جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھے ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ لاکھوں انسانوں میں شائع کئے جاتے ہیں اور چھاپے جاتے ہیں اور ضائع نہیں کئے جاتے۔ وُہ ضائع نہ ہوں گے۔ اور

وُہ قائم رہیں گے۔

اشاعت مذہب کا بہترین طریق

سوال : آپ کی رائے میں مذہب کے پھیلانے کا بہتر طریقہ کیا ہے؟

جواب : "میرے نزدیک اشاعتِ مذہب کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وُہ مذہب اپنی خوبیوں اور حُسن کی وجہ سے خود ہی روح کے اندر چلا جاوے اور اس کے لیے بیرونی کوشش کرنی نہ پڑے۔ مثلاً بعض چیزیں ایسی ہیں کہ وہ اپنی روشنی کی وجہ سے خود بخود نظر آتی ہیں۔ جیسے سُورج، چاند، ستارے وغیرہ۔ اور ایک وہ چیزیں ہیں جو ان روشنیوں کے بغیر نظر ہی نہیں آسکتی ہیں۔ مثلاً چرند پرند وغیرہ کو ہم نہیں دیکھ سکتے، جب تک روشنی نہ آوے۔ پس سچا مذہب اپنی روشنی اور حقانیت و صداقت کے نُور سے خود بخود شناخت ہو کر رُوحوں میں اُترتا جاتا ہے اور دلوں کو اپنی طرف کھینچتا جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ تعلیم ایک بڑا نشان ہے۔ جس مذہب کے ساتھ تعلیم کا نشان نہیں ہوتا۔ اُس کے دُوسرے نشان فائدہ پہنچا نہیں سکتے۔ آسمانی تعلیم اپنے اندر ایک روشنی اور نُور رکھتی ہے۔ وُہ انسانی طریقوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ ایک انسان جب بکلی مر جاوے اور گندی زندگی سے نکل آوے۔ اس وقت وہ خدا میں زندگی پاتا ہے اور سچے مذہب کا نشان محسوس کرتا ہے، مگر خدا کے فضل کے سوا یہ کس کا کام ہے کہ گندی زندگی سے مر کر نئی زندگی پاوے۔ یہ اس خدا کے ہاتھ سے ہوتا ہے، جس نے دُنیا کو زندگی بخشی ہے۔ وُہ جس انسان کو مبعوث کرتا ہے، پہلے اُس کو یہ زندگی عطا کرتا ہے۔ وُہ بظاہر دُنیا میں ہوتا ہے اور دُنیا کے لوگوں سے ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اس دُنیا کا انسان نہیں ہوتا۔ وُہ خدا تعالیٰ کی چادر کے نیچے ہوتا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ اُس کے مناسبِ حال تعلیم اس کو دیتا ہے۔ جس کو اسی مناسبت کے لوگ سیکھتے ہیں۔ اس میں گند، نفس پرستی، ظلم اور شہوانی خواہشات کو پُورا نہیں کیا جاتا، بلکہ وُہ پاک باتیں ہوتی ہیں جو انسان پر ایک مَوت وارد کر کے اُس کو ایک نئی زندگی عطا کرتی ہیں جس سے اس کو گناہ سوز فطرت مِل جاتی ہے۔ وہ ہر ایک قسم کی ناپاکی اور گند سے نفرت کرتا ہے اور خدا تعالیٰ میں زندگی بسر کرنے میں راحت اور لذت پاتا ہے۔ پس میرے نزدیک سچا مذہب اپنی اشاعت کا آپ ہی کفیل ہے۔ اس کے لیے کسی خارجی کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اُس کی صداقت کے اظہار کا ذریعہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو خدا کی طرف سے اُسے لے کر آتے ہیں۔ مقابلہ کے وقت ان کو غلبہ مِلتا ہے، جو بطور نشان کے ہوتا ہے۔ اُن کی آمد اس وقت ہوتی ہے۔ جب دُنیا حق اور نُور کے لیے بھُوکی پیاسی ہوتی ہے۔ غرض عمدہ تعلیم اور کامِل نمونہ جو اس تعلیم کی عمدگی کا زندہ ثبوت ہوتا ہے، وہی اشاعت کا بہترین طریق ہے۔"

رُوحانی زندگی پانے کا طریق

سوال : ہم آپ کو بہت تکلیف دینا نہیں چاہتے۔ یہ رُوحانی زندگی کس طرح مِل سکتی ہے؟

جواب : "خدا کے فضل سے"

سوال : ہمیں کچھ کہنا چاہیے کہ رُوحانی زندگی ہم کو مِل جاوے؟

جواب : ہاں۔ دُعا کی بہت بڑی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی نیک صحبت میں رہنا چاہیے۔ سب تعصبوں کو چھوڑ کر گویا دُنیا سے الگ ہو جاوے۔ جیسے جہاں طاعُون پڑی ہوئی ہو اور کوئی شخص وہاں سے الگ نہیں ہوتا ہے، تو وُہ خطرہ کی حالت میں ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنی حالت کو بدل نہیں ڈالتا اور اپنی زمین میں تبدیلی نہیں کرتا اور الگ ہو کر نہیں سوچتا کہ کس طرح پاک زندگی پاؤں۔ اور خدا سے دُعا نہیں مانگتا وہ خطرہ کی حالت میں ہے۔ دُنیا میں کوئی نبی نہیں آیا جس نے دُعا کی تعلیم نہیں دی۔ یہ دُعا ایک ایسی شَے ہے۔ جو عبُودیت اور ربُوبیت میں ایک رشتہ پیدا کرتی ہے۔ اس راہ میں قدم رکھنا بھی مشکل ہے۔ لیکن جو قدم رکھتا ہے پھر دُعا ایک ایسا ذریعہ ہے کہ اُن مشکلات کو آسان اور سہل کر دیتا ہے۔

دُعا کا ایک ایسا باریک مضمون ہے کہ اس کا ادا کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ جب تک انسان خود دُعا اور اس کی کیفیتوں کا تجربہ کار نہ ہو، وُہ اُس کو بیان نہیں کر سکتا۔ غرض جب انسان خدا تعالیٰ سے متواتر دُعائیں مانگتا ہے، تو وُہ اور ہی انسان ہو جاتا ہے۔ اس کی رُوحانی کدُورتیں دُور ہو کر اُس کو ایک قسم کی راحت اور سرُور ملتا ہے اور ہر قسم کے تعصب اور ریا کاری سے الگ ہو کر وُہ تمام مشکلات کو جو اُس کی راہ میں پیدا ہوں برداشت کر لیتا ہے۔ خدا کے لیے اُن سختیوں کو جو دُوسرے برداشت نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے۔ صرف اس لیے کہ خدا تعالیٰ راضی ہو جاوے برداشت کرتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ جو رحمٰن رحیم خدا ہے اور سراسر رحمت ہے، اُس پر نظر کرتا ہے اور اُس کی ساری کُلفتوں اور کدُورتوں کو سرُور میں بدل دیتا ہے۔

زبان سے دعویٰ کرنا کہ مَیں نجات پا گیا ہوں یا خدا تعالیٰ سے قوی رشتہ پیدا ہو گیا ہے، آسان ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ دیکھتا ہے کہ وُہ کہاں تک ان تمام باتوں سے الگ ہو گیا ہے۔ جن سے الگ ہونا ضروری ہے۔ یہ سچّی بات ہے کہ جو ڈھونڈتا ہے وُہ پا لیتا ہے۔ سچّے دل سے قدم رکھنے والے کامیاب ہو جاتے ہیں اور منزلِ مقصُود تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب انسان کچھ دین کا اور کچھ دُنیا کا ہوتا ہے۔ آخر کار دین سے الگ ہو کر دُنیا ہی کا ہو جاتا ہے۔ اگر انسان ربانی نظر سے مذہب کو تلاش کرے تو تفرقہ کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے۔ مگر نہیں۔ یہاں مقصُود اور غرض یہ ہوتی ہے کہ میری بات رہ جاتے۔ دو آدمی اگر بات کرتے ہیں، تو ہر ایک

اُن میں سے یہی چاہتا ہے کہ دُوسرے کو گرا دے۔ اس وقت تو چیونٹی کی طرح تعصّب، ہٹ دھرمی اور ضد کی بلائیں لگی ہوئی ہیں۔ غرض میں آپ کو کہاں تک سمجھاؤں بات بہت باریک ہے اور دُنیا اس سے بے خبر ہے اور یہ صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اِس زمانہ میں دہریت کا زور

میرا مذہب یہ ہے کہ وُہ خدا جس کو ہم دکھانا چاہتے ہیں وُہ دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور دُنیا اس سے غافل ہے۔ اُس نے مجھ پر اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ جو دیکھنے کی آنکھ رکھتا ہے، وُہ دیکھے۔

دو قسم کے لوگ ہیں ایک وُہ جو خدا کو مانتے ہیں اور دُوسرے وُہ جو نہیں مانتے اور دہریہ کہلاتے ہیں۔ جو مانتے ہیں، اُن میں بھی دہریت کی ایک رگ ہے، کیونکہ اگر وہ خدا کو کامل یقین کے ساتھ مانتے ہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس قدر فسق و فجور اور بے حیائی میں ترقی ہو رہی ہے۔ ایک انسان کو مثلاً سنکھیا یا سٹرکنیا دیا جاوے جبکہ اُس کو اس بات کا علم ہے کہ یہ زہرِ قاتل ہے، تو وُہ اُس کو کبھی نہیں کھائے گا۔ خواہ اس کے ساتھ تم اُسے کسی قدر لالچ بھی روپیہ کا دو۔ اِس لیے کہ اُس کو اس بات کا یقین ہے کہ مَیں نے اس کو کھایا اور ہلاک ہوا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ گناہ سے ناراض ہوتا ہے اور پھر بھی اس زہر کے پیالے کو پی لیتے ہیں۔ جھوٹ بولتے، زنا کرتے ہیں، دُکھ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بارہ بارہ آنہ یا ایک روپیہ کے زیور پر معصوم بچوں کو مار ڈالتے ہیں۔ اس قدر بے باکی اور شرارت و شوخی کا پیدا ہونا سچے علم اور پُورے یقین کے بعد تو ممکن نہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اُن کو یہ ہرگز معلوم نہیں کہ یہ بدی کا زہر ہلاک کرنے میں سنکھیا یا سٹرکنیا کے زہر سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر اُن کا ایمان اس بات پر ہوتا کہ خدا ہے اور وہ بدی سے ناراض ہوتا ہے اور اس کی پاداش میں سخت سزا ملتی ہے، تو گناہ سے بیزاری ظاہر کرتے اور بدیوں سے ہٹ جاتے، لیکن چونکہ گناہ کی زندگی عام ہوتی جاتی ہے اور بدی اور فسق و فجور سے نفرت کی بجائے محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے مَیں یہی کہوں گا اور یہی سچ ہے کہ آج کل دہریہ مَت پھیلا ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ زبان سے کہتا ہے کہ خدا ہے، مگر مانتا نہیں اور دُوسرا گروہ صاف انکار کرتا ہے۔ حقیقت میں دونوں ملے ہوئے ہیں۔

آمد کا مقصد

اس لیے میں خدا تعالیٰ پر ایسا ایمان پیدا کرانا چاہتا ہوں کہ جو خدا تعالیٰ پر ایمان لاوے وُہ گناہ کی زہر سے بچ جاوے اور اس کی فطرت اور سرشت میں ایک تبدیلی ہو جاوے۔ اُس پر موت وارد ہو کر ایک نئی زندگی اُس کو ملے۔ گناہ سے لذّت پانے کی بجائے اس کے دل میں نفرت پیدا ہو۔ جس کی یہ صورت ہو جاوے وہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں نے خدا کو پہچان لیا ہے۔

خدا خوب جانتا ہے کہ اس زمانہ میں یہی حالت ہو رہی ہے کہ خدا کی معرفت نہیں رہی۔ کوئی مذہب ایسا نہیں رہا جو اس منزل پر انسان کو پہنچا دے اور یہ فطرت اس میں پیدا کرے۔ ہم کسی خاص مذہب پر کوئی افسوس نہیں کر سکتے۔ یہ بلا عام ہو رہی ہے اور یہ وبا خطرناک طور پر پھیلی ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں۔ خدا پر ایمان لانے سے انسان فرشتہ بن جاتا ہے بلکہ ملائکہ کا مسجُود ہوتا ہے۔ نورانی ہو جاتا ہے۔

غرض جب اس قسم کا زمانہ دُنیا پر آتا ہے کہ خدا کی معرفت باقی نہیں رہتی اور تباہ کاری اور ہر قسم کی بدکاریاں کثرت سے پھیل جاتی ہیں۔ خدا کا خوف اُٹھ جاتا ہے اور خدا کے حقوق بندوں کو دیے جاتے ہیں، تو خدا تعالیٰ ایسی حالت میں ایک انسان کو اپنی معرفت کا نُور دے کر مامُور فرماتا ہے۔ اس پر طعن ہوتا ہے اور ہر طرح سے اس کو ستایا جاتا اور دُکھ دیا جاتا ہے، لیکن آخر وہ خدا کا مامُور کامیاب ہو جاتا اور دُنیا میں سچائی کا نُور پھیلا دیتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں خدا نے مجھے مامُور کیا اور اپنی معرفت کا نور مجھے بخشا۔ کوئی گالی نہیں جو ہم کو نہیں دی گئی۔ کوئی صُورت ایذارسانی کی نہیں، جو ہمارے لیے نہیں نکالی گئی، مگر ہم ان ساری بدزبانیوں کو سُنتے ہیں اور ان ساری تکلیفوں کے برداشت کرنے کو ہر وقت آمادہ ہیں۔ خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ بناوٹ سے نہیں بلکہ ہمارا فرض ہے کہ سُنیں، کیونکہ جس مسند پر ہمیں بٹھایا گیا ہے۔ اُس پر بیٹھنے والوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔

مسیح موعود کا کام

غرض اس سلسلہ کو قائم ہوئے پچیس سے زیادہ سال گزر گئے۔ یہ ایک بڑا حصّۂ زندگی کا ہے۔ اس عرصہ میں ایک بچہ پیدا ہو کر بھی صاحبِ اولاد ہو سکتا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے عین وقت پر ہماری دستگیری کی اور مخلوق پر رحم فرمایا۔ چونکہ خود اس نے ایک غیر معمولی ہمّت اور استقلال ہم کو دیا ہے۔ جو اپنے مامُوروں کو ہمیشہ دیا کرتا ہے۔ اس لیے اسی قوّت اور طاقت کی وجہ سے ہم نہیں تھکتے۔ اور یہ ساری مخالفتیں جو اس وقت کی جاتی ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ ان کا نام ونشان مٹ جاوے گا اور ہم امیدوار ہیں کہ وہ زمانہ آنے والا ہے۔

مَیں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت آسمان باتیں کر رہا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ زمین کے رہنے والوں میں ایک پاک تبدیلی ہو۔ جس طرح سے ہر ایک بادشاہ طبعًا چاہتا ہے کہ اُس کا جلال ظاہر ہو۔ اسی طرح منشاءِ الٰہی یُوں ہی ہو رہا ہے کہ اس کی عظمت و جبروت کا اہلِ دُنیا کو علم ہو اور وُہ خدا جو پوشیدہ ہو رہا ہے دُنیا پر اپنا ظہور دکھائے۔ اس لیے اس نے اپنا ایک مامُور بھیجا ہے تاکہ دنیا کا جذام جاتا رہے۔

اگر یہ سوال ہو کہ تم نے آکر کیا بنایا۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دُنیا کو خود معلوم ہو جاوے گا، کہ کیا بنایا۔ ہاں۔ اتنا ہم ضرور کہتے ہیں کہ لوگ آکر ہمارے پاس گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ اُن میں انکسار فروتنی پیدا

ہوتی ہے اور رذائل دُور ہو کر اخلاقِ فاضلہ آنے لگتے ہیں اور سبزہ کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور اپنے اخلاق اور عادات میں ترقی کرنے لگتے ہیں۔ انسان ایک دم میں ہی ترقی نہیں کر لیتا، بلکہ دنیا میں قانونِ قدرت یہی ہے کہ ہر شئے تدریجی طور پر ترقی کرتی ہے۔ اس سلسلہ سے باہر کوئی شے ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ آخر سچائی پھیلے گی اور پاک تبدیلی ہو گی۔ یہ میرا کام نہیں ہے، بلکہ خدا کا کام ہے۔ اُس نے ارادہ کیا ہے کہ پاکیزگی پھیلے۔ دُنیا کی حالت مسخ ہو چکی ہے اور اُسے ایک کیڑا لگا ہوا ہے۔ پوست ہی پوست باقی ہے۔ مغز نہیں رہا، مگر خدا نے چاہا ہے کہ انسان پاک ہو جاوے اور اُس پر کوئی داغ نہ رہے۔ اسی واسطے اُس نے محض اپنے فضل سے یہ سلسلہ قائم کیا ہے۔"

مسیح موعود کی حقیقت

سوال: آپ کی کتابوں کے موافق آپ کا لقب مسیح موعود ہے۔ اس کے ٹھیک معنی کیا ہوتے ہیں؟

جواب: "اس راز کو سمجھنے کے واسطے یہ جاننا ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ جس نے نبوتوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ نبوت کا ایک سلسلہ پہلے قائم کیا تھا۔ اس سلسلہ کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی سے ڈالی تھی۔ اُن سے پیشتر جو نبی دُنیا میں گذرے تھے۔ اُن کے آثار نہ رہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ ہی تھے جن کی کتاب میں نوحؑ کا آدمؑ کا اور بعض دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا۔ غرض جیسے کسی خاندان کا مُورثِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ اسی طرح پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاندانِ نبوت کا مورثِ اعلیٰ ٹھہرایا اور توریت کے ذریعہ اُن کو اپنی شریعت دی۔ موسیٰؑ مردِ خُدا کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کی خدمت کے لیے کہ اس میں زوال نہ ہو اور نبی بھیجتا رہا جو اس سلسلۂ موسویہ کے خادم ہوتے تھے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد چودھویں صدی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (جس کو آپ لوگ یسُوعؑ کہتے ہیں) اسی سلسلہ موسویہ کا مؤید بنا کر بھیجا۔ وہ اس سلسلہ کی آخری اینٹ تھے۔ جیسے آخری اینٹ مکان کو ختم کر دیتی ہے، اسی طرح پر حضرت مسیحؑ پر سلسلہ موسویہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس سلسلے کو خدا نے پُورا کیا اور ایک نئے سلسلہ کی بنیاد رکھی جو اسماعیلؑ کی نسل سے قائم ہوا اور سلسلہ محمدیّہ کہلایا۔ جیسا کہ خود اسماعیلؑ کے لفظ سے بھی معلوم ہوتا ہے اور جیسا خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی معرفت خبر دے دی تھی کہ بنی اسماعیل میں ایک سلسلہ موسویہ سلسلہ کی طرح قائم کیا جاوے گا۔ چونکہ بنی اسرائیل یعنی یہودیوں نے نہ اوّل کے ساتھ جو موسیٰ علیہ السلام تھے، اچھا سلُوک کیا اور نہ آخری کے ساتھ جو مسیحؑ تھا، اچھا سلُوک اور ایسا ہی نہ درمیانی نبیوں سے اچھا سلُوک کیا۔ یہ قوم ایسی سنگدل اور

بے باک تھی کہ صفحۂ روزگار میں اُس کی نظیر نہ ملے گی۔ نبیوں کی تکذیب اور ایذا رسانی میں اس قوم نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اُنھوں نے خدا کے نُورانی بندوں کی قدر نہیں کی۔ اس لیے حضرت عیسیٰؑ پر اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔

مسیحؑ کی بن باپ ولادت میں قدرت کا انتباہ

یہ ختم رضامندی کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ ناراضگی کی وجہ سے تھا۔ خود حضرت مسیحؑ کی پیدائش بطور نشان کے تھی۔ یعنی وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا، چونکہ نسل باپ سے جاری ہوتی ہے، اس لیے حضرت عیسیٰؑ کو بن باپ پیدا کر کے خدا نے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا کہ تمہاری شامتِ اعمال کی وجہ سے اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

دو باتوں کا خود تم نے اعتراف کیا ہے۔ اوّل یہ کہ خدا نے اُن کو بدُوں باپ پیدا کیا۔ جو یہ کہتا ہے کہ اُن کا باپ ہے، وُہ خدا تعالیٰ کے قانون کو توڑنا چاہتا ہے اور خدا تعالیٰ کے اس نشان کی جو اُن کی پیدائش میں رکھا ہوا تھا۔ بے حُرمتی کرتا ہے۔

دُوسری بات جس کا تم کو اعتراف ہے، یہ ہے کہ وُہ آخری اینٹ تھے۔ اس کی مثال انجیل میں بیان کی گئی ہے کہ ایک شخص نے باغ لگایا۔ اس کے تیار ہونے پر نوکر کو بھیجا وغیرہ آخر تک۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نظرِ مہر اور نظرِ رحم یہود پر نہ رہی تھی۔ پھر تیسری نشانی اس امر پر کہ سلسلہ موسویہ کا خاتمہ مسیحؑ پر ہو گیا، یہ ہے کہ اُن کا مُلک بھی چھن گیا۔

غرض مسیحؑ کا بن باپ پیدا ہونا بطور ایک نشانِ تنبیہ کے تھا۔ اسی خاندان میں سے جو ایک ہی جُزو رکھتا تھا اور جس میں آج تک نبی آتے رہے تھے۔ خدا نے ایک اور شاخ پیدا کر دی اور ایک دوسری بنیاد بنی اسماعیل میں سے ڈالی۔ یہود کی حکومت کی تباہی کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ نبوّت اور حکومت خدا نے اس قوم میں رکھ دی تھی، لیکن مسیحؑ کو جبکہ بن باپ پیدا کر کے یہ بتایا کہ تمھاری بداعمالیاں اور شوخیاں نبیوں کی تکذیب اور خدا تعالیٰ کے ماموروں سے عداوت اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ اب تم بجائے منعم علیہم ہونے کے مغضوب ہوتے ہو اور نبوّت کے خاندان کے انقطاع کے لیے یہ نشان اُن کو دیا گیا کہ بنی اسرائیل میں سے مسیحؑ کا کوئی باپ نہ ہوا یعنی اُس کو بن باپ پیدا کر کے بتایا کہ آئندہ نبوت تم میں سے گئی۔

انتقالِ نبوّت

اور یہ انتقالِ نبوّت چونکہ خدا کے غضب کے سبب سے ہوا تھا۔ اس لیے حکومت جو نبوّت کے ساتھ دُوسرا فضل اس قوم کو ملا ہوا تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ میرا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ ایک وُہ سلسلہ تھا جو سلسلہ موسویہ کہلاتا ہے اور جس کی آخری

اینٹ مسیح ابنِ مریمؑ ہے جن کی بن باپ پیدائش نے اس سلسلہ کے خاتمہ کی خبر دی اور خدا نے بنی اسماعیل میں اپنے وعدہ کے موافق ایک اور عظیم الشان سلسلہ مُوسوی سلسلہ کے ہمرنگ پیدا کیا؛ چنانچہ ہمارے نبیؐ کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ کے بانی ہوئے اور اس طرح پر مثیلِ موسیٰؑ قرار پاتے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام جیسے ایک سلسلہ کے بانی تھے۔ اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک سلسلہ کے بانی قرار پائے اور اس طرح پر بھی کہ جیسے فرعون پر موسیٰ علیہ السلام کو فتح ہوئی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آخر میں پوری کامیابی عطا ہوئی اور ابوجہل جو اس امت کا فرعون تھا۔ ہلاک ہوا۔ اور بھی بہت سے وجُوہ مماثلت کے ہیں۔ جن کو ہم اس وقت بیان نہیں کرتے۔

اُمتِ محمدیہؐ کا خاتم الخلفاء

کیونکہ اصل مطلب تو یہ بتانا ہے کہ یہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ کا مثیل ہے پس جس طرح پر حضرت مُوسیٰ کا سلسلہ حضرت مسیحؑ پر آکر ختم ہوا۔ یہاں بھی ضرور تھا کہ خاتم الخلفا مسیح موعود ہی ہوتا۔ اور جیسے حضرت مسیحؑ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بعد چودھویں صدی میں آئے تھے۔ اسی طرح پر ضرور تھا کہ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آنے والے مسیح موعود کا زمانہ بھی چودھویں صدی ہی ہوتا، تاکہ مشابہت پوری ہو۔ وُہ وقت اور یہ وقت دونوں مِل گئے۔ اور ایسا ہی خدا نے یہ بھی مقرر کر رکھا تھا کہ جیسے یہودی حضرت عیسیٰؑ کے وقت میں بہت ہی بگڑ گئے تھے اور ان کی اخلاقی ایمانی حالتیں مسخ ہوگئی تھیں اور حقیقت باقی نہ رہی تھی۔ ایسے وقت میں انجیل اُن کو حقیقت دکھانے کے لیے آئی تھی اور پاک باطنی اور اخلاقی قانون سے باخبر کرنے آئی تھی جس سے وہ لوگ بالکل بے خبر ہو چکے تھے۔ اسی طرح اس وقت زمانہ کا حال ہو رہا ہے۔ فسق و فجور کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ یورپ کی نمائشی تہذیب نے اخلاق کے تمام اعلیٰ اصولوں پر پانی پھیر دیا ہے اور دہریت کو پھیلا دیا ہے۔ مذہب جس شئے کا نام تھا، اُس کا نام و نشان مِٹ چکا ہے۔ یُورپ کی قوموں کا ہی اگر یہ حال ہوتا تب بھی ضرور تھا کہ کوئی روحانی معلّم آتا، مگر مُسلمانوں کی حالت بھی بگڑ گئی۔ ان کے ایمانیات، اخلاق و عادات میں ایک عظیم زلزلہ آیا ہے۔ وہ اسلام کے صرف نام سے آشنا ہیں۔ اس کی حقیقت اور مغز سے بے خبر ہو رہے ہیں۔ اُن کی عملی اور علمی قوتیں کمزور ہوگئی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر قوموں نے اُن کے مذہب اور ایمان پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ جب ایسی حالت ہوگئی، تو خدا نے اپنے وعدہ کے موافق اور اس مشابہت اور مماثلت کے لحاظ سے جو سلسلہ محمدیہ کو سلسلہ موسویہ سے ہے۔ اس چودھویں صدی کے سر پر مجھے مسیح موعود کے نام سے بھیجا۔ قرآن کریم میں خاتم الخلفاء کی پیشگوئی تھی اور یہی ذکر تھا کہ ایک مسیح اِس اُمت میں آئے گا۔ اور انجیل میں مسیحؑ نے کہا کہ آخری زمانہ میں مَیں آؤں گا۔ وُہ مَیں ہی ہوں۔ اور اس کا راز خدا نے مجھ پر یہ کھولا

ہے کہ جو لوگ یہاں سے چلے جاتے ہیں، اُن کی خُو، خصلت اور اخلاق پر ایک اور شخص آتا ہے اور اُس کا آنا گویا اُسی شخص کا آنا ہوتا ہے اور یہ بات بے معنی اور بے سند بھی نہیں ہے۔ خود انجیل نے اس عُقدہ کو حل کیا ہے۔ یہود جو مسیح ابنِ مریمؑ سے پیشتر ایلیا نبی کے آنے کے منتظر تھے اور ملاکی نبی کی کتاب کے وعدہ کے موافق اُن کا حق تھا کہ وہ انتظار کرتے، لیکن چونکہ وُہ ظاہر بین اور الفاظ پرست تھے۔ اس لیے وہ حقیقت سے آشنا نہ ہوئے اور ایلیا ہی کا انتظار کرتے رہے جیسا کہ توریت اور نبیوں کی کتابوں میں لکھا تھا۔ جو وعدہ پر آتا ہے وہی موعود ہو۔ اُن کو یہ غلطی لگی کہ مسیح موعود سے پہلے ایلیا آئے گا۔ ان کی نظر چونکہ موٹی تھی وہ انتظار کرتے رہے کہ ایلیا پہلے آئے۔ چنانچہ ایک بار وُہ مسیحؑ کے پاس گئے اور اُنھوں نے یہ سوال کیا۔ آپ نے یہی جواب دیا کہ ایلیا تو آ گیا اور وُہ یہی یُوحنّا ہے۔ وُہ یوحنّا کے پاس گئے۔ اس سے پُوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ مَیں ایلیا نہیں ہوں۔ چونکہ اُن کے دل پاک نہ تھے، اس لیے اس کو تناقض پر محمول کیا اور اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ یہ مسیح سچّا مسیح نہیں ہے۔ حالانکہ مسیح علیہ السلام نے جو کچھ کہا وُہ بالکل دُرست تھا اور اس میں کوئی تناقض نہ تھا۔ مسیح علیہ السلام کا مطلب صرف یہ تھا کہ یہ یُوحنّا جس کو مسلمان لوگ یحییٰ کہتے ہیں۔ ایلیا کی خُو اور طبیعت اور قوّت پر آیا ہے، مگر اُنھوں نے یہ سمجھا کہ سچ مچ وہی ایلیا جو ایک بار پہلے آ چکا تھا پھر آ گیا ہے؛ حالانکہ خدا تعالیٰ کے قانونِ مقررہ کے یہ خلاف ہے۔ اس کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ ایک بار اس دُنیا سے اٹھائے جاتے ہیں، پھر وُہ نہیں آتے۔ ہاں خدا تعالیٰ چاہے تو اُن کی خُو اور طبیعت پر کسی دوسرے بندے کو بھیج دیتا ہے اور شدّتِ مناسبت کے لحاظ سے وُہ دونوں دو جُدا جُدا انسان نہیں ہوتے، بلکہ ایک ہی ہوتے ہیں۔

مسیح کا ذاتی فیصلہ

غرض حضرت مسیح نے اپنے آنے سے پیشتر ایلیاہ کے آنے کے وعدہ اور عقدہ کو اس طرح حل کر کے ایک فیصلہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ یہ وہ فیصلہ ہے جو خود مسیحؑ نے اپنی عدالت میں اپنی سچائی کے ثبوت میں اپنے سے پہلے ایک نبی کے دوبارہ آنے کے متعلق کیا ہے کہ کسی کے دوبارہ آنے سے مُراد اُس کی خُو اور طبیعت پر آنے والے سے ہوتی ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ ایلیاہ تو یُوں آیا یعنی یُوحنّا ہی اُس کی خُو اور طبیعت پر آ گیا۔ لیکن مَیں خود ہی آؤں گا۔ اگر اس قسم کی صراحت اُنھوں نے کہیں انجیل میں کی ہے، تو وُہ بتانی چاہیے، مگر ایک بھی ایسا مقام نہیں ہے جہاں اُنھوں نے اپنی آمد اور ایلیاہ کی آمد میں تفریق کی ہو، بلکہ ایلیاہ کے قصّہ کا فیصلہ کر کے اپنی آمدِ ثانی کے مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔ پس ایسی صورت میں ہر ایک طالبِ حق کے لیے ضرور ہے کہ وُہ اس فیصلہ کے بعد چُوں چرا نہ کرے اور کوئی ایسی بحث نہ کرے جس میں وقت ضائع ہو، کیونکہ یہ تو بالکل ایک سیدھی سی بات ہے۔ مثلاً ایک آدمی کہے کہ ہر انسان کی دو ہی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ دس ہیں

انسان کیا ہر آنے والے انسان کو دکھا دے، مگر ایک اور ہو جو کہے کہ نہیں۔ دو نہیں پچاس آنکھیں ہوتی ہیں، لیکن وہ کسی کی پچاس آنکھیں دکھا دے نہیں تو کون صرف اُس کے کہنے ہی پر مان لے گا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسیحؑ کی آمدِ ثانی ایلیاہ کے رنگ میں نہیں ہے۔ اُن کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو پچاس آنکھیں بتاتا ہے۔ سچی بات یہی ہے کہ مسیح کی آمدِ ثانی ایلیاہ ہی کے رنگ میں ہے۔ مَیں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مَیں تناسخ کے مسئلہ کو نہیں مانتا۔ میرا آنا ایلیاہ کے رنگ پر ہے۔ خدا نے مجھے مسیحؑ کے رنگ پر بھیجا ہے اور اصلاحِ اخلاق کے لیے بھیجا ہے۔

اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا

نافہم مخالف یہ کہتے ہیں کہ جہاد کے ذریعہ اسلام پھیلایا جاتا ہے، مگر مَیں کہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام کی کامل تعلیم خود اس کی اشاعت کا موجب ہے۔ نفسِ اسلام کے لیے ہرگز کسی تلوار یا بندوق کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام کی گذشتہ لڑائیاں دفاعی لڑائیاں تھیں۔ اُنھوں نے غلطی اور سخت غلطی کھائی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وُہ جبراً مسلمان بنانے کے واسطے تھیں۔ غرض میرا ایمان ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ نہیں پھیلایا جاتا، بلکہ اس کی تعلیم جو اپنے ساتھ اعجازی نشان رکھتی ہے خود دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے؛ چنانچہ جن لوگوں نے میری کتابوں کو پڑھا ہے اور میری کارروائی کو دیکھا ہے، وُہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ساری کارروائی مسیحؑ کے رنگ میں ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں اخلاقی قوتوں کی تربیت کروں۔ چونکہ یہ سارا سلسلہ اور ساری کارروائی مسیحی رنگ اپنے اندر رکھتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے میرا نام مسیح موعود رکھا۔

مسیح موعود آگیا اور وہ مَیں ہوں

اب جبکہ مَیں نے اس حد تک بات کو پہنچایا ہے، تو مَیں جانتا ہوں کہ مسیحی بھی میرے مخالف ہوں گے، لیکن مَیں کسی کی مخالفت سے کب ڈر سکتا ہوں، جبکہ خدا نے مجھے مامور کر کے بھیجا ہے۔ اگر یہ دعویٰ میری اپنی تراشی ہوئی بات ہوتی، تو مجھے ایک ادنیٰ سی مخالفت بھی تھکا کر بٹھا دیتی، مگر یہ میرے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے ہر سلیم الفطرت کو جس طرح وہ چاہے سمجھانے کے لیے میں تیار ہوں اور اس کی تسلی کے لیے ہر جائز اور مسنون راہ میں اختیار کر سکتا ہوں۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ یہی وُہ زمانہ ہے جس کے لیے مُسلمان اپنے اعتقاد کے موافق اور عیسائی اپنے خیال پر منتظر تھے۔ یہی وُہ وقت تھا، جس کا وعدہ تھا۔ اب آنے والا آگیا۔ خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ خدا تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے لوگوں کی تائید میں زبردست نشان ظاہر کیا کرتا ہے اور دلوں کو منوا دیتا ہے۔ جو کچھ مسیح موعُود کے لیے مقدّر تھا، وُہ ہو گیا۔ اب کوئی مانے نہ مانے، مسیح موعُود آگیا اور وُہ مَیں ہوں ''

سوال : اور کیا مشابہت ہے ؟

جواب : تعلیم میں مشابہت ہے۔

مسیح موعود کی رسالت کا نتیجہ

سوال : آپ کی رسالت کا نتیجہ کیا ہوگا ؟

جواب : "خدا تعالیٰ کے ساتھ جو رابطہ کم ہوگیا ہے اور دُنیا کی محبت غالب آگئی ہے اور پاکیزگی کم ہو گئی ہے، خدا تعالیٰ اس رشتہ کو جو عبودیت اور الوُہیت کے درمیان ہے پھر مستحکم کرے گا اور گمشدہ پاکیزگی کو پھر لائے گا۔ دُنیا کی محبت سرد ہو جائے گی"

سچے مذہب کی شناخت

سوال : جبکہ مختلف مذاہب ہیں پھر کس طرح پہچانیں کہ سچا مذہب خدا کی طرف سے کون ہے ؟

جواب : "یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ دُنیا میں ہر کھوٹے اور کھرے کے درمیان ایک امتیاز ہے۔ رات اور دن میں صریح فرق ہے۔ پھر سچا مذہب بھی کبھی مخفی رہ سکتا ہے ؟ خدا پاک ہے اور وہ محبت، رحمت کرنے والا ہے اور وُہ نفسانی اُمور جو گناہ کے کام ہیں۔ بدکاری، تعصب، تکبّر اور تمام گناہ جو دل میں جمع ہوتے ہیں، پھر آنکھوں کے ذریعہ یا اور ذریعوں سے صدُور پاتے ہیں۔ اُن سے ناراض ہوتا ہے۔ پھر یہ کیونکر مشکل ہو سکتا ہے کہ انسان یہ تمیز نہ کر سکے کہ خدا انسانوں کو پاک بنانا چاہتا ہے اور وُہ اُن سے گناہ کے صدُور کو پسند نہیں کرتا۔ پس جس مذہب کی تعلیم عملی طور پر ایسی فطرت عطا کرتی ہو کہ انسان خدا سے ڈر کر اس کی صفات کے نیچے رہ کر پاکیزگی اور محبت میں ترقی کرے اور گناہ سے بچے، وہی مذہب خدا کی طرف سے ہوگا۔ خدائی مذہب کے ساتھ اُس کی صداقت کے زندہ نشان ہوتے ہیں، جو ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں"

مسیحؑ کا واقعہ صلیب

سوال : آپ کا خیال مسیحؑ کی صلیب کی نسبت کیا ہے ؟

جواب : میں اس کو نہیں مانتا کہ وہ صلیب پر مرے ہوں بلکہ میری تحقیقات سے یہی ثابت ہوا ہے کہ وُہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے اور خود مسیح علیہ السلام بھی میری رائے سے متفق ہیں۔ حضرت مسیحؑ کا بڑا معجزہ یہی تھا کہ وُہ صلیب پر نہیں مریں گے، کیونکہ یونسؑ نبی کے نشان کا اُنھوں نے وعدہ کیا تھا۔ اب اگر یہ مان

لیا جائے جیسا کہ عیسائیوں نے غلطی سے مان رکھا ہے کہ وُہ صلیب پر مر گئے تھے تو پھر یہ نشان کہاں گیا اور یونس نبی کے ساتھ مماثلت کیسی ہوئی؟ یہ کہنا کہ وُہ قبر میں داخل ہوکر تین دن کے بعد زندہ ہوئے۔ بہت بے ہودہ بات ہے۔ اس لیے کہ یونسؑ تو مچھلی کے پیٹ میں زندہ داخل ہوئے تھے، نہ مرکر۔ یہ نبی کی بے ادبی ہے۔ اگر ہم اس کی تاویل کرنے لگیں۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے۔ ہر ایک سلیم الفطرت انسان کو واجب ہے کہ جو کچھ مسیحؑ نے صاف لفظوں میں کہا اس کو محکم طور پر پکڑیں۔ حضرت عیسٰیؑ پر ایک غشی کی حالت تھی۔ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اور اسباب اور واقعات بھی اس قسم کے پیش آگئے تھے کہ وہ صلیب کی موت سے بچ جائیں؛ چنانچہ سبت کے شروع ہونے کا خیال۔ حاکم کا مسیح کے خون سے ہاتھ دھونا۔ اس کی بیوی کا خواب دیکھنا وغیرہ۔

خدا تعالیٰ نے ہم کو سمجھا دیا ہے اور ایک بہت بڑا ذخیرہ دلائل و براہین کا دیا ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہرگز ہرگز صلیب پر نہیں مرے۔ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے۔ غشی کی حالت بجائے خود موت ہوتی ہے۔ دیکھو سکتہ کی حالت میں نہ نبض رہتی ہے نہ دل کا مقام حرکت کرتا ہے۔ بالکل مُردہ ہی ہوتا ہے، مگر پھر وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ مسیح کے نہ مرنے کے دو بڑے زبردست گواہ ہیں۔ اوّل تو یہ ہے کہ یہ ایک نشان اور معجزہ تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس کی کسرِ شان کی جائے اور وہ آدمی سخت حقارت اور نفرت کے لائق ہے جو اللہ تعالیٰ کے نشانات کو حقیر سمجھ لیتا ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تصدیق نہیں کرتے کہ وہ صلیب پر مرے ہیں بلکہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے اور پھر اپنی طبعی موت سے مرنے کی تصدیق فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اگر انجیل کی ساری باتوں کو جو اس واقعہ صلیب کے متعلق ہیں یکجائی نظر سے دیکھیں، تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کہ مسیح صلیب پر مرے ہوں۔ حواریوں کو ملنا، زخم دکھانا، کباب کھانا، سفر کرنا۔ یہ سب اُمور ہیں جو اس بات کی نفی کرتے ہیں اگرچہ خوش اعتقادی سے ان واقعات کی کچھ بھی تاویل کیوں نہ کی جاوے، لیکن ایک منصف مزاج کہہ اُٹھے گا کہ زخم لگے رہے اور کھانے کے محتاج رہے یہ زندہ آدمی کے واقعات ہیں۔ یہ واقعات اور صلیب کے بعد کے دُوسرے واقعات گواہی دیتے ہیں اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ دو تین گھنٹہ سے زیادہ صلیب پر نہیں رہے اور وُہ صلیب اس قسم کی نہ تھی جیسے آج کل کی پھانسی ہوتی ہے جس پر لٹکاتے ہی دو تین منٹ کے اندر ہی کام تمام ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں تو کیل وغیرہ ٹھونک دیا کرتے تھے، اور کئی دن زندہ رہ کر انسان بھوکا پیاسا مر جاتا تھا۔ مسیح کے لیے اس قسم کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ وُہ صرف دو تین گھنٹہ کے اندر ہی صلیب سے اُتار لیے گئے۔ یہ تو وہ واقعات ہیں جو انجیل میں موجود ہیں۔ جو مسیحؑ کے صلیب پر نہ مرنے کے لیے بردست

گواہ ہیں پھر ایک اور بڑی شہادت ہے جو اس کی تائید میں ہے۔ وُہ مرہم عیسیٰ ہے۔ جو طب کی ہزاروں کتابوں میں برابر درج ہے اور اس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ مرہم عیسیٰ کے زخموں کے واسطے حواریوں نے تیار کی تھی۔ یہودیوں، عیسائیوں کی طبی کتابوں میں اس مرہم کا ذکر موجود ہے۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صلیب پر مر گئے تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور امر پیدا ہوگیا ہے جس نے قطعی طور سے ثابت کر دیا ہے کہ مسیح کا صلیب پر مرنا بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔ وہ ہرگز ہرگز صلیب پر نہیں مرے اور وُہ ہے مسیح کی قبر۔

مسیح کی قبر

"مسیح کی قبر سری نگر خانیار کے محلہ میں ثابت ہوگئی ہے اور یہ وہ بات ہے جو دُنیا کو ایک زلزلہ میں ڈال دے گی، کیونکہ اگر مسیح صلیب پر مرے تھے، تو یہ قبر کہاں سے آگئی؟"

سوال: آپ نے خود دیکھا ہے؟

جواب: "میں خود وہاں نہیں گیا، لیکن میں نے اپنا ایک مخلص ثقہ مرید وہاں بھیجا تھا۔ وہ وہاں ایک عرصہ تک رہا اور اس کے متعلق پوری تحقیقات کر کے پانسو معتبر آدمیوں کے دستخط کرائے جنھوں نے اس قبر کی تصدیق کی۔ وہ لوگ اس کو شہزادہ نبی کہتے ہیں اور عیسیٰ صاحب کی قبر کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ آج سے گیارہ سو سال پہلے اکمال الدین نام ایک کتاب چھپی ہے وہ بعینہٖ انجیل ہے۔ وُہ کتاب یُوز آسف کی طرف منسوب ہے اُس نے اس کا نام بُشریٰ یعنی انجیل رکھا ہے۔ یہی تمثیلیں، یہی قصّے، یہی اخلاقی باتیں جو انجیل میں ہیں پائی جاتی ہیں اور بسا اوقات عبارتوں کی عبارتیں انجیل سے ملتی ہیں۔ اب یہ ثابت شدہ بات ہے کہ وہ یُوز آسف کی قبر ہے۔

یُوز آسف

یُوز آسف وہی ہے، جس کو یسُوع کہتے ہیں۔ اور آسف کے معنی ہیں پراگندہ جماعتوں کو جمع کرنے والا۔ چونکہ مسیح علیہ السّلام کا کام بھی بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنا تھا اور اہلِ کشمیر بہ اتفاقِ اہلِ تحقیق بنی اسرائیل ہی ہیں۔ اس لیے اُن کا یہاں آنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ خود یُوز آسف کا قصّہ یورپ میں مشہور ہے، بلکہ یہاں تک کہ اٹلی میں اس نام پر ایک گرجا بھی بنایا گیا ہے اور ہر سال وہاں ایک میلہ بھی ہوتا ہے۔ اب اس قدر صَرف کثیر سے ایک مذہبی عمارت کا بنانا اور پھر ہر سال اس پر ایک میلہ کرنا کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سرسری نگاہ سے دیکھی جائے۔ وُہ کہتے ہیں کہ یُوز آسف مسیح کا حواری تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بات سچی نہیں ہے۔ یُوز آسف خود ہی مسیح تھا۔ اگر وہ حواری ہے تو یہ تمہارا فرض ہے کہ تم ثابت کرو کہ مسیح کے کسی حواری کا نام شہزادہ نبی تھا۔

یہ ایسی باتیں ہیں جو صلیب کے واقعہ کا سارا پردہ ان سے کھل جاتا ہے۔ ہاں اگر مسیحی اس بات کے قائل نہ ہوتے، تو البتّہ بحث بند ہو جاتی، لیکن جبکہ انھوں نے قبول کر لیا ہے کہ یُوز آسف ایک شخص ہوا

ہے اور اس کی تعلیم انجیل ہی کی تعلیم ہے اور اس نے بھی اپنی کتاب کا نام انجیل ہی رکھ لیا ہے اور جس طرح پرشہزادہ نبی مسیح کا نام ہے اس کو بھی شہزادہ نبی کہتے ہیں۔ اب غور کرنے کے قابل بات ہے کہ اگر یہ خود مسیح ہی نہیں تو اور کون ہے؟

خدا کے لیے سوچو۔ جو شخص دُنیا سے دل نہیں لگاتا اور سچائی سے پیار کرتا ہے اس کو تو ماننے میں ذرا بھی عُذر نہیں ہو سکتا، کیونکہ جب مان لیا کہ یُوز آسف واقعی ایک شخص تھا جس کا مسیح سے تعلق تھا اور پھر اٹلی میں اُس کا گرجا بھی بنا دیا اور ہر سال وہاں میلہ بھی ہوتا ہے اور پھر یہ بھی اقرار کر لیا کہ اس کی تعلیم انجیل ہی کی تعلیم ہے پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وُہ خود مسیح نہیں ہے؟ یہ چار باتیں جب تسلیم کر لیں، تو مَیں ایک جزئے کر آپ ہی سے پُوچھتا ہوں کہ آپ جو کہتے ہیں کہ وہ حواری تھا۔ ثابت کر کے دکھاؤ کہ یُوز آسف کسی حواری کا بھی نام تھا۔ اور یُوز آسف تو یسوع سے بگڑا ہوا ہے۔ اب ایک ہی بات سے فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر یہ ثابت کر کے دکھایا جاوے کہ مسیحؑ کے کسی حواری کا نام یُوز آسف، شہزادہ نبی اور عیسٰی صاحب ہے تو بے شک یہ قبر کسی حواری کی قبر ہوگی۔ اگر یہ ثابت نہ ہو اور ہرگز ہرگز ثابت نہ ہوگا، تو پھر میری بات کو مان لو کہ اس قبر میں خود حضرت مسیحؑ ہی سوتے ہیں۔

مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ بُردباری کے ساتھ سنتے ہیں۔ جو بُردباری سے سُنتا ہے وہ تحقیق کر سکتا ہے جس قدر باتیں آپ نے سُنی ہیں، دُوسرے کم سنتے ہیں۔ آپ خدا کے لیے غور کریں کہ جس حالت میں یہ قصّہ مشترک ہو گیا ہے کہ وہ حواریوں میں سے تھا۔ بہر حال تعلق تو مانا گیا اور پھر گرجا بنا دیا اور ہر سال میلہ ہونے لگا، تو اب آپ بتائیں کہ یہ ثبوت کس کے ذمہ ہے؟ اگر مسیحی تعلق نہ مان لیتے تو بارِ ثبوت بیشک میرے ذمّے ہوتا۔ لیکن جب آپ لوگوں نے خود اس کو مان لیا ہے، تو مَیں آپ سے ثبوت مانگتا ہوں کہ کسی ایسے حواری کا پتہ دیں جو شاہزادہ نبی کہلایا ہو۔"

پادری صاحب: ہم آپ کی مہربانی اور خاطرداری کے لیے بہت مشکور ہیں۔

حضرت اقدسؑ: "یہ تو ہمارا فرضِ منصبی ہے۔ جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھیجا ہے۔ اس کو کرنا ضروری ہے۔"

[حضرت اقدس حجۃ اللہ کی یہ تقریر سُن کر مسٹر فضل نے (جو غالباً لاہور کی بُک سوسائٹی میں ملازم ہیں اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے زبان کھولی، لیکن اس سے بہتر ہوتا کہ وہ خاموش رہتے اور ان کی دانش اور غور طلب طبیعت کا راز نہ کھلتا۔ حضرت اقدسؑ نے اس قدر طول طویل تقریر یُوز آسف کے متعلق فرمائی اور اُس کو تاریخی شہادتوں کے ساتھ موکّد فرمایا۔ مگر مسٹر فضل کے سوال

پر نگاہ کی جائے کہ آپ کیا فرماتے ہیں]

مسٹر فضل : قبر کے متعلق کوئی تاریخی ثبوت ملا ہے؟

حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ "گیارہ سو برس کی کتاب موجود ہے۔ خود عیسائیوں میں اس کا گرجا موجود ہے۔ وہاں میلہ ہوتا ہے اور ابھی آپ تاریخی ثبوت ہی پوچھتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ تاریخی ثبوت نہیں تو کیا ہے؟

اور یہ بھی فرمایا کہ :

تم لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ صرف دھوکا دینا چاہتے ہو۔ میں ہر انسان کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ پاک دل بنے۔ ریاکاری اور تعصب سے اپنے دل کو صاف کرے اور جہاں سے صداقت اور حکمت کی بات ملے، اُس کو نہایت فراخدلی کے ساتھ قبول کرے۔ میں ہر وقت سُننے کو تیار ہوں۔ اگر آپ صفائی سے جواب دیں کہ مسیح کے اس حواری کو اس وجہ سے شہزادہ نبی کہتے ہیں۔ اور اگر آپ کوئی جواب نہ دیں اور جواب ہے بھی نہیں اور صرف اعتقادی طور پر بتائیں کہ ہم ایسا مانتے ہیں، تو یہ ایسی بات ہے جیسے کسی ہندو سے پوچھیں کہ تم جو کہتے ہو کہ گنگا مہادیو کی جٹوں سے نکلتی ہے یا اس میں سَت ہے اور اس کے جواب میں صرف یہی کہے کہ میں اس کے دلائل تو نہیں دے سکتا، مگر ضرور مانتا ہوں کہ اس میں سَت ہے، تو یہ معقول بات نہ ہوگی۔ غرض میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے نہ اعتقاد کے طور پر بلکہ تحقیقات سے ثابت کر لیا ہے کہ یہ قبر واقعی حضرت مسیحؑ ہی کی قبر ہے۔ واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں، تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ جرمنی میں ایسے مسیحی بھی ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت مسیحؑ صلیب پر نہیں مرے۔ یہ بات بہت صاف ہے اور غور کرنے کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

انسان کا فرض

سوال : آپ کی سمجھ میں عیسائیوں کا فرض کیا ہے؟

جواب : ہر ایک انسان کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ حق کی تلاش کرے اور حق جہاں اُسے ملے اس کو فوراً لے لے، عیسائیوں کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۸ صفحہ ۱ تا ۴ پرچہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۱ء

الحکم " ۵ " ۱۸ " ۱ تا ۴ " ۱۷ رمئی ۱۹۰۱ء

الحکم " ۵ " ۱۹ " ۱ تا ۳ " ۲۴ رمئی ۱۹۰۱ء

اس کے بعد پادریوں نے مکرّر حضرت اقدس کا شکریہ ادا کیا اور پھر کتب خانہ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دفتر اخبار الحکم سے کچھ کتابیں لیں اور واپس چلے گئے۔

دو الہامات

۸ را پریل ۱۹۰۱ء کو آپ نے ایک الہام سُنایا تھا۔

سالِ دیگر را کہ مے داند حساب ٭ تا کجا رفت آنکہ با ما بود یار

۹ رمئی ۱۹۰۱ء کو آپ نے یہ الہام سُنایا:

"آج سے یہ شرف دکھائیں گے ہم"

تفسیر نویسی

اس بات کا ذکر آیا کہ آج کل لوگ بغیر سچے علم اور واقفیت کے تفسیریں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس پر فرمایا:

"تفسیرِ قرآن میں دخل دینا بہت نازک امر ہے۔ مبارک اور سچا دخل اس کا ہے جو روح القدس سے مدد لے کر دخل دے؛ ورنہ علومِ مروجہ کا لکھنا دُنیاداروں کی چالاکیاں ہیں"

قبر کی پختگی کا مسئلہ

ایک شخص کا سوال پیش ہوا کہ میرا بھائی فوت ہوگیا ہے۔ میں اس کی قبر پکّی بناؤں یا نہ بناؤں؟

فرمایا: "اگر نمود اور دکھلاوے کے واسطے پکّی قبریں اور نقش و نگار اور گنبد بنائے جائیں، تو یہ حرام ہے۔ لیکن اگر خشک مُلّا کی طرح یہ کہا جائے کہ ہر حالت اور ہر مقام میں کچّی ہی اینٹ لگائی جاتے تو یہ بھی حرام ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ عمل نیّت پر موقوف ہے۔ ہمارے نزدیک بعض وجوہ میں پکّی کرنا دُرست ہے مثلاً بعض جگہ سیلاب آتا ہے۔ بعض جگہ قبر میں سے میّت کو کتّے اور بجّو وغیرہ نکال لے جاتے ہیں۔ مُردے کے لیے بھی ایک عزّت ہوتی ہے۔ اگر ایسے وجُوہ پیش آجائیں تو اس حد تک کہ نمود اور شان نہ ہو بلکہ صدمہ سے بچانے کے واسطے قبر کا پکّا کرنا جائز ہے اللہ اور رسُول نے مومن کی لاش کے واسطے بھی عزّت رکھی ہے۔ ورنہ عزّت ضروری نہیں تو غسل دینے، کفن دینے، خوشبو لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجوسیوں کی طرح جانوروں کے آگے پھینک دو۔ مومن اپنے لیے ذلّت نہیں چاہتا۔ حفاظت ضروری ہے۔ جب تک نیّت

صحیح ہے۔ خدا تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرتا۔ دیکھو مصلحتِ الٰہی نے یہی چاہا کہ حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کا پختہ گنبد ہو اور کئی بزرگوں کے مقبرے پختہ ہیں۔ مثلاً نظام الدین، فرید الدین، قطب الدین معین الدین رحمۃ اللہ علیہم یہ سب صُلحاء تھے۔

رسُومات

ایک شخص کا تحریری سوال پیش ہوا کہ محرّم کے دنوں اِمامَین کی رُوح کو ثواب دینے کے واسطے روٹیاں وغیرہ دینا جائز ہے یا نہیں۔ فرمایا :

" عام طور پر یہ بات ہے کہ طعام کا ثواب میّت کو پہنچتا ہے، لیکن اُس کے ساتھ شرک کی رسُومات نہیں چاہئیں۔ رافضیوں کی طرح رسُومات کا کرنا ناجائز ہے۔"

بیعت کی حقیقت

ایک شخص کا سوال پیش ہوا کہ اگر آپ کو ہر طرح سے بزرگ مانا جائے اور آپ کے ساتھ صِدق اور اخلاص ہو، مگر آپ کی بیعت میں انسان شامل نہ ہووے، تو اس میں کیا حرج ہے ؟

فرمایا :" بیعت کے معنے ہیں اپنے تئیں بیچ دینا اور یہ ایک کیفیت ہے جس کو قلب محسُوس کرتا ہے جبکہ انسان اپنے صِدق اور اخلاص میں ترقی کرتا کرتا اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، تو وہ بیعت کے لیے خود بخود مجبور ہو جاتا ہے اور جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو جائے، تو انسان سمجھ لے کہ ابھی اس کے صِدق اور اخلاص میں کمی ہے۔"

کشوف و الہامات میں شیطان کا دخل

اس بات کا ذکر آیا کہ لاہوری علماء نے الٰہی بخش ملہم سے یہ سوال کیا ہے کہ آیا تمھارا الہام تلبیسِ ابلیس سے معصُوم ہے یا نہیں۔ جس کے جواب میں الٰہی بخش نے کہا کہ میرا الہام دخلِ شیطان سے پاک نہیں۔ اس پر حضرتِ اقدس امامِ معصومؑ نے فرمایا :

" یہ لوگ نہیں جانتے کہ اس میں کیا سِرّ ہے اور کسی کا الہام یا کشف شیطان کے دخل سے کہاں تک پاک ہوتا ہے۔ انسان کے اندر دو قسم کے گناہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن سے انسان خدا کی نافرمانی دیدہ دانستہ کرتا ہے اور بے باکی سے گناہ کرتا ہے۔ ایسے لوگ مجرم کہلاتے ہیں۔ یعنی خدا سے ان کا بالکل قطع تعلق ہو جاتا ہے اور وہ شیطان کے ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ جو ہر چند بدی سے بچتے ہیں، مگر بعض دفعہ بسبب کمزوری کے کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ سو جس قدر انسان گناہوں کو چھوڑتا اور خدا کی طرف آتا ہے،

اسی قدر اس کے خواب اور کشف دخلِ شیطانی سے پاک ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اُن تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے جو شیطان کے اندر آنے کے ہیں۔ تب اس میں سوائے خدا کے اور کچھ نہیں آتا۔ جب تم سُنو کہ کسی کو الہام ہوتا ہے، تو پہلے اُس کے الہامات کی طرف مت جاؤ۔ الہام کچھ شئے نہیں، جب تک کہ انسان اپنے تئیں شیطان کے دخل سے پاک نہ کرے اور بے جا تعصبوں اور کینوں اور حسدوں سے اور ہر ایک خدا کو ناراض کرنے والی بات سے اپنے آپ کو صاف نہ کرے۔ دیکھو۔ اِس کی مثال ایسی ہے کہ ایک حوض ہے اور اس میں بہت سی نالیاں پانی کی گرتی ہیں۔ پھر ان نالیوں میں سے ایک کا پانی گندہ ہے تو کیا وہ سارے پانی کو گندہ نہ کر دے گا۔ یہی راز ہے جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا گیا مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۴، ۵) ہاں انسان کو ان کمزوریوں کے دُور کرنے کے واسطے استغفار بہت پڑھنا چاہیے۔ گناہ کے عذاب سے بچنے کیلئے استغفار ایسا ہے جیسا کہ ایک قیدی جُرمانہ دے کر اپنے تئیں قید سے آزاد کرا لیتا ہے۔ مگر استغفار سے خدا اس کو نیچے دبا دیتا ہے[1]"

۱۷ر مئی ۱۹۰۱ء

بیعت لینے کا حکم

سوال ہوا۔ کیا آپ دُوسرے صُوفیا اور مشائخ کی طرح عام طور پر بیعت لیتے ہیں یا بیعت لینے کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے۔ فرمایا:

ہم تو امرِ الٰہی سے بیعت کرتے ہیں جیسا کہ ہم اشتہار میں بھی یہ الہام لکھ چکے ہیں کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ - (الفتح: ۱۱)

گُناہ سے بچنے کا طریق

فرمایا: جذبات اور گُناہ سے چھُوٹ جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کرنا چاہیے۔ جب سب سے زیادہ خدا کی عظمت اور جبرُوت دل میں بیٹھ جائے، تو گناہ دُور ہو جاتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کے خوف دلانے سے بسا اوقات لوگوں کے دلوں پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وُہ مر جاتے ہیں۔ تو پھر خوفِ الٰہی کا اثر کیونکر نہ ہو۔ چاہیے کہ اپنی عمر کا حساب کرتے رہیں۔ ان دوستوں اور رشتہ داروں کو یاد کریں جو انہیں میں سے نکل کر چلے گئے۔ لوگوں کی صحت کے ایّام یُونہی

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۲-۱۳ پرچہ ۱۷ر مئی ۱۹۰۱ء

غفلت میں گزر جاتے ہیں۔ ایسی کوشش کرنی چاہیے کہ خوفِ الٰہی دل پر غالب رہے۔ جب تک انسان طُولِ اُمَل کو چھوڑ کر اپنے پر موت وارد نہ کرے۔ تب تک اُس سے غفلت دُور نہیں ہوتی۔ چاہیے کہ انسان دُعا کرتا رہے یہانتک کہ خدا اپنے فضل سے نُور نازل کر دے۔ جو یندہ یابندہ "

وفاتِ مسیح پر ایک لطیف استدلال

فرمایا: حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جب مسیحؑ آوے، اس کو میرا اسلام کہنا۔ اس حدیث کے مطلب میں غور کرنا چاہیے۔ اگر مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر موجود تھے تو خود حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی ملاقات معراج میں کی تھی اور نیز حضرت جبرئیلؑ ہر روز وہاں سے آتے تھے۔ کیوں نہ اُن کے ذریعہ سے اپنا سلام پہنچایا اور پھر حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم بھی بعد از وفات آسمان پر گئے تھے اور وہاں ہی حضرت مسیحؑ بھی ہیں اور حضرت مسیحؑ کو تو خود رسول کریمؐ کے پاس سے ہو کر زمین پر اُترنا تھا۔ تو پھر اس کے کیا معنے ہوئے کہ زمین والے ان کو آنحضرتؐ کا سلام پہنچائیں۔ کیا اس صورت میں حضرت عیسیٰؑ اُن کو یہ جواب نہ دیں گے کہ مَیں تو خود ان کے پاس سے آتا ہوں تو تم یہ سلام کیسا دیتے ہو؟ یہ تو مثال ہوئی کہ گھر سے مَیں آؤں اور خبریں تم دو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت رسولِ کریمؐ اور آپؐ کے اصحابؓ کا یہی عقیدہ اور مذہب تھا کہ حضرت مسیحؑ فوت ہو گئے ہیں اور دُنیا میں واپس نہیں آ سکتے اور آنے والا مسیح اسی اُمّت میں سے برُوزی رنگ میں ہو گا۔"

سچی لذّت اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہے

سوال ہوا کہ فواحشات کی طرف لوگ جلد جُھک جاتے ہیں اور اُن سے لذّت اُٹھاتے ہیں جن سے خیال ہو سکتا ہے کہ اُن میں بھی ایک تاثیر ہے۔ فرمایا:

" بعض اشیاء میں نہاں درنہاں ایک ظِلّ اصل شئے کا آجاتا ہے۔ وُہ شئے طفیلی طور پر کچھ حاصل کر لیتی ہے۔ مثلاً راگ اور خوش الحانی، لیکن دراصل سچی لذّت اللہ تعالیٰ کی محبت کے سوا اور کسی شئے میں نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری چیزوں سے محبت کرنے والے آخر اپنی حالت سے توبہ کرتے اور گھبراتے اور اضطراب دکھاتے ہیں۔ مثلاً ہر ایک فاسق اور بدکار سزا کے وقت اور پھانسی کے وقت اپنے فعل سے پشیمانی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کو ایسی استقامت عطا ہوتی ہے کہ وہ ہزار ایذائیں دیئے جائیں، مارے جائیں، قتل کیے جائیں، وہ ذرّہ جنبش نہیں کھاتے۔ اگر وُہ شئے جو اُنھوں نے حاصل کی ہے

اصل نہ ہوتی اور فطرتِ انسانی کے ٹھیک مناسب نہ ہوتی، تو کروڑوں موتوں کے سامنے ایسے استقلال کے ساتھ وہ اپنی بات پر قائم نہ رہ سکتے۔

یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے اور فطرتِ انسانی کے نہایت قریب یہی بات ہے جو ان لوگوں نے اختیار کی ہے اور کم ازکم بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار آدمیوں نے اپنے سوانح سے اس بات کی صداقت پر مُہر لگا دی ہے۔"

دُنیا کے قید خانہ ہونے کی حقیقت

فرمایا: "آئندہ زندگی میں مومن کے واسطے بڑی تجلی کے ساتھ ایک بہشت ہے، لیکن اس دُنیا میں بھی اس کو ایک مخفی جنت ملتی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ دُنیا مومن کے لیے سجن یعنی قید خانہ ہے۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ ابتدائی حالت میں جبکہ ایک انسان اپنے آپ کو شریعت کی حدود کے اندر ڈال دیتا ہے اور وہ اچھی طرح اس کا عادی نہیں ہوتا، تو وہ وقت اس کے لیے تکلیف کا ہوتا ہے، کیونکہ وہ لامذہبی کی بے قیدی سے نکل کر نفس کے مخالف اپنے آپ کو احکامِ الٰہی کی قید میں ڈال دیتا ہے، مگر رفتہ رفتہ وہ اس سے ایسا اُنس پکڑتا ہے کہ وہی مقام اس کے لیے بہشت ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو قید خانہ میں کسی پر عاشق ہو گیا ہو۔ پس کیا تم خیال کرتے ہو کہ وہ قید خانہ سے نکلنا پسند کرے گا۔"

اپنی زبان میں دُعا

سوال ہوا کہ آیا نماز میں اپنی زبان میں دُعا مانگنا جائز ہے۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"سب زبانیں خدا نے بنائی ہیں۔ چاہیے کہ اپنی زبان میں جس کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ نماز کے اندر دعائیں مانگے، کیونکہ اُس کا اثر دل پر پڑتا ہے تاکہ عاجزی اور خشوع پیدا ہو۔ کلامِ الٰہی کو ضرور عربی میں پڑھو اور اس کے معنی یاد رکھو اور دُعا بیشک اپنی زبان میں مانگو۔ جو لوگ نماز کو جلدی جلدی پڑھتے ہیں اور پیچھے لمبی دعائیں کرتے ہیں۔ وہ حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ دُعا کا وقت نماز ہے۔ نماز میں بہت دعائیں مانگو۔"

۱۸؍ مئی ۱۹۰۱ء

ظالم حاکم

فرمایا: "اگر حاکم ظالم ہو تو اُس کو بُرا نہ کہتے پھرو، بلکہ اپنی حالت میں اصلاح کرو۔ خدا اس کو بدل دے گا یا اسی کو نیک کر دے گا، جو تکلیف آتی ہے وہ اپنی ہی بدعملیوں کے

سبب آتی ہے، ورنہ مومن کے ساتھ خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ مومن کے لیے خدا تعالیٰ آپ سامان مہیا کر دیتا ہے۔ میری نصیحت یہی ہے کہ ہر طرح سے تم نیکی کا نمونہ بنو۔ خدا کے حقوق بھی تلف نہ کرو اور بندوں کے حقوق بھی تلف نہ کرو۔"

۲۰؍مئی ۱۹۰۱ء

ضرورت سے زیادہ مساجد کی تعمیر

کہیں سے خط آیا کہ ہم ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں اور تبرکاً آپ سے بھی چندہ چاہتے ہیں۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ:

"ہم تو دے سکتے ہیں اور یہ کچھ بڑی بات نہیں، مگر جبکہ خود ہمارے ہاں بڑے بڑے اہم اور ضروری سلسلے خرچ کے موجود ہیں۔ جن کے مقابل میں اس قسم کے خرچوں میں شامل ہونا اسراف معلوم ہوتا ہے۔ تو ہم کس طرح شامل ہوں۔ یہاں جو مسجد خدا بنا رہا ہے اور وہی مسجد اقصیٰ ہے وہ سب سے مقدم ہے۔ اب لوگوں کو چاہیے کہ اس کے واسطے روپیہ بھیج کر ثواب میں شامل ہوں۔ ہمارا دوست وہ ہے جو ہماری بات کو مانے نہ وہ جو کہ اپنی بات کو مقدم رکھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پاس ایک شخص آیا کہ ہم ایک مسجد بنانے لگے ہیں۔ آپ بھی اس میں کچھ چندہ دیں۔ انھوں نے عذر کیا کہ میں اس میں کچھ دے نہیں سکتا، حالانکہ وہ چاہتے تو بہت کچھ دے دیتے۔ اس شخص نے کہا کہ ہم آپ سے بہت نہیں مانگتے صرف تبرکاً کچھ دے دیجئے۔ آخر انھوں نے ایک دونی کے قریب سکہ دیا۔ شام کے وقت وہ شخص دونی لے کر واپس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت یہ تو کھوٹی نکلی ہے۔ وہ بہت ہی خوش ہوئے اور فرمایا۔ خوب ہوا۔ دراصل میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں کچھ دوں۔ مسجدیں بہت ہیں اور مجھے اس میں اسراف معلوم ہوتا ہے۔"[1]

۳؍جون ۱۹۰۱ء

رضائے الٰہی کے حصول کا طریق

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی تعریف میں جو فرمایا ہے لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ صفحہ ۸ تا ۹ پرچہ ۲۴؍مئی ۱۹۰۱ء

خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر : ۲۲) اس آیت کی تفسیر میں حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ کہ:

"ایک تو اس کے یہ معنے ہیں کہ قرآن شریف کی ایسی تاثیر ہے کہ اگر پہاڑ پر وُہ اترتا، تو پہاڑ خوفِ خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور زمین کے ساتھ مل جاتا۔ جب جمادات پر اس کی ایسی تاثیر ہے تو بڑے ہی بیوقوف وہ لوگ ہیں جو اس کی تاثیر سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور دُوسرے اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص محبتِ الٰہی اور رضائے الٰہی کو حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک دو صفتیں اس میں پیدا نہ ہو جائیں۔ اوّل تکبر کو توڑنا جس طرح کہ کھڑا ہوا پہاڑ جس نے سر اونچا کیا ہوا ہوتا ہے گر کر زمین سے ہموار ہو جائے۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ تمام تکبر اور بڑائی کے خیالات کو دُور کرے۔ عاجزی اور خاکساری کو اختیار کرے اور دُوسرا یہ ہے کہ پہلے تمام تعلقات اس کے ٹوٹ جائیں جیسا کہ پہاڑ گر کر متصدعاً ہو جاتا ہے۔ اینٹ سے اینٹ جُدا ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی اس کے پہلے تعلقات جو موجبِ گندگی اور الٰہی نارضامندی تھے وہ سب تعلقات ٹوٹ جائیں اور اب اُس کی ملاقاتیں اور دوستیاں اور محبتیں اور عداوتیں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے رہ جائیں۔"[1]

آنحضرتؐ کی طرف سے مسیح موعود کو سلام

فرمایا: حضرت رسُول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مسیح موعُود کو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہا ہے اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی تھی کہ با وجود لوگوں کی سخت مخالفتوں کے اور ان کے طرح طرح کے بد اور جانستان منصُوبوں کے وہ سلامتی میں رہے گا اور کامیاب ہوگا۔ ہم کبھی اس بات پر یقین اور اعتقاد نہیں کر سکتے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی طور سے سلام فرمایا۔ آنحضرتؐ کے لفظ لفظ میں معارف و اسرار ہیں۔"[1]

تقویٰ کی حقیقت

فرمایا: "تقویٰ والے پر خدا کی ایک تجلّی ہوتی ہے وہ خدا کے سایہ میں ہوتا ہے، مگر چاہیئے کہ تقویٰ خالص ہو اور اس میں شیطان کا کچھ حصّہ نہ ہو ورنہ شرک خدا کو پسند نہیں اور اگر کچھ حصّہ شیطان کا ہو تو خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ سب شیطان کا ہے۔ خدا کے پیاروں کو جو دُکھ آتا ہے وہ مصلحتِ الٰہی سے آتا ہے؛ ورنہ ساری دُنیا اکٹھی ہو جائے، تو ان کو ایک ذرہ بھر تکلیف نہیں دے سکتی؛ چونکہ وہ دُنیا میں نمونہ قائم کرنے کے واسطے ہیں۔ اس واسطے ضروری ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں تکالیف اُٹھانے کا نمونہ بھی وہ لوگوں کو دکھائیں؛ ورنہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے کسی بات میں اس سے بڑھ کر تردّد نہیں

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ صفحہ ۹ پرچہ ۱۰ جون ۱۹۰۱ء

ہوتا کہ اپنے ولی کی قبضِ رُوح کروں۔ خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اُس کے ولی کو کوئی تکلیف آوے، مگر ضرورت اور مصالح کے واسطے وہ دُکھ دیئے جاتے ہیں اور اس میں خود ان کے لیے نیکی ہے، کیونکہ اُن کے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء اللہ کے لیے تکلیف اس قسم کی نہیں ہوتی جیسی کہ یہود کو لعنت اور ذلت ہو رہی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اُس کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ انبیاء شجاعت کا ایک نمونہ قائم کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو اسلام کے ساتھ کوئی دشمنی نہ تھی، مگر دیکھو، جنگِ حنین میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے۔ اس میں یہی بھید تھا کہ آنحضرتؐ کی شجاعت ظاہر ہو جبکہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کے مقابلہ میں اکیلے کھڑے ہو گئے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسُول ہوں۔ ایسا نمونہ دکھانے کا کسی نبی کو موقعہ نہیں ملا۔ ہم اپنی جماعت کو کہتے ہیں کہ صرف اپنے پر وہ مغرور نہ ہو جائے کہ ہم نماز روزہ کرتے ہیں یا موٹے موٹے جرائم مثلاً زنا، چوری وغیرہ نہیں کرتے۔ ان خوبیوں میں تو اکثر غیر فرقہ کے لوگ مُشرک وغیرہ تمہارے ساتھ شامل ہیں۔

تقویٰ کا مضمون باریک ہے۔ اس کو حاصل کرو۔ خدا کی عظمت دل میں بٹھاؤ۔ جس کے اعمال میں کچھ بھی ریاکاری ہو خدا اس کے عمل کو واپس اُلٹا اس کے مُنہ پر مارتا ہے۔ متقی ہونا مشکل ہے۔ مثلاً اگر کوئی تجھے کہے کہ تُو نے قلم چرایا ہے تو تُو کیوں غصہ کرتا ہے۔ تیرا پرہیز تو محض خدا کے لیے ہے۔ یہ طیش اس واسطے ہوا کہ رُوبحق نہ تھا۔ جب تک واقعی طور پر انسان پر بہت سی موتیں نہ آجائیں وہ متقی نہیں بنتا۔ معجزات اور الہامات بھی تقویٰ کی فرع ہیں۔ اصل تقویٰ ہے۔ اس واسطے تم الہامات اور رویاء کے پیچھے نہ پڑو، بلکہ حصولِ تقویٰ کے پیچھے لگو۔ جو متقی ہے، اُسی کے الہامات بھی صحیح ہیں اور اگر تقویٰ نہیں، تو الہامات بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ اُن میں شیطان کا حصہ ہو سکتا ہے۔ کسی کے تقویٰ کو اس کے مُلہم ہونے سے نہ پہچانو، بلکہ اس کے الہاموں کو اس کی حالتِ تقویٰ سے جانچو اور اندازہ کرو۔ سب طرف سے آنکھیں بند کر کے پہلے تقویٰ کے منازل کو طے کرو۔ انبیاء کے نمونہ کو قائم رکھو۔ جتنے نبی آئے، سب کا مدعا یہی تھا کہ تقویٰ کی راہ سکھلائیں۔ اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (الانفال:۳۵) مگر قرآن شریف نے تقویٰ کی باریک راہوں کو سکھلایا ہے۔ کمال نبی کا کمالِ امت کو چاہتا ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خَاتَمَ النَّبِیّٖن تھے، صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے آنحضرتؐ پر کمالاتِ نبوت ختم ہوئے۔ کمالاتِ نبوت ختم ہونے کے ساتھ ہی ختمِ نبوت ہوا۔ جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہے اور معجزات دیکھنا چاہے اور خوارق عادت دیکھنا منظور ہو تو اُس کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی بھی خارقِ عادت بنائے۔ دیکھو امتحان دینے والے محنتیں کرتے کرتے مدقوق کی طرح بیمار اور کمزور ہو جاتے ہیں پس تقویٰ کے امتحان میں پاس ہونے کے لیے ہر ایک تکلیف اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب انسان اِس راہ پر قدم اُٹھاتا ہے، تو شیطان اُس پر بڑے بڑے حملے کرتا ہے، لیکن ایک حد پر پہنچ کر آخر شیطان ٹھہر جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب انسان کی سفلی زندگی پر موت آکر وہ خدا کے زیرِ سایہ ہو جاتا ہے۔

وُہ مظہرِ الٰہی اور خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ مختصر خلاصہ ہماری تعلیم کا یہی ہے کہ انسان اپنی تمام طاقتوں کو خدا کی طرف لگا دے۔

مسیح علیہ السلام کی بن باپ ولادت

حضرت مسیحؑ کے بے باپ پیدا ہونے کے متعلق ذکر تھا، فرمایا:

"ہمارا ایمان اور اعتقاد یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بن باپ تھے اور اللہ تعالیٰ کو سب طاقتیں ہیں۔ نیچری جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا باپ تھا، وہ بڑی غلطی پر ہیں ایسے لوگوں کا خدا مُردہ خدا ہے اور ایسے لوگوں کی دُعا قبول نہیں ہوتی[1]۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بے باپ پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم ایسے آدمی کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ تمہاری حالتیں ایسی ردّی ہوگئی ہیں کہ اب تم میں کوئی اس قابل نہیں جو نبی ہو سکے۔ یا اس کی اولاد میں سے کوئی نبی ہو سکے۔ اس واسطے آخری خلیفۂ موسوی کو اللہ تعالیٰ نے بے باپ پیدا کیا اور ان کو سمجھایا کہ اب نبوّت تمہارے خاندان سے گئی۔ اسی کی مثل خدا تعالیٰ نے آج یہ سلسلہ قائم کیا ہے کہ آخری خلیفہ محمدی یعنی مہدی و مسیح کو سیدوں میں سے نہیں بنایا، بلکہ فارسی الاصل لوگوں میں سے ایک کو خلیفہ بنایا، تاکہ یہ نشان ہو کہ نبوّتِ محمدی کی گدی کے دعویداروں کی حالتِ تقویٰ اب کیسی ہے۔"

فرمایا:

"انبیاء کا قاعدہ ہے کہ شخصی تدبیر نہیں کرتے۔ نوع کے پیچھے پڑتے ہیں۔ جہاں شخصی تدبیر آئی وہاں چنداں کامیابی نہ آئی؛ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ حال ہوا۔"

اِس زمانہ کا مجاہدہ

مدت کی بات ہے کہ ایک دفعہ حضرت مولوی نور الدین صاحب نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام سے عرض کیا کہ اس سلسلہ میں کوئی مجاہدہ مجھے بتلائیے۔

آپ نے فرمایا: "عیسائیت کے رَدّ میں کوئی کتاب لکھو۔"

تب حضرت مولوی نور الدین صاحب نے کتاب فصل الخطاب لمقدمۃ اہل الکتاب دو جلدیں لکھیں۔ پھر ایک دفعہ ایسا ہی مولوی صاحب نے حضرت اقدسؑ سے سوال کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا: "آریوں کے رَدّ میں کتاب لکھو۔" تب مولوی صاحب نے تصدیق براہین احمدیہ لکھی اور فرمایا کہ ان ہر دو مجاہدوں میں مجھے بڑے بڑے فائدے ہوئے۔"

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۰-۱۱ پرچہ ۲۴ رجون ۱۹۰۱ء)

---

[1] شاید نیچریوں نے اسی لحاظ سے کہ وہ مُردہ اور کمزور خدا ہے۔ دُعا اور استجابتِ دعا سے انکار کر دیا ہے۔ (سراج الحق نعمانی)

حضرت اقدسؑ کی ایک تقریر



جون ۱۹۰۱ء

پورے مسلمان بنو

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم دُنیا سے بالکل انقطاع کرکے اس کی طرف آ جاؤ گے وہ خود تمہارا متولّی اور متکفّل ہو جائے گا۔ جو آدمی تبتّلِ تام نہیں کرتا بلکہ کچھ رُو بدُنیا رہتا ہے اور کسی قدر رُو بہ خدا بھی رہتا ہے۔ وہ کبھی بھی مقصودِ اصلی کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے نہ دین کی عزّت مِل سکتی ہے، نہ دُنیا کی۔ خدا تعالیٰ تم سے یہ چاہتا ہے کہ تم پورے مسلمان بنو۔ مسلمان کا لفظ ہی دلالت کرتا ہے کہ انقطاعِ کُلّی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مُسلمان کو مسلمان پیدا کرکے لاانتہا فضل کئے ہیں؛ بشرطیکہ وُہ غور کرے اور سمجھے۔ ایک ہندو سے رام چندر کے خدا ہونے یا خدا تعالیٰ کے خالق ہونے پر بحث کرو۔ اس وقت تمہیں ایک لذت اور سرُور آئے گا کہ تمہارا خدا کیسا قادرِ مُطلق، مُحی، مُمیت۔ خالقِ کُل شَے خدا ہے اور برخلاف اس کے جنھوں نے رام چندر جیسے کھانے پینے کے محتاج انسان کو خدا بنایا ہے۔ جب یہ کہیں گے کہ اُس کی بیوی کو راون نکال کرلے گیا، تو کس قدر شرم اُس خدا کے ماننے والوں کو دامنگیر ہوگی کہ عجیب خدا ہے جو اپنی بیوی کی بھی حفاظت نہیں کر سکا۔ ایسا ہی آریہ جب اپنے خدا کی یہ صفت مخالف سے سُنے گا کہ اس نے ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کیا اور وہ اپنے کسی بڑے سے بڑے پریمی اور بھگت کو بھی کبھی نجات نہیں دے سکتا، یا اُس نے ایسی شریعت انسانوں کے لیے بنائی کہ ایک مرد اپنی بیوی کو اولاد نہ ہونے کی صورت میں دُوسرے مرد سے اولاد پیدا کرنے کے واسطے ہمبستری کی اجازت دے سکتا ہے، تو اُسے کیسا شرمندہ ہونا پڑیگا۔ اگر اُس میں غیرت اور حیا کا کوئی مادہ باقی ہو لیکن مُسلمان کیسا خوش ہوگا اور اس کی اُمیدیں کیسی وسیع ہوں گی۔ جب اپنے خالق خالقِ کُلِّ شَیئٍ اور قدّوس، سُبحان خدا کو پیش کرے گا۔

اخیار اور ابرار کا نام ابدالآباد تک زندہ رہتا ہے

پس یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا؛ چنانچہ فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (توبہ: ۱۲۰) اخیار اور ابرار کا نام ابدالآباد تک زندہ رہتا ہے۔ گذشتہ زمانے کے بادشاہوں یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ برخلاف اس کے خدا تعالیٰ کے راستبازوں

اور برگزیدوں کی دُنیا مداح ہے۔ دیکھو ہمارے رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر عظمت دُنیا میں قائم ہے۔ ۹۴ کروڑ مسلمان آپ کے نام لینے والے موجود ہیں۔ جو ہر وقت آپؐ پر دُرود پڑھتے ہیں۔ کیا کوئی قیصر و کسریٰ پر بھی درود پڑھتا ہے؟ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی کس قدر عظمت ہو رہی ہے۔ یہانتک کہ نادانوں نے اپنی جہالت اور کم مائیگی کی وجہ سے ان کو خدا بنا رکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ رسولوں کا طبقہ مصائب اُٹھا کر دُنیا سے گذر گیا، مگر اُن کا خدا کے لیے دُنیا کے عیش و آرام کو چھوڑ کر طرح طرح کے آلام و مصائب کے بار کو اُٹھا لینا ان کی عظمت کا باعث ہوگیا۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کے محبوبوں کو تکالیف آتی ہیں۔

ان کی تکالیف میں ایک لطیف سِر ہوتا ہے۔ ان پر اس لیے سب سے زیادہ تکالیف اور مصائب نہیں آتی ہیں کہ تباہ ہو جائیں، بلکہ اس لیے کہ تا زیادہ سے زیادہ پھل اور پھول میں ترقی کریں۔ دیکھو دُنیا میں ہر جوہرِ قابل کے لیے خدا نے یہی قانون ٹھہرایا ہے کہ اوّل وہ صدمات کا تختۂ مشق بنایا جاتا ہے کسان زمین میں ہل چلا کر اس کا جگر پھاڑتا ہے اور اس مٹی کو باریک کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہوا کے جھونکے اسے اِدھر اُدھر اڑائے لیے پھرتے ہیں۔ نادان خیال کرے گا کہ زمیندار نے بڑی غلطی کی جو اچھی بھلی زمین کو خراب کر دیا۔ مگر عقلمند خوب سمجھتا ہے کہ جب تک زمین کو اس درجہ تک نہ پہنچایا جاوے۔ وہ پھل پھول پیدا کرنے کی قابلیت کے جوہر نہیں دکھا سکتی۔ اسی طرح زمین میں بیج ڈال دیا جاتا ہے۔ جو خاک میں مل کر بالکل مٹی کے قریب ہو جاتا ہے، لیکن کیا وہ دانے اس لیے مٹی میں ڈالے جاتے ہیں کہ زمیندار اُن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے؟ نہیں نہیں وہ دانے اس کی نگاہ میں بہت ہی بیش قیمت ہیں۔ اس کی غرض ان کو مٹی میں گرانے سے صرف یہ ہے کہ وہ پھلیں اور پھولیں اور ایک ایک کی بجائے ہزار ہزار ہو کر نکلیں۔

جبکہ ہر جوہرِ قابل کے لیے خدا نے یہی قانون رکھا ہے وہ اپنے خاص بندوں کو مٹی میں پھینک دیتا ہے اور لوگ اُن کے اوپر چلتے ہیں اور پیروں کے نیچے کچلتے ہیں، مگر کچھ وقت نہیں گزرتا کہ وہ اُس سبزہ کی طرح (جو خس و خاشاک میں دبے ہوئے دانے سے نکلتا ہے) نکلتے ہیں۔ اور ایک عجیب رنگ اور آب کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں جو ایک دیکھنے والا تعجب کرتا ہے۔ یہی قدیم سے برگزیدہ لوگوں کے ساتھ سُنّت اللہ ہے کہ وہ ورطۂ عظیمہ میں ڈالے جاتے ہیں، لیکن نہ اس لیے کہ غرق کیے جاویں بلکہ اس لیے کہ اُن موتیوں کے وارث ہوں جو دریائے وحدت کی تہ میں ہیں۔ وہ آگ میں ڈالے جاتے ہیں نہ اس لیے کہ جلائے جائیں بلکہ اس غرض کے لیے کہ خدا تعالیٰ کی قدرت کا تماشہ دکھایا جاوے۔ غرض ان سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے اور ہنسی کی جاتی ہے۔ اُن پر لعنت کرنا ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور اپنی نصرت کی چمکار دکھاتا ہے۔ اس وقت دُنیا کو ثابت ہو جاتا ہے اور غیرتِ الٰہی اس غریب کے لیے جوش مارتی ہے اور ایک ہی تجلّی میں اعداء

کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ سو اول نوبت دشمنوں کی ہوتی ہے اور آخر میں اُس کی باری آتی ہے۔ اسی کی طرف خدا تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الاعراف : ۱۲۹) پھر خدا تعالیٰ کے ماموروں پر مصائب اور مشکلات کے آنے کا ایک یہ بھی بھید ہوتا ہے۔ تا اُن کے اخلاق کے نمونے دُنیا کو دکھائے جاویں اور اُس عظیم الشان بات کو دکھائے جو ایک معجزہ کے طور پر اُن میں ہوتی ہے وہ کیا؟

استقامت

استقامت ایک ایسی چیز ہے کہ کہتے ہیں اَلْاِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں یہ استقامت ہی تو تھی کہ خواب میں حکم ہوا کہ تو بیٹا ذبح کر حالانکہ خواب کی تعبیر اور تاویل بھی ہو سکتی تھی، مگر خدا تعالیٰ پر ایسا ایمان اور دل میں ایسی قوت ہے کہ یہ حکم پاتے ہی معاً تعمیل کے واسطے تیار ہو گئے اور اپنے ہاتھ سے نوجوان بیٹے کو ذبح کرنے لگے۔ آج کل اگر کسی کا بچہ امراض میں مبتلا رہ کر مر جائے تو خدا تعالیٰ کی نسبت ہزار ہا شکوک پیدا ہو جاتے ہیں اور شکوہ و شکایت کے لیے زبان کھولتے ہیں، لیکن ایک ابراہیمؑ ہے کہ بیٹے کی محبت کو کچل ڈالا اور اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کو تیار ہو گیا۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ کبھی ضائع نہیں کرتا۔ ایسے آدمیوں کے کلمات طیبات قرار دیئے جاتے ہیں اور اُن کو ذریعہ دُعا، اُن کے کپڑوں کو متبرک قرار دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی حوصلگی اور استقامت

یاد رکھو۔ مومنوں کا ابتلا برنگ انعام ہو جاتا ہے۔ اور اس سے عوام کو حصّہ نہیں دیا جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ زندگی جو مکّہ میں گذری۔ اس میں جس قدر مصائب اور مشکلات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آئیں ہم تو ان کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ دل کانپ اٹھتا ہے جب ان کا تصوّر کرتے ہیں۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی حوصلگی، فراخدلی، استقلال اور عزم و استقامت کا پتہ لگتا ہے۔ کیسا کوہ وقار انسان ہے کہ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹے پڑتے ہیں، مگر اس کو ذرا بھی جُنبش نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے منصب کے ادا کرنے میں ایک لمحہ سُست اور غمگین نہیں ہوا۔ وہ مشکلات اُس کے ارادے کو تبدیل نہیں کر سکیں۔ بعض لوگ غلط فہمی سے کہہ اٹھتے ہیں کہ آپؐ تو خدا کے حبیب مصطفٰے اور مجتبیٰ تھے۔ پھر یہ مصیبتیں اور مشکلات کیوں آئیں؟ مَیں کہتا ہوں کہ پانی کے لیے جب تک زمین کو کھودا نہ جاوے اس کا جگر پھاڑا نہ جاوے وہ کب نکل سکتا ہے۔ کتنے ہی گز گہرا زمین کو کھودتے چلے جائیں۔ تب کہیں جا کر خوشگوار پانی نکلتا ہے جو مایۂ حیات ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ لذّت جو خدا تعالیٰ کی راہ میں استقلال اور ثباتِ قدم دکھانے سے نہیں ملتی جب تک ان مشکلات اور مصائب میں سے ہو کر انسان نہ گزرے۔ وہ لوگ جو اس کوچہ سے بے خبر ہیں وہ ان مصائب کی لذّت سے کب آشنا ہو سکتے ہیں اور کب اُسے محسوس

کر سکتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم ہے کہ جب آپؐ کو کوئی تکلیف پہنچتی تھی اندر سے ایک سُرور اور لذّت کا چشمہ پھوٹ نکلتا تھا۔ خدا پر توکّل، اس کی محبت اور نصرت پر ایمان پیدا ہوتا تھا۔

محبت ایک ایسی چیز ہے کہ وہ سب کچھ کرا دیتی ہے۔ ایک شخص کسی پر عاشق ہوتا ہے تو معشوق کے لیے کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ ایک عورت کسی پر عاشق تھی۔ اُس کو کھینچ کھینچ کر لاتے تھے اور طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، ماریں کھاتی تھی۔ مگر وہ کہتی تھی کہ مجھے لذّت ملتی ہے جبکہ جھوٹی محبتوں فسق و فجور کے رنگ میں جلوہ گر ہونے والے عشق میں مصائب اور مشکلات کے برداشت کرنے میں ایک لذّت ملتی ہے تو خیال کرو کہ وہ جو خدا تعالیٰ کا عاشقِ زار ہو۔ اس کے آستانہ الوہیت پر نثار ہونے کا خواہش مند ہو، وہ مصائب اور مشکلات میں کس قدر لذّت پا سکتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حالت دیکھو۔ مکہ میں ان کو کیا کیا تکلیفیں پہنچیں بعض ان میں سے پکڑے گئے۔ قسم قسم کی تکلیفوں اور عقوبتوں میں گرفتار ہوئے۔ مرد تو مرد بعض مسلمان عورتوں پر اس قدر سختیاں کی گئیں کہ ان کے تصور سے بدن کانپ اُٹھتا ہے۔ اگر وہ مکہ والوں سے مل جاتے تو اس وقت وہ بظاہر ان کی بڑی عزت کرتے، کیونکہ وہ اُن کی برادری ہی تو تھے۔ مگر وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو مصائب اور مشکلات کے طوفان میں بھی حق پر قائم رکھا۔ وہ وُہی لذّت اور سُرور کا چشمہ تھا جو حق کے پیار کی وجہ سے اُن کے سینوں سے پھُوٹ نکلا تھا۔ ایک صحابی کی بابت لکھا ہے کہ جب اُس کے ہاتھ کاٹے گئے تو اس نے کہا کہ میں وضو کرتا ہوں۔ آخر لکھا ہے کہ سر کاٹو تو سجدہ کرتا ہے۔ کہتا ہوا مر گیا۔ اس وقت اُس نے دُعا کی کہ یا اللہ! حضرتؐ کو خبر پہنچا دے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مدینہ تھے۔ جبرائیل نے جا کر السلام علیکم کہا اور آپؐ نے علیکم السلام کہا اور اُس واقعہ پر اطلاع ملی۔ غرض اس لذّت کے بعد جو خدا تعالیٰ میں ملتی ہے ایک کیڑے کی طرح کچل کر مر جانا منظور ہوتا ہے اور مومن کو سخت سے سخت تکالیف بھی آسان ہی ہوتی ہیں۔ سچ پُوچھو تو مومن کی نشانی ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ مقتول ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو کہہ دیا جائے کہ یا نصرانی ہو جا یا قتل کر دیا جائے گا۔ اس وقت دیکھنا چاہیے کہ اس کے نفس سے کیا آواز آتی ہے۔ آیا وہ مرنے کے لیے سُر رکھ دیتا ہے یا نصرانی ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر وہ مرنے کو ترجیح دیتا ہے تو وہ مومن حقیقی ہے، ورنہ کافر ہے۔ غرض ان مصائب میں جو مومنوں پر آتے ہیں اندر ہی اندر ایک لذّت ہوتی ہے۔ بھلا سوچو تو سہی کہ اگر یہ مصائب لذّت نہ ہوتے تو انبیاء علیہم السلام ان مصائب کا ایک دراز سلسلہ کیونکر گزارتے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی ایک عجیب نمونہ ہے اور ایک پہلو سے ساری زندگی ہی تکالیف میں گزری۔ جنگِ حنین میں آپؐ اکیلے ہی تھے۔ لڑائی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی نسبت

رسُول اللہ ظاہر کرنا آپؐ کی کس درجہ کی شوکت، جرأت اور استقامت کو بتاتا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ انسان جبتک اس کوچہ میں داخل نہ ہو، اُسے لذت ہی نہیں آتی۔ یہ ایک ایسی لذت ہے جس کی طرف خدا تعالیٰ ہر مومن کو بُلاتا ہے۔ جس طرح اور لذتوں کا مزا چکھتے ہو اس کا بھی مزا چکھو اور تلاش کرنے والے پالیتے ہیں۔

اِس طرف سے اگر تکاہل اور تساہل ہوگا، تو اُدھر سے بھی حرکت نہ ہوگی۔ اِدھر سے مجاہدہ ہوگا، تو اُدھر سے بھی حرکت ہوگی۔ مجاہدہ ایک ایسی شے ہے کہ اس کے بدُوں انسان کسی ترقی کے بلند مقام کو پا نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ (العنکبوت: ۷۰) جو لوگ ہم میں ہوکر مجاہدہ کرتے ہیں ہم اُن پر اپنی راہیں کھولتے ہیں۔ غرض مجاہدہ کرو اور خدا میں ہوکر کرو تاکہ خدا کی راہیں تم پر کھلیں اور ان راہوں پر چل کر تم اُس لذت کو حاصل کرسکو جو خدا میں ملتی ہے۔ اس مقام پر مصائب اور مشکلات کی کچھ حقیقت نہیں رہتی۔ یہ وہ مقام ہے جس کو قرآن شریف کی اصطلاح میں شہید کہتے ہیں۔

شہادت کی حقیقت

لوگوں نے شہید کے معنی صرف یہی سمجھ رکھے ہیں کہ کسی کافر غیر مُسلم کے ساتھ جنگ کی اور اس میں مارے گئے، تو بس شہید ہوگئے۔ اگر اتنے ہی معنے شہید کے لیے جاویں، تو پھر مخالفوں کو بہت بڑی گنجائش اعتراض کی رہتی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں اور آریوں نے اسلام کو تلوار کے ذریعہ سے پھیلنے والا مذہب قرار دیا ہے؛ اگرچہ ان لوگوں کی سخت نادانی ہے کہ وہ بدُوں دریافت کئے اصل منشا کے اعتراض کر دیتے ہیں۔ مگر ہم کو ان مولویوں پر بھی افسوس ہے، جنھوں نے قرآن شریف کے حقائق کو پیش نہیں کیا اور خیالی اور فرضی تفسیریں اور مصنوعی قصے بیان کرکے اسلام کے پاک اور خوشنما چہرہ پر ایک پردہ ڈال دیا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ جو خود اسلام کا محافظ اور ناصر ہے وہ اب چاہتا ہے کہ اسلام کا پاک اور درخشاں چہرہ دکھایا جاوے؛ چنانچہ یہ سلسلہ جو اس نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی نصرت کا وقت آپہنچا اور اسلام کی عزت اور جلال کے دن آگئے، کیونکہ خدا تعالیٰ کی تائیدیں اور نصرتیں جو ہمارے شاملِ حال ہیں، یہ آج کسی مذہب کے پَیرو کو نصیب نہیں اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ کیا کوئی اہلِ مذہب ہے جو اسلام کے سوا اپنے مذہب کی حقانیت پر تائیدی اور سماوی نشان پیش کر سکے۔ خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ جو قائم کیا ہے۔ یہ اُس کی حفاظت کے وعدہ کے موافق ہے جو اس نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) میں کیا ہے۔

میرا مطلب یہ تھا کہ شہید کے معنی صرف یہی نہیں کہ غیر مُسلم کے ساتھ جنگ کرکے مَر جانے والا شہید

ہوتا ہے۔ ان ہی لوگوں نے ہی اسلام کو بدنام کیا اور اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر سرحدی نادان مسلمان بے گناہ انگریزوں کو قتل کرنے میں ثواب سمجھتے ہیں؛ چنانچہ آئے دن ایسی وارداتیں سُننے میں آتی ہیں۔ پچھلے دِنوں کسی سرحدی نے لاہور میں ایک میم کو قتل کر دیا تھا۔ ان احمقوں کو اتنا معلوم نہیں کہ یہ شہادت نہیں بلکہ قتلِ بے گناہ ہے۔ اسلام کا یہ منشا نہیں ہے کہ وُہ فتنہ و فساد برپا کرے بلکہ اسلام کا مفہوم ہی صلح اور آشتی کو چاہتا ہے۔ اسلامی جنگوں پر اعتراض کرنے والے اگر یہ دیکھ لیتے کہ ان میں کیسے احکام جاری ہوتے تھے تو وہ حیران رہ جاتے۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ جزیہ دینے والوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا اور ان جنگوں کی بنا دفاعی اصول پر تھی۔ ہمارے نزدیک جو جاہل پٹھان اس طرح پر بے گناہ انگریزوں پر جا پڑتے ہیں اور اُن کو قتل کرتے ہیں وہ ہرگز شہادت کا درجہ نہیں حاصل کرتے بلکہ وہ قاتل ہیں اور اُن کے ساتھ قاتلوں کا سا سلوک ہونا چاہیے۔

تو شہید کے معنی یہ ہیں کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ ایک خاص قسم کی استقامت مومن کو عطا کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر مصیبت اور تکلیف کو ایک لذّت کے ساتھ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ: ۶، ۷) میں مُنعَم علیہ گروہ میں سے شہیدوں کا گروہ بھی ہے اور اس سے یہی مراد ہے کہ استقامت عطا ہو، جو جان تک دے دینے میں بھی قدم کو ہلنے نہ دے[1]"

۱۹؍جولائی سنہ ۱۹۰۱ء

صداقتِ نبوت کی ایک قرآنی دلیل

حافظ محمد یوسف صاحب کا ذکر آیا کہ بعض باتوں پر اعتراض کرتے تھے۔ فرمایا:

"اُن کو تو سرے سے سب باتوں سے انکار ہے جبکہ قرآن شریف نے صداقتِ نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں لَوْ تَقَوَّلَ والی دلیل پیش کی ہے اور حافظ صاحب اس سے انکار کرتے ہیں تو پھر کیا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تو اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر لوگوں کو سناتا اور اس کو میری طرف منسوب کرے اور کہے کہ یہ خدا کا کلام ہے؛ حالانکہ وُہ خدا کا کلام نہ ہو تو تُو ہلاک ہو جاتے گا۔ یہی دلیل صداقت

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۲۴، ۲۵ صفحہ ۱-۲ پرچہ ۳۰؍جون سنہ ۱۹۰۱ء و ۱۰؍جولائی سنہ ۱۹۰۱ء

نبوتِ محمدیہ مولوی آلِ حسن صاحب اور مولوی رحمت اللہ صاحب نے نصاریٰ کے سامنے پیش کی تھی اور وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے اور اب یہی دلیلِ قرآنی ہم اپنے دعویٰ کی صداقت میں پیش کرتے ہیں۔ حافظ صاحب اور ان کے ساتھی اکبر بادشاہ کا نام لیتے ہیں۔ مگر یہ اُن کی سراسر غلطی ہے۔ تَقَوَّلَ کے معنی ہیں جھوٹا کلام پیش کرنا۔ اگر اکبر بادشاہ نے ایسا دعویٰ کیا تھا، تو اس کا کلام پیش کریں، جس میں اس نے کہا ہو کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ یہ الہامات ہوئے ہیں۔ ایسا ہی روشن دین جالندھری اور دوسرے لوگوں کا نام لیتے ہیں، مگر کسی کے متعلق یہ پیش نہیں کر سکتے کہ اُس نے کونسے جھوٹے الہامات شائع کیے ہیں۔ اگر کسی کے متعلق ثابت شدہ معتبر شہادت کے ساتھ حافظ صاحب یا ان کے ساتھی یہ ثابت کر دیں کہ اس نے جھوٹا کلام خدا پر لگایا؛ حالانکہ خدا کی طرف سے وُہ کلام نہ ہو۔ اور پھر ایسا کرنے پر اس نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر عمر پائی ہو یعنی ایسے دعوے پر وہ ۲۳ سال زندہ رہا ہو، تو ہم اپنی ساری کتابیں جلا دیں گے۔ ہمارے ساتھ کینہ کرنے میں ان لوگوں نے ایسا غلو کیا ہے کہ اسلام پر ہنسی کرتے ہیں اور خدا کے کلام کے مخالف بات کرتے ہیں۔ گو ان کی ایسی بات کرنے سے قرآن جھوٹا ہوتا ہو، پھر بھی ہم کو جھٹلاتے ہیں۔ مگر تعصب بُرا ہے۔ ایسی بات بولتے ہیں جس سے قرآن شریف پر زد ہو۔ ہمارا تو کلیجہ کانپتا ہے کہ مُسلمان ہو کر ایسا کرتے ہیں۔ ایک تو وہ مسلمان تھے کہ بظاہر ضعیف حدیث میں بھی اگر سچائی پاتے تو اس کو قبول کرتے اور مخالفوں پر حجت میں پیش کرتے اور ایک یہ ہیں کہ قرآن کی دلیل کو نہیں مانتے۔ ہم تو حافظ صاحب کو بُلاتے ہیں کہ شائستگی سے، خلق و محبت سے چند دن یہاں آکر رہیں۔ ہم اُن کا ہرجانہ دینے کو تیار ہیں۔ نرمی سے ہمارے دلائل کو سُنیں اور پھر اپنا اعتراض کریں۔ مولوی احمد اللہ صاحب کو بھی بے شک اپنے ساتھ لائیں۔"

بابو محمد صاحب نے عرض کی کہ حافظ محمد یوسف صاحب اعتراض کرتے تھے کہ مولوی عبدالکریم صاحب نے الحکم میں یہ کفر لکھا ہے کہ یہ وہ احمدِ عربی ہے۔ فرمایا:

"حافظ صاحب سے پُوچھو کہ براہینِ احمدیہ میں جو میرا نام محمدؐ لکھا ہے اور مسیح بھی لکھا ہے اور تم لوگ اس کو پڑھتے رہے اور اس کتاب کی تعریف کرتے رہے اور اس کے ریویو میں لمبی چوڑی تحریریں کرتے رہے، تو اس کے بعد کونسی نئی بات ہوئی ہے۔ مولوی نذیر حسین دہلوی نے اس کتاب کے متعلق خود میرے سامنے کہا تھا کہ اسلام کی تائید میں جیسی عُمدہ یہ کتاب لکھی گئی ہے، ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اِس وقت منشی عبدالحق صاحب بھی موجود تھے اور بابو محمد صاحب بھی موجود تھے۔ یہ وہ زمانہ براہین کا تھا جب کہ تم خود تسلیم کرتے تھے کہ اس میں کوئی بناوٹ وغیرہ نہیں۔ اگر یہ خدا کا کلام نہ ہوتا، تو کیا انسان کے لیے ممکن تھا کہ اتنی مدت پہلے سے اپنی پٹڑی جمائے اور ایسا لمبا منصوبہ سوچے۔ اب چاہیے کہ یہ لوگ اس نفاق

کا جواب دیں کہ اس وقت کیوں ان لوگوں کو یہی باتیں اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ مہدی جو آنے والا ہے، اس کے باپ کا نام میرے باپ کا نام اور اس کی ماں کا نام میری ماں کا نام ہوگا اور وُہ میرے خُلق پر ہوگا۔ اس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی مطلب تھا کہ وُہ میرا مظہر ہوگا۔ جیساکہ ایلیا نبی کا مظہر یوحنّا نبی تھا۔ اس کو صُوفی بروز کہتے ہیں کہ فلاں شخص موسٰی کا مظہر اور فلاں عیسٰی کا مظہر ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ سے وہ لوگ مُراد ہیں جو مہدی کے ساتھ ہونگے اور وہ لوگ قائم مقام صحابہ کے ہوں گے اور ان کا امام یعنی مہدی قائم مقام حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوگا۔[۱]

۲۰؍جولائی ۱۹۰۱ء

ذاتیات میں دخل تقوٰی کے خلاف ہے

منشی الٰہی بخش صاحب اور ان کے رفیق اور ان کی تصنیف عصاءِ موسٰی کا ذکر تھا کسی نے کہا کہ فلاں شخص ان لوگوں کے چال چلن کی نسبت ایسی بات کہتا تھا۔ فرمایا

"ہم اس میں نہیں پڑتے اور نہ ہم اس طرح ذاتیات میں دخل دیتے ہیں۔ یہ بات تقوٰی کے برخلاف ہے۔"

بابو محمد صاحب نے ذکر کیا کہ انھوں نے عصائے موسٰی میں کئی باتیں واقعات کے برخلاف لکھی ہیں۔

اس پر حضرت اقدس ؑ نے فرمایا :

"ہم نے ضرورۃ الامام میں یہ ظاہر کیا تھا کہ ہمیں اُن پر حُسنِ ظن ہے مگر افسوس کہ انھوں نے اس طرح واقعات کے برخلاف اُمور لکھ کر ہمارے اس حُسنِ ظن کو دُور کر دیا ہے۔ کسی دُوسرے شخص کی عبارت نقل کر کے الٰہی بخش صاحب میری نسبت اور میرے والد صاحب کی نسبت ہتک کے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ وہ ایسے مُفلس تھے۔ تقوٰی کا خاصہ نہیں کہ محض جھُوٹ نقل کرے۔ ناقل بھی تو ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر الٰہی بخش صاحب کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے پُرانے نہ ہوتے اور وہ ہمارے خاندان کے حالات سے واقفیت نہ رکھتے اور کسی دور علاقہ کے رہنے والے ہوتے اور سرلیپل گریفن کی کتاب رؤسائے پنجاب میں میرے والد صاحب کا ذکر نہ پڑھا ہوتا اور غدر میں سرکار انگریزی کو پچاس سواروں کی مدد کے حال سے وہ ناواقف ہوتے تو میں ان کو معذور سمجھتا۔

---

[۱] الحکم جلد ۵ نمبر ۲۷ صفحہ ۶، ۷ پرچہ ۲۴؍جولائی ۱۹۰۱ء

مگر اب تو اُن کے تقویٰ کا خوب اندازہ ہو گیا۔"

فرمایا:" ساری کل انسان کی صحت اور ایمان کی خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

تحریر میں سختی

کسی نے ذکر کیا کہ کوئی اعتراض کرتا تھا کہ مولوی عبدالکریم صاحب کی تحریر میں سختی ہوتی ہے۔ فرمایا:" ہر ایک امر کے لیے موقع ہوتا ہے۔ ایک مولوی کو عین مسجد میں بدکاری کرتے ہوئے دیکھے تو دیکھنے والا ضرور کہے گا کہ یہ بدذات ہے۔ دین کی بے عزتی کرتا ہے، مگر جو شخص نہیں جانتا کہ محل اور موقعہ کونسا ہے، وہ دھوکا کھاتا ہے۔ ایک شخص خواہ مخواہ افترا کرتا ہے۔ بہتان باندھتا ہے۔ گالیاں دیتا ہے۔ ایک نہ دو نہ تین بلکہ بیسیوں تک نوبت پہنچاتا ہے۔ خواہ مخواہ کہا جائے گا کہ یہ بے حیا ہے۔ جو شخص قرآن شریف کے لیے غیرت نہیں رکھتا، وہ کیا ہے؟ غصّہ خدا نے بے جا نہیں بنایا۔ اس کا خراب استعمال بے جا ہے۔ کسی نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ کفر کے وقت تم بڑے غصّہ والے تھے۔ اب غصّہ کا کیا حال ہے۔ فرمایا۔ غصّہ تو اب بھی وہی ہے مگر پہلے اس کا استعمال بے جا تھا۔ اب ٹھکانہ پر لگ گیا ہے۔ یہ اعتراض تو صانع پر ہوتا ہے کہ اس نے غصّہ کی قوت کیوں بنائی؟ دراصل کوئی بھی قوت بُری نہیں۔ بداستعمالی بُری ہے۔ قرآن شریف میں انجیل کی طرح یہ حکم نہیں دیتا کہ خواہ مخواہ مار کھاتے رہو۔ ہماری شریعت کا یہ حکم ہے کہ موقع دیکھو۔ اگر نرمی کی ضرورت ہے خاک سے مل جاؤ۔ اگر سختی کی ضرورت ہے سختی کرو۔ جہاں عفو سے صلاحیت پیدا ہوتی ہو، وہاں عفو سے کام لو۔ نیک اور باحیا خدمتگار اگر قصور کرے، تو بخش دو۔ مگر بعض ایسے خیرہ طبع ہوتے ہیں کہ ایک دن بخشو تو دُوسرے دن دُگنا بگاڑ کرتے ہیں وہاں سزا ضروری ہے اور عملی طور پر انجیل میں سختی دکھائی گئی ہے۔ جہاں حضرت مسیحؑ نے مخالفین کو بے ایمانوں اور سانپوں کے بچّے کہا ہے۔ خدا نے بھی جھوٹے پر لعنت کی ہے اور دیگر اس قسم کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔"

مومن کی دو مثالیں

فرمایا:" قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے مومن کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک مثال فرعون کی عورت سے ہے جو کہ اس قسم کے خاوند سے خدا کی پناہ چاہتی ہے۔ یہ اُن مومنوں کی مثال ہے جو نفسانی جذبات کے آگے گر جاتے ہیں اور غلطیاں کر بیٹھتے ہیں پچھتاتے ہیں، توبہ کرتے ہیں۔ خدا سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کا نفس فرعون سے خاوند کی طرح ان کو تنگ کرتا رہتا ہے۔ وہ لوگ نفسِ لوّامہ رکھتے ہیں۔ بدی سے بچنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ دوسرے مومن وُہ ہیں جو اس سے اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ وہ صرف بدیوں سے ہی نہیں بچتے بلکہ نیکیوں کو حاصل کرتے ہیں۔ اُن

کی مثال اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم سے دی ہے اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (تحریم ۱۳) ہر ایک مومن جو تقویٰ وطہارت میں کمال پیدا کرے وہ بروزی طور پر مریمؑ ہوتا ہے اور خدا اُس میں اپنی رُوح پھونک دیتا ہے جو کہ ابنِ مریم بن جاتی ہے۔ زمخشری نے بھی اس کے یہی معنے کیے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ اور اگر یہ معنی نہ کیے جاویں، تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ مریمؑ اور ابنِ مریمؑ کے سوامسِ شیطان سے کوئی محفوظ نہیں۔ اس سے لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ تمام انبیاء پر شیطان کا دخل تھا پس در اصل اس آیت میں بھی اشارہ ہے کہ ہر ایک مومن جو اپنے تئیں اس کمال کو پہنچائے، خدا کی رُوح اس میں پھونکی جاتی ہے اور وہ ابنِ مریمؑ بن جاتا ہے اور اس میں ایک پیشگوئی ہے کہ اس اُمت میں ابنِ مریم پیدا ہوگا۔ تعجب ہے کہ لوگ اپنے بیٹوں کا نام محمدؐ اور عیسیٰ اور موسیٰ اور یعقوب اور اسحاق اور اسماعیل اور ابراہیم رکھ لیتے ہیں اور اس کو جائز جانتے ہیں پر خدا کے لیے جائز نہیں جانتے کہ وہ کسی کا نام عیسیٰ یا ابنِ مریم رکھ دے۔"

امام بطور وکیل کے ہوتا ہے کسی کے سوال پر فرمایا:

"مخالف کے پیچھے نماز بالکل نہیں ہوتی۔ پرہیزگار کے پیچھے نماز پڑھنے سے آدمی بخشا جاتا ہے۔ نماز تو تمام برکتوں کی کنجی ہے۔ نماز میں دُعا قبول ہوتی ہے۔ امام بطور وکیل کے ہوتا ہے۔ اس کا اپنا دل سیاہ ہو تو پھر وُہ دُوسروں کو کیا برکت دے گا۔"

یہود کی ہٹ دھرمی فرمایا: "یہود کہا کرتے ہیں کہ ہم تو قیامت کے دن خدا کے آگے ملاکی نبی کی کتاب رکھ دیں گے اور کہہ دیں گے کہ اس کتاب میں تُو نے فرمایا تھا کہ مسیح کے پہلے الیاس نبی آئے گا۔ اور تُو نے یہ نہیں کہا تھا کہ مثیلِ الیاس یا اس کا بروز یوحنا کی شکل میں آئے گا۔ اب اگر یہ مسیح سچا ہے اور ہم نے اس کو نہیں مانا تو ہمارا کیا قصور۔ یہی حال آج کل کے علماء کا ہے جو مسیح کے منتظر ہیں۔"

اس بات کا ذکر آیا کہ حضرت مسیحؑ نے جب یہود کو کہا کہ یُوحنا ہی الیاس ہے تو وُہ یُوحنا کے پاس گئے اور معلوم نہیں کن الفاظ میں ان سے پوچھا کہ تو الیاس ہے؟ تو یُوحنا نے انکار کیا کہ مَیں الیاس نہیں ہوں اور اس طرح حضرت مسیحؑ کی تکذیب ہوئی۔ اس پر فرمایا۔

"معلوم نہیں کہ یہودیوں نے کس طرح سے دھوکے کی گفتگو کی ہوگی۔ یُوحنا کو کیا خبر تھی کہ یہ کیا شرارت

کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ غلط ہے کہ پیغمبر خدا کی طرح ہر وقت حاضر ناظر ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات سچی ہوتی تو آنحضرتؐ کو حضرت عائشہؓ کے متعلق کیوں گھبراہٹ ہوتی۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی۔ سعدیؒ نے خوب لکھا ہے۔

کسے پُرسید زاں پیرِ خرد مند | کہ اے روشن گُہر پیرِ خرد مند
ز مصرش بوئے پیراہن شمیدی | چرا در چاہِ کنعانش ندیدی
بگفت احوالِ ما برقِ جہاں است | دمے پیدا و دیگر دم نہاں است
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم | گہے بر پُشتِ پائے خود نہ بینم

موجودہ اناجیل اصلی نہیں

فرمایا: "موجودہ اناجیل کے اصلی نہ ہونے کے لیے ایک بڑی بھاری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر ایک نبی کو ہم اُس کی قوم کی زبان میں اس کی طرف بھیجتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہود کی زبان عبرانی تھی، حالانکہ عبرانی میں اس وقت کوئی انجیل اصلی نہیں ملتی، بلکہ اصل یُونانی کو قرار دیا جاتا ہے جو کہ سنّت اللہ کے برخلاف ہے۔"

ابتلاء اور امتحان

فرمایا:

"دُنیوی بادشاہوں اور حاکموں نے جو اعلیٰ مراتب کے عطا کرنے کے واسطے امتحان مقرر کیے ہیں۔ یہی سُنّت اللہ کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی بعد امتحانوں کے دَرجات عطا کرتا ہے۔ جن مصائب اور تکالیف کے امتحانات میں حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پاس ہوئے وہ دُوسرے کا کام نہ تھا۔"[1]

---

۲۶ رجولائی تا یکم اگست ۱۹۰۱ء

افراط و تفریط

کسی مقام پر ایسی کثرتِ بارش کا ذکر تھا جس سے بہت نقصان کا اندیشہ ہوا۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ "جیسا لوگ احکامِ الٰہی کے معاملہ میں افراط و تفریط کرتے

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ صفحہ ۳-۴ پرچہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء

ہیں۔اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ بھی اُن کے ساتھ افراط و تفریط کا معاملہ کرتا ہے۔"

استغفار

ایک شخص نے پُوچھا کہ مَیں کیا وظیفہ پڑھا کروں۔فرمایا :

"استغفار بہت پڑھا کرو۔انسان کی دو ہی حالتیں ہیں۔یا تو وُہ گناہ نہ کرے یا اللہ تعالیٰ اس گناہ کے بد انجام سے بچالے۔سو استغفار پڑھنے کے وقت دونوں معنوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ سے گذشتہ گناہوں کی پردہ پوشی چاہے اور دُوسرا یہ کہ خدا سے توفیق چاہے کہ آئندہ گناہوں سے بچائے۔مگر استغفار صرف زبان سے پورا نہیں ہوتا ، بلکہ دل سے چاہیے۔نماز میں اپنی زبان میں بھی دُعا مانگو یہ ضروری ہے۔"

ہر نیکی کی جڑ یہ اتقاء ہے

فرمایا:"تقویٰ اختیار کرو۔تقویٰ ہر چیز کی جڑ ہے۔تقویٰ کے معنی ہیں ہر ایک باریک در باریک رگِ گناہ سے بچنا۔تقویٰ اس کو کہتے ہیں کہ جس امر میں بدی کا شُبہ بھی ہو،اس سے بھی کنارہ کرے۔"

فرمایا:"دل کی مثال ایک بڑی نہر کی سی ہے۔جس میں سے اور چھوٹی چھوٹی نہریں نکلتی ہیں۔جن کو سُوَا کہتے ہیں یا راجباہا کہتے ہیں۔دل کی نہر میں سے بھی چھوٹی چھوٹی نہریں نکلتی ہیں۔مثلاً زبان وغیرہ۔اگر چھوٹی نہر یا سوئے کا پانی خراب اور گندہ اور مَیلا ہو تو قیاس کیا جاتا ہے کہ بڑی نہر کا پانی خراب ہے۔پس اگر کسی کو دیکھو کہ اُس کی زبان یا دست و پا وغیرہ میں سے کوئی عُضو ناپاک ہے،تو سمجھو کہ اس کا دل بھی ایسا ہی ہے۔"

غیروں کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کی حکمت

اپنی جماعت کا غیر کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے متعلق ذکر تھا۔فرمایا :

"صبر کرو اور اپنی جماعت کے غیر کے پیچھے نماز مت پڑھو۔بہتری اور نیکی اسی میں ہے۔اور اسی میں تمہاری نصرت اور فتحِ عظیم ہے اور یہی اس جماعت کی ترقی کا موجب ہے۔دیکھو دُنیا میں رُوٹھے ہوئے اور ایک دُوسرے سے ناراض ہونے والے بھی اپنے دشمن کو چار دن مُنہ نہیں لگاتے اور تمہاری ناراضگی اور رُوٹھنا تو خدا کے لیے ہے۔تم اگر ان میں رَلے ملے رہے تو خدا تعالیٰ جو خاص نظر تم پر رکھتا ہے،وہ نہیں رکھے گا۔پاک جماعت جب الگ ہو،تو پھر اس میں ترقی ہوتی ہے۔"

معراج

حضرت رسول کریمؐ کی معراج کی بابت کسی نے سوال کیا۔ فرمایا :

"سب حق ہے۔ معراج ہوئی تھی، مگر یہ فانی بیداری اور فانی اشیاء کے ساتھ نہ تھی، بلکہ وہ اور رنگ تھا۔ جبرئیل بھی تو رسول اللہؐ کے پاس آتا تھا اور نیچے اُترتا تھا۔ جس رنگ میں اس کا اُترنا تھا۔ اسی رنگ میں آنحضرتؐ کا چڑھنا ہوا تھا۔ نہ اُترنے والا کسی کو اُترتا نظر آتا تھا اور نہ چڑھنے والا کوئی چڑھتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ حدیث شریف میں جو بخاری میں آیا ہے۔ ثُمَّ اسْتَیْقَظَ یعنی پھر جاگ اُٹھے۔"

بائبل اور سائنس

حضرت نوحؑ کی کشتی کا ذکر تھا۔ فرمایا :

"بائبل اور سائنس کی آپس میں ایسی عداوت ہے جیسی کہ دو سوکنیں ہوتی ہیں۔ بائبل میں لکھا ہے کہ وہ طوفان ساری دُنیا میں آیا اور کشتی تین سو ہاتھ لمبی اور پچاس ہاتھ چوڑی تھی اور اس میں حضرت نوحؑ نے ہر قسم کے پاک جانوروں میں سے سات جوڑے اور ناپاک میں سے دو جوڑے ہر قسم کے کشتی میں چڑھائے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اوّل تو اللہ تعالیٰ نے کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کیا جب تک پہلے رسول کے ذریعہ سے اس کو تبلیغ نہ کی ہو۔ اور حضرت نوحؑ کی تبلیغ ساری دُنیا کی قوموں تک کہاں پہنچی تھی جو سب غرق ہو جاتے۔ دوم اتنی چھوٹی سی کشتی میں جو صرف ۳۰۰ ہاتھ لمبی اور ۵۰ ہاتھ چوڑی ہو۔ ساری دنیا کے جانور، بہائم، چرند پرند سات سات جوڑے یا دو دو جوڑے کیونکر سما سکتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب میں تحریف ہے اور اس میں بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی ہیں۔ تعجب ہے کہ بعض سادہ لوح علماء اسلام نے بھی ان باتوں کو اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے، مگر قرآن شریف ہی ان بے معنی باتوں سے پاک ہے۔ اس پر ایسے اعتراض وارد نہیں ہو سکتے۔ اس میں نہ تو کشتی کی لمبائی چوڑائی کا ذکر ہے اور نہ ساری دُنیا پر طُوفان آنے کا ذکر ہے بلکہ صرف الارض یعنی وہ زمین جس میں نوحؑ نے تبلیغ کی۔ صرف اس کا ذکر ہے۔ لفظ اراراٹ جس پر نوحؑ کی کشتی ٹھہری اصل ارٰی رِیت ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ میں پہاڑ کی چوٹی کو دیکھتا ہوں۔ رِیت پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے لفظ جُودِی رکھا ہے جس کے معنی ہیں میرا جود وکرم یعنی وہ کشتی میرے جود وکرم پر ٹھہری۔"

جہاد آخر الحیل ہے

فرمایا :" نادان مولوی ذرا ذرا بات پر جہاد کا فتویٰ دیتے ہیں، حالانکہ جہاد تو آخر الحیل تھا۔ یہ اس کو اوّل الحیل بناتے ہیں۔ کوئی بدذات کسی

طرح بھی باز نہ آوے۔ تب حکم تھا کہ تلوار چلاؤ۔ اور یہ بات صاف ہے کہ جب تمام مسائل سُنائے جائیں۔ روشن دلائل دیئے جائیں۔ تب پر بھی خدا کا نمک حرام، خدا کے نشانات کا نمک حرام باز نہ آوے اور دین میں سدِّ راہ بنے تو ایسے کے لیے خس کم جہاں پاک کہنا بے جا نہیں۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تلوار نہیں اُٹھائی۔ صرف مدافعت کے لیے ایسا کیا گیا اور سچ یہ ہے کہ پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُنھوں نے تلوار اُٹھائی، آخر وہ تلوار اُنھیں کی اُن پر پڑی۔"

ہم بحث کرنا نہیں چاہتے

ایک شخص نے کہلا بھیجا کہ مَیں ہندوستان سے کوئی مولوی اپنے ساتھ لاؤں گا، جو آپؑ کے ساتھ گفتگو کرے، مگر مولوی لوگ قادیان آنا پسند نہیں کرتے۔ آپ بٹالہ میں آجائیں۔ فرمایا:

"قادیان سے وہ لوگ اسی واسطے نفرت رکھتے ہیں۔ کہ مَیں قادیان میں ہوں۔ پھر اگر میں بٹالہ میں ہوا تو بٹالہ اُن کے لیے نفرت کا مقام بن جائے گا۔ قادیان میں وُہ ہمارے پاس نہ ٹھہریں۔ کسی اور کے پاس جہاں چاہیں قیام کریں۔ یہاں دہریئے موجود ہیں، ان کے پاس ٹھہریں۔ ہم بحث کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا مطلب صرف سمجھا دینا ہے۔ اگر ایک دفعہ اُن کو تسلّی نہ ہو وے۔ پھر سُنیں۔ پھر سُنیں۔"

وفاتِ مسیح علیہ السلام

فرمایا: "اِس دُنیا سے اُس جہان میں جانے کے لیے مُردوں کے واسطے تو ایک راہ بنا ہوا ہے اور مُردے ہمیشہ جایا کرتے ہیں، مگر اس کے سوا اور کوئی دُوسری سڑک نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی اسی مُردوں والی سڑک کی راہ گئے، جو مُردوں میں جا بیٹھے؛ ورنہ حضرت یحیٰؑ کے پاس کیونکر جا بیٹھے۔"

تقویٰ کا اثر

"تقویٰ کا اثر اسی دُنیا میں متّقی پر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ صرف اُدھار نہیں نقد ہے۔ بلکہ جس طرح زہر کا اثر اور تریاق کا اثر بدن پر ہوتا ہے۔ اسی طرح تقویٰ کا اثر بھی ہوتا ہے[1]۔"

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ صفحہ ۳-۴ پرچہ ۱۰ راگست ۱۹۰۱ء

یکم اگست ۱۹۰۱ء

صبر و استقلال

حضرت اقدس امام ہمام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور جناب مولوی عبدالکریم صاحب سلمہ ربہٗ نے ایک شخص کو پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ شخص بہت سی گدیوں میں پھرا ہے اور بہت سے پیروں اور مشائخ کے پاس ہو آیا ہے۔ حضرت اقدسؑ نے مذکورہ شخص کو مخاطب کر کے فرمایا :

”کہو کیا کہتے ہو“

شخص - حضور! میں بہت سے پیروں کے پاس گیا ہوں۔ مجھ میں بعض عیب ہیں۔ اوّل- میں جس بزرگ کے پاس جاتا ہوں، تھوڑے دن رہ کر پھر چلا آتا ہوں اور طبیعت اس سے بداعتقاد ہو جاتی ہے۔ دوم- مجھ میں غیبت کرنے کا عیب ہے۔ سوم- عبادت میں دل نہیں لگتا اور بھی بہت سے عیب ہیں۔

حضرت اقدسؑ : میں نے سمجھ لیا ہے۔ اصل مرض تمہارا بے صبری کا ہے۔ باقی جو کچھ ہے اس کے عوارض ہیں۔ دیکھو انسان اپنے دنیا کے معاملات میں جبکہ بے صبر نہیں ہوتا اور صبر و استقلال سے انجام کا انتظار کرتا ہے۔ پھر خدا کے حضور بے صبری لے کر کیوں جاتا ہے۔ کیا ایک زمیندار ایک ہی دن میں کھیت میں بیج ڈال کر اس کے پھل کاٹنے کے فکر میں ہو جاتا ہے یا ایک بچہ کے پیدا ہوتے ہی کہتا ہے کہ یہ اسی وقت جوان ہو کر میری مدد کرے۔ خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت میں اس قسم کی عجلت اور جلد بازی کی نظیریں اور نمونے نہیں ہیں۔ وہ سخت نادان ہے جو اس قسم کی جلد بازی سے کام لینا چاہتا ہے۔ اس شخص کو بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنا چاہیے۔ جس کو اپنے عیب عیب کی شکل میں نظر آ جاویں؛ ورنہ شیطان بدکاریوں اور بداعمالیوں کو خوش رنگ اور خوبصورت بنا کر دکھاتا ہے۔ پس تم اپنی بے صبری کو چھوڑ کر صبر اور استقلال کے ساتھ خدا تعالیٰ سے توفیق چاہو اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ بغیر اس کے کچھ نہیں ہے۔ جو شخص اہل اللہ کے پاس اس غرض سے آتا ہے کہ وہ پھونک مار کر اصلاح کر دیں، وہ خدا پر حکومت کرنی چاہتا ہے۔ یہاں تو محکوم ہو کر آنا چاہیے۔ ساری حکومتوں کو جبتک چھوڑتا نہیں، کچھ بھی نہیں بنتا۔ جب بیمار طبیب کے پاس جاتا ہے تو وہ اپنی بہت سی شکائتیں بیان کرتا ہے۔ مگر طبیب شناخت اور تشخیص کے بعد معلوم کر لیتا ہے کہ اصل میں فلاں مرض ہے۔ وہ اس کا علاج شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے تمہاری بیماری بے صبری کی ہے۔ اگر تم اس کا علاج کرو، تو دوسری بیماریاں بھی خدا چاہے تو رفع ہو جائیں گی۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ انسان خدا تعالیٰ سے کبھی مایوس نہ ہو- اور اس وقت تک طلب میں

لگا رہے کہ جبتک غرغرہ شروع ہو جاوے۔ جبتک اپنی طلب اور صبر کو اس حد تک نہیں پہنچاتا، انسان بامُراد نہیں ہوسکتا اور یُوں خدا تعالیٰ قادر ہے وہ چاہے تو ایک دَم میں بامُراد کر دے۔ مگر عشقِ صادق کا یہ تقاضا ہونا چاہیے کہ وُہ راہِ طلب میں پویاں رہے۔ سعدیؒ نے کہا ہے ؎

گر نباشد بدوست رہ بُردن شرطِ عشق است در طلب مُردن

مرض دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مرض مستوی اور ایک مرض مختلف۔ مرض مستوی وہ ہوتا ہے جس کا دَرد وغیرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاج کا تو انسان فکر کرتا ہے اور مرض مختلف کی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔ اسی طرح سے بعض گناہ تو محسوس ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان اُن کو محسوس بھی نہیں کرتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہر وقت انسان خدا تعالیٰ سے استغفار کرتا رہے۔ قبروں پر جانے سے کیا فائدہ۔ خدا تعالیٰ نے تو اصلاح کے لیے قرآن شریف بھیجا ہے۔ اگر پُھونک مار کر اصلاح کر دینا خدا تعالیٰ کا قانون ہوتا تو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ برس تک مکہ میں کیوں تکلیفیں اُٹھاتے۔ ابوجہل وغیرہ پر اثر کیوں نہ ڈال دیتے۔ ابُوجہل کو جانے دو۔ ابُوطالب کو تو آپؐ سے بھی محبت تھی۔ غرض بے صبری اچھی نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ ہلاکت تک پہنچاتا ہے۔"

۲ر اگست ۱۹۰۱ء (دارالامان میں)

آج جُمعہ کا دن ہے۔ صُبح آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر رحمت علی صاحب ہاسپٹل اسسٹنٹ چھاؤنی میاں میر تشریف لائے۔ جُمعہ کی نماز چھوٹی اور بڑی دونوں مسجدوں میں ادا ہوئی۔ صاحبزادہ مبارک احمد سلمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت آج بحمد اللہ نسبتاً بہت اچھی رہی۔ مغرب کی نماز کے بعد حضرت اقدس ایدہ اللہ بنصرہ حسب معمول بعد نماز بیٹھے رہے۔ ایک شخص نے جو کئی دن سے دارالامان میں آیا ہوا تھا۔ ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ یا امام پاک! یہ خدا کا کلام ہے۔ مَیں اس کو پیش کرتا ہوں اور تین سو روپیہ آپ سے مانگتا ہوں اور قرآن شریف کو بار بار حضرت اقدسؑ کے ہاتھ میں دیتا اور اصرار کرتا تھا کہ آپ اس کو رکھیں۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

اس زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت

"ہم قرآن شریف ہی کی تعلیم دینے کو آئے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف تو اس لیے بھیجا ہے کہ اس پر عمل کیا جاوے۔ اس میں کہیں نہیں لکھا کہ خدا کسی کو مجبور کرتا ہے۔ انسان کی ہر حالت خواہ وہ آرام کی ہو

یا تکلیف کی، گذر ہی جاتی ہے۔ کیونکہ وقت تو اُس کی پروا نہیں کرتا ؛ چنانچہ کسی نے کہا ہے۔ شبِ تنور گذشت وشبِ سمور گذشت۔ پھر انسان کیونکر اس کام کو مقدم نہ کرے جو اس کا اصل فرض ہے۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑی ضرورت آج اسلام کی زندگی کی ہے۔ اسلام ہر قسم کی خدمت کا محتاج ہے۔ اس کی ضرورتوں پر ہم کسی ضرورت کو مقدم نہیں کر سکتے۔ خدا تعالیٰ نے جو کام ہمارے سپرد کیا ہے۔ ہم معصیت سمجھتے ہیں کہ اس کام کو چھوڑ دیں۔ دو بیمار ہوتے ہیں۔ ایک ان میں سے اگر مر جاوے تو کچھ حرج نہیں ہوتا، لیکن ایک ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ مر جاوے تو دُنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ بس یہی حالت اسلام کی ہو رہی ہے۔ آج سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اور بن پڑے اسلام کی خدمت کی جاوے۔ جس قدر روپیہ ہو وہ اسلام کے احیاء میں خرچ کیا جاوے۔ مَیں اب تمہارے اس طرح پر قرآن شریف پیش کرنے کو کیا کروں۔ مَیں تمہارا فکر کروں یا قرآن شریف کا فکر کروں۔ میرے لیے تو قرآن ہی کا فکر مقدم پڑا ہوا ہے اور جو کام خدا نے میرے سپرد کیا ہے اُسے مَیں کیونکر چھوڑ دوں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام کا کیا حال ہو گیا ہے۔ کوئی ناجائز کام کسی تاویل اور پناہ لینے سے روا نہیں ہو جاتا۔ تمہاری یہ قسم دراصل ناجائز ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص قتل کا مستوجب ہوا وہ بیت الحرام میں داخل ہو گیا۔ صرف اس خیال سے کہ اس کی شان میں آیا ہے مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران : ۹۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو وہیں قتل کیا جاوے۔ اس طرح اگر کوئی لوگوں کو قسمیں دے کر اپنے اغراض کو پورا کرنے پر مجبور کرے تو وہ ساری دنیا کا کام آج تمام کر دیتا اور خدا کے احکام سے امان اُٹھ جاتا۔ اور ایسے طریقوں اور حیلوں سے آج اسلام کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ ہمارا یہ مذہب نہیں ہے کہ دینی حالت کا لحاظ نہ کریں اور اُس کی پروا نہ ہو۔ نہیں ! بلکہ ہمارے نزدیک وہ سب سے مقدم ہے۔ تم نے جو طریق اختیار کیا ہوا ہے۔ اس کو خدا تعالیٰ جائز نہیں رکھتا ۔"

اس کے بعد ڈاکٹر رحمت علی صاحب نے اپنا ایک خواب عرض کیا کہ کسی نے اعتراض کیا کہ مسیحؑ کی نسبت آیا ہے وہ بہت مال دے گا۔ مَیں نے اس کو کہا کہ کس قدر مال اس نے دیا ہے کوئی لینے والا بھی ہو۔ دس ہزار ایک کتاب کے ساتھ ہے۔ پانچسو ایک کے ساتھ ہے۔ وغیرہ۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔

"ہاں درست ہے مگر قرآن شریف کو خدا تعالیٰ نے خیر کہا ہے ؛ چنانچہ فرمایا : وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔ پس قرآن شریف معارف اور علوم کے مال کا خزانہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآنی معارف اور علوم کا نام بھی مال رکھا ہے۔ دُنیا کی برکتیں بھی اسی کے ساتھ آتی ہیں۔"

زاں بعد پھر اسی قرآن فروش نے کہا کہ یا امام پاک ! انہوں نے تو خدا کے کلام کو واپس نہیں کیا۔ آپ تو امام پاک ہیں۔ آپ کیوں واپس کرتے ہیں ؟ حضرتؑ نے فرمایا :

"تم نے نبیوں کو کہاں دیکھا ہے"؟

اس نے کہا کہ یا حضرت آپ کو تو دیکھا ہے۔ فرمایا

"تم نے ہم کو بھی نہیں دیکھا۔ اگر تم دیکھتے تو ایسی بے جا حرکت نہ کرتے۔

[تھوڑی دیر کے بعد وہ چلا گیا۔ پھر ڈاکٹر رحمت علی صاحب کچھ اپنے مقامی حالات سُناتے رہے اور گورنمنٹ انگلشیہ کا ذکر کرتے رہے کہ اس نے فوجوں میں نماز اور اپنے مذہب کی پابندیوں کے لیے پُورا وقت اور فرصت دے رکھی ہے؛ بشرطیکہ کوئی کہنے والا ہو۔ ہر مذہب کے لوگوں کے لیے ایک ایک مذہبی پیشوا مقرر کر رکھا ہے اور نماز کے اوقات میں کوئی کام نہیں رکھا۔ ہاں جُمعہ کی تکلیف ہے۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا: کہ]

"یہ تکلیف بھی جاتی رہتی۔ اگر سب مِل کر درخواست کرتے۔ مگر ان کم بختوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر جمعہ کی فرضیت کو ہی اُڑانا چاہا ہے۔ افسوس"!

احتیاطی نماز

پھر اُس شخص نے جس کا ذکر یکم اگست کی شام میں کیا کہ حضرت احتیاطی نماز کے لیے کیا حکم ہے۔ فرمایا:

"احتیاطی نماز کیا ہوتی ہے۔ جُمعہ کے تو دو ہی فرض ہیں۔ احتیاطی فرض کچھ چیز نہیں"۔

فرمایا: "لدھیانہ میں ایک بار میاں شہاب الدین بڑے پکے موحد نے جمعہ کے بعد احتیاطی نماز پڑھی۔ مَیں نے ناراض ہو کر کہا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ تم تو بڑے پکے موحد تھے۔ اُس نے کہا کہ مَیں نے جُمعہ کی احتیاطی نہیں پڑھی، بلکہ مَیں نے مار کھانے کی احتیاطی پڑھی ہے"۔

مسیح موعود کے حنفی مذہب پر ہونے سے مُراد

اس کے بعد مولوی بہاؤالدین صاحب احمد آبادی نے پُوچھا کہ مکتوباتِ امامِ ربانی میں مسیح موعود کی نسبت لکھا ہے کہ وہ حنفی مذہب پر ہوگا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا:

"اس سے یہ مُراد ہے کہ جیسے حضرت امام اعظمؒ قرآن شریف ہی سے اِستدلال کرتے تھے، اسی طرح مسیح موعود بھی قرآن شریف ہی کے علوم اور حقائق کو لے کر آئے گا؛ چنانچہ اپنے مکتوبات میں دوسری جگہ اُنھوں نے اس راز کو کھول بھی دیا ہے اور خصوصیت سے ذکر کیا ہے کہ مسیح موعود کو قرآنی حقائق کا عِلم دیا جائے گا"۔

کیا مہدی جنگ اور خونریزی کرے گا

پھر یکم اگست والے سائل نے کہا کہ مہدی کی نسبت لکھا ہے کہ وُہ خون کرے گا۔ وغیرہ حضرتؑ نے فرمایا:

"مَیں نے تمہارا مطلب سمجھ لیا ہے۔ یاد رکھو مہدی کی نسبت جو حدیثیں ہیں جن میں لکھا ہے کہ وُہ جنگ کرے گا اور خونریزی کرے گا۔ اُن کی نسبت خود ان مولویوں نے لکھ دیا ہے کہ بہت سی حدیثیں ان میں موضوع ہیں اور قریباً سب کی سب مجروح ہیں۔ ہمارا یہ مذہب نہیں کہ مہدی آتے ہی خون کرتا پھرے گا۔ بھلا وُہ دین کیا ہوا جس میں سوائے جنگ اور جدال کے اور کچھ نہ ہو۔ جہاد کے مسئلہ کو بھی ان ناواقفوں نے نہیں سمجھا۔ قرآن شریف تو کہتا ہے۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (البقرۃ:۲۵۷) تو کیا اگر مہدی آکر لڑائیاں کرے گا، تو اِکراہ فی الدین جائز ہوگا اور قرآن شریف کے اس حکم کی بے حرمتی ہوگی؟ اس کے آنے کی غرض تو یہ ہے کہ وُہ اسلام کو زندہ کرے۔ یا یہ کہ اس کی توہین کرے؟ اگر دین میں لڑائیاں ہی ضرور ہوتی ہیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ برس تک مکہ میں رہ کر کیوں نہ لڑے۔ ہر قسم کی تکلیف اُٹھاتے رہے اور پھر بھی آپؐ نے ابتدا نہیں کی۔ ہمارا مذہب ہے کہ جبراً مسلمان کرنے کے واسطے لڑائیاں ہرگز نہیں کی ہیں، بلکہ وہ لڑائیاں خداتعالیٰ کا ایک عذاب تھا۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے آپ کو سخت تکالیف دی تھیں اور مسلمانوں کا تعاقب کیا اور ان کو تنگ کیا تھا۔ پس یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ اسلام تلوار دکھاتا ہے۔ اسلام تو قرآن اور ہدایت پیش کرتا ہے۔ وُہ صلح اور امن لے کر آیا ہے اور دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں جو اسلام کی طرح صُلح پھیلاتا ہو۔

پس یہ غلط ہے کہ مہدی جنگ کرے گا۔ ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں۔ بھلا اگر تلوار مار کر لوگوں کو ہلاک کر دیا اور ان کے املاک لُوٹ لیے تو اس سے فائدہ کیا ہوا۔ جس مہدی ہونے کا ہمارا دعویٰ ہے یہ تو قرآن شریف سے ثابت ہے۔ جیسے مُوسوی سلسلہ مسیح پر آکر ختم ہوا۔ اسی طرح خداتعالیٰ نے ایک خاص مناسبت کی وجہ سے اس سلسلہ کو بھی ایک محمدی مسیح پر ختم کیا ہے۔ مہدی نام اُس کا اِس لیے رکھا ہے کہ وہ براہِ راست خداتعالیٰ سے ہدایت پائے گا۔ اور ایسے وقت میں آئے گا جبکہ دُنیا سے نورِ ہدایت اُٹھ گئے ہوں گے۔ پھر ایک لطیف تر بات ان دونوں سلسلوں کی مماثلت میں یہ ہے کہ جیسے مسیح مُوسوی علیہ السلام کے بعد چودھویں صدی میں آیا تھا۔ یہاں بھی مسیح محمدی کی بعثت کا زمانہ چودھویں ہی صدی ہے اور جیسے مسیح مُوسوی یہودیوں کی سلطنت میں نہیں بلکہ رُومیوں کی سلطنت میں پیدا ہوا تھا اسی طرح محمدی مسیح بھی مُسلمانوں کی سلطنت میں نہیں بلکہ انگلش گورنمنٹ کی سلطنت میں پیدا ہوا ہے۔ غرض ہمارا ہرگز یہ مذہب نہیں ہے کہ مہدی آکر لڑائیاں کرتا پھرے گا اور خُونریزی اس کا کام ہوگا۔"[1]

۱؎ الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ صفحہ ۶ تا ۸ پرچہ ۱۰ راگست ۱۹۰۱ء

۱۵؍اگست ۱۹۰۱ء دیوار کے مقدمہ کی فتحیابی پر فرمایا :

"اس دیوار کی وجہ سے قریباً ڈیڑھ سال راستہ بند رہ کر ایک محاصرہ ہم پر رہا ہے۔ اس کی خبر بھی حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے جو حدیث میں موجود ہے۔"

اس بات پر کہ حدیث میں آیا ہے کہ مسیح کا نزول ہوگا۔ فرمایا :

"جو شئے اُوپر سے یعنی آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ سب کی نظریں اس کی طرف پھر جاتی ہیں اور سب آسانی سے اس کو دیکھ سکتے ہیں اور وہ چیز جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ پس اس لفظ میں ایک استعارہ ہے کہ مسیح کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا کر دیگا کہ بہت جلد اُس کی شہرت ہوگی، چنانچہ یہ امر اس زمانہ کے اسباب ریل۔ ڈاک، مطبع وغیرہ سے ظاہر ہے۔"

قرآن شریف کی جامعیّت

فرمایا : "کُل چیزیں قرآن شریف میں موجُود ہیں۔ اگر انسان عقلمند ہو تو اس کے لیے وہ کافی ہے۔" فرمایا :

"یورپین لوگ ایک قوم سے مُعاہدہ کرتے ہیں۔ اس کی ترکیبِ عبارت ایسی رکھ دیتے ہیں کہ دراز عرصہ کے بعد بھی نئی ضرورتوں اور واقعات کے پیش آنے پر بھی اس میں استدلال اور استنباط کا سامان موجود ہوتا ہے۔ ایسا ہی قرآن شریف میں آئندہ کی ضرورتوں کے مواد اور سامان موجود ہیں۔"

غضِّ بصر

فرمایا : "مومن کو نہیں چاہیے کہ دریدہ دہن بنے یا بے محابا اپنی آنکھ کو ہر طرف اُٹھائے پھرے، بلکہ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النّور : ۳۱) پر عمل کر کے نظر کو نیچی رکھنا چاہیے اور بدنظری کے اسباب سے بچنا چاہیے۔"

تقلید کے متعلق مذہب

ایک دفعہ ایک واعظ ایسے طرز پر حضرتؑ کے سامنے گفتگو کرتا تھا کہ گویا اس کے نزدیک حضرتؑ بھی فرقہ وہابیہ کے طرفدار ہیں اور اپنے تئیں بار بار حنفی اور وہابیوں کا دشمن ظاہر کرتا تھا کہ حق کا طالب ہوں۔ اس پر حضرتؑ نے فرمایا :

"اگر کوئی محبت اور آہستگی سے ہماری باتیں سُنے تو ہم بڑی محبت کرنے والے ہیں اور قرآن اور حدیث

کے مطابق ہم فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس طرح فیصلہ کرنا چاہے کہ جو امر قرآن شریف اور احادیث صحیحہ کے مطابق ہو اسے قبول کرے گا اور جو ان کے برخلاف ہوگا اسے ردّ کر دے گا۔ تو یہ امر ہمارا عین سرور، عین مدعا ہے اور عین آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

ہمارا مذہب وہابیوں کے برخلاف ہے۔ ہمارے نزدیک تقلید کو چھوڑنا ایک اباحت ہے، کیونکہ ہر ایک شخص مجتہد نہیں ہے۔ ذرا سا علم ہونے سے کوئی متابعت کے لائق نہیں ہو جاتا۔ کیا وہ اس لائق ہے کہ سارے متقی اور تزکیہ کرنے والوں کی تابعداری سے آزاد ہو جائے۔ قرآن شریف کے اسرار سوائے مطہر اور پاک لوگوں کے اور کسی پر نہیں کھولے جاتے ہمارے ہاں جو آتا ہے اسے پہلے ایک حنفیت کا رنگ چڑھانا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں یہ چاروں مذہب اللہ تعالیٰ کا فضل ہیں اور اسلام کے واسطے ایک چار دیواری۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حمایت کے واسطے ایسے اعلیٰ لوگ پیدا کئے جو نہایت متقی اور صاحب تزکیہ تھے۔ آجکل کے لوگ جو بگڑے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اماموں کی متابعت چھوڑ دی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ کو دو قسم کے لوگ پیارے ہیں۔ اوّل وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے خود پاک کیا اور علم دیا۔ دوم وہ جو اُن کی تابعداری کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان لوگوں کی تابعداری کرنے والے بہت اچھے ہیں۔ کیونکہ اُن کو تزکیۂ نفس عطا کیا گیا تھا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے قریب تر کے ہیں۔ مَیں نے خود سُنا ہے کہ بعض لوگ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے حق میں سخت کلامی کرتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی غلطی ہے۔“

(از نوٹ بک مولوی شیر علی صاحب)

۱۵ر اگست ۱۹۰۱ء کی صبح کو ایک الہام ہوا

وَ اِنِّیْ اَرٰی بَعْضَ الْمَصَائِبِ تَنْزِلُ[1]

۲۶ر اگست ۱۹۰۱ء صبح بوقتِ سیر فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی

”اچھی زندگی وُہ ہے جو عمدہ ہو؛ اگرچہ تھوڑی ہو حضرت نوحؑ کے مقابلہ میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۱ صفحہ ۳ تا ۴ پرچہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۱ء

کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر نہایت مفید تھی۔ تھوڑے سے عرصہ میں آپ نے بڑے بڑے مفید کام کئے۔ انبیاءؑ کے اقوال میں ایک اثر ہوتا ہے، وہ اپنے ساتھ قوتِ قدسیہ رکھتے ہیں۔ یہ قوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے زیادہ تھی۔ ایک آدمی کو راہ پر لانا کیسا مشکل ہوتا ہے، مگر آنحضرت کے طفیل کروڑوں آدمی راہ پر آگئے۔ اس وقت دُنیا میں تمام مذاہب کے مقابلہ پر سب سے زیادہ تعداد مُسلمانوں کی ہے۔ بعض جغرافیہ والوں نے مسلمانوں کی تعداد کم لکھی ہے، مگر محققین نے بڑے بڑے ثبوت دے کر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ مُسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

کسی بات کا اثر دو طرح پر قائم رہتا ہے۔ اعتقاداً و عملاً۔ اعتقادی طور پر سارے مُسلمان کلمہ طیبہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ پر قائم ہیں اور عملی طور پر مثلاً سُور نہ کھانا تمام مسلمانوں میں خواہ وہ کسی فرقہ یا مُلک کے ہوں سب میں نہایت قوت کے ساتھ اُس پر عمل ہوتا ہے۔ بدی کے ارتکاب میں سے جھوٹ بولنا سب سے زیادہ آسان اور جلدی ہوسکنے والا ہے۔ کیونکہ زنا، چوری وغیرہ کے واسطے قوت، مال، ہمت، دلیری چاہیے۔ مگر جھُوٹ کے واسطے کسی چیز کی ضرورت نہیں، صرف زبان ہلا دینی پڑتی ہے۔ باوجود اس کے صحابہؓ میں جھوٹ ثابت نہیں۔ آنحضرتؐ کے اصحاب میں سے کسی نے بھی جھوٹ نہیں بولا۔ دیکھو کتنا بڑا اثر ہے۔ لیکن اس کے مقابل حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں دیکھو۔ اپنے نبی کا عین گرفتاری کے وقت انکار کر دیا۔ ایک نے تیس روپے لے کر اُس کو پکڑوا دیا۔ ایک حواری کہتا ہے کہ مسیح نے ایسے نشان دکھائے کہ اگر لکھے جائیں، تو دُنیا میں نہ سمائیں۔ دیکھو یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ جو باتیں دُنیا میں ہوئیں اور ہونے کے وقت سما گئیں وہ بعد میں کیونکر نہ سما سکتیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں سب سے زیادہ قبول ہوئیں۔"

قبولیتِ دُعا کے شرائط

فرمایا: "قبولیتِ دُعا کے واسطے چار شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔ تب کسی کے واسطے دُعا قبول ہوتی ہے۔

شرط اوّل یہ ہے کہ اتقاء ہو یعنی جس سے دُعا کروائی جاوے وہ دُعا کرنے والا متقی ہو۔ تقویٰ احسن و اکمل طور پر حضرت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا تھا۔ آپؐ میں کمالِ تقویٰ تھا۔ اصُول تقویٰ کا یہ ہے کہ انسان عبُودیت کو چھوڑ کر الوُہیت کے ساتھ ایسا مِل جاوے، جیسا کہ لکڑی کے تختے دیوار کے ساتھ مِل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی شے حائل نہ رہے۔ امُور تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک یقینی بدیہی یعنی ظاہری دیکھنے میں ایک بات بُری یا بھلی ہے۔ دوم یقینی نظری یعنی ویسا یقین تو نہیں۔ مگر پھر بھی نظری طور پر دیکھنے میں وہ امر اچھا یا بُرا ہو۔ سوم امورِ مشتبہ، یعنی ان میں شبہ ہو کہ شاید یہ بُرے ہوں۔ پس متقی وہ ہے کہ اس احتمال اور شبہ سے بھی بچے۔ اور تینوں مراتب کو طے کرے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ شبہ اور احتمال سے بچنے کے لیے

ہم دس باتوں میں سے نو باتیں چھوڑ دیتے ہیں۔ چاہیے کہ احتمالات کا سدِ باب کیا جاوے۔ دیکھو ہمارے مخالفوں نے اس قدر تائیدات اور نشانات دیکھے ہیں کہ اگر اُن میں تقویٰ ہوتا تو کبھی روگردانی نہ کرتے۔ ایک کریم بخش کی گواہی ہی دیکھو جس نے رو رو کر اپنے بڑھاپے کی عمر میں جبکہ اس کی موت بہت قریب تھی یہ گواہی دی کہ ایک مجذوب گلاب شاہ نے پہلے سے مجھے کہا تھا کہ عیسیٰ قادیان میں پیدا ہو گیا ہے اور وُہ لدھیانہ میں آوے گا اور تُو دیکھے گا کہ مولوی اس کی کیسی مخالفت کریں گے۔ اس کا نام غلام احمد ہوگا۔ دیکھو یہ کیسی صاف پیشگوئی ہے جو اس مجذوب نے کی۔ کریم بخش کے پابندِ صوم و صلوٰۃ ہونے اور ہمیشہ سچ بولنے پر سینکڑوں آدمیوں نے گواہی دی جیسا کہ ازالۂ اوہام میں مفصّل درج ہے۔

اب کیا تقویٰ کا یہ کام ہے کہ اس گواہی کو جھٹلایا جاوے۔ تقویٰ کے مضمون پر ہم کچھ شعر لکھ رہے تھے اس میں ایک مصرعہ الہامی درج ہوا۔ وُہ شعر یہ ہے۔

ہر اک نیکی کی جڑ یہ اتقا ہے　　اگر یہ جڑ رہی سب کچھ رہا ہے

اس میں دوسرا مصرعہ الہامی ہے۔ جہاں تقویٰ نہیں وہاں حسنہ حسنہ نہیں اور کوئی نیکی نیکی نہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف کی تعریف میں فرماتا ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ : ۳) قرآن بھی ان لوگوں کے لیے ہدایت کا موجب ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کریں۔ ابتدا میں قرآن کے دیکھنے والوں کا تقویٰ یہ ہے کہ جہالت اور حسد اور بخل سے قرآن شریف کو نہ دیکھیں بلکہ نورِ قلب کا تقویٰ ساتھ لے کر صدقِ نیت سے قرآن شریف کو پڑھیں۔

دُوسری شرط قبولیتِ دُعا کے واسطے یہ ہے کہ جس کے واسطے انسان دُعا کرتا ہو، اس کے لیے دل میں درد ہو۔ اَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ۔ (النمل : ۶۳)

تیسری شرط یہ ہے کہ وقتِ اصفٰی میسّر آوے۔ ایسا وقت کہ بندہ اور اس کے رب میں کچھ حائل نہ ہو۔ قرآن شریف میں جو لیلۃ القدر کا ذکر آیا ہے کہ وُہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یہاں لیلۃ القدر کے تین معنی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ رمضان میں ایک رات لیلۃ القدر کی ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی ایک لیلۃ القدر تھا یعنی سخت جہالت اور بے ایمانی کی تاریکی کے زمانہ میں وہ آیا جبکہ ملائکہ کا نزول ہوا۔ کیونکر نبی دُنیا میں اکیلا نہیں آتا بلکہ وہ بادشاہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ لاکھوں کروڑوں ملائکہ کا لشکر ہوتا ہے۔ جو ملائک اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں اور لوگوں کے دلوں کو نیکی کی طرف کھینچتے ہیں۔ سوم۔ لیلۃ القدر انسان کے لیے اس کا وقتِ اصفٰی ہے۔ تمام وقت یکساں نہیں ہوتے۔ بعض وقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ کو کہتے کہ اَرِحْنَا يَا عَائِشَةُ یعنی اے عائشہ مجھ کو راحت و خوشی پہنچا اور بعض وقت آپؐ بالکل دُعا میں مصروف ہوتے۔ جیسا کہ سعدیؒ نے کہا ہے۔

وقتے چنیں بودے کہ جبرئیل و میکائیل پرداختے و دیگر وقت با حفصہ و زینب درساختے
جتنا جتنا انسان خدا کے قریب آتا ہے یہ وقت اسے زیادہ میسر آتا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ پوری مدت دُعا کی حاصل ہو یہاں تک کہ خواب یا وحی سے اللہ تعالیٰ خبر دے۔ محبت و اخلاص والے کو جلدی نہیں چاہیے، بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہئیے۔[1]

ایک رویار

۲۶ یا ۲۷؍ اگست ۱۹۰۱ء یا اس کے قریب ایک دن حضرت نے فرمایا:

"ہم نے رویار میں دیکھا ہے کہ ایک شخص نے قے کی ہے اور اس پر کپڑا دے کر اُسے چھپاتا ہے۔"

کراماتِ اولیار ایک صاحب جن کے خاندان میں پیری مُریدی کا سلسلہ مدت سے چلا آتا ہے اور ہزاروں اُن کے مُرید ہیں اور وُہ خود بھی پیر تھے۔ مگر اب ان سلسلوں کو ترک کر کے اس سلسلہ الٰیہ میں شامل ہیں۔ انھوں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ زمانۂ پیری میں ہم لوگوں کی اکثر جھوٹی کرامتیں مشہور تھیں۔ اور بہت لوگ ہمارے مُرید اور معتقد تھے۔ مَیں نے ایک دفعہ اپنے بھائی سے ذکر کیا اور دل میں کئی بار خطرہ گزرا کہ ہمارے والد صاحب کی جو کرامتیں مشہور ہیں وُہ بھی اس طرح کی ہوں گی جس طرح کی ہماری ہیں۔ پھر ہم نے سوچا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی اور دُوسرے بزرگوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ غرض میں اسی خیال میں ترقی کرتا ہوا قریب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی بدگمان ہو جاتا اور معاذ اللہ خدا تعالیٰ کا بھی انکار کرتا کہ خوش قسمتی سے مجھے آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور حق مل گیا۔ اس پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"بیشک ان گدی نشینوں اور اس قسم کے پیروں کے ایمان خطرہ میں ہیں۔ لیکن اس قسم کی جھوٹی کرامتوں کے دکھلانے والے اور جھُوٹی کرامتوں کے مشہور ہو جانے سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ سب جھوٹے ہی ہیں۔ اور تمام سلسلہ اولیار کا اور بزرگانِ دین کا سب مکاری اور فریب پر مبنی تھا بلکہ ان جھوٹے ولیوں کا وجُود اس بات کا ثبوت ہے کہ دُنیا میں سچے ولی بھی ضرور ہیں، کیونکہ جبتک کوئی سچی بات نہ ہو، تب تک کوئی جھوٹی بات نہیں بنائی جاتی۔ مثلاً اگر دُنیا میں سچا اور اصلی سونا نہ ہوتا تو کیمیاگر کبھی جھُوٹا سونا نہ بناتا۔ اگر سچے ہیرے اور موتی

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۲ صفحہ ۱۳-۱۴ پرچہ ۳۱؍ اگست ۱۹۰۱ء

کانوں سے نہ نکلتے تو جھوٹے ہیرے اور موتی بنانے کا کسی کو خیال نہ پیدا ہوتا۔ ان جھوٹوں کا ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ سچے ضرور ہیں۔

۲۸/اگست ۱۹۰۱ء کی صبح کو حضرت نے فرمایا کہ:

آئندہ کے متعلق ایک نظارہ "ہمارے مخالف دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو مسلمان مُلّا مولوی وغیرہ دُوسرے عیسائی انگریز وغیرہ۔ دونوں اس مخالفت میں اسلام پر ناجائز حملے کرنے میں زیادتی کرتے ہیں۔ آج ہمیں ان دونوں قوموں کے متعلق ایک نظّارہ دکھایا گیا اور الہام کی صورت پیدا ہوئی مگر اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ انگریزوں وغیرہ کے متعلق اس طرح سے تھا کہ ان میں بہت سے لوگ ہیں جو سچائی کی قدر کریں گے اور مُلّا مولویوں وغیرہ کے متعلق یہ تھا کہ اُن میں سے اکثر کی قوت مسلُوب ہو گئی ہے۔"

آدابِ دُعا دُعا کے متعلق ذکر تھا: فرمایا:

"دُعا کے لیے رقّت والے الفاظ تلاش کرنے چاہئیں۔ یہ مناسب نہیں کہ انسان مسنُون دُعاؤں کے ایسا پیچھے پڑے کہ اُن کو جنتر منتر کی طرح پڑھتا رہے اور حقیقت کو نہ پہچانے۔ اتباعِ سنّت ضروری ہے، مگر تلاش رقّت بھی اتباعِ سنّت ہے۔ اپنی زبان میں جس کو تم خُوب سمجھتے ہو، دُعا کرو تاکہ دُعا میں جوش پیدا ہو۔ الفاظ پرست مخذُول ہوتا ہے۔ حقیقت پرست بننا چاہیے۔ مسنُون دُعاؤں کو بھی برکت کے لیے پڑھنا چاہیے، مگر حقیقت کو پاؤ۔ ہاں جس کو زبانِ عربی سے موافقت اور فہم ہو وہ عربی میں پڑھے۔"

حُقّہ نوشی حُقّہ نوشی کے متعلق ذکر آیا۔ فرمایا:

"اس کا ترک اچھا ہے۔ ایک بدعت ہے۔ مُنہ سے بُو آتی ہے۔ ہمارے والد صاحب مرحُوم اس کے متعلق ایک شعر اپنا بنایا ہوا پڑھا کرتے تھے جس سے اس کی بُرائی ظاہر ہوتی ہے۔"

۳/ستمبر ۱۹۰۱ء

ایک رویاء فرمایا: "آج ہم نے رویاء میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا دربار ہے اور ایک مجمع ہے اور اس میں تلواروں کا ذکر ہو رہا ہے، تو مَیں نے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہا کہ سب سے بہتر اور

تیز تر وہ تلوار ہے جو تیری تلوار میرے پاس ہے۔ اس کے بعد ہماری آنکھ کھل گئی اور پھر ہم نہیں سوئے، کیونکہ لکھا ہے کہ جب ایک مبشر خواب دیکھو، تو اس کے بعد جہاں تک ہو سکے نہیں سونا چاہیے اور تلوار سے مُراد یہی حربہ ہے۔ جو کہ ہم اس وقت اپنے مخالفوں پر چلا رہے ہیں جو آسمانی حربہ ہے۔"

فلسفی اور نبی

فرمایا: "فلسفی اور نبی میں یہ فرق ہے کہ فلسفی کہتا ہے کہ خدا ہونا چاہیے۔ نبی کہتا ہے خدا ہے۔ فلسفی کہتا ہے کہ دلائل ایسے موجود ہیں کہ خدا کا وجود ضرور ہونا چاہیے۔ نبی کہتا ہے کہ میں نے خدا سے کلام کیا ہے اور مجھے اس نے بھیجا ہے اور میں اس کی طرف سے اس کو دیکھ کر آیا ہوں[۱]۔"

انبیاء کی کامیابی کا راز

نبی بخش بٹالوی کا ذکر آیا کہ اس نے مُصلح ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور ایک اخبار نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"بعض لوگ انبیاء اور مرسلین من اللہ کی کامیابیوں کو دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید ان لوگوں کی کامیابی بسبب ان کی لفاظیوں اور قوتِ بیانیوں اور فصاحتوں اور بلاغتوں کے ہے۔ آؤ ہم بھی ایسا ہی کریں اور اپنا سلسلہ جمائیں۔ مگر وہ لوگ غلطی کھاتے ہیں۔ انبیاء کی کامیابی بسبب اس تعلق کے ہوتی ہے جو اُن کا خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ آدمؑ سے لے کر آج تک کسی کو تقویٰ کے سوا فتح نہیں ہوئی۔

فتح کی کُنجی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فتح صرف اُسی کو ہو سکتی ہے جس کا بحرِ تقویٰ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ تقویٰ کا پودا قائم ہو جاتے، تو اس کے ساتھ زمین و آسمان اُلٹ سکتے ہیں۔" (ڈائری)

فرمایا: "مُسلمانوں پر افسوس ہے کہ اُنھوں نے یہ تو مان لیا کہ آخری زمانہ کے مُسلمان بھی یہود ہوں گے پر یہ نہ مانا کہ آخری زمانہ کا مسیح بھی انہیں میں سے ہوگا۔ گویا ان کے نزدیک اُمّتِ محمّدیہ میں صرف شر ہی رہ گیا ہے اور خیر کچھ بھی نہیں۔"

کسی نے ذکر کیا کہ نبی بخش بٹالوی کہتا ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب اپنے خُطبوں میں مرزا صاحب کے متعلق بڑا غلو کرتے ہیں اور اسی پر مرزا صاحب نے سمجھ لیا ہے کہ ہمارا درجہ بڑا ہے۔ فرمایا: "براہین احمدیہ کے زمانہ میں مولوی

---

[۱] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۳ صفحہ ۹ پرچہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء

عبدالکریم صاحب کہاں تھے اس میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور أَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ تَوْحِيْدِيْ وَتَفْرِيْدِيْ اور "تیرا مخالف جہنم میں گرے گا" وغیرہ ۔ مولوی عبدالکریم صاحب اس کے مقابل میں کیا کہہ سکتے ہیں، جو خدا نے کہا ہے "۔

فرمایا "انبیاءؑ کے کلام میں الفاظ کم ہوتے ہیں اور معانی بہت "۔

فرمایا "جس قدر دُعائیں ہماری قبول ہو چکی ہیں وُہ پانچہزار سے کسی صورت میں کم نہیں "۔

شیطان مسیح موعودؑ کے ہاتھوں ہلاک ہوگا

فرمایا "شیطان نے آدم کو مارنے کا منصوبہ کیا تھا اور اس کا استیصال چاہا تھا۔ پھر شیطان نے خدا سے مُہلت چاہی اور اس کو مُہلت دی گئی۔ إِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (الحجر: ۳۹) بسبب اس مُہلت کے کسی نبی نے اس کو قتل نہ کیا۔ اُس کے قتل کا وقت ایک ہی مقرر تھا کہ وہ مسیح موعود کے ہاتھ سے قتل ہو۔ اب تک وُہ ڈاکوؤں کی طرح پھرتا رہا ہے۔ لیکن اب اس کی ہلاکت کا وقت آگیا ہے۔ اب تک اخیار کی قلت اور اشرار کی کثرت تھی لیکن شیطان ہلاک ہوگا اور اخیار کی کثرت ہوگی اور اشرار چُوہڑے چماروں کی طرح ذلیل بطور نمونہ کے رہ جائیں گے "۔

اعمال کی دو قسمیں

فرمایا "اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بہشت و دوزخ کی امید و بیم سے ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو طبعی جوش سے ہوتے ہیں۔ دو باتیں مسلمانوں میں طبعی جوش کے طور پر اب تک موجود ہیں۔ ایک سُوّر کے گوشت کی حُرمت۔ خواہ مسلمان کیسا ہی فاسق ہو۔ سُوّر کے گوشت پر ضرور غیرت دکھائے گا اور دُوسرے حرمین شریف کی عزت۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کو جرأت نہیں ہو سکتی کہ حرمین پر ہاتھ ڈالنے کی دلیری کرے "۔

شیطان کا وجود

اس بات کا ذکر ہوا کہ نیچری لوگ شیطان کے ہونے کے منکر ہیں۔

حضرت نے فرمایا؛

" انسان کو اپنی حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ اَحَقُّ بِالْاَمْن وہی لوگ ہیں جو خدا کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی ماہیت و حقیقت کو حوالہ بخدا کرتے ہیں۔ اب دیکھو چار چیزیں غیر مرئی بیان ہوئی ہیں۔ خدا، ملائک،

ارواح، شیطان۔ یہ چاروں چیزیں لائیڈرک ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں سے خدا اور رُوح کو تو مان لیا جاتے اور ملائک اور شیطان کا انکار کیا جاتے؟ اس انکار کا نتیجہ تو رفتہ رفتہ حشرِ اجساد کا انکار اور الہام کا انکار اور خدا کا انکار ہو گا اور ہوتا ہے۔ بسا مرتبہ انسان نیکی کا ارادہ کرتا ہے مگر اسے جذبات کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں اور باوجود عقل اور سمجھ کے بے اختیار سا ہو کر فسق و فجور میں گرتا ہے۔ یہ کشاکش کیا ہے۔ خدا نے انسان کو اس مسافر خانہ میں بڑے بڑے قویٰ کے ساتھ بھیجا ہے۔ چاہیے کہ یہ اُن سب سے کام لے[1]۔"

۱۰ر ستمبر ۱۹۰۱ء

غیروں کے پیچھے نماز

سیّد عبداللہ صاحب عرب نے سوال کیا کہ میں اپنے مُلک عرب میں جاتا ہوں وہاں میں ان لوگوں کے پیچھے نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں۔

فرمایا: "مصدقین کے سوا کسی کے پیچھے نماز نہ پڑھو۔"

عرب صاحب نے عرض کیا وہ لوگ حضور کے حالات سے واقف نہیں ہیں اور ان کو تبلیغ نہیں ہوئی۔

فرمایا: "ان کو پہلے تبلیغ کر دینا پھر یا وہ مصدق ہو جائیں گے یا مکذب۔"

عرب صاحب نے عرض کیا کہ ہمارے مُلک کے لوگ بہت سخت ہیں اور ہماری قوم شیعہ ہے۔

فرمایا: "تم خدا کے بنو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس کا معاملہ صاف ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ اس کا متولی اور متکفل ہو جاتا ہے۔"

اب اسلام کا مذہب پھیلے گا

فرمایا: "آج کل تمام مذاہب کے لوگ جوش میں ہیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اب ساری دُنیا میں مذہب عیسوی پھیل جائے گا۔ برہمو کہتے ہیں کہ ساری دُنیا میں برہموؤں کا مذہب پھیل جائے گا اور آریہ کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب سب پر غالب آجائے گا۔ مگر یہ سب جھوٹ کہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان میں کسی کے ساتھ نہیں۔ اب دُنیا میں اسلام پھیلے گا اور باقی سب مذاہب اس کے آگے ذلیل اور حقیر ہو جائیں گے۔"

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۴ صفحہ ۱۱ پرچہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۰۱ء

دُعا فرمایا: ”جو بات ہماری سمجھ میں نہ آوے یا کوئی مشکل پیش آوے تو ہمارا طریق یہ ہے کہ ہم تمام فکر کو چھوڑ کر صرف دُعا میں اور تضرع میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ تب وہ بات حل ہو جاتی ہے۔“

قرآن شریف پر غور کی ضرورت فرمایا: ”افسوس ہے کہ لوگ جوش اور سرگرمی کے ساتھ قرآن شریف کی طرف توجہ نہیں کرتے جیسا کہ دُنیادار اپنی دنیاداری پر یا ایک شاعر اپنے اشعار پر غور کرتا ہے۔ ویسا بھی قرآن شریف پر غور نہیں کیا جاتا۔ بٹالہ میں ایک شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان ہے۔ اس نے ایک دفعہ ایک مصرعہ کہا۔

صبا شرمندہ مے گردد بروئے گُل نگہ کردن

مگر دُوسرے مصرعہ کی تلاش میں برابر چھ مہینے سرگردان و حیران پھرتا رہا۔ بالآخر ایک دن ایک بزاز کی دوکان پر کپڑا خریدنے گیا۔ بزاز نے کئی تھان کپڑوں کے نکالے، پر اس کو کوئی پسند نہ آیا۔ آخر بغیر کچھ خریدنے کے جب اُٹھ کھڑا ہوا، تو بزاز ناراض ہوا کہ تم نے اتنے تھان کھلوائے اور بے فائدہ تکلیف دی۔ اس پر اُس کو دُوسرا مصرعہ سُوجھ گیا۔ اور اپنا شعر اس طرح سے پُورا کیا۔

؎ صبا شرمندہ مے گردد بروئے گُل نگہ کردن که رختِ غنچہ را وَا کردو نتوانست تہ کردن

جس قدر محنت اس نے ایک مصرعہ کے لیے اٹھائی۔ اتنی محنت اب لوگ ایک آیتِ قرآنی کے سمجھنے کے لیے نہیں اُٹھاتے۔ قرآن جواہرات کی تھیلی ہے اور لوگ اس سے بے خبر ہیں۔[1]“

۱۲؍ستمبر ۱۹۰۱ء

مسیح موعودؑ کی سچائی پر زمانہ کی شہادت ”اسلام کی موجودہ حالت خود بتا رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کوئی سلسلہ ایسا قائم کرے جو اس کو ان مشکلات سے نجات دے۔ زیرک اور دانشمند انسان کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ جب زمین پر تیاری ہے تو آسمان پر کوئی تیاری نہ ہوگی؟ کیا مخالفوں نے اسلام کے نیست و نابود کرنے میں کوئی کمی چھوڑی ہے۔ پادریوں کی طرف دیکھو کہ انہوں نے کس قدر زور لگایا ہے۔ ان لوگوں کے ارادے ہیں اور ان کے نزدیک وہ امن جس کو یہ امن قرار دیتے ہیں اس

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ صفحہ ۶ پرچہ ۲۴؍ستمبر ۱۹۰۱ء

وقت قائم ہو سکتا ہے کہ اسلام کا استیصال ہو جاوے۔ جو شخص قرآن شریف کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا سچا نبی مانتا ہے۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے جو یہ وعدہ کیا تھا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) کیا وُہ اس وقت ان بے جا حملوں کے دفاع اور فرو کرنے کے لیے اس صدی کے سر پر اپنی سُنّتِ قدیمہ کے موافق کوئی آسمانی سلسلہ قائم نہ کرتا ؟؟؟ اور پھر قرآن شریف میں جبکہ یہ صاف فرمادیا ہے کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (الم نشرح: ۷) تو کیا ضروری نہ تھا کہ ان تنگیوں کی جن میں آج اسلام مبتلا ہے۔ انتہا ہوتی؟ اور یُسر کی حالت پیدا ہوتی؟ بے شک ضرور تھا؛ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

یہ ایسی باتیں ہیں کہ ان پر غور کرنے سے ضروری طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ اس مصیبت اور تنگی کے وقت ضرور آسمان پر ایک سامان ہو چکا ہے اور تیاری ہو رہی ہے۔ اور وہ وقت قریب ہے کہ اسلام اپنی اصلی حالت اور صُورت میں نمایاں ہو اور ملل باطلہ تباہ ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ کی سنّتِ قدیم میں سے یہ امر بھی ہے کہ وُہ ظاہر نہیں فرماتا جب تک اس کا وقت نہ آجائے۔ مگر اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ تخم ریزی ہو رہی ہے۔ اندرونی مصائب کو ہی دیکھو کہ وہ کیا رنگ لا رہے ہیں۔ مُسلمانوں میں وحدت نہیں رہی جو کامیابی کا اصل الاصُول ہے۔ خوارج، شیعہ الگ ہیں۔ حنبلی، شافعی، مالکی، حنفی الگ ہیں۔ صُوفیوں اور مشائخ میں الگ الگ تفرقہ شروع ہے۔ جیسا کہ چشتی۔ نقشبندی۔ سہروردی، قادری وغیرہ فرقوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ہر ایک اِن فرقہ والوں میں سے بجائے خود یہ خیال کرتا ہے اور کرتا ہوگا کہ اب اسی کا فرقہ کامیاب ہو جائے گا اور باقی سب کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ حنفی کہتے ہوں گے کہ سب حنفی ہی ہو جائیں گے۔ رافضیوں کے نزدیک ابھی رفض ہی کا زمانہ ہوگا۔ وجودی کہتے ہوں گے کہ سب وجودی ہی ہو جائیں گے۔ اصل میں یہ سب جھُوٹے ہیں۔ کیونکہ یہ باتیں خدا تعالیٰ سے استمزاج کرکے تو نہیں کی جاتیں، بلکہ اپنے ذاتی اور سطحی خیالات ہیں۔ کوئی شخص خدا تعالیٰ کے ارادہ تک نہیں پہنچا۔ خدا تعالیٰ کے ارادے وہی ہیں جو قرآن شریف سے ثابت ہیں۔ جو ظُلم اس وقت کتاب اللہ پر اندرونی یا بیرونی طور پر کیا گیا ہے۔ جو فرقہ اس ظلم کا انتقام لینے والا اور کتاب اللہ کے جلال اور عظمت کو ظاہر کرنے والا ہوگا، وہی خدا سے تائید پائے گا۔ اور اسی کی کامیابی خدا کے حضُور سے مقدّر ہے۔ جو اس ظلم کی اصلاح کرے گا خواہ اس فرقہ کا کوئی نام ہو اگر وہ فرقہ دین کے لیے غیرت رکھتا اور کتاب اللہ کی عزّت کے لیے اپنے ننگ و نام کو کھوتا ہے تو اس وقت ایک لذّت اور بصیرت کے ساتھ خود بخود روشن ہو جائے گا کہ یہی خدا تعالیٰ سے مدد یافتہ ہے۔ جو کچھ اس زمانہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی بابت کچھ نہ پوچھئے۔ بہت سے چور اور ڈاکو مل کر نقب زنی کر رہے ہیں۔ اور ایک خطرناک سازش اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ کے خلاف کی جا رہی ہے، مگر یہاں کچھ فکر ہی نہیں۔ اندرونی مفاسد نے مخالفوں کو موقعہ دے دیا ہے کہ وہ متاعِ اسلام کے لوٹ لینے میں دلیر ہو جائیں۔

میری رائے میں اندرونی مفاسد میں سے بہت کچھ حصّہ علماء کے باعث سے پیدا ہوا ہے اور کچھ حصّہ اُن لوگوں کی غلطیوں کا ہے جو اپنے آپ کو موحّد کہتے ہیں اور انھوں نے نری خشک لفاظیوں کا نام اسلام رکھ چھوڑا ہے اور ذرا بھی آگے نہیں بڑھتے۔ انھوں نے فیصلہ کر رکھا ہے جیسا عیسائیوں یا اور باطل پرستوں نے مان رکھا ہے کہ خدا کی طاقتیں پیچھے رہ گئی ہیں اور آگے نہیں ہیں گویا جو کچھ اُن کے ہاتھ میں ہے وُہ نرے قصّے اور کہانیاں ہی ہیں۔ جن میں حقیقت کی رُوح اور زندگی کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہو کہ انہوں نے اسلام کا یہ مغز اور خلاصہ دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے کہ صرف قصّوں کی پیروی کرو اور کچھ نہیں۔ جس قدر یہ ظلم اسلام پر کیا گیا ہے۔ اس کی نظیر اپنے رنگ میں بہت ہی کم ملے گی۔ کیونکہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب تھا اور ہے جو ہر زمانہ میں زندہ مذہب کہلا سکتا ہے، کیونکہ اس کے نشانات مُردہ مذاہب کی طرح پیچھے نہیں رہ گئے بلکہ اس کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں۔ مگر ان خشک موحّدوں نے اس کو بھی مُردہ مذاہب کے ساتھ ملانے کی کوشش کی جبکہ اُس کے انوار و برکات کو ایک وقتِ خاص تک محدُود کر دیا۔ ابتداء میں جب اس فرقہ نے سر نکالا تو بعض طبیعتِ رسا والے بھی اُن کے پاس آتے تھے، اگر یہ کسی کو خیال پیدا نہ ہوا کہ ان کا تھیلا تو پڑتال کر کے دیکھے کہ ان کے پاس ہے کیا؟ جب خوب غور اور فکر سے اُن کی تلاشی لی گئی تو آخر یہی نکلا کہ ان کے پاس بجز رفع یدین یا آمین بالجہر یا سینہ پر ہاتھ باندھنے کے اور ایسی ہی چند جزئی باتوں کے اور کچھ نہیں۔ اور وُہ اسی پر زور دیتے رہے۔ مثلاً امام کے پیچھے فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیے قطع نظر اس کے کہ اس کے معانی پر اطلاع ہو یا نہ ہو۔ محمد حسین قریباً بیس برس تک اپنے رسائل میں انہیں مسائل پر زور دیتا رہا، لیکن آخر ماحصل یہی نکلا کہ اس پُرگوئی میں کوئی رُوحانیت نہیں ہے اور آخر ان تیز زبانوں کی مُنہ زوری اَئمّہ اربعہ کی تحقیر و تذلیل تک منتہی ہوتی ہے۔

اَئمّہ اربعہ برکت کا نشان تھے

میری رائے میں اَئمّہ اربعہ برکت کا نشان تھے۔ ان میں رُوحانیت بھی، کیونکہ رُوحانیت تقویٰ سے شروع ہوتی ہے اور وہ لوگ درحقیقت متقی تھے اور خدا سے ڈرتے تھے اور اُن کے دِل کلابُ الدّنیا سے مناسبت نہ رکھتے تھے۔

یاد رکھو یہ تقویٰ بڑی چیز ہے۔ خوارق کا صدُور بھی تقویٰ ہی سے ہوتا ہے اور اگر خوارق نہ بھی ہوں پھر بھی تقویٰ سے عظمت ملتی ہے۔ تقویٰ ایک ایسی دولت ہے کہ اس کے حاصل ہونے سے انسان خدا تعالیٰ کی محبت میں فنا ہو کر نقشِ وجُود مٹا سکتا ہے۔ کمال تقویٰ کا یہی ہے کہ اُس کا اپنا وجود ہی نہ رہے اور صیقل زدم آں قدر کہ آئینہ نماند کا مصداق ہو جاتے۔ اصل میں یہی توحید اور یہی وحدتِ وجود تھی جس میں لوگوں نے غلطیاں کھا کر کچھ کا کچھ بنا لیا ہے۔ یہ کیا دین اور تقویٰ ہے کہ ایک ضعیف انسان اور بے چارہ بندہ ہو کر خدائی کا دعویٰ کرے۔ اس سے بڑھ کر کیا گستاخی اور شوخی ہو سکتی ہے کہ انسان خدا بنے اور خدا کے بھید اور اسرار کے جاننے کا مدّعی ٹھہرے۔

وجُودی فرقہ وجودیوں کی مثال ایسی ہے جیسے ڈاکٹر انسان کی تشریح کرتا ہے اور اس کے دل و گردہ وجگر کے بھید معلوم کرتا ہے۔ اسی طرح پر وجُودی نے خدا کا بھید معلوم کرنے کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ یہ نری غلطی اور گستاخی ہے۔ یہ لوگ اگر خدا تعالیٰ کی عظمت و جبرُوت سے ڈرنے والے ہوتے اور ان کے دل میں خدا کا خوف ہوتا تو ان کے لیے صرف آیت لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (انعام : ۱۰۴) ہی کافی تھی۔ اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ : ۱۲) ہی بس تھا۔ مگر جو شخص خدا کے وجُود میں آگے سے آگے ہی چلا جاوے تو حیا اس کا نام نہیں ہے۔

وجُودی مذہب والوں نے کیا بنایا؟* انھوں نے کیا معلوم کیا جو ہم کو معلوم نہ تھا؟ بنی نوع کو انھوں نے کیا فائدہ پہنچایا؟ ان ساری باتوں کا جواب نفی میں دینا پڑے گا۔ اگر کوئی ضد اور ہٹ سے کام نہ لے تو ذرا بتاتے تو سہی کہ خدا تو محبت اور اطاعت کی راہ بتاتا ہے، چنانچہ خود قرآن شریف میں اس نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اور فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ (البقرہ : ۲۰۱) کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ بیٹا باپ کی محبت میں فنا ہو کر خود باپ بن جائے۔ باپ کی محبت میں فنا تو ہو سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ باپ ہی ہو جاوے۔ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ فنا ِ نظری ایک ایسی شے ہے جو محبت سے ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن ایسی فنا جو درحقیقت بہانہ فنا کا ہو اور ایک جدید وجود کے پیدا کرنے کا باعث بنے کہ میں ہی ہوں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔

جن لوگوں میں تقویٰ اور ادب ہے اور جنھوں نے لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل : ۳۷) پر قدم مارا ہے وُہ سمجھ سکتے ہیں کہ وجُودی نے جو قدم مارا ہے وُہ حدِ ادب سے بڑھ کر ہے۔ بیسیوں کتابیں ان لوگوں نے لکھی ہیں، اگر ہم پُوچھتے ہیں کہ کیا کوئی وجُودی اس بات کا جواب دے سکتا ہے کہ واقعی وجُودی میں خدا ہے؟ یا تصوّر ہے؟ اگر خدا ہی ہے۔ تو کیا یہ ضُعف اور کمزوریاں جو آئے دن عاید حال رہتی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی

* **نوٹ**:۔ بناتے تو کیا خاک اُلٹے خرابی میں پڑ گئے۔ کیا اچھا ہوتا کہ اگر یہ وجُودی بجائے وحدتِ وجود کے کثرتِ وجود کا عقیدہ رکھتے اور خدا بننے کی کوشش نہ کرتے بلکہ مسیح بننے کی کوشش کرتے تاکہ یہ شرکِ عظیم جو دُنیا میں پھیل رہا ہے کچھ تو مٹتا اور ۴۰ کروڑ لوگوں میں سے جو رات دن رَبُّنَا الْمَسِيْحُ پکارتے ہیں کسی کی تو آنکھ کھُلتی کہ دُنیا میں کتنے مسیح ہو چکے ہیں اور ہوں گے اور قرآن کریم نے اس شرکِ اعظم کو توڑنے کے لیے مسیح ابن مریم بننے کا دروازہ کھول دیا ہے، چنانچہ سورۃ تحریم کی آخری آیات بوضاحتِ تمام کہہ رہی ہیں کہ پہلے زمانہ میں ایک ہی مسیح تھا مگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں سے سارے مومنین مسیح ابن مریم ہو سکتے ہیں۔

صفات ہیں ؟ ذرا بچہ یا بیوی بیمار ہو جاوے تو کچھ نہیں بنتا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جاوے۔ مگر خدا تعالیٰ چاہے تو شفا دے سکتا ہے، حالانکہ وجودی کے اختیار میں یہ امر نہیں ہے۔ بعض وقت مالی ضعف اور افلاس ستاتا ہے، بعض وقت گناہ اور فسق و فجور بے ذوقی اور بے شوقی کا موجب ہو جاتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے شامل حال بھی یہ امور ہوتے ہیں ؟ اگر خدا ہے تو پھر اس کے سارے کام کُنْ فَیَکُوْنُ سے ہونے چاہئیں ؛ حالانکہ یہ قدم قدم پر عاجز اور محتاج ٹھوکریں کھاتا ہے۔ افسوس وجودی کی حالت پر کہ خدا بھی بنا پھر اس سے کچھ نہ ہوا۔ پھر عجیب تر یہ ہے کہ یہ خدائی اس کو دوزخ سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ (الزلزال:۹) پس جب کوئی گناہ کیا تو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے جہنم میں جانا پڑا اور ساری خدائی باطل ہو گئی۔ وجودی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ (الشوریٰ: ۸) جبکہ وہاں بھی انسانیت کے مجسّم بنے رہے، تو پھر ایسی فضول بات کی حاجت ہی کیا ہے جس کا کوئی نتیجہ اور اثر ظاہر نہ ہوا۔ غرض یہ لوگ بڑے بیباک اور دلیر ہوتے ہیں اور چونکہ اس فرقہ کا نتیجہ اباحت اور بے قیدی ہے۔ اس لیے یہ فرقہ بڑھتا جاتا ہے۔ لاہور، جالندھر، ہوشیارپور اضلاع میں اس فرقہ نے اپنا زہر بہت پھیلایا ہے۔ غور کر کے اس کے نتائج پر نظر کرو، بجز اباحت کے اور کچھ معلوم نہیں دیتا۔ یہ لوگ صوم و صلوٰۃ کے پابند نہیں اور ہو بھی نہیں سکتے، کیونکہ خدا سے ڈرنا جس پر نجات کا مدار اور اعمال کا انحصار ہے وہ ان میں نہیں ہے۔ بعض بالکل دہریوں کے رنگ میں ہیں۔

غرض میں سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ فتنہ بھی منجملہ ان فتنوں کے جو اس وقت پھیلے ہوئے ہیں ایک سخت فتنہ ہے۔ جس نے فسق و فجور کا دریا چلا دیا ہے اور اباحت اور دہریت کے دروازوں کو کھول دیا ہے۔ اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس وقت زندہ ہوتے، تو وہ ان کو دیکھ کر حیران ہوتے کہ یہ اسلام کہاں سے آیا۔ انسان کو کسی حالت میں مناسب نہیں ہے کہ وہ انسانیت کی حدود کو توڑ کر آگے نکل جاوے۔ کیا سچ کہا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ولیکن میفزائے بر مصطفٰے

غرض یہ فرقہ دِق کی طرح ہے۔ ایک شخص الٰہ آباد میں تھا۔ اس نے مجھ سے خط و کتابت کی۔ ایک دو مرتبہ کے خطوط کی آمد و رفت کے بعد وہ گالیوں اور بدزبانیوں پر اُتر آیا۔ ان لوگوں میں تزکیۂ نفس تو بڑی بات ہے عام اخلاقی حالت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ اخلاقِ فاضلہ اور تزکیۂ نفس کا مدار ہے تقویٰ اور خدا کا خوف جو بدقسمتی سے ان لوگوں میں نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو خدا بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس جب وہ انسانیت چھوڑ کر خدا بن گئے اور یہ ایک ثابت شدہ بات ہے کہ وہ خدا تو بن سکتے ہی نہیں۔ پھر باقی یہ رہا کہ انسانیت چھوڑ کر شیطان بن گئے۔ اس لیے وہ بہت جلد برافروختہ ہو جاتے ہیں اور جہاں تک ان لوگوں کے حالات کی تحقیقات کرو گے ان میں اسلام کی پابندی نہیں ہوتی، اس لیے کہ خشیتِ الٰہی نہیں ہوتی اور ہیبت اُٹھ جاتی

ہے۔ آخر کار دہریوں کے ساتھ نشست و برخاست شروع کرتے ہیں۔ اور حدُود اللہ کو توڑ کر بے قید ہو جاتے ہیں۔
غرض یہ بڑا ہی خطرناک زہر ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت بایزید بسطامی یا خواجہ جنید بغدادی یا سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے کلمات میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن سے جاہل یا تو اُن کو کفر کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یا ان کے اقوال کو فرقہ مناالہ وحدۃ وجُود کے لیے حجّت پکڑتا ہے جیسے سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ اور اَللّٰہُ فِیْ جُبَّتِیْ۔
یہ اُن کی غلط فہمی ہے جو وہ ان کے اقوال سے حجّت پکڑتے ہیں۔ اوّل تو یہ صحیح طور پر معلوم نہیں کہ ان کے مُنہ سے ایسے الفاظ نکلے بھی ہیں یا نہیں لیکن اگر ہم مان بھی لیں کہ واقعی اُنھوں نے ایسے الفاظ بیان فرمائے ہیں تو ایسے کلمات کا چشمہ عشق اور محبّت ہے۔ مثلاً ایک عاشق جوشِ محبّت اور محویّتِ عشق میں کہہ سکتا ہے۔ ؎

من تو شدُم تو من شُدی من تن شدُم تو جان شُدی ۔۔۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہ محویّت اور فنا اس قسم کی اور رنگ کی ہے جیسے ماں کو اپنے بچّہ کے ساتھ محبّت کے رنگ میں ہوتی ہے۔ یہانتک کہ اگر تھوڑی دیر بچّہ ماں کو نہ ملے تو اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے اور ایک اضطراب اور گھبراہٹ محسُوس کرتی ہے اور جُوں جُوں اس میں توقف اور دیر ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر اُس کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے اور اسے بیہوش کر دیتا ہے۔ اب یہ اُس کی فنا اُس کے وجود سے بڑھ کر ہے۔ مگر وجُودی نے فنا میں ایک وجُود قائم کیا ہے۔ غرض ان بزرگوں کے مُنہ سے جو الفاظ اس قسم کے نکلے ہیں جن کو وجُودیوں نے اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ وُہ اسی قسم کی محویّت اور عشق و محبّت کے غلبۂ تامّہ کا نتیجہ ہیں، جس کو ان لوگوں نے اپنی کم فہمی کے باعث کچھ کا کچھ بنالیا ہے۔ اُن کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جب عشق و محبّت جوش مارتے ہیں، تو اس کے عجیب عجیب اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہانتک کہ یہ اپنے آپ سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ استیلاءِ محبّت میں اپنا وجود دکھائی دیتا ہی نہیں اور یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مَیں کچھ بھی نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک لوہے کے ٹکڑے کو آگ میں ڈال دیا جاوے۔ یہانتک کہ وہ سرخ انگارے کی طرح ہو جاتے۔ اس حالت میں ایک دیکھنے والا لوہے کا ٹکڑا قرار نہیں دے گا، بلکہ وُہ اُس کو آگ ہی کا ایک انگارہ سمجھے گا اور وُہ بظاہر ہوتا بھی آگ ہی ہے۔ اس سے جلا بھی سکتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ لوہا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح پر آتشِ محبّت اپنے عجائبات دکھاتی ہے۔ نادان ان عجائبات کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان پر غور کرے اور ان سے کوئی مفید نتیجہ حاصل کرے۔ ایک خیالی اثر دل پر قائم کر لیتا ہے اور اسی لیے یہ مشکلات ہیں کہ ہر شخص جس مذہب میں اپنی عمر کا ایک حصّہ گذارتا ہے وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ بڑی بھاری غلطی ہے جہاں اور غلطیوں اور کمزوریوں کا مواخذہ ہوگا، وہاں اس کا بھی مواخذہ ضرور ہوگا، کیونکہ خدا تعالیٰ نے صاف طور پر فرما دیا ہے۔ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل: ۳۷) پھر مُنْعَم خدا والا کیونکر کہہ سکتا ہے کہ

مجھے واقعی یقین آگیا ہے۔ وہ اپنے اندر کون سے خواصِ ربّانی اور صفاتِ ربّانی محسوس کرتا ہے جو یہ فضول دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ جب قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا اور حوائجِ انسانی کی زنجیروں میں پابند اور جکڑا ہوا ہے۔ پھر اُسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مَنم خدا کہے اور یہ کہے کہ ہاں مجھے اپنے خدا ہونے پر یقین ہو گیا ہے۔ اگر وُہ ایسا کہے تو دُوسرا اُس کو دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ تو کیوں فضول اتنی شیخی مارتا ہے۔ اپنی عاجزی اور فرو مائگی کو دیکھو۔ قرآن شریف میں خالق اور مخلوق میں صریح امتیاز رکھا ہوا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے قرآن شریف کو شروع کیا گیا ہے اور پھر مرنے کے بعد بھی ایک مرحلہ رکھا ہوا ہے۔ انسان جب خود اپنے حالات اور صفات کو ہی جان نہیں سکتا اور سمجھ نہیں سکتا۔ پھر یہ خدا کیسے بن سکتا ہے۔ اس کے علم کا محدُود اور ناقص ہونا ہی اس کے مخلوق اور بندہ ہونے کی دلیل ہے۔ اگر یہ غور کرے۔

مسئلہ وحدتِ وجود

غرض یہ بڑا گند ہے۔ اور لوگ جو اس مسئلہ وحدتِ وجود کو مانتے ہیں بڑے گستاخ اور متکبّر ہوتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کو نہیں چھوڑتے اور غلطیوں کو چھوڑیں کیونکر۔ جبکہ وہ اپنے آپ کو معاذ اللہ خدا سمجھتے ہیں۔ اگر خدا اور بندہ میں فرق کریں تو ان کو اپنی غلطیوں کی حقیقت پر اطلاع ملے۔ وُہ اپنے طفلانہ خیالات پر خوش ہیں، اس لیے قرآن شریف کے حقائق سے ان کو کوئی خبر نہیں ہو سکتی۔ یہ بہت بڑی خرابی ہے اور مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ خرابی کب سے پیدا ہوئی ہے۔

میرے نزدیک سارے گدّی نشینوں میں کوئی کم ہو گا جس کا یہ مذہب نہ ہو اور انہوں نے بزرگانِ دین کے اُن اقوال کو جو اُنھوں نے استیلائے محبّت اور جوشِ عشق میں فرمائے تھے۔ فلسفہ بنا دیا۔ اصل میں فنائے نظری اور وجُودی مذہب میں یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر فلسفہ نہیں رکھتا، وہ استیلائے عشق رکھتا ہے اور دُوسرا فیلسوف بنتا ہے۔ یہ خدا کا دشمن اور مُنکر ہے اور اس کو خدا سے محبّت نہیں کیونکہ جیسے فلسفی مُردہ کو تو چیر سکتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وُہ مُردہ کو کھا بھی لے۔ اسی طرح پر وحدتِ وجود کا قائل خدا تو بنتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو خدا سے محبّت بھی ہے۔ جس کسی نے کتّے یا بندر کی تشریح دیکھ لی ہے، اس کے لیے کب لازم آتا ہے کہ اس سے تعلق بھی ہو۔ یہ ایسے ہی مدّعی ہیں۔ فیلسوف بنے ہوئے ہیں۔ مگر انھوں نے ثابت نہیں کیا کہ خدا سے اُن کا کوئی تعلق بھی ہے۔ اکابر کا وُہ طبقہ جنھوں نے آگے قدم بڑھایا ہے وُہ مقبُول بھی ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ اُن پر خدا تعالیٰ کی محبّت اور عشق غالب آگیا تھا۔ وہ قرآن شریف پر ایمان لائے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت کے دریا میں تیرتے تھے۔ اسلام ان کا مذہب تھا۔ اس لیے اُن سے خدا تعالیٰ کے فضل سے وہ کرشمے اور عجائبات ظاہر ہوئے..... حقیقت یہی ہے کہ جب بندہ اپنے خالق کے ساتھ محبّت و عشق میں ایک شدید تعلق پیدا کر لیتا ہے اس وقت اسے خدا تعالیٰ اپنی صفات سے ایک حظّ عطا کرتا ہے۔ کیونکہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

غرض یہ غلطیاں تو ان لوگوں کی ہیں جو خدا بنے ہیں اور انھوں نے اسلام کو سخت گزند پہنچایا ہے۔ مخالفوں نے اُن کے اقوال کو لے کر اسلام پر اعتراض کیے ہیں۔

ایک اور فتنہ

پھر دُوسرا فتنہ اُن لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں۔ انھوں نے الفاظ پرستی کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا۔ لاہور میں ایک شخص سے بحث ہوئی۔ عبدالحکیم٭ اس کا نام تھا۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ حضرت عُمرؓ بھی محدث نہ تھے اور حدیث کے معنی یہ کیے کہ اگر محدث ہوتا تو عُمرؓ ہوتا۔ یہ ترجمہ کرکے اس نے خدا پر الزام لگایا کہ اس نے اس اُمت کے گویا آنسو پُونچھ دیئے اور کچھ نہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ ان کو اتنی سمجھ نہیں کہ کیا اسی کرتُوت پر وہ اس اُمت کو خیر الامم قرار دیتے ہیں جس میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک شخص بھی ایسا نہ ہوا جس کو خدا تعالیٰ سے کلام کرنے کا شرف ملا ہو اور جو اسلام کی صداقت کے لیے ایک زندہ نمونہ ٹھہرتا۔ ان لوگوں نے عملی طور پر گویا مان لیا ہے کہ اب نہ کسی کا خدا سے تعلق ہے نہ مکالمۃ اللہ کا شرف کسی کو حاصل ہے، دُعاؤں کی قبولیت کا کوئی نشان موجود نہیں ہے۔ پھر بنی اسرائیل کی تو عورتوں تک کو بھی خُدا سے ہمکلام ہونے کا شرف ملتا تھا۔ کیا اسلام میں کوئی مرد بنی اسرائیل کی عورتوں جیسا بھی نہیں ہے؟

اے اسلام کے نادان دوستو! ذرا غور تو کرو کہ اس سے اسلام پر کیسا حرف آتا ہے۔ کہ خدا نے اسی واسطے اسلام کو تمہارے لیے پسند کیا تھا اور اسی وجہ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دیا تھا کہ آئندہ قیامت تک کوئی نشان ان کی صداقت پر قائم نہ ہوتا اور زندگی کے نشان مٹائے جاتے؟ مجھے بہت ہی افسوس ہوتا ہے کہ جب ان لوگوں کے عقائد پر نظر کرتا ہوں۔ ان میں بجز الفاظ کے اور کچھ نظر نہیں آتا اور جو کچھ انہوں نے مان رکھا ہے اس سے مخالفوں کو بڑے بڑے اعتراض کرنے کا موقعہ ملا ہے؛ چنانچہ مسیح کے متعلق ہی جو کچھ ان کے عقائد ہیں وہ پوشیدہ نہیں۔ یہ لوگ مانتے ہیں کہ مسیح مُردے زندہ کرتا تھا اور چڑیاں بھی بنایا کرتا تھا اور آج تک وہ آسمان پر بغیر کسی قسم کے زمانہ کے اثر ہونے کے بیٹھا ہوا ہے تو بتاؤ کہ اس کے خدا بنانے میں انہوں نے کیا باقی

٭ **نوٹ**: جب اس مولوی عبدالحکیم سے فروری ۱۸۹۲ء میں بمقام لاہور حضرت اقدس امام علیہ السلام کی بحث ہوئی تھی۔ تو بفضلہ تعالیٰ خاکسار ایڈیٹر الحکم بھی اس بحث کے موقعہ پر شامل تھا۔ یہ شخص آخر مباحثہ کے پرچے لیکر چل دیا اور پھر بے حیائی سے ۱۹۰۰ء میں بمقام قادیان آیا۔ ہر چند اس کو سمجھایا مگر وہ راہ پر نہ آیا اور بیہودہ بکواس کرنے لگا۔ جب اس کو لاہور والا مباحثہ یاد دلایا اور ان کاغذات کو لے کر بھاگ جانیکا الزام اس کو دیا گیا تو پھر وعدہ کیا کہ میں اب وہ کاغذ طبع ہونیکے واسطے بھیج دوں گا۔ ایک مہینہ کے اندر اندر ایڈیٹر الحکم کے پاس کاغذ مباحثہ پہنچ جائیں گے۔ اگر نہ بھیجوں تو مجھے کاذب سمجھا جاوے۔ مگر اب ایک مہینہ چھوڑ ایک سال ختم ہونے کو آیا۔ آجتک اس نے وہ کاغذ نہ بھیجے۔ کاش اگر وہ کمبخت وہ پرچے بھیج دیتا تو حضرت اقدسؑ کی تقریروں کو شائع کر سکتے۔ بہرحال یہ اس عبدالحکیم کا ذکر ہے (ایڈیٹر)

دکھا۔ مَیں نے ایک موحد سے پوچھا کہ تم جو کہتے ہو کہ مسیح نے بھی کچھ جانور بنائے تھے اور وہ خدا کے بنائے ہوئے پرندوں میں مِل جل گئے۔ اب ہمیں کیونکر معلوم ہو کہ یہ جانور مسیح کا بنایا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ غرض اِس قسم کے ان لوگوں کے عقائد ہیں۔ ہاں چالاکی سے ائمہ اربعہ کو بُرا کہہ لیتے ہیں۔ مثلاً ایک امام کی بابت وُہ الزام لگاتے ہیں کہ وُہ بڑے مالدار تھے اور زکوٰۃ نہیں دیتے تھے۔ آخر سال پر سارا مال بیوی کو دے دیتے تھے اور پھر اپنی طرف منتقل کر لیتے تھے اس طرح پر گویا اس کو زکوٰۃ کے اثر سے بچا لیتے تھے۔ اس قسم کے بہت سے افترا کرتے ہیں۔ انھوں نے بجز لفاظی کے اور کوئی فائدہ اسلام کو نہیں پہنچایا۔ اپنے طریقِ عمل سے اسلام کو مُردہ مذہب ثابت کرنا چاہا ہے۔ جبکہ یہ کہہ دیا کہ اب کوئی ایسا مرد نہیں ہے جس کے ساتھ زندہ نشانات اسلام کی تائید میں ہوں۔ افسوس! ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہوا۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے ؟ کیا قرآن میں جو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (فاتحہ: ۶-۷) تھا۔ یہ یُونہی ایک بے معنی اور بے مطلب بات تھی اور نرا ایک قصہ ہی قصہ ہے ؟ کیا وہ انعام کچھ نہ تھا۔ خدا نے نرا دھوکہ ہی دیا ہے ؟ اور وہ اپنے سچے طالبوں اور صادقوں کو بدنصیب ہی رکھنا چاہتا ہے ؟ کس قدر ظلم ہے اگر یہ خدا کی نسبت قرار دیا جائے کہ وُہ نِری لفاظی سے ہی کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی خیالی باتیں ہیں۔ قرآن شریف درحقیقت انسان کو ان مراتب اور اعلیٰ مدارج پر پہنچانا چاہتا ہے جو اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے مصداق لوگوں کو دیئے گئے تھے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جب کہ خدا تعالیٰ کے کلام کے زندہ ثبوت موجود نہ ہوں۔ ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں کہ آریوں کی طرح خدا کا پریمی اور بھگت کتنی ہی دعائیں کرے اور رو رو کر اپنی جان کھوئے اور اس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ اسلام خشک مذہب نہیں ہے۔ اسلام ہمیشہ ایک زندہ مذہب ہے اور اس کے نشانات اس کے ساتھ ہیں۔ پیچھے رہے ہوئے نہیں۔

غرض یہ بھی ایک بدنصیب گروہ ہے۔ یہ لوگ اپنا اصل مذہب نہیں بتاتے ہیں۔ ان کی خبر مشکل سے ہوتی ہے۔

احناف

رہے حنفی، ان میں بدقسمتی سے اقوالِ مُردہ اور بدعات نے دخل پا لیا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تو اعلیٰ درجہ کے متقی تھے، مگر اُن کے پیرووں میں جب رُوحانیت نہ رہی تو انھوں نے اور بدعتوں کو داخل کر لیا اور تقلید میں انھوں نے یہاں تک غلو کیا کہ ان لوگوں کے اقوال کو جن کی عصمت کا قرآن دعویٰ نہیں کرتا، رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر بھی فضیلت دے دی اور اپنے اغراض و مقاصد کو مدِّنظر رکھ کر امام صاحبؒ کے اقوال کی جس طرح چاہا تاویل کر لی۔ لُدھیانہ میں مَیں ایک دفعہ تھا تو نوابوں کے خاندان میں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور باتوں ہی باتوں میں انہوں نے کہا کہ مَیں پکا حنفی ہوں اور یہ بھی کہا کہ میرے چچا صاحب کو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی حُسنِ عقیدت تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے مَالَا بُدَّ مِنْهُ میں

امام صاحبؒ کا یہ قول دیکھا کہ صرف جَو اور انگور اور دو اور یعنی چار قسم کی شراب حرام ہے، تو اُنھوں نے ولایت کی شرابیں منگوا کر اسّی ہزار روپیہ کی شراب پی تاکہ امام صاحبؒ کی سچی پیروی ہو جاوے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ ثُمَّ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ۔

غرض اس قسم کی تاویلیں کر لیتے ہیں۔ عام طور پر شکایت کی جاتی ہے کہ جس قسم کا فتویٰ کوئی چاہے ان سے لے لے۔ حلالہ کا مسئلہ بھی انھوں نے ہی نکالا ہے۔ اگر کوئی عورت کو طلاق دے دے تو پھر جائز طور پر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وُہ کسی دُوسرے سے نکاح کرے اور وُہ پھر اس کو طلاق دے؛ حالانکہ قرآن شریف میں کہیں اس کا پتہ نہیں ملتا اور احادیث میں حلالہ کرنے والے پر لعنت آئی ہے۔

شافعی

پھر ایک اور فرقہ شافعی مذہب والوں کا ہے۔ وُہ تو وحشیوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک مقولہ ہے۔ "شافعی سب کچھ معافی"۔ یعنی نہ حِلّت و حُرمت کی ضرورت ہے نہ کچھ اور۔

چنانچہ ہمارے مُلک میں خانہ بدوش لوگ جو پھرا کرتے ہیں یہ اپنے آپ کو شافعی کہتے ہیں۔ ان کے اطوار اور چال چلن کو دیکھو۔ اَمرتسر میں ایک مُوحد زندی کی مسجد میں نماز پڑھایا کرتا تھا۔ اس نے میرے پاس ذکر کیا کہ وہ ایک مرتبہ بمبئی چلا گیا اور اتفاق سے شافعیوں کی مسجد میں چلا گیا۔ صُبح کی نماز کا وقت تھا۔ اس سے جب دریافت کیا تو اس نے کہہ دیا کہ مَیں شافعی ہوں اور جب اُنھوں نے اس کو نماز کے لیے امام بنایا اور اس نے شافعی مذہب کے موافق صبح کی نماز میں قنوت نہ پڑھی تو وہ لوگ بڑے ہی برافروختہ ہوئے۔ آخر بمشکل وہاں سے بچ کر نکلا۔ الغرض مذہبِ اسلام میں اندرُونی طور پر ایسے ایسے بہت سے فساد اور فِتنے ہیں جن کی اصلاح کی ضرورت ہے اور بیرونی فسادوں کو آدمی دیکھے تو اور بھی حیران ہو جاتا ہے۔ ایک پادریوں کے ہی فتنہ کو دیکھو تو گھبرا جاوے۔ مختصر یہ کہ ان سارے فسادوں کا اجتماع بالبداہت بتا رہا ہے کہ اس وقت آسمانی سلسلہ کی ضرورت ہے اور اگر خدا اس وقت کوئی سلسلہ قائم نہ کرتا تو پھر خدا پر اعتراض ہوتا، مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے وقت پر ہماری دستگیری کی اور اس سلسلہ کو اپنی تائیدوں کے ساتھ قائم کیا۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک"۔ [1]

---

۱۳ ستمبر ۱۹۰۱ء

تبتّل کی حقیقت

۱۳ ستمبر ۱۹۰۱ء کو مغرب کی نماز کے بعد حضرت اقدس حجۃ اللّٰہ علی الارض مسیح موعود ادام فیوضہم نے سیّد امیر علی شاہ صاحب ملہم سیالکوٹی کے استفسار

---

[1] الحکم جلد نمبر ۵ نمبر ۳۵ صفحہ ۱ تا ۳ پرچہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء
" " ۵ " ۳۶ " ۱ تا ۳ " ۳۰ ستمبر ۱۹۰۱ء

پر بیان فرمائی۔ ان کو اپنی کسی رویا میں ارشاد ہوا تھا کہ وہ تبتّل کے معنی حضرت اقدسؑ سے دریافت کریں۔ اس پر انہوں نے سوال کیا اور حضرت اقدسؑ نے اس کی تشریح فرمائی۔ (ایڈیٹر)

"میرے نزدیک رویا میں یہ بتانا کہ تبتّل کے معنی مجھ سے دریافت کئے جاویں۔ اس سے یہ مُراد ہے کہ جو میرا مذہب اس بارہ میں ہے، وہ اختیار کیا جاوے۔ منطقیوں یا نحویوں کی طرح معنے کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ حال کے موافق معنے کرنے چاہئیں۔ ہمارے نزدیک اُس وقت کسی کو مُتبتّل کہیں گے۔ جب وُہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام اور رضا کو دُنیا اور اس کی متعلقات و مکرُوہات پر مقدّم کرے۔ کوئی رسم و عادت، کوئی قومی اصُول اس کا رہزن نہ ہو سکے، نہ نفس رہزن ہو سکے، نہ بھائی نہ جورو، نہ بیٹا نہ باپ۔ غرض کوئی شئے اور کوئی متنفس اس کو خدا تعالیٰ کے احکام اور رضا کے مقابلہ میں اپنے اثر کے نیچے نہ لا سکے اور وہ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصُول میں ایسا اپنے آپ کو کھو دے کہ اس پر فنائے اَتم طاری ہو جائے اور اس کی ساری خواہشوں اور ارادوں پر ایک موت وارد ہو کر خدا ہی خدا رہ جاوے۔ دُنیا کے تعلّقات بسا اوقات خطرناک رہزن ہو جاتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السّلام کی رہزن حضرت حوّا ہوگئی۔ پس تبتّل تام کی صُورت میں یہ ضروری امر ہے کہ ایک سُکر اور فنا انسان پر وارد ہو، مگر نہ ایسی کہ وہ اسے خدا سے گم کرے بلکہ خدا میں گُم کرے۔

غرض عملی طور پر تبتّل کی حقیقت تب ہی کھُلتی ہے جبکہ ساری روکیں دُور ہو جائیں اور ہر ایک قسم کے حجاب دُور ہو کر محبّتِ ذاتی تک انسان کا رابطہ پہنچ جاوے اور فناءِ اَتم ایسی حاصل ہو جاوے۔ قیل و قال کے طور پر تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور انسان الفاظ اور بیان میں بہت کچھ ظاہر کر سکتا ہے، مگر مشکل ہے تو یہ کہ عملی طور پر اسے دکھا بھی دے جو کچھ وہ کہتا ہے۔ یُوں تو ہر ایک خدا کو ماننے والا ہے۔ پسند بھی کرتا ہے اور کہہ بھی دیتا ہے کہ مَیں چاہتا ہوں کہ خدا کو سب پر مقدّم رکھوں اور مقدّم کرنے کا مدّعی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ان آثار اور علامات کا معائنہ کرنا چاہیں جو خدا کے مقدّم کرنے کے ساتھ ہی عطا ہوتے ہیں تو ایک مشکل کا سامنا ہوگا۔ بات بات پر انسان ٹھوکر کھاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں جب اس مال اور جان دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اُن سے اُن کی جانوں اور مالوں یا اور عزیز ترین اشیاء کی قربانی چاہتا ہے؛ حالانکہ وہ اشیاء اُن کی اپنی بھی نہیں ہوتی لیکن پھر بھی وہ مضائقہ کرتے ہیں۔ ابتداءً بعض صحابہ کو اس قسم کا ابتلا پیش آیا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بناءِ مسجد کے واسطے زمین کی ضرورت تھی۔ ایک شخص سے زمین مانگی تو اس نے کئی عُذر کر کے بتا دیا کہ میں زمین نہیں دے سکتا۔ اب وُہ شخص رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لایا تھا اور اللہ اور اس کے رسُول کو سب پر مقدّم کرنے کا عہد اس نے کیا تھا، لیکن جب آزمائش اور امتحان کا وقت آیا تو اس کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ گو آخر کار اس نے وہ قطعہ دے دیا۔ تو بات اصل میں یہی ہے کہ کوئی امر محض بات سے نہیں ہو سکتا۔ جب تک عمل اس کے ساتھ نہ ہو۔

اور عملی طور پر صحیح ثابت نہیں ہوتا جبتک امتحان ساتھ نہ ہو۔

ہمارے ہاتھ پر بیعت تو یہی کی جاتی ہے کہ دین کو دنیا پر مقدم کروں گا اور ایک شخص کو جسے خدا نے اپنا مامور کر کے دُنیا میں بھیجا ہے اور جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے جس کا نام حکم اور عدل رکھا گیا ہے، اپنا امام سمجھوں گا۔ اس کے فیصلے پر انشراحِ قلب کے ساتھ رضامند ہو جاؤں گا، لیکن اگر کوئی شخص یہ عہد اور اقرار کرنے کے بعد ہمارے کسی فیصلہ پر خوشی کے ساتھ رضامند نہیں ہوتا بلکہ اپنے سینہ میں کوئی روک اور اٹک پاتا ہے تو یقیناً کہنا پڑے گا کہ اس نے تبتّل حاصل نہیں کیا اور وُہ اس اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچا جو تبتّل کا مقام کہلاتا ہے، بلکہ اس کی راہ میں ہوائے نفس اور دنیوی تعلقات کی روکیں اور زنجیریں باقی ہیں اور ان حجابوں سے وہ باہر نہیں نکلا جن کو پھاڑ کر انسان اس درجہ کو حاصل کرتا ہے۔ جبتک وُہ دنیا کے درخت سے کاٹا جا کر اُلوہیت کی شاخ کے ساتھ ایک پیوند حاصل نہیں کرتا۔ اس کی سرسبزی اور شادابی محال ہے۔ دیکھو جب ایک درخت کی شاخ اس سے کاٹ دی جاوے تو وہ پھل پھول نہیں دے سکتی خواہ اسے پانی کے اندر ہی کیوں نہ رکھو اور ان تمام اسباب کو جو پہلی صُورت میں اُس کے لیے مایۂ حیات تھے، استعمال کرو، لیکن وہ کبھی بھی بارآور نہ ہوگی۔ اسی طرح پر جب تک ایک صادق کے ساتھ انسان کا پیوند قائم نہیں ہوتا وُہ رُوحانیت کو جذب کرنے کی قوت نہیں پا سکتا، جیسے وہ شاخ تنہا اور الگ ہو کر پانی سے سرسبز نہیں ہوتی۔ اسی طرح پر یہ بے تعلق اور الگ ہو کر بارآور نہیں ہو سکتا۔ پس انسان کو متبتّل ہونے کے لیے ایک قطع کی ضرورت بھی ہے۔ اور ایک پیوند کی بھی۔

خدا کے ساتھ اُسے پیوند کرنا اور دُنیا اور اس کے تمام تعلقات اور جذبات سے الگ بھی ہونا پڑے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بالکل دُنیا سے الگ رہ کر یہ تعلق اور پیوند حاصل کرے گا۔ نہیں بلکہ دُنیا میں رہ کر پھر اس سے الگ رہے۔ یہی تو مردانگی اور شجاعت ہے اور الگ ہونے سے مراد یہ کہ دُنیا کی تحریکیں اور جذبات اس کو اپنا زیرِ اثر نہ کر لیں اور وُہ ان کو مقدم نہ کرے، بلکہ خدا کو مقدم کرے۔ دُنیا کی کوئی اور روک اس کی راہ میں نہ آئے اور اپنی طرف اس کو جذب نہ کر سکے۔ مَیں نے ابھی کہا ہے کہ دنیا میں بہت سی روکیں انسان کے لیے ہیں۔ ایک جورو یا بیوی بھی بہت کچھ رہزن ہو سکتی ہے۔ خدا نے اس کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ خدا نے صرف ایک نہی کی تعلیم دی تھی اس کا اثر پہلے عورت پر ہوا پھر آدمؑ پر ہوا۔

غرض تبتّل کیا ہے؟ خدا کی طرف انقطاع کر کے دُوسروں کو محض مُردہ سمجھ لینا۔ بہت سے لوگ ہیں جو ہماری باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ بجا اور دُرست ہے، مگر جب اُن سے کہا جاوے کہ پھر تم اس کو قبول کیوں نہیں کرتے۔ تو وُہ یہی کہیں گے۔ کہ لوگ ہم کو بُرا کہتے ہیں۔ پس یہ خیال کہ لوگ اُن کو بُرا کہتے ہیں یہی ایک رگ ہے جو خدا سے قطع کراتی ہے، کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کا خوف دل میں ہو اور اس کی عظمت اور جبروت کی حکومت

کے ماتحت انسان ہو۔ پھر اس کو کسی دوسرے کی پرواہ کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کیا کہتا ہے کیا نہیں؟ ابھی اس کے دل میں لوگوں کی حکومت ہے نہ خدا کی۔ جب یہ مشرکانہ خیال دل سے دُور ہو جاوے پھر سب کے سب مُردے اور کیڑے سے بھی کمتر اور کمزور نظر آتے ہیں۔ اگر ساری دُنیا ل کر بھی مقابلہ کرنا چاہے تو ممکن نہیں کہ ایسا شخص حق کو قبول کرنے سے رُک جائے۔

تبتّل تام کا پورا نمونہ انبیاء علیہم السلام اور خدا کے ماموروں میں مشاہدہ کرنا چاہیے کہ وہ کس طرح دُنیاداروں کی مخالفتوں کی باوجود پوری بے کسی اور ناتوانی کے پرواہ تک نہیں کرتے۔ اُن کی رفتار اور حالات سے سبق لینا چاہیے۔

بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ ایسے لوگ جو بُرا نہیں کہتے، مگر پورے طور پر اظہار بھی نہیں کرتے محض اس وجہ سے کہ لوگ بُرا کہیں گے کیا اُنکے پیچھے نماز پڑھ لیں؟ مَیں کہتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ ابھی تک اُن کے قبولِ حق کی راہ میں ایک ٹھوکر کا پتھر ہے اور وُہ ابھی تک اسی درخت کی شاخ ہیں جس کا پھل زہریلا اور ہلاک کرنے والا ہے۔ اگر وُہ دُنیاداروں کو اپنا معبُود اور قبلہ نہ سمجھتے تو ان حجابوں کو چیر کر باہر نکل آتے اور کسی کے لعن طعن کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے اور کوئی خوف شماتت کا انہیں دامنگیر نہ ہوتا، بلکہ وُہ خدا کی طرف دوڑتے۔ پس تم یاد رکھو کہ تم ہر کام میں دیکھ لو کہ اس میں خدا راضی ہے یا مخلوقِ خدا۔ جب تک یہ حالت نہ ہو جاوے کہ خدا کی رضا مقدم ہو جاوے اور کوئی شیطان رہزن نہ ہو سکے۔ اس وقت تک ٹھوکر کا اندیشہ ہے، لیکن جب دُنیا کی بُرائی بھلائی ہی نہ ہو بلکہ خدا کی خوشنودی اور ناراضگی اس پر اثر کرنے والی ہو یہ وہ حالت ہوتی ہے جب انسان ہر قسم کے خوف و حُزن کے مقامات سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہماری جماعت میں شامل ہو کر پھر اس سے نِکل جاتا ہے ۔ تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کا شیطان اس لباس میں ہنُوز اس کے ساتھ ہوتا ہے ـــ لیکن اگر وہ عزم کرلے کہ آئندہ کسی وسوسہ انداز کی بات کو سُنوں گا ہی نہیں۔ تو خدا اسے بچا لیتا ہے...... ٹھوکر لگنے کا عمُوماً یہی سبب ہوتا ہے کہ دُوسرے تعلّقات قائم تھے۔ اُن کو پرورش کے لیے ضرورت پڑی کہ ادھر سے سُست ہوں۔ سُستی سے اجنبیّت پیدا ہوئی۔ پھر اس سے تکبّر اور پھر انکار تک نوبت پہنچی۔ تبتّل کا عملی نمونہ ہمارے پیغمبرِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ نہ آپ کو کسی کی مدح کی پرواہ نہ ذم کی۔ کیا کیا آپ کو تکالیف پیش آئیں، مگر کچھ بھی پرواہ نہیں کی۔ کوئی لالچ اور طمع آپ کو اس کام سے روک نہ سکا جو آپ خدا کی طرف سے کرنے کے لیے آئے تھے۔ جب تک انسان اس حالت کو اپنے اندر مشاہدہ نہ کرے اور امتحان میں پاس نہ ہو لے۔ کبھی بھی بےفکر نہ ہو۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو شخص متبتّل ہوگا متوکّل بھی وہی ہوگا۔ گویا متوکّل ہونے کے واسطے متبتّل ہونا شرط ہے۔ کیونکہ جب تک اوروں کے ساتھ تعلقات ایسے ہیں کہ ان پر بھروسہ اور تکیہ کرتا ہے۔ اُس وقت تک خالصۃً اللہ پر توکّل کب ہو سکتا ہے جب خدا کی طرف انقطاع کرتا ہے

تو وُہ دنیا کی طرف سے توڑتا ہے اور خدا میں پیوند کرتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جبکہ کامل توکل ہو جیسے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل متبتل تھے۔ ویسے ہی کامل متوکل بھی تھے اور یہی وجہ ہے کہ اتنے وجاہت والے اور قوم و قبائل والے سرداروں کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور ان کی مخالفت سے کچھ بھی متاثر نہ ہوتے۔ آپؐ میں ایک فوق العادت یقین خدا تعالیٰ کی ذات پر تھا۔ اسی لیے اس قدر عظیم الشان بوجھ کو آپؐ نے اُٹھا لیا اور ساری دنیا کی مخالفت کی اور ان کی کچھ بھی ہستی نہ سمجھی۔ یہ بڑا نمونہ ہے توکل کا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ اس لیے کہ اس میں خدا کو پسند کرکے دنیا کو مخالف بنا لیا جاتا ہے۔ مگر یہ حالت پیدا نہیں ہوتی جب تک گویا خدا کو نہ دیکھ لے۔ جبتک یہ امید نہ ہو کہ اس کے بعد دُوسرا دروازہ ضرور کھلنے والا ہے۔ جب یہ امید اور یقین ہو جاتا ہے تو وہ عزیزوں کو خدا کی راہ میں دشمن بنا لیتا ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا اور دوست بنا دے گا۔ جائیداد کھو دیتا ہے کہ اس سے بہتر ملنے کا یقین ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خدا ہی کی رضا کو مقدم کرنا تو تبتل ہے اور پھر تبتل اور توکل توام ہیں۔ تبتل کا راز ہے توکل اور توکل کی شرط ہے تبتل۔ یہی ہمارا مذہب اس امر میں ہے۔[1]

---

۱۴ ستمبر ۱۹۰۱ء بعد مغرب

"اُمّ المؤمنین" کے لفظ کا استعمال

"اُمّ المؤمنین" کا لفظ جو مسیح موعودؑ کی بیوی کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سُن کر فرمایا:

"اعتراض کرنے والے بہت ہی کم غور کرتے اور اس قسم کے اعتراض صاف بتاتے ہیں کہ وہ محض کینہ اور حسد کی بناء پر کیے جاتے ہیں؛ ورنہ نبیوں یا ان کے اظلال کی بیویاں اگر اُمہات المؤمنین نہیں ہوتی ہیں تو کیا ہوتی ہیں؟ خدا تعالیٰ کی سُنّت اور قانونِ قدرت کے اس تعامل سے بھی پتہ لگتا ہے کہ کبھی کسی نبی کی بیوی سے کسی نے شادی نہیں کی۔ ہم کہتے ہیں کہ ان لوگوں سے جو اعتراض کرتے ہیں کہ اُمّ المؤمنین کیوں کہتے ہو؟ یہ پُوچھنا چاہیئے کہ تم بتاؤ جو مسیح موعود تمہارے ذہن میں ہے اور جسے تم سمجھتے ہو کہ وہ آکر نکاح بھی کرے گا۔ کیا اس کی بیوی کو تم اُمّ المؤمنین کہو گے یا نہیں؟ مُسلم میں تو مسیح موعود کو نبی ہی کہا گیا ہے اور قرآن شریف میں انبیاء علیہم السلام

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۷ صفحہ ۱ تا ۳ پرچہ ۱۰ راکتوبر ۱۹۰۱ء

کی بیویوں کو مومنوں کی مائیں قرار دیا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ لوگ میری مخالفت اور بغض میں ایسا تجاوز کرتے ہیں کہ مُنہ سے بات کرتے ہوئے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اس کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا۔

جن لوگوں نے مسیح موعود کو شناخت کر لیا ہے۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمودہ کے موافق اس کی شان کو مان لیا ہے، ان کا ایمان تو خود بخود انہیں اس بات کے ماننے پر مجبُور کرے گا اور جو آج اعتراض کرتے ہیں یہ اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وقت میں بھی ہوتے، تب بھی اعتراض کرنے سے باز نہ آتے۔

یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ خدا کا مامُور جو ہدایت کرتا ہے اور رُوحانی اصلاح کا موجب ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت باپ سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ افلاطون حکیم لکھتا ہے کہ باپ تو رُوح کو آسمان سے زمین پر لاتا ہے، مگر اُستاد زمین سے پھر آسمان پر پہنچاتا ہے۔ باپ کا تعلق تو صرف فانی جسم کے ہی ساتھ ہوتا ہے۔ مُرشد اور مُرشد بھی وہ جو خدا کی طرف سے ہدایت کے لیے مامُور ہوا ہو، اس کا تعلق رُوح سے ہوتا ہے جس کو فنا نہیں ہے۔ پھر جب وُہ رُوح کی تربیت کرتا ہے اور اس کی رُوحانی تولید کا باعث ہوتا ہے تو وُہ اگر باپ نہ کہلائے گا، تو کیا کہلائے گا؟ اصل یہی ہے کہ یہ لوگ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں پر بھی کچھ توجہ نہیں کرتے؛ ورنہ اگر ان کو سوچتے اور قرآن کو پڑھتے تو یہ مُنکرین میں نہ رہتے۔"

فوٹو بنوانے کی غرض

[پھر اعتراض کیا گیا کہ تصویر پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ تصوّرِ شیخ کی غرض سے بنوائی گئی ہے حضرت اقدس علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا:]

"یہ تو دُوسرے کی نیّت پر حملہ ہے۔ مَیں نے بہت مرتبہ بیان کیا ہے کہ تصویر سے ہماری غرض کیا تھی۔ بات یہ ہے کہ چونکہ ہم کو بلادِ یُورپ خصوصاً لنڈن میں تبلیغ کرنی منظور تھی، لیکن چونکہ یہ لوگ کسی دعوت یا تبلیغ کی طرف توجّہ نہیں کرتے جب تک داعی کے حالات سے واقف نہ ہوں اور اس کے لیے اُن کے ہاں علم تصویر میں بڑی بھاری ترقی کی گئی ہے۔ وہ کسی شخص کی تصویر اور اس کے خدوخال کو دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اس میں راستبازی، قوتِ قدسی کہاں تک ہے؟ اور ایسا ہی بہت سے امور کے متعلق انہیں اپنی رائے قائم کرنے کا موقعہ مِل جاتا ہے۔ پس اصل غرض اور نیّت ہماری اس سے یہ تھی جس کو ان لوگوں نے جو خواہ نخواہ ہر بات میں مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کو بُرے بُرے پیرایوں میں پیش کیا اور دُنیا کو بہکایا۔ مَیں کہتا ہوں کہ ہماری نیّت تو تصویر سے صرف اتنی ہی تھی۔ اگر یہ نفسِ تصویر کو ہی بُرا سمجھتے ہیں، تو پھر کوئی سکّہ اپنے پاس نہ رکھیں بلکہ بہتر ہے کہ آنکھیں بھی نکلوا دیں کیونکہ اُن میں بھی اشیاء کا ایک انعکاس ہی ہوتا ہے۔

یہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ افعال کی تہ میں نیّت کا بھی دخل ہوتا ہے اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ پڑھتے ہیں۔

مگر سمجھتے نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص محض ریاکاری کے لیے نماز پڑھے تو اس کو یہ کوئی مستحسن قرار دیں گے؟ سب جانتے ہیں کہ ایسی نماز کا فائدہ کچھ نہیں، بلکہ وبالِ جان ہے تو کیا نماز بُری تھی؟ اس کے بداستعمال نے اس کے نتیجہ کو بُرا پیدا کیا۔ اسی طرح پر تصویر سے ہماری غرض تو اسلام کی دعوت میں مدد لینا تھی۔ جو اہلِ یورپ کے مذاق پر ہو سکتی تھی۔ اس کو تصویرِ شیخ بنانا اور کچھ سے کچھ کہنا افترا ہے۔ جو مسلمان ہیں اُن کو اس پر غصہ نہیں آنا چاہیے تھا جو کچھ خدا اور رسُول نے فرمایا ہے وہ حق ہے۔ اگر شائخ کا قول خدا اور رسُول کے فرمودہ کے موافق نہیں تو کالائے بدبریشِ خاوند۔ تصورِ شیخ کی بابت پُوچھو تو اس کا کوئی پتہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ صالحین اور فانین فی اللہ کی محبت ایک عمدہ شے ہے لیکن حفظِ مراتب ضروری ہے۔

گر حفظِ مراتب نہ کُنی زندیقی

پس خدا کو خدا کی جگہ۔ رسُول کو رسُول کی جگہ سمجھو اور خدا کے کلام کو دستورالعمل ٹھہرا لو۔ اس سے زیادہ قرآن شریف میں اور کچھ نہیں کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ : ۱۱۹) پس صادقوں اور فانی فی اللہ کی صحبت تو ضروری ہے اور یہ کہیں نہ کہا گیا کہ تم اُسے ہی سب کچھ سمجھو۔ اور یا قرآن شریف میں یہ حکم ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران : ۳۲) اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ مجھے خدا سمجھ لو، بلکہ یہ فرمایا کہ اگر خدا کے محبوب بننا چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی راہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو۔ اتباع کا حکم تو دیا ہے، مگر تصورِ شیخ کا حکم قرآن میں نہیں پایا جاتا۔"

تصورِ شیخ

سوال : جو تصورِ شیخ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم شیخ کو خدا نہیں سمجھتے۔

جواب : مانا کہ وہ ایسا کہتے ہیں، مگر بت پرستی تو شروع ہی تصور سے ہوتی ہے۔ بُت پرست بھی بڑھتے بڑھتے ہی اس درجہ تک پہنچا ہے۔ پہلے تصور ہی ہوگا۔ پھر یہ سمجھ لیا کہ تصور قائم رکھنے کے لیے بہتر ہے تصویر بنالیں اور پھر اس کو ترقی دیتے دیتے پتھر اور دھاتوں کے بُت بنانے شروع کر دیئے اور اُن کو تصاویر کا قائم مقام بنایا۔ آخر یہاں تک ترقی کی کہ اُن کی رُوحانیت کو اور وسیع کر کے ان کو خدا ہی مان لیا۔ اب نرے پتھر ہی رکھ لیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ منتر کے ساتھ اُن کو دُرست کر لیتے ہیں اور پرمیشر کا حلول ان پتھروں میں ہو جاتا ہے۔ اس منتر کا نام انہوں نے آواہن رکھا ہوا ہے۔ مَیں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ میرے ہاتھ میں ایک کاغذ ہے۔ مَیں نے ایک شخص کو دیا کہ اسے پڑھو، تو اس نے کہا کہ اس پر آواہن لکھا ہوا ہے۔ مجھے اس سے کراہت آئی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ تُو مجھے دکھا۔ جب مَیں نے پھر ہاتھ میں لے کر دیکھا، تو اس پر لکھا ہوا تھا۔ اَرَدْتُ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا خلیفہ جو ہوتا ہے، ردائے الٰہی کے نیچے ہوتا ہے۔ اسی لیے آدمؑ کے لیے فرمایا کہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر : ۳۰) اسی طرح پر غلطیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اصُول کو نہ سمجھا۔ کچھ کا کچھ

بگاڑ کر بنا لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ شرک اور بُت پرستی نے اس کی جگہ لے لی۔ ہماری تصویر کی اصل غرض وہی تھی جو ہم نے بیان کر دی کہ لنڈن کے لوگوں کو اطلاع ہو اور اس طرح پر ایک اشتہار ہو جاوے۔

قلب جاری ہونے کا مسئلہ

غرض تصورِ شیخ کا مسئلہ ہندوؤں کی ایجاد اور ہندوؤں ہی سے لیا گیا ہے چنانچہ قلب جاری ہونے کا مسئلہ بھی ہندوؤں ہی سے لیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اصل غرض انسان کی پیدائش سے یہ ہوتی، تو پھر اتنی بڑی تعلیم کی کیا ضرورت تھی۔ صرف اجرائے قلب کا مسئلہ بتا کر اس کے طریقے بتا دیئے جاتے۔ مجھے ایک شخص نے معتبر روایت کی بنا پر بتایا کہ ہندو کا قلب رام رام پر جاری تھا۔ ایک مسلمان اس کے پاس گیا اس کا قلب بھی رام رام پر جاری ہو گیا۔ یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ رام خدا کا نام نہیں ہے۔ دیانند نے بھی اس پر گواہی دی ہے۔ کہ یہ خدا کا نام نہیں ہے۔ قلب جاری ہونے کا دراصل ایک کھیل ہے جو سادہ لوح جُہلا کو اپنے دام میں پھنسانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر لوٹا لوٹا کہا جاوے تو اس پر بھی قلب جاری ہو سکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو تو پھر وہی بولتا ہے۔ یہ تعلیم قرآن نے نہیں دی ہے، بلکہ اس سے بہتر تعلیم دی ہے اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الشعراء : ۹۰) خدا یہ چاہتا ہے کہ سارا وجود ہی قلب ہو جاتے؛ ورنہ اگر وجود سے خدا کا ذکر جاری نہیں ہوتا تو ایسا قلب قلب نہیں بلکہ کلب ہے۔

خدا یہی چاہتا ہے کہ خدا میں فنا ہو جاؤ اور اس کے حدود و شرائع کی عظمت کرو۔ قرآن فنائِ نظری کی تعلیم دیتا ہے۔ مَیں نے آزما کر دیکھا ہے کہ قلب جاری ہونے کی صرف ایک مشق ہے جس کا انحصار صلاح و تقویٰ پر نہیں ہے۔ ایک شخص منٹگمری یا ملتان کے ضلع کا مجھے چیف کورٹ میں ملا کرتا تھا، اسے اجرائے قلب کی خوب مشق تھی۔ پس میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ وقعت بات نہیں اور خدا تعالیٰ نے اس کو کوئی عزّت اور وقعت نہیں دی۔ خدا تعالیٰ کا منشاء اور قرآن شریف کی تعلیم کا مقصد صرف یہ تھا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ (الشمس : ۱۰) کپڑا جب تک سارا نہ دھویا جاوے وہ پاک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پر انسان کے سارے جوارح اس قابل ہیں کہ وہ دُھوتے جائیں۔ کسی ایک کے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے سوا یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خدا کا سنوارا ہوا بگڑتا نہیں، مگر انسان کی بناوٹ بگڑ جاتی ہے۔ ہم گواہی دیتے ہیں اور اپنے تجربہ کی بنا پر گواہی دیتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے اندر خدا تعالیٰ کی مرضی اور سنّتِ نبویؐ کے موافق تبدیلی نہیں کرتا اور پاکیزگی کی راہ اختیار نہیں کرتا تو خواہ اس کے قلب سے ہی آواز آتی ہو، وہ زہر جو انسان کی رُوحانیت کو ہلاک کر دیتی ہے دُور نہیں ہو سکتی۔ رُوحانیت کی نشوونما اور زندگی کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ خدا تعالیٰ نے رکھا ہے اور وہ اِتباعِ رسولؐ ہے۔ جو لوگ قلب جاری ہونے کے شعبدے لیے پھرتے ہیں، انہوں نے

سنّتِ نبوی کی سخت توہین کی ہے۔ کیا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر کوئی انسان دُنیا میں گذرا ہے؟ پھر غارِ حرا میں بیٹھ کر وُہ قلب جاری کرنے کی مشق کیا کرتے تھے یا فنا کا طریق آپؐ نے اختیار کیا ہوا تھا؟ پھر آپؐ کی ساری زندگی میں کہیں اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ آپؐ نے صحابہؓ کو یہ تعلیم دی ہو کہ تم قلب جاری کرنے کی مشق کرو اور کوئی ان قلب جاری ہونے والوں میں سے پتہ نہیں دیتا اور کبھی نہیں کہتا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی قلب جاری تھا۔ یہ تمام طریق جن کا قرآن شریف میں کوئی ذکر نہیں۔ انسانی اختراع اور خیالات ہیں جن کا نتیجہ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ قرآن شریف اگر کچھ بتاتا ہے، تو یہ کہ خدا سے یوُں محبت کرو کہ اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ کے مصداق ہو۔ اور فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۲) پر عمل کرو اور ایسی فنا اتم تم پر آجاوے کہ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا (المزمّل: ۹) کے رنگ سے تم رنگین ہو جاؤ اور خدا تعالیٰ کو سب چیزوں پر مقدم کرو۔ یہ اُمور ہیں جن کے حصُول کی ضرورت ہے۔ نادان انسان اپنی عقل اور خیال کے پیمانہ سے خدا کو ناپنا چاہتا ہے اور اپنی اختراع سے چاہتا ہے کہ اس سے تعلق پیدا کرے اور یہی ناممکن ہے۔

پس میری نصیحت یہی ہے کہ ان خیالات سے بالکل الگ رہو اور وہ طریق اختیار کرو جو خدا تعالیٰ کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلّم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دکھایا کہ اسی پر چل کر انسان دُنیا اور آخرت میں فلاح اور فوز حاصل کر سکتا ہے اور صحابہؓ کو جس کی تعلیم دی۔ پھر وقتاً فوقتاً خدا کے برگزیدوں نے سنّتِ جاریہ کی طرح اپنے اعمال سے ثابت کیا اور آج بھی خُدا نے اسی کو پسند کیا۔ اگر خدا تعالیٰ کا اصل منشا یہی ہوتا تو ضرور تھا کہ آج بھی جب اس نے ایک سلسلہ گمشدہ صداقتوں اور حقائق کے زندہ کرنے کے لیے قائم کیا یہی تعلیم دیتا اور میری تعلیم کا منتہا یہی ہوتا، مگر تم دیکھتے ہو کہ خدا نے ایسی تعلیم نہیں دی ہے، بلکہ وُہ تو قلب سلیم چاہتا ہے وُہ محسنوں اور متقیوں کو پیار کرتا ہے، اُن کا ولی ہوتا ہے۔ کیا سارے قرآن میں ایک جگہ بھی لکھا ہوا ہے کہ وُہ ان کو پیار کرتا ہے کہ جن کے قلب جاری ہوں؟ یقیناً سمجھو کہ یہ محض خیالی باتیں اور کھیلیں ہیں جن کا اصلاحِ نفس اور رُوحانی اُمور سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ ایسے کھیل خدا سے بُعد کا موجب ہو جاتے ہیں اور انسان کے عملی حصّہ میں مُضر ثابت ہوتے ہیں، اس لیے تقویٰ اختیار کرو۔ سُنّتِ نبویؐ کی عزت کرو اور اس پر قائم ہو کر دکھاؤ جو قرآن شریف کی تعلیم کا اصل مغز یہی ہے۔"

صوفیاء کا معاملہ

سوال: پھر صُوفیوں کو کیا غلطی لگی؟

جواب: اُن کو بحوالہ خدا کرو۔ معلوم نہیں انھوں نے کیا سمجھا اور کہاں سے سمجھا تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ (البقرہ: ۱۳۵) بعض وقت لوگوں کو دھوکا لگتا ہے کہ وہ ابتدائی حالت کو انتہائی سمجھ لیتے ہیں۔ کیا معلوم ہے کہ انھوں نے ابتداء میں یہ کہا ہو پھر آخر میں چھوڑ دیا ہو یا کسی اور

ہی نے ان کی باتوں میں التباس کر دیا ہو اور اپنے خیالات ملا دیئے ہوں۔ اسی طرح پر توریت و انجیل میں تحریف ہوگئی۔ گذشتہ مشائخ کا اس میں نام بھی نہیں لینا چاہیے۔ ان کا تو ذکرِ خیر چاہیے۔ انسان کو لازم ہے کہ جس غلطی پر خدا اُسے مطلع کرے خود اس میں نہ پڑے۔ خدا نے یہی فرمایا ہے کہ شرک نہ کرو اور تمام عقل اور طاقت کے ساتھ خدا کے ہو جاؤ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ۔"

حبسِ دم

سوال : حبسِ دم کیا ہے ؟

جواب : "یہ بھی ہندو جوگیوں کا مسئلہ ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔"[1]

۱۲ر ستمبر ۱۹۰۱ء

[۱۲ر ستمبر ۱۹۰۱ء کی شام کو جبکہ حضرت اقدس امام علیہ الصلوٰۃ والسلام حسبِ معمول مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر احباب کے زمرہ میں تشریف فرما ہوتے تو باتوں ہی باتوں میں کچھ طبّی تحقیقاتوں کا سلسلہ چل پڑا اور اُن مغربی تجارب اور تحقیقاتوں کا ذکر ہونے لگا، جو عملِ جراحی کے متعلق یورپ و امریکہ والوں نے کی ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص منشی عبدالحق صاحب پٹیالوی نے اپنے ہاں اولادِ نرینہ ہونے کے لیے دُعا کی درخواست کی۔ اس پر حضرتِ اقدس امام عالیمقام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مختصر سی لطیف تقریر فرمائی۔ جس کو ہم اپنے الفاظ اور طرز میں ادا کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے :]

اولاد کی خواہش

" انسان کو سوچنا چاہیے کہ اسے اولاد کی خواہش کیوں ہوتی ہے؟ کیونکہ اس کو محض طبعی خواہش ہی تک محدود نہ کر دینا چاہیے کہ جیسے پیاس لگتی ہے یا بھوک لگتی ہے، لیکن جب ایک خاص اندازہ سے گزر جاوے تو ضرور اس کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ جیسا کہ فرمایا۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذّٰریٰت: ۵۷) اب اگر انسان خود مومن اور عبد نہیں بنتا ہے اور اپنی زندگی کے اصل منشار کو پورا نہیں کرتا ہے اور پورا حق عبادت ادا نہیں کرتا بلکہ فسق و فجور میں زندگی بسر کرتا ہے اور گناہ پر گناہ کرتا ہے تو ایسے آدمی کی اولاد کے لیے خواہش کیا نتیجہ رکھے گی؟ صرف یہی کہ گناہ کرنے کے لیے وہ اپنا ایک اور خلیفہ چھوڑنا چاہتا ہے۔ خود کونسی کمی کی ہے جو اولاد کی خواہش کرتا ہے۔ پس جب تک اولاد کی خواہش محض اس غرض کے لیے نہ ہو کہ وہ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۹-۴۰ صفحہ ۱-۲ پرچہ ۲۴ اکتوبر و ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۱ء

دیندار اور متقی ہو اور خدا تعالیٰ کی فرماں بردار ہو کر اُس کے دین کی خادم بنے بالکل فضول بلکہ ایک قسم کی معصیت اور گناہ ہے اور باقیاتِ صالحات کی بجائے اس کا نام باقیاتِ سیّئات رکھنا جائز ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں صالح اور خدا ترس اور خادمِ دین اولاد کی خواہش کرتا ہوں، تو اس کا یہ کہنا بھی نرا ایک دعویٰ ہی دعویٰ ہو گا۔ جب تک کہ وہ اپنی حالت میں ایک اصلاح نہ کرے۔ اگر خود فسق و فجور کی زندگی بسر کرتا ہے اور مُنہ سے کہتا ہے کہ میں صالح اور متقی اولاد کی خواہش کرتا ہوں، تو وہ اپنے اس دعویٰ میں کذّاب ہے۔ صالح اور متقی اولاد کی خواہش سے پہلے ضروری ہے کہ وُہ خود اپنی اصلاح کرے اور اپنی زندگی کو متقیانہ زندگی بنادے تب اس کی ایسی خواہش ایک نتیجہ خیز خواہش ہو گی اور ایسی اولاد حقیقت میں اس قابل ہو گی کہ اس کو باقیاتِ صالحات کا مصداق کہیں۔ لیکن اگر یہ خواہش صرف اس لیے ہو کہ ہمارا نام باقی رہے اور وہ ہمارے املاک و اسباب کی وارث ہو یا وُہ بڑی ہی نامور اور مشہور ہو۔ اس قسم کی خواہش میرے نزدیک شرک ہے۔

نیکی کرنے کا مقصد

یاد رکھو کسی نیکی کو کبھی اس لیے نہیں کرنا چاہیے کہ اس نیکی کے کرنے پر ثواب یا اجر ملے گا۔ کیونکہ اگر محض اس خیال سے نیکی کی جاوے تو وہ اِبْتِغَاءَ لِمَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ نہیں ہو سکتی، بلکہ اس ثواب کی خاطر ہو گی اور اس سے اندیشہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت اسے چھوڑ بیٹھے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہر روز ہم سے ملنے کو آوے اور ہم اس کو ایک روپیہ دے دیا کریں، تو وہ بجائے خود یہی سمجھے گا کہ میرا جانا صرف روپے کے لیے ہے۔ جس دن سے روپیہ نہ ملے اسی دن سے آنا چھوڑ دے گا۔ غرض یہ ایک قسم کا باریک شرک ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ نیکی کو محض اس لیے کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ خوش ہو اور اس کی رضا حاصل ہو اور اس کے حکم کی تعمیل ہو۔ قطع نظر اس کے کہ اُس پر ثواب ہو یا نہ ہو۔* ایمان تب ہی کامل ہوتا ہے جبکہ یہ وسوسہ اور وہم درمیان سے اُٹھ جاوے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (التوبۃ : ۱۲۰) مگر نیکی کرنے والے کو اجر مدِّنظر نہیں رکھنا چاہیے۔ دیکھو اگر کوئی مہمان یہاں محض اس لیے آتا ہے کہ وہاں آرام ملے گا۔ ٹھنڈے شربت ملیں گے یا تکلّف کے کھانے ملیں گے۔ تو وہ گویا ان اشیاء کے لیے آتا ہے، حالانکہ خود میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حتی المقدور اس کی مہمان نوازی

---

* نوٹ : حضرت حجۃ اللہ نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر مجھے یہ بھی بتایا جاوے اور یقین کرایا جاوے کہ اس کام کے کرنے پر سخت سے سخت عذاب دیا جاوے گا۔ تب بھی میں اپنی رُوح میں کوئی لغزش نہیں پاتا کہ وہ اس کام کو چھوڑ دے، کیونکہ محض عذاب یا ثواب میرے کام کی غرض نہیں ہے۔ مجھے تو خدا تعالیٰ نے طبعی طور پر ایک جوشِ فطرت عطا کیا ہے۔ جو اس کے احکام کی تعمیل کی طرف کشاں کشاں لیے جاتا ہے (ایڈیٹر)

ہیں کوئی کمی نہ کرے اور اس کو آرام پہنچاوے اور وہ پہنچاتا ہے، لیکن مہمان کا خود ایسا خیال کرنا اس کے لیے نقصان کا موجب ہے۔

اولاد کی خواہش صرف نیکی کے اصُول پر ہونی چاہیے

تو غرض مطلب یہ ہے کہ اولاد کی خواہش صرف نیکی کے اصُول پر ہونی چاہیے۔ اس لحاظ سے اور خیال سے نہ ہو کہ وہ ایک گُناہ کا خلیفہ باقی رہے۔ خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ مجھے کبھی اولاد کی خواہش نہیں ہوئی تھی؛ حالانکہ خدا تعالیٰ نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر کے درمیان ہی اولاد دے دی تھی۔ یہ سُلطان احمد اور فضل احمد قریباً اسی عُمر میں پیدا ہو گئے تھے۔ اور نہ کبھی مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وُہ بڑے بڑے دُنیا دار بنیں اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچ کر مامُور ہوں۔ غرض جو اولاد معصیت اور فسق کی زندگی بسر کرنے والی ہو۔ اس کی نسبت تو سعدیؒ کا یہ فتویٰ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

کہ پیش از پدر مُردہ بہ ناخلف

پھر ایک اور بات ہے کہ اولاد کی خواہش تو لوگ بڑی کرتے ہیں اور اولاد ہوتی بھی ہے، مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وُہ اولاد کی تربیت اور ان کو عُمدہ اور نیک چلن بنانے اور خدا تعالیٰ کے فرمانبردار بنانے کی سعی اور فکر کریں، نہ کبھی اُن کے لیے دُعا کرتے ہیں اور نہ مراتب تربیت کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

میری اپنی تو یہ حالت ہے کہ میری کوئی نماز ایسی نہیں ہے جس میں مَیں اپنے دوستوں اور اولاد اور بیوی کے لیے دُعا نہیں کرتا۔ بہت سے والدین ایسے ہیں جو اپنی اولاد کو بُری عادتیں سکھا دیتے ہیں۔ ابتدا میں جب وہ بدی کرنا سیکھنے لگتے ہیں، تو ان کو تنبیہ نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن بدن دلیر اور بے باک ہوتے جاتے ہیں۔ ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکا اپنے جرائم کی وجہ سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اس آخری وقت میں اس نے خواہش کی کہ میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ جب اُس کی ماں آئی تو اُس نے ماں کے پاس جا کر اُسے کہا کہ مَیں تیری زبان کو چوسنا چاہتا ہوں۔ جب اُس نے زبان نکالی تو اُسے کاٹ کھایا۔ دریافت کرنے پر اُس نے کہا کہ اسی ماں نے مجھے پھانسی پر چڑھایا ہے، کیونکہ اگر یہ مجھے پہلے ہی روکتی، تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لوگ اولاد کی خواہش تو کرتے ہیں، مگر نہ اس لیے کہ وہ خادمِ دین ہو بلکہ اس لیے کہ دنیا میں ان کا کوئی وارث ہو اور جب اولاد ہوتی ہے تو اس کی تربیت کا فکر نہیں کیا جاتا۔ نہ اس کے عقائد کی اصلاح کی جاتی ہے اور نہ اخلاقی حالت کو دُرست کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ اس کا ایمان درست نہیں ہو سکتا جو اقرب تعلقات کو نہیں سمجھتا۔ جب وہ اس سے قاصر ہے تو اور نیکیوں کی اُمید اس سے کیا ہو سکتی ہے؟ — اللہ تعالیٰ نے اولاد کی خواہش کو اس طرح پر قرآن میں بیان فرمایا ہے رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا

قُرَّۃَ اَعۡیُنٍ وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا (الفرقان : ۷۵) یعنی خدا تعالیٰ ہم کو ہماری بیویوں اور بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرماوے اور یہ تب ہی میسّر آسکتی ہے کہ وُہ فسق و فجور کی زندگی بسر نہ کرتے ہوں بلکہ عبادُ الرحمٰن کی زندگی بسر کرنے والے ہوں اور خدا کو ہر شَے پر مقدم کرنے والے ہوں اور آگے کھول کر کہہ دیا وَاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا۔ اولاد اگر نیک اور متقی ہو تو ان کا امام ہی ہو گا۔ اس سے گویا متقی ہونے کی بھی دُعا ہے۔[1]"

۳۰ر اکتوبر ۱۹۰۱ء

[ابھی مغرب کی اذان نہ ہوئی تھی کہ حضرت اقدس علیہ السلام تشریف لے آئے۔ آپؑ کا چہرہ بشاشت اور مسرت سے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ چہرہ سے ایک جلال ٹپکتا تھا۔ آتے ہی فرمایا:]

مسیح کی شان میں افراط و تفریط کے خلاف غیرت کا اظہار

"آج مَیں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی نسبت بہت بڑا اِطراء کیا گیا ہے اور اُن کی شان میں اتنا غلوّ کیا گیا کہ معاذ اللہ خدا ہی بنا دیا گیا ہے۔ ہم ان کی عزّت کرتے ہیں جیسے اور نبیوں کی عزّت کرتے ہیں اور خدا کا راستباز نبی مانتے ہیں، مگر اس غلوّ و اطراء کو توڑنے کے لیے مَیں نے تجویز کیا ہے کہ اُن کے وُہ سارے سوانح یکجائی طور پر پیش کریں جو عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک وہ ساری باتیں جو اُن کی انسانیت کے اثبات پر گواہِ ناطق ہیں، پیش نہ کی جاویں۔ خیالی طور پر جو کچھ اُن کے مراتب میں غلوّ کیا گیا ہے اُس کا استیصال نہ ہو گا اور یہ جوش خدا تعالیٰ نے مجھے محض اس لیے دیا ہے کہ مَیں دیکھتا ہوں اس اِطراء کا نتیجہ بہت بُرا ہوا ہے۔ نبی کریمؐ کی توہین کی گئی اور خدا تعالیٰ کے جلال و جبروت کی کچھ بھی پرواہ نہیں کی گئی۔ اس لیے یہ سلسلہ میں سمجھتا ہوں بہت مفید ہو گا۔ چونکہ اِنَّمَا الۡاَعۡمَالُ بِالنِّیَّاتِ ہماری نیّت نیک ہے اس لیے وہ واقعات جو ہم اس میں درج کریں گے، اس لیے نہیں ہوں گے کہ ہم خدانخواستہ اُن کی توہین کرتے ہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ اُن کی انسانیت ان کو دی جاتے بلکہ ہم ان اعتراضوں کو جو یہودیوں اور فری تھنکروں نے اُن پر کیے ہیں۔ درج کرکے ان کا جواب دیں گے۔"

[اس کے بعد چونکہ اذان ہو چکی تھی۔ نماز مغرب ادا کی گئی۔ بعد نماز مغرب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر اسی سلسلہ کلام میں فرمایا:]

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ صفحہ ۱۰ تا ۱۲ پرچہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء

اعجاز المسیح کی تصنیف

"یہ کتاب جو مَیں لکھ رہا ہوں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم الشان نشان ہوگی چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بشارت دی ہوئی ہے کہ اُجِیْبُ کُلَّ دُعَائِكَ اِلَّا فِیْ شُرَکَائِكَ۔ اس لیے مجھے پورا بھروسہ اور یقین ہے کہ میری دُعائیں کُل دُنیا سے زیادہ قبول ہوئی ہیں اور اسی لیے یہ کتاب ایک نشان ہے کہ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکے گا۔ ہماری جماعت کے ہاتھ میں یہ زبردست نشان ہوگا۔ مَیں عربوں کے دعویٰ ادب و فصاحت و بلاغت کو بالکل توڑنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ جو اخبار نویس ہیں اور چند سطریں لکھ کر اپنے آپ کو اہلِ زبان اور ادیب قرار دیتے ہیں، وُہ اس اعجاز کے مقابلہ میں قلم اٹھا کر دیکھ لیں۔ اُن کے قلم توڑ دیئے جاویں گے۔ اور اگر اُن میں کچھ طاقت ہے اور قوت ہے تو وہ اکیلے اکیلے یا سب کے سب مل کر اس کا مقابلہ کریں پھر انہیں معلوم ہو جائے گا اور یہ راز بھی کُھل جائے گا جو یہ ناواقف کہا کرتے ہیں۔ کہ عربوں کو ہزارہا روپیہ کے نوٹ دے کر کتابیں لکھائی جاتی ہیں۔ اب معلوم ہو جائے گا کہ کون عرب ہے، جو ایسی فصیح و بلیغ کتاب اور ایسے حقائق و معارف سے پُر لکھ سکتا ہے۔ جو کتابیں یہ ادب و انشاء کا دعویٰ کرنے والے لکھتے ہیں، اُن کی مثال پتھروں کی سی ہے کہ نرم، سخت، سیاہ، سفید پتھر جمع کر کے رکھے جائیں۔ مگر یہ تو ایک لذیذ اور شیریں چیز ہے۔ جس میں حقائق اور معارفِ قرآنی کے اجزاء ترکیب دیئے گئے ہیں۔ غرض جو بات رُوح القدس کی تائید سے لکھی جاوے اور جو الفاظ اُس کے القاء سے آتے ہیں وہ اپنے ساتھ ایک حلاوت رکھتے ہیں اور اس حلاوت میں ملی ہوئی شوکت اور قوت ہوتی ہے جو دُوسروں کو اس پر قادر نہیں ہونے دیتی۔ غرض یہ ایک بہت بڑا نشان ہوگا۔"

پھر اسی سلسلہ کلام میں کہ مسیح کی سوانح پر نکتہ چینیوں کو ہم لکھنا چاہتے ہیں اور یہودی اور فری تھنکروں کے اعتراضوں کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا:

"اس طرز کے اختیار کرنے سے مدعا یہ ہے کہ مسیحؑ کی خدائی باطل کی جاوے۔ یہ اعتقاد ظلمِ عظیم ہے اور مجھے تو خدا کی قدرت ہے کہ شروع سے جبکہ ابھی میں طالب علم ہی تھا، اُس کی تردید کا ایک جوش خدا نے دیا تھا۔ گویا میری سرشت میں یہ بات رکھ دی تھی؛ چنانچہ جب پادری فنڈر صاحب نے اپنی کتابیں شائع کیں تو ۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۰ء کا ذکر ہے کہ مولوی گُل علی شاہ صاحب کے پاس جو ہمارے والد صاحب نے خاص ہمارے لیے اُستاد رکھے ہوئے تھے، پڑھا کرتا تھا اور اس وقت میری عُمر سولہ سترہ برس کی ہوگی تو اس کی میزان الحق دیکھنے میں آئی۔ ایک ہندو نے جو میرا ہم مکتب تھا، اس کی فارسی کو دیکھ کر اُس کی بڑی تعریف کی۔ مَیں نے اس کو بہت ملزم کیا اور بتایا کہ اس کتاب میں بجز نجاست کے اور کچھ نہیں ہے تو نِری زبان پر جاتا ہے۔ اس وقت سے خدا نے اس جوش میں ترقی کی ہے اور میرے رگ و ریشہ میں یہ بات پڑی ہوئی ہے کہ اس افترا کے پُتلے کو تباہ کیا جاوے۔ اور خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ آجکل جو نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے یہ فرمایا تھا کہ اُس

کے یے نمازیں جمع کی جاویں گی۔ تو یہ عظیم الشان پیشگوئی پوری ہو رہی ہے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ باوجود اس کے کہ دو بیماریوں میں ہمیشہ سے مبتلا رہتا ہوں، پھر بھی آج کل میری مصروفیت کا یہ حال ہے کہ رات کو مکان کے دروازے بند کر کے بڑی بڑی رات تک بیٹھا اس کام کو کرتا ہوں؛ حالانکہ زیادہ جاگنے سے مراق کی بیماری ترقی کرتی جاتی ہے اور دورانِ سر کا دورہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر مَیں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا اور اس کام کو کئے جاتا ہوں؛ چونکہ دن چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ دن کدھر جاتا ہے۔ اُسی وقت عصر ہوتی ہے جب شام کی نماز کے لیے وضو کرنے کے واسطے پانی کا لوٹا رکھ دیا جاتا ہے۔ اس وقت مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کاش اتنا دن اور ہوتا؛ حالانکہ اسہال کی بیماری ہے اور ہر روز کئی کئی دست آتے ہیں، مگر جب پاخانے کی حاجت بھی ہوتی ہے تو مجھے رنج ہی ہوتا ہے کہ ابھی کیوں حاجت ہوئی اور ایسا ہی روٹی کے لیے جب کئی مرتبہ کہتے ہیں تو بڑا جبر کر کے جلد جلد چند لقمے کھا لیتا ہوں۔ بظاہر تو مَیں روٹی کھاتا ہوا دکھائی دیتا ہوں، مگر مَیں سچ کہتا ہوں کہ مجھے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جاتی ہے اور کیا کھاتا ہوں۔ میری توجہ اور خیال اسی طرف لگا ہوا ہوتا ہے۔ پس یہ کام بہت ضروری ہے اور خدا چاہے تو ایک نشان ہوگا جس کی نظیر لانے پر کوئی قادر نہ ہوگا۔"

[ناظرین! حضرت اقدسؑ کے اس جوش کا کچھ قدر پتہ ان الفاظ سے مِل سکتا ہے جو آپؑ کو اعلائے کلمۃ الاسلام کے لیے حق نے عطا فرمایا ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم کس دُھن میں ہیں اور وُہ کس خیال میں۔ پھر اسی سلسلہ کلام میں فرمانے لگے۔ کہ:]

"اگرچہ یہ کتاب بظاہر کوئی عجیب اور اعجاز نظر نہ آتی ہو، مگر اس کی اشاعت پر دُنیا کو معلوم ہو جائے گا۔ جب ہم نے مہوتسو کے لیے مضمون لکھنا شروع کیا تو ہمارے ایک دوست نے اپنے خیال کے موافق کچھ خوشی ظاہر نہ کی۔ مگر خدا تعالیٰ نے الہاماً خوشخبری دی کہ وہ مضمون بالا رہا؛ چنانچہ یہ اشتہار جلسہ سے پہلے ہی شائع کر دیا گیا۔ آخر جب وہ جلسہ میں پڑھا گیا تو اس کی عظمت اور اس کے حقائق کو سب نے تسلیم کیا یہاں تک کہ لاہور کے انگریزی اُردو اخبارات نے اس کے بالا رہنے کا اعتراف کیا۔ اسی طرح پر جب یہ کتاب شائع ہو کر باہر نکلے گی، تب پتہ لگے گا۔ مَیں نے ایک بار ایک شخص کو دِلی سے عطر لانے کے لیے کہا وہ کہنے لگا کہ جب میں عطار کی دوکان پر گیا، تو جو عطر وہ دکھاتا تھا، مَیں اس کو ہی واپس کر دیتا تھا۔ آخر عطار نے کہا، میاں تم یہاں دوکان میں بیٹھے ہو تمہیں پتہ نہیں لگتا۔ جب دوکان سے باہر لے کر جاؤ گے، تب اس عطر کی حقیقت معلوم ہوگی؛ چنانچہ جب وہ عطر لے کر آیا تو اس نے بیان کیا کہ جو گاڑیاں ہم سے پیچھے آتی تھیں ان کے سوار کہتے تھے کہ کس کے پاس عطر ہے۔ گویا اس کی اتنی خوشبو تھی۔"

[اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے دعویٰ کی صداقت اور اپنے مامور من اللہ ہونے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ

اپنے رابطہ کے ایسے شدید اور گاڑھا تعلق ہونے پر کہ کوئی دُوسرا آج زمین پر ویسا نہیں۔ اپنی دُعاؤں کی قبولیت پر کچھ فرماتے رہے۔ پھر مرزا خدا بخش صاحب ابوالعطاء کی کتاب "عسلِ مصفّٰی" سُننے لگے اور اس کے ضمن میں المسیح الدجال پر ایک پُرجوش اور لطیف تقریر فرمائی جو بالکل اچھوتی اور نئی تھی اور کسی تحریر میں ابھی تک نہیں آئی۔ یہ وُہ تقریر ہے جو دجال کی حقیقت اور اس کے خاص پُتلے کو ہر ایک کے سامنے کر دیا جائے گا۔ کوئی ہی ایسا بدبخت ہوگا جو اس کے بعد بھی مُنکر رہے۔[1])

۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۱ء

فونوگراف کے ذریعہ تبلیغ

[حضرت اقدسؑ حسبِ معمول سیر کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں فونوگراف کی ایجاد اور اس سے اپنی تقریر کو مختلف مقامات پر پہنچانے کا تذکرہ ہوتا رہا؛ چنانچہ یہ تجویز کی گئی کہ اس میں حضرت اقدسؑ کی ایک تقریر عربی زبان میں بند ہو جو چار گھنٹہ تک جاری رہے اور اس تقریر سے پہلے حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کی تقریر ایک انٹروڈکٹری نوٹ کے طور پر جس کا مضمون اس قسم کا ہو کہ انیسویں صدی مسیحی کے سب سے بڑے انسان کی تقریر آپ کو سُنائی جاتی ہے۔ جس نے خدا کی طرف سے مامُور ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور جو مسیح موعود اور مہدی موعود کے نام سے دُنیا میں آیا ہے اور جس نے ارضِ ہند میں ہزاروں لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور جس کے ہاتھ پر ہزاروں تائیدی نشان ظاہر ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے جس کی ہر میدان میں نُصرت کی۔ وہ اپنی دعوت بلادِ اسلامیہ میں کرتا ہے۔ سامعین خود اس کے مُنہ سے سُن لیں کہ اُس کا کیا دعویٰ ہے اور اس کے دلائل اس کے پاس کیا ہیں۔ اس قسم کی ایک تقریر کے بعد پھر حضرت اقدسؑ کی تقریر ہوگی اور جہاں جہاں یہ لوگ جائیں اسے کھول کر سُناتے پھریں۔

سیر سے تشریف لا کر حضرت اقدسؑ نے قاضی یوسف علی صاحب نعمانی کو دیکھا اور اندر تشریف لے گئے۔ پھر ظہر کے وقت تشریف لائے، نمازیں جمع ہوئیں۔ آج اتفاق سے ڈاک میں حکیم محمد اجمل خانصاحب دہلوی کا خط اور حاذق الملک میموریل فنڈ کے کاغذات آپ کے پاس پہنچے۔ حضورؑ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ جناب کو فرصت ہوگی تو اس پر ایک خط لکھیں گے جو الحکم میں طبع ہوگا۔[2]

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۰ صفحہ ۵ - ۶ پرچہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۱ء

[2] 〃 〃 ۵ 〃 ۴۱ 〃 ۱ 〃 ۱۰ر نومبر ۱۹۰۱ء

یکم نومبر ۱۹۰۱ء بروز جمعۃ المبارک

حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کی تطہیر

[حضرت اقدس جری اللہ فی حلل الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام بعد نماز مغرب حسب معمول بیٹھ گئے۔ اِرد گرد خُدام ارادت مندی کے ساتھ حلقہ باندھے بیٹھے تھے۔ آپؑ نے کل کے سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ]

"مسیح علیہ السلام کی شان میں جس قدر اطراء کیا گیا ہے اور پھر جس قدر اُن پر حملے کر کے اُن کو گرایا گیا ہے۔ مَیں ان دونوں پہلوؤں کو صاف کر کے مسیح علیہ السلام کی شان کو اعتدال پر لانا چاہتا ہوں اور جو کچھ وہ تھے اس سے دُنیا کو اطلاع دینا بھی میرا کام ہے۔ آج میں اس پر بہت غور کرتا رہا کہ عیسائیوں نے جو مسیحؑ کو خدا بناتے ہیں باوجود خدا بنانے کے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور باتوں کے علاوہ ایک نئی بات مجھے معلوم ہوئی اور وہ یہ ہے کہ۔

تاریخ سے معلوم ہوا ہے کہ جس یُوسف کے ساتھ حضرت مریمؑ کی شادی ہوئی اس کی ایک بیوی پہلے بھی موجود تھی۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ یہودیوں نے تو اپنی شرارت سے اور حد سے بڑھی ہوئی شوخی سے حضرت مسیحؑ کی پیدائش کو ناجائز قرار دیا اور انھوں نے یہ ظلم پر ظلم کیا کہ ایک تارکہ اور نذر دی ہوئی لڑکی کا اپنی شریعت کے خلاف نکاح کیا۔ اور پھر حمل میں نکاح کیا۔ اس طرح انھوں نے شریعت مُوسوی کی توہین کی اور بایں حضرت مسیحؑ کی پاک پیدائش پر نکتہ چینی کی اور ایسی نکتہ چینی جس کو ہم سُن بھی نہیں سکتے۔ اُن کے مقابلہ میں عیسائیوں نے کیا کیا؟ عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کی پیدائش کو تو بے شک اعتقادی طور پر رُوح القدس کی پیدائش قرار دیا اور خود خدا ہی کو مریمؑ کے پیٹ سے پیدا کیا، مگر تعددِ ازواج کو ناجائز کہہ کر وہی اعتراض اس شکل میں حضرت مریمؑ کی اولاد پر کر لیا اور اس طرح پر خود مسیحؑ اور ان کے دوسرے بھائیوں کی پیدائش پر حملہ کیا۔

واقعی عیسائیوں نے تعددِ ازواج کے مسئلہ پر اعتراض کر کے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ہم تو حضرت مسیحؑ کی شان بہت بڑی سمجھتے ہیں اور اسے سچا اور خدا کا برگزیدہ نبی مانتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ آپ کی پیدائش باپ کے بدوں خدا تعالیٰ کی قدرت کا ایک نمونہ تھی اور حضرت مریمؑ صدیقہ تھیں۔ یہ قرآن کریم کا احسان ہے حضرت مریمؑ پر اور حضرت مسیحؑ پر جو ان کی تطہیر کرتا ہے اور پھر یہ احسان ہے اس زمانہ کے موعود امام کا کہ اس نے از سرِ نو اس تطہیر کی تجدید فرمائی۔"]

اس پر حضرت مولانا عبد الکریم صاحب نے فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ لاریب "اُمّہات المومنین" کا عجیب جواب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا انتقام۔

اس کے بعد پھر حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ:

"میں یہ سارے اعتراض جمع کر کے خود حضرت مسیحؑ کی طرف سے جواب دُوں گا اور ساتھ ساتھ نبی کریمؐ کا مقابلہ بھی مسیحؑ سے کرتا جاؤں گا۔"

اس کے بعد مفتی صاحب نے وُہ اعتراض پڑھ کر سُنائے جو فری تھنکروں اور یہودیوں نے حضرت مسیحؑ پر کئے ہیں۔ زاں بعد مرزا خدا بخش صاحب نے اپنی کتاب کا کچھ حصّہ سُنایا۔ پھر نماز عشاء ہوئی۔[1]

۲؍ نومبر ۱۹۰۱ء

ابنِ صیاد

فرمایا: "مجھے تعجب ہے کہ بے چارے ابنِ صیاد پر یہ ظلم کیا جاتا ہے کہ خواہ نخواہ اسے دجّال بنایا جاتا ہے؛ حالانکہ ساری عمر اس سے کوئی شرارت ظاہر نہیں ہوئی، بلکہ اس نے مُسلمان ہو کر اپنی جان دی اور شہید ہوا اور حج کیا۔ مجھے تو یہ ظلم نظر آتا ہے اور اس لیے وُہ اس قابل ہے کہ اسے رضی اللہ عنہ کہا جاوے۔ یہ صرف بلا سوچے سمجھے موردِ اعتراض ٹھہرایا گیا ہے۔"

(اس پر حضرت مولوی نورالدین صاحب نے فرمایا کہ حضورؑ! رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو مدینہ سے نکال بھی دیا اور بعض کو قتل بھی کیا گیا، مگر ابنِ صیاد کو آپؐ نے نہیں نکالا۔ اگر وُہ ایسا ہی دجّال تھا جیسا کہ یہ لوگ خیال کرتے ہیں، تو اسے کیوں چھوڑا؟)

پھر حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ:

"حقیقت میں یہ اعتراض بہت صحیح ہے اور اس کا جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ وہ ایک سچا مسلمان تھا۔ اس نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نبی الامین کہہ کر کی اور اُس کی ماں بھی معلوم ہوتا ہے مُسلمان تھی۔ یہ حضرت ابنِ صیاد رضی اللہ عنہ مظلوم ہیں۔"

۳؍ نومبر ۱۹۰۱ء

عیسیٰؑ اور یسُوع میں فرق

حسب معمول بیٹھتے ہی حضرت مسیحؑ کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ حضرت مولوی نورالدین صاحب نے عرض کیا کہ حضور عیسیٰ اور یسُوع میں فرق ہے۔ عیسائی کبھی عیسیٰ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۱ صفحہ ۱۰، ۳ پرچہ ۱۰؍ نومبر ۱۹۰۱ء

ابن مریم نہیں بولتے بلکہ بعض تو بُرا سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں یشوع ہے۔ عبرانی میں عین نہیں بولتے۔ یسو کہتے ہیں اور قرآن نے کہیں یسو کا تذکرہ نہیں کیا انجیل پر کہیں کتاب کا لفظ نہیں بولا گیا۔ اس پر جب یہ آیت پیش کی گئی کہ مسیحؑ نے کہا ہے اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ (مریم : ۳۱) تو اس کی لطیف تشریح فرمائی۔ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ سے مراد فہمِ کتاب ہے۔

۳؍نومبر ۱۹۰۱ء

دُعا کے اصُول

[حضرت اقدس حسبِ معمول سیر کو نکلے سیٹھ احمد دین صاحب بھی ساتھ تھے۔ مولوی بُرہان الدین صاحب نے عرض کیا کہ سیٹھ صاحب کا ایک لڑکا ہوا تھا، وُہ فوت ہو چکا ہے۔ حضور دُعا کریں۔]

فرمایا: "ہاں مَیں دُعا کروں گا۔ مگر ساری باتیں ایمان پر منحصر ہیں۔ ایمان جس قدر قوی ہو اسی قدر خدا تعالیٰ کے فضل سے حصّہ ملتا ہے۔ خدا کے پاس کیا نہیں۔ اگر ایمان قوی نہ ہو، تو انسان خدا سے بدظن ہو جاتا ہے اور پھر تعویذ گنڈے کرنے لگتا ہے اور غیر اللہ کی طرف جُھک جاتا ہے پس مومن بننا چاہیے۔

دُعا کے یہ اصُول ہیں۔ مَیں نے بہت دفعہ بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کبھی اپنی منواتا ہے اور کبھی مومن کی مانتا ہے۔ اس کے سوا چونکہ ہم تو علیم نہیں اور نہ اپنی ضرورتوں کے نتائج سے آگاہ ہیں، اس لیے بعض وقت ایسی چیزیں مانگ لیتے ہیں جو ہمارے لیے مُضر ہوتی ہیں پس وُہ دُعا تو قبول کر لیتا ہے اور جو دُعا کرنے والے کے واسطے مفید ہوتا ہے، وہ اُسے عطا کرتا ہے۔ جیسے ایک زمیندار کسی بادشاہ سے ایک اعلیٰ درجہ کا گھوڑا مانگے اور بادشاہ اس کی ضرورت کو سمجھ کر عُمدہ بیل دے دے۔ تو اس کے لیے وہی مناسب ہو سکتا ہے۔ دیکھو ماں بھی تو بچے کی ہر خواہش کو پورا نہیں کرتی۔ اگر وُہ سانپ یا آگ کو لینا چاہے تو کب دیتی ہے؟ پس خدا تعالیٰ سے کبھی مایُوس نہیں ہونا چاہیے اور تقویٰ اور ایمان میں ترقی کرنی چاہیے۔"

ریا

فرمایا: "ریا کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے اور وہ چیونٹی سے بھی باریک چلتی ہے۔ ہر تحسین اور توہین میں ریا کا ایک شعبہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مومن کو چاہیے، اگر کسی کی طرف سے کوئی نیکی اور فائدہ پہنچے اگر وہ اس کی تحسین سے پہلے خدا کی تعریف نہیں کرتا تو یہ بھی ریا میں داخل ہے۔ ایسا ہی کسی تکلیف یا بدی کے وقت ضروری ہے کہ خدا کی حکمت کو مدِّنظر رکھے۔"

مومن کا کمال تو یہ ہے کہ وہ اپنے ان تعلقات کو جو خدا تعالیٰ کے ساتھ رکھتا ہے کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کو اس کا علم ہو۔ بلکہ بعض صوفیوں نے لکھا ہے کہ جب مومن خدا تعالیٰ کے ساتھ شدّتِ ارتباط اور محبت کی وجہ سے گوشہ نشینی میں اپنی مناجات کر رہا ہو اُس وقت کوئی اس کو دیکھ لے تو وہ اس سے زیادہ شرمندہ ہوتا ہے۔ جیسے کوئی زناکار عین زناکاری کے وقت پکڑا جاوے۔ پس ریاء سے بچنا چاہیے۔ اور اپنے ہر قول و فعل کو اس سے محفوظ رکھنا چاہیئے۔"[1]

---

۴ نومبر ۱۹۰۱ء [آج پھر حسبِ معمول حضرت اقدسؑ سیر کو نکلے۔ اکثر احباب حضور کے ہمراہ تھے۔ انگریزی رسالہ کا ذکر ہوتا رہا۔ اسی سلسلہ میں فرمایا:]

"مَیں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر وقت میرا گذرتا ہے، وُہ سب عبادت ہی ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی نماز پڑھتا ہے دو چار رکعت تو اس میں کچھ دل حاضر ہوتا ہے کچھ غیر حاضر۔ مگر جس کام میں مَیں لگا ہوا ہوں اس کا اصل مقصد خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال کو قائم کرنا ہے۔ پھر سارا وقت حضورِ قلب میسر رہتا ہے اور کوئی دن نہیں جاتا کہ مَیں شام تک دو چار لطیف باتیں حاصل نہ کرُوں۔"

بائبل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک پیشگوئی

رات بہت بڑی گذر گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی کی طرف جو توراۃ میں ہے اور آج تک کسی نے اس پر توجہ نہیں کی۔ مگر خدا نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔ پس اسی وقت مَیں نے توراۃ نکالی اور اس کو دیکھا۔ جو لوگ علومِ الٰہیہ اور اس کے استعارات سے دلچسپی رکھتے ہیں، اُن کو بیشک اس میں مزا آئے گا، مگر جو حقائق سے حصّہ نہیں رکھتے وہ اس پر ہنسی کریں گے۔

وُہ پیشگوئی اس طرح پر ہے۔ کہ توراۃ میں لکھا ہے کہ جب ہاجرہؓ کو اور اسماعیلؑ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام چھوڑ آئے تو ان کے پاس ایک پانی کی مشک دے کر چھوڑ آئے۔ جب وہ ختم ہو گئی تو حضرت اسماعیلؑ پیاس کی شدت سے تڑپنے لگے اور قریب المرگ ہو گئے، تو حضرت ہاجرہؓ ان کی اس حالت کو نہ دیکھ سکی اور کچھ فاصلے پر جا بیٹھی۔ وہاں لکھا ہے کہ تیر کے ٹپّے پر اس وقت ہاجرہؓ چلّائی اور خدا کے فرشتہ نے اُس کو پکارا اور کہا اے ہاجرہؓ مت ڈر۔ اُٹھ لڑکے کو اُٹھا۔ غرض پھر ہاجرہؓ کو ایک کنواں نظر آیا۔ جہاں سے اس نے مشک بھری۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ فرشتہ نے جو ہاجرہؓ کو کنواں دکھایا تھا۔ اسی میں ایک پیشگوئی تھی۔ اس پر میرے دل میں

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۱ صفحہ ۱-۲ پرچہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۱ء

فوراً یہ آیت گذری۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (آل عمران : ۱۰۴) ابراہیمؑ کا پانی جب ختم ہو چکا تو اسماعیلؑ قریب المرگ ہو گیا۔ اس وقت خدا نے اُسے بچا لیا اور ایک اور کنواں پانی کا اُسے دیا گیا۔ عرب والے بھی اسماعیلؑ کی اولاد ہونے کے سبب سے گویا اسماعیل ہی تھے۔ جب ہدایت اور شریعت کا اُن میں خاتمہ ہو گیا اور قریب المرگ ہو گئے، تو خدا تعالیٰ نے ایک نئی شریعت اُن پر نازل کی اور یہ اس آیت میں اشارہ ہے۔ غرض یہ پیشگوئی ہے جس کی طرف پہلے کسی نے توجہ نہیں کی۔[1]"

۴ر نومبر ۱۹۰۱ء

المسیح الدجال کی حقیقت

فرمایا: "اصل بات یہ ہے کہ دجال بھی مسیح موعود کی طرح ایک موعود ہے۔ اس کا نام المسیح الدجال ہے۔ سورۃ تحریم میں جیسے مسیح موعود کے لیے بشارت اور نص موجود ہے۔ اسی نص سے بطور اشارۃ النص کے دجال کے وجود پر ایک دلیل لطیف قائم ہوتی ہے۔ یعنی جیسے مریمؑ میں نفخِ رُوح سے ایک مسیح پیدا ہوا۔ اسی طرح اس کے بالمقابل ایک خبیث وجود کا ہونا ضروری ہے جس میں رُوح القدس کی بجائے خبیث رُوح کا نفخ ہوا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بعض عورتوں کو رجا کی بیماری ہوتی ہے اور وُہ خیالی طور پر اس کو حمل ہی سمجھتی ہیں یہاں تک کہ حاملہ عورتوں کی طرح سارے لوازم اُن کو پیش آتے ہیں اور چوتھے مہینے حرکت بھی محسوس ہوتی ہے، مگر آخر کو کچھ بھی نہیں نکلتا۔ اسی طرح پر المسیح الدجال کے متعلق خیالات کا ایک بُت بنایا گیا ہے اور قوتِ واہمہ نے اس کا ایک وجود خلق کر لیا۔ جو آخر کار ان لوگوں کے اعتقاد میں ایک خارجی وجود کی صورت میں نظر آیا۔ المسیح الدجال کی حقیقت تو یہ ہے۔"

۵ر نومبر ۱۹۰۱ء

آنحضرتؐ کے نشانات

(نشانات کے متعلق آج صبح کی سیر میں یہ ذکر تھا کہ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (الانبیاء : ۶) والی آیت پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نشانات آپ کے زمانہ میں غیر مفید تھے۔ اس کے متعلق شام کو پھر فرمایا کہ:

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۱ صفحہ ۲ پرچہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۱ء

اَدْنُوْنَ کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ اب زمانہ ترقی کر گیا ہے پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سونٹے کا سانپ بنا کر دکھاتے تو وہ بھلا کب مؤثر ہو سکتا تھا۔ اس قسم کے نشانات تو ابتدائے زمانہ میں کام آنے والے تھے۔ جیسے ایک چھوٹے بچے کے لیے جو پاجامہ سیا گیا ہے، وہ اس کے بالغ ہونے پر کب کام آسکتا ہے۔ اسی طرح پر وہ زمانہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا، اس قسم کے نشانات کا محتاج نہ تھا بلکہ اس میں بہت ہی اعلیٰ درجے کے خوارق کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات اپنے اندر ایک علمی سلسلہ رکھتے ہیں[1]۔

۱۳ر نومبر ۱۹۰۱ء

ایمان کی حقیقت اور اثرات

فرمایا: "ایمان بڑی دولت ہے اور ایمان اس بات کو کہتے ہیں کہ اس حالت میں مان لیا جائے جبکہ علم ابھی کمال کے درجہ تک نہ پہنچا ہو۔ اور ابھی شکوک و شبہات سے ایک جنگ شروع ہو۔ پس اسی حالت میں جو شخص تصدیقِ قلبی اور تصدیقِ لسانی سے کام لیتا ہے، وہ مومن ہے اور حضرتِ احدیت میں اس کا نام راستباز اور صادق رکھا جاتا ہے اور اس کے اس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے موہبت کے طور پر معرفتِ تامہ کے مراتب اس پر کھولے جاتے ہیں اور اصل بہشت اسی ایمان سے شروع ہوتا ہے؛ چنانچہ قرآن شریف نے جہاں بہشت کا تذکرہ فرمایا ہے، وہاں پہلے ایمان کا تذکرہ کیا ہے۔ اور پھر اعمالِ صالحہ کا اور اعمالِ صالحہ کی جزا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۔ (البقرۃ: ۲۶) کہا ہے۔ یعنی ایمان کی جزا جنت اور اس جنت کو ہمیشہ سرسبز رکھنے کے لیے چونکہ نہروں کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ نہریں اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہیں۔ اور اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ اس دوسرے جہان میں انہارِ جاریہ کے رنگ میں متمثل ہو جائیں گے۔

دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر انسان اعمالِ صالحہ میں ترقی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچتا ہے اور سرکشی اور حدود اللہ سے اعتداء کرنے کو چھوڑتا ہے، اسی قدر ایمان اس کا بڑھتا ہے اور ہر جدید عملِ صالح پر اس کے اطمینان میں ایک رسوخ اور دل میں ایک قوت آجاتی ہے۔ خدا کی معرفت میں اسے لذت آنے لگتی ہے اور پھر یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ مومن کے دل میں ایک ایسی کیفیت محبتِ الٰہی،

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۱ صفحہ ۴ پرچہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۱ء

عشقِ خداوندی کی، اللہ تعالیٰ ہی کی موہبت اور فیض سے پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا سارا وجود اس محبت اور سُرور سے جو اس کا نتیجہ ہوتا ہے، لبالب پیالہ کی طرح بھر جاتا ہے اور انوارِ الٰہی اس کے دل پر بجلی احاطہ کر لیتے ہیں اور ہر قسم کی ظُلمت اور تنگی اور قبض دُور کر دیتے ہیں۔ اس حالت میں تمام مصائب اور مشکلات بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں اُن کے لیے آتی ہیں۔ وُہ انہیں ایک لحظہ کے لیے پراگندہ دل اور منقبض خاطر نہیں کر سکتے، بلکہ وہ بجائے خود محسُوس اللذّات ہوتے ہیں۔ یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔

بہشت اور دوزخ کی حقیقت

ایمان کے انواعِ اوّلیہ بھی ساتّ ہیں اور ایک اور آخری درجہ ہے جو مُوہبتِ الٰہی سے عطا کیا جاتا ہے۔ اس لیے بہشت کے بھی ساتّ ہی دروازے ہیں اور آٹھواں دروازہ فضل کے ساتھ کھلتا ہے۔ غرض یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بہشت اور دوزخ جو اُس جہان میں موجود ہوں گی، وُہ کوئی نئی بہشت و دوزخ نہ ہوگی بلکہ انسان کے ایمان اور اعمال ہی کا وُہ ایک ظِلّ ہیں اور یہی اُس کی سچّی فلاسفی ہے۔ وُہ کوئی ایسی چیز نہیں جو باہر سے آ کر انسان کو ملے گی، بلکہ انسان کے اندر ہی سے وہ نکلتی ہیں۔ مومن کے لیے ہر حال میں اسی دُنیا میں بہشت موجود ہوتا ہے۔ اسی عالم کا بہشتِ موجود دُوسرے عالم میں اس کے لیے بہشتِ موعُود کا حکم رکھتا ہے۔ پس یہ کیسی سچّی اور صاف بات ہے کہ ہر ایک کا بہشت اس کا ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں۔ جن کی اس دُنیا میں لذّت شروع ہو جاتی ہے اور یہی ایمان اور اعمال دُوسرے رنگ میں باغ اور نہریں دکھائی دیتی ہیں۔ مَیں سچ کہتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ اسی دُنیا میں باغ اور نہریں نظر آتی ہیں اور دُوسرے عالم میں بھی باغ اور نہریں کُھلے طور پر محسوس ہوں گی۔ اسی طرح پر جہنّم بھی انسان کی بے ایمانی اور بداعمالی کا نتیجہ ہے۔ جیسے جنّت میں انگور انار وغیرہ پاک درختوں کی مثال دی ہے، ویسے ہی جہنّم میں زقّوم کے درخت کا وجود بتایا ہے۔ اور جیسے بہشت میں نہریں، سلسبیل اور زنجبیلی اور کافُوری نہریں ہوں گی۔ اسی طرح جہنّم میں گرم پانی اور پیپ کی نہریں بتائی ہیں۔ اُن پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایمان منکسر المزاجی اور اپنی رائے کو چھوڑ دینے سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح پر بے ایمانی تکبّر اور انانیّت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے نتیجہ میں زقّوم کا درخت دوزخ میں ہوا اور وہ بداعمالیاں اور شوخیاں جو اس تکبّر اور خود بینی سے پیدا ہوتی ہیں وُہ وہی کھولتا ہوا پانی یا پیپ ہوگی۔ جو دوزخیوں کو ملے گی۔

اب یہ کیسی صاف بات ہے کہ جیسے بہشتی زندگی اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اسی طرح پر دوزخ کی زندگی بھی یہاں ہی سے انسان لے جاتا ہے۔ جیسا کہ دوزخ کے باب میں فرمایا۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَۃِ (الھمزۃ، ۸) یعنی دوزخ وہ آگ ہے جو خدا کا غضب اس کا منبع ہے اور وُہ گناہ سے پیدا ہوتی ہے اور پہلے دل پر غالب ہوتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کی جڑ وُہ ہُموم غُموم اور

حسرتیں ہیں جو انسان کو آگھیرتی ہیں، کیونکہ تمام رُوحانی عذاب پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ جیسے تمام رُوحانی سُروروں کا منبع بھی دل ہے اور دل ہی سے شروع ہونے بھی چاہئیں۔ کیونکہ دل ہی ایمان یا بے ایمانی کا منبع ہے۔ ایمان یا بے ایمانی کا شگوفہ بھی پہلے دل ہی سے نکلتا ہے اور پھر تمام بدن اور اعضاء پر اس کا عمل ہوتا ہے اور سارے جسم پر محیط ہو جاتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ بہشت اور دوزخ اسی دُنیا سے انسان ساتھ لے جاتا ہے اور یہ بات بھُولنی نہ چاہیے کہ بہشت اور دوزخ اس جسمانی دُنیا کی طرح نہیں بلکہ ان دونوں کا مبداء اور منبع رُوحانی اُمور ہیں۔ ہاں یہ سچی بات ہے کہ عالمِ معاد میں وہ جسمانی شکل پر ضرور متشکل ہو کر نظر آئیں گے۔ یہ ایک بڑا ضروری مضمون ہے جس پر ساری قوموں نے دھوکا کھایا ہے اور اس کی حقیقت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے کوئی خدا ہی کا مُنکر ہو بیٹھا ہے اور کوئی تناسخ کا قائل ہو گیا۔ کسی نے کچھ تجویز کیا اور کسی نے کچھ۔ اگر خدا تعالیٰ نے ہمیں موقع دیا تو ہمارا ارادہ ہے کہ اس پر بسط کے ساتھ بڑی بحث کریں۔ اسی کی مرضی اور توفیق پر موقوف ہے؛ ورنہ ہم تو ایک لفظ بھی بول نہیں سکتے "

حیات کی تین اقسام

فرمایا: "نباتی، حیوانی اور انسانی تین قسم کی جان مانی گئی ہے بعض حکماء نباتات میں شعور اور حس کے بھی قائل ہیں؛ چنانچہ بہت سے اس قسم کے درخت اور پودے پائے گئے ہیں، جن پر مختلف اُمور اثر کرتے ہیں۔ مثلاً چھوئی موئی کا درخت۔ جب انسان اُسے ہاتھ لگاتا ہے فوراً مُرجھا جاتی ہے۔ اور اسی قسم کے بہت سے درخت ایسے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک چیز میں خدا نے ایک برزخ رکھا ہوا ہے۔ نباتات اور حیوانات کے درمیان وُہ نباتات جن میں حس و شعور ہے وہ برزخ ہیں جو بہت بڑا حصہ انسانی عقول کا رکھتے ہیں۔ اسی برزخ کے نہ سمجھنے سے بعض کو یہ دھوکا لگا ہے کہ انسان بندر سے ترقی کر کے انسان بنا ہے؛ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ تمام برزخ جو مخلوقات میں موجود ہیں وُہ وحدتِ خلقی کی دلیل ہونے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایک دلیل ہیں اور افسوس ہے کہ ناواقف اور نااہل اس سے کوئی لُطف نہیں اُٹھا سکتے۔

بچہ جب بننے لگتا ہے تو ساری چیزیں اکٹھی ہی بنتی ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں پیدائشِ انسان کا مفصل ذکر ہے۔ بعض لوگوں کی سمجھ میں جب اُس کی حقیقت نہ آئی، تو اعتراض کر دیا، مگر مشاہدہ سے یہی سچ ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک بار ایک انڈے کو توڑا اور اس کو ایک برتن میں ڈال دیا۔ میں اس کے وسط میں ایک نقطہ دیکھتا تھا۔ جو دل کی حرکت کی طرح حرکت کرتا تھا اور میں نے نہایت غور کے ساتھ جو دیکھا تو اس نقطہ سے مختلف جہات میں کچھ خطوط سے گئے ہوئے تھے۔ کوئی ان میں سے دماغ کی طرف تھا۔ کوئی جگر کی طرف وغیرہ۔

یں کئی منٹ تک یہ تماشہ دیکھتا رہا اور بعض عورتوں نے بھی اُس کو دیکھا۔ غرض قرآن نے جو کچھ اُس کی حقیقت بیان کی ہے، وُہ صحیح ہے۔

ہاں جو یہ برزخ ہیں یہ وحدتِ خلق کی دلیل ہیں۔ اسی طرح پر انسان اور خدا کے درمیان بھی ایک برزخ ہے اور وُہ تجلیات ہیں، چنانچہ اس مقام اور مرتبہ کی طرف خدا تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ (النجم: ۹، ۱۰) یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ مرتبہ کا بیان ہے، کیونکہ یہ مرتبہ اس انسانِ کامل کو مل سکتا ہے جو عبُودیت اور الُوہیت کی دونوں قوسوں کے درمیان ہو کر ایسا شدید اور قوی تعلق پکڑتا ہے۔ گویا ان دونوں کا عین ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو درمیان سے اُٹھا کر ایک مصفّا آئینہ کا حکم پیدا کر لیتا ہے اور اس تعلق کی دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہت سے یعنی اوپر کی طرف سے وہ تمام انوار و فیوضِ الٰہیہ کو جذب کرتا ہے اور دُوسری طرف سے وہ تمام فیوض بنی نوع کو حسبِ استعداد پہنچاتا ہے۔ پس ایک تعلق اس کا الُوہیت سے اور دُوسرا بنی نوع سے۔ جیسا کہ اس آیت میں صاف معلوم ہوتا ہے۔ یعنی پھر نزدیک سے (اللہ تعالیٰ سے) پھر نیچے کی طرف اُترا (یعنی مخلوق کی طرف اُترا، یعنی مخلوق کی طرف تبلیغِ احکام کے لیے نزول کیا) پس وہ ان تعلقاتِ قرب کے مراتبِ تام کی وجہ سے دو قوسوں کے وتر کی طرح ہو گیا، بلکہ قوسِ الُوہیت اور عبُودیت کی طرف اس سے بھی زیادہ قرب ہو گیا، چونکہ دُنُوّ قرب سے ابلغ تر ہے۔ اس لیے خدا نے اس لفظ کو استعمال فرمایا اور یہی نقطہ جو برزخ بین اللہ و بین الخلق ہے۔ نفسی نقطہ سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے لیتے اور بنی نوع کو پہنچاتے ہیں، اس لیے آپؐ کا نام قاسم بھی ہے۔"

وضعِ عالَم میں وحدت

فرمایا:" وضعِ عالَم میں خدا تعالیٰ نے توحید کا ثبوت رکھ دیا ہے۔ وضعِ عالَم میں کرویت ہے۔ پانی، ستارے، آگ وغیرہ یہ چیزیں سب گول ہیں۔ چونکہ کُرہ میں وحدت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس میں جہات نہیں ہوتی ہیں۔ پس یہ وضعِ عالَم میں توحیدِ الٰہی کا ثبوت ہے۔ پانی کا ایک قطرہ دیکھو تو وہ گول ہوگا۔ ایسا ہی اجرام بھی اور آگ بھی۔ آگ کی ظاہری حالت سے کوئی اگر کہے کہ یہ گول نہیں ہوتی تو یہ اُس کی غلطی ہے، کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ آگ کا شعلہ دراصل گول ہوتا ہے، مگر ہوا اس کو منتشر کرتی ہے۔

عیسائیوں نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ جہاں تثلیث نہیں پہنچی یعنی تثلیث کی تبلیغ نہیں ہوئی، وہاں اُن سے توحید کی باز پُرس ہوگی، کیونکہ وضعِ عالَم میں توحید کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر خدا تین ہوتے تو ضرور تھا کہ سب اشیاء مثلث نما ہوتیں۔

وضع عالم کی کُرویت سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ آدم ہی سے شروع ہو کر آدم ہی پر سلسلہ ختم ہوتا ہے، کیونکہ محیط دائرہ کا خط جس نقطہ سے چلتا ہے۔ اس پر ہی جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مسیح موعود جو خاتم الخلفاء ہے اس کا نام بھی خدا نے آدم ہی رکھا ہے؛ چنانچہ براہین احمدیہ میں درج ہے۔

اَرَدْتُ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ

چونکہ مسیح موعود نئی طرز کا آدم ہے، اس لیے اس کے ساتھ شیطان بھی نئی طرز کا ہے[1]۔"

۱۴ر نومبر ۱۹۰۱ء

سچی شہادت کو چھپانا اچھا نہیں

فرمایا "دُنیا چند روزہ ہے۔ شہادت کو چھپانا اچھا نہیں۔ دیکھو بادشاہ کے پاس جب کوئی تحفہ لے کر جائے مثلاً سیب ہی ہو۔ اور سیب ایک طرف سے داغی ہو، تو وہ اس تحفہ پر کیا حاصل کر سکے گا۔ مخفی ہونے میں بہت سے حقوق تلف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً نماز باجماعت، بیمار کی عیادت، جنازہ کی نماز، عیدین کی نماز وغیرہ۔ یہ سب حقوق مخفی رہ کر کیونکر ادا کیے جا سکتے ہیں۔ مخفی رہنے میں ایمان کی کمزوری ہے۔ انسان اپنے ظاہری فوائد کو دیکھتا ہے، اگر وہ بڑی غلطی کرتا ہے۔ کیا تم ڈرتے ہو کہ سچی شہادت کے ادا کرنے سے تمہاری روزی جاتی رہے گی؟ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ۔ (الذٰریات : ۲۳، ۲۴) تمہارا رزق آسمان میں ہے۔ ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے۔ یہ سچ ہے۔ زمین پر خدا کے سوا کون ہے جو اس رزق کو بند کر سکے یا کھول سکے۔ فرماتا ہے۔ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف : ۱۹۷) نیکوں کا وہ آپ والی بن جاتا ہے پس کون ہے جو مردِ صالح کو ضرر دے سکے؟ اور اگر کوئی مصیبت یا تکلیف انسان پر آپڑے۔ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ (الطلاق : ۳) جو خدا کے آگے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ خدا اس کے لیے ہر ایک تنگی اور تکلیف سے نکلنے کی راہ بنا دیتا ہے اور فرمایا۔ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق : ۴) وُہ متقی کو ایسی راہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے رزق آنے کا خیال و گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں۔ وعدوں کے سچا کرنے میں خدا سے بڑھ کر کون ہے۔ پس خدا پر ایمان لاؤ۔ خدا سے ڈرنے والے ہرگز ضائع نہیں ہوتے يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ یہ ایک وسیع بشارت ہے۔ تم تقویٰ اختیار کرو۔ خدا تمہارا کفیل ہوگا۔ اس کا جو وعدہ ہے، وہ سب

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ صفحہ ۱-۳ پرچہ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۱ء

پورا کر دے گا۔ مخفی رہنا ایمان میں نقص ہے۔ جو مصیبت آتی ہے اپنی کمزوری سے آتی ہے۔ دیکھو آگ دُوسروں کو کھا جاتی ہے، پر ابراہیمؑ کو نہ کھا سکی۔ مگر خدا کی راہ بغیر تقویٰ کے نہیں کھُلتی۔

تقویٰ اختیار کرو

معجزات دیکھنے ہوں تو تقویٰ اختیار کرو۔ ایک وہ لوگ ہیں جو ہر وقت معجزات دیکھتے ہیں۔ دیکھو آج کل مَیں عربی کتاب اور اشتہار لکھ رہا ہوں۔ اس کے لکھنے میں سطر سطر میں معجزہ دیکھتا ہوں جبکہ مَیں لکھتا لکھتا اٹک جاتا ہوں تو مناسب موقع فصیح و بلیغ پُرمعانی و معارف فقرات و الفاظ خدا کی طرف سے الہام ہوتے ہیں اور اس طرح عبارتیں کی عبارتیں لکھی جاتی ہیں؛ اگرچہ مَیں اس کو لوگوں کی تسلّی کے لیے پیش نہیں کر سکتا۔ مگر میرے لیے یہ ایک کافی معجزہ ہے۔ اگر مَیں اس بات پر قسم بھی کھا کر کہوں کہ مجھ سے پچاس ہزار معجزہ خدا نے ظاہر کرایا تب بھی جھوٹ ہرگز نہ ہوگا۔ ہر ایک پہلو میں ہم پر خدا کی تائیدات کی بارش ہو رہی ہے۔ عجیب تر ان لوگوں کے دل ہیں جو ہم کو مُفتری کہتے ہیں۔ مگر وہ کیا کریں۔ ولی را ولی شناسد۔ کوئی تقویٰ کے بغیر ہمیں کیونکر پہچانے۔ رات کو چور چوری کے لیے نکلتا ہے۔ اگر راہ میں گوشہ کے اندر کسی ولی کو بھی دیکھے جو عبادت کر رہا ہو۔ وہ یہی سمجھے گا کہ یہ بھی میری طرح کوئی چور ہے۔

خدا عمیق در عمیق چھُپا ہوا ہے اور ایسا ہی وہ ظاہر در ظاہر ہے۔ اس کا ظہور اتنا ہوا کہ وہ مخفی ہو گیا۔ جیسا سورج کہ اس کی طرف کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ خدا کا پتہ حق الیقین کے ساتھ نہیں پا سکتے، جب تک کہ تقویٰ کی راہ میں قدم نہ ماریں۔ دلائل کے ساتھ ایمان قوی نہیں ہو سکتا۔ بغیر خدا کی آیات دیکھنے کے ایمان پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ اچھا نہیں کہ کچھ خدا کا ہو اور کچھ شیطان کا ہو۔ صحابہؓ کو دیکھو کس طرح اپنی جانیں نثار کیں۔ ابوبکرؓ جب ایمان لایا تو اس نے دُنیا کا کونسا فائدہ دیکھا تھا۔ جان کا خطرہ تھا اور ابتلاء پڑھتا جاتا تھا، مگر صحابہ نے صدق خوب دکھایا۔ ایک صحابی کا ذکر ہے۔ وہ کملی اوڑھے بیٹھا تھا۔ کسی نے اس کو کچھ کہا۔ عمرؓ پاس سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ اس شخص کی عزّت کرو۔ مَیں نے اس کو دیکھا ہے کہ یہ گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اور اس کے آگے پیچھے کئی کئی نوکر چلتے تھے۔ صرف دین کی خاطر اس نے سب سے ہجرت کی۔ دراصل یہ آنحضرتؐ کی رُوحانیّت کا زور تھا جو صحابہ میں داخل ہوا۔ اُن کا کوئی جھُوٹ ثابت نہیں۔ ہر امر میں ایک کشش ہوتی ہے۔ دیکھو دیوار کی اینٹوں میں ایک کشش ہے؛ ورنہ اینٹ اینٹ الگ ہو جاوے۔ ایسی ہی جماعت میں ایک کشش ہوتی ہے۔ یہ ہوتا آیا ہے کہ ہر نبی کی جماعت میں سے کچھ لوگ مُرتد بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ ایسا ہی موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ کی جماعت کے ساتھ ہوا۔ ان لوگوں کا مادہ خبیث ہوتا ہے اور ان کا حصّہ شیطان کے ساتھ ہوتا ہے، مگر جو لوگ اس صداقت کے وارث ہوتے ہیں۔ وہ اس میں قائم رہتے ہیں۔

غرض خدا کی راہ میں شجاع بنو۔ انسان کو چاہیے۔ کبھی بھروسہ نہ کرے کہ ایک رات مَیں زندہ رہوں گا۔

بھروسہ کرنے والا ایک شیطان ہوتا ہے۔ انسان بہادر بنے۔ یہ بات زورِ بازو سے نہیں ملتی۔ دُعا کرے اور دُعا کرائے۔ صادقوں کی صحبت اختیار کرے۔ سارے کے سارے خدا کے ہو جاؤ۔ دیکھو کوئی کسی کی دعوت کرے اور محض ٹھیکرے میں روٹی لے جائے۔ اسے کون کھلائے گا، وہ تو اُلٹا مار کھائے گا۔ باطن بھی سنوارو اور ظاہر بھی دُرست کرو۔ انسان اعمال سے ترقی نہیں کرسکتا۔ آنحضرتؐ کا رتبہ سمجھنے سے ترقی کرسکتا ہے۔"[1]

۱۶؍ نومبر ۱۹۰۱ء

مُعجزہ اسلام کی پہلی اینٹ ہے

فرمایا: "افسوس ان لوگوں نے اسلام کو بدنام کیا ہے جس بات کو سمجھتے نہیں۔ اس میں یورپ کے فلاسفروں کی چند بے معنی کتابیں پڑھ کر دخل دیتے ہیں۔ مُعجزات اور مکالماتِ الٰہیہ ہی ایسی چیزیں ہیں جن کا مُردہ ملتوں میں نام و نشان نہیں ہے اور معجزہ تو اسلام کی پہلی اینٹ ہے اور غیب پر ایمان لانا سب سے اوّل ضروری ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے خیالات دہریت کا نتیجہ ہیں۔ جو خطرناک طور پر پھیلتی جاتی ہے۔ سیّد احمد نے وحی کی حقیقت خود بھی نہیں سمجھی۔ دل سے پھوٹنے والی وحی شاعروں کی مضمون آفرینی سے بڑھ کر کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ افسوس ہے کہ مولوی صاحب نے روپیہ صرف کیا اور کوشش کی، مگر نتیجہ یہ نکلا۔ مولوی صاحب اُس کو ضرور خط لکھ دیں اور اسے بتائیں کہ معجزات اور مکالمات اور پیشگوئیاں ہی ہیں جنھوں نے اسلام کو زندہ مذہب قرار دیا ہے۔

فری میسنز FREE MASONS

فرمایا: "ہم کو کبھی کبھی خیال پیدا ہوتا تھا کہ فری میسن کی حقیقت معلوم ہو جاوے۔ مگر کبھی توجہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ان حالات کو جو یہ اپنے لیکچر میں بیان کرتا ہے سُن کر اس الہام کی جو مجھے ہوا تھا۔ ایک عظمت معلوم ہوتی ہے۔ اس الہام کا مضمون یہ ہے۔ کہ فری میسن اس کے قتل پر مسلّط نہیں کئے جائیں گے۔ اس الہام میں بھی گویا فری میسن کی حقیقت کی طرف شاید کوئی اشارہ ہو کہ بعض ایسے اُمور میں جہاں کسی قانون سے کام نہ چلتا ہو، اپنی سوسائٹی کے اثر سے کام لیتے ہوں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ فری میسن کی مجلس میں ضرور بعض بڑے بڑے اہلکار اور عمائدِ سلطنت یہاں تک کہ بعض بڑے شاہزادے بھی داخل ہوں گے اور ان کا رُعب داب ہی مانع ہوتا ہوگا کہ کوئی اس کے اسرار کھول سکے، ورنہ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ صفحہ ۱۴ پرچہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۱ء

یہ کوئی معجزہ یا کرامت تو ہے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصالح سلطنت کے لیے کوئی ایسا مجمع ہوتا ہو گا۔"

ایک مُنذر الہام

فرمایا: "آج ایک مُنذر الہام ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک خوفناک رویا بھی ہے۔ وُہ الہام یہ ہے۔ مَحْمُوْمٌ پھر نَظَرْتُ اِلَی الْمَحْمُوْمِ۔ پھر دیکھا کہ بکرے کی ران کا ٹکڑا چھت سے لٹکایا ہوا ہے۔"[1]

۱۷؍ نومبر ۱۹۰۱ء

انقلابِ دنیا

فرمایا: "حضرت ابراہیم کا باپ آزر ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام اَبْ رکھا ہے۔ اس قسم کے انقلاب دُنیا میں ہوتے آئے ہیں۔ کبھی باپ صالح ہوتا ہے۔ بیٹا طالح ہوتا ہے۔ اور کبھی بیٹا صالح ہوتا ہے۔ باپ طالح ہوتا ہے۔ ہمارے پڑدادا صاحب بڑے مخیّر تھے اور باخدا بزرگ تھے؛ چنانچہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ان کو گولی کا اثر نہیں ہوتا۔ ایک وقت میں اُن کے دستر خوان پر ۵۰۰ آدمی ہوا کرتے تھے؛ اور اکثر حافظ قرآن اور عالم ان کے پاس رہتے تھے۔ اور قادیان کے ارد گرد ایک فصیل ہوتی تھی جس پر تین یا چار چھکڑے برابر برابر چلا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت سکھوں کی تعدی اور لوٹ کھسوٹ میں وہ سب سلسلہ جاتا رہا اور ہمارے بزرگ یہاں سے چلے گئے۔ پھر جب امن ہوا، تو واپس آئے۔"

سیّد

فرمایا: "سیّد باعتبار اولادِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نہیں کہلاتے، بلکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہونے کی حیثیت سے کہلاتے ہیں۔

تُرکوں کے ذریعہ سے اسلام کو قوت حاصل ہوئی

فرمایا: "اگرچہ ہمارے نزدیک اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات: ۱۴) ہی ہے اور ہمیں خواہ مخواہ ضروری نہیں کہ ترکوں کی تعریف کریں یا کسی اور کی، مگر سچی اور حقیقی بات کے اظہار سے ہم رُک نہیں سکتے۔ ترکوں کے ذریعہ سے اسلام کو بہت بڑی قوت حاصل ہوئی ہے۔ یہ کہنا کہ وُہ پہلے کافر تھے یہ

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ صفحہ ۳، ۴ پرچہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۱ء

طعن دُرست نہیں۔کوئی دوسو برس پہلے کافر ہوا، کوئی چار سو برس پہلے۔یہ کیا ہے، آخر جو آج سیّد کہلاتے ہیں کیا ان کے آباء واجداد پر کوئی وقت کفر کی حالت کا نہیں گذرا؟ پھر ایسے اعتراض کرنا دانشمندی نہیں۔

ہندوستان میں جب یہ مغل آئے تو اُنھوں نے مسجدیں بنوائیں اور اپنا قیام کیا۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کے اثر سے اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ اور اب تک حرمین شریفین ترکوں ہی کی حفاظت کے نیچے خدا نے رکھی ہوئی ہیں۔غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں خدا تعالیٰ نے دو ہی گروہ رکھے ہیں۔ایک تُرک، دُوسرے سادات۔ تُرک ظاہری حکومت اور ریاست کے حقدار ہوئے اور سادات کو فقر کا مبداء قرار دیا گیا؛ چنانچہ صُوفیوں نے فقر اور رُوحانی فیوض کا مبداء سادات ہی کو ٹھہرایا ہے اور مَیں نے بھی اپنے کشوف میں ایسا ہی پایا ہے۔دُنیا کا عروج ترکوں کو ملا ہے۔"

حضرت اقدسؑ یہ ذکر کر رہے تھے۔ایک یُورپین صاحب بہادر اندر آئے اور ٹوپی اُتار کر مجلس میں آگے بڑھے اور بڑھتے ہی کہا؛

ایک یُورپین سیّاح سے گفتگو

یورپین : السلام علیکم

اُن کے السلام علیکم کہنے پر مختلف خیال حاضرین کے دل میں گزرے۔کسی نے ترک سمجھا اور کسی نے نومُسلم۔صاحب موصُوف کو بیٹھے ہوئے ایک منٹ ہی گزرا ہوگا کہ خانصاحب نوّاب خاں صاحب تحصیلدار گجرات نے پُوچھا: آپ کہاں سے آئے ہیں؟

یورپین : مَیں سیّاح ہوں۔

خانصاحب : آپ کا وطن؟

یورپین : مَیں اتنی اُردو نہیں جانتا اور پھر سمجھ کر بولا۔او ہاں انگلینڈ۔

اتنے میں مفتی محمد صادق صاحب آگئے۔حضرت اقدسؑ کے ایماء سے وہ ترجمان ہوئے اور اس طرح پر حضرت اقدسؑ اور یورپین نو وارد میں گفتگو ہوئی۔

حضرت اقدسؑ : آپ کہاں سے آئے ہیں؟

یُورپین : مَیں کشمیر سے گلگت گیا تھا اور وہاں سے ہو کر اب یہاں آتا ہوں۔

حضرتؑ : آپ کا اصل وطن کہاں ہے؟

یُورپین : انگلینڈ۔مَیں سیّاح ہوں۔اور عرب اور کربلا بھی گیا تھا۔اب مَیں یہاں سے مصر، الجیریا، کاریتھیج اور سوڈان کو جاؤں گا۔

حضرتؑ : آپ کے سفر کا کیا مقصد ہے ؟

یورپین : صرف دید، شنید، سیاحت۔

حضرتؑ : کیا آپ بحیثیت کسی پادری کے سفر کرتے ہیں ؟

یورپین : ہرگز نہیں۔

حضرتؑ : آپ کی دل چسپی زیادہ تر کس امر کے ساتھ ہے۔ کیا مذہب کے ساتھ یا علمی امُور کی طرف یا پولیٹیکل امُور کے ساتھ۔

یورپین : مَیں صرف نظارۂ عالم دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ کسی طرح دلِ مُضطر کو قرار ہو۔

حضرتؑ : آخر آپ کے سفر کی کوئی غرض بھی ہے ؟

یورپین : کوئی مدعا نہیں۔

حضرتؑ : کیا آپ فری میسن ہیں ؟

یورپین : مَیں ان میں یقین نہیں رکھتا۔ بلکہ مَیں اپنا آپ ہی بادشاہ ہوں اور آپ ہی اپنا لاج ہوں۔ مَیں سب کا دوست ہوں اور کسی کا دشمن نہیں۔

حضرتؑ : آپ کا نام کیا ہے ؟

یورپین : ڈی۔ڈی۔ڈکسن۔

حضرتؑ : عیسائی فرقوں میں سے آپ کس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ؟

یورپین : مَیں کسی فرقہ کا پابند نہیں ہوں۔ میرا اپنا مذہب خاص ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جس میں صداقتیں نہ ہوں۔ مَیں ان سب مذاہب میں سے صداقتوں کو لے کر اپنا ایک الگ مذہب بناتا ہوں۔

حضرتؑ : اگر آپ کا کوئی مذہب نہیں، تو یہ مجمُوعہ انتخاب بھی تو ایک مذہب ہی ہونا چاہیے۔

یورپین : ہاں اگر اسے مذہب کہنا چاہیے، تو میرا یہی مذہب ہے کہ مختلف صداقتیں لیتا ہوں۔

حضرتؑ : اچھا، جو مذہب آپ نے مختلف مذاہب کی صداقتوں کو لے کر جمع کیا ہے وُہ غلطیوں سے بالکل منزّہ ہے یا کوئی اور مذہب بھی ایسا آپ کے نزدیک ہے جو بالکل غلطیوں سے مبرّا ہو۔؟

یورپین : جو مذہب مَیں نے جمع کیا ہے۔ وُہ تعلیمیافتہ لوگوں کے لیے اچھا ہے اور وہ مسیحؑ کی اس تمثیل کے اس اُصول پر ہے۔ جو اس نے کسی مالدار آدمی کی بیان کی ہے کہ اس نے اپنے نوکروں کو کچھ روپیہ دیا۔ ان میں سے ایک نے تو اس روپیہ کو کسی مصرف میں لگایا اور کچھ بنایا۔ دُوسرے نے کچھ نہ کیا۔ پس خدا نے جو کچھ ہم کو دیا

ہے۔ اگر ہم اس سے کچھ بنائیں تو وہ خوش ہوتا ہے اور جو کچھ نہیں بناتا، اس سے ناراض ہوتا ہے۔

حضرتؑ: اچھا! آپ کچھ روز یہاں قیام کریں گے؟ تاکہ آپ ہمارے مذہب سے جو ہم پیش کرتے ہیں۔ فائدہ اٹھائیں۔

یورپین: مَیں ایک دن کے بعد واپس جانا چاہتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ کل تک ٹھہر سکتا ہوں۔

حضرتؑ: آپ ایک ہفتہ تک نہیں ٹھہر سکتے؟

یورپین: نہیں۔ مَیں نہیں ٹھہر سکتا۔ مسٹر کینیڈی ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس بٹالہ میں میرے منتظر ہوں گے۔ میں انہیں آج آنے کو کہہ آیا، مگر خیر کل چلا جاؤں گا۔

حضرتؑ: جب آپ کسی کے نوکر نہیں اور اپنے آپ ہی بادشاہ ہیں اور صرف نظارۂ عالم کے لیے آپ نکلے ہیں، تو پھر کیوں آپ ایک ہفتہ تک نہیں ٹھہر سکتے؟

یورپین: یہ سچ ہے مگر مَیں نے اپنے پیشِ نظر کُل دنیا کا دیکھنا رکھا ہے۔ اگر مَیں اس طرح پر ٹھہرنے لگوں تو مجھے اندیشہ ہے کہ بہت سی دلچسپیاں مجھے ٹھہراتی جائیں گی۔

حضرتؑ: آپ کے چہرہ سے اچھے آثار نظر آتے ہیں اور آپ سمجھ دار اور زیرک معلوم ہوتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ ایک ہفتہ یہاں رہ جاویں اور ہماری باتوں کو سمجھ لیں۔ اگر آپ کا ارادہ ہو اور آپ پسند کریں، تو صاحب کو ایک چٹھی لکھ دی جاوے۔

یورپین: مَیں آپ کا بہت مشکور ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ مَیں ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔

۱۷؍نومبر ۱۹۰۱ء کی شام

آنحضرتؐ کے نشانات کا ظہور

فرمایا: "ہمارا دعویٰ ہے کہ دُنیا میں کوئی آدمی ایسا پیش کرو کہ جس کے اس قدر نشانات، جن کے کروڑوں گواہ ہوں پُورے ہوئے ہوں۔ ایک سو سے زیادہ عظیم الشان پیشگوئیاں کتاب (تریاق القلوب) میں درج کر دی گئی ہیں۔ جب یہ لوگ کسی کو پیش نہیں کر سکتے تو کہہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فضیلت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کو اتنی خبر نہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کہاں فضیلت ہوئی۔ یہ بزرگی اور عظمت تو آپ ہی کی ہوئی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر تو کوئی چیز نہیں، بلکہ اُسی کے رنگ اور اُسی کی چادر میں سے یہ ظہور نشانات کا ہو رہا ہے اور اسی کے ہاتھ پر صادر ہو رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو اسباب اور سامان تبلیغ اور اشاعت

کے ہمیں میسر آئے ہیں اور اس زمانہ میں جمع ہوئے ہیں وہ پہلے نہیں ہوئے اور نہ مذاہب کا اس قدر زور ہوا غرض یہ نشانات اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ الٰہی بخش کی پیش گوئیاں کیا حقیقت رکھ سکتی ہیں۔

سچے موحد ہی خداداد قویٰ سے کام لے سکتے ہیں

فرمایا: "جو قوی خدا تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں۔ ان سب سے بجز سچے موحد کے کوئی دوسرا کام نہیں لے سکتا۔ شیعہ ترقی نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ تو اپنی ساری کوششوں کا منتہاء امام حسینؓ کو سمجھ بیٹھے۔ ان کو رو لینا اور ماتم کر لینا کافی قرار دے لیا۔ ہمارے اُستاد ایک شیعہ تھے۔ گل علی شاہ اُن کا نام تھا۔ کبھی نماز نہ پڑھا کرتے تھے۔ مُنہ تک نہ دھوتے تھے۔

(اس پر نواب صاحب نے آپ کی تائید میں بیان کیا کہ وہ میرے والد صاحب کے بھی اُستاد تھے اور وہاں جایا کرتے تھے۔ اور یہ واقعی سچ ہے کہ اُن کی مسجدیں غیر آباد ہوتی ہیں۔)

ہماری مسجد کا ایسا ہی حال تھا اور اب خدا کے فضل سے وُہ آباد ہوگئی ہے۔ اور لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔

اس پر حضرت اقدسؑ نے نواب صاحب کو مخاطب کرکے فرمایا:

"وُہ کبھی کبھی آپ کے والد صاحب کا ذکر کیا کرتے تھے اور یہاں سے تین تین مہینے کی رُخصت لے کر مالیر کوٹلہ جایا کرتے تھے۔

مَیں نے غائبانہ بھی کئی مرتبہ ذکر کیا ہے اور میری فراست مجھے یہی بتاتی ہے (یہ نواب صاحب کی مسجد کے آباد ہونے اور نمازیوں کے آنے کے ذکر پر فرمایا) کہ راستی کو قبول کرنا اور پھر خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال سے ڈر جانا اور اُس کی طرف رجُوع کرنا آپ کے اور آپ کی اولاد کے اقبال کی نشانی ہے۔ بجُز اس کے کہ انسان سچائی سے خدا کی طرف آئے۔ خُدا کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ خواہ وُہ کوئی ہو۔ مبارک دن ہمیشہ نیک بخت کو ملتے ہیں۔ یہ آثار صلاحیت، تقویٰ اور خدا ترسی کے جو آپ میں پیدا ہو گئے ہیں، آپ کے لیے اور آپ کی اولاد کے لیے بہت ہی مفید ہیں۔"

مخالفت ہمیشہ سچّوں کی ہوتی ہے

فرمایا: "مجمل طور پر لکھا ہے کہ طاعُون ترقی پر ہے۔ میرا ارادہ ہے اور مولوی صاحب نے بھی کہا ہے کہ ایک بار پھر طاعُون کے متعلق ایک اشتہار دے دیا جاوے کہ لوگ رجُوع کریں اور سچی پاکیزگی اور تبدیلی پیدا کریں۔ دیکھا گیا ہے اور سُنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ جس قدر زور ہوا ہے، سچّوں پر ہی ہوا ہے۔ اُن کی مخالفت میں ساری طاقتیں خرچ کی گئی ہیں۔ دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کتنا زور لگایا گیا۔ برخلاف اس کے مسیلمہ کذاب

کوئی الغور مان لیا گیا۔ ایسا ہی حضرت مسیحؑ کے وقت میں بھی ہوا اور اب بھی ویسا ہی ہوا۔ جھوٹوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ راستباز پر حملہ پر حملہ کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کے لیے سب مل بیٹھے ہیں۔[1]"

۱۸؍نومبر ۱۹۰۱ء

سیر سے واپسی پر حضرت اقدسؑ نے نواب صاحب کو خطاب کرکے فرمایا:

اعزّہ کو تبلیغ

"مَیں سُنتا رہتا ہوں کہ آپ اپنے اعزّہ کو وقتاً فوقتاً تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ یہ بہت ہی عُمدہ بات ہے۔ ہر وقت انسان کو فکر کرنی چاہیے کہ جس طرح ممکن ہو۔ عورتوں اور مردوں کو اس امر الٰہی سے اطلاع کر دیوے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے قبیلہ کا شیخ اسی طرح سوال کیا جائے گا، جیسے کسی قوم کا نبی۔ غرض جو موقعہ مِل سکے، اِسے کھونا نہیں چاہیے۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء: ۲۱۵) کا حکم ہوا، تو آپ نے نام بنام سب کو خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ ایسا ہی مَیں نے بھی کئی مرتبہ عورتوں اور مردوں کو مختلف موقعوں پر تبلیغ کی ہے اور اب بھی کبھی گھر میں وعظ سُنایا کرتا ہوں۔

مَیں نے ارادہ کیا تھا کہ عورتوں کے لیے ایک قصّہ کے پیرایہ میں سوال و جواب کے طور پر سارے مسائل آسان عبارت میں بیان کیے جاویں، مگر مجھے اس قدر فرصت نہیں ہو سکتی۔ کوئی اور صاحب اگر لکھیں، تو عورتوں کو فائدہ پہنچ جاوے۔"

فضول خرچی

فرمایا: "اُمراء بہت سے فضول خرچ رکھتے ہیں، جس سے آخر کو انہیں بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر وہ اعتدال کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں، تو کچھ حرج نہیں ہے۔ سُود کی بلا نے مُسلمانوں کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ یہ بنیئے سُود در سُود دے کر آخر ساری جائدادوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔"

کثرتِ ازدواج کی اسلامی بناء

فرمایا: "اگرچہ عورت بجائے خود پسند نہیں کرتی کہ کوئی اور اس کی سوت آوے، مگر اسلام نے جس اصُول پر کثرتِ ازدواج کو رکھا ہے

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۳ صفحہ ۱-۴ پرچہ ۲۴؍نومبر ۱۹۰۱ء

وہ تقویٰ کی بنا پر ہے۔ بعض وقت اولاد نہیں ہوتی اور بقائے نوع کا خیال انسان میں ایک فطرتی تقاضا ہے۔ اس لیے دوسری شادی کرنے میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ بعض اوقات پہلی بیوی کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور بہت سے اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں۔ پس اگر عورتوں کو پُورے طور پر خدا تعالیٰ کے احکام سے اطلاع دی جاوے اور انہیں آگاہ کیا جاوے، تو وُہ خود بھی دُوسری شادی کی ضرورت پیش آنے پر ساعی ہوتی ہیں۔"

ایک رویاء

فرمایا:"رات مَیں نے ایک رویاء دیکھی ہے۔ یعنی ۱۰ نومبر کی رات کو جس کی صُبح کو ۱۸ نومبر تھی اور وہ رویاء یہ تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک سپاہی وارنٹ لے کر آیا ہے اور اس نے میرے ہاتھ پر ایک رسّی لپیٹی ہے، تو میں اُسے کہہ رہا ہوں کہ یہ کیا ہے مجھے تو اس سے ایک لذّت اور سرور آرہا ہے۔ وہ لذّت ایسی ہے کہ میں اُسے بیان نہیں کرسکتا۔ پھر اسی اثنا میں میرے ہاتھ میں معًا ایک پروانہ دیا گیا ہے کسی نے کہا کہ یہ اعلیٰ عدالت سے آیا ہے۔ وُہ پروانہ بہت ہی خوشخط لکھا ہوا تھا اور میرے بھائی مرزا غلام قادر صاحب مرحوم کا لکھا ہوا تھا۔ مَیں نے اس پروانہ کو جب پڑھا، تو اس میں لکھا ہوا تھا۔ عدالتِ عالیہ نے اسے بَری کیا ہے۔"

فرمایا:"اس سے پہلے کئی دن ہوتے۔ یہ الہام ہوا تھا:

ضَیْفَنٌ اَلْخَبَرُ (ضَیفن ناخواندہ مہمان کو کہتے ہیں)"

---

۱۹ نومبر ۱۹۰۱ء

ختمِ نبوت کا منکر کون؟

فرمایا:"تعجب کی بات ہے یہ لوگ اسے دعویٰ جدید کہتے ہیں۔ براہین میں ایسے الہامات موجود ہیں جن میں نبی یا رسول کا لفظ آیا ہے؛ چنانچہ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی اور جَرِیُّ اللّٰهِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَآءِ وغیرہ ان پر غور نہیں کرتے اور پھر افسوس یہ نہیں سمجھتے کہ ختمِ نبوت کی مُہر مسیح اسرائیلی کے آنے سے ٹوٹتی ہے یا خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے۔ ختمِ نبوت کا انکار وہ لوگ کرتے ہیں جو مسیح اسرائیلی کو آسمان سے اُتارتے ہیں اور ہمارے نزدیک تو کوئی دوسرا آیا ہی نہیں نہ نیا نبی نہ پُرانا۔ بلکہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر دُوسرے کو پہنائی گئی ہے اور وہ خود ہی آئے ہیں۔ کیا اگر ایک شیشہ میں حافظ صاحب اپنی تصویر دیکھیں، تو کیا عورتوں کو پردہ کرلینا چاہیے کہ یہ کون غیر محرم گھس آیا۔ آپ ان کو خوب مفصّل اور واضح خط لکھیں۔"

حقیقت و استعارہ

پھر فرمایا:"انبیاء علیہم السلام کے آنے کے وقت لوگوں کے حالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔وُہ استعارات کو حقیقت پر محمول کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت کو استعارہ بنانا چاہتے ہیں۔یہی مصیبت اب ان کو پیش آئی ہے۔یہ کوئی ایسا دجّال دیکھنا چاہتے ہیں جس کی آنکھ درحقیقت باہر نکلی ہوئی ہو اور پورے ستر گز کا اُس کا گدھا ہو اور آسمان سے حضرت عیسیٰ کبوتر کی طرح منڈلاتے ہوئے اُتریں۔ یہ کبھی ہونا ہی نہ تھا۔یہودیوں کو بھی حضرت عیسیٰ کے وقت یہی مصیبت پیش آئی۔وُہ بھی یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ مسیح سے پہلے جیسا کہ ملاکی نبی کی کتاب میں لکھا ہے آسمان سے ایلیاؔ اُترے گا؛ چنانچہ جب مسیح آیا، تو اُنھوں نے یہی اعتراض کیا۔مگر مسیحؑ نے ان کو جواب میں یہی کہا کہ ایلیا آچکا اور وہ یہی یحییٰ بن زکریا ہے۔یہودی سمجھتے تھے کہ خود ایلیا آئے گا۔ اس لیے وُہ مُنکر ہو گئے؛ چنانچہ ایک یہودی کی کتاب مَیں نے منگوائی تھی۔اس میں وہ صاف لکھتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم سے مواخذہ کرے گا، تو ہم ملاکی نبی کی کتاب کھول کر رکھ دیں گے کہ اس میں تو صاف لکھا ہوا ہے کہ ایلیا پہلے آسمان سے آئے گا۔یہ کہاں لکھا ہے کہ وُہ یحییٰ ہی ہوگا۔اب ہمارا دعویٰ تو حضرت مسیحؑ کی ہائیکورٹ سے فیصلہ ہو گیا کہ جس کے دوبارہ آنے کا وعدہ ہوتا ہے اس کی آمدِ ثانی کا یہ رنگ ہوتا ہے کہ اس کی خُو بُو اور خواص پر کوئی دُوسرا آتا ہے۔یہی دھوکا اور غلطی ہمارے علماء کو لگی ہے۔یہ اصل میں ایک استعارہ ہے جس کو اُنھوں نے حقیقت پر حمل کر لیا ہے۔ایسا ہی دجّال اور اس کے دُوسرے لوازمات کو حقیقت بنایا۔

عیسائیوں نے بھی دھوکا کھایا۔حضرت عیسیٰ نے اپنے بعد فارقلیط کے آنے کی پیشگوئی کی تھی۔عیسائیوں نے رُوح القدس مراد لی؛ حالانکہ اس سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد تھے۔یہ لفظ فارقلیط فارق اور لیط سے مرکب ہے۔لیط شیطان کو کہتے ہیں۔(اور فارق کے معنی ہیں جُدا کرنیوالا یعنی شیطان کو دُور کرنے والا۔ ناقل)

غرض یہ بڑی خطرناک غلطی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے وقت لوگ کھاتے ہیں کہ استعارات کو حقیقت پر اور حقیقت کو استعارات پر محمول کر لیتے ہیں۔"

حضرت اُمّ المومنین کی ایک رویاء

(اس کے بعد حضرت اقدسؑ نے جناب اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کی ایک رویاء سُنائی جو اُنھوں نے گذشتہ شب دیکھی۔اور وہ یہ ہے:)

آپ نے دیکھا کہ دوپہر کے بعد ظہر جس وقت عموماً یکے بٹالہ سے آتے ہیں۔مَیں (حضرت اقدسؑ) کچھ اسباب اور دوسرے سے کر گیا ہوں اور اُمّ المومنین کو دیئے ہیں کہ مرزا غلام قادر آگئے ہیں اور رحمت اللہ بھی ہے۔اس پر اُمّ المومنین نے حضرتؑ سے دریافت کیا۔اس خیال سے کہ ان کا گھر تو دُوسری طرف ہے اور ان کی بیوی بھی موجود

ہے جن سے حضرت اقدسؑ کو موجودہ صورت میں بالکل انقطاع ہے) کہ پھر ان کے کھانے کا کیا انتظام ہوگا۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ دراصل وُہ مر گئے ہیں اور وہ دونوں گھروں کو دیکھنے کو آئے ہیں۔ اُم المومنین نے کہا کہ رحمت اللہ خاص آپ سے ملنے کو آیا ہے۔ پیر منظور علی ایک لڑکا ہے۔ وہ ایک کپڑوں کی پوٹلی اُس دُوسرے گھر میں ہمارے ہی مکان کی سیڑھیوں میں سے ہو کر اس طرف لے گیا ہے۔ جس کو انھوں نے کھولا ہے تو وہ سیاہ بُوٹی اور سفید زمین کی ایک چھینٹ تھی۔ اس کے بعد اُن کا اور اسباب بھی اِدھر ہی آگیا۔ تو معلوم ہوا کہ منظور علی اُدھر جو پوٹلی لے گیا تھا وُہ بھی غلطی سے لے گیا ہے دراصل اِدھر ہی کی تھی۔ پھر آنکھ کھُل گئی۔

حضرت اقدسؑ نے فرمایا:

"میری اُس رویاء کے ساتھ جو کل سُنائی تھی۔ اس کے بعض اجزاء ملتے ہیں" اور فرمایا کہ "غلام قادر میں جو قادر کا لفظ ہے۔ اس کا تعلق دونوں گھروں سے ہے، مگر رحمت اللہ مخصوص اسی گھر سے ہے"۔

۲۰ر نومبر ۱۹۰۱ء

حُجّۃ اللہ کا مقام

فرمایا: "جب انسان حُجّۃ اللہ کے مقام پر ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہی اُس کے جوارح ہوتا ہے اور سچّی بات ہے کہ جب خدا تعالیٰ سے انسان پُوری صُلح کر لیتا ہے اور اپنی مرضی اور تمام خواہشوں اور قوتوں کو اس کے ہی سپُرد کر دیتا ہے، تو خدا اس کی ساری طاقتیں ہو جاتا ہے۔ اُس کی مثال اُس لوہے کی سی ہو جاتی ہے۔ جو آگ میں ڈال دیا جاوے اور خوب گرم ہو کر آگ کی طرح سُرخ ہو جاوے پھر اُس میں اس وقت وہی خواص ہوتے ہیں جو آگ میں ہوتے ہیں"۔

خَیْرُ الْمَاکِرِیْن کے معنے

فرمایا: "مَیں نے غور کیا ہے کہ مکر کا لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح علیہ السلام کے لیے قرآن میں آیا ہے اور میرے لیے بھی یہ لفظ براہین میں آیا ہے گویا مسیح علیہ السلام کے قتل کے لیے بھی ایک مخفی منصوبہ کیا گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کیا گیا تھا اور یہاں بھی منصوبے ہوئے۔ اور اپنے طور پر آج کل بھی فرق نہیں کیا جاتا۔ مگر خدا تعالیٰ کا مکر ان سب پر غالب آیا۔ مکر مخفی اور لطیف تدبیر کو کہتے ہیں۔ لیکھرام نے اپنے خطوط میں یہی لکھا تھا کہ خیر الماکرین سے میرے لیے کوئی نشان طلب کرو۔ جب خدا تعالیٰ باریک اسباب سے مجرم کو ہلاک یا ذلیل کرتا ہے اور اپنے بندہ کو جو راستباز ہوتا ہے، دشمن کے منصوبوں اور شرارتوں سے محفوظ رکھتا ہے اس وقت اُس کا نام خیر الماکرین

بیان ہوتا ہے۔ یعنی ایسے اسباب مجرم کی سزا کے لیے مہیا کرتا ہے کہ جن اسباب کو وہ اپنے لیے کسی اور غرض سے مہیا کرتا ہے۔ پس وہی اسباب جو بہتری کے لیے بنا تا ہے ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحؑ کو ایسے طرز پر بچایا کہ وہ اسباب جو ان کی ہلاکت کے لیے جمع ہوئے تھے، ان کی زندگی کا موجب ثابت ہوئے۔ اور ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے کفارِ مکہ کے منصوبوں سے بچا لیا اور اسی طرح پر یہاں بھی اُس کا وعدہ ہے۔

اگر کوئی یُوں کہے کہ وہاں ہی محفوظ کیوں نہ رکھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سُنّت اللہ یہ نہیں ہے بلکہ خدا اپنا علم دکھانا چاہتا ہے اس لیے وہاں سے نکال لیتا ہے۔

مکر کی حد اُسی وقت تک ہے جبکہ وہ انسانی تدابیر تک ہو، مگر جب انسانی منصُوبوں کے رنگ سے نکل گیا، پھر وُہ خارق عادت معجزہ ہوا۔ اگر ذرّہ بھی ایمان کسی میں ہو تو وہ اِن اُمور کو صفائی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کے لیے ہجرت نہ ہو۔"[1] end vol-2



[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۴۴ صفحہ ۱-۴ پرچہ ۳۰ رنومبر ۱۹۰۱ء